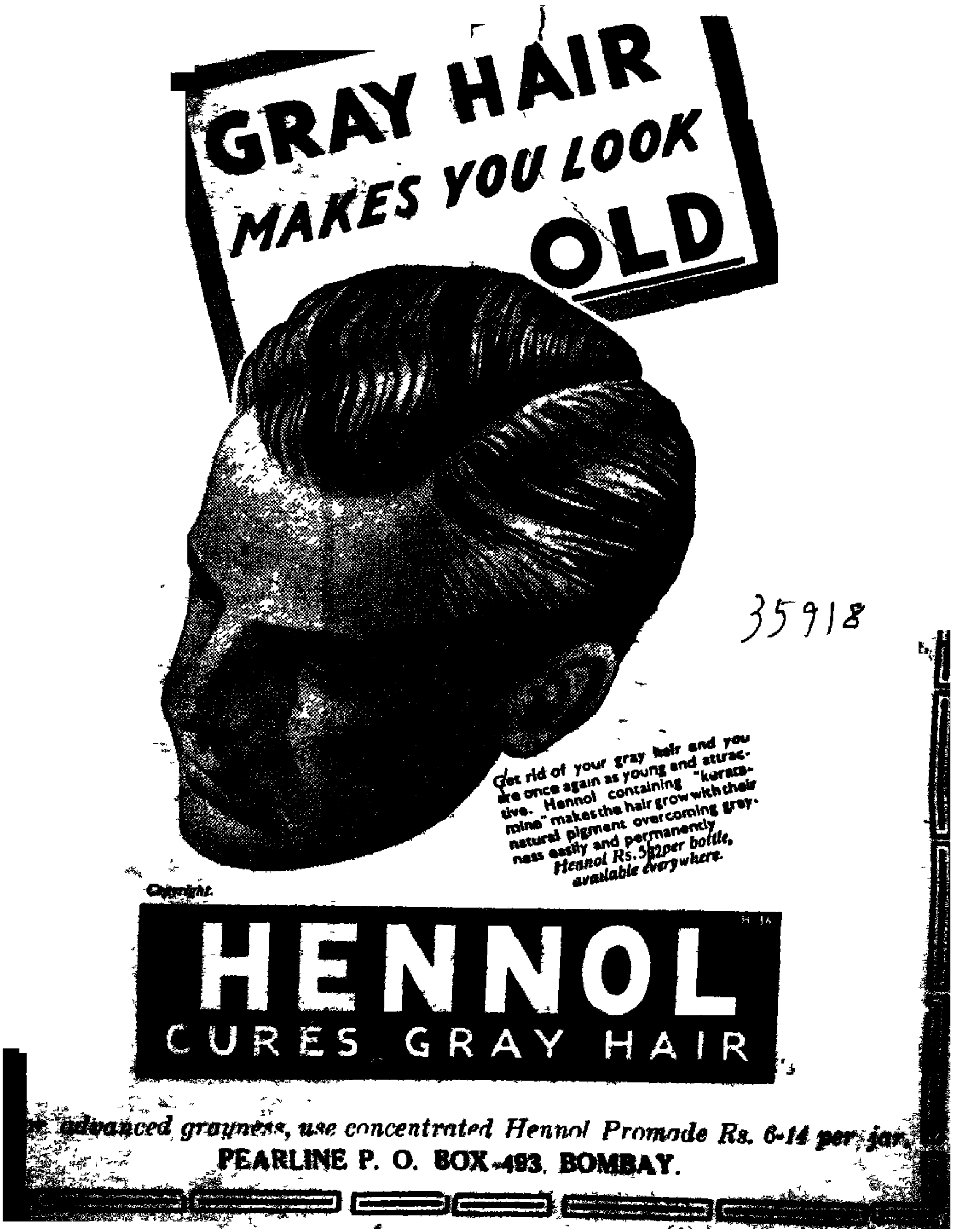
5th YEAR of PUBLICATION
APRIL 195
Vol 5. No. 1

The NAI ZINDAGI

ALLAHABAD

10 ANNAS


GRAY HAIR
MAKES YOU LOOK
OLD
Get rid of your gray hair and you
are once again as young and attrac-
tive. Hennol containing "kurata-
mine" makes the hair grow with their
natural pigment overcoming grey-
ness easily and permanently
Hennol Rs. 5-12 per bottle,
available everywhere.
Copyright.
HENNOL
CURES GRAY HAIR
advanced grayness, use concentrated Hennol Promode Rs. 6-14 per jar.
PEARLINE P. O. BOX-493, BOMBAY.

35918

اردو زبان کا واحد پولیٹیکل و سیاسی رسالہ

نئی زندگی
الٰہ آباد

مالک:- ڈاکٹر سید محمود
سرپرست:- ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید
ایڈیٹر:- سید [illegible]
جوائنٹ ایڈیٹر:- [illegible]

جلد ۵	ماہ اپریل سنہ ۱۹۴۵ء	نمبر ۱

فہرست مضامین

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	نقطۂ نظر	ایڈیٹر	۳
۲	امریکہ کی خارجی حکمت عملی	ادارہ	۹
۳	ہندوستان کی آبادی کے تازہ اعداد و شمار		۱۱
۴	قومیت	ڈاکٹر بینی پرشاد	۱۲
[illegible]	قرون وسطیٰ میں ہندوستانیوں کی قوموں کے ارتقا کا ابتدائی دور	سید نور الحسن	۱۴
	ہندوستان میں کتنے کارخانے ہیں		۱۹
	ابتدائی تعلیم	خواجہ غلام السیدین	۲۰
	ہندوستان کی تہذیب	ڈاکٹر مہدی حسن	۲۴
	امریکن ہندوستان کو بدنام کریگی برطانوی سازش	ایک ہندوستانی امریکن	۳۸
۱۰	مصر و ترکی کی موجودہ وزارتیں	اخبارات کی رائیں	۵۱
۱۱	اصول کی خاطر	قدسیہ صہبائی	۵۵
	تبصرہ	ادارہ	۶۱

سالانہ چندہ [illegible]
ششماہی تین روپے آٹھ آنے

[illegible] نے [illegible] پریس [illegible] الہ آباد میں چھپوا کر دفتر رسالہ نئی زندگی الہ آباد سے شائع کیا۔

فکر و نظر

ایڈیٹوریل

راجہ نریندر ناتھ مرحوم کا آخری خط

ناظرین نئی زندگی راجہ نریندر ناتھ کے نام پر یقینی چونکتے ہوں گے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ راجہ صاحب مرحوم کی حالیہ زندگی کو نئی زندگی کے اصولوں سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ لیکن ذیل کا خط پڑھنے کے بعد، جو مرحوم نے اپنی موت سے دو دن پہلے ڈاکٹر سید محمود کے نام لکھا تھا۔ ناظرین کو انکشاف ہوگا کہ ان دنوں راجہ صاحب پر کون سے خیالات حاوی تھے۔ ایک کٹر ہندو مہا سبھائی (جو تقریباً بیس سال سے پنجاب ہندو مہا سبھا کا صدر تھا) کے یہ الفاظ یقینی نئی زندگی کے اصولوں کی سب سے بڑی فتح ہے۔ اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جلد یا بدیر ہندوستان کے تمام فرقہ پرستوں کو، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، بالآخر اسی نتیجے پر پہنچنا پڑے گا، جس نتیجے پر راجہ صاحب مرحوم اپنے پچاس سالہ تجربہ کے بعد پہنچے۔

خط

موصولہ ۱۰ مارچ ۱۹۴۵ء

مشفق و کرم ڈاکٹر سید محمود ہمواره از عنایات الٰہی بہرہ اندوز باشند!

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۳ جنوری ۴۵ء مجھے ملا آپ نے مجھے ممنون و مشکور فرمایا۔ میرے نسبت آپ نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں۔ وہ آپ کا حسن ظن ہے۔ ورنہ میں اپنے آپ کو ایک ایسی کشتی کا چلانے والا سمجھتا ہوں جس کا پار اترنا مشکل ہے۔

ہندو مسلمانوں کے باہمی ربط و میل کا مسئلہ واقعی بہت اہم ہے اور میں اس پر مدت سے غور کر رہا ہوں آپ کو معلوم ہوگا کہ میری عمر کا بہت سا حصہ ملازمت میں گزرا جس میں ۱۲ برس ایکزیکٹو لائن میں صرف ہوئے شروع میں میرے ہندو دوست مجھ سے شکایت کرتے تھے۔ کہ آپ اپنے انتظامی کاموں میں مسلمانوں کا بہت لحاظ رکھتے ہیں جواب میں انہیں اکبر اور دیگر مسلمان بادشاہوں کی مثالیں دیتا تھا اور کہتا تھا کہ اکبر کی لبرل پالیسی کی وجہ سے اس پر شاہ ایران نے جس کا نام شاہ عباس تھا۔ یہ الزام لگایا تھا کہ آپ جادۂ اسلام سے منحرف ہوگئے ہیں۔ شاہ عباس کا اصلی خط تو میری نظر سے نہیں گذرا مگر ابو الفضل کے پہلے دفتر میں شاہ عباس کے اس خط کا ... ہے۔ ابو الفضل کہتا ہے کہ لوگوں کا کہنا ہے اگر ... پالیسی کے ... دماغ نہیں رکھتے، وہ کہتا ہے کہ

قِیلَ اِنَّ اللہَ ذُوْ وَلَدٍ
قِیلَ اِنَّ الرَّسُوْل قَدْ کَہنَا
مَا نَجَا اللہُ وَالرَّسُوْل مَعًا
مِنْ لِسَانِ الوَرٰی فَکَیْفَ اَنَا

ہندو مسلم مسئلہ پر میں پچاس برس سے غور کر رہا ہوں اور اس کا حل جو مجھے شروع میں سوجھتا تھا۔ اس سے بہتر حل مجھے اب تک سجھ

میں نہیں آیا - چنانچہ میں نے اس پر عمل بھی کیا - لوگ کہتے ہیں کہ یہ علاج فضول ہے لیکن اس وقت تک ان کے اعتراضات ماننے کو تیار نہیں ہوں۔ علاج وہی ہے جس کا آپ نے مختصر ذکر کیا ہے یعنی اتحادِ ثقافت، مجھے تعجب ہے کہ گاندھی جی اور ان کے دوستوں کو یہ علاج کیوں نہیں سوجھتا، انہیں ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کرتے ہوئے اب پچیس برس سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا، اگر انہیں اس وقت یہ علاج سوجھتا تو پچیس برس میں ثقافت اور سوشل فضا میں انقلابِ عظیم ہو جاتا، وہ صرف سیاسیات میں اتحاد پیدا کرنے کے کوشاں رہے اور اس وقت تک ناکامیاب رہے ہیں۔ اس میں کسی کو کلام نہیں کہ وہ قومیت اور حب الوطنی کے سچے جذبات سے متاثر ہیں مگر انہیں ماضی کے حالات سے پوری واقفیت نہیں، وہ ایک ہندو ریاست میں پیدا ہوئے اور ان کے والد ماجد ایک ہندو ریاست میں ایک اعلیٰ عہدہ پر ممتاز تھے - ان کا ماحول ان خرافات سے پاک تھا - جو ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ میرے والد بزرگوار فارسی اور عربی کے فاضل تھے باایں ہمہ وہ کٹے ہندو تھے، یعنی جو امور ان کے وقت میں ہندو مذہب کے عنصر سمجھے جاتے تھے - ان میں وہ راسخ الاعتقاد اور راسخ العمل تھے، ساتھ ہی اس کے بہت سے پڑھے لکھے مسلمانوں سے ان کی دوستی تھی چنانچہ ان میں سے ایک خود سکندر حیات خاں کے والد بزرگوار تھے

میں نے ۱۹۲۶ء میں ایک ریزولیوشن بھی کونسل میں پیش کیا تھا۔ جو نامنظور ہوا - لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کہتا ہوں۔ چنانچہ بعض اصحاب نے جنھوں نے اس وقت میری مخالفت کی تھی اب پشیمانی کا اظہار کیا۔ پرانے زمانہ میں ہندو مسلمانوں کے اتفاق کی کیا وجہ تھی، علاوہ سیاسیات کے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پنجاب، یو۔ پی، بہار بلکہ کل شمالی ہندوستان کے ہندو۔ فارسی زبان سے اچھی طرح واقفیت پیدا کرتے تھے اور اسلامی ثقافت کے عناصر سے پوری واقفیت رکھتے تھے۔ وہ مسلمانوں کو تنفر کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ میری تجویز یہ ہے کہ اوّل تمام یونیورسٹیوں میں (COMP - ARATIVE THEOLOGY) (یعنی تقابل مذاہب کا علم) ایک مضمون جز فلسفہ اور پولیٹیکل سائنس کا قرار دیا جائے۔

ہندو اور اسلامی فلسفہ کا اگر آپ بغور ملاحظہ کریں گے تو اس کے آپ ان میں اور کوئی فرق نہیں دیکھیں گے، ہندو فلسفہ کا میلان "ہمہ اوست" کی طرف ہے اور مسلمانوں کا "ہمہ از اوست" کی طرف ہندوؤں کا ہمہ اوست کا میلان ہی اصل موجب ان کے دیوتا پرست اور بُت پرست ہونے کا ہے چونکہ وہ ہمہ اوست کا اعتقاد رکھتے تھے انھوں نے کوئی تلقین بت پرستی اور دیوتا پرستی کے خلاف نہیں کی وہ وحدانیت کے قائل تھے، چنانچہ البیرونی جو محمود غزنوی کے وقت میں ہندوستان میں آیا اور جس نے سنسکرت پڑھی تھی، کہتا ہے کہ ہندوؤں کے اعلیٰ طبقہ کے لوگ وحدانیت کے قائل ہیں۔ دارا شکوہ نے اپنشدوں کو پڑھ کر اس کا ترجمہ کیا اور کتاب کا نام "مجمع البحرین" رکھا - وہ کہتا ہے کہ وحدانیت کی تلقین اپنشدوں میں اتنی ہی قدرت کی گئی ہے جتنی کہ قرآن میں۔ سوامی دویکانند وحدانیت کی تلقین امریکہ میں کرتے تھے، امرناتھ سوامی کشمیر گئے اور کبیر بھوانی کے آرتی کے مندر میں موجود تھے۔ میری تجویز کا جزو اعظم یہ ہے کہ ملک میں ایک کروڑ روپیہ جمع کیا جائے جو بآسانی ۴ فی صدی سود پیدا کر سکتا ہے۔ اس طرح چار لاکھ سالانہ کی آمدنی ہو سکتی ہے جس کو گیارہ صوبوں میں مساوی حصوں میں تقسیم کیا جائے ہر صوبہ میں تیس ہزار سے زیادہ آمدنی ہو جائے گی۔ اس آمدنی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے تین ایسے ہندوؤں کو انعام دیے جائیں جو اردو، ہندی، فارسی اور سنسکرت میں تعلیم حاصل کر چکے ہیں ان زبانوں کے ادبیات سے واقف ہوں، فارسی، عربی اور سنسکرت یا اردو، ہندی میں تعلیم حاصل کرنا مشکل نہیں ہے، میری اپنی تعلیم کی داستان یہ ہے کہ میرے والد نے مجھے سنسکرت اور فارسی ساتھ ساتھ پڑھوائی تھی عربی میں صرف کی تعلیم میں نے بعد میں حاصل کی، میں انگریزی، اردو و فارسی میں خاصی دستگاہ رکھتا ہوں مگر عربی و سنسکرت سے بالکل ناواقف نہیں ہوں، ان مشرقی زبانوں میں تعلیم حاصل کرنا میری انگریزی تعلیم میں حارج نہیں ہوا - میں نے ۱۶ برس کی عمر میں انٹرنس پاس کیا ۲۰ سال کی عمر میں بی - اے اور ۲۱ سال کی عمر میں ایم - اے اگرچہ عربی و سنسکرت میں میری تعلیم بہت ہی غیر مکمل ہے مگر ان سے بالکل ناواقف نہیں ہوں - پچھلے دنوں میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ

گورنمنٹ ہند نے دس لاکھ روپیہ ہندو مسلمانوں میں اتفاق پیدا کرنے کے لیے منظور کیا ہے۔ پنجاب گورنمنٹ تو ایک لاکھ روپیہ سالانہ اس کام کے لیے دیتی ہے۔ اس ایک لاکھ روپے کو ایسے ہندو مسلمان کو انعامات دینے میں استعمال کیا جائے جو اس مضمون پر کتابیں یا مضامین لکھیں کہ ہندوؤں نے معلومات انسانی کی توسیع میں اور مسلمانوں نے علیٰ ہذا۔ معلومات انسانی کی کن شاخوں میں اضافہ کیا۔ اب تک ہم محمود غزنوی اور ان چند مسلمان بادشاہوں کو اسلامی تہذیب کا نمونہ سمجھتے ہیں جنھوں نے مندر توڑے اور ہندوؤں کو جبراً مسلمان کیا ہم امام غزالی اور ابن خلدون جیسے مسلمان فاضلوں کے کارناموں سے واقف نہیں، علیٰ ہذا مسلمان سمجھتے ہیں کہ ہندو بت پرست اور عجائب پرست ہیں اور اپنے آپ کو سب سے افضل قوم شمار کرتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ علم طب ریاضی و فلسفہ میں ہمارے اکتسابات اور معلومات کس درجہ تک پہنچ گئی تھیں۔

میں نے دوسروں کے ساتھ مل کر جو جوابات سپرو کمیٹی کے سوالات کے دئے ان کی نقل اس خط کے جواب کے ساتھ مسٹر سنتانم کو بھیجا ہے آپ کے ملاحظہ کے لیے بھیجتا ہوں، اس سے آپ کو میرے پولیٹکل خیالات معلوم ہو جائیں گے اتحاد ثقافت کوئی اثر پیدا نہیں کرے گا جب تک کہ سیاسیات کے اصولوں کو ساتھ ترمیم نہ کیا جائے اور کچھ نہیں تو مخلوط انتخاب تو جاری کر دی جائیں۔ یہ کام انجام کو نہیں پہنچ سکتا جب تک مہاتما گاندھی اس کا ذمہ نہ لیں ایک کروڑ کیا اس سے بھی زائد فراہم ہو سکتا ہے اگر ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات اتفاق کو اس طریق پر مہاتما گاندھی چلا دیں جس طرح میں چلانا چاہتا ہوں تو کروڑ کا فراہم کرنا لازمی ہے۔

آپ مجھ پر اور تمام ملک پر احسان کریں گے اگر مہاتما گاندھی کو اس کام پر مائل کریں۔ ایک کروڑ ملک میں فراہم کرنا ان کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔ سیاسیات میں اتفاق پیدا کرنے سے پہلے وہ فضا پیدا کرنی چاہیے۔ جو اتفاق سیاسیات کے لیے ضروری ہے۔ آج کل تو ہندو مسلمانوں میں انتہا درجہ کی کشمکش ہے۔ انگریزوں کا ہندوستان سے رخصت ہونا اس کش مکش کے دور کرنے کے لیے ضروری نہیں ہے۔ اور وہ جاتے کب ہیں:

یہ خط اور میرا خط سنتانم کے نام سے ہے آپ مہاتما جی کو سنا دیں اور مجھے اطلاع دیں کہ وہ میری تجویز کے بارے میں کیا کہتے ہیں، سپرو صاحب کے سوالات کے جواب میں میں نے جو کچھ کہا ہو تمام تر فوراً اختیار کرنا ضروری نہیں مگر مخلوط انتخاب سے فوراً شروع کرنا لازمی ہے۔

جب آپ مہاتما گاندھی کے سامنے میرے خطوط پیش کریں تو ان کو یہ رباعی جوش ملیح آبادی کی سنا دیجئے ؎

هر شخص ہے بدحواس کس سے پوچھوں
ہر قلب ہے غرق یاس کس سے پوچھوں
کچھ روز سے اس عالم آب و گل میں!
ہر چیز ہے کیوں اداس کس سے پوچھوں

راقم نریندر ناتھ، از لاہور

اگر گاندھی جی اس تجویز کو عملاً منظور کریں تو روپیہ فراہم کرنے کے بعد ایک بورڈ آف ٹرسٹ قائم کرنا پڑے گا جو بہت سی تفصیلات کا فیصلہ کرے گا۔

میں لمبا خط نہ اردو میں اور نہ انگریزی میں خود لکھ سکتا ہوں مجھے دوسروں سے لکھوانا پڑتا ہے اور آجکل صحیح اردو لکھنے والے کم ملتے ہیں۔

ڈاکٹر سید محمود کا نوٹ

مندرجہ بالا خط پر کوئی تفصیلی تبصرہ سے بہتر یہ ہے کہ ہم ناظرین کے سامنے ڈاکٹر سید محمود کا وہ خط نقل کر دیں، جو راجہ صاحب مرحوم کے خط کے ساتھ بطور دیباچہ شائع ہوا ہے۔ یہ بیان ہم ہفت وار نئی دہلی سے نقل کر رہے ہیں۔

"یہ خط جو راجہ نریندر ناتھ صاحب نے اپنی موت سے دو تین دن پہلے لکھا تھا۔ میرے خیال میں راجہ صاحب مرحوم کی سب سے بڑی یادگار ثابت ہوگا۔ کچھ عرصے اقبال کے متعلق راجہ صاحب [illegible]

خط و کتابت ہو رہی تھی، اپنے آخری خط میں میں نے ایک واقعہ جو اسی دن پیش آیا تھا اور جس کا مجھ پر بہت اثر ہوا تھا۔ ان کو لکھا تھا۔ وہ واقعہ یہ تھا بمبئی میں ایک جگہ اتفاقاً ایک ترک شاہزادے سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے دورانِ گفتگو مصطفیٰ کمال اور ان کی پارٹی کے متعلق دریافت کیا اس ترک شاہزادے نے بے حد تعریف کی اور مصطفیٰ کمال کے متعلق نہایت اچھے خیالات ظاہر کئے۔ مجھے تعجب ہوا کہ اس کے خاندان نے مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں اس قدر نقصان اٹھایا اور یہی وہ ہے کہ خود یہ شہزادہ مارا مارا پھرتا ہے، میرے تعجب کو دیکھ کر وہ ترک شہزادہ ہنسا اور کہا کہ چونکہ تم ہندوستانی ہو اس لیے تم کو اس پر تعجب ہوا ہندوستان میں یہ ایک عجیب بات ہو تو ہو لیکن کسی دوسرے ملک کے آدمی کو اس پر تعجب نہ ہوتا یہ صحیح ہے کہ مصطفیٰ کمال نے میرے خاندان کو برباد کر دیا اور ہم لوگ ان کی بدولت روٹیوں کو محتاج ہو گئے اور انھوں نے ہمارے خاندان کو ملک بدر کر دیا لیکن مصطفیٰ کمال اور ان کی پارٹی نے ملک کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا اور آج یہ ان کا طفیل ہے کہ ہمارا ملک آزاد ہے، تو پھر کیا ایک خاندان کے ذاتی نقصان کی وجہ سے ہم ان کی برائی کرتے، اس واقعہ کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ اور میں نے راجہ صاحب کو لکھا کہ ہم ہندوستانیوں میں پھوٹ کے رجحانات اس قدر کیوں، جنوبی افریقہ میں جہاں ہماری ذلت کی کوئی حد نہیں وہاں ہندوستانی آپس میں جوتی پیزار کرتے رہتے ہیں، انگلستان میں کل چند ہزار ہندوستانی ہیں (۲۸) وہاں ہیں اور ایک دوسرے کو دوسروں کے سامنے ذلیل کرنے میں ذرا تامل نہیں کرتے۔ یہی حال عراق وغیرہ کا ہے جہاں ہندوستانی آپس کے جوتی پیزار کی وجہ سے سخت بدنام ہیں، کیا یہ ہندوستان کی آب و ہوا کا اثر ہے یا ہمارا سوشل سسٹم اس کا باعث ہے، میں نے پھر ہندو مسلم جھگڑے کے بارے میں کچھ لکھا تھا۔ اسی خط کا یہ جواب ہے جو راجہ صاحب مرحوم نے اپنی موت سے دو دن پہلے لکھا تھا، میں نے گاندھی جی کو یہ خط سنایا انھوں نے اس کو بہت پسند کیا دوسرے ہی دن اخباروں میں راجہ صاحب کی موت کی خبر چھپی، گاندھی جی پر اور مجھ پر ان کی موت کا بڑا اثر ہوا۔ میں [illegible] جو اب بھی نہیں ہوا تھا۔ میں ہندو مسلمانوں میں سوشل اور کلچرل تعلقات جو سیڈیول انڈیا میں تھے ان کو اب بھی ویسا ہی ضروری سمجھتا ہوں۔ میں نے گذشتہ چند برسوں میں اس کے متعلق انگریزی زبان میں کئی کتابیں بھی لکھیں۔ لیکن ملک کی فضا کو دیکھ کر ان کو چھپوانا بے کار سمجھا راجہ صاحب مرحوم کے اس خط نے مجھے پھر بہت دلائی اور شاید پھر ان کتابوں کو چھپوا دوں، گاندھی جی نے مجھ سے کہا کہ میں راجہ صاحب کے اس خط کو اخباروں میں ضرور چھپوا دوں، میں بھی سمجھتا ہوں کہ یہ خط نہایت اہم ہے اور اس کو شائع ہونا چاہئے، راجہ صاحب مرحوم نے پچاس برس کے تجربے اور غور و فکر کے بعد ہندو مسلم کلچرل اور سوشل میل جول اور اتحاد کو ملک کے لیے لازمی سمجھا بلکہ وہ تو یہاں تک کہہ گئے کہ گذشتہ زمانے میں ہندو مسلمانوں میں میل جول کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ کل شمالی ہندوستان میں ہندو فارسی زبان سے اچھی واقفیت پیدا کرتے تھے اور اسلامی کلچر سے پوری واقفیت رکھتے تھے یہ ہے ایک ایسے بزرگ کی رائے جس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کانگریسی تھا، یا ہندو مذہب سے اس کو کوئی لگاؤ نہ تھا، بلکہ وہ ہندو سبھا کا پنجاب میں صدر تھا۔ مذہباً پکا ہندو تھا، ہمارے وہ دوست جو گاندھی جی کی اس تجویز سے چراغ پا ہیں کہ ہندی اور اردو دونوں رسم الخط سیکھنا چاہئے ذرا راجہ صاحب مرحوم کے اس خط پر غور کریں کہ گاندھی جی نہیں بلکہ ہندو سبھا کا ایک اتنا بڑا رکن کیا کہتا ہے، اگر ہم اس نکتہ کو اب بھی نہ سمجھے تو ہمارا اور ہمارے ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستان مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

(اقبال)

مجھے امید ہے کہ ملک کے سب ہندی [illegible] اخبارات اس خط کو ضرور شائع کریں گے اور اگر ممکن ہو تو کوئی صاحب اس کا ترجمہ کر کے انگریزی اخبارات میں بھی چھپوا دیں۔ ہندو مسلمانوں دونوں

[illegible]جہ صاحب کے اس خط سے دو مختلف سبق ملیں گے۔

خاکسار: سید محمود

ڈاکٹر سید محمود کا بیان بھی ختم ہوا، اور ہمیں ان دونوں بیانات پر کوئی مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر یقینی تکلیف ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی اپیل پر ٹریبیون، اور ہندوستان ٹائمز جیسے اخباروں نے کوئی نوٹس نہ لیا، جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے راستے میں آئے جا چکے ہیں کہ وہ اس قسم کی باتیں سننا ہی گوارا نہیں کرتے۔

مسلم لیگ کی تنظیم خطرے میں

قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح آج دہلی میں بستر علالت پر، ایک مغل شہنشاہ کی طرح جس کی مرکزی طاقت کمزور ہو چکی ہو، پڑے ہوئے ہیں اور یکے بعد دیگرے اپنے تمام وزارتی صوبوں کے ہاتھ سے نکل جانے کی خبریں سن رہے ہیں سب سے پہلے صوبہ پنجاب نے علم بغاوت بلند کیا۔ اور مسٹر جناح اور لیگ ہائی کمان کی طاقت کو چیلنج کیا۔ اور بالآخر یہ صوبہ مسلم لیگ کی تنظیم حکومت سے نکل گیا۔ اس کے بعد سندھ کی باری آئی سندھ کے وزیر اعظم سر غلام حسین ہدایت اللہ نے جو فی الحقیقت کبھی بھی مسلم لیگ کی تنظیم کے تابع نہ رہے تھے۔ کئی بار علم بغاوت بلند کیا۔ اور اب بالآخر سندھ میں ۹ سال کے عرصے میں یہ چھٹی وزارت مسلم لیگ کے نام پر دوبارہ بنی ہے۔ صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی وزارت ہمیشہ اقلیت پارٹی کی وزارت رہی اور بالآخر ذرا سی کش مکش میں اس کا سارا ڈھانچہ پاش پاش ہو کر رہ گیا آسام کی مسلم لیگی وزارت نے حال ہی میں لیگ ہائی کمان کے ایما کے بغیر وسیع دیگر آل پارٹی وزارت مرتب کر لی۔ اور اب صوبہ بنگال کی لیگی وزارت نے جسے بہت ہی مستحکم وزارت خیال کیا جاتا تھا۔ حزب مخالف کے حملوں کی تاب نہ لا کر استعفیٰ دے دیا ہے۔

یہاں پر "یوم نجات" کا کوئی جذبہ کارفرما نہیں۔ لیکن دیکھتے دیکھتے ایک سال کے اندر ہندوستان کے پانچ صوبوں سے مسلم لیگ کا مسند حکومت سے بلا ارادہ نکل جانا یقینی ہر شخص کو حیرت میں ڈال دے گا۔ اور ہر سوچنے والا دماغ اس عمیق [illegible] میں پڑ جائے گا کہ۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟

اس سوال کا جواب نہایت آسان ہے۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ لیگی وزارت تھی ہی کہاں؟ ہماری قوم کا یہ خاصہ ہے کہ وہ الفاظ کو ناموں سے بہت خوش ہوتی ہے۔ چنانچہ اس قوم کے قائد اعظم بھی مسلمانوں کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے اس جھوٹی مسرت سے لذت اندوز ہونے کے عادی رہے ہیں۔ مسٹر جناح کے پاس نہ ایسے لوگ ہیں جو اپنی جماعت کی اطاعت میں صحیح وزارت قائم کریں اور نہ مسٹر جناح نے کبھی یہ کوشش کی کہ کسی صوبے میں صحیح [illegible]ن میں مسلم لیگی وزارت قائم ہو۔ اور نہ ہی مسلم لیگ کے پاس کوئی پارلیمنٹری یا وزارتی پروگرام ہے۔ بہرحال آپ جس صوبے کی صورت حال پر غور کریں گے یہ دیکھیں گے کہ مسٹر جناح نے ہر جگہ ٹھوپ تھاپ سے کام لیا ہے اور کسی صوبے میں بھی اس مرحلے سے آگے بڑھ کر کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ کہ یہ صوبہ اپنے آپ کو "مسلم لیگی" کہہ دے اور اس کا لیبل لگائے۔ مسٹر جناح اور مسلم لیگ ہائی کمان کو اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہیے کہ وہ اپنی کلاہ شتری میں ایک اور طرے کا خواہ وہ جھوٹے تاروں ہی کا بنا ہو، اضافہ کر لیں۔

اب ذرا آپ مسٹر محمد علی جناح کے عمل کو وزارت پنجاب کے سلسلے میں غور فرمائے۔ مسٹر جناح نے اسی کو غنیمت سمجھا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی وزارت قائم ہے۔ جب تک سر سکندر حیات زندہ رہے اور اپنے کو مسلم لیگی کہتے رہے۔ مسٹر جناح نے کبھی ان سے یا ان کی وزارت سے کوئی تعارض نہ کیا۔ کبھی پنجاب میں مسلم لیگ کی عوامی تنظیم قائم کرنے کی کوشش نہ کی، پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ کی پارٹی قائم نہ کی اور نہ کبھی صحیح معنوں میں مسلم لیگی وزارت قائم کرنے کے متعلق غور کیا۔

قائد اعظم اور سر سکندر مرحوم کے درمیان ایک [illegible] جس کے اب مسٹر جناح انکاری ہیں۔ جس کا نشانہ [illegible]

پنجاب کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دیں گے۔ اور اس کے عوض سر سکندر حیات خان تمام آل انڈیا معاملات میں مسلم لیگ کی حمایت کریں گے۔ جب تک سر سکندر مرحوم زندہ رہے، مسٹر جناح اسی پیکٹ پر عامل اور اسی کے طابع رہے۔ ہمارا خیال ہے کہ سر سکندر حیات خان قائد اعظم سے زیادہ ہوشیار انسان تھے جنھوں نے اس طرح کی شرط قائد اعظم سے منوالی۔ دنیا کا کوئی بھی لیڈر یا قائد اس ہتک آمیز شرط کو نہیں مان سکتا کہ کسی صوبہ کے سیاست میں دخل دینے کی اسے اجازت ہی حاصل نہ ہو، پھر وہ جماعت کیسی جماعت ہے اور وہ قائد کیسا قائد ہے جو کسی ایک فرد واحد کی خاطر کو ملحوظ رکھ کر سارے صوبے کی سیاسیات سے دست کش ہو جائے اور ساری دعوی دیدے۔ لیکن ایسا ہی ہوا۔ اور جب تک سر سکندر زندہ رہے مسٹر جناح اس بازی دعوی پر حرف بہ حرف عمل پیرا رہے۔

مسلم اکثریت صوبوں کے ان وزرا کا اس میں کچھ بھی نہ بگڑتا تھا کہ وہ دوسرے صوبوں میں جا کر مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے فرقہ پرستی کی زہر آلود فضا پھیلائیں۔ لیکن وہ خود اپنے صوبے کی فضا کو جہاں وہ اپنی حکومت سنبھالنا اور چلانا چاہتے تھے، فرقہ پرستی کے زہر سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ پنجاب سے سر سکندر حیات اور بنگال سے شیر بنگال مسٹر فضل الحق، مسلم اکثریت کے صوبوں میں گئے اور خوب فلک شگاف اور بصیرت افروز تقریریں کیں۔ اور سارے ملک کی سیاسی فضا میں زہر گھولا۔ مسٹر جناح یہی چاہتے تھے اور انھوں نے پنجاب اور بنگال میں ان دونوں شیروں کی حمایت کی یہی قیمت مقرر کی تھی۔

سر سکندر کے انتقال کے بعد ملک خضر حیات خان اور مسٹر جناح کے درمیان بھی تقریباً اسی قسم کی ساز باز رہی لیکن مسٹر جناح نے "لیگ" ایک صوبے کی وزارت سے ٹکر لینے کی ٹھان لی۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پنجاب میں بھونچال آ جائے گا۔ یہ آسمان و زمین مل جائیں گے۔ یونینسٹ پارٹی کی دھجیاں اڑ جائیں گی۔ لیکن ہم بھی دیکھ رہے تھے یہ تماشا نہ ہوا۔

قائد اعظم کے غیض و غضب کا طوفان آیا اور گیا بھی، لیکن یونینسٹ وزارت ایک چٹان کی طرح قائم و دائم رہی اور اب تک اسی طرح دندنا رہی ہے۔ بڑی تگ و دو کے بعد اس وقت پنجاب میں کل ۲۲ ممبران مسلم لیگ کی حزب مخالف میں شامل ہیں۔ یونینسٹ پارٹی حزب مخالف پر ایک سو ممبروں کی اکثریت سے حکومت کر رہی ہے۔

گرچہ سندھ کی لیگی وزارت بھی لیگ ہائی کمان کو ٹھکرا چکی لیکن پنجاب کے تلخ تجربے کے بعد مسٹر جناح نے اسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا، اور سر غلام حسین ہدایت اللہ صوبے کھلم کھلا لیگ کی تقسیم کو ہمیشہ ٹھکرا لیگی کابینہ کے وزیر اعظم بنے رہے۔ اور مسٹر جناح نے مسٹر کھوڑو اور مسٹر جی۔ ایم۔ سید کی کبھی بھی سر غلام حسین کے مقابلے میں حمایت نہ کی۔ حال میں مسٹر جی۔ ایم۔ سید کو جس طرح قائد اعظم نے ٹھکرایا ہے، وہ واقعی ایک "قائد اعظم" ہی کر سکتا ہے۔

مسٹر غلام حسین ہدایت اللہ نے قائد اعظم اور مسلم لیگ کے ایما کے بغیر خان بہادر مولا بخش (برادر اعظم خان بہادر اللہ بخش مرحوم) کو آزاد مسلم گروپ کے لیڈر کی حیثیت سے لیگ ہائی کمان کی مرضی کے بغیر اپنی کابینہ میں لے لیا۔ مسٹر مولا بخش کو اس لئے شامل کیا گیا کہ ان کی آزاد مسلم جماعت کی جو دس ممبروں پر مشتمل ہے سر غلام حسین کو حمایت حاصل ہو جائے۔ اور اس کے لیے سر غلام حسین نے یہ قیمت ادا کر دی کہ مسٹر مولا بخش کو مسلم لیگ کے عہد نامے پر دستخط کرنے کی شرط سے بری کر دیا۔ لیکن جونہی سر غلام حسین کو مسٹر سید کی (جن کے گروپ میں دس مسلم ارکان ہیں) حمایت حاصل ہو گئی انھوں نے مولا بخش کو ٹھکرا دیا۔ اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سندھ میں پھر مسلم لیگی وزارت قائم ہو گئی ہے۔ لیکن اس وزارت کی ہیئت ترکیبی ایسی ہے کہ اسے زیادہ عمر حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہاؤس ۶۰ ممبروں کا ہے۔ مسلم لیگ کی جماعت میں ۲۴ ممبران ہیں، جن میں ۱۴ سر غلام حسین کے گروپ میں اور ۱۰ مسٹر سید کے گروپ میں ہیں۔ اور نو آزاد ہندوؤں کی مدد سے یہ تعداد ۳۳ تک پہنچی ہے۔ اور اس طرح اس وزارت کا قیام عمل میں آیا ہے۔ غرضیکہ یہ وزارت ان ۹ آزاد ہندو ممبروں کے رحم و کرم پر ہے،

بھی ہے۔

جہاں تک بنگال کا تعلق ہے، بنگال کی مسلم لیگی وزارت کو اگر ہم یورپین جماعت کی تعداد کو شمار نہ کریں، کبھی بھی اکثریت حاصل نہ ہوئی یہ حکومت ۲۴ یوروپینوں کی حمایت سے چل رہی ہے۔ اور اس پر بھی بعض اوقات ایسا ہو جاتا ہے کہ حزب مخالف اپنے ارادوں میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور حکومت کو شکست ہو جاتی ہے۔ دو سال کی وزارت میں دو بار ایسا ہوا کہ اس وزارت کا وجود خطرے میں پڑا اور گورنر کی بروقت امداد سے اس کی جان بچی۔

سر ناظم الدین کی حمایت میں سابق گورنر بنگال نے مسٹر فضل الحق کے ساتھ جو غیر آئینی حرکت کی اور جبراً استعفیٰ لیا، یہ رسوائی برطانوی حکومت کی جبین سے اب تک نہیں مٹی ہے۔ ابھی اسی ہفتے کی بات ہے کہ ۹۷ ووٹ کے مقابلے میں ۱۰۶ ووٹوں سے بنگال اسمبلی میں سر ناظم الدین کی وزارت کو شکست ہوئی۔ اور گورنر بنگال نے دفعہ ۹۳ کے ماتحت عنان حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ واضح رہے کہ ان ۹۷ ووٹوں میں یوروپین گروپ کے ووٹ بھی شامل ہیں۔ اس صورت حال میں ظاہر ہے کہ بنگال کی اسمبلی میں لیگ کی کیا طاقت ہے۔

لیکن ان تمام وزارتوں میں سرحد کی مسلم لیگی وزارت سب سے آگے بڑھ گئی۔ سرحد میں مسلم لیگی وزارت کو کبھی بھی کسی حال میں بھی اور کسی جماعت کی حمایت سے بھی اکثریت حاصل نہ ہوئی، اور یہ وزارت فی الحقیقت ہمیشہ ایک "اقلیت وزارت" رہی۔ لیکن گورنر کی مدد سے اسمبلی کے اجلاس کو التوا میں ڈال کر کانگریسی اراکین کو نظر بند کر کے اور دوسرے سینکڑوں ہنگاموں سے یہ وزارت دو سال تک چلتی رہی یہاں سب سے زیادہ حیرت قائد اعظم کے عمل پر ہے کہ انہوں نے ایک سخت قسم کے آئینی اور قانون پرور انسان ہوتے ہوئے بھی ایسی مغالطہ آمیز وزارت قائم کرنے کی اجازت دی اور اسے مسلم لیگ کا لبس عطا کیا۔

غرضیکہ یہ تمام وزارتیں اب ختم ہو چکی ہیں اور جو ہے وہ دم توڑ رہی ہے۔ یہ تمام بدنامیاں اور رسوائیاں مسلم لیگ ہائی کمان کے کھاتے میں ہی جائیں گی۔

اب اگر ہم یہاں پھر اسی ابتدائی سوال کا اعادہ کریں کہ ایسا ہوا کیوں؟ تو ہمیں یہ صاف جواب ملے گا کہ مسٹر جناح کے آگے مسلم لیگ کی تنظیم کا کوئی بلند مقصد نہیں اور یہ ساری وزارتوں کو مسلم لیگ کا بلّا اس لئے دیا گیا کہ مسٹر جناح غلط یا صحیح، سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندگی کا دعویٰ کر سکیں لیکن اگر مسلم لیگ کی واحد نمائندگی کی یہی بنیاد تھی، اور مطالبۂ پاکستان کے پیچھے یہی (SANCTION) تھا۔ تو اب ان پاکستانی صوبوں کی طرف سے، جنھوں نے پاکستانی وزارتوں کو ٹھکرا دیا، قائد اعظم دنیا کے سامنے کیا جواب دینا چاہتے ہیں

بہر حال یہ صورت حال تو مسلم اکثریت کے صوبوں کی ہے۔ اب ذرا مسلم اقلیت کے صوبوں کا جائزہ لیں۔ جہاں گرچہ وزارت کا سرے سے کوئی سوال ہی نہیں لیکن پھر بھی باہمی نفاق میں کوئی کمی نہیں۔ یو۔ پی میں الہ آباد کے سیشن کے بعد سے مسلم لیگ کی دو جماعتوں میں جو جھگڑا شروع ہوا ہے، وہ تین سال کے بعد اب تک ختم نہیں ہوا۔ اور اب یو۔ پی مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی سے نواب اسمٰعیل خاں اور چودھری خلیق الزماں جیسے سربرآوردہ اراکین کے استعفے کی خبر آئی ہے۔ ابھی حال میں جس طرح بمبئی کے صوبائی انتخابات میں مسلم لیگ کی دو پارٹیوں میں ہنگامہ برپا ہوا ہے اور مسٹر جناح بنفس نفیس میدان میں آئے اور کھلم کھلا سرمایہ دار جماعت کا ساتھ دیا ہے۔ یہ بمبئی کے اردو مسلم لیگی اخبارات پڑھنے سے معلوم ہوگا، جنھوں نے شاید پہلی بار مسٹر جناح پر اتنی سخت نکتہ چینی کی ہے اور ان سے بازپرس کی ہے۔ پھر سندھ میں مسٹر جناح نے مسٹر جی۔ ایم سید کے مقابلے میں سر غلام حسین کی حمایت کی اور مسٹر سید کو جس طرح پھینکا، اس پر ہندوستان کے مسلم لیگی پریس کا ردّ عمل نئی زندگی کے اسی شمارہ میں آپ کی نظر سے گذرے گا۔

اس سارے نقشے کو سامنے رکھ کر مسلم لیگ کے اس انتشار اور زوال کا جب ہم سبب ڈھونڈھتے ہیں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ مسٹر جناح نے اپنے ساتھیوں کا انتخاب غلط کیا، اور یہ ساری ابتری اس وجہ سے ہے کہ مسلم لیگ میں لوگ نہیں ہیں اور اس جماعت میں لیے

امریکہ کی خارجی حکمتِ عملی

(۱۹۱۹ء کے بعد سے اس وقت تک)

از :- اداریہ

کسی ملک کا خارجی طرزِ عمل محض بین الاقوامی دُنیا کی فوری صورتِ حال سے متعین نہیں ہوتا بلکہ اس کی جڑیں ملک کے اندرونی معاشی نظام اور اندرونی سیاسی صورتِ حال میں پھیلی ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ روایات، باشندوں کی مخصوص نفسیاتی ساخت، ان کی عام ہمدردیوں اور تہذیبی و تمدنی رُجحانات کا بھی کسی ملک کے خارجی طرزِ عمل کے متعین کرنے میں بہت اہم حصّہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی موجودہ خارجی پالیسی کو گہرے اور واضح طور پر سمجھنے کے لئے اس کے پس منظر اور اسباب و علل کا مطالعہ کرنا بے حد ضروری ہے۔ مخصوص طور پر جبکہ موجودہ جنگ نے امریکہ کو اس کے گوشۂ عافیت سے نکال کر بین الاقوامی امور کے بیچوں بیچ لا کھڑا کیا ہے۔ اور یہ تقریباً یقینی ہے کہ اس جنگ کے بعد امریکہ دوبارہ علیحدگی کی پالیسی اختیار کرنے کی بجائے دُنیا کے معاملات میں اہم حصّہ لینا پسند کریگا

امریکہ کے بین الاقوامی تعلقات کو تین خطوں میں آسانی سے تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ امریکہ اور یورپ، امریکہ اور دوسری امریکی ریاستیں، امریکہ اور مشرقِ بعید، لیکن قبل اس کے کہ ہم ان موضوعات سے علیحدہ علیحدہ بحث کریں امریکہ کے خارجی طرزِ عمل کی چند خصوصیات کو جان لینا ضروری ہے۔ چند خاص اسباب کی بنا پر امریکہ نے بین الاقوامی دُنیا میں کسی واضح مخصوص اور متعین طرزِ عمل سے عام طور پر گریز کیا ہے۔ اس کے برخلاف یورپ کی حکومتوں نے ہمیشہ اپنے خارجی طرزِ عمل کو صاف اور واضح رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ امریکہ میں بین الاقوامی معاملات میں دلچسپی لینا مدتوں تک سیاسی عیش پسندی اور لمحاتِ فرصت کی چیز سمجھا جاتا رہا۔ اس کے مندرجہ ذیل اسباب قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ [illegible] کے بعد سے ایک سو سال تک (یعنی جب ریاستہائے متحدہ [illegible] برطانیہ سے کنیڈا کو چھین لینے میں ناکامیاب رہیں) ریاستہائے متحدہ امریکہ یورپ کے سیاسی توازن اور بحرۂ اٹلانٹک میں برطانیہ کی زبردست بحری طاقت کی موجودگی سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھاتا رہا۔ یعنی اپنے بڑھنے اور طاقت حاصل کرنے کے دوران میں یورپ یا دُنیا کی کسی بھی طاقت کے دستبرد سے ریاستہائے متحدہ امریکہ قطعی محفوظ رہا۔ دسمبر ۱۸۲۳ء میں صدر منرو نے جس "منرو اصول" کو امریکہ کی خارجی طرزِ عمل کا اساس بنایا وہ دراصل نتیجہ تھا اس خوف کا کہ یورپ کے دوسرے ممالک خاص طور پر روس برِّ اعظم امریکہ کے کسی علاقہ میں قدم جمانے کی کوشش نہ کرے۔ ان اسباب کی بنا پر باہری دُنیا سے امریکہ کی دلچسپی برائے نام رہی۔

امریکہ کے علیحدگی پسند مدبّرین غلطی سے معلول کو علت قرار دیتے آئے ہیں۔ اور اپنی حفاظت اور امن کو علیحدگی اور الگ تھلگ رہنے کی پالیسی کا نتیجہ قرار دے رکھا ہے۔ پھر ایک واضح خارجی طرزِ عمل اختیار کرنے سے خود امریکہ کے باشندوں میں رخنہ پڑ جانے کا ڈر تھا۔ کیونکہ امریکہ کی حکمراں آبادی خود یورپ کے مختلف ملکوں سے امریکہ میں ہجرت کرنے والے لوگوں پر مشتمل تھی۔ چنانچہ ریاستہائے متحدہ امریکہ نے باہری دُنیا سے اپنے تعلقات کو سیاسی نہیں بلکہ محض تجارتی رنگ دینے کی کوشش کی اور واشنگٹن نے جنگِ آزادی کے بعد جس خارجی طرزِ عمل کی شکل و صورت متعین کی تھی اس کو کم و بیش ڈیڑھ سو سال تک برقرار رکھا گیا۔ لیکن باہری دُنیا سے اس بے توجہی کے باوجود امریکی ریاست نہیں تو کم سے کم امریکی باشندے دوسرے ملکوں کی آزادی، جمہوریت اور قومیت کی تحریکوں میں بڑی دلچسپی لیتے آئے ہیں۔ اس کی وجہ بڑی حد تک اس نفسیاتی ساخت میں ملتی ہے جو امریکہ کے انقلاب اور جنگِ آزادی کی تخلیق ہے اور جس کے تحت امریکہ ہر زمانہ میں خود کو دُنیا کے سامنے آزادی اور مساوات کا نمونہ سمجھتا آ رہا ہے۔ چنانچہ انیسویں صدی کی

کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے اولین بیس سالوں کے درمیان یورپ اور دُنیا میں جتنی آزادی اور قومیت کی تحریکیں پیدا ہوئیں ان سبھوں کو امریکہ کی ہمدردی حاصل تھی۔ یونان، ہنگری، اطالیہ، پولینڈ، آئرلینڈ، آرمینیا اور چین وغیرہ کی مثالیں ہمارے پیش نظر ہیں۔ اس کا ایک اور سبب یہ بھی تھا کہ امریکہ کا تجارتی مفاد ایسے بڑے بڑے خود مختار علاقوں سے وابستہ تھا جو دوسرے طاقتور ممالک کے دباؤ سے آزاد ہوں۔ اور جو خود صنعتی اعتبار سے ہنوز ترقی یافتہ نہ ہوں۔ گذشتہ جنگ عظیم اور موجودہ جنگ میں بھی امریکہ نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اس کی معاشی اور تجارتی اساس کے علاوہ ایک بنیاد یہ بھی ہے کہ امریکہ کی مخصوص نفسیاتی ساخت جمہوریت پسند واقع ہوئی ہے۔ اور اس لئے ذہنی طور پر شخصی یا آمری طرزِ حکومت کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔

امریکہ کی خارجی پالیسی کی ان بنیادی خصوصیات اور کردار کو سمجھنے کے بعد اب ہم اس طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ ۱۹۱۴ء کے بعد مختلف خطوں کے ساتھ امریکہ کا کیا طرزِ عمل رہا۔

امریکہ اور یورپ

گذشتہ جنگ عظیم میں صدر ولسن کی رہنمائی میں امریکہ خود کو جنگ سے علیحدہ نہ رکھ سکا جس کے معنی تھے کہ امریکہ نے اپنی روایتی علیحدگی کی پالیسی کو خیرباد کہہ دیا۔ لیکن یہ صورتِ حال محض عارضی تھی۔ صدر ولسن جب پیرس کانفرنس کے بعد امریکہ گیا تو اس نے کانگریس سے باہر اور کانگریس کے اندر مخالفت کی ایک مضبوط دیوار کھڑی پائی۔ پیرس کانفرنس سے ولسن عالمگیر امن کے قیام کے لئے دُنیا کی دوسری طاقتوں اور جمعیت الاقوام کے ساتھ امریکی تعاون کا وعدہ لیکر آیا تھا۔ لیکن ۱۹۔ مارچ ۱۹۲۰ء کو امریکہ کے سینیٹ نے معاہدۂ ورسائی کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ اور ۱۹۲۰ء کے انتخابات میں خارجی طرزِ عمل ہی کی بنا پر ولسن کی پارٹی کے نمائندے جیمس کاکس کو ہارڈنگ کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ یہ دراصل جنگ کے اُن نتائج کا ردِّ عمل تھا جس نے امریکہ کے عوام کو بددل کر دیا تھا۔ اور وہ دوبارہ علیحدگی کی روایتی پالیسی کی زبردست موافقت کرنے لگے تھے۔ اس پالیسی کے تحت ۱۹۲۱ء میں امریکہ نے آسٹریا ہنگری سے علیحدہ عہد نامے مرتب کئے جس کے تحت امریکہ کے وہ تمام فائدے اور حقوق برقرار رکھے گئے جو یورپ کے نئے عہد ناموں اور معاہدۂ ورسائی کے تحت دوسری اتحادی طاقتوں کو ان ممالک میں عطا کئے گئے تھے۔ علیحدگی کا یہ رُجحان ۱۹۳۹ء تک امریکہ کے خارجی طرزِ عمل پر مکمل طور سے حاوی رہا۔ اس درمیان میں یورپ سے امریکہ کے تعلقات کو ہم وضاحت خیال اور آسانی کے لئے مختلف موضوعات کے تحت تقسیم کر سکتے ہیں یا امریکہ اور جمعیت الاقوام، امریکہ اور جنگی قرضہ۔ امریکہ اور تخفیفِ اسلحہ، امریکہ اور اجتماعی تحفظ و امن کا مسئلہ۔

ہارڈنگ کے دورانِ صدارت میں امریکہ نے اپنی تازہ اور شدید علیحدگی کی پالیسی کے تحت لیگ سے قطعی الگ تھلگ رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہاں تک کہ چھ ماہ تک امریکہ نے لیگ کے مراسلات کا جواب تک دینا پسند نہ کیا۔ اور اپنے سفیر مقیم لندن کے ذریعے ناظم جمعیت اقوام کو مطلع کر دیا کہ امریکہ لیگ سے بے سروکار ہونے کے باعث اس کے مراسلات کا جواب دینے پر خود کو مجبور نہیں پاتا۔ ۱۹۲۲ء کے اولین مہینوں سے اس شدید ردِّ عمل کی پالیسی میں کچھ ردّوبدل پیدا ہوا۔ اور امریکہ سے اس قسم کی کانفرنسوں میں غیر سرکاری نمائندے بھیجے جانے لگے جن کے زیر بحث ایسے بین الاقوامی سوالات تھے جو امریکہ کو بھی متاثر کرتے تھے مثلاً افیون کی خفیہ تجارت کا مسئلہ۔ تجارتی محصولات یا بین الاقوامی رسل و رسائل کے سوالات وغیرہ وغیرہ۔ صدر ہارڈنگ نے امریکہ کو اس شرط پر "بین الاقوامی انصاف کی دائمی عدالت" (Permanent Court of International Justice) میں شامل کرنے کا وعدہ کیا کہ بین الاقوامی عدالت کے ججوں کے انتخاب میں امریکہ کا دوسرے ملکوں کے مساوی حصہ ہوگا۔ لیکن یہ وعدہ کبھی شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکا۔ رفتہ رفتہ لیگ کے سلسلے میں امریکہ کے اس طرزِ عمل میں فرق آنے لگا۔ ۱۹۲۹ء میں امریکہ کے سینیٹ میں شعبۂ انتظامیہ کی پہل اور کوششوں سے امریکہ کو بین الاقوامی عدالت کا رُکن بنانے کیلئے "روٹ فارمولا" پیش کیا گیا۔ لیکن صرف سات ووٹ کی کمی کے سبب دو تہائی اکثریت نہیں حاصل کی جا سکی۔ اور اس تجویز کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ آگے چل کر امریکہ نے کئی موقعوں پر لیگ کے ذریعہ دُنیا کی دوسری طاقتوں سے بین الاقوامی امن و امان کے قیام کے لئے اشتراکِ عمل اور تعاون بھی کیا۔ مثلاً ۱۹۳۱ء میں جب جاپان نے منچوریا پر حملہ کر کے بین الاقوامی امن و سکون کو [illegible]

نے لیگ کاونسل کی مارچ سنہ ۱۹۳۲ء کی کارروائیوں میں حصہ لے کر جاپان کے اس اقدام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ لیگ کاونسل کے سامنے امریکہ کے ناظم ریاست اسٹمسن نے اپنا مشہور "اسٹمسن اصول" پیش کیا جسے لیگ کاونسل نے منظور کیا۔ اس اصول کے تحت لیگ کے ارکان نے اس بات کا عہد کیا کہ منچوریا میں جاپان کی پٹھو حکومت کو کبھی نہ تسلیم کیا جائے۔ امریکہ نے لیگ کی عام تخفیفِ اسلحہ کانفرنس منعقدہ سنہ ۳۳-۱۹۳۲ء میں بھی شرکت کی اور تخفیفِ اسلحہ پر زور دیا۔ لیکن امریکہ نے عالمگیر امن کے مسائل پر دنیا کی دوسری طاقتوں سے صلاح ومشورہ کرنے پر خود کو مجبور و پابند کر دینے سے انکار کیا۔ روزویلٹ کے صدر ہونے کے بعد امریکہ نے جون سنہ ۱۹۳۴ء میں بین الاقوامی لیبر آفس کی رکنیت قبول کی لیکن اس شرط پر کہ لیگ کے معاہدہ (League Covenant) سے متعلق جتنے فرائض ہیں وہ امریکہ پر نہیں عائد ہوتے۔

گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد امریکہ اور یورپ کے درمیان تعلقات کی جو صورتیں قائم ہوئیں ان میں جنگی قرضوں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

گذشتہ جنگِ عظیم کے موقع پر یورپ کی اتحادی حکومتوں نے برطانیہ سے جتنا قرض لیا تھا اُس کا نصف سے زیادہ برطانیہ نے امریکہ سے قرض لیا تھا۔ اس کے علاوہ یورپ کی اتحادی طاقتوں نے امریکہ سے بھی براہ راست طور پر قرض لیا تھا۔

(مسلسل)

ہندوستان کی آبادی کے تازہ اعداد و شمار

(سنہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق صرف برطانی ہند)

صوبے	آبادی
برطانی ہند (مجموعی)	۲۹۵۸۰۸...
(۱) مدراس	۴۹۳۴۲...
(۲) بمبئی	۲۰۸۵....
(۳) بنگال	۶۰۳۰۶...
(۴) صوبہ متحدہ	۵۵۰۲۱...
(۵) پنجاب	۲۸۴۱۹...
(۶) بہار	۳۶۳۴۰...
(۷) صوبہ متوسط و برار	۱۶۸۱۳...
(۸) آسام	۱۰۲۰۵...
(۹) صوبہ سرحد	۳۰۳۸...
(۱۰) اڑیسہ	۸۷۲۹...
(۱۱) سندھ	۴۵۳۵...
(۱۲) اجمیر مارواڑ	۵۸۴...
(۱۳) بلوچستان	۵۰۲...
(۱۴) کورگ	۱۶۹...
(۱۵) [illegible]	۹۱۸...

قومیت:

از ڈاکٹر بینی پرشاد صدر شعبۂ سیاسیات الٰہ آباد یونیورسٹی

قومیت کی صحیح تعریف تقریباً ناممکن ہے لیکن اگر تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس سے مراد وہ احساس ہے جو ایک مشترکہ جائے مقام، مشترکہ تہذیب (جس کے خط و خال کو واضح کرنا بے حد مشکل ہے) اور مشترکہ روایات یادداشت، امیدوں اور مفادوں سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ احساس دراصل تاریخی ماحول اور حالات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن عام طور پر قومیت کی اساس اس نظریہ پر قائم ہے کہ قوم یا تو کسی معین نسل پر مشتمل ہوتی ہے یا کسی مخصوص نسل کی شاخ کی حیثیت رکھتی ہے۔ قومیت کی بنیاد لازمی طور پر نسلی اور تہذیبی ہے اور قومیت کا احساس کسی جماعت کے ظاہر اور نمایاں ہونے کے جذبے کا نتیجہ ہے۔ جب مختلف انسانی جماعتیں ایک دوسرے سے دوچار اور متصادم ہو جائیں تو قومیت کا جذبہ تیز تر ہو گیا۔ اور قومی آزادی کا تصور قائم ہوا۔

قومیت انگلستان میں چودھویں یا پندرھویں صدی میں رونما ہوئی سولھویں صدی میں۔ ان ملکوں میں قومیت کے عروج کا زیادہ تر سبب یہ تھا کہ یہاں کی قوموں کو غیر قوموں سے متصادم ہونے کا موقع ملا۔ دینی اصلاح کی تحریک نے جب یورپ کے بہت سے حصوں میں مذہبی جوش و خروش کو کم کر دیا تو قومیت نے اس کی جگہ لے لی اور لوگ قوم کے لئے جان دینا باعث فخر سمجھنے لگے۔ جب اٹھارہویں صدی کے آخر میں پولینڈ کو ہمسایہ ملکوں نے آپس میں تقسیم کر لیا تو قومیت کا احساس اور بھی بڑھ گیا اور اس کے ساتھ ایک تقدس سا وابستہ ہونے لگا انقلاب فرانس اور عہد نپولین نے عوام کو منظر عام پر لا کھڑا کیا، جس کا ردعمل یوں رونما ہوا کہ عوام میں قومیت کا احساس بہت بڑھ گیا انقلاب نے حکومت خود اختیاری کے نصب العین کو قومیت سے ملا دیا جس کے بعد قومیت نے ایک مذہبی عقیدے کی حیثیت اختیار کر لی اور دنیا کی آبادی کے ایک بہت بڑے حصہ کو متاثر کرنے لگی۔ شاعروں، مورخوں صحافت نگاروں اور سیاست دانوں نے مرکزی یورپ اور بلقان میں قومیت کے نصب العین کو آگے بڑھایا۔ مشرق قریب، ہندوستان، چین اور جاپان بھی قومیت کے جادو سے مسحور ہونے لگے۔ ہندوستان کے لوگ قومیت کو غیر ملکی قبضہ و اقتدار سے نجات کا ذریعہ سمجھنے لگے اور چین، جاپان اور ترکی وغیرہ میں قومیت غیر ملکی خطروں کے مقابلہ کا ذریعہ سمجھی جانے لگی۔ اس دوران میں صنعتی انقلاب کی پیدا کردہ صنعتی ترقیوں کا استعمال قومی مقاصد اور قومی امور کے پیش نظر ہونے لگا تھا۔ اور یہ صورت حال بجائے خود نتیجہ تھی ان تجارتی روایات کا جو پہلے ہی سے قومی اساس پر قائم تھی۔ صنعتی ترقیوں کا استعمال قومی مقاصد اور قومی امور کے پیش نظر ہونے لگا تھا۔ اور یہ صورت حال بجائے خود نتیجہ تھی۔ ان تجارتی روایات کا جو پہلے ہی سے قومی اساس پر قائم تھی۔ صنعتی انقلاب بجائے خود ایک ایسے ملک میں رونما ہوا جہاں قومی ریاست پہلے سے موجود تھی اور انیسویں صدی میں یہ پھیلا بھی زیادہ تر ان ملکوں میں جن کی سیاسی تنظیم پہلے ہی قومی شکل اختیار کر چکی تھی اور جہاں تجارتی روایات مضبوطی سے قائم تھیں۔ ہیز (HAYES) اپنی تصنیف (ESSAYS ON NATIONALISM) میں کہتا ہے کہ "صنعتی انقلاب کی وجہ سے مختلف ملکوں کے درمیان خیالات اور خبروں کا جو زبردست تبادلہ و اشاعت وجود میں آئی اس نے بھی لسانیاتی اسباب کی بنیاد پر زیادہ تر قومی ہی شکل و صورت اختیار کی،" تجارتی آزادی اگر کچھ تھوڑے سے علاقوں میں موجود بھی تھی تو اس وجہ سے کہ یہ عارضی طور پر ان ملکوں کے قومی مفاد کے حسب خواہ تھی۔

قومیت اور سامراج

اور ہر کی تشریح سے یہ بات واضح ہوئی کہ قومیت [illegible]

کی ایک نئی شکل ہے۔ اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ قومیت کے تحت ملکی سرحدیں، نظریاتی سرحدوں سے جاملی ہیں (یعنی کچھ مخصوص نظریئے مخصوص ملکوں سے وابستہ ہوگئے ہیں) قومیت کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مطالبہ مکمل سیاسی خودمختاری کا مطالبہ ہوتا ہے۔ قومیت اندرون ریاست میں گہرے اشتراک عمل اور تعاون پر زور دیتی ہے لیکن ریاست سے باہر اس سے علیحدگی کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ دوسری جماعتوں کو نقصان پہنچاکر خود کو فائدہ پہنچانے کے اصول نے قومیت کی نئی شکل اختیار کی ہے۔ اور اس کا تعلق تہذیبی برتری کے احساس سے قائم ہوگیا ہے۔ قومیت میں ایک خاص تحریک ہوتی ہے۔ چنانچہ دنیا کے بعض حصوں میں قومیت نے سیاسی اتحاد کو جنم دیا ہے اور دوسرے ملکوں میں اس سے سیاسی آزادی کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ بعض ریاستوں میں قومیت کے ذریعہ مخالف جماعتیں تہذیبی اعتبار سے گھل مل گئی ہیں اور بعض ریاستوں میں قومیت اقتصادی لوٹ کھسوٹ کا آلہ کار بن گئی ہے۔ آخری دونوں صورتوں میں قومیت آگے چل کر تہذیبی یا اقتصادی سامراج کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔

مینزینی اور دوسرے مدبرین نے قومیت کو بین الاقوامی تعاون اور اشتراک عمل کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن قومیت لازمی طور پر ایک قسم کی "اخلاقی خودکفالت" (MORAL SELF SUFFICIENCY) کے اصول کی طرف راغب تھی۔ جرمن قومیت کے عروج کے زمانہ میں ہیگل نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ریاست انسان کی تمام تر اخلاقی اور روحانی طاقتوں کی مظہر ہے۔ ہیگل کے نزدیک ریاست انسان کے پورے اخلاقی نظام کی سرپرست ہے۔ لیکن ریاست بجائے خود کسی خارجی اخلاقی نظام کا حصہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ منظم اخلاقی زندگی صرف ریاست ہی میں ممکن ہے نہ کہ بین الاقوامی دنیا میں۔ بوزانکے (BOSANQUET) ہیگل سے گہرے طور پر متاثر تھا چنانچہ اس کا خیال ہے کہ انسان کی تمام صلاحیتیں اور امکانات صرف ریاست ہی میں کل صورت اختیار کرسکتے ہیں۔

تہذیبی ہم آہنگی

اسی "اخلاقی خودکفالت" کے اصول کے تحت ریاست میں قومی اتحاد کے ساتھ ساتھ "تہذیبی ہم آہنگی" پر بھی زور دیا جانے لگا۔ قومیت جن مختلف شکلوں میں ظاہر ہوئی ان کے متعین کرنے میں "عسکریت" (MILITARISM) کا بہت اہم حصہ رہا ہے۔ عسکریت نے مرکزی اور مشرقی یورپ کی ریاستوں میں تہذیبی اعتبار سے اقلیتوں کو ہضم کر جانے کی جابرانہ پالیسی کو فروغ دیا اور اکثریت اور اقلیت کے باہمی تعلقات میں زہر گھول کر بین الاقوامی خطرات بھی پیدا کئے۔ لارڈ ایکٹن کا شمار ان لوگوں میں سے ہے جنھوں نے پہلی بار سیاسی اور تہذیبی سرحدوں کو ملانے کے طرز عمل کی مخالفت کی اور اس سے پیدا ہونے والے خطرات کو محسوس کیا۔ لارڈ ایکٹن نے قومیت کے نظریئے کی اس زمانہ میں مخالفت کی جب کہ قومیت اپنے پورے عروج و شباب پر تھی اور ایک مسلّم اور طے شدہ نظریئے کی حیثیت رکھتی تھی ۱۸۶۲ء میں اس نے یہ لکھا تھا کہ "اصولی اعتبار سے ریاست اور قوم کو متوازی حیثیت دینے کا مطلب یہ ہے کہ ریاست کی تمام دوسری قومیتیں محکوم ہو جاتی ہیں۔ اس اصول کے تحت ریاست کی اقلیتیں حکمراں جماعت کی ہمسر نہیں ہوسکتیں کیونکہ اس طرح ریاست کی قومی حیثیت برقرار نہیں رہ سکتی۔"

معاشی قومیت

معاشی دنیا میں ریاست کے خودکفیل ہونے کا اصول جدید صنعتی ضروریات کا ساتھ دیتا ہے۔ صنعت کی ترقی کے لئے ہمیشہ خام اشیاء، بازار اور سستی محنت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس سے دوسرے علاقوں کو جن میں کمزور قومیں آباد ہوتی ہیں ریاست میں شامل کرنے اور ان پر حکومت قائم رکھنے کی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔ معاشی قومیت کا ایک پہلو معاشی سامراج ہے۔ چنانچہ گذشتہ جنگ عظیم کے موقعہ پر آگسٹ مولر جیسے اشتراکیوں نے بھی اس بات پر زور دیا تھا کہ جرمنی کو وسیع نوآبادیات کی ضرورت ہے تاکہ جرمنی ان ضروری خام اشیاء کو جو جرمنی میں نہیں پیدا ہوتیں خود اپنے ریاستی حدود کے اندر ہی حاصل کرسکے۔

برطانیہ نے بھی خود اپنے سامراجی نظام کے حدود میں اسی اصول کی پابندی کی ہے اور فرانس کا نوآبادیاتی طرز عمل بھی اسی پر قائم ہے۔ بڑے پیمانہ کی صنعت اور مالی نظام کی مدد سے

ریاست قومی جوش و خروش اور حب الوطنی کے جذبات کو کام میں لاکر قومیت اور شہنشاہیت کو برابر سطح پر لا کھڑا کرتی ہے۔ اس خاص مقام پر قومیت کا مسئلہ نسل اور مخصوص طور پر رنگ کے مسائل کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس کے بعد سامراج کی تمام مختلف شکلیں سامنے آنے لگتی ہیں۔

قومیت کی نفسیات

قومیت نے اکثر علیحدگی، غرور اور ظلم و جور کے میلانات پیدا کئے ہیں۔ نشلے نے امن قائم رکھنے کے لیے ایک بین الاقوامی تنظیم کی اسکیم پیش کی تھی۔ اس کے نزدیک قومیت ایک ازلی، مقدس اور ابدی نظریہ ہے لیکن اس کے باوجود اس کا خیال تھا کہ قومیت کے پیچھے غرور ایک لازمی جذبہ ہے۔ یہاں تک کہ سیریؔ نے بھی عالمگیر اخوت کے اصول پر حملہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ساری دنیا کے لوگوں سے محبت کرنا غیر ممکن ہے۔ بعض مدبرین نے تو قومیت کے انتہا پسند نظریہ کی حمایت کی ہے۔ مثلاً "وان بلو" نے اپنے ملک یعنی پولینڈ کے طرز عمل کی موافقت میں ایک بار کہا کہ "قوموں کے باہمی جدوجہد اور کشمکش کے دوران میں کوئی فاتح ہے۔ تو کوئی مفتوح۔ یہ زندگی اور عروج کا ایک قانون ہے کہ جب دو تمدن ملتے ہیں تو وہ برتری حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے سرد آزما ہو جاتے ہیں۔"

اخلاقی دوہراپن

نسلوں اور قوموں کے موجودہ تعلقات کی دنیا میں اجتماعی اخلاق کے مختلف، درشت اور معیار قائم ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تعلقات سیاسی خود غرضی، اور علیحدگی کی بنیاد پر کھڑے ہیں۔ یہ اخلاقی دوہراپن اس وقت پیدا ہوتا ہے جب لوگ خود اپنی جماعت سے وفاداری کا ثبوت تو دیتے ہیں لیکن دوسری زیادہ بڑی جماعتوں سے اپنی وفاداری اور ہمدردی کے جذبات کو ملاتے نہیں جا سکتے۔ یہ اخلاقی دوہراپن اس وقت اور بھی شدید صورت اختیار کر لیتا ہے جب اپنے اپنے خاندان، گاؤں، پیشہ، ذات یا طبقہ سے لوگوں کی جذباتی وابستگی حد سے تجاوز کرنے لگتی ہے چنانچہ ایک جماعت، پیشہ، گاؤں یا طبقہ کے لوگ دوسرے پیشوں یا طبقوں سے اس طرح اپنا برتاؤ اور رویہ بدل دیتے ہیں کہ اگر یہ بات بہت عام نہ ہوتی تو ہم اس تبدیلی کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے۔ جماعتی تعلقات کی دنیا میں "لشکریت" نے اس اخلاقی "دوہراپن" کو ایک اصول کا درجہ اور اہمیت دے رکھا ہے۔ چنانچہ ریاست کا خارجی طرز عمل "لشکریت" کے بل بوتے پر اسی "اخلاقی دوہراپن" کی پابندی کرتا ہے۔ اور علم سیاسیات نے نہ صرف یہ کہ اس صورت حال کو تسلیم کیا ہے بلکہ بعض اوقات تائید بھی کی ہے اس صورت حال کو "عقل سیاست" کا لقب دیا گیا ہے۔

"عقل سیاست"

مہابھارت میں خطرناک اور نازک صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے قتل عام، دھوکہ اور فریب اور دروغ گوئی کو "عقل سیاست" کے عین مطابق قرار دیا گیا ہے۔ کوٹلیہ نے اپنے ارتھ شاستر میں اور دوسرے ہندو مفکرین نے بھی ریاستوں کے باہمی تعلقات سے بحث کرتے ہوئے ان اصولوں کے جواز اور اہمیت پر زور دیا ہے جو یکساں سیاسی حالات یکساں طرز عمل اور اصولوں کو جنم دیتے ہیں۔ چنانچہ شیخ سعدی کے گلستان اور دوسرے ایرانی مفکرین کی تصانیف میں بھی ان اصولوں کی جھلک ملتی ہے یورپ میں بھی یہی حال ہے۔ یورپ میں بین الریاستی اخلاق کا پایہ عام طور سے بہت گرا ہوا ہے۔ اور اس کا غیر مناسب ردعمل بعض اوقات ریاستوں کی اندرونی سیاست کے سبب و لہجہ میں بھی نظر آتا ہے۔ علم سیاست کے پدر اعظم ارسطو نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ہمیشہ "اچھا آدمی ہو" اور "اچھا شہری" ہونا ایک ہی بات نہیں ہے۔ سولھویں صدی کے اطالوی مفکر اعظم میکاولی نے "عقل سیاست" کو ایک ضابطہ اور ایک نظام کا درجہ عطا کیا ہے چنانچہ اس کا خیال ہے۔ کہ جب ریاست کا تحفظ خطرے میں ہو تو انصاف اور بے انصافی، ظلم اور کرم، شاندار اور شرمناک چیزوں اور طرز عمل کے درمیان تمیز کرنا حماقت ہے۔ ہوریس والپول HORACE WALPOLE بھی اسی طرح کہتا ہے کہ کسی بھی بڑے ملک کو "نیک لوگ" نہیں بچا سکتے ہیں کیونکہ "نیک لوگ" اس حد تک نہیں جا سکتے جس حد تک جانا ملک کے تحفظ کے لیے ضروری ہے

انسانی تعلقات کی یہی وہ خصوصیت ہے جو نسلوں اور

قوموں کے باہمی تعلقات پر اپنی رنگ آمیزی کررہی ہے اور جس نے ایک صحیح معنوں میں اخلاقی طرز عمل کے تمام سرچشموں کو زہر آلود کردیا ہے پروفیسر ہابہاؤس (HOBHOUSE) کہتا ہے "کمزور قوموں سے تعلقات کے سلسلے میں ہم ایک ایسی فضا میں سانس لیتے ہیں۔ جہاں دل خوش کن اور شاندار اصطلاحوں کے پردے میں بے ایمانی اور فریب کاری کا راج ہے۔ اگر لوگ مساوات کا لفظ زبان پر لاتے ہیں تو د۔ اصل ان کا مطلب ہوتا ہے کہ انصاف کے پردہ میں کمزور اقوام پر ظلم کرو جب وہ کسی کمزور قوم سے سرپرستی کا وعدہ کرتے ہیں۔ تو اس سے مراد ایسی قسم کی سرپرستی ہوتی ہے جو آدمی کسی "تیار مرغے" کے ساتھ روا رکھتا ہے"۔

لیکن بعض اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ شاندار اور خوش کن الفاظ واصطلاحات کا یہ نازک سا رنگین پردہ بھی چاک کر دیا جاتا ہے۔ اور یورپ کے مدبرین صاف صاف لفظوں میں اپنے حقیقی ارادوں کا اعلان کر دیتے ہیں۔ ایک جرمن مفکر کہتا ہے کہ "وہ مورخ بڑا احمق ہوگا جو افریقہ یا مشرق میں یورپ والوں کے طرز عمل کو خود یورپ کے اصولوں اور معیاروں پر جانچنے کی کوشش کرے گا۔ اس لئے کہ یورپ والوں نے افریقہ اور ایشیا میں اپنے تحفظ کے لیے جو۔ و تشدد کا استعمال جائز رکھا ہے سعید خام سبیں افریقہ میں رہے اور اپنی حکومت قائم رکھنے کے لئے تمام طریقوں سے استعمال برتی ہوئی ہیں۔ اور اس سلسلہ میں انسانی حقوق اور اس قبیل کے دوسرے اخلاقی تصریحے ان کا راستہ نہیں روک سکتے۔ چنانچہ کیپلنگ کہتا ہے کہ سوئز سے آگے بائبل کے "دس احکام" کی گنجائش نہیں ہے۔ رنگ کے اختلاف کے علاوہ قومی اختلافات بھی ہیں (NATIONALISTIT) قومیانہ طرز عمل[1] اخلاقی "زہراین" کو جنم دیتا ہے اور اس کی جھلک ہمیں اب بھی ملتی ہے۔

[1] NATIONAL کا ترجمہ قومی ہے اس لیے NATIONALISTIC کا ترجمہ قومیانہ موزوں ہے جس سے ذم کا پہلو واضح ہوتا ہے۔

قرونِ وسطیٰ میں ہندوستان کی قوموں کے ارتقاء کا ابتدائی دور

از جناب سید نورالحسن صاحب لکچرار شعبۂ تاریخ لکھنؤ یونیورسٹی

ہندوستان میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ تاریخی اعتبار سے ہمارا ملک ایک قومی وحدت ہے ہمالہ سے لے کر راس کماری تک ایک ہی قوم بستی ہے جسے ہندوستانی قوم کہتے ہیں، اس کی قومی زبان ایک ہے جسے ہندوستانی زبان کہہ سکتے ہیں۔ اس تصور کا تاریخی سبب ظاہر ہے۔ جب ہمارے ملک پر برطانوی شہنشاہیت کا راج قائم ہوگیا۔ تو اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ اس غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف سارے ملک کا ایک متحدہ محاذ بنایا جائے ان بیرونی حکمرانوں کے مقابلے میں اپنے اتحاد کو ظاہر کرنے کے لئے ہم سمجھنے لگے کہ ہم سب تاریخی اعتبار سے ایک ہی قوم سے متعلق ہیں

ہندوستانی تاریخ کے اس عمومی نظریہ سے کچھ مختلف نظریہ میں اس وقت آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جدید قوموں کی تعریف اسٹالین نے یوں کی ہے "کہ ایک قوم ایک علاقہ میں بسنے والے ایسے لوگوں کا اجتماعی نام ہے جو تاریخی ارتقا کی منزلیں طے کرکے ایک ہی زبان بولتے ہیں جن کی معاشی زندگی دوسرے سے وابستہ ہوچکی ہے جن میں اپنے ایک ہونے کا سیاسی احساس پیدا ہوچکا ہے۔ ان اقوام کا اظہار جن کی تہذیبی ہم آہنگی میں ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ صرف ایک زبان بولنے سے یا ایک ہی سیاسی نظام کے تحت میں آجانے سے مختلف لوگ ایک ہی قوم کے نہیں کہلانے لگتے بلکہ قومیں تاریخی ارتقا کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اگر ہم دنیا کی قوموں پر نظر ڈالیں تو یہ معلوم ہوگا کہ ایک دیس کے رہنے والے کچھ تاریخی حالات کی وجہ سے ایک دوسرے سے نزدیک آتے ہیں اور پھر معاشی ترقی کے ایک خاص دور میں منسلک ہوجاتے ہیں برطانوی یا فرانسیسی یا امریکی، جرمنی، اور اطالوی قومیں سرمایہ داری اور صنعتی ترقی کے دور میں نمودار ہوئیں۔ لیکن یہ وہ ممالک تھے۔ جہاں ایک ہی قوم کی تشکیل ہوئی۔ بعض ریاستیں ایسی بھی تھیں جہاں جاگیردارانہ نظام کے ختم ہونے کے بعد اور سرمایہ دارانہ نظام کے قیام کی وجہ سے ایک کے بجائے کئی قومیں نمودار ہوئیں۔ جیسے سلطان جو انقلاب سے پہلے کی روسی سلطنت یا آسٹریا ہنگری کی سلطنت۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ ان ملکوں پر ایک نہیں بلکہ کئی قومیں پیدا ہوئیں حالانکہ اس کا سبب یہ تھا کہ ان ریاستوں کے بسنے والے تہذیبی اعتبار سے الگ الگ راستوں پر چل رہے تھے۔ اور صنعتی معاشی نظام نے آکر ان قوموں کے مبہم وجود کو پائدار بنا دیا۔

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس کا مقابلہ فرانس یا برطانیہ سے نہیں بلکہ سلطان یا روسی سلطنت سے کیا جاسکتا ہے۔ یہاں ابھی تک ایسی معاشی ترقی نہیں ہوئی کہ یہاں کی قومیں اپنے پورے شباب پر پہنچ سکیں۔ یہ ابھی تک ارتقا کی منزلیں طے کررہی ہیں۔ اگرچہ ابتدائی صنعتی ترقی اور تحریک آزادی نے ان کے مبہم انفرادی نقوش کو نمایاں کردینے میں بہت مدد دی ہے۔

مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے قبل دسویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی معاشی بنیادیں دیہی نظام پر قائم تھیں۔ یعنی ہر ہر گاؤں مجموعی حیثیت سے ایک مکمل وحدت کہا جاسکتا تھا۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کا کوئی ایسا ربط نہ تھا کہ دونوں میں کسی اتحاد کا احساس ہوسکے۔ ان کا تعلق صرف یہی تھا کہ غالباً دونوں ایک ہی جاگیردار کی ملکیت سمجھتے تھے۔ لیکن سیاسی اعتبار سے بڑے علاقے ایک دوسرے سے مربوط نہ تھے کیونکہ سارا ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم تھا۔ جن پر کسی نہ کسی قبیلے کا سردار راج کرتا تھا۔ یہ قبیلے زیادہ تر راجپوت تھے۔

تیرھویں صدی میں جب مسلمانوں کی سلطنت قائم ہوئی تو ایک نئی صورت حال پیدا ہوگئی۔ غلام خاندان کے زمانے ہی سے شمالی ہندوستان پر ایک مرکزی حکومت کا راج قائم ہوگیا۔ ان کے

آنے سے سیاسی تفرقے کی بندشیں ٹوٹنے لگیں اور کم از کم سیاسی اعتبار سے لوگ ایک دوسرے کے زیادہ نزدیک آنے لگے۔ لیکن مسلمان اس وقت بطور ایک جدا قوم کے آئے تھے۔ ان کی ایک امتیازی شکل تھی۔ ان کا معاشی اور سیاسی نظام اور ان کی تہذیبی روایات بقیہ ہندوستان سے الگ تھیں۔ اس غیر ملک میں اپنی حکومت قائم رکھنے کے لئے مسلمانوں میں ایک انفرادی وحدت کا احساس کافی تھا۔

سارے ملک پر ایک مرکزی حکومت کی گرفت رکھنا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا اسے صوبوں میں تقسیم کرکے بڑے بڑے سرداروں کو جاگیر کے طور پر حوالے کر دیا گیا۔ ان جاگیرداروں یا صوبہ داروں کی حیثیت نیم خود مختاروں کی سی تھی۔ جب تک ان میں یہ احساس رہتا کہ مرکزی حکومت کی مدد کے بغیر ان کا برسر اقتدار رہنا ممکن نہیں وہ مرکزی حکومت کا حکم مانتے، لیکن جیسے ہی وہ اس کو محفوظ سمجھتے اور یہ محسوس کرتے کہ مرکزی حکومت ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی، وہ فوراً خود مختاری کا دعوے کر بیٹھتے۔ چنانچہ اس قسم کا پہلا دعوے بلبن کے زمانے میں بنگال کے صوبہ دار طغرل بیگ نے کیا تھا۔

ان صوبہ داروں نے محسوس کیا کہ مرکزی حکومت کے مقابلے میں اپنی طاقت کو مضبوط بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ غلامی عناصر سے ناتا جوڑا جائے۔ وہ اپنی اپنی جاگیروں پر اب غیر ملکوں کی حیثیت سے نہ تھے۔ بلکہ مرکزی حکومت کے مقابلے میں انکی طاقت کا دارومدار ہی اس بات پر تھا۔ کہ مقامی عوام کے ساتھ گہرے سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی تعلقات قائم کئے جائیں۔ ان لوگوں کو دوسری کشمکش کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلی کشمکش مرکزی حکومت سے تھی۔ دوسری کشمکش خود ان علاقوں کے پرانے حکمرانوں سے تھی۔ ان دونوں شکلوں کا کامیابی کیساتھ سامنا کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ ان علاقوں کے ہندو راجاؤں سے تعاون کیا جائے اور وہاں کے عوام کو خوش اور راضی کرکے اپنے ساتھ لایا جائے۔ ان سیاسی حالات میں دو مختلف رجحانات نے بڑی مدد دی۔ ان میں سے ایک معاشی رجحان تھا۔ اور دوسرا تہذیبی۔

جاگیردارانہ نظام نے دیہی نظام کو بے حد صدمہ پہنچایا۔ نئے نظام کے دو تین نتیجے ہمیں صاف نظر آتے ہیں۔ ایک تو یہ الگ الگ گاؤں میں منقسم عوام ایک دوسرے کے نزدیک تر ہوتے جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ راجاؤں اور ان کے ساتھ ساتھ اونچی اونچی ذات والوں کا راج اور عوام کے نقطۂ نظر سے ان کے مظالم ختم ہو جاتے ہیں اور اس کے بجائے ایک ایسی حکومت قائم ہو جاتی ہے جو عوام کے لیے غیر شعوری ہے جسے ہم (IMPREIAL) کہہ سکتے ہیں چونکہ اس پہ اسلامی نظام کی مہر ثبت تھی۔ اس لئے اس نے ذات پات کے تفرقے کو بالکل کچل دیا۔

ان سیاسی اور معاشی حالات نے الگ الگ صوبوں میں وہاں کے بسنے والوں کے سیاسی اور معاشی مفاد کو یکساں اور وابستہ کر دیا۔ اس وابستگی نے ان علاقوں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو یکجہتی کے رشتوں میں منسلک کر دیا۔ میرا یہ مطلب نہیں۔ اس زمانے ہی سے ہمیں مختلف قوموں کا وجود نظر آتا ہے بلکہ میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت علیحدہ قومی ارتقاء کا پس منظر تیار ہو گیا۔ اس چیز کا اظہار ہمیں اس زمانے کی تہذیبی تحریکوں میں نظر آتا ہے۔

دیہی علیحدگی، چھوٹے چھوٹے راجاؤں اور ان کے ساتھ ساتھ اونچی ذات کے اقتدار کے کم ہوتے ہی علیحدہ علیحدہ قبیلے کا دیوتاؤں کی پوجا کا تصور بھی دور ہوا اور عوام کا مذہب شرک کے بدلے وحدانیت میں تبدیل ہونے لگا۔ ایک خدا جو سب کا خدا ہے۔ جیسے ایک بادشاہ جو اس علاقے کے تمام لوگوں کا بادشاہ ہے۔ اس خدائے عظیم کے سامنے سب انسانوں کی برابری جیسے بادشاہ کے سامنے ٹھاکر اور امیر، برہمن اور شودر سب برابر تھے۔ کہیں پر تو اس وحدانیت کا اثر یہ ہوا کہ عوام کثیر تعداد میں مسلمان ہو گئے جیسے کہ بنگال میں۔ اور کہیں بھگتی مارگ کے پرچار کرنے والوں کے پیرو ہو گئے۔ تیرہویں صدی سے لے کر پندرہویں صدی تک ہم یہ دیکھیں گے کہ ہندوستان کے ہر ہر گوشے میں بھگتی کا پیغام پہنچانے والے پھیل رہے ہیں بنگال، مہاراشٹر، گجرات، پنجاب، اور خود وسط ہندوستان یعنی ہر صوبہ ہر جگہ ترقی پذیر مذہبی تحریک بھگتی کی تحریک ہے بھگتی کی تحریک نے اخوت انسانیت اور وحدت پر بڑا زور دیا۔ اس طرح اگر اس زمانے کی مقبول اسلامی تحریکوں پر نظر ڈالی جائے تو وہ بھی تصوف کے رنگ میں ڈوبی نظر آئیں گی یہ بات قابل غور ہے کہ اس زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے مذہبی رہنما ان ہی چیزوں پر زور دیتے رہتے ہیں جو دونوں کی

ذہنی اتحاد پیدا کرتی ہیں۔

اس ذہنی اتحاد کے ہمیں دو خاص نمونے نظر آتے ہیں ایک تو زبان اور دوسرا فن تعمیر۔ مثال کے طور پر ... وقت، بنگال اور گجرات کا ذکر کروں گا۔ بنگالی زبان ... جیسے بنگال کے ہندو اور مسلمانوں دونوں نے پروان چڑھایا۔ سچ تو یہ ہے کہ بنگالی زبان گلی کوچوں سے ترقی کر کے پہلے پہل درباروں میں جب ہی پہنچی جب مسلمان صوبہ داروں نے خود مختاری کا علم اٹھایا۔ یہی حال گجراتی زبان کا بھی ہے۔ اسی طرح فن تعمیر کو لیجئے۔ فن تعمیر میں مسلمان کچھ عربی کچھ ایرانی اور کچھ ترکی روایات اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان کی امتیاز خصوصیتیں نہیں سمجھی جاتی تھیں۔ قبہ، مینار، محراب۔ اگر ہم غلاموں اور خلجیوں کی بنائی ہوئی عمارتوں کو دیکھیں تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں اتحاد بے جوڑ چیزیں بے حد ہیں۔ مگر گجرات اور بنگال نے اپنے اپنے طور پر ایک مشترکہ فن تعمیر کو فروغ دیا۔ جامع مسجد احمد آباد یا آدینہ مسجد گوڑ کو دیکھئے۔ ان میں دو مختلف فنون کی ملاوٹ ایسی ہے جیسے شیر و شکر اور دونوں کی اپنی امتیازی شان بھی الگ ہے۔

اس پیدا ہوتے ہوئے قومی احساس کے سیاسی مظاہروں کی میں چند مثالیں پیش کروں گا۔ مثلاً ہمایوں کی پہلی بادشاہت میں مرزا عسکری کا گجرات پہنچ کر یہ احساس کہ اگر مغل گجرات میں ایک آزاد حکومت قائم کریں تو وہ دہلی کے عوام کو زیادہ پسند آئے گی۔ بہ نسبت اس کے کہ گجرات کا صوبہ دار ان کا حاکم ہو۔ یا پھر ہمایوں کی دوسری بادشاہت کی اس تجویز کو لیجئے جب ہمایوں مرکزی حکومت کو ختم کر کے ملک کو بارہ نیم خود مختار ریاستوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے اور یہ غور کرتا ہے کہ وہ خود باری باری ہر ریاست میں کچھ دن قیام کرے یا پھر اس مشکل کو دیکھئے جو شیر شاہ اور اکبر دونوں کو بنگال اور گجرات کے فتح کرنے میں پیش آئی تھی۔

اکبر کا زمانہ ایسا تھا جس میں تجارت کو بے حد فروغ ہوا اور تجارتی سرمایہ داری نے جاگیرداری نظام پر وار کیا۔ جیسا کہ ایک عالمگیر منظر ہے تجارتی سرمایہ نقدی قدروں کو عروج دیتا ہے اور معاشی نظام کو ہمہ گیری کے راستے پر لگا دیتا ہے

اکبر نے یہ کوشش کی کہ مختلف صوبوں میں ہندوں اور مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے ارتباط کو زیادہ مکمل بنائے اور اسے سارے ہندوستان کے تہذیبی اور سیاسی اتحاد میں تبدیل کر دے۔ دوسرے یہ کہ مغل سلطنت کسی ایک قوم کی ملکیت ہو کر نہ رہ جائے۔ چنانچہ ایک طرف تو اکبر نے راجپوتوں، ایرانیوں وغیرہ کو مغلوں اور تورانیوں کا ہم پلہ بنایا۔ دوسرے صوبجاتی نظام ایسا قائم کیا جس میں صوبجاتی قوموں کو ترقی کا موقع ملا۔

اکبر کے زمانے ہی سے دو ایسی تحریکیں شروع ہو گئیں جو ایک دوسرے کی ضد تھیں یعنی ایک طرف تو تجارتی سرمایہ داری اکبر کی سلطنت کے امن اور صوبجاتی انتظام کی وجہ سے مختلف علاقوں میں قومیت کا دبا ہوا احساس ابھر آیا۔ دوسری طرف بعض ایسے غیر ملکی اور ہندوستانی مسلمان جو سمجھتے تھے کہ اصل طاقت کہیں ان کے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ ان اسلامی رجحانات کو بڑھانے لگے جو مسلمانوں کو بقیہ لوگوں سے الگ کر دیں۔ سیاسی طور پر یہ جدوجہد سلیم اور خسرو، دارا اور اورنگ زیب کی جدوجہد تھی، راجپوتوں اور مسلمان امرا کی کش مکش تھی۔ اس جدوجہد میں اس قسم کے مسلمانوں کو کامیابی ہوئی۔ تہذیبی اعتبار سے اس کا اظہار مجدد الف ثانی کی تحریک میں ہوا جن کا مقصد یہ تھا کہ تصوف کو سنت اسلام سے نزدیک تر لایا جائے۔

اس طرح کے مسلمان امرا کے عروج کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ اسلام کے نام پر انہوں نے یہ کوشش کی کہ مرکزی حکومت کا تسلط بقیہ قوموں پر جمایا جائے۔ اکبری عہد کے حالات نے صوبائی قوموں کو ترقی کا موقع دے کر خود مغل سلطنت کے عروج کے منافی رجحانات پیدا کر دیئے تھے۔ ایک حد تک ترقی کرنے کے بعد علیحدہ قوموں کی ترقی اسی صورت میں ہو سکتی تھی۔ جب کہ مرکزی حکومت کی طاقت کم کی جائے۔ اور خود مغل سلطنت کی بقا اس میں تھی کہ مختلف قوموں کی ترقی کو روکا جائے۔ چنانچہ ہندوستان کی ان مختلف قوموں میں اور مغل حکومت میں کش مکش تاریخی عوامل کا ایک لازمی نتیجہ تھی۔ یہ کشمکش ہمہ گیر تھی۔ چونکہ مغل حکومت کی خود مختارانہ روش کے خلاف مغل حکومت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے اکثر جگہوں پر ان قوموں کی جدوجہد جن میں ہندوں کی بہت بڑی اکثریت تھی۔ ہندو مذہبی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ بات قابل غور ہے۔ کہ اورنگ زیب کے زمانے میں مغل حکومت

کو افراد سے نہیں بلکہ قوموں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ جیسے راجپوت، مرہٹہ، سکھ، بندیلہ، جاٹ، بنگالی وغیرہ۔ اورنگ زیب کو شخصی حیثیت سے مغل سلطنت کے زوال کا ذمہ دار قرار دینا تاریخی ارتقار کو نظرانداز کرنا ہے۔ مغل ریاست اس لیے منتشر ہوئی کہ بہت سی قومیں آزادی کے لیے سر اٹھا رہی تھیں اور ان کی ترقی خود مغل سلطنت کے پیدا کئے ہوئے حالات میں ہوئی تھی۔

یہ صحیح ہے کہ ان میں سے کچھ قومیں ترقی کی اہلیت رکھتی تھیں اس لیے صنعتی ترقی اور قومی آزادی کی تحریک کی وجہ سے بہت آگے بڑھ گئیں۔ بعض قومیں معاشی بدحالی کی وجہ سے ماند پڑ گئیں اور غالباً حالات سازگار ہونے پر پھر آگے بڑھیں گی۔ ہماری آزادی کی تحریک اور ترقی کا دار و مدار اسی پر ہونا چاہیے کہ ہمارے ملک کی تمام قومیں ترقی کر کے اپنا مکمل نشو و نما کر سکیں۔

تقریر ... ہندوستانی تعلیم صفحہ ۱۳ (... کے مضمون کا حصہ ہے) ... قومی اور حکمراں ... سست عوامی تصویر ... مگر کسی خلا میں نہیں ہو سکتا ... زندگی اور اقتصادی ... ایک انقلاب کی ضرورت ہے ... یہ قومی زندگی کے ساتھ منسلک ہے۔ میرا یقین ہے کہ ہندوستان کا تعلیمی مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا جب تک اس کے سیاسی مسئلہ کا حل اطمینان بخش طریقہ پر ہو۔ یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب ہندوستان سیاسی حیثیت سے آزاد ہو اور مملکت جس کی طرح ہندوستان کی معاشرتی اور اقتصادی زندگی عدل و انصاف کے اصولوں پر قائم ہو فطرتی بنیاد ...

ہندوستان میں کتنے کارخانے ہیں

کارخانوں کی قسم	کارخانوں کی تعداد	مزدوروں کی تعداد
(۱) سوت اور کپڑے کی ملیں	۴۲۳	۵۶۶۰۰۰
(۲) جوٹ ملیں	۱۰۵	۳۰۹۰۰۰
(۳) روئی دھننے وغیرہ کی ملیں	۲۵۲۶	۱۸۲۰۰۰
(۴) چینی کے کارخانے	۱۷۵	۷۹۰۰۰
(۵) چاول کی ملیں	۱۰۰۹	۴۴۰۰۰
(۶) چائے کے کارخانے	۹۹۱	۶۷۰۰۰
(۷) سگریٹ کی فیکٹریاں	۳۰	۱۱۰۰۰
(۸) جوتے وغیرہ اور چمڑے کا دوسرا سامان	۵۱	۱۲۰۰
(۹) اونی کپڑے کی ملیں	۱۸	۱۳۰۰۰
(۱۰) سلک کی ملیں	۲۹	۷۰۰۰

ابتدائی تعلیم

از جناب خواجہ غلام السیدین

ہندوستان کی سرزمین ہر زمانہ میں علم و ہنر کا گہوارہ رہی ہے۔ زندگی کے تمام طبقات میں عالموں کے طبقہ کو سب سے زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ قدیم ہندوستان میں تعلیم اور مذہب کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور اس لئے تعلیم کو نہ صرف دنیاوی حیثیت بلکہ مذہبی حیثیت بھی حاصل تھی، مسلمانوں کے عہد حکومت میں بھی علم اور مذہب کی وابستگی قائم رہی اور تعلیم صرف روزی کمانے کا ذریعہ نہ تھی، اساتذہ محنت اور شوق سے تعلیم دیتے تھے اور طلبا علم کو اپنی تہذیب و شرافت کا معیار سمجھتے تھے۔ اس زمانہ میں امتحانات پاس کرنے اور استاد کو ذریعہ معاش بنانے کا رواج معدوم تھا۔ دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی یہ رواج بہت زمانہ کے بعد ظہور میں آیا، گذشتہ دور میں اکثر امرا درسگاہیں قائم کرتے تھے اور مدرسوں کو شاہی سرپرستی بھی حاصل تھی، چونکہ اس زمانہ کے اعداد و شمار کا ملنا محال ہے اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ ابتدائی تعلیم کے لئے کونسی سہولتیں مہیا تھیں لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے زریں عہد میں دنیاوی اور دینی تعلیم کی درسگاہوں سے لوگ فیض حاصل کرتے تھے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے پہلے ہندوستان کی تعلیمی حالت کیا تھی۔ وہ لوگ جو برطانوی عہد کی افادیت کو زیادہ اہمیت دینا چاہتے ہیں، یہ کہتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمرانی کے پہلے ہندوستان کی تعلیمی فضا پر بالکل تاریکی چھائی ہوئی تھی، لیکن مفکرین کا ایک گروہ جس میں ڈاکٹر LEITNER (پنجاب کے ڈائرکٹر محکمۂ تعلیمات) اور KEIN HARGHI شامل ہیں یہ کہتا ہے کہ اس وقت بھی ملک کے طول و عرض میں درسگاہوں کی کثرت تھی اور علم کا چرچا آج کل کے زمانہ سے کہیں زیادہ تھا KIRI HARDIE نے MAK MULLER کی سند پر کہا ہے کہ صرف بنگال میں اسی ہزار درسگاہیں تھیں یعنی ہر چار سو شخصوں کے لئے ایک درسگاہ کا اوسط نکلتا ہے، اور یہ بھی کہا ہے کہ اکثر دیہاتوں میں اکثر لوگ لکھنا اور پڑھنا جانتے تھے، پرانے نظام تعلیم کے ختم ہونے کے بعد دیہات کی درسگاہیں بھی ٹوٹ گئیں اور دیہاتوں میں علم کا وہ بول بالا نہ رہا، ان دو متضاد خیالات کا صحیح تجزیہ مشکل ہے مگر شواہد کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگریزوں کے آنے کے پہلے ہندوستان میں علم کی روشنی سے لوگ کافی طور پر بہرہ ور تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں ابتدائی تعلیم پر کوئی توجہ نہیں دی گئی، کچھ انگریزوں مثلاً CHARLES GRANT اور WITHRFORCE کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان میں تعلیمی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں، ان کا خیال تھا کہ تعلیم امن عامہ کے لئے مفید ہے اس لیے کہ جاہل عوام الناس سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے متاثر ہو جائیں گے CHARLES CRANT نے ۱۷۹۸ء میں ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ انگریزی تعلیم ان توہمات کو دور کرے گی جو ہندوستانیوں کے فلسفہ اور مذہب سے وابستہ ہیں اور اس طرح مغربی تہذیب کی قومیت اور برتری کا احساس پیدا ہوگا۔ لارڈ میکالے کے دماغ میں بھی یہی خیال جو تنگ نظری اور کبر و ناز کا نتیجہ تھا۔ کارفرما تھا۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ جب ولبرفورس نے ۱۷۹۳ء میں پارلیمنٹ میں ایک بل پیش کی کہ عیسائی مشنری اور اساتذہ ہندوستان بھیجے جائیں تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے اس کی مخالفت کی۔ ان کا خیال تھا کہ تعلیم کے بعد ہندوستان میں سیاسی بیداری کے آثار نمایاں ہوں گے اور امریکی نو آبادیات کا تلخ تجربہ اٹھانا پڑے گا۔ جوں ہی زمانہ گزرتا گیا ہندوستان کے حکمرانوں کو یہ احساس پیدا ہوا کہ حکومت تعلیم کی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

۱۸۱۳ء کے بجٹ میں تعلیمی اغراض کے لئے ایک لاکھ روپیہ کی منظوری عمل میں آئی مگر دس سالوں تک یہ رقم صرف نہیں

کی گئی۔ ۱۸۲۲ء میں ہر سال دو تین لاکھ روپے تعلیم پر خرچ کیے گئے لیکن یہ خرچ ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کی آبادی کے لیے کافی نہ تھا۔ ۱۸۵۴ء کے EDVIATICN DESPATCH نے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی۔ اس کی سفارشات کے مطابق حکومت پر ابتدائی تعلیم کی ذمہ داری عائد کی گئی اور غیر سرکاری درسگاہوں کو مالی اعانت دی گئی لیکن ان تجاویز سے کوئی زیادہ فائدہ نہ ہوا اس لیے کہ مسئلہ تعلیم کی اہمیت کے اعتبار سے رقم ناکافی تھی۔ اس زمانہ کی حکومت اور ہندوستان کے بعض لیڈروں مثلاً سر سید احمد خاں کا یہ خیال تھا کہ اعلیٰ تعلیم اور اونچے طبقات کی تعلیم پر توجہ دی جائے اور اس طرح اونچے طبقہ والوں میں عوام الناس کی تعلیم کا احساس پیدا ہوگا۔ اور وہ اس کا سامان کریں گے۔ مگر حالات کی ناسازگاری کے باعث یہ نظریہ مفید ثابت نہ ہوا۔

۱۸۸۲ء میں HUNTER COMMN. نے تجویز کیا کہ حکومت ابتدائی تعلیم کے مسئلہ پر پہلے سے زیادہ توجہ دے میونسپل بورڈوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کو حکم دیا گیا کہ ابتدائی تعلیم پر روپیہ صرف کریں۔ غیر سرکاری درسگاہوں کو نتیجہ کی رو سے مالی اعانت دی گئی۔ لیکن ان تجاویز پر بھی پوری طرح عمل درآمد نہ ہوا

بیسویں صدی کے آغاز میں تمام دنیا میں تعلیم کا احساس تیز ہو رہا تھا۔ لیکن ہندوستان میں ابھی تک سست گامی پر عمل تھا ۱۹۰۴ء میں لارڈ کرزن کی وائسرائیلٹی کے عہد میں مرکزی حکومت نے ایک رزولیوشن کے ذریعہ اعلان کیا کہ "ابتدائی تعلیم کا پھیلانا حکومت کے اہم فرائض میں ہے"۔ چنانچہ مرکزی حکومت نے تمام صوبوں کی تعلیمی ضروریات کے لیے مالی اعانت کو چالیس لاکھ سے ستر لاکھ کر دیا۔ لیکن یہ رقم بھی ملک کی ضروریات کے لحاظ سے کافی نہ تھی۔ اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ۱۹۰۶ء میں ایک کروڑ اسی لاکھ اسکول جانے کے لائق لڑکوں میں سے صرف ۳۶ لاکھ لڑکے اسکولوں میں تھے یعنی سیکڑہ میں ۸۰ لڑکے کسی اسکول میں نہ تھے۔ اور اسکول میں رہنا بھی تعلیم کے مترادف نہ تھا۔ لڑکیوں کی تعلیم کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔

ابتدائی جبریہ تعلیم کے لئے سب سے پہلے مسٹر جی کے گوکھلے نے آواز بلند کی۔ ۱۹۱۰ء میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں انہوں نے اس کے لئے تجویز پیش کی اور دوسرے سال ابتدائی جبریہ تعلیم کا بل پیش کیا، دوران تقریر میں مسٹر گوکھلے نے کہا۔

"حکومت نے اپنے اوپر یہ فرض عائد کیا ہے کہ عوام الناس کو تعلیم دی جائے لیکن ہم لوگ ساٹھ سالوں سے جس رفتار سے چل رہے ہیں وہ بہت مایوس کن ہے ... گذشتہ دس سالوں سے اس رفتار میں کچھ تیزی ہوئی ہے مگر اس رفتار سے بھی ایک طویل مدت کے بعد ہر لڑکا اور ہر لڑکی کسی درسگاہ میں تعلیم پا سکیں گے۔ ملک کی آبادی میں جو اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کو ہم نے نظرانداز کیا ہے۔ ہندوستان کو دوسرے مہذب ملکوں کی مثال اور ان کے تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ دوسرے مہذب ممالک اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ تعلیم کی ہمہ گیری کے لئے حکومت کو جبر کی پالیسی اختیار کرنی چاہئے ... اس پالیسی کو شروع کر دینے سے لوگ جبر کے عادی ہو جائیں گے اور بیس سالوں میں ملک کے اندر ہمہ گیر تعلیم کا نظام جاری ہو جائے گا۔

لیکن تعجب بالائے تعجب! تمام سرکاری ممبروں اور بعض غیر سرکاری ممبروں نے اس بل کی مخالفت کی، ۳۱ ممبروں نے موافقت کی، مخالفین نے یہ دلیل پیش کی کہ جبریہ تعلیم کے لیے عوام نے مطالبہ نہیں کیا۔ صوبائی حکومتوں نے اس کی موافقت نہیں کی ہے، تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کا محدود گروہ اس کی مخالفت کرتا ہے۔ اور ابتدائی تعلیم لوگوں کی رضامندی سے بھی دی جا سکتی ہے

۱۹۱۳ء میں حکومت نے پھر ایک رزولیوشن کا اجرا کیا جس میں چند مفید چیزیں تھیں۔ ابتدائی تعلیم کا ذریعہ لوکل بورڈوں کو بنایا گیا اور غیر سرکاری مدارس کو مالی اعانت دی گئی، حکومت اب تک براہ راست ابتدائی تعلیم کی ذمہ داری اپنے اوپر لینے کو تیار نہ تھی۔

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد ۱۹۱۹ء کے اصلاحات کی رو سے صوبائی حکومتوں نے ابتدائی تعلیم کے لئے قوانین پاس کئے ان قوانین کے ماتحت میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کو حق دیا گیا کہ اگر وہ چاہیں تو حکومت کی منظوری حاصل کر کے چھ سال سے لے کر دس سال کے طلبہ کے لیے جبریہ ابتدائی تعلیم نافذ کریں۔ بعض صوبوں میں یہ تعلیم مفت دی گئی لیکن بعض صوبوں مثلاً بنگال

ں عام طور پر یہ تعلیم مفت قرار نہیں دی گئی، جبریہ تعلیم کی ذمہ داری ڈسٹرکٹ بورڈ پر عائد کی گئی جن کے پاس ناکافی سرمایہ تھا اور جہاں عزم و حوصلہ کی بھی کمی تھی۔ ظاہر ہے کہ عوام کی تعلیم کا مسئلہ اب بھی لاینحل رہا۔

ہندوستان کی ابتدائی تعلیم کے مسئلہ پر غور کرنے سے اس کی وسعت کا احساس ہوتا ہے، اس ملک میں اب چالیس کروڑ نفوس کی آبادی ہے۔ گذشتہ سالوں میں کافی سرمایہ اس پر صرف کیا گیا ہے اور کافی توجہ دی گئی ہے مگر اس پر بھی یہ مسئلہ کے حل کا صرف آغاز ہے۔ اس وقت سکول جانے کے لائق طلبہ اور طالبات میں سے صرف چودہ فی صدی زیر تعلیم ہیں اور حرف شناسی کا اندازہ لگانے میں یہ تعداد بھی شاید معتبر نہیں، ابتدائی اسکولوں میں طلبہ میں سے ۲۶ فی صدی اور طالبات میں سے صرف تیرہ فی صدی کلاس چہارم میں پہنچتی ہیں، بنگال کے ابتدائی اسکولوں کے حسب ذیل شمار و اعداد سے معلوم ہوگا کہ حالت کیا ہے۔

بچوں کا کلاس	پہلا کلاس	دوسرا کلاس	تیسرا کلاس	چوتھا کلاس
۲۱	۶۰۵	۲۵	۲۰۵	۱۰۵

اس کے معنی یہ ہوئے کہ کل سات فی صدی چوتھے کلاس تک پہنچتے ہیں۔ گویا تعلیمی مشینری ایک ایسی انجن ہے جس کی سو گھوڑوں کی طاقت ہے مگر اس کی کارگردگی کل ۷ فی صدی غرضکہ تعلیم پر جو سرمایہ خرچ ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ بہت زیادہ مفید نہیں تعلیمی اصلاحات کی کوئی اسکیم مفید نہیں ہوسکتی جب تک کوئی انقلاب انگیز قدم نہ اٹھایا جائے اگرچہ حرف شناسوں کی تعداد آہستہ آہستہ ترقی پر ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ ملک کی آبادی بھی بڑھ رہی ہے ۱۹۳۱ء میں یہ ۳۰۵ فی صدی تھی، ۱۹۴۱ء میں یہ ۹ فی صدی ہوگئی تھی اور اس مایوس کن ترقی کے حساب سے شاید ایک ہزار سال کے بعد تعلیم سو فیصدی ہو۔

تعلیمی اخراجات کا معاملہ بھی حوصلہ افزا نہیں، موجودہ شمار و اعداد کے لحاظ سے تمام ذرائع سے ہم نو کروڑ روپیہ تعلیم پر خرچ کررہے ہیں لیکن نہایت معتدل اندازہ کیلئے ۲۰۰ کروڑ روپیوں کی ضرورت ہوگی اور اس تخمینہ میں اسکول کی عمارتوں اور ان کے ساز و سامان کا حساب شامل نہیں ہے یہ تخمینہ اس حساب پر لگایا گیا ہے کہ ہر لڑکے پر آٹھ روپیہ اور ہر لڑکی پر دس روپیہ خرچ کیا جائے۔ حالانکہ ترقی یافتہ ملکوں میں یہ خرچ بہت زیادہ ہے۔

ابتدائی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہوسکتا جب تک کہ ان شمار و اعداد پر توجہ نہ دی جائے۔ ابھی تک ہندوستان کی تعلیمی پالیسی دوراندیشی اور قوت تخیلہ سے مبرا رہی ہے، اس کا واحد علاج یہ ہے کہ تمام ملک میں تعلیم کے لیے ایک سرگرم جہاد ہو۔ انگلستان میں جو تعلیمی پالیسی آج سے ۷۵ سال پہلے تھی آج ہندوستان میں وہی معیار ہے اور جبریہ تعلیم بھی تک ایک ایسا خواب ہے جو شرمندہ تعبیر نہیں ہوا ہے۔

اب یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ بغیر جبریہ تعلیم مسئلہ کا حل نہیں ہوسکتا۔ سر جارج اینڈرسن SIR GEORGE ANDERSON نے پنجاب میں تعلیم کی ترقی کی رپورٹ ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۷ء میں یہ کہا ہے کہ بغیر جبریہ تعلیم کے مفید نتائج حاصل نہیں ہوسکتے اور جہاں تک جلد ہو اس کا نفاذ کیا جائے۔

جبریہ تعلیم کو کامیاب بنانے کے لئے ضروری ہے کہ یہ تعلیم مفت بھی ہو۔ مجھے ان لوگوں پر تعجب آتا ہے جو اس خیال کی مخالفت کرتے ہیں۔ جب کہ دنیا کے دولت مند ممالک مثلاً انگلستان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں عام تعلیم نہ صرف مفت ہے۔ بلکہ اور دوسری سہولتیں بھی حاصل ہیں مثلاً ان کو بچوں کو مفت کھانا ملتا ہے۔ علاج مفت ہوتا ہے اور وظیفے بھی ملتے ہیں۔ اور بعض حالات میں والدین کو بھی وظیفے ملتے ہیں۔

اگر تعلیم کو مملکت کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے تو پھر اس کے لیے سرمایہ کا حاصل کرنا لازمی ہے، اگر تعلیمی اور ثقافتی کاموں کو اتنا ہی ضروری سمجھا جائے جتنا کہ جنگی مصارف کو یا ملازمتوں کو تو پھر کسی صورت سے سرمایہ کی فراہمی ناگزیر ہے۔ اگر اس کا احساس نہ ہو تو پھر ہمیشہ مفت جبریہ تعلیم کو ٹالنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ہاتھ آجائیگا

یہ مسئلہ موجب تنازع ہے کہ ناقص تعلیم کسی تعلیم کے نہ ہونے سے بہتر ہے یا نہیں۔ پرانے فرسودہ مضامین کی جو تعلیم دی جاتی ہے وہ نہ تو بچوں کی نفسیات کے مطابق ہے اور نہ قومی زندگی کی ضروریات کے موافق ہے، تعلیم کا مستقبل اپنے مایوس کن ماضی سے بہتر اور شاندار نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ نصاب تعلیم کو از سر نو مرتب نہ کیا جائے اور ابتدائی تعلیم کے طریقوں اور اس کی فضا کو

نہ بدلا جائے۔ اگر ابتدائی اسکولوں میں زندگی کی بھرپور لہر نہ ہوگی تو پورا تعلیمی نظام ناقص ہوگا۔

طریقۂ تعلیم کے نظام کی تعمیر کن اصولوں پر ہو؟

پہلی چیز یہ ہے کہ نظریات اور عملیات میں امتزاج پیدا کیا جائے۔ زندگی کی بنیاد عملیات پر ہے اور اسکول میں صرف کتابوں کا علم پڑھایا جاتا ہے جب اسکول میں داخل ہوتا ہے تو اپنی گھریلو زندگی اور اسکول کی زندگی میں ایک عجیب تغیر پاتا ہے۔ بچہ اسکول میں نظریاتی اصولوں پر عمل درآمد ہوگا۔ یہ ایسے اسکول کی تعلیم زندگی کی عملیات کے مطابق نہیں۔

ایک دیہاتی لڑکا جو اپنی روزی زراعت سے کمائے گا۔ اس کے لئے اسکول کی تعلیم اس کے زراعتی پیشہ کی معاون نہیں ہوتی۔ ابتدائی تعلیم کا اصل مقصد یہ نہیں ہے کہ بچہ کو اس کے دیہاتی ماحول سے علیحدہ کر دیا جائے بلکہ غرض یہ ہونی چاہئے کہ وہ اپنے پیشہ اور اپنی زندگی میں عقل و ہوش کے ساتھ زیادہ دلچسپی لے سکے۔ ہمارے ابتدائی اسکولوں میں نظریات اور عملیات کے صحیح امتزاج کے لیے ابھی تک کافی سامان موجود نہیں۔

گزشتہ سالوں میں اسکول کی مصنوعی فضا کی اصلاح کے لیے مضامین داخل کیے گئے ہیں مثلاً صنعتی تعلیم، مطالعۂ فطرت، زراعت، تصویر کشی وغیرہ، ایسے اسکول بھی جاری کیے گئے ہیں جہاں دیہاتی چیزوں پر توجہ دی جاتی ہے۔ اور ایسی کتابیں بھی لکھی گئیں جو دیہات کے لڑکوں کی ضرورت اور دلچسپی کا لحاظ کرتی ہیں، بعض ترقی یافتہ اسکولوں نے تعلیم کے موجودہ طریقوں کے ساتھ بھی تجربہ کیا ہے، مگر ان اصلاحات نے ابھی تک کوئی انقلاب انگیز تغیر نہیں پیدا کیا ہے اس لیے کہ یہ اصلاحات ایک فرسودہ نظام تعلیم میں پیوست کئے گئے ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ تعلیم کو زندگی کے قالب میں ڈھالا جائے اس نقطۂ خیال سے BASIC NATIONAL ED. (بنیادی قومی تعلیم) جس کے ساتھ مہاتما گاندھی کا نام وابستہ ہے۔ شاید سب سے پہلی سعی خیز اور انقلابی کوشش ہے، اس نظام کے ماتحت مفت جبریہ اور ہمہ گیر تعلیم کی بنیاد ڈالی گئی ہے، یہ نظام چار یا پانچ سالوں کے کورس پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ سات برس کے سن سے لے کر چودہ سال کے سن تک سات سالوں کے کورس کی تائید کرتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ نہ صرف حرف شناسی ہو بلکہ طلبا میں زندگی کے مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ ساتھ ہی ساتھ صنعتی تعلیم کو بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہ صنعتی تعلیم طلبہ کی فضا کے مطابق ہوگی۔ استاد طلبہ کے دماغ کو اس طرح متاثر کرے گا کہ صنعتی تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ تاریخ، جغرافیہ اور سائنس سے بھی دلچسپی پیدا کریں گے، اس طرح علم کے امکانات وسیع تر ہوتے جائیں گے۔ طلبا کی خلاقی صلاحیتیں ترقی پذیر ہوں گی اور تعلیم اور زندگی میں صحیح مناسبت پیدا ہو جائیگی۔

مہاتما گاندھی کے زیر اثر ۱۹۳۸ء میں یہ نظام تعلیم امید افزا حالات میں شروع ہوا باوجودیکہ نظریات پرستوں نے اعتراض کیا اور مالی رکاوٹیں بھی سد راہ ہوئیں، اگر وہی سیاسی حالات قائم رہتے جو اس وقت موجود تھے تو اب تک کافی ترقی ہو گئی ہوتی۔ یہ نظام تعلیم ابتدائی تجربہ کی منزل سے گزر چکا ہے اور ایک حد تک لوگوں میں اس کی افادیت کا احساس پیدا ہوا ہے۔ آئندہ جو بھی نظام ہوگا وہ اس نظام کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

کیا ہندوستان میں اس نظام تعلیم یا کسی دوسرے نظام پر عمل درآمد ہو سکتا ہے، صرف کسی حوصلہ افزا نظام کا مرتب کر لینا کافی نہیں اس لئے کہ مالی اور عملی مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔ جب کہ دوسرے ممالک نے مشکلات کے باوجود عام تعلیم کے ایک منظم نظام کو کامیابی سے چلایا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہندوستان میں ایک ایسے نظام کی کامیابی نہ ہو اگر یہ تصور نہ کیا جائے کہ یہاں کے لوگ دوسری قوموں سے کمتر ہیں اور وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتے جو دوسری قوموں نے حاصل کیا ہے۔

چالیس سالوں کے عرصہ میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے (PHILLIPINES) میں حرف شناسی کے معیار کے موقع سے ۵۵ فی صدی تک ترقی دی ہے۔ ۲۰ سالوں کے اندر حکومت روس نے جہالت کے تناسب کو ۹۰ فی صدی سے ۸ فی صدی تک کم کر دیا ہے، چین اور ترکی نے مشکلات کے باوجود تعلیمی مسئلہ حل کیا ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کو کامیابی حاصل نہ ہو ضرورت اس کی ہے کہ پرجوش تعلیمی جہاد کا اعلان کیا جائے جس کے سامنے لوگوں

ہندستان کی تہذیب

از:- ڈاکٹر مہدی حسین - پی، ایچ۔ ڈی ؛ ڈی لٹ

(اس مضمون کا ایک حصہ اسی عنوان سے فروری کے "نئی زندگی" میں شائع ہو چکا ہے - (اڈیٹر)

غلام مسالک الابصار کے مصنف شہاب الدین احمد عباس نے لکھا ہے کہ جنگ میں سے سلطان محمد اس قدر قیدی گرفتار کر کے لاتا ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ دہلی میں ہزاروں عمدہ عمدہ غلام سستی قیمت پر نہ بکتے ہوں۔ ابو الصفا عمر شبلی نے ایک غلام چار درہم میں خرید ا تھا۔ مجھ سے سب راویوں نے یہی بیان کیا کہ خدمت کرنے والی لونڈی کی قیمت دہلی شہر میں آٹھ ٹنکے سے زیادہ نہیں ہے۔ اور جو لونڈیاں خانہ داری کے مطلب کی ہوتی ہیں ان کی قیمت پندرہ ٹنکے اور بعض کی بیس ٹنکے یا اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن حافظ ابن تاج ملتانی نے راوی پر اعتراض کیا اور کہا کہ جب ہندی لونڈیوں کی اتنی زیادہ قیمت ہے تو پھر وہ سستی کہاں سے ہوتیں۔ راوی نے جواب دیا کہ ان کی خوبصورتی کی وجہ سے اور بھلی عادتوں کے سبب ہر شخص خریدنے کیلئے ان پر گرتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ میں ہی خریدلوں۔ اس سبب ان کا بھاؤ تیز ہو جاتا ہے۔ ان لونڈیوں میں یہ بھی خوبی ہوتی ہے کہ اکثر پڑھی لکھی اور قرآن کی حافظ ہوتی ہیں۔ مذہب سے بھی واقف ہوتی ہیں اور حدیث سے بھی۔ سیکڑوں شعر انھیں حفظ یاد ہوتے ہیں اور حدیثیں ان کی نوک زبان ہوتی ہیں۔ وہ گانے بجانے میں یکتا ہوتی ہیں۔ اور شطرنج اور چوسر بھی خوب کھیلتی ہیں۔ اور یہ لطف ہے کہ آپس میں اپنے ہنر بیان کرتے جھگڑتی ہیں۔ ایک کہتی ہے "میں تین دن میں اپنے مالک کے دل کو مٹھی میں لیلوں" دوسری کہتی ہے "واہ یہ بھی کوئی بڑی بات ہے بہن، میں تو دو ہی دن میں اس کے دل میں گھر کرلوں"۔ تیسری کہتی ہے "اجی تمہاری بات بھی کچھ نہیں۔ میں تو گھڑی بھر میں اس کے دل پر قبضہ کروں"۔ چوتھی کہتی ہے "واہ بھئیا! یہ بھی کیا کمال ہوا مجھے تو اپنے مالک کے دل پر قبضہ کرنے میں بس اتنی دیر لگے گی جتنی کہ پلک جھپکانے میں لگتی ہے"۔

ابن بطوطہ نے لونڈیوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے مسالک الابصار کی تائید ہوتی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ جو لونڈیاں لوٹ میں آتی ہیں وہ ہندستان میں بہت سستی ملتی ہیں۔ کیونکہ وہ گندی ہوتی ہیں۔ تہذیب سے واقف نہیں ہوتیں۔ مگر یہاں سکھی لکھائی لونڈیاں بھی سستی ہوتی ہیں۔ اس لئے لوٹ کی لونڈیوں کو کوئی نہیں خریدتا۔

ہندی عورتیں مسالک الابصار میں لکھا ہے کہ عام طور سے ہندستان کی عورتوں کو ترکی اور قپچاقی عورتوں کی نسبت زیادہ حسین اور ملیح بتایا جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ حسن و ملاحت کے علاوہ بعض خوبیاں ہندی عورتوں میں ایسی ہیں جو کسی اور ملک کی عورتوں میں نہیں پائی جاتیں۔ ہندستان کی اکثر عورتیں سبزہ رنگ ہوتی ہیں اور بعض گورے رنگ کی ہوتی ہیں ان کے گورے رنگ میں سرخی جھلکا کرتی ہے۔ اور باوجودیکہ لوگوں کے پاس ترکی، قپچاقی، رومی اور ہر صنف کی عورتیں موجود ہیں مگر ان میں سے کوئی حسن و خوبی میں ہندی عورت کو نہیں پہونچتی۔ میرے نزدیک دُنیا کے کسی خطہ کی عورت ہندی عورت کے مقابلہ میں بڑھ نہیں سکتی۔ اور بڑھ سکتی ہے تو ہندی عورت سے کوئی ہندستان ہی کی عورت بڑھ سکتی ہے۔ یہ عورتیں تمام دُنیا کی عورتوں سے صرف حسن و صباحت ہی میں بڑھی ہوئی نہیں ہیں بلکہ ان میں اور بھی بے شمار خوبیاں ہیں جن کیلئے تحریر کے دامن میں گنجائش نہیں"۔

شاہی سواری مسالک الابصار میں لکھا ہے کہ سلطان محمد کی خدمت میں دس ہزار خواجہ سرا رہتے ہیں۔ ایک ہزار جہدار اور ایک ہزار ابتدار اور دو لاکھ غلام ہیں جن کے گھوڑوں پر ہتیار سجے رہتے ہیں اور وہ بادشاہ کی سواری کے ادھر

اُدھر چلتے ہیں۔ اور ان سواریوں کا سلسلہ پیادوں سے جاملتا ہے جو بادشاہ کے آگے آگے چلتے ہیں۔

شیخ مبارک کا بیان ہے کہ جب سلطان محمد سوار ہوتا ہے تو اس کے سر پر شاہی چتر لگایا جاتا ہے۔ اور جب جنگ کی غرض سے نکلتا ہے یا دُور دراز کا سفر کرتا ہے تو اس کے سر پر سات چتر لگائے جاتے ہیں۔ ان میں سے دو چتر زر و جواہر سے جڑے ہوئے ایسے ہیں جن کی کوئی قیمت نہیں ہوسکتی۔ جب بادشاہ پایہ تخت میں ہوتا ہے تو اس کے سارے ٹھاٹھ سکندر اعظم کے سے ہوتے ہیں۔ وہی آن بان اور وہی شان و شوکت۔ وہی سلطنت کے آئین، وہی دربار کے قوانین۔ . . . بادشاہ کی سواری خواہ پایہ تخت میں نکلے یا پایہ تخت سے باہر۔ سواری کے ساتھ ساتھ خان ملک اور امیر ہاتھوں میں جھنڈے لئے نکلتے ہیں۔ خانوں کی جماعت میں زیادہ سے زیادہ نو جھنڈے ہوتے ہیں۔ اور امیروں کی جماعت میں کم سے کم تین۔ بادشاہ کی سواری جب پایہ تخت میں نکلتی ہے تو خانوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ دس کوتل گھوڑے ہوتے ہیں۔ اور امیروں کے ساتھ دو کوتل گھوڑے۔ بادشاہی لشکر کے کُل افسر سفر کی حالت میں اپنا اپنا انتظام اپنی مقدرت اور ہمّت کے مطابق کرتے ہیں اور جب پایہ تخت میں پہنچتے ہیں تو ان کے خرچ سے کہیں زیادہ اُن کو شاہی خزانہ سے مل جاتا ہے۔

شکار کی سواری مسالک الابصار میں لکھا ہے کہ جب بادشاہ شکار کو جاتا ہے تو ہاتھی پر سوار ہو کر جاتا ہے۔ اس وقت اس کے ساتھ ایک لاکھ سوار سے اور دو سو ہاتھی سے زیادہ نہیں ہوتے۔ اور شاہی سواری کے ساتھ چار کوٹھی کے محل بھی آٹھ سو اونٹوں پر لدے ہوتے ہیں۔ یعنی ہر محل کو دو سو اونٹ اٹھائے ہوتے ہیں۔ ان سب محلوں پر زردوزی کا کام کئے ہوئے سیاہ ریشمی پردے پڑے ہوتے ہیں۔ ہر محل دو منزلہ ہوتا ہے۔ محلوں کے علاوہ تنبو اور ڈیرے بھی ساتھ ہوتے ہیں مگر وہ دو منزلہ نہیں ہوتے۔

ابن بطوطہ نے بھی شکار کی سواری کا حال لکھا ہے۔ اور جو کچھ لکھا ہے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر لکھا ہے بلکہ ذاتی تجربے کر لکھا ہے۔ اس لئے کہ شکار کی سواری میں بعض موقعوں پر وہ بادشاہ کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ کا ذکر اُس نے یوں کیا ہے کہ "جب بادشاہ شکار کیلئے دار الخلافہ سے باہر گئے تو میں بھی ساتھ گیا۔ میں نے سفر کی تمام ضروری چیزیں خرید لی تھیں، ایک ڈیرہ خرید لیا۔ اور ایک سائبان۔ سائبان ڈیرے کے اندر سائے کیلئے لگایا جاتا ہے۔ اور دو بڑے بانسوں پر کھڑا کیا جاتا ہے جنہیں لوگ گردنوں پر لے جاتے ہیں۔ یہ لوگ کیوانی کہلاتے ہیں۔ ان کیوانیوں کو کرایہ پر نوکر رکھ لیتا ہے۔ اور اسی طرح گھاس لانیوالوں کو، کہاروں کو، ڈولا اٹھانے والوں کو، اور دوا دیوں کو جو آگے آگے دوڑتے ہیں۔ اور رات کو مشعل لیکر چلتے ہیں نوکر رکھ لیتا ہے۔ میں نے بھی روزانہ اُجرت پر یہ سب لوگ اپنے ساتھ لے لئے تھے۔ جس روز بادشاہ کی سواری شہر سے باہر نکلی۔ اسی روز میں بھی شہر سے باہر نکل آیا۔ میرے سوا اور آدمی دو دو تین تین دن بعد آئے۔ سواری نکلنے کے دن شام کو پانچ بجے کے قریب بادشاہ نے ارادہ کیا کہ ہاتھی پر سوار ہو کر دیکھے کہ کون کون چلنے کو تیار ہے۔ اُس وقت بادشاہ اپنے ڈیرے کے باہر کُرسی پر بیٹھے تھے۔ میں نے جا کر سلام کیا اور داہنیں ہاتھ پر اپنی مقررہ جگہ کھڑا ہوگیا۔ بادشاہ نے ملک تتولہ سرجامدار کے ذریعے مجھ سے کہلا بھیجا کہ بیٹھ جاؤ۔ اتنے میں ہاتھی آپہنچا۔ سیڑھی لگا دی گئی اور بادشاہ اس ہاتھی پر سوار ہو گئے۔ اس وقت چتر لگایا گیا۔ چتر لگ چکا تو خاص خاص مصاحب بھی سوار ہو گئے دستور یہ ہے کہ جب بادشاہ سوار ہو جاتے ہیں تو ہر امیر اپنی اپنی فوج اور علم اور طبل اور نفیری اور سرنا لیکر سوار ہو جاتا ہے۔ بادشاہ کے آگے آگے فقط حاجب اور طوائف اور طبلچی اور سرنا بجانے والے ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دائیں اور بائیں طرف پندرہ پندرہ آدمی ہوتے ہیں۔ جن میں وزیر اور بڑے بڑے امیر اور بعض پردیسی شرفا بھی شامل ہوتے ہیں۔ میں بھی دائیں طرف کی جماعت میں تھا۔ بادشاہ کے سامنے پیدل اور راہبر ہوتے ہیں۔ اور پیچھے ریشمی پٹکوں والے سُنہری علم ہوتے ہیں۔ اور اونٹوں پر طبل لدے ہوئے ہوتے ہیں۔ اونٹوں کے پیچھے شاہی غلام اور پیدل ہوتے ہیں۔ ان کے بعد امیر ہوتے ہیں اور ان کے بعد عام لوگ۔ کسی کو خبر نہیں ہوتی کہ کس جگہ قیام ہوگا۔ جب کوئی جگہ دریا کے کنارے یا درختوں کے جھنڈ میں بادشاہ کو اچھی معلوم ہوتی ہے تو حکم ہوتا ہے کہ اس جگہ اُتر جاؤ۔ جب تک بادشاہ کا ڈیرا نہ لگ جائے کوئی شخص اپنا ڈیرا نہیں لگا سکتا۔ پھر ناظر آتے ہیں اور ہر شخص کو

کو اس کی جگہ بتلاتے ہیں۔ بیچ میں شاہی ڈیرہ ہوتا ہے اردگرد اور ڈیرے ہوتے ہیں۔ بکری کا گوشت یا کچھ شکار پہلے ہی آگے آگے روانہ کر دیا جاتا ہے۔ امیروں کے لڑکے فوراً حاضر ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں سیخ ہوتی ہے۔ وہ آگ روشن کرتے ہیں اور گوشت بھونتے ہیں۔ پھر ایک چھوٹا سا ڈیرہ لگایا جاتا ہے۔ اس کے باہر بادشاہ مع اپنے مصاحبوں کے بیٹھ جاتا ہے۔ دسترخوان آتا ہے اور بادشاہ جس کو چاہتا ہے اپنے ساتھ کھانے کیلئے بلا لیتا ہے . . ."

ابن بطوطہ نے شکار کی سواری کا حال پورا نہیں لکھا۔ اس کا بیان ناتمام ہے۔ مگر جتنا ہے اُس سے یہ ظاہر ہے کہ شکار کی سواری خاص ہوتی تھی۔ جب ہی ضیاءالدین برنی نے لکھا ہے "برسم شکار رفت" یعنی شکار کی سواری نکلی۔ جسے اکثر مورخوں نے یہ سمجھا کہ سلطان محمد آدمیوں کا شکار کرنے کیلئے نکلا۔

ہوا خوری اور تفریح مسالک الابصار میں لکھا ہے کہ جب بادشاہ ہوا خوری وغیرہ کیلئے کہیں جاتا ہے تو اس کے ساتھ تیس ہزار سپاہی گھوڑوں پر اور اتنے ہی ہاتھیوں پر سوار ہوتے ہیں۔ ایک ہزار کوتل گھوڑے ہوتے ہیں جن پر زین کسے ہوتے ہیں۔ ان کے جسموں پر سنہری پاکھریں پڑی ہوتی ہیں۔ اُن کے گلوں میں ہار پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ہر ہر عضو میں وہ زیور پہنے ہوتے ہیں۔ بعض گھوڑے یاقوت اور جواہرات وغیرہ سے سجے ہوتے ہیں۔ لیکن بادشاہ جب اپنے محلات میں ایک محل سے دوسرے محل تک سوار ہو کر جاتا ہے تو اس کے سر پر چتر ہوتا ہے۔ اور مسلح سپاہی ہاتھوں میں تلواریں لئے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ اور بارہ ہزار غلام بادشاہ کے گرد اگرد حلقہ کئے رہتے ہیں۔ سوائے چتر بردار یا سلاحدار اور جامہ بردار کے۔ بادشاہ کی سواری کی یہ شان محلات کے اندر شیخ محمد خجندی نے جو دہلی کے شاہی لشکر میں ملازم تھا اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ جیسی دیکھی تھی ویسی ہی لکھ دی۔

جنگ کی سواری اور لشکر کی ترتیب عام سواری میں اور جنگ کی سواری میں فرق تھا۔ جسے مسالک الابصار میں وضاحت سے نہیں لکھا گیا۔ شیخ مبارک کے حوالے سے اس میں بس اتنا لکھا ہے کہ جب بادشاہ سوار ہوتا ہے تو اس کے سر پر شاہی چتر لگایا جاتا ہے۔ اور جب جنگ کی غرض سے نکلتا ہے یا دور دراز کا سفر کرتا ہے تو اس کے سر پر سات چتر لگائے جاتے ہیں۔ ان میں سے دو چتر زر و جواہر سے جڑے ہوئے ایسے ہیں جن کی کوئی قیمت ہی نہیں ہو سکتی۔ جنگ کے وقت بادشاہ لشکر کے بیچوں بیچ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے اردگرد علما اور فضلا ہوتے ہیں۔ اور لشکر کا ہر حصہ میمنہ ہو، میسرہ ہو یا جناح دُور دُور تک پھیلا ہوتا ہے۔ تیر اندازوں کے آگے ہاتھی ہوتے ہیں جن کے سارے بدن پر فولادی پاکھریں پڑی ہوتی ہیں۔ ان ہاتھیوں پر ہودے دھرے ہوتے ہیں۔ ہودجوں پر پردے پڑے ہوتے ہیں۔ اور ان میں جنگجو سپاہی بیٹھے ہوتے ہیں۔ ہودجوں میں تیر پھینکنے کے لئے سوراخ بھی ہوتے ہیں۔ اور تلواروں کے ہاتھ نکالنے کی بھی گنجائش ہوتی ہے۔ ہاتھیوں کے آگے آگے پیادے ہوتے ہیں۔ جو سر سے پیر تک ہتیاروں میں ڈوبے رہتے ہیں۔ یہ لوگ آگے آگے اس لئے چلتے ہیں کہ پیچھے آنے والے ہاتھیوں کیلئے راستہ صاف کر دیں۔ اور دشمن کے سواروں کو سامنے سے آتا دیکھیں تو تلواریں مار مار کر پھیر دیں۔ ہودجوں کے برجوں میں تیر انداز بیٹھے رہتے ہیں۔ جو ہاتھیوں کی پشت کی طرف مُنہ کئے رہتے ہیں۔ اور پیچھے سے حملہ کرنے والوں پر تیر چلاتے رہتے ہیں۔ ہاتھیوں کے دائیں بائیں گھڑ سوار رہتے ہیں جو دشمنوں کو کاٹتے چھانٹتے اور پامال کرتے ہوئے چلتے ہیں۔ بھاگنے والوں کو کسی غار یا گڑھے میں بھی پناہ نہیں ملتی۔ سامنے سے آنے والے کو پیادے نہیں چھوڑتے۔ غرض شاہی لشکر ہاتھیوں کے چاروں طرف حلقہ باندھے رہتا ہے۔

لشکر کے اس عمدہ انتظام کی بدولت دشمنوں پر کیا نیچے کیا اوپر۔ کیا دائیں کیا بائیں کیا آگے کیا پیچھے ہر طرف سے مار کی بھرمار رہتی ہے۔ غنیم لشکر شاہی سے ملتے ہی موت کے شکنجے میں کس جاتا ہے۔ اور بلا کے گھیرے میں پھنس جاتا ہے۔

دربار مسالک الابصار میں لکھا ہے کہ سلطان محمد کے دربار میں بارہ سو طبیب ملازم ہیں۔ اور دس ہزار باز دار جو گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں۔ اور ان پرندوں کو لئے پھرتے ہیں جن کو شکار کے طریقے سکھائے جاتے ہیں۔ اور تین ہزار آدمی شکار کو گھیر

گھار کر لانے پر تعینات ہیں۔ پانچسو بادشاہ کے ہمنشین ہیں۔ دو ہزار دو سو قوال ہیں۔ بادشاہ کے غلاموں میں سے بھی ایکہزار قوال ہیں۔ جو قوالی سکھانے پر مامور ہیں۔ اور ایکہزار شاعر مقرر ہیں جو نہایت قابل ہیں۔ تینوں زبانوں میں یعنی عربی، فارسی اور ہندی میں شعر کہتے ہیں۔ یہ سب کے سب سلطان کے دربار سے تنخواہ پاتے ہیں۔ اسی کی طرف سے ان پر انعام واکرام ہوتا رہتا ہے۔ اگر بادشاہ کو یہ معلوم ہوجائے کہ اس کے قوال نے کسی اور کے ہاں قوالی کی ہے تو اس قوال کی جان بچنی مشکل ہوجاتی ہے۔ بادشاہ کا اور بار صبح اور شام دن میں دو مرتبہ ہوتا ہے۔

محمد جندی کا بیان ہے کہ منگل کے روز بادشاہ پورے دن دربار عام کرتا ہے۔ منگل کا دربار ایک بہت وسیع میدان میں ہوتا ہے۔ جہاں ایک شاہانہ چتر لگا دیا جاتا ہے۔ چتر اتنا بڑا ہوتا ہے کہ سائبان کی طرح سارے میدان کو ڈھک لیتا ہے۔ بیچ میں ایک اونچا چاندی اور جواہرات کا جڑاؤ تخت رکھا جاتا ہے۔ جس پر بادشاہ عدل و انصاف کیلئے بیٹھتا ہے۔ تخت کے دائیں بائیں ارکان سلطنت یعنی وزیر اور مشیر ادب سے کھڑے رہتے ہیں۔ اور تخت کے پیچھے مسلح سپاہی اور خدمتگار وغیرہ کمر کسے رہتے ہیں۔ باقی منصبدار اور عہدیدار اپنے اپنے منصبوں کے مطابق کھڑے ہوتے ہیں۔ تخت کے سامنے بیٹھنے کی اجازت صرف خانوں کو، صدر جہاں کو اور خفیہ نویسوں کو ہوتی ہے۔ اور آواز لگانے والے چپراسی دروازوں پر کھڑے ہوکر فریادیوں اور نالش دائر کرنے والوں کو پکار پکار کر حاضر کرتے رہتے ہیں۔ یہ فریاد کے لانے والے اور انصاف چاہنے والے اپنی اپنی فریاد سُنا کر بادشاہ سے انصاف کے طالب ہوتے ہیں۔ بادشاہ کے حضور میں پہونچنے کے بعد جس وقت تک وہ اپنی پوری فریاد نہ سُنا لیں اور ان کے حق میں بادشاہ کا حکم صادر نہ ہوجائے اس وقت تک نہ انہیں کوئی مار سکتا ہے اور نہ کسی طرح کا دباؤ ڈال سکتا ہے۔ منگل کے علاوہ ہر روز صبح وشام بادشاہ دربار عام کرتا ہے۔ دربار عام میں کوئی شخص کسی قسم کا ہتیار اندر نہیں لا سکتا۔ چاقو تک دربار میں نہیں لایا جاسکتا۔ نہ خود ہتیار سجا کر آسکتا ہے۔ دربار میں داخل ہونے سے پہلے بادشاہ کو ہر آنیوالے کی بابت پوری اطلاع دی جاتی ہے۔

دربار کے میدان میں بادشاہ کے تخت تک پہونچنے کیلئے دروازہ کے اندر دروازہ اسی طرح سات دروازے ہوتے ہیں۔ پہلے دروازے پر ایک سپاہی مقرر ہوتا ہے۔ جب کوئی خان یا ملک یا بڑا امیر دروازے پر پہنچتا ہے تو وہ سپاہی بادشاہ کو خبر دینے کی غرض سے بگل بجانا شروع کر دیتا ہے۔ خانوں، ملکوں اور بڑے امیروں کو اندر تک سوار ہوکر جانے کی اجازت ہے۔ مگر معمولی شخص کیلئے پہلے ہی دروازے پر پیدل ہوجانے کا حکم ہے۔ البتہ معمولی لوگوں میں سے کسی کو خاص طور سے اجازت مل جاتی ہے۔ تو وہ بس چھٹے دروازے تک سوار ہوکر جاسکتا ہے۔ دربار میں داخل ہونے والا جب تک ساتویں دروازے تک نہیں پہنچ جاتا، اس وقت تک برابر بگل بجتا رہتا ہے۔ جو آتا جاتا ہے وہ چھ ؤں دروازوں سے گذر کر ساتویں دروازے کے قریب بیٹھتا جاتا ہے۔ جب آنیوالوں کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے اور کسی کا انتظار باقی نہیں رہتا تو پہلا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔ اور جو لوگ ساتویں دروازے پر جمع ہوتے ہیں اُن کو دروازے سے گذرنے اور محل کے اندر داخل ہونے کی اجازت دیدی جاتی ہے۔ اندر داخل ہونے کے بعد جو بٹھانے کے لائق سمجھے جاتے ہیں ان کو تخت کے ادھر اُدھر بٹھا دیا جاتا ہے، باقی سب کھڑے رہتے ہیں۔ بٹھائے وہ لوگ جاتے ہیں جو یا تو قاضی ہوں یا وزیر اور یا خفیہ نویس۔ ان سب کو ایسی جگہ بٹھایا جاتا ہے جہاں بادشاہ کی نظر نہ پڑے۔ اس کے بعد عدالت کی کارروائی اس طریقے سے شروع ہوتی ہے کہ ہر محکمہ میں عرضیوں کے گڈے اور کاغذات کے بستے کھول دئیے جاتے ہیں۔ ہر محکمہ کیلئے ایک علیحدہ حاجب مقرر ہے جو اپنے محکمہ کے مقدموں کی پیروی اور کاغذات کی پیشی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ سب محکموں کے حاجب مقدمات کے کاغذات حاجب خاص کے پاس لے جاتے ہیں۔ حاجب خاص سب حاجبوں کا افسر ہوتا ہے۔ وہ اُن کاغذات کو بادشاہ کی خدمت میں لے جاتا ہے، بادشاہ ان سب پر حکم لکھ دیتا ہے۔ اور دربار برخاست ہوجاتا ہے۔ تو حاجب خاص اُن سب کاغذات کو بادشاہ کے پیش کار کے پاس لے جاتا ہے۔ پیش کار کے ذریعے شاہی فیصلوں کا اجرا ہوتا ہے۔

جب دربار عام برخاست ہوجاتا ہے تو دربار خاص قائم ہوتا ہے۔ وہاں بادشاہ علماء کو بلاتا ہے۔ مگر دربار خاص میں وہی علماء جاسکتے ہیں جن کو بادشاہ کے ساتھ بہت ربط ضبط ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ بادشاہ بہت گھل مل جاتا ہے۔ ان کے ساتھ بیٹھ

کھانا بھی کھاتا ہے۔ اور دلچسپی اور خوش مذاقی کی باتیں بھی کرتا ہے۔ وہ بھی بادشاہ سے کھل کر کلام کرتے ہیں۔ علماء کی صحبت کا وقت ختم ہوتا ہے تو بادشاہ ان کو رخصت کر دیتا ہے۔ علما چلے جاتے ہیں تو بادشاہ خلوت میں بیٹھتا ہے۔ اور اپنے خاص خاص مصاحبوں کو بلاتا ہے۔ اور خدا کی تعریف کے گیت سننے کیلئے قوالوں کو طلب کرتا ہے۔ کبھی بادشاہ مصاحبوں سے باتیں کر کے خوش ہوتا ہے اور کبھی قوالوں کے گیت سن کر باغ باغ ہوتا ہے۔

شیخ مبارک کا بیان ہے کہ دربار عام ہو چکتا ہے تو سلطان محمد کی عام اور خاص محفلیں ہوتی ہیں۔ عام محفل کی تو یہ کیفیت ہے کہ اس میں [illegible] ملازمین کا گزر نہیں۔ صرف بڑے بڑے عہدے کے لوگ آتے ہیں۔ یا وہ لوگ جنھیں بادشاہ ضرورۃً طلب کرتا ہے۔ اور خاص محفل کی یہ شان ہے کہ خاص خاص مصاحب اور بڑے بڑے عہدیدار بھی اپنے نمبر سے جا سکتے ہیں۔ [illegible] قاعدہ [illegible] اور طبیبوں اور ان کے ہم رتبہ لوگوں کیلئے مقرر ہے۔ غرض خاص محفل میں کوئی بھی بغیر نمبر کے نہیں جا سکتا [illegible] کی حاضری کیلئے بھی وقت مقرر ہیں۔

سلطنت کا انتظام اور حکومت کا طرز

مسالک الابصار میں لکھا ہے کہ خانوں میں سے چن کر کسی خان کو سلطان محمد اپنا نائب مقرر کر لیتا ہے۔ جو امیریہ کہلاتا ہے۔ لشکر کے معاملات خاص طور پر۔ اور رعایا کے عام طور پر اسی امیریہ کے ذمے ہوتے ہیں۔ ایک بڑا صوبہ اس کی جاگیر میں دیا جاتا ہے۔ اور اس بادشاہ کا ایک وزیر بھی ہے۔ وزیر کو امیریہ کے برابر جاگیر ملتی ہے۔ اور وزیر کے چار نائب ہوتے ہیں جو شق کہلاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی تنخواہ بیس[illegible] سے لیکر چالیس ہزار سالانہ ٹکے تک ہوتی ہے۔ وزیر کے ماتحت چار سکریٹری ہیں جو دفتروں میں بیٹھ کر خفیہ خبریں لکھتے ہیں۔ ان چاروں میں سے ہر ایک کو ایک ایک شہر جاگیر میں ملا ہوا ہے۔ جس کی آمدنی بڑی بندرگاہ کی آمدنی کے برابر ہوتی ہے۔ دیوان اور شاعروں کی دیکھ بھال انھیں سکریٹریوں کے ذمے ہے۔ ہر سکریٹری کے ماتحت قریب قریب تین سو منشی ہیں۔ جن میں سے سب سے چھوٹے کی تنخواہ ہزار ٹکے سالانہ ہے۔ اور بڑے منشیوں کے پاس گاؤں اور جاگیریں ہیں۔ ان ہی جاگیردار منشیوں میں اتنے بڑے بھی ہیں جن کی جاگیریں پچاس گاؤں ہیں۔ قاضی القضاۃ کے پاس جو صدر جہاں کہلاتا ہے دس قصبے ہیں جن کی آمدنی تقریباً ساٹھ ہزار ٹکے ہے۔ آجکل کمال الدین بن برہان خاں قاضی القضاۃ ہے وہی صدر الاسلام بھی کہلاتا ہے۔ اور وہی محکمہ عدل کا سب سے بڑا افسر ہے۔ تمام عالموں اور فاضلوں کے معاملات خواہ وہ دیسی ہوں یا پردیسی صدر جہاں کے اہتمام میں ہیں۔ شیخ الاسلام کی جو شیخ الشیوخ کہلاتا ہے [illegible] ہے، اس کے ذمے تمام جوگیوں، سادھوؤں اور قلندروں کا اہتمام ہے۔ خواہ وہ دیسی ہوں یا پردیسی، محتسب کیلئے ایک گاؤں مقرر ہے جس کی آمدنی آٹھ ہزار ٹکے کے قریب ہے۔

شیخ مبارک [illegible] سلطنت اور طرز حکومت کے اعتبار سے سلطان محمد کا مقابلہ الپ ارسلان سلجوقی کے بیٹے ملک شاہ سے کیا ہے۔ [illegible] بادشاہ اپنے زمانہ کا ملک شاہ ہے۔ ملک شاہ گیارھویں عیسوی کا وہ نامی گرامی بادشاہ گزرا ہے جس کی [illegible] سیاست دانیاں اس کے وزیر اعظم نظام الملک ابو علی حسن نے سیاست نامہ میں بیان کی ہیں۔ سیاست نامہ کا انگریزی ترجمہ آٹھ جلدوں میں موجود ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک شاہ سیاسیات میں بڑی واقفیت رکھتا تھا۔ سیاست مدن میں ماہر تھا۔ یہی مثال سلطان محمد کی ہے۔ وہ بھی سیاست مدن (Political Science) میں ماہر تھا۔ اور سیاسیات میں بڑی دلچسپی لیتا تھا۔

صنعتیں

شیخ مبارک کا بیان ہے کہ سلطان محمد نے کپڑا بننے کا کارخانہ جاری کر دیا ہے۔ جس میں طرح طرح کے ریشمی کپڑے بنے جاتے ہیں۔ اور چار ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ اس کارخانہ کا بنا ہوا کپڑا خلعت دینے، پہننے اور تحفے دینے کے کام آتا ہے۔ اس کے علاوہ چین، عراق اور اسکندریہ سے بھی کپڑا آتا ہے۔ بادشاہ ہر سال پورے دو لاکھ جوڑے تقسیم کرتا ہے۔ ایک لاکھ گرمیوں میں اور ایک لاکھ جاڑوں میں۔ گرمیوں میں جو کپڑا تقسیم ہوتا ہے وہ زیادہ تر اسکندریہ کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ اور جاڑوں میں جو تقسیم ہوتا ہے وہ سب ریشمی ہوتا ہے وہ دہلی کے کارخانہ کا بنا ہوا ہوتا ہے، یا چین کا یا عراق کا۔ اس کے علاوہ

خانقاہوں اور سراؤں میں بھی بادشاہ کی طرف سے کپڑا تقسیم کیا جاتا ہے۔

سلطان محمد نے زردوزی کا کارخانہ بھی جاری کر رکھا ہے۔ جس میں چار ہزار زردوز کام کرتے ہیں۔ زردوزی کئے ہوئے کپڑے بیگمات کے پہننے کے کام آتے ہیں۔ امراء کو خلعت دینے کے کام آتے ہیں۔ اور ان کی بیویوں کو بطور عطیہ کے دیئے جاتے ہیں۔

ڈاک کا انتظام

مسالک الابصار کے مصنف نے سراج الدین ابوصفا عمر شبلی کی زبانی لکھا ہے کہ "سلطان محمد کو اپنی قلمرو کے حالات اور اخبار معلوم کرنے کی دُھن رہتی ہے۔ اور آس پاس کی سلطنتوں کے حالات کی بھی تلاش رہتی ہے۔ وہ ہر سلطنت کے ملکی، مالی اور فوجی حالات دریافت کرتا رہتا ہے۔"

سلطان محمد نے اپنی سلطنت میں ڈاک کا انتظام یوں کیا ہے کہ ہر طرف پیادے مقرر کر دیئے ہیں۔ پیادوں کے درجے چھوٹے بڑے ہیں۔ ان میں سے بعض خبریں پہنچانے کی غرض سے چھاؤنیوں میں رہتے ہیں۔ اور بعض شہروں میں۔ جب کسی پیادے کو نئی خبر معلوم ہوتی ہے جس کا بادشاہ تک پہنچانا ضروری ہوتا ہے تو وہ اپنے بڑے افسر تک پہنچا دیتا ہے۔ اور وہ بڑا افسر اپنے سے بڑے افسر کو پہنچا دیتا ہے۔ اسی طرح سلسلے وار وہ خبر بادشاہ تک پہنچ جاتی ہے۔ ڈاک کا یہ انتظام قریب قریب کے شہروں اور بستیوں کے لئے ہے۔

دُور دراز کے ملکوں کی ڈاک کے متعلق یہ انتظام ہے کہ دار الخلافہ دہلی سے لیکر متعلقہ صوبوں کے قلعوں تک تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر ڈاکخانے بنے ہوئے ہیں۔ یہ ڈاک خانے ایسے ہی ہیں جیسے کہ مصر و شام کے ڈاک گھر۔ فرق یہ ہے کہ مصر و شام کے ڈاک گھر ذرا دُور دُور بنے ہوئے ہیں۔ اور یہاں پاس پاس ہیں۔ یہاں تو ایک ڈاک خانہ سے دوسرے ڈاکخانے کا فاصلہ آدھ میل ہوگا یا اس سے بھی کم۔ ہر ڈاکخانہ میں دس دوڑنے والے ڈاکیے جو اسی کام کیلئے مقرر کئے جاتے ہیں مقرر رہتے ہیں۔ مقررہ وقت پر چپراسی ڈاک کے پلندے پوسٹ ماسٹر کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ پوسٹ ماسٹر ان کو کھلوا کر ڈاکیوں پر تقسیم کر دیتا ہے۔ ڈاکیہ ڈاک لیتے ہی اپنے مقام سے دوڑتا ہے اور دوسرے ڈاکخانہ میں پہنچا دیتا ہے۔ اسی طرح سے ڈاک دُور سے دُور شہروں میں جلد سے جلد پہونچ جاتی ہے۔ ڈاکیہ ڈاک کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہونچا دیتا ہے تو فوراً اپنی جگہ واپس آجاتا ہے۔ یہ پیادوں کی ڈاک ہے جو گھوڑوں اور سانڈنیوں کی ڈاک کو مات کرتی ہے۔ اور ان دونوں سے بھی جلد پہنچتی ہے۔ راوی کہتا ہے کہ ہر ڈاکخانہ کے ارد گرد اچھی خاصی بستی بسی ہوتی ہے۔ اس بستی میں مسجد بھی ہوتی ہے۔ جس میں پانچوں وقت جماعت سے نماز پڑھی جاتی ہے۔ مسافروں کے ٹھہرنے کیلئے مسجد میں حجرے بھی ہیں۔ اس بستی میں پانی سے بھرے ہوئے پکے تالاب بھی ہیں اور بازار بھی جہاں کھانے پینے کی سب چیزیں ملتی ہیں اور جانوروں کیلئے ہر قسم کا چارہ بھی موجود رہتا ہے۔ ان بستیوں سے مسافر کو بڑا آرام ملتا ہے۔ اس کو اپنے ساتھ نہ کھانے پینے کی چیزیں لے جانے کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ خیمہ ڈیرا ڈھونڈنے کی۔

ابوصفا عمر شبلی نے کہا کہ سلطان محمد کی انتظامی سرگرمیوں ہی سے ایک یہ بات بھی ہے کہ اس نے اپنی قلمرو میں ہر جگہ خبر پہنچانے کی غرض سے ڈاکخانوں کے علاوہ نوبت خانوں کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے جو ایک طرف دار الخلافہ دہلی پر ختم ہوتا ہے اور دوسری طرف دار الخلافہ دولت آباد پر۔ بادشاہ کی سلطنت کے دو دار الخلافے یہی دو بڑے شہر ہیں۔ انہی دونوں شہروں کو ہندوستان بھر کے نوبت خانوں کا مرکز سمجھنا چاہیے۔ ان نوبت خانوں کی بدولت شہر شہر کے حالات اور واقعات کی اطلاع بادشاہ کو ہوتی رہتی ہے۔ خواہ بادشاہ ملک کے کسی حصے میں کیوں نہ ہو۔ حد ہے کہ ان نوبت خانوں کے ذریعے ہر شہر کے دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی اطلاع تک بادشاہ کو مل جاتی ہے۔ جب کسی نوبت خانہ کے قریب کوئی واقعہ ہو جاتا ہے تو اس میں نوبت بجتی ہے۔ اور اس نوبت کی آواز پر چاروں طرف کے نوبت خانوں میں سلسلہ وار نوبت بجتی چلی جاتی ہے۔

ابن بطوطہ نے ڈاک کا مختصر سا حال لکھا ہے۔ مگر جو کچھ لکھا ہے اُس سے مسالک الابصار کی تائید ہوتی ہے۔ اس کو

ڈاک چوکی کے اور خبر رسانی کے انتظام ایسے دلچسپ معلوم ہوئے اور اس قدر اہم نظر آئے کہ اُس نے سفر نامہ کے شروع ہی میں اس کا تذکرہ کر دیا۔ اس کا بیان ہے کہ "سیوستان سے ملتان تک دس دن کا راستہ ہے اور ملتان سے دارالخلافہ دہلی کا پچاس دن کا۔ جو خبر اخبار نویس بادشاہ کو لکھتے ہیں وہ اس کے پاس ڈاک کے ذریعے پانچ دن میں پہونچ جاتی ہے۔ ڈاک دو قسم کی ہے ایک گھوڑے کی دوسری پیادوں کی۔ گھوڑے کی ڈاک کو اولاق کہتے ہیں۔ ہر چار کوس کے بعد گھوڑا بدلا جاتا ہے۔ یہ گھوڑے سرکاری ہوتے ہیں۔ پیدلوں کی ڈاک کا انتظام یہ ہے کہ ایک میل میں تین چوکیاں ہرکاروں کی ہوتی ہیں۔ چوکی کو "داوہ" کہتے ہیں۔ ہر تہائی میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں آباد ہوتا ہے۔ گاؤں کے باہر ہرکاروں کیلئے بُرجیاں بنی ہوتی ہیں۔ ہر ایک بُرجی میں ہرکارے کمر کسے بیٹھے رہتے ہیں۔ ہر ایک ہرکارہ کے پاس دو گز لمبی ایک چھڑی ہوتی ہے۔ جس کے سرے پر تانبے کے گھنگرو بندھے ہوتے ہیں۔ جب شہر سے ڈاک چلتی ہے تو ہرکارہ ایک ہاتھ میں ڈاک کا تھیلہ پکڑ لیتا ہے دوسرے ہاتھ میں چھڑی لے لیتا ہے۔ اور پوری طاقت سے دوڑتا ہے۔ قریب کی برجی والا ہرکارہ گھنگروؤں کی آواز سُن کر تیار ہو جاتا ہے۔ اور ڈاک کا تھیلہ لیکر فوراً دوڑنے لگتا ہے۔ اس طرح ڈاک دُور دُور پہونچ جاتی ہے۔ اور یہ ڈاک گھوڑوں کی ڈاک سے بھی جلدی جاتی ہے۔ کبھی کبھی اس ڈاک کے ذریعے خراسان کے تازہ میوے بھی بادشاہ کیلئے تھالیوں میں پہنچائے جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی کسی سنگین مجرم کو بھی چارپائی پر اُٹھا کر اسی طرح ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ جب میں دولت آباد میں تھا تو بادشاہ کیلئے گنگا جل اسی ڈاک کے ذریعے پہنچایا جاتا تھا۔ دولت آباد دریائے گنگا سے چالیس دن کے فاصلے پر ہے۔

مخبری کا محکمہ مسالک الابصار سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمد کی سلطنت میں مخبری کا ایک علیحدہ محکمہ قائم تھا۔ اس محکمہ کا تعلق خاص بادشاہ سے تھا۔ اسی کے تحت میں بہت سے کارکن، اخبار نویس اور جاسوس تھے جو ملک کے مختلف حصوں میں کام پر متعین تھے۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے اخبار نویس ہر مسافر کا مفصل حال لکھتے ہیں۔ اس کی صورت کیسی ہے۔ لباس کیسا ہے۔ اس کے خادم کتنے ہیں۔ کتنے ہمراہی ہیں۔ اور اس کے ساتھ جانور کس قدر ہیں۔ اس کی عادتیں کیسی ہیں۔ غرض کوئی بات باقی نہیں چھوڑتے۔

ہر ایک چھوٹے اور بڑے امیر کے پاس بادشاہ کا ایک غلام رہتا ہے جو بادشاہ تک اس امیر کی ذرا ذرا سی بات پہنچاتا ہے۔ اسی طرح ہر امیر کے گھر میں کچھ لونڈیاں رہتی ہیں جو امیر کے سب خانگی واقعات بھنگنوں سے کہتی ہیں۔ اور بھنگنیں اس قسم کی خبریں مخبروں کے افسر کو پہنچا دیتی ہیں . . . . "

سکے اور نرخ مسالک الابصار میں لکھا ہے کہ خجندی کا گذر تین اور رفیقوں کے ساتھ دہلی میں ہوا۔ وہاں ایک دُکان پر بیٹھ کر سب نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ کھانے میں روٹی تھی، گوشت تھا اور مکھن۔ کھا چکے تو دُکان والے سے پوچھا کہ کیا ادا کریں؟ کہا۔ میاں ایک جیتل۔

شیخ مبارک کا بیان ہے کہ ہندوستان میں سب سے بڑے دو سکے ہیں۔ سُنہری سکہ لکِ حمر اکہلاتا تھا جو سو ہزار سُنہری ٹنکوں کے برابر ہوتا ہے۔ اور روپہلی سکہ جو لکِ ابیض کہلاتا ہے چاندی کے سو ہزار ٹنکوں کی برابر ہوتا ہے۔ سنہری ٹنکہ وزن میں ساڑھے تیرہ ۱۳½ ماشے ہوتا ہے۔ اور روپہلی ٹنکہ وزن میں آٹھ ہشتگانیوں کے برابر ہوتا ہے۔ اس ہشتگانی کا وزن اتنا ہی ہوتا ہے جتنا مصر اور شام میں روپہلی ہشتگانی کا۔ ان دونوں کی قیمت بھی ایک ہی ہوتی ہے۔ ہشتگانی کا سکہ چار سلطانیوں کے برابر ہوتا ہے۔ سلطانی کو دوگانی بھی کہتے ہیں۔ اور سلطانی کا سکہ ششگانی کے تہائی کے برابر ہوتا ہے۔ ششگانی ہندوستان کے سکوں میں سے تیسری قسم کا سکہ ہے۔ اور یہ ہشتگانی کے تین چوتھائی کے برابر ہوتا ہے۔ "یگانی" بھی ایک سکہ ہے جو سلطانی یا دوگانی کا آدھا ہوتا ہے۔ قیمت میں وہ ایک جیتل کے برابر ہوتا ہے۔ ایک اور سکہ جو دوازدہ گانی کہلاتا ہے ڈیڑھ ہشتگانی کے برابر ہوتا ہے۔ "شانزدہ گانی" بھی ایک سکہ ہے جو دو ہشتگانیوں کے برابر ہے۔ غرض ہندوستان میں چاندی سونے

کے سکے جو اس وقت رائج ہیں چھ قسم کے ہیں۔ شانزدہ گانی، دوازدہ گانی، ہشتگانی، ششگانی، سلطانی اور یگانی۔ بناوٹ میں سب سے چھوٹا سکہ سلطانی ہے۔ چھوٹے سکے اصل میں تین ہیں۔ ششگانی، یگانی اور سلطانی۔ یہی تینوں تجارت میں بہت کام آتے ہیں۔ سلطانی سے زیادہ تو کوئی سکہ نہیں چلتا۔ سلطانی مصر اور شام کے چوتھائی درہم کی برابر ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہیئے کہ سلطانی آٹھ فلوس کے اور جیتل چار فلوس کے اور ہشتگانی مصر اور شام کے بتیس فلوس کے برابر ہوتی ہے۔

رطل کا پیمانہ جو ہندوستان میں سیر کہلاتا ہے وزن میں ستر مثقال[1] ہوتا ہے۔ تول میں مصر کے ۱۰۲⅔ درہم کے برابر ہوتا ہے۔ من ہندوستان میں چالیس سیر کا ہوتا ہے۔ یہاں چیزوں کو ناپ کر دینے کا رواج نہیں ہے۔ گیہوں یہاں سوا روپئے من ملتا ہے۔ جو ایک روپیہ من اور چاول پونے دو روپئے من۔ چاول کی بڑھیا قسموں کے بھاؤ اس سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ چنا آٹھ آنے من ہے۔ اور گائے اور بکری کا گوشت ایک سلطانی کا (یعنی دو آنے) چھ سیر ملتا ہے۔ اور دونوں قسم کے گوشت کا ایک ہی بھاؤ ہے۔ بھیڑ کا گوشت ایک سلطانی (دو آنہ) کا چار سیر ملتا ہے۔ ایک مرغابی ہشتگانی کی (یعنی ۸ر) کی ملتی ہے۔ اور مصری ایک شانزدگانی (ایک روپیہ) کی چار سیر آتی ہے۔ اور اعلیٰ قسم کی موٹی تازی بھیڑ ایک نقرئی ٹنکے میں آتی ہے۔ نقرئی ٹنکہ آٹھ ہشتگانیوں کے برابر ہوتا ہے۔ ایک اچھا بیل بعض وقت دو ٹنکوں کا ملتا ہے اور بعض وقت اس سے بھی کم میں۔ بھینسوں کی بھی ایسی ہی قیمت ہے۔ بھیڑیں تو ایک گاؤں میں ہزاروں ملتی ہیں۔

مرغیاں اعلیٰ درجے کی ایک مصری درہم کی چار مل سکتی ہیں۔ کبوتر، چڑیاں اور قسم قسم کے پرندے بہت سستے ملتے ہیں۔

پوشاک

مسالک الابصار میں لکھا ہے کہ ہندستان کے باشندوں کا پہناوا زیادہ تر سفید لباس ہے۔ رنگین اور اونی کپڑے جیسے بانات، مخمل، شال وغیرہ باہر سے لائے جاتے ہیں۔ اور یہاں چوگنی اور پچگنی قیمت پر بکتے ہیں۔ علماء، اولیاء، اور درویش زیادہ تر اونی کپڑے پہنتے ہیں۔ اور بادشاہ، خان، ملک اور فوج کے سب افسر سر سے پاؤں تک تاتاری کپڑے پہنتے ہیں۔ ان کے بدنوں پر اسلامی طریقے کی اور خوارزمی فیشن کی قبائیں ہوتی ہیں۔ جو کمر پر سے تنگ ہوتی ہیں۔ ان کے سروں پر پانچ چھ گز کپڑے کی پگڑیاں ہوتی ہیں جو ان کے لمبے قدوں پر چھوٹی معلوم ہوتی ہیں۔ ایسی پگڑیوں کو عمامہ کہنا موزوں نہیں ہے۔ ناصر الدین محمد حبشی جو زمردی کے لقب سے مشہور ہے۔ اور جو دو مرتبہ ہندوستان میں آچکا ہے اور سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے دربار میں رہ چکا ہے کہتا تھا کہ ہند میں ہمہ شما تو عام طور سے سفید لباس پہنتے ہیں جن پر سنہری کام کیا ہوا ہوتا ہے مگر خاص خاص لوگ، افسر اور عہدہ دار وغیرہ تاتاری ملکوں کے بنے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں جن پر سنہری کام کیا ہوا ہوتا ہے۔ بعضوں کے لباس میں سب جگہ نہیں تو صرف آستینوں پر کام کیا ہوا ہوتا ہے۔ بعضوں کے لباس میں مغلوں کی طرح پیٹھ پر اور گلے کے چاروں طرف چوڑا چوڑا زردوزی کا کام کیا ہوا ہوتا ہے۔ گلے پر جو کام کیا جاتا ہے وہ جواہرات سے سجایا جاتا ہے۔ اور اس میں یاقوت اور ہیرے ٹانکے جاتے ہیں۔ ان کے سر کے بالوں کی لٹیں آگے سے گندھی اور بٹی ہوئی لٹکی رہتی ہیں۔ جس طرح سے کہ مصر کے سپاہیوں کا دستور ہے۔ بالوں کی لٹوں کو گوندھا ہوا رکھنے کیلیے موباف کی طرح ریشمی کپڑا استعمال کرتے ہیں۔ اور اپنی کمروں میں سونے چاندی کی پیٹیاں لگاتے ہیں۔ یا کوڑا باندھ لیتے ہیں یا تبر لٹکا لیتے ہیں۔ تلواریں تو کمر سے دور دراز سفر کے وقت باندھتے ہیں۔ گھر پر ہر وقت تلوار باندھنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ فوجی عہدہ داروں ہی کی طرح ملکی اور مالی افسروں اور وزیروں اور منشیوں کا لباس ہوتا ہے۔ فرق اتنا ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنی کمر میں پیٹیاں نہیں لگاتے۔ فوجیوں کی شان پیٹیوں

۱۔ ۱۵ ماشے۔

۲۔ اوپر جو عبارت لکھی گئی اس سے صاف ظاہر ہے کہ ٹنکے دو طرح کے تھے۔ ایک طلائی دوسرا نقرئی۔ طلائی یعنی سنہری ٹنکہ ۱۰½ ماشے کا ہوتا تھا۔ دہلی ٹنکے کی آٹھ ہشتگانیاں ہوتی تھیں۔ ایک ہشتگانی مصر اور شام کے درہم کے برابر ہوتی تھی۔ ایک ہشتگانی کی چار سلطانیاں آتی تھیں، اور ایک سلطانی یا دوگانی کے دو جیتل اور ایک جیتل کے چار فلوس یا چار پیسے آتے تھے۔

سے ہوتی ہے تو وزیروں اور منشیوں کا امتیاز اس رومال سے ہوتا ہے جس کو وہ صوفیوں کی طرح اپنے صافوں پر باندھ لیتے ہیں اس قسم کی وضع اور بندش کو شملہ کہتے ہیں۔ قاضی اور علما، لشکریوں کی طرح چست لباس پہنتے ہیں۔ زرہ بکتر لگائے رہتے ہیں۔ قاضیوں، عالموں اور لشکریوں کے علاوہ عام لوگ بھی چست کپڑے پہنے اور زرہ بکتر لگائے دیکھے جاتے ہیں۔

بھرتی کیونکر ہوتی تھی

اس زمانہ کی تاریخوں میں کچھ نہیں لکھا کہ بھرتی کیونکر ہوتی تھی۔ مگر ابن بطوطہ کے سفرنامہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بغیر جانچ اور بلا امتحان کے نہ سپاہیوں کی بھرتی ہوتی تھی اور نہ ترقی۔ امتحان لینے کا اور بھرتی کرنے اور ترقی دینے کا اختیار صوبے کے حاکموں کو بھی دیدیا گیا تھا۔ اگرچہ یہ کام بادشاہ ہی کا تھا۔ جب ملتان کے حاکم قطب الدین کے پاس ابن بطوطہ پہنچا تو وہ سپاہیوں کا امتحان لے رہا تھا۔ امتحان کے نتیجہ پر اُن کی ترقی منحصر تھی۔ ابن بطوطہ نے دیکھا کہ "ایک بڑے چبوترے پر فرش کیا ہوا ہے اس کے اوپر قطب الملک بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے پاس شہر کے قاضی اور خطیب بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور دائیں بائیں فوج کے افسر کھڑے ہوئے ہیں۔ سرہانے مسلح آدمی کھڑے ہیں۔ سامنے سے لشکر گذر رہا تھا وہیں بہت سی کمانیں پڑی ہوئی تھیں۔ لشکر میں سے جو سپاہی تیر اندازی کا کمال دکھانا چاہتا وہ جس کمان کو اٹھا سکتا اٹھا لیتا۔ کھینچتا اور تیر چلاتا۔ اگر اپنی سواری کا کمال دکھانا چاہتا تو ایک چھوٹا نقارہ دیوار میں لگا ہوا تھا۔ سپاہی گھوڑا دوڑا کر اپنا نیزہ اس میں لگا دیتا۔ ایک نیچی سی دیوار پر ایک انگوٹھی لگی ہوئی تھی۔ سپاہی گھوڑا دوڑاتا دیوار کے قریب پہونچتا اور نیزے کی انی میں انگوٹھی پرو لے جاتا۔ ایک گیند بھی پڑی ہوئی تھی سپاہی گھوڑا دوڑا کر اس پر بلا لگاتا تھا۔ جس قدر کمال سپاہی اور سوار ان کھیلوں میں دکھاتے تھے اسی قدر اُن کی ترقیاں ہوتی تھیں۔

صاحبانِ کرامت

کہا جاتا ہے کہ سلطان محمد "عالم کش"، تھا اور مشہور ہے کہ اس نے علما، پر مزید ظلم کئے۔ اُن کو سزائیں دیں اور خونریزیاں کیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ سلطان محمد کا تشدد جو کچھ تھا ان علما پر تھا جو اس کے [illegible] ایک منافق تھے، ظاہر پرست اور ریاکار تھے۔ سچے علما، پر اور صاحبانِ کشف و کرامت پر وہ بے حد مہربان تھا۔ سلطان جلال الدین خلجی سید مولا کو ٹھنڈے دل سے نہ دیکھ سکا۔ اور باوجود رحم دل ہونے کے اس عالم اور عامل کو بڑی بیرحمی سے قتل کرا دیا۔ مگر سلطان محمد نے "شیخ محمود کبا" سے ذرا تعرض نہ کیا۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ "زندہ علما، میں سے "شیخ محمود کبا" ہیں۔ یہ بڑے بزرگ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کو دستِ غیب ہے اس لئے کہ وہ خرچ بہت کرتے ہیں۔ اگرچہ ظاہرا کوئی ذریعہ ان کی آمدنی کا نہیں۔ ہر مسافر کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اور مستحقوں اور محتاجوں کو روپے دیتے ہیں۔ اشرفیاں دیتے ہیں اور بنے بنائے کپڑے دیتے ہیں۔ ان سے بہت سی کرامتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ میں نے کئی بار ان کی زیارت کی اور فیض حاصل کیا۔ شیخ علاؤ الدین نیلی ایک اور عالم ہیں۔ یہ شیخ نظام الدین بدایونی کے جانشین ہیں۔ ہر جمعہ کو وعظ کہتے ہیں۔ بڑا مجمع ہوتا ہے۔ بہتیرے ان کے مُرید ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ شیخ علاؤ الدین وعظ کہہ رہے تھے اور قاری قرآن شریف کی آیتیں تلاوت کرتا جاتا تھا۔ جب اس نے یہ آیت پڑھی ؎ اے لوگو خدا سے ڈرو۔ قیامت کا واقعہ بڑا جانکاہ ہوگا۔ اس دن ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پلاتے ہوئے بچے کو بھول جائیگی۔ اور ہر حاملہ کا حمل وضع ہو جائے گا۔ اور آدمیوں کے ہوش و حواس گم ہو جائیں گے۔ ایسا معلوم ہوگا کہ گویا وہ نشے میں ہیں مگر وہ نشے وشے میں نہ ہونگے۔ اُن کی یہ حالت عذابِ خدا کے خوف سے ہوگی۔ ؎ شیخ علاؤ الدین نیلی نے اسی آیت کو دوبارہ پڑھوایا۔ ایک فقیر نے جو مسجد کے گوشے میں بیٹھا ہوا تھا ایک چیخ ماری۔ شیخ نے اسی آیت کو پھر پڑھوایا فقیر نے ایک اور چیخ ماری اور مر گیا۔ میں بھی اس وقت مسجد میں موجود تھا۔ اور یہ واقعہ میری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ میں نے بھی اس فقیر کے جنازے کی نماز پڑھی۔

؎ یا ایہا الناس اتقوا ربکم ان زلزلۃ الساعۃ شئ عظیم ۰ یوم ترونہا تذہل کل مرضعۃ عما ارضعت وتضع کل ذات حمل حملہا وتری الناس سکاری وما ہم بسکاری ولکن عذاب اللہ شدید ۰

شیخ صدر الدین کہرانی ایک اور عالم ہیں۔ یہ دن میں ہمیشہ روزہ رکھتے ہیں اور رات کو نمازیں پڑھتے رہتے ہیں۔ دنیا کو انھوں نے بالکل ترک کر دیا ہے۔ لباس ان کا فقط ایک کمبل ہے۔ بہت سے امیر اُن کے پاس آتے ہیں۔ سلطان محمد خود اُن کی زیارت کیلئے آتا ہے۔ مگر شیخ اکثر سلطان سے اور اس کے امیروں سے چھپتے پھرتے ہیں۔ ایک دفعہ سلطان محمد نے اُن سے درخواست کی کہ لنگر کے خرچ کے واسطے کچھ زمین یا گاؤں قبول کر لیجئے۔ مگر شیخ نے انکار کر دیا۔ ایک دفعہ سلطان انکی زیارت کیلئے آیا تو اس نے دس ہزار دینار اُن کی نذر کئے۔ مگر شیخ نے قبول نہ کئے۔

شیخ صدر الدین تین تین دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ تین دن سے پہلے کبھی افطار نہیں کرتے۔ کسی نے پوچھا کہ اس کا کیا سبب ہے۔ فرمایا کہ "میں جب تک بیتاب نہیں ہو جاتا اس وقت تک روزہ نہیں کھولتا۔ ایسی حالت میں مُردار بھی حلال ہو جاتا ہے۔"

شیخ کمال الدین عبداللہ غازی ایک اور عالم ہیں۔ جو شیخ نظام الدین اولیا کی خانقاہ کے پاس ایک غار میں رہتے ہیں۔ میں نے تین مرتبہ اس غار میں جا کر ان کی زیارت کی۔ ایک دفعہ میرا ایک غلام بھاگ گیا۔ کچھ عرصے بعد میں نے اس کو ایک ترک کے پاس جا پایا۔ اور اُسے واپس لیجانا چاہا۔ شیخ کمال الدین نے منع کیا اور کہا کہ یہ شخص تمہارے قابل نہیں ہے اب اس کا خیال چھوڑ دو۔ پس میں نے اس ترک سے سو دینار لیکر غلام کو اسی کے حوالے کر دیا۔ چھ مہینے بعد میں نے سُنا کہ اس غلام نے اپنے آقا کو قتل کر دیا۔ پولیس نے اُسے گرفتار کر لیا۔ بادشاہ کے سامنے اُس کی پیشی ہوئی اور اسے مقتول کے وارثوں کے حوالے کر دیا گیا۔ اُنھوں نے اس کو مار ڈالا۔ یہ کرامت دیکھ کر میں شیخ کمال الدین کا معتقد ہو گیا۔ ..."

ستی ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد ابن بطوطہ ملتان سے اجودھن ہوتا ہوا سرستی اور ہانسی کی طرف جا رہا تھا۔ راستہ میں اس نے ایک عورت کے ستی ہونے کی خبر سُنی۔ اس کا بیان ہے کہ "ایک اور دفعہ میں نے دیکھا کہ ایک ہندو عورت بناؤ سنگار کئے ہوئے گھوڑے پر چڑھی چلی جاتی تھی۔ ہندو مسلمان اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ آگے آگے نوبت بجتی جاتی تھی برہمن لوگ بھی ساتھ تھے۔ مگر یہ سلطان محمد کی قلمرو میں بغیر اس کی اجازت کے جلا نہ سکتے تھے۔ سلطان نے اجازت دیدی تو عورت کو جلایا گیا۔ کچھ عرصے بعد ایسا اتفاق ہوا کہ میں ابرہی میں تھا۔ ابرہی میں اکثر باشندے ہندو ہیں اس کا حاکم سامرہ قوم کا مسلمان تھا۔ ابرہی کی نواح میں نافرمان ہندو رہتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے رہزنی کی۔ ابرہی کا حاکم ہندو مسلمانوں کے ایک دستے کو ساتھ لیکر اُن سے لڑنے کو گیا۔ بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ بادشاہ کی فوج کے سات ہندو مارے گئے۔ اُن میں سے تین کی عورتیں تھیں۔ عورتوں نے ستی ہونے کا ارادہ کیا۔ ... ستی ہونے سے تین دن پہلے وہ گانے بجانے اور کھانے پینے میں مشغول ہو گئیں۔ ... ان کے پاس ہر طرف سے عورتیں آنے لگیں اور اُن سے مل مل کر رخصت ہونے لگیں۔ چوتھے دن صبح کو اُن کے پاس گھوڑے لائے گئے۔ ہر ایک بیوہ بناؤ سنگار کرکے اور خوشبوئیں لگا کر گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ناریل تھا جس کو اُچھالتی چلی جاتی تھی۔ اور بائیں ہاتھ میں آئینہ تھا جس میں منہ دیکھتی جاتی تھی۔ برہمن اس کے ارد گرد جمع تھے۔ اور ان کے رشتے دار اُن کے ساتھ تھے۔ آگے آگے نقارے بجتے جاتے تھے۔ ہر ایک ہندو آگے بڑھ بڑھ کر اُس سے کہتا تھا کہ میرا سلام میرے ماں باپ کو، بھائی کو اور فلاں فلاں دوست کو کہہ دینا۔ وہ کہتی تھی اچھا اور ہنستی جاتی تھی۔ میں بھی اپنے دوستوں کو لیکر اُسی طرف چلا۔ تین کوس نکل گئے تو ایک ایسی جگہ آئی جہاں پانی کثرت سے تھا۔ اور درختوں کے جھنڈ اس قدر گھنے تھے کہ اندھیرا سا ہو رہا تھا۔ بیچ میں چار گنبد تھے۔ ہر گنبد میں ایک ایک بت رکھا تھا۔ گنبدوں کے بیچ میں پانی کا حوض تھا جس پر درختوں کے سائے کے سبب دھوپ نہ پڑتی تھی۔ ... جب یہ عورتیں ان گنبدوں کے پاس پہونچیں تو حوض میں اتر کر اُنھوں نے غسل کیا۔ اور غوطہ لگایا۔ اور اپنے کپڑے اور زیور اُتار کر علیحدہ رکھ دیئے۔ صرف ایک موٹی ساڑھی باندھ لی۔ اس وقت حوض کے پاس ایک نشیب میں آگ دہکا دی گئی۔ جب پر سرسوں کا تیل ڈال دیا گیا شعلے اٹھنے لگے۔ پندرہ ایک آدمی لکڑی کے بندھے ہوئے گٹھے لئے ہوئے تھے۔ اور دس ایک آدمی لکڑیوں کے بڑے بڑے کندے

گئے تھے۔ نقارے اور نفیری والے بیوہ کے انتظار میں تھے۔ آگ کو ایک رضائی کی اوٹ میں کر لیا گیا تھا۔ تاکہ ان عورتوں کی نظر نہ پڑے۔ ایک عورت نے بڑھ کر زبردستی رضائی کو چھین لیا۔ کہنے لگی "کیا میں جانتی نہیں کہ یہ آگ ہے۔ مجھے ڈراتے ہو"۔ پھر اس نے آگ کو ڈنڈوت کی۔ اور بھڑکتے ہوئے شعلوں کے اندر جا پڑی۔ عورت کا آگ میں گرنا تھا کہ نقاروں کا شور اٹھا اور نفیریاں بجنے لگیں۔ لوگوں نے پتلی لکڑیاں جو ہاتھوں میں لئے کھڑے تھے آگ میں ڈالنی شروع کیں۔ اور اوپر سے بڑے بڑے کندے ڈال دیئے تاکہ وہ عورت ہل بھی نہ سکے۔ دیکھنے والے چیخ اٹھے۔ میں عورت کو جلتے ہوئے نہ دیکھ سکا۔ بیہوش ہو گیا۔ گھوڑے پر سے گرنے کو تھا کہ مجھے میرے دوستوں نے سنبھال لیا۔ . . . "

لڑائی کے ہتیار تاریخ فیروز شاہی میں آتشباری اور آگ کا ذکر ہے۔ مگر بندوقوں کا یا بارود کا استعمال اس زمانہ میں نہ تھا۔ اور توپیں اس وقت تک معدوم تھیں۔ خاص طریقوں سے آگ پیدا کی جاتی تھی۔ کوئلوں کو بھی دہکایا جاتا تھا اور جلتی ہوئی آگ برسائی جاتی تھی۔ تلواریں چلائی جاتی تھیں۔ تیر برسائے جاتے تھے۔ اور نیزے چلائے جاتے تھے۔ ان سب کے علاوہ منجنیق اور عزادے کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ منجنیق اور عزادے سے توپوں کا کام لیا جاتا تھا۔ ان کے ذریعے قلعہ کی دیواریں توڑی جاتی تھیں۔ آگ پھینکی جاتی تھی اور پتھر برسائے جاتے تھے۔ چھوٹی منجنیق عزادہ کہلاتی تھی۔ اس زمانہ میں منجنیق کا استعمال صرف ہندوستان ہی میں نہ تھا بلکہ ساری دنیا میں تھا۔ چین میں بھی تھا اور یورپ میں بھی۔

تاریخ فیروز شاہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں تیر۔ تیغ۔ ناوک۔ سنگ مغربی۔ ساباط[1]۔ پاشیب[2] اور گرگج[3] کا بھی استعمال ہوتا تھا۔ ناوک ایک قسم کے چھوٹے نیزے کا نام تھا۔ سنگ مغربی۔ مغربی کے معنی لغات میں تو اشرفی کے ہیں۔ مگر سنگ مغربی سے مراد غالباً وہ گول گول اور چھوٹے چھوٹے پتھر تھے جو منجنیق کے ذریعے پھینکے جاتے تھے۔

سڑکیں سفرنامے سے ظاہر ہے کہ سلطان محمد کے زمانے میں بڑی بڑی اور پکی سڑکیں تھیں۔ بلکہ اس سے پہلے بھی موجود تھیں۔ وہ لکھتا ہے کہ "دہلی سے دولت آباد چالیس منزل ہے۔ اور تمام راستے پر دونوں طرف بید مجنوں اور قسم قسم کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ چلنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ باغ کے درمیان چلا جاتا ہے۔ اور ہر ایک کوس میں تین چوکیاں ڈاک کے ہرکاروں کی ہیں۔ اور ہر چوکی پر ہر چیز جس کی مسافر کو ضرورت ہوتی ہے ملتی ہے گویا وہ بازار میں جا رہا ہے۔ اسی طرح یہ سڑک تلنگانہ اور معبر کے ملک تک چلی گئی ہے جو دہلی سے چھ مہینے کا راستہ ہے۔ ہر ایک منزل پر بادشاہی محل ہے اور مسافروں کیلئے سرا ہے۔

غمی کی رسمیں ابن بطوطہ کو دہلی میں آئے ڈیڑھ مہینہ گزرا تھا کہ اس کی بیٹی کا انتقال ہو گیا۔ یہ لڑکی سال بھر سے کم تھی۔ مگر اس کے دفن و کفن کا بڑا اہتمام کیا گیا۔ بادشاہ اس وقت دار الخلافہ میں نہ تھا۔ وزیر کو خبر ہوئی تو پہلے تو اس نے پالم دروازے کے باہر ایک خانقاہ میں قبر کی جگہ تجویز کی۔ اور اس کے بعد بادشاہ کو لکھا۔ بادشاہ کا جواب دوسرے دن شام کو آ گیا۔ سفرنامہ میں لکھا ہے کہ "ہندوستان میں تیسرے دن صبح ہوتے ہی میت کی قبر پر جاتے ہیں۔ اور قبر کے اوپر گرد ریشمی کپڑے اور گدیلے بچھاتے ہیں۔ اور قبر پر پھول رکھتے ہیں۔ . . . . . نارنج اور لیموں کی ٹہنیاں بھی مع پھلوں کے قبر پر رکھتے ہیں۔ اگر ان میں پھل موجود نہ ہوں تو دھاگے کے ذریعے سے میووں کے دانے ان میں لگا دیتے ہیں۔ لوگ اپنے اپنے قرآن مجید کی جلدیں لے جاتے ہیں اور قبر کے گرد بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔ جب قرآن خوانی ہو چکتی ہے تو حاضرین کو گلاب پلایا

1. A covered passage connecting tow houses.

2. A scaffold or floor bet tow walls under which there is a lane or passage.

3. The round of a ladder, the declivity of a mountain.

جاتا ہے۔ گلاب ان پر چھڑکا بھی جاتا ہے۔ پھر انھیں پان دیئے جاتے ہیں۔

شادی کی رسمیں

سفرنامہ میں شادی کا یہ دستور لکھا ہے کہ جس مکان سے دولھا دولھن کو اپنے گھر لاتا ہے اس مکان کے دروازے پر دولھن کی جماعت کھڑی ہوجاتی ہے۔ جب دولھا کی جماعت آتی ہے تو دولھن والے دولھا والوں کو داخل ہونے سے روکتے ہیں۔ اگر دولھا والے غالب آجاتے ہیں تو چلے جاتے ہیں۔ اگر مغلوب ہوجاتے ہیں تو اُن کو ہزاروں روپئے انعام دینے پڑتے ہیں۔ دولھا کے سر پر سہرا باندھا جاتا ہے۔ جب دولھا والے برات لیکر دولھن کے مکان میں داخل ہوجاتے ہیں تو دولھا اور دُولھن دونوں کو ایک مقام پر لاکر بٹھا دیا جاتا ہے۔ وہاں عورتوں کا مجمع ہوتا ہے۔ گانے والی عورتیں بھی بیٹھی ہوتی ہیں۔ اس وقت دولھن اپنے ہاتھ سے دولھا کو پان دیتی ہے۔ اور دولھا کے عزیزوں پر سے روپئے پیسے لُٹائے جاتے ہیں۔ عورتیں اللہ اکبر کے نعرے لگاتی جاتی ہیں اور گاتی بھی جاتی ہیں۔ باہر نقارے بجتے رہتے ہیں۔ پھر دولھا دولھن کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہوجاتا ہے۔ اور دولھن دولھا کے پیچھے پیچھے ہولیتی ہے۔ دولھا گھوڑے پر سوار ہوجاتا ہے۔ اور دولھن ڈولے میں سوار ہوجاتی ہے۔ اس وقت ان دونوں پر سے روپئے پیسے نچھاور کئے جاتے ہیں۔ براتی بھی تو گھوڑوں پر ہوتے ہیں اور کچھ پیدل۔ جس امیر کے دروازے پر سے برات گذرتی ہے وہی باہر نکل کر اس پر سے نچھاور کرتا ہے۔ دوسرے دن دولہن کے گھر سے دولھا کے دوستوں کے گھر کپڑے مع نقدی کے بھیجے جاتے ہیں۔ پھر دعوت ہوتی ہے۔

یہ طریقے ابن بطوطہ نے محلسرا کی ایک شادی میں دیکھے۔ عام شادیوں میں بھی کم و بیش ایسی ہی رسمیں ہونگی۔

پردہ

سفرنامے سے ظاہر ہوتا ہے کہ پردہ اکثر ہندوؤں اور بعض مسلمانوں میں نہ تھا۔ محلسرا کی جس برات میں ابن بطوطہ شریک ہوا اس میں دولھا دولھن کی سواری کے ساتھ عورتیں بھی براتیوں میں شامل تھیں۔ بعض تو گھوڑوں پر بیٹھی جارہی تھیں اور بعض پیدل چل رہی تھیں۔ لیکن ایک دوسرے مقام پر ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ "اس ملک میں عورتیں ڈولیوں میں آتی جاتی ہیں۔" ابن بطوطہ نے ڈولی کا جو حلیہ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں پالکیوں کا رواج تھا۔



امریکہ میں ہندوستان کو بدنام کرنے کی برطانوی سازش

ایک ہندوستانی امریکن کا انکشاف

کسی کو بھی یہ ٹھیک معلوم نہیں کہ امریکہ میں ہندوستان کے خلاف مہم پر جو روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔ اس میں سے ہندوستان کو کتنا روپیہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان سے جو روپیہ بھیجا جاتا ہے وہ خفیہ فنڈوں سے لیا جاتا ہے جن پر اسمبلی اور کونسل کی رائے نہیں لی جاتی۔ ایک اندازہ یہ ہے کہ حکومتِ ہند کوئی ۲۵ لاکھ روپے سالانہ اور برطانیہ کی حکومت کوئی چار کروڑ روپے سالانہ خرچ کرتی ہے۔

مہم کیسے شروع ہوئی

برطانوی حکومت کی یہ کوئی نئی پالیسی نہیں ہے وہ گذشتہ جنگ سے ہندوستان کے خلاف منظم پراپیگنڈہ کر رہی ہے۔ مسٹر رستم جی پہلے ہندوستانی تھے جنھیں پراپیگنڈہ کرنے کیلئے امریکہ بھیجا گیا تھا ہندوستان کے متعلق سون ٹیکورے علاوں کی امریکہ میں خوب اشاعت کی گئی اور امریکن باشندوں کو بتایا گیا کہ آخر میں ہندوستان کو حکومت خود اختیاری مل جائے گی۔ لیکن ابھی تک ہندوستان کو اس حکومت کا اہل نہیں سمجھا گیا جہالت۔ ذات پات کے سسٹم، بچوں کی شادی اور ہندو مسلم مسئلہ کو ہندوستان کے بارے میں برطانوی لعنت بعض کی وجہ بتایا گیا ہے۔

گذشتہ جنگ کے بعد برطانوی حکومت نے حکومتِ ہند کے ذریعہ بہت سے امریکن تعلیم یافتہ لوگوں اور دوسرے لوگوں کو امریکہ سے بلایا ہے تاکہ ہندوستان کو بدنام کیا جا سکے۔ کیتھرین میو ہندوستان کے خلاف گندگی اچھالنے والوں کی ملکہ تھی اس نے ہندوستان کا دورہ کرنے کے بعد مدر انڈیا کے نام سے جو کتاب لکھی اس کی دس لاکھ سے زیادہ جلدیں امریکہ میں تقسیم ہوئیں۔ امریکہ کی پارلیمنٹ کے سب ممبروں۔ ملک کے اعلیٰ افسروں۔ تعلیمی ماہروں کلبوں۔ انجمنوں۔ گرجاؤں حتیٰ کہ سکول اور کالجوں کو اس کتاب کی جلدیں بھیجی گئیں۔ ان میں سے بعض کو تین تین کاپیاں مفت بھیجی گئیں۔ آج بھی برطانوی محکمۂ اطلاعات اس کتاب کی جلدیں مفت تقسیم کر رہا ہے۔ عیسائیت کے بہت بڑے حامی لارڈ ہیلی فیکس سابق وائسرائے ہند اس محکمہ کی براہ راست نگرانی کرتے ہیں۔ اگست ۱۹۴۲ء میں بوسٹن میں ریڈیو پر لوگوں کو بار بار تاکید کی گئی کہ وہ مس میو کی کتاب کا مطالعہ کریں۔ اس ریڈیو پر جو شخص پروگرام پیش کرتا تھا۔ اس کا نام ہمیشہ راز ہی میں رہا لیکن اس کا پتہ لگانا مشکل نہیں تھا۔

پراپگنڈہ کیوں کر ہوتا ہے

گذشتہ دو سال سے برطانوی سامراجی اپنے افسروں اور ایجنٹوں کے ذریعہ امریکہ میں ہندوستان کے خلاف زور شور سے پراپیگنڈہ کر رہے ہیں پراپیگنڈہ کی ان مہموں کے لئے حکومت ہند ایک خاص رقم ادا کرتی ہے۔ سر گرجا شنکر باجپائی کو پہلے ایجنٹ جنرل کی حیثیت سے امریکہ بھیجا گیا۔ اس کے بعد مسٹر جے ہنسی افسر اطلاعات کی حیثیت سے وہاں پہنچ گئے۔ ان کے پہنچنے پر ایجنٹ جنرل کا دفتر ہندوستان کے خلاف پراپیگنڈہ کرنے والے ایجنٹوں کی رہنمائی کا ایک مرکز بن گیا۔ اس دفتر میں ذریعہ ہند حکومت ہند کے ہوم سکریٹری اور انڈیا آفس لندن کے افسر اطلاعات کے نوٹ پہنچتے رہے ہیں جن کی بنیاد پر پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے تک سر فریڈرک پکل (جو اب لارڈ ہیلی فیکس کے مشیر ہیں) ہندوستان کا محکمہ اطلاعات (انڈیا آفس) کے مسٹر جانسن سے رہنمائی حاصل کرتے تھے اس کے بعد مسٹر ہنسی وغیرہ

یہ افسران بڑی بڑی جگہوں پر کام کر رہے ہیں۔ ان لوگوں میں سے جو انگریز ہندوستان کے خلاف پروپیگنڈہ کر رہے ہیں۔ ان کی تعداد ایک ہزار سے اوپر پہنچتی ہے۔

برطانیہ کے حامی امریکن جن کی تعداد چار ہزار ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں سماجی، مالی یا خاندانی رشتوں کی وجہ سے برطانیہ سے ہمدردی ہے۔ ان میں سے بہت سے امریکن مشنری ہیں جو ہندوستان آچکے ہیں اور جنھیں برطانیہ نے قیصر ہند کے تمغے دے کر اپنا طرفدار بنالیا ہے۔ یہ لوگ بہت بیہودہ قسم کا پراپیگنڈہ کرتے ہیں۔

ان لوگوں نے بہت بڑی تعداد میں مراسلات جاری کرنے شروع کیے۔ یہ مراسلات برطانوی اطلاعات کی سروسوں کی مدد سے تیار کیے جاتے تھے۔ یہ مراسلات تین طرح کے ہوتے تھے۔

(۱) بنیادی رہنمائی کے نوٹ جو برطانوی افسروں اور برطانیہ کے حامی ان معتبر امریکنوں کے پاس بھیجے جاتے تھے۔ جو سرگرمی کے ساتھ امریکہ میں برطانوی پراپیگنڈے میں مصروف تھے۔

(۲) واقعات کا پس منظر —— یہ مراسلات اگرچہ خفیہ ہوتے تھے لیکن انہیں ذریعہ کا نام لیے بغیر عام استعمال میں لایا جاسکتا تھا۔ اس قسم کے مراسلات بہت بڑے حلقہ میں بھیجے جاتے تھے۔

(۳) اخبارات کے لئے مراسلات —— جو سب اخباروں کو بھیجے جاتے تھے۔

تین قسم کے یہ مراسلات ہزاروں پتوں پر پہنچتے تھے حکومتِ ہند کے اس "افسر غلط اطلاعات" نے سینکڑوں کتابیں، رسالے اور پمفلٹ چھپوا کر مفت تقسیم کئے۔ اس کے علاوہ برطانوی اطلاعات کی سروسیں لاکھوں پتوں پر ہندوستان کے خلاف پراپیگنڈہ کے مضامین بھیجتی رہیں۔ ان میں سے کچھ مضامین انہی کی رہنمائی میں تیار ہوتے تھے۔ اور کچھ برطانوی افسر اطلاعات خود تیار کرتا تھا۔

پراپیگنڈے کے طریقے

ریڈیو اور عام جلسوں وغیرہ کے علاوہ ذاتی میل جول خط و کتابت اور نجی گفتگوؤں کے ذریعہ پراپیگنڈہ کیا گیا ہر ہفتہ سمندری جہازوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ پراپیگنڈے کے ماہر برطانیہ سے امریکہ پہنچتے ہیں۔ ان کے پہنچنے سے پہلے ہی برطانوی اطلاعات کی سروسوں کے خفیہ محکمے اور بے شمار برطانوی قونصل جو امریکہ میں پھیلے ہوئے ہیں ان کے ۔۔۔۔ دورے کا پروگرام تیار کر لیتے ہیں۔ یہ ماہرین پروپیگنڈہ جن میں برطانوی کیبنٹ کے ممبر بھی ہوتے ہیں، عام جلسوں میں تقریریں کرتے ہیں۔ مقالے پڑھتے ہیں۔ اور اخبار نویسوں، کاروباری اور تعلیمی لوگوں کو یہ یقین دلانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ برطانیہ ہندوستان کو دل سے آزادی دینا چاہتا ہے۔ ممتاز ماہرین پروپیگنڈہ کے اعزاز میں برطانوی سفارت خانوں اور قونصل خانوں میں پارٹیاں دی جاتی ہیں تاکہ اخبار نویسوں، کالج کے پروفیسروں، بینکروں صنعتی ماہروں اور دوسرے بارسوخ لوگوں کو ماہرین پروپیگنڈہ سے ملنے کے لیئے بلایا جا سکے۔ تعجب ہے کہ کچھ امریکن کسی لارڈ یا لیڈی کی ان پارٹیوں میں مدعو ہونے پر برتری اور فخر محسوس کرتے ہیں۔ برطانیہ اس قسم کے امریکنوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا رہا ہے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ امریکن جو قدرتی طور پر جمہوریت پسند ہیں اونچے اونچے خطابات کا کیونکر آر لیتے ہیں۔ بہرحال حقیقت ہے کہ امریکن اخبار نویس لارڈ ہیلی فیکس جیسے آدمیوں کا آسانی سے اثر قبول کر لیتے ہیں۔ سر فریڈ رک پکل اور حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات کے نئے سکریٹری مسٹر بوزمین حال ہی امریکہ میں ان پارٹیوں میں اور دوسری تقریبوں میں مشہور اخبار نویسوں سے ملے اور ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کے خلاف میں زہر اگلنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی اس مقصد کے لئے وہ دس ہزار کی آبادی والے چھوٹے شہروں میں بھی گئے۔ افسوس ہے کہ بعض امریکن ایڈیٹر جو ہندوستان کے دوست تھے برطانیہ کے ایجنٹوں کے ورغلانے میں آگئے [illegible] امریکہ کے مشہور اخبار "دی نیشن" میں ہندوستان کے خلاف [illegible] ایڈیٹوریل شائع ہوا سر گرجا شنکر باجپئی کے محکمے نے اس مضمون کو [illegible] چھپوایا اور اس کی وسیع اشاعت کی گئی۔

دس ہزار ایجنٹ

سرکاری اندازہ یہ ہے کہ امریکہ میں برطانیہ کے دس ہزار آدمی ہندوستان کے خلاف پراپیگنڈہ کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کو مندرجہ ذیل قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) تین ہزار برطانوی افسر جن کا کام یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی آزادی کے خلاف انگلستان کے حق میں رائے عامہ پیدا کریں۔

(۲) بہت سے برطانوی شہری جو اگرچہ ابھی امریکہ کے باشندے تو نہیں قرار دیئے گئے۔ مگر وہ اس ملک میں بس گئے ہیں، ان میں اکثر لوگ یونیورسٹیوں، کاروباری اداروں، گرجوں۔ انجمنوں، اخباروں کے دفتروں وغیرہ میں بڑے بڑے عہدوں پر ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کی تعداد دو ہزار ہے۔

(۳) وہ انگریز جو ۲۵ برس سے امریکہ میں آباد ہیں۔ اور وہ اب امریکہ کے باشندے قرار دئیے گئے ہیں، ان انگریزوں کا تمام تر مقصد یہ ہے کہ امریکن اداروں۔ افسروں اور تعلیمی گروہوں میں گھس جائیں وہ برابر اس پر زور دے رہے ہیں کہ ہندوستان پر برطانیہ کا قبضہ بہا ضروری ہے اندازہ ہے کہ ۱۹۲۹ء سے تین سو سے زیادہ برطانوی ماہرین اقتصادیات پروفیسر کاروباری ماہر اور خاص تربیت یافتہ انگریز امریکہ آچکے ہیں۔ اور وہاں بس گئے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو بیوتر برک کے بچوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ لارڈ بیوتر برک ہی وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے کہا تھا کہ ان لوگوں کو امریکہ بھیجا جائے تاکہ یہ وہاں جاکر زندگی کے مختلف شعبوں یعنی اہم جگہوں پر قبضہ کرلیں۔ آج ان میں سے بہت سے لوگ یونیورسٹیوں کاروباری اور تعلیمی اداروں حتی کہ امریکہ کی حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔

پراپیگنڈہ کی چند مثالیں درج ذیل کی جاتی ہیں۔

۱۹۴۳ء میں مسٹر اور مسز موئر کو وائسرائے، گورنروں اور والیان ریاست کے معزز مہمان کی حیثیت سے ہندوستان بلایا گیا۔ وہ دونوں پندرہ ماہ تک ہندوستان میں رہے ہیں اور ہندوستانیوں کی مہمان نوازی سے خوب لطف اندوز ہوئے اس عرصے میں انھوں نے "یہ ہندوستان ہے" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس میں ہندوستان کے خلاف خوب زہر افشانی کی گئی ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں مسٹر موئیر حکومت برطانیہ کے ملازم تھے انہیں قابل اعتماد امریکن قرار دیتے ہوئے ہندوستان کے خلاف کتاب لکھنے کا کام انھیں سونپ دیا گیا۔ مسٹر موئیر مارچ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۴ء کے وسط تک ہندوستان میں رہے۔ امریکہ میں برطانوی انفارمیشن سروس نے ان کی کتاب کے مسودہ کی نظر ثانی کی اور وہ از سرے نو لکھا گیا۔ برطانوی انفارمیشن سروس نے اور ہندوستان کے محکمہ اطلاعات نے مفت تقسیم کرنے کے لیے اس کتاب کی تین ہزار جلدیں خریدیں

مسٹر پوسٹ ویلز نے "ہندوستان۔ طوفان کا مخالف" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی۔ پوسٹ ویلز ہندوستان میں امریکن قونصل خانہ میں کام کرتے تھے۔ لیکن برطانیہ نے ان کی خدمات حاصل کرلیں، ایک ہندوستانی یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹر کی ڈگری دی۔ اس کے بعد انہیں یہ کتاب لکھنے پر آمادہ کیا گیا۔ برطانوی انفارمیشن سروس نے خود اس کتاب کی تنقید لکھی اور اسے مختلف اخبارات کو بغرض اشاعت روانہ کیا۔" یہ کتاب بھی مصنف کے مقدمے کے ساتھ پبلشر کے نام سے شائع ہوئی۔ اور اسے بھی سارے امریکہ میں تقسیم کیا گیا۔

سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کا انکار

حال ہی میں برطانوی وزارت اطلاعات نے بعض امریکنوں کو ہندوستان بھیجنے کی کوشش کی۔

(۱) ییل یونیورسٹی کے ایک پروفیسر آرکرے جو ۱۹ برس تک ہندوستان میں رہ چکے ہیں۔ انہیں ہندوستان کا دورہ کرنے کی درخواست کی گئی۔ لارڈ ہیلی فیکس نے اس معاملہ میں ذاتی دلچسپی لی لیکن حکومت امریکہ نے مسٹر آرکر کی حوصلہ افزائی نہیں کی اور انھیں ہندوستان آنے سے روک دیا۔ حکومت نے محسوس کیا کہ اگر مسٹر آرکر نے یہ دورہ کیا تو ہندوستان میں امریکن باشندوں کی شہرت کو صدمہ پہنچے گا۔ چنانچہ ایک "غیر جانبدار" امریکن مشاہد کو ہندوستان بھیجنے کی اسکیم ناکام رہی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس معاملے میں لارڈ ہیلی فیکس اعلیٰ حکام تک پہنچے۔ لیکن وہ انھیں رضامند نہ کرسکے۔

(۲) برطانیہ کی وزارت اطلاعات نے ایک امریکن فوٹو گرافر کو ہندوستان بھیجنے کا انتظام کیا تاکہ وہ جو فوٹو لائے انہیں امریکہ میں پراپیگنڈہ کے لئے استعمال کیا جاسکے۔ اس فوٹو گرافر نے پاسپورٹ کے لیے درخواست دی لیکن شاید مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر اس کی درخواست بھی مسترد کردی گئی۔

(۴) برطانوی حکومت نے ایک حبشی وکیل کو ہندوستان کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ لیکن اس وکیل کو بھی حکومت امریکہ نے پاسپورٹ نہیں دیا۔

امریکہ کی حکومت امریکن اخبار نویسوں سے زیادہ عقلمند معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ بعض امریکن اخبار نویس آسانی سے برطانوی وزارت اطلاعات کے جھانسے میں آگئے جو سرکردہ امریکن اخبار نویس اخبارات میں اعلانیہ برطانوی سامراج کی حمایت کر رہے ہیں۔ ان میں والٹر لپ مین۔ ڈرو تی تھامسن۔ میجر فیلڈنگ ایلوٹ۔ فلپ سمس ویول ووٹ اور بانٹ نوور۔

"ان امریکن اخبار نویسوں کے بڑے بڑے برطانوی افسروں سے ذاتی تعلقات ہیں اور کبھی کبھی برطانوی افسر اخبار نویسوں کے اعزاز میں پارٹیاں بھی دیتے رہتے ہیں۔" لیکن امریکن اخبار نویسوں کی اکثریت ہندوستان کی آزادی کے حق میں ہے۔ اور مذکورہ بالا اخبار نویسوں نے جو مضامین لکھے ہیں ان سے وہ امریکن عوام کی رائے نہیں بدل سکے۔ اگر آپ کسی امریکن سے ہندوستان کے مسئلہ پر گفتگو کریں۔ تو وہ چھوٹتے ہی کہے گا۔ کہ برطانیہ ہمیں بے وقوف نہیں بنا سکتا۔ برطانیہ ہندوستان کے خلاف جو پراپیگنڈہ کر رہا ہے۔ اس سے متوسط درجہ کے امریکن نفرت کرتے ہیں اور ان میں سخت ناراضگی پھیلی ہوئی ہے۔

جن ایڈیٹروں نے ہندوستان کے خلاف مضامین لکھے ہیں ان سے اکثر برطانوی النسل ہیں جو امریکہ کے باشندے بن گئے ہیں مثلاً واشنگٹن پوسٹ کے ایڈیٹر کے کچھ مضامین نیویارک ٹائمز جیسے اخبار میں شائع ہوئے جس کا برطانیہ کے دفتر خارجہ سے خاص تعلق ہے اور یہ تعلق کسی سے پوشیدہ نہیں۔ امریکہ کے اخبارات میں ہندوستان کے خلاف جو مضامین شائع ہوتے ہیں وہ مشنری بھیجتی ہیں جنھیں برطانیہ کی طرف سے امداد ملتی ہے اور جو ہندوستان میں زمانۂ قیام میں برطانیہ کی مہمان رہ چکی ہیں۔ اور اعزازات اور خطابات پا چکی ہیں۔ اس کے علاوہ برطانیہ کے پاس بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو اخبارات کو خطوط لکھتے ہیں جن میں وہ ہندوستان کی آزادی کے خلاف دلیلیں پیش کرتے ہیں۔

نیویارک ہیرالڈ ٹریبیون میں ایک برطانوی پراپیگنڈہ باز کا ایک خط شائع ہوا تھا۔ جو بطور نمونہ درج ذیل کیا جاتا ہے

"مسٹر گاندھی کے پاس کوئی تعمیری پروگرام نہیں ایسی حکومت سے یک دم نجات حاصل کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے جس نے ہندوستان کو ترقی کی اس منزل پر پہنچا دیا جس پر وہ دو ہزار سال میں بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں اب تک ہندوستان کو عیسائیت اور برطانوی سلطنت کے ہی ٹھوس فائدے پہنچے ہیں۔

مسٹر گاندھی کو اچھوتوں سے کوئی محبت نہ تھی لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ آئین کی رو سے اچھوتوں کو کچھ ووٹ حاصل ہوگئے ہیں تو ان کا دل اچھوتوں کے لیے گانی پسیجنے لگا۔"

سازش میں کینیڈا بنک کا حصہ

دسمبر ۱۹۴۳ء میں کینیڈا کے رائل بنک نے ہندوستانی ٹیکس دہندوں یا برطانوی دفتر اطلاعات کے خرچے پر چار صفحہ کا ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں لکھا تھا

"ہندوستان کو پسماندہ انسانوں کی ایک بستی بتایا گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہت سی بنیادی آزادیاں ہندوستان کو دوسرے ممالک سے زیادہ حاصل ہیں۔"

اس پمفلٹ میں امریکن عوام پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کہ حقیقی نقطہ نگاہ سے ہندوستان ایک جنت ہے اور ہندوستانی کارخانہ دار جنگ سے بڑی بڑی رقمیں کما رہے ہیں امریکنوں کو یہ بھی بتایا گیا کہ ہندوستان میں جو وائی قحط تھا۔ برطانیہ نے اس کا سدباب کیا۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ پمفلٹ کی اشاعت کے وقت صرف صوبہ بنگال میں دس لا[illegible] سے دم توڑ رہے تھے۔ غالباً کینیڈا کے رائل بنک نے اپ[illegible] کے وہ اخبارات نہیں پڑھے جن میں بنگال کے قحط زدہ لوگوں کے لیے حکومت کینیڈا کی گیہوں کی پیشکش کو نمایاں جگہ دی گئی تھی۔

پادریوں کی زہر فشانی!

واشنگٹن میں برطانیہ کے پراپیگنڈہ افسروں نے امریکہ کی مشہور فیڈرل کونسل آف چرچیز آف کرائسٹ کو آٹھ صفحات کا ایک بلیٹن شائع کرنے پر آمادہ کیا۔ اس مضمون میں انڈین نیشنل

کانگریس کے متعلق مندرجہ ذیل الفاظ لکھے ہیں۔

"اس جماعت کے داخلی نظام کا جمہوریت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ نظام ایک چھوٹی سی ٹولی کے ہاتھ میں ہے۔ آئینی حکومت سے اس کے دلچسپی لینے کا دار و مدار صرف اس بات پر ہے کہ وہ پوری طرح منظم رہ پائے کہ وہیں مستقل اکثریت حاصل رہے۔ مسلم لیگ ہندو مہاسبھا اچھوت اور انڈیپینڈنٹ لیبر کانگریس پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ دوسری پارٹیوں اسے ایک آنکھ نہیں بھاتیں وہ خود ہی سارے ملک پر چھا جانا چاہتی ہے۔ کانگریس بالکل فاشسٹ اور نازی حکومتوں کی طرح ہے۔ اس کے ہاتھ میں اقتدار جانا جمہوریت کی ... صرف ... ہوگی۔"

برطانوی انفارمیشن سروس نے سیکرٹری کا یہ پمفلٹ لاکھوں کی تعداد میں چھپوا کر امریکہ کے مختلف حصوں میں تقسیم کرایا۔

اس پمفلٹ میں ایک دلچسپ انکشاف یہ کیا گیا تھا کہ ۱۹۳۹ء سے لے کر اب تک کانگریس کے ۳۰ لاکھ ممبر کم ہو گئے

ہندوستان کو سیاست سے دلچسپی نہیں

برطانوی انفارمیشن سروس نے "ہندوستان میں کیا آزادیاں" کے زیر عنوان ایک پمفلٹ شائع کیا تھا جس کے خاص خاص نکات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

"... ایک امریکن اخبار کے ایڈیٹوریل میں لکھا تھا۔ ہندوستان کے عوام کے ساتھ غداری کرنا اتحادی اقوام کے ساتھ غداری کرنے کے مترادف ہے۔"

ایک اور ایڈیٹوریل میں لکھا تھا۔ "ہندوستان کے لوگ آزادی مانگتے ہیں۔"

"ہندوستان کے باشندوں کی امیدیں اور اندیشے کیا ہیں اور ہندوستان جمہوریتوں اور ڈکٹیٹروں کے خلاف جنگ میں کیا حصہ لے رہا ہے؟"

"کوئی حکومت عوام کی مدد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی اور عوام کی سرگرم مخالفت کے سامنے تو وہ ٹھہر ہی نہیں سکتی۔"

"حکومت ہند اور ہندوستانی کسانوں اور مزدوروں کے درمیان کوئی تنازعہ نہیں ہے۔ ہندوستان کی ۳۸ کروڑ ۹۰ لاکھ کی آبادی میں سے ۹۰ فیصدی کسان اور مزدور ہیں۔"

کانگریس اور دوسری جماعتوں کے چند لاکھ سرگرم کارکن سیاسیات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ورنہ عوام الناس کسان اور مزدور ہیں جنھیں صرف اپنی فصلوں سے دلچسپی ہے۔"

سیاسیات سے دلچسپی

پڑھے لکھے شہریوں کو ہے۔ ہندوستان کے شہروں میں عورتوں اور پندرہ سال سے کم کے عمر کے بچوں کو سیاسیات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق شہروں میں مرد ہندوؤں کی آبادی ایک کروڑ ۳ لاکھ اور مرد مسلمانوں کی آبادی ۴۰ لاکھ تھی یہ تعداد کوئی ۲ کروڑ تک پہنچتی ہے۔ چونکہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے بعد سے آبادی پندرہ فیصدی بڑھ گئی ہے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں کوئی دو کروڑ ۳۰ لاکھ آدمی سیاسیات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۳۶ کروڑ ۶۰ لاکھ ہندوستانی سیاست سے بالکل بے بہرہ ہیں ہو سکتا ہے کہ یہ حقیقت افسوسناک ہو یا نہ ہو لیکن یہ حالت برطانوی راج کی پیداوار نہیں ہے ہندوستان کی تاریخ کی ورق گردانی کر جائیے۔ بادشاہ اور فاتح آئے اور گئے فوجیں لڑیں اور خون بہائے لیکن کسان روزمرہ کے کاموں میں مصروف رہے۔ عوام نے نہ حکمرانی کی یہ لڑائیاں لڑیں بلکہ یہ لڑائیاں جنگجو طبقوں نے لڑیں۔"

"اگست اور ستمبر کے سیاسی ہنگاموں میں کسان اپنے پرسکون گاؤں کے آس پاس ہل چلاتے رہے۔"

"وہ کونسی طاقت ہے جو حکومت ہند اور باشندگان ہند کو متحد کئے ہوئے ہے؟"

"اٹلانٹک چارٹر میں جنگ کے بعد ہر ملک کو چار آزادیاں دینے کا وعدہ کیا گیا ہے۔"

"(۱) تقریر کی آزادی (۲) مذہبی آزادی (۳) خطرات سے آزادی (۴) احتیاج سے آزادی۔"

"دوسرے ملکوں سے پہلی تین آزادیوں کا وعدہ کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہندوستان سو سال سے زیادہ عرصے سے ان آزادیوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔"

تقریر کی آزادی

"تقریر کی آزادی کا سیاسیات سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ کسان کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ اسے فصلوں، آبپاشی، لگان اور گاؤں کی عام بھلائی کے معاملے میں اپنی بات کہنے کا موقع ملتا ہے۔ ضلع افسروں کے ریکارڈوں، اور کمشنروں، صوبائی حکومتوں اور گورنروں کے نام جو بے شمار درخواستیں آتی ہیں۔ ان کو پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ عوام کو کس وسیع پیمانہ پر تقریر کی آزادی حاصل ہے اور حکومت ان کی درخواستوں پر کس پھرتی سے کاروائی کرتی ہے۔

خطرات سے آزادی

"تقریر کی آزادی کی طرح ہندوستانیوں کو یہ آزادی بھی عرصے سے حاصل ہے۔ گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے ہندوستان پر حملہ نہیں ہوا لوگ لٹیروں اور ڈاکوؤں سے محفوظ ہیں۔ اور وہ امن و امان اور ایک مضبوط حکومت کے فائدے حاصل کر رہی ہیں۔

احتیاج سے آزادی

یہ ایسا مقصد ہے جو ابھی تک دنیا کے کسی ملک نے حاصل نہیں کیا ہمارے ملک کی حکومت اور اپنی رعایا کے لئے یہ مقصد حاصل کرنے کی مختلف کوششیں کی ہیں۔ اور حکومت ہند بھی ان کوششوں میں دوسری حکومتوں سے پیچھے نہیں ہے۔

برطانوی انفارمیشن کے ایک مقالے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ ان کی دلچسپیاں گاؤں سے صرف پانچ پانچ میل دور تک محدود ہیں لیکن دوسرے مضمون میں امریکنوں کو یہ بتایا گیا کہ ہندوستانی کسان اور مزدور جانتے ہیں کہ ہٹلر اور ٹوجو کے مقاصد کیا ہیں اور وہ کبھی کبھی ٹوجو اور ہٹلر کے خلاف نعرے لگاتے ہیں

"گاندھی جی کیوں برت رکھ رہے ہیں؟" عنوان سے ایک اور خفیہ پمفلٹ شائع کیا گیا جس میں امریکنوں کو بتایا گیا کہ گاندھی جی کے برت سے جاپانیوں کو مدد ملے گی۔ ان کے برت کی اشاعت سے ہندوستان کی تحریک آزادی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ ان کے برت کا یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ ملک میں جلسے شروع ہو جائیں۔ گاندھی جی کو امید ہے کہ انکی بکری کا دودھ اور لنگوٹی پھر بیرونی دنیا کی توجہ مبذول کریں گے اور غیر ممالک کے اخبارات جلی سرخیوں میں برت کی خبریں شائع کریں گے۔ اور اس طرح کانگریس کے مطالبہ آزادی کی طرف پھر توجہات مبذول ہو جائیں گی۔ اگر اخباروں میں برت کی خبریں شائع ہوئیں تو گاندھی جی اپنا پہلا مقصد حاصل کر لے گا۔" اس پمفلٹ کے مصنف نے پہلے سانس میں یہ کہا کہ برت سے ہندوستان کو آزادی حاصل کرنے میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔ اور دوسرے سانس میں اپنے پہلے بیان کی یہ تردید کر کے یہ تسلیم کر لیا کہ برت کی خبروں سے کانگریس کے مطالبہ آزادی کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول ہو جائے گی۔

صرف ہندوستانیوں پر مشتمل وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل بنانے سے انکار کی۔ برطانوی ایجنٹوں نے امریکنوں کے سامنے یہ صفائی پیش کی۔ "ایگزیکٹو کونسل میں چار انگریز ممبر ہیں۔ وہ فرقہ وارانہ مسئلوں کو ان کے حسن و قبح پر جانچتے ہیں۔ موجودہ صورت میں کونسل میں ہندوستانی جماعتوں اور مفادات کی نمائندگی کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے۔ لیکن اگر انگریز ممبروں کو نکال دیا جائے تو نمائندگی کا مسئلہ بہت اہم بن جائیگا۔"

ایک اور بہانہ

امریکہ میں برطانوی ایجنٹوں نے ایک اور پمفلٹ شائع کیا جس میں بتایا گیا۔ کہ وائسرائے نے مسٹر راجگوپال آچاری کو گاندھی جی سے ملنے کی کیوں اجازت نہیں دی۔ اس پمفلٹ میں جو وجوہ بتائی گئیں وہ درج ذیل کی جاتی ہیں۔

"ایسا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ گاندھی جی نے راجگوپال آچاریہ سے درخواست کی ہے کہ وہ مصالحت کے خیال سے گاندھی جی سے ملیں۔ جناح نے حال ہی میں جو بیانات دیئے ہیں۔ ان سے کچھ اور ہی ظاہر ہوتا ہے۔ تحریک سول نافرمانی کے سلسلے میں کہیں کہیں ابھی تک حادثات پیش آ رہے ہیں اور عام لوگ بالخصوص مسلمان ان حادثوں کو کانگریس سے وابستہ کرتے ہیں۔

"کئی لحاظ سے گاندھی جی کانگریس میں شامل ہے۔ ایک شال

بھی نہیں ملتی کہ کانگریس نے گاندھی کی خواہش کے خلاف کام کیا ہو۔ گاندھی سے ملنے کی اجازت دینے کا ہندوستان میں فوراً یہ مطلب سمجھا جائے گا کہ حکومت کو شکست ہوگئی اور وہ کانگریس سے گفت و شنید کرنا چاہتی ہے۔

گاندھی جناح ملاقات

• کیا گاندھی کو جناح سے ملاقات کرنے کی اجازت دے دی جائے" اس عنوان سے ۲۰ مئی ۱۹۴۳ء کو ایک خفیہ پمفلٹ جاری کیا گیا جس میں امریکنوں کو بتایا گیا کہ گاندھی نے ہنگاموں کی مذمت نہیں کی۔ اگر ان ہنگاموں کو عوام کی حمایت حاصل ہوتی اور اگر ہنگامے کامیاب رہتے تو ہندوستان پر جاپان کا قبضہ ہوگیا ہوتا۔

صوبجاتی حکومتوں کے اختیارات

برطانوی ایجنٹوں نے ایک اور پمفلٹ یہ لکھ کر امریکنوں کو غلط فہمی میں مبتلا کیا کہ صوبہ سرحد اور آسام کی حکومتوں کو وہی اختیارات حاصل ہیں جو حکومت امریکہ کو حاصل ہیں۔ ایک مبصر نے امریکہ کے ...... دی آوٹ میں کہا "مجھے معلوم ہے کہ صوبہ سرحد میں اقلیت حاکم ہے اور اکثریت پارٹی کانگریس جیل میں ہے۔ اصل میں برطانیہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اس نے صوبۂ سرحد میں جمہوری حکومت قائم کردی ہے لیکن وہ اس کا امریکہ کی حکومت سے کیسے مقابلہ کرسکتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ایک بھی ایسی مثال موجود نہیں کہ اکثریت والی پارٹی کو جیل میں بند کردیا گیا ہو اور عوام پر اقلیت کی حکومت ٹھونس دی گئی ہو۔"

... اس پمفلٹ کی سرخیاں ... تھیں۔

(۱) ... کروڑ پچاس لاکھ ہندوستانی ... اپنے اوپر خود حکومت کرتے ہیں۔

(۲) کئی صوبوں میں صوبجاتی خودمختاری پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔

(۳) صوبۂ سرحد میں پھر ہردلعزیز حکومت قائم ہونے کی اہمیت۔

• ہندوستان کو آزادی دینے سے دشمن پر جلد فتح ہو جائے گی یا اس میں دیر لگے گی؟" اس عنوان کے ماتحت ایک اور دلچسپ پمفلٹ شائع کیا گیا ہے۔ پمفلٹ میں لکھا ہے کہ غیر ملکوں کو ہندوستان کے لوگوں سے واقفیت نہیں ہے۔ اگر برطانیہ نے کسی سیاسی سمجھوتے کی حمایت کی تو یہ مسلمانوں یا سکھوں یا ہندوؤں کے مفادات کے خلاف ہوگا۔ اور اس سے فرقہ وارانہ کشت و خون شروع ہو جائے گا جس سے پندرہ لاکھ سے زیادہ والنٹیر ہندوستانی سپاہیوں کی وفاداری میں فرق آئے گا۔ ان جھگڑوں کا فوجیوں کے باہمی تعلقات پر بہت برا اثر پڑے گا اور انہیں ہر وقت اپنے بال بچوں کا خیال ستاتا رہے گا۔

اس لیے اگر کسی بڑی ہندوستانی جماعت پر باہر کا کوئی سیاسی سمجھوتہ ٹھونسا گیا تو ایک طاقتور اور آزمودہ کار فوج اتحادیوں کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ کیا اس سے جلد فتح حاصل ہوگی؟"

فلپس کا معاملہ

ہندوستان میں صدر روزولٹ کے نمائندے مسٹر ولیم فلپس کو جیل میں گاندھی جی سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی اس کی صفائی میں برطانوی پراپیگنڈہ ایجنٹوں نے امریکنوں کو بتایا کہ حکومت ہند کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتی جس سے ہندوستان کے ...... ان لوگوں کا جوش کم ہو جائے جو جنگی کوششوں میں شاندار مدد دے رہے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک مصالحت کی گفت و شنید شروع ہونے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ گاندھی جی صاف صاف لفظوں میں ہنگاموں کی مذمت کریں۔ اگر اس کے بغیر گفت و شنید شروع ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہنگامہ شروع کرنے والے جیت گئے۔"

یہ عذر لنگ اس حالت میں پیش کیا گیا ہے۔ جبکہ ولیم فلپس کو ملاقات کی اجازت نہ ملنے سے آٹھ مہینے پہلے ہی گاندھی جی ہنگاموں کی مذمت کرچکے تھے۔

کچھ عرصہ ہوا اس قسم کا معذرت نامہ امریکہ میں شائع کیا گیا تھا۔ یہ معذرت نامہ فلسکیپ سائز کے بارہ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کا عنوان تھا۔ ہندوستانی مسئلے کی ضروری باتیں۔ مندرجہ ذیل دو

وعدے کئے گئے تھے۔ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں رہنے کا حق ہے۔ تو انگریزوں کو بھی ہے۔ پانچ سطروں کے بعد نہایت بھولے پن سے یہ کہا گیا کہ ہم انگریز اس اصول کا پوری طرح حامی ہے کہ ایک قوم کو کسی دوسری قوم پر اس کی مرضی کے خلاف حکومت نہیں کرنی چاہئے"۔ کسی برطانوی نمائندہ نے ہندوستان کی اسمبلی اور کونسل میں اس اصول کو تسلیم نہیں کیا۔ اور نہ برطانوی حکومت نے اپنے بے شمار اعلانات میں اس قسم کا کوئی ذکر کیا۔ لیکن امریکہ میں ضرورت کے وقت سب کچھ کہہ دیا جاتا ہے۔ ذیل میں برطانوی پراپیگنڈہ پمفلٹوں کے دو حصے درج کئے جاتے ہیں۔ جنھیں آپ دلچسپی سے پڑھیں گے۔

اگر ہندوستانی یورپ کے حکمراں ہوتے؟

ہندوستان کی عام حالت کو سمجھانے کے لئے یہ مثال دی جاسکتی ہے کہ فرض کیجئے سترویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے تجارت پیشہ لوگوں نے اٹلی میں اپنے تجارتی مستقر قائم کرلئے۔ اس عرصے میں اٹلی کی بے شمار ریاستوں کے درمیان متواتر جنگ وجدال جاری رہی چونکہ یورپ پر روم کے بادشاہ کا ایک مبہم اقتدار قائم تھا۔ اس لئے ہندوستانی تاجروں نے اس کی پناہ لی اور اس سے تجارت کرنے کی اجازت نامے حاصل کرلئے۔ بعد میں ہندوستانی تاجروں نے دیکھا کہ بادشاہ ان کی حفاظت نہیں کرسکتا اور مقامی جنگ وجدال سے ان کی تجارت خراب ہورہی ہے۔ تو انہوں نے اپنے کارخانے قلعہ بند کرنے شروع کردیئے۔ اور ہندوستانی سپاہیوں نے ان کارخانوں کا بچاؤ کیا۔ پڑوس کی اطالوی ریاستوں کو ہندوستانی سپاہیوں کی جنگجویانہ خوبیوں کا جلد ہی علم ہوگیا۔ کسی کسی ریاست نے بطور اتحادی ہندوستانیوں کو اپنی خدمات پیش کردیں جب ہندوستانیوں کو فتح ہوگئی تو انہیں تجارت کرنے کے زیادہ مواقع ملے۔ اور پہلے سے زیادہ علاقہ ان کے قبضے میں آگیا۔ اس کے علاوہ اگر تجارت کرنے کے حقوق حاصل کرنے کے بجائے اور زیادہ علاقہ پر قبضہ کیا جائے تو زیادہ فائدہ پہنچے گا۔

"مختصر یہ کہ جو ہندوستانی تجارت کرنے کی غرض سے اٹلی آئے تھے وہ یورپ کی سیاسیات میں گھل مل گئے۔ اور کچھ مدت میں ان کا یورپ کی بڑی فوجی طاقتوں میں شمار ہونے لگا۔ اور آخر میں یعنی ۱۸۵۰ء تک وہ ہندوستانی ایک بالادست طاقت بن گئے۔

ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ ۱۷۵۰ء سے براعظم یورپ پر ایک بدیشی ہندوستانی حکومت قائم ہے۔ اس کا یورپ پر کیا اثر ہوتا؟"

پہلا اثر تو یہ ہوتا کہ ۱۸۶۶ء میں پرشیا اور آسٹریا کے درمیان ۱۸۷۰ء میں فرانس اور پرشیا کے درمیان جنگ نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ نہ بلقان کی جنگ اور نہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم ہوتی اور ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوتی"

"مشترکہ زبان کا تحفہ"

"ہندوستانیوں نے (جنھیں ہم نے یورپ کا فاتح فرض کرلیا ہے۔ ایک مرکزی نظام قائم کرلیا اور اس کے لئے سول سروس کی ضرورت ہوئی۔ شروع شروع میں تو بڑے بڑے عہدے ہندوستانیوں کو دیئے گئے۔ لیکن دوسرے درجہ کی اہمیت کی دوسری جگہوں پر ہندوستانیوں کو مقرر کیا گیا۔ کیونکہ حکومت کی سرکاری زبان ہندوستانی تھی۔ اس لیے سب یورپینوں کو جو سرکاری ملازمت چاہتے تھے ہندوستانی سیکھنی پڑی کیراکاؤ سے بارسلونا تک ہندوستانیوں نے بے شمار تجارتی ادارے قائم کرلئے اور ان کا سارا کاروبار ہندوستانی میں ہونے لگا چنانچہ ہندوستانی سب تعلیم یافتہ یورپینوں کی مشترکہ زبان بن گئی۔ تاکہ شمال میں فنی جنوب میں ہسپانوی مغرب میں فرانسیسی اور مشرقی بلغاروی بے تکلفی کے ساتھ آپس میں بات چیت کرسکیں۔

"ہندوستانیوں نے یورپ کے ترقی کرتی ہوئی صنعتوں میں بہت سا سرمایہ لگادیا۔ اور اس وسیع علاقے میں تجارتی آزادی قائم کردی۔ ہندوستانیوں نے سڑکیں بنائیں نہریں نکالیں اور ریلیں چلائیں پہلے ان میں سے کوئی چیز نہیں تھی۔

"اگر یہ تصویر فرضی نہ ہوتی بلکہ حقیقی ہوتی تو کیا نتائج رونما ہوتے؟ یقین کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ یورپ کی مختلف قومیں یعنی ترک۔ یونانی۔ پرتگالی۔ سویڈ۔ اسٹونین جرمن فرانسیسی اپنے آپ کو رومانوی۔ ترک۔ یونانی اور پرتگالی وغیرہ سمجھنے سے زیادہ یورپین سمجھتیں انھیں پہلی بار تمام یورپ کے نقطہ نظر سے اپنے معاملات پر غور کرتیں یہ احساس پیدا ہونے کے ساتھ ہی وہ یہ بھی محسوس کرنے لگتیں کہ ان کی تہذیب غیر ملکی حکمرانوں (ہندوستانیوں) سے الگ ہے۔

"یہ احساس پیدا ہونے کے بعد یورپ میں ایک قوم پیدا ہو

تحریک شروع ہو جاتی۔ پہلے یہ مطالبہ کیا جاتا کہ ہندوستانی حکومت میں یورپینوں کو اور زیادہ حصہ دیا جائے۔ پھر یہ مطالبہ ہونے لگتا کہ ہندوستانی سلطنت میں یورپین کو برابر کا درجہ دیا جائے۔

تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ کوئی شخص کسی چیز پر سے آسانی کے ساتھ اپنا قبضہ نہیں اٹھاتا۔ نتیجہ ہندوستانیوں کے خلاف یورپینوں کے ایجی ٹیشن کا رد عمل تک بڑھتا رہتا۔ ہمارا خیال ہے کہ ہندوستانی خود محسوس کرتے کہ یورپینوں کے مطالبہ کی قوت بڑھتی جا رہی ہے۔ اور اگر ایک ہندوستانی دولت مشترکہ قائم کر دی جائے جس میں یورپ بھی شامل ہو تو ہندوستانی سلطنت زیادہ مضبوط ہو جائے گی۔ ہندوستانی حکمرانوں نے مختلف آئینی اصلاحات دیں۔ اعلیٰ عہدوں پر ... فی صدی تک یورپیوں کو مقرر کیا۔ اور آخر میں یورپ کو درجہ مقبوضات دینے کا وعدہ کر لیا۔

"جونہی یورپیوں نے یہ محسوس کیا کہ حکومت خود اختیاری چند سال کے اندر اندر مل جائے گی۔ ان کے آپس کے اختلافات پھر پیدا ہو گئے۔ مثلاً فرانسیسیوں نے اپنے روایتی دشمن جرمن اکثریت کے مقابلہ میں اقلیت بننا گوارا نہیں کیا۔ دوسری اقلیتوں نے بھی تحفظات کا مطالبہ کیا۔ کہ ملی ہندوستانی حکومت کے دستوں سے ... تک یورپیوں میں اقلیتوں کے تحفظات کے متعلق اختلافات باقی ہیں۔ اس وقت تک ہندوستان یورپ کو درجہ نوآبادیات نہیں دے سکتا۔ ہندوستانی حکومت کے مخالفوں کا یہ کہنا تھا کہ نوکر شاہی قائم رکھنے کے لئے ہندوستانیوں کا یہ ایک بہانہ ہے۔

"اس مثال سے بہت بڑی حد تک ہندوستان کی صورت حالات کا نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔

"انگریز تاجر ہندوستان گئے۔ وہاں انھوں نے مغل بادشاہ کی منظوری سے کارخانے قائم کئے۔ وہ پہلے تو شہنشاہ کی پناہ میں رہے۔ لیکن وہاں وہ محفوظ نہیں رہ سکے۔ اس لئے انھوں نے اپنے کارخانوں کو قلعہ بند کر لیا۔ وہ ہندوستانی سیاسیات میں گھس مل گئے۔ اور آخر کار سب سے زیادہ علم میں ایک بالادست طاقت بن گئے۔ قوم پرور طبقے کے دباؤ سے برطانیہ نے ہندوستان کو کچھ اصلاحات دیں۔ یہ اصلاحات بڑھتے بڑھتے ۱۹۳۵ء کے آئین تک پہنچ گئیں۔ اس آئین کا پہلا حصہ ۱۹۳۷ء میں نافذ ہو گیا۔ آئین کا دوسرا حصہ یہ تھا کہ ہندوستانی ریاستوں کو ملا کر برطانوی ہند کا ایک فیڈریشن قائم کیا جائے۔ لیکن پارٹیوں نے اس حصہ پر اعتراض کیا۔ اور اس کے اجرا میں تاخیر ہو گئی۔ اس قانون کے ماتحت مرکزی جماعت قانون ساز میں اقلیتوں کے لئے نشستیں محفوظ کر دی گئی ہیں۔ لیکن کٹر ہندوؤں کو سب سے بڑی اکثریت حاصل ہوئی۔ پھر بھی ہندوؤں کو کسی نہ کسی اقلیت کے ساتھ مل کر حکومت بنانی پڑتی۔ جسے انھوں نے پسند نہیں کیا۔

"دوسری طرف مسلمانوں نے یہ اعتراض کیا۔ کہ ان کے مفادات کے تحفظ کا کافی انتظام نہیں کیا گیا۔ دستور کے دوسرے حصے پر عمل کرانے کے لیے کوئی اور قدم نہیں اٹھایا جا سکا۔ کیونکہ جنگ شروع ہو گئی۔

برطانوی راج کی برکات

آج بار بار برطانیہ سے کہا جاتا ہے کہ اس نے ہندوستان کے متعلق جو پوزیشن اختیار کر رکھی ہے اسے صحیح ثابت کرے۔ ہندوستان پر برطانیہ کے قبضہ رہنے کا بنیادی جواز یہ نہیں کہ برطانیہ کی بدولت ہندوستان نے تجارتی اور صنعتی ترقی کی۔ آبپاشی کے وسائل بڑھے سڑکیں بنیں اور ریلیں جاری ہوئیں نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ برطانیہ نے ہندوستان کو جن کی خودمت بخشی وہ ہندوستان پر برطانوی قبضہ کا جواز ہے پھر بھی ان فائدوں کو ذہن میں رکھ کر اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ برطانیہ نے ہندوستان میں کیا کیا ہے۔ مثلاً ہندوستان میں چھ کروڑ پچاس لاکھ ایکڑ ایسی زمین ہے جو مصنوعی طریقوں سے سیراب ہوتی ہے۔

"دنیا کے کسی حصے میں اتنا بڑا علاقہ مصنوعی طریقوں سے سیراب نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں ۴۲ ہزار میل لمبی ریل کی پٹریاں ہیں۔ ایشیا کے کسی ملک میں ریل کا ایسا زبردست نظام قائم نہیں۔ ہندوستان کی ریلوں کا یہ نظام دنیا میں تیسرے درجہ پر ہے صرف امریکہ اور روس کی ریلیں ہندوستان کی ریلوں سے بازی لے گئی ہیں۔ ان ساری باتوں کا لحاظ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہندوستان پر برطانیہ کے قبضہ کا بنیادی جواز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر انھیں بنیادی جواز قرار دے دیا جائے تو اس پر منصفانہ نکتہ چینی کی جا سکتی ہے۔

"اعتراض کرنے والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ برطانیہ نے اپنا سرمایہ نہیں لگایا۔ ہندوستان میں جو نہریں نکلیں جو سڑکیں اور ریلیں بنیں ان کے لیے برطانیہ نے غریب ہندوستانیوں کے فائدے کے خیال سے خیرات روپیہ نہیں دیا بلکہ انگریزوں نے جو کام کیا ہندوستانیوں نے سود کی صورت میں ان کی قیمت ادا کی۔ ہندوستان میں انگریزوں کی موجودگی کی بنیادی وجہ تاریخ میں تلاش کرنی چاہیئے۔

"برطانیہ نے طاقت کے بل پر ہندوستان کو فتح کیا اس قابل تردید حقیقت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا۔ گذشتہ ۳۰ سال یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ میں لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ ایک ملک کا دوسرے ملک پر قبضہ کرنا یا ایک قوم کا دوسری قوم پر حکومت کرنا غلط ہے آج ایسے بہت کم لوگ ہیں جو اس اصول کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں لیکن اس اصول کا ان انگریز تاجروں اور سپاہیوں پر اطلاق نہیں ہو سکتا۔ جنھوں نے سنہ ۱۷۰۰ء اور سنہ ۱۸۵۷ء کے درمیان ہندوستان فتح کیا تھا۔ اس وقت یہ خیال کہ ایک ملک کا دوسرے ملک کو فتح کرنا غلط ہے۔ موجود نہ تھا۔ ان انگریز تاجروں اور سپاہیوں نے ہندوستان کے ساتھ وہی کیا جو ہیلینوں نے یونان کے ساتھ۔ ایطالویوں نے یورپ کے ساتھ اینگلو سکسنوں نے انگلستان کے ساتھ نارمنوں نے اینگلو سکسنوں کے ساتھ اور مسلمانوں نے ہندوستان کے ساتھ کیا۔

"اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں رہنے کا حق ہے تو انگریزوں کو بھی ہے۔ برطانیہ نے اس وقت ہندوستان فتح کیا تھا۔ جب فاتح کے حق پر کوئی انگلی اٹھانے والا موجود نہ تھا۔ اس لیے ہندوستان کے متعلق برطانیہ کی پوزیشن کی صفائی پیش کرتے وقت اس تاریخی حقیقت کا خیال رکھنا چاہیئے۔ انگریز کوئی تین سو سال سے ہندوستان میں موجود ہیں۔

"آج برطانوی حکومت اور ہر انگریز اس نظریہ کا قائل ہے کہ ایک قوم کا دوسری قوم پر حکومت کرنا غلط ہے اور برطانوی حکومت صاف صاف لفظوں میں یہ اعلان کر چکی ہے کہ جنگ ختم ہونے کے بعد فوراً ہندوستانی جو آئین بنائیں گے اسے مان لیا جائے گا چاہے اس کی رو سے ہندوستان کو مکمل آزادی ہی کیوں نہ مل جائے۔"

غرضیکہ اسطرح سر گرجا شنکر باجپئی کی براہ راست نگرانی میں ہندوستان کے خرچ پر ہندوستان اور اس کے لیڈروں کے خلاف زہر ملا پراپیگنڈہ ہو رہا ہے۔ چونکہ امریکہ میں جاپان کے خلاف زبردست جذبہ پھیلا ہوا ہے۔ اس جذبہ سے فائدہ اٹھا کر امریکنوں کو ہندوستان کے قوم پرور لیڈروں کے خلاف بھڑکایا جا رہا ہے۔ اور کہا جا رہا ہے کہ کانگریس کے لیڈروں کی ذہنیت شکست خوردہ ہے۔ اور وہ جاپان کے ایجنٹ ہیں۔ ہندوستانی لیڈروں کو بدنام کرنا ہی اس محکمہ کا خاص کام ہے۔ جس کے باجپئی افسر اعلیٰ ہیں۔ ہندوستان سے جہاں ایک بڑا محکمہ "اطلاعات" قائم ہے۔ بذریعہ ہوائی ڈاک مواد امریکہ پہنچتا رہتا ہے ہوائی جہاز ڈاک سے کر کوئی ایک ہفتہ میں پہنچتا ہے۔

اس کے علاوہ گاندھی جی اور کانگریس کے مخالف اخبارات باقاعدگی کے ساتھ ہندوستان سے امریکہ پہنچتے رہتے ہیں اور انہیں ان تاجروں اخبار نویسوں اور سیاستدانوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے جنکی رائے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ امریکہ کے دفتر خارجیہ میں بھی یہ اخبار بھیجے جاتے ہیں خود میں نے دفتر خارجیہ کی ان الماریوں میں جہاں ہندوستان کے متعلق کاغذات رکھے جاتے ہیں ایسے ایسے گمنام اخبار دیکھے جنکو اس ہندوستان میں کوئی اہمیت حاصل نہیں اور جنکا یہاں کوئی نام بھی نہیں جانتا میں نے دریافت کیا کہ یہ اخبار کہاں سے آئے جواب دیا کہ یہ اخبار اس لٹریچر کا ایک حصہ جو باجپئی اینڈ کمپنی نے دفتر خارجیہ کو بھیجا ہے۔

باجپئی کی ایک اور کامیابی

اس عرصہ میں سر گرجا شنکر باجپئی نے ایک اور شاندار کارنامہ یہ کیا کہ وہ کنیڈا تشریف لے گئے۔ انہوں نے کنیڈا کے وزیر اعظم سے کہا کہ ہندوستان میں غذائی حالت اطمینان بخش ہے۔ وہاں اناج کی کوئی کمی نہیں وہاں اناج افراط سے موجود ہے۔ قحط پڑنے کی وجہ یہ ہے۔ کہ ملک کے لوگوں نے بڑے بڑے ذخیرے چھپا کر رکھ چھوڑے ہیں

کہا جاتا ہے کہ سر گرجا شنکر نے وزیر اعظم کینیڈا کو اس بات پر آمادہ کیا کہ کینیڈا نے ہندوستان کو اناج بھیجنے کی جو فیاضانہ پیش کش کی ہے۔ اسے واپس لے لیا جائے۔

کیلیفورنیہ میں پنجابی کاشتکاروں کا ایک جلسہ ہوا۔ سر گرجا شنکر باجپئی بھی اس میں رونق افروز تھے انھوں نے کہا کہ ہمیشہ سے بھوکے بنگالی کی عادت چلی آرہی ہے بنگال کے لوگ ہمیشہ بھوک سے مرتے رہتے ہیں۔ وہاں قحط پڑنا کوئی نئی بات نہیں

ہے۔ اس پر سرگرجا شنکر پر آوازے کسے جانے لگے اور انھیں جلسہ چھوڑ کر جانا پڑا۔

باجپئی اپنے وطن کے خلاف جو کام کر رہے ہیں۔ اس کے معاوضہ میں ہندوستان انھیں ۲۵ ہزار ڈالر (کوئی دو لاکھ روپے) دیتا ہے۔ ان کی تنخواہ میں سے انکم ٹیکس نہیں کٹتا۔ صدر روزویلٹ کو باجپئی سے کم تنخواہ ملتی ہے وہ ۲۴ ہزار ڈالر پاتے ہیں۔

باجپئی واشنگٹن میں ایک عالی شان عمارت میں رہتے ہیں جسے محل کہا جا سکتا ہے۔ واشنگٹن جیسے بڑے شہر میں اس شان کی چند ہی عمارتیں ہیں۔ انگریزوں اور امریکیوں کی پارٹیوں پر لاکھوں روپے سالانہ خرچ کئے جاتے ہیں ہندوستان سے آئے ہوئے مہمانوں کی بھی خاطر تواضع کی جاتی ہے مگر وہ ایسے ہی مہمان ہوتے ہیں جیسی شرما پارٹی تھی۔ اگرچہ یہ سارا خرچ ہندوستانی ٹیکس دہندے ادا کرتے ہیں لیکن کسی پارٹی میں واشنگٹن میں مقیم ہندوستانیوں کو مدعو نہیں کیا جاتا۔

باجپئی کا نائب

مسٹر بی اے۔ رامن باجپئی کے نائب ہیں۔ ان کا پورا نام تھرو لنگم راما نجم ہے۔ وہ ہندوستانی محکمہ اطلاعات کے افسر اعلیٰ ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ ہندوستان کے متعلق ہر سچائی کو غلط ثابت کر کے دکھایا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ رامن جب انگلستان میں پڑھتے تھے تو ان کے والدین نے روپیہ بھیجنا بند کر دیا۔ چنانچہ رامن ہندوستانی طلبہ کی امداد پر گزر اوقات کرتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے برطانیہ میں رہنے والے ہندوستانیوں کی سرگرمیوں کی رپورٹ کرنے کا پیشہ اختیار کر لیا۔ رامن کو فرانس بھیجا گیا۔ لیکن پیرس کے ہندوستانی طالب علموں کو ان کی حرکتوں کا علم تھا۔ ان طالب علموں نے رامن کو ڈنڈے سے ٹھوک لیا اور وہیں پیرس سے بھاگنا پڑا۔ اس کے بعد برٹش انفارمیشن سروس نے رامن کو امریکہ بھیج دیا۔ لیکن وہ ایک قوم پرور ہندوستانی کی حیثیت سے وہاں گئے۔ انھوں نے "گاندھی کیا چاہتا ہے" کے عنوان سے جو سوانح نما کتاب شائع کی ہے۔ اس کے سرورق پر اپنے متعلق مندرجہ ذیل الفاظ لکھے ہیں: "ایک آپ کا قوم پرور ہندوستانی اخبار نویس جس کی اخبار نویسی نقائص اور نا انصافی سے پاک ہے۔"

۱۹۲۲ء میں رامن کو کسی خاص مشن پر ہندوستان بھیجا گیا۔ وہ ڈپلومیٹک پاس پورٹ حاصل کر کے بحرالکاہل کے راستے سے ہندوستان آئے۔ ہانگ کانگ، سنگاپور اور دوسرے برطانوی مقبوضات میں رامن کی سرکاری طور پر تواضع کی گئی۔ ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھا گیا رامن نے ہندوستان کا دورہ کیا اور پبلک انفارمیشن بیورو نے اس کا سارا خرچ اٹھایا، رامن اول درجے میں سفر کرتے تھے۔ رامن نے کہا کہ وہ ایک امریکن اخبار کی طرف سے ہندوستان آئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ رامن کئی مہینے تک ہندوستان میں رہے اس عرصے میں انھوں نے امریکہ کے کسی اخبار کو ایک بھی پیغام نہیں بھیجا۔

دروغگوئی اور تہمت

امریکہ واپس پہنچ کر رامن نے دو کتابیں شائع کیں ایک کا عنوان ہے "گاندھی کیا چاہتا ہے" اور دوسری کا عنوان ہے "ہندوستان پر ایک رپورٹ" دونوں کتابیں برٹش انفارمیشن نے شائع کیں لیکن کتاب میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کتابیں انڈیا آفس لندن میں لکھی گئیں۔ اور نیو یارک میں برٹش انفارمیشن سروس کی مس ہیرنگٹن اور مسٹر ہینسی نے ان پر نظر ثانی کی۔ پہلی کتاب میں نہایت مسخ شدہ صورت میں اخبار ہیرلڈ کے اقتباسات ہیں اور اس میں گاندھی جی پر خوب کیچڑ اچھالی گئی ہے۔ اس کتاب کی سوا لاکھ جلدیں امریکہ میں مفت تقسیم کی گئیں۔ اگر یہ کتاب برٹش انفارمیشن سروس کی نہ ہوتی تو اسے مفت تقسیم کرنا رامن کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کتاب کی بسم اللہ ہی غلط ہے اس میں لکھا ہے کہ رامن بڑے اونچے ہندوستانی اخبار نویس ہیں۔ ان سے زیادہ بہتر طریقے پر کوئی اور گاندھی جی کے متعلق سوالات کے جواب نہیں دے سکتا کیونکہ وہ ایک دورہ میں گاندھی جی کے ساتھ رہ چکے ہیں۔ وہ ہندوستان کے چوٹی کے اخبار نویسوں میں سے ہیں۔ کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ رامن گول میز کانفرنس میں گاندھی جی کے ساتھ تھے۔ اس کے بعد بھی گاندھی جی سے اور دوسرے لیڈروں سے واسطہ قائم رہا۔ اور ہندوستان میں گاندھی جی کو پہلا اور آخری گول میز کانفرنس کا خون ریکارڈ کروانے پر آمادہ کیا۔"

مذکورہ بالا حوالوں میں جتنے الفاظ ہیں اتنے ہی جھوٹ ہیں۔

نے امریکہ سے واپسی پر ان لوگوں سے جو ۱۹۳۱ء کی گول میز کانفرنس میں گاندھی جی کے ساتھ تھے، اس بارے میں تصدیق کی۔ مجھے جو باتیں معلوم ہوئیں وہ ذیل میں درج ہیں:-

کوئی شخص رامن کو نہیں یا چوٹی کا اخبار نویس نہیں سمجھتا۔ وہ کبھی دورہ میں گاندھی جی کے ساتھ نہیں رہے جب گاندھی جی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیئے لندن پہنچے تو رامن پہلے ہی وہاں موجود تھے لیکن وہ ایک دن کے لیے بھی گاندھی کے سٹاف میں شامل نہیں رہے۔ رامن نے گاندھی جی کے سٹاف میں شامل ہونے کی کوشش کی مگر انہیں کامیابی نہیں ہوئی گراموفون کا حوالہ دینا بڑی ڈھٹائی ہے۔ اس سلسلہ میں بھی مجھے حقیقت معلوم ہوئی ہے۔ رامن نے متواتر یہ کوشش کی کہ گاندھی جی اپنا گراموفون ریکارڈ بھروالیں لیکن گاندھی جی انکار کرتے رہے۔ اس کے بعد گاندھی جی کے سٹاف نے رامن سے گاندھی جی کے ریکارڈ کا ایک معاوضہ طے کیا اور کہا معاوضہ میں جو رقم ملے گی اسے ہندوستان میں تعمیری کاموں پر خرچ کیا جائے گا۔ یہ طے ہونے کے بعد گاندھی جی ریکارڈ بھروانے پر تیار ہو گئے انہوں نے خدا پر ایک تقریر کی جس کا ریکارڈ بھر لیا گیا۔ اس کے بعد رامن لندن کے گاندھی کیمپ میں شاذونادر آنے لگے جب ان سے کہا جاتا کہ ریکارڈ بھروائی کے معاوضے کے بارے میں اپنے پرنسپلوں سے تحریر لائیے۔ تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتے۔ آخر میں معاملہ یہاں تک پہنچا کہ رامن ایک خط لے کر آئے جس میں لکھا تھا کہ ریکارڈ کے ہندوستان میں فروخت ہونے پر معاوضہ دیا جائے گا۔ برطانیہ امریکہ اور دوسرے ملکوں میں ریکارڈ کے فروخت ہونے کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا اس معاملے میں رامن جیت گیا۔ گاندھی جی نے کہا کہ میں اس معاملہ کو آگے بڑھانا نہیں چاہتا۔ اس کے بعد رامن نے گاندھی جی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔

مسٹر رامن کی دونوں کتابوں کی جلدیں ہندوستان میں پہنچ دی گئیں۔ لیکن چین کے برطانوی سفیر کو بھیجی گئیں جس نے دونوں کتابیں چینیوں میں مفت تقسیم کیں۔ تمام جلدیں واشنگٹن کے برطانوی اور ہندوستانی دفاتر اطلاعات نے تقسیم کیں لیکن کتابوں کے سرورق پر صرف مصنف کا نام اور پتہ تھا۔

رامن کی کتاب "گاندھی کیا چاہتا ہے" کے چند اقتباسات درج ذیل کئے جاتے ہیں:-

"سر اسٹیفورڈ کرپس نے عوام میں یہ رجحان پایا کہ وہ جاپانیوں کی کامیابیوں سے خوش ہوتے ہیں"

"گاندھی جی کے چین کے متعلق اپنے بیانات میں وہ جوش نہیں ہوتا جو پنڈت جواہرلال نہرو اور راجگوپال اچاری کے بیانوں میں ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چینی دشمن کا جو شاندار مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس کے گاندھی جی دل سے مداح نہیں ہیں۔ گاندھی جی نے ہتھیار ڈالنے پر مارشل پیتاں کی تو تعریف کی لیکن چینیوں کی بہادری کو دیکھ کر ان کا دل نہیں گرماتا۔

"گاندھی سارے ہندوستان کی نمائندگی نہیں کرتا وہ اپنی پارٹی کا بھی کلی طور پر نمائندہ نہیں ہے"

حضرت رامن نے کچھ نصیحتیں بھی فرمائی ہیں وہ لکھتے ہیں جو ہندوستانی اپنے ملک کو آزاد کرانا چاہتے ہیں اور اسی کے ساتھ لڑائی بھی جلد جیتنے کے خواہشمند ہیں۔ انہیں دوران جنگ میں گاندھی کی پالیسی سے قطع تعلق کر لینا چاہئے۔

جب رامن تمام عرصہ ایک پکا ہندوستانی اخبار نویس کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ تو دفاتر اطلاعات نے اس کی کتاب کیوں مفت تقسیم کی؟ اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد بھی۔ رامن نے ایک غیر جانبدار مقرر کی حیثیت سے امریکہ کا دورہ کیا۔ لیکن وہ جہاں بھی گیا۔ امریکی سامعین نے اس کا مذاق اڑایا۔ ایک دفعہ آزادی ہند کی قومی کمیٹی کے سکرٹری ڈاکٹر انوپ سنگھ اور رامن کے درمیان مباحثہ ہوا۔ اس مباحثہ میں ایک امریکن خاتون نے ڈاکٹر انوپ سنگھ سے پوچھا "کیا یہ حقیقت ہے کہ رامن انگریزوں کا ایجنٹ ہے۔ ڈاکٹر انوپ سنگھ نے جواب دیا "آپ یہ سوال رامن سے کیوں نہیں کرتیں۔" چنانچہ امریکن خاتون نے رامن سے پوچھا۔

"کیا آپ انگریزوں کے تنخواہ دار ہیں؟" رامن نے جواب دیا "جی نہیں۔ وہ صرف میری تقریریں شائع کر دیتے ہیں امریکن خاتون ہنسی اور کہا "بس میں یہی معلوم کرنا چاہتی تھی۔" آپ اپنے ملک کے نمائندہ نہیں ہیں۔

ایک اور موقع پر ایک خاتون نے ہندوستان کے دفتر اطلاعات سے ٹیلیفون پر پوچھا "کیا رامن آپ کے ہاں ملازم ہیں!

نوما جواب تھا؟ جی ہاں وہ ہمارے ملازم ہیں۔"

جب یہ بھید اچھی طرح کھل گیا تو راسی کھلم کھلا افسر اعلیٰ کی حیثیت سے ہندوستان کے دفتر اطلاعات میں ملازم ہو گئے اور امریکہ میں پراپیگنڈہ ایجنٹ کی حیثیت سے ان کا نام لکھا گیا۔ لیکن ہندوستان میں ان کا تقرر چھ مہینے تک راز میں رکھا گیا۔ اب۔ ان کی رہی سہی آبرو ختم ہو گئی۔

آر۔ ایس۔ شرما

گزشتہ تین سال میں امریکنوں کے سامنے برطانوی اور ہندوستانی حکومتوں کا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لئے کم سے کم ۲۰ ماہرین پراپیگنڈہ امریکہ جا چکے ہیں۔ ان میں شرما شستری اور مختلف فوجی اور بحری افسر بھی شامل ہیں۔ مسٹر آر۔ ایس۔ شرما اپریل [illegible] میں امریکہ سے واپس آتے ہوئے مصر میں مجھے ملے تھے۔ انھوں نے ایک ملاقات میں کہا کہ امریکن ہندوستان میں برطانوی راج کے بارے میں اس قدر با خبر ہیں کہ کوئی انگریزی یا ہندوستانی پراپیگنڈہ باز انہیں بے وقوف نہیں بنا سکتا۔ پراپیگنڈہ باز خود بنا دیتی [illegible]

اندر لندن میں مغربی امریکہ کے ایک شہر میں ریڈیو کے پروگرام کے منیجر نے مجھے بتایا کہ سفرا مشن کے ایک ممبر اپنا جی۔ مصرا سے (ہندوستانی ٹیکس دہندوں کے خرچ پر) امیر شن پر ایک تقریر کرائی۔ ریڈیو کے منیجر کو ہندوستان سے ہمدردی تھی اس نے مصرا سے تین بار پوچھا کہ ہندوستان کیا چاہتا ہے تاکہ ریڈیو سننے والے امریکنوں کو ہندوستانیوں کی خواہشات آزادی کا علم ہو جائے تین بار سوال کرنے کے باوجود مصرا نے یہ جواب دیا "ہندوستان جنگی کوششوں میں مدد کرنا چاہتا ہے" ریڈیو منیجر نے مجھ سے کہا کہ میں نے مصرا کو یہ کہنے کا تین بار موقع دیا کہ ہندوستان آزادی چاہتا ہے لیکن اسے یہ کہنے کی جرات نہ ہوئی۔ میں اسے یہ کہنے پر مجبور نہ کر سکتا تھا۔

میں امریکہ میں ہندوستان کے خلاف برطانوی پراپیگنڈہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتا اور بالخصوص اس پراپیگنڈہ کو غدار ہندوستانی کر رہے ہیں۔ بلکہ میں مرکزی اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ کے ممبروں سے پرزور اپیل کرتا ہوں کہ امریکہ میں ہندوستان کو بدنام کرنے کیلئے ہندوستانی ٹیکس دہندوں کا جو روپیہ خرچ ہو رہا ہے اس کے خلاف زبردست احتجاج کرنا چاہیے برطانیہ امریکہ میں ہندوستان کو بدنام کرنے پر چار کروڑ روپیہ سالانہ خرچ کرتا ہے اُسے [illegible]

[illegible]

مسلم لیگ کی موجودہ وزارتیں

منتخب اردو اخبارات کی رائیں

روزنامہ خلافت بمبئی

اس وقت مسلم لیگی وزارتیں لیگ کے گلے میں ہڈی بنی ہوئی ہیں نہ وہ نکلتی ہیں نہ ان کو نگلا جاتا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ لیگ کی وزارتیں مسلم لیگ کی وزارتیں مسلم لیگ کی نیک نامی اور ترقی کا باعث ہوں گی لیکن مہینوں اور برسوں کے تجربوں کے بعد ہمارا یہ خیال غلط ثابت ہوگیا اور ہماری ساری امیدیں مایوسی میں بدل گئیں۔ موجودہ وزارتوں کی وجہ سے لیگ کی ذرا بھی نیک نامی اور ترقی نہیں ہوئی بلکہ ان کی وجہ سے لیگ کے نظام میں انتشار اور خلفشار پیدا ہوا اور عوام میں لیگ کی بدنامی ہوئی۔

یہ صورت حال ذرا بھی حیرت انگیز نہیں ہے۔ بلکہ اگر حالات پر ذرا بھی غور کیا جائے تو اس کے منطقی اسباب فوراً دماغ میں آجاتے ہیں۔ اس کا سب سے پہلا سبب ابھی تک ہندوستان کی اسلامی سیاست پر سرمایہ داروں جاگیرداروں خطاب یافتوں اور معتدل سیاست دانوں کا غلبہ ہے۔

لیگ کی قیادت کی طرح لیگ کی وزارتوں پر بھی جو لوگ قابض ہیں۔ ان میں سے اکثر رجعت پسند اور قدامت نواز ہیں جو نئے حالات اور سیاست و اقتصادیات کے نئے نظریات سے متاثر ہونے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ گورنروں کے غلام ہیں یوروپین جماعتیں ان کی دست راست ہیں اور سرمایہ دار و جاگیردار ان کے یاور فادار یا آقا۔

اس وقت آسام۔ بنگال۔ سرحد اور سندھ میں لیگی وزارتیں ہیں۔ لیکن اگر ایمانداری اور سچائی کے ساتھ ان وزارتوں کے اعمال کا جائزہ لیا جائے۔ اور کوئی فیصلہ کیا جائے تو ہم بے خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ فیصلہ وزارتوں کے خلاف ہی ہوگا۔ بنگالی صوبے میں دوسرے صوبوں سے زیادہ رشوت۔ نفع اندوزی۔ گرانی۔ بدانتظامی

خودغرضی اور حصول زر کی گرم بازاری ہے۔ اپنے حمایتیوں کو فائدہ پہنچانا تو درکنار خود وزیر ایسے حرکات کے مرتکب ہوئے اور ہو رہے ہیں کہ جن پر ایک معمولی انسان کو بھی شرم آنی چاہئے۔ ان افعال کی وجہ سے لیگ بدنام ہو رہی ہے۔ دوسرے مسلمانوں پر ہنستے ہیں اور مسلمان بری طرح پستے چلے جا رہے ہیں۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ لیگی وزارتوں نے مسلمانوں کے لیے کیا کیا ہے تو اس کا جواب کچھ نہیں کے سوائے کچھ نہیں۔ (۳ مارچ)

روزنامہ عصر جدید کلکتہ

بدقسمتی سے جناح صاحب قانون پسندی میں بہت غالی ہیں اور ان کا غلو اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ وہ تنظیم کی ضرورت کے مطابق اس کی مشینری میں رد و بدل کیلئے تیار نہیں ہیں۔ بلکہ تنظیم کو جامد قانون کے چکر میں پھنسائے ہوئے ہیں جو عام مسلمانوں کے لیے سخت گراں ہو رہا ہے۔ اور یہ گرانی بالکل طبعی ہے۔

اس کی روشن مثال سندھ کے معاملات ہیں۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ اور پیر الٰہی بخش دونوں کے متعلق قطعیت کے ساتھ دنیا کو معلوم ہے کہ ان کو لیگ سے دلچسپی ہے یا وزارت سے۔

سر غلام حسین ہدایت اللہ کی زندگی قلابازیوں سے پُر ہے ہم کو سندھ کے سر غلام حسین ہدایت اللہ اور بنگال کے مولوی فضل الحق میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ نے کراچی مسلم لیگ کے جلسوں تک کی ممانعت کر دی، شکارپور کے انتخاب میں مسلم لیگی امیدوار کے خلاف کھلی سازش کی۔ صوبہ مسلم لیگ کی تنظیم کو دبانے کا کوئی دقیقہ بظاہر اٹھا نہیں رکھا۔ لیکن اس شخص کے خلاف آل انڈیا مسلم لیگ کی مشینری نے کوئی حرکت نہیں کی۔ ہم کو بتایا گیا ہے کہ آل انڈیا پارلیمنٹری بورڈ ہے جس کا کام ہوتا

کی پارلیمنٹری پارٹیوں کو مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام کے موافق چلانا ہے۔ لیکن قانون پسند جناح صاحب اور ان کے معتمد جناب نواب زادہ لیاقت علی خان صاحب نے آج تک قوم کو یہ نہیں بتایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ نے اپنا کیا پروگرام رکھا ہے

ہم یہ بھی پڑھا کرتے ہیں کہ ایک آل انڈیا مجلس عمل ہے اس نام سے شروع میں ہم سخت دھوکہ میں مبتلا رہے اور ہماری طرح بہت سے اور خوش فہم ہوں گے جو اس دھوکہ میں ہوں گے کہ یہ مجلس عمل اس لیے بنائی گئی ہے کہ مسلم لیگ کی تنظیم کو عوام کی روزمرہ زندگی میں موثر انہ حالیت میں تبدیل کردے لیکن سے

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

معلوم ہوا ہے کہ مسلم لیگ کی قیادت عظمیٰ کی لغت میں "عمل" کا مفہوم فی الحال اسی قدر درج ہے کہ صوبوں میں اگر مقررہ قانون کے مطابق کوئی خامی نظر آئے تو اس کی اصلاح کی جائے۔ اور صوبوں کی تنظیم کے خلاف اگر کوئی اپیل آئے تو اس کا فیصلہ کردے ۔ واہ رے مجلس عمل! زندہ باد!

خلاصہ یہ کہ سر غلام حسین کی ہر بے اعتدالی جو لعفق شاید مسلم لیگ کے دستور کے خلاف نہیں تھی گوارا کی گئی۔ یہ ای کی تحریک کی ہر فقرہ بازی کو جو مسلم لیگ نے استدائی تعصب العصر کے مداق اگر اسے سے مراد نہ تھی برداشت کی گئی

لیکن جناب سید ... صوبہ مسلم لیگ کو بہر ار تاکید کی گئی کہ دیکھو سر غلام ... بہ حیثیت ... تمہارا لیڈر ہے۔ ... جب تک لیڈر ہے تم ... کی ... پر قابو نا مجبور ہو کر ... دلائل یہی سناتے ہیں سید نے ... کہا ہوگا کہ ... کے معنی یہ ہیں کہ مسلم لیگ کی تنظیم کوئی چیز نہ ... مفہور و ... نہیں ہے۔ مسلمان زیادہ دنوں تک اس ... کو مسلم لیگ میں ... نہ کر سکیں گے

گو سر غلام حسین ہدایت اللہ کے پشت پناہ ... کو قیادت عظمیٰ کے عوام ... کا شرف ہے۔ بچارے سیدھے سادے عوامی آدمی ان کی ایک نہ چلی۔

لیکن جناح صاحب سے دستور، قواعد و ضوابط وغیرہ وغیرہ کا دفتر اٹھا کر جناب سید کے سر پر پھینک مارا اور اس طرح خود انہوں نے ساری رائے عامہ کو چپ کر دیا۔

ہمارے خیال میں مسٹر جناح نے بمبئی کی صوبہ مسلم لیگ کے انتخاب میں دخل اندازی کے بعد سندھ کی صوبہ مسلم لیگ کی تنظیمی قوت کے مقابلہ میں چند وزارت پرستوں کی پشت پناہی کرکے ایسی حیرت انگیز اور افسوسناک کارروائی کی ہے کہ اب اس کے بعد مسلم لیگ کے عوامی اور عملی عناصر کا فرض ہو جاتا ہے کہ اپنی تمام قوتوں کے ساتھ لیگ کو اس کرسی نشین، سرمایہ دار، اور وزارت پرست قسم کے عناصر سے بالکل پاک و صاف کرکے دم لے۔ ہم نے بہت دکھ کے ساتھ یہ سب کچھ لکھا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اپنی ہے۔

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

(۱۴ مارچ)

روزنامہ زمیندار - لاہور

سر غلام حسین ہدایت اللہ نے شکست کے بعد حاجی مولا بخش کو وزارت سندھ میں شامل کر لیا ہے۔ حاجی صاحب نے مسلم لیگ کے حلف نامے پر صرف دستخط ہی نہیں کئے بلکہ لیگ پارٹی کے آٹھ ممبروں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا ہے اس اعتبار سے سر غلام حسین کا طرز انتخاب مسلم لیگ کو ایک بنیادی صدمہ پہنچانے کا باعث ہوا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ قائد اعظم سر غلام حسین سے سوال کریں گے کہ مسلم لیگی کہلانے والی وزارت میں ایک غیر مسلم لیگی ... کیوں شامل کیا گیا؟ لیکن یہ قیاس ... ثابت ہوا۔ قائد اعظم حسب معمول وزیر اعظم کی حمایت کئے جاتے ہیں۔ آپ نے سید غلام مرتضیٰ کو ایک برقی پیغام بھیجا ہے جس میں ان پر عہد شکنی کا الزام عائد کیا ہے۔ اور انہیں اس بات ... گیا ہے کہ اپنے لیڈر سر غلام حسین ... دکھانے کی کوشش کیوں کی۔

سید ... جو اپنی حیثیت رکھتا ہے وہ ... لیڈر ... دکھ ... محسوس کرتے جو ... انتخابات میں مسلم لیگ کے حریف ... سے میدان میں آ ... رہنمائی ... کو ... مجبور ہو ... پڑتا ہے ... کے ... لکھنا پڑتا ہے کہ قائد اعظم کا ... (سعد ... ۱۹ ...)

روزنامہ جنگ۔ دہلی

بنگال کی مسلم وزارت کو چھوڑ کر جہاں سر ناظم الدین اپنی سراب نما حکمت عملی پر امید کے قلعے بنائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ آسام و پنجاب، سرحد اور سندھ کے اندر کوئی وزارت ایسی نہیں جو اطمینان کے سانس لے رہی ہو۔ سندھ کی اپنی حریم وزارت میں سے رہی ہو، میزانیہ کے اندر سوا بارہ لاکھ روپے کا خسارہ ہے۔ اور سرحد کے عوام اور رنگ رلی وزارت کی غفلتوں اور تن آسانیوں سے آخری طور پر نالاں ہو چکے ہیں۔ پنجاب کے اندر ملک خضر حیات خاں صاحب اور ان کی جاٹ ٹولی نے مسلم عوام اور مسلم اغراض کے ساتھ وہ ظلم کیا ہے جو شاید کسی کانگریسی وزارت نے بھی اپنے صوبے میں نہ کیا ہوگا۔ آج جو رویہ یہاں کے افراد نے ایک ایک دوسرے کے خلاف اختیار کر رکھا ہے۔ خود ملک خضر حیات خاں کے بیان اور راجہ غضنفر علی خاں کے جوابی بیان سے ظاہر ہے۔ ملک خضر حیات سردار شوکت پر مخرب اخلاق کارروائیوں کے سلسلے میں عدالتی مقدمہ چلانے کے فکر میں ہیں۔ اور مخالف صفوں نے یہ دھمکی دی ہے کہ اگر ایسا ہوا تو موجودہ وزراء کے خلاف بھی ایسا مواد موجود ہے جو عدالت کے اندر اپنے کردار کی صفائی میں طلب کیے جا سکتے ہیں جن کے معنی صاف یہ ہیں کہ موجودہ وزراء بھی اس مخرب اخلاق ریشہ دوانیوں سے مبرا نہیں ہیں۔ جو سردار شوکت حیات خاں کے سر تھوپی جا رہی ہیں۔ یہ سارا فسانہ وزارت کے متوالوں کی رسوائی اور تشہیر کے لیے آل انڈیا ریڈیو کا اعلان بن جائے گا۔ سندھ کے اندر صورت حال ظاہر و باہر ہے۔ وزارت کے شیدائی جاہ و نمود کے بندے خود غرضی و نفس پرستی کے شکار افراد ایک دوسرے سے متصادم ہو رہے ہیں اور مسلم اکثریت کے صوبوں کی رسوائی و بدنامی کا پورا سامان مہیا کر رہے ہیں۔

یہ ہیں وہ مجوزہ پاکستانی رقبوں کی مسلم وزارتیں اور یہ ہیں وہ پاکستانی علاقوں کے حکمراں! ہم مسلم لیگ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا وہ ان کوائف، مناک اور احوال شر انگیز پر مسلمانوں کو دعوت پاکستان دے رہے ہیں یا پاکستان کو ایک شاہکار حکمرانی کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ عوام کے اندر بھی صحیح اسلامی معلومات اور حریت پسندی کا احساس نہیں ہے اور وہ اب بھی ہر سرمایہ دار اور جاگیردار کے پیچھے بھیڑوں کی طرح دوڑنے کے عادی ہیں۔ آج صوبہ سرحد کے ان نمایندوں کے ذہنی انقلابات دیکھ کر افسوس ہوتا ہے جو محض پارلیمنٹری سکریٹری کے عہدے کی خاطر کبھی کانگریس کا سہارا لیتے ہیں اور کبھی مسلم لیگ کی آغوش میں آ کر میاؤں میاؤں کرنے لگتے ہیں۔ یہ نہ کوئی قومی کردار ہے اور نہ کوئی ملی ذہنیت ایک خود غرضانہ اور نفس پرستانہ جذبہ ہے۔ جو دین قسم کے نام لیواؤں کو جتنا بھی رسوا کر دے اتنا کم ہے۔ اگر مسلم لیگ اور اس کے زعماء پاکستان کو بھی قائم کرنا چاہتے ہیں تو پہلے پاکستان میں بسنے والوں کا ایک کردار ایک شعار اور ایک احساس پیدا کریں۔ (۱۳ مارچ)

روزنامہ الہلال۔ بمبئی

سر غلام حسین اور سید کے درمیان جو جنگ جاری ہے اس کے قانونی نکات اور دستوری موشگافیوں سے ہمیں مطلب نہیں۔ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان کا اصول صرف ایک جو قرآن مجید نے اس کو دیا ہے۔ وہ یہ کہ نیکی اور بھلائی میں تعاون کرو اور ظلم اور برائی میں تعاون نہ کرو۔ کوئی بھی ہو ہم کو اس کی دوستی اور دشمنی کے وقت اسی اصول پر کام کرنا چاہئے اسی وجہ سے ہم سید کے ہمدرد ہیں اور ہر مسلمان کو سید کا ہمدرد ہونا چاہئے اس کے علاوہ سید کی قانونی پوزیشن اور دستوری حیثیت بھی کمزور نہیں ہے اس لیے جو کچھ کیا ہے وہ انصاف، انسانیت اور قرآن کے اصول کے مطابق ہی نہیں کیا بلکہ مسلم لیگ کے قانون کے مطابق بھی کیا ہے جس کا وہ سندھ میں سب سے مخلص خادم بلکہ سچا پرستار ہے

قائد اعظم نے سید کے ایک نہایت ملتجیانہ اور وفادارانہ تار کا جن الفاظ میں جواب دیا ہے ان کو پڑھ کر ہمارا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ کیا قوم اور جماعت کے خادموں کو لونڈیوں اور غلاموں کی وجہ سے اسی طرح گالیاں دی جانی چاہئیں۔ قائد اعظم کہتے ہیں کہ سید نے غلام حسین کو ذلیل کیا۔ مگر کیا یہ درست نہیں کہ قائد اعظم نے سید کو ذلیل کیا اور سندھ کی ساری مسلم لیگ کو ذلیل کیا جس کا وہ معتمد قائد ہے۔ ہم کو یقین ہے کہ قائد اعظم سر غلام حسین کا ساتھ دے کر اور انھیں سر پر چڑھا کر لیگ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ ایسے لوگوں سے کوئی امید رکھنا ریگستان میں کنواں کھودنے کے مرادف ہے۔

(۱۲ مارچ)

سندھ کا عادل (دہلی)

ممکن ہے کہ مسٹر جناح کے شخصی رعب کی وجہ سے سندھ میں لیگ کے دو گروہ جو حصول اقتدار کے معاملے میں ایک دوسرے کے رقیب ہیں آپس میں مل کر بیٹھ جائیں لیکن سوال یہ ہے کہ جب تک لیگی صوبوں میں وزارتوں اور عہدوں کے حصول کا جذبہ دماغوں پر طاری رہے گا کیا اس وقت تک اسی قسم کی گڑبڑ دوبارہ پیدا ہونے کے امکانات ہر وقت موجود نہیں رہیں گے۔

ہم مسٹر جناح کی خدمت میں ادب کے ساتھ یہ عرض کریں گے کہ مسلم لیگ ... کو نکال سکنے کے معاملے میں جس بنیادی کمزوری سے آپ کے ہاتھ کمزور رہیں اس کمزوری کو دور کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ اس بیپا پوتی کی پالیسی کو چھوڑ کر زیادہ مضبوط پالیسی اختیار کی جا سکے۔

مسٹر جناح ... ہیں کہ آپ نے لیگ میں سردار خان بہادروں اور ذاتی ... کے بھوکوں کو گھسا رکھا ہے۔

ضرورت ہے کہ اس قسم کے ... مسلم لیگ سے نکال باہر کرنے کے بعد اس ... کی جماعت ... ۔(۱۲ مارچ)

روزنامہ انجام (دہلی)

بہرحال مسلم لیگ جیسی بھی ہے ... جمہوری جماعت ہے ... خیال ہے کہ ... طرح بہت سے مسلمان اس شدید ... کے باوجود جس کا اظہار قائد اعظم نے مسٹر سید ... کے خلاف کیا ہے۔ مسٹر سید کو اس وقت تک ... نہ بتائے جائیں اور نہ سمجھائے جائیں ... جتنا برا انہیں بنایا گیا ہے۔ بہت سے مسلمانوں کی رائے شاید یہی ہوگی۔ کہ اگر مسٹر سید کچھ بھی ہیں تو سر غلام حسین سے زیادہ برے نہیں ہو سکتے۔

اگر قائد اعظم کی نظر میں مسٹر سید سے وہ تمام غلطیاں ہوئی ہیں جن کا ذکر قائد اعظم نے کیا ہے تو ان غلطیوں کے مقابلہ میں سر غلام حسین کی یہ حرکت کہ انھوں نے سنٹرل پارلیمنٹری بورڈ کی منظوری کے بغیر خان بہادر مولا بخش کے آزاد مسلم گروپ کے ساتھ مل کر ایک کولیشن بنا ڈالی۔ کوئی غلطی ہے یا نہیں اور آیا سر غلام حسین کی یہ غلطی مسٹر سید کی ساری غلطیوں سے زیادہ سنگین ہے یا نہیں۔ یہ بھی ایک سوال ہے۔ جو یقیناً جواب طلب ہے۔

مختصر یہ کہ مسلم انڈیا کا مرد سندھ، برابر بیمار ہے۔ اور صحت کے کوئی آثار پیش نہیں کر رہا ہے۔ اور اگر قائد اعظم کی تشخیص صحیح تشخیص ہے۔ تو سندھ کی مسلم سیاست پر فاتحہ ہی پڑھ لینی پڑے گی کیونکہ ہمیں سر غلام حسین سے کوئی توقع نہیں اور آزمائے ہوئے کو آزمانا ہمارے نزدیک زندگی کا کوئی اچھا اصول نہیں ہے

(۱۶ مارچ)

مسلم صوبوں کی اسی گڑبڑی پر دوبارہ لکھتے ہوئے معاصر انجام اپنے ۱۷ مارچ کے اداریہ میں رہنما مسلم لیگ کے سامنے ہندو اور مسلم عوام کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرتے ہوئے ایک نہایت مفید ... پیش کرتا ہے۔ (انجام مورخہ ۱۷ مارچ)

... ملک میں عوام کی خواہشات یہ ہیں کہ ہندوستان میں موجودہ غیر ... ختم ہو اور اس کی جگہ کانگریس اور لیگ کے نمائندوں پر مشتمل ... قومی حکومت کی تشکیل عمل میں آئے۔ جسے عوام کا اعتماد حاصل ہو اور جو ملک کے دفاع اور مابعد جنگ ملک کی ترقی کے لیے ... معنوں میں کوئی کام کر سکے۔ مرکزی اسمبلی میں حکومت کو پے در پے شکستیں ہو رہی ہیں اور مسٹر سی راجگوپال اچاریہ نے بالکل ٹھیک کہا ہے ... آزاد ملک میں ایسا ہوتا تو یقیناً حکومت مستعفی ہو جاتی اور ... نظام حکومت کا قیام عمل میں آ چکا ہوتا اسکو موجودہ نوکر شاہی ہٹ ... سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اور حکومت کی یہ ... وقت تک ... رہے گی جب تک ملک میں اتحاد کی سازگار فضا پیدا نہیں ہو جاتی ... کانگریس اور لیگ کے درمیان اتحاد ایک مبارک قدم ہے لیکن محض ... اتحاد قائم کر کے حکومت کی بنیادوں کو عارضی طور پر متزلزل تو کیا جا سکتا ہے لیکن بوسیدہ عمارت کو ڈھا کر نئی عمارت کی تعمیر نہیں کی جا سکتی۔ وقت کا عین تقاضہ یہی ہے کہ اسمبلی سے باہر کانگریس اور لیگ کے درمیان جو ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتیں ہیں شاندار اتحاد کی بنیاد رکھی جائے۔ اس عظیم الشان مقصد کو حاصل کرنے کیلئے ملک کے گوشے گوشے سے آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ گاندھی جناح ملاقات بھی انہیں جذبات کا نتیجہ تھی۔ اس وقت ہمارے ذہن میں محبوب لیڈر نے قوم سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ "ہم دونوں ملنے کیلئے جدا ہو رہے ہیں۔" آج اس ملاپ کا بہترین وقت ہے ہمیں اپنے اختلافات کو دور کر کے اس اتفاق کے راستہ پر گامزن ہو جانا چاہئے جو آزادی کی منزل پر ختم ہوتا ہے ہمارے مضبوط اتحاد

ہم آہنگ ارادوں کے سامنے سامراجیوں کی شاطرانہ چالیں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ غلامی میں نہ کام آتی ہیں تدبیریں نہ شمشیریں۔ جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ ...

اصول کی خاطر

از :۔ قدوس صہبائی

نوٹ :۔ یہ افسانہ جنگ کے اس دور میں لکھا گیا۔ جب روس پر جرمنی نے حملہ نہ کیا تھا۔ اور مصنف ڈیفنس آف رولس کے تحت جیل میں زندگی گذار رہا تھا۔ (صہبائی)

"تم ——— تم نے میری زندگی عذاب میں ڈال دی ہے، نہ گھر کی فکر نہ بچے کا خیال، دن رات کانگریس، کانگریس، آزادی، آزادی، مزدور اور کسان ——— اور گھر بار سے لاپرواہی۔ یہ سب مصیبتیں ہی کیا کم کافی تھیں جو اب بربادی کی تکمیل کرانا چاہتے ہو۔ نہیں مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا۔ خود دنیا کی اس اندھی دیوانگی میں پڑ کر انسانیت کو بھی بھول گئے ہو۔"

یہ کہہ کر عذرا رونے لگی۔ اور شہاب ——— "لاحول ولاقوۃ۔ کیسے انسانوں سے پالا پڑا ہے۔" کہہ کر باہر نکل گیا۔

عذرا کی ساس نے جو اس چیخنے چلانے اور رونے دھونے کی آواز سنی تو صحن میں ہی سے چیختی پیٹتی کمرہ کی طرف دوڑی۔

"شہاب! شہاب!! کیا بیچاری کو مار ڈالے گا۔ میں ان کی (اپنے متوفی شوہر کی طرف اشارہ ہے) زندگی ہی میں کہا کرتی تھی کہ یہ لڑکا بڑا ضدی اور نکما ہے۔ خاندان بھر کا نام ڈبوئے گا۔ میں جھوٹ تھوڑا ہی کہتی تھی۔ ادھر باپ کی آنکھیں بند ہوئیں اور ادھر اس نے ہاتھ پاؤں نکالے ——— دو ہی سال میں ساری جائداد اڑا دی۔ دو ٹھیکرا مکان رہ گئے ہیں۔ وہ تو میرے نام تھے نہیں ان کا بھی تیا پانچا ہو جاتا ——— کیا ہے بیٹی، کیا کہہ رہا ہے کمبخت؟"

"کچھ نہیں اماں۔ یہ تو میری قسمت کا پھیر ہے۔" آنسو پونچھتی ہے۔

"ہاں بیٹی قسمت کا ہی پھیر ہے۔ پڑھایا لکھایا، ہزاروں روپیہ خرچ کر کے وکیل بنوایا، ولایت بھیجا، اکلوتا بیٹا تھا، باپ کے کیسے کیسے ارمان تھے کہ کلکٹر ہوگا، کمشنر ہوگا، جج بنے گا اور گھر کو روپے سے بھر دیگا۔ لیکن اس کے ولایت سے آتے ہی وہ تو اپنی اس ہونہار کے کرتوت دیکھنے کو زندہ نہ رہے اور ہمیں ساری مصیبت جھیلنے کو چھوڑ گئے۔"

"بیٹی! تیری شادی میں نے کن ارمانوں سے کی تھی، سمجھتی تھی کہ شاید شادی اس کو سنبھال دے۔ مگر ہائے ری قسمت۔ اس کو ایسا جنون "ہندوستان کی آزادی" کا چڑھا ہے جو اتارے نہیں اترتا۔ دن رات اسی غم میں مارا مارا پھرتا ہے۔ خدا جانے ہندوستان کی آزادی کیا ہوتی ہے۔ اس سے کیا فائدہ ہوتا ہے۔ جب دیکھو جب اس کی زبان پر امیر اور غریب کا نام ہے جب دیکھو کسان اور مزدور کا رونا ہے۔ چار چار دن غائب۔ پوچھو تو کسان کانفرنس میں گیا تھا، مزدور سبھا میں لگا ہوا تھا۔ بیٹی میں نے تیری قسمت پھوڑ دی۔ خدا اس مہاتما گاندھی کا ستیاناس کر دے ——— جس نے میرے لال پر جادو کر دیا ہے۔ نہ جانے یہ کیسا جن ہے ———"

اتنا کہہ کر شہاب کی بوڑھی ماں کا دل بھر آیا۔ وہ زیادہ نہ کہہ سکی اور عذرا کو گلے لگا کر رونے لگی۔ جب ذرا دماغ کا بوجھ ہلکا ہوا تو اس نے پھر کہنا شروع کیا:۔

"بیٹی! میں خدا کی اور تیری دونوں کی گنہ گار ہوں۔ تیرا باپ شادی پر بالکل تیار نہ تھا۔ لیکن چھوٹا بھائی ہے میری خفگی نہیں چاہتا تھا۔ راضی ہو گیا۔ وہ پہلے ہی سمجھتا تھا۔ اور جب میں اس سے کہتی تھی کہ شادی کر دو، بچپن سے دونوں کی نسبت اور منگنی بھی ہو چکی ہے۔ تو وہ صاف کہہ دیتا تھا کہ بہن، شہاب کا مستقبل اچھا نظر نہیں آتا۔ وہ حکومت کے خلاف ولایت

بیٹھے بُرے خیالات لے کر آیا ہے ۔ اگرچہ اس کی قابلیت اور علمیت بہت بڑھ گئی ہے ۔ لیکن اب وہ گھر بار بیوی بچوں کے لائق نہیں رہا ۔ ہائے میری عذرے تیری قسمت بھی پھوڑ دی ۔" یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگی ۔

عذرا نے ساس کو زیادہ غمگین دیکھ کر سمجھانا شروع کیا ۔ اُسے اپنا غم بوڑھی پھوپھی کے اس صدمے کے سامنے ہیچ نظر آتا تھا ۔ اتنے میں پالنے میں سے بچے کے رونے کی آواز آئی ۔ ساس اور بہو دونوں رونا دھونا بھول کر اُدھر متوجہ ہوگئیں ۔ عذرا بچے کو گود میں لیکر ٹہلنے لگی ۔ ساس چُپ سناٹے میں کچھ سوچنے لگی ۔

"بیٹی !" تھوڑے سے وقفے کے بعد اس نے پھر کہا "کیا بات ہے ۔ تو آج کیسے رو رہی تھی ۔ تجھ جیسی صابر و شاکر کو یہ ظالم رُلایا کرتا ہے !"

"کچھ نہیں پھوپھی ۔ رونا تو بھرا ہے ۔ آنکھ سے آنسو تو اسی وقت نکل آتے ہیں جب کوئی تازہ چوٹ زخمِ دل پر لگائی جائے ۔"

"تو آج اس نے تجھ سے کیا کہا تھا ؟"

"آج نہیں ، وہ تو ایک مہینہ ہوا جب سے میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ ان کی کوئی پارٹی ہے ۔ کیونسٹ پارٹی یا کیا ۔ اس کو اس نازک زمانہ میں پوشیدہ طور پر کام کرنا ہے ۔ کیونکہ ملک بھر میں وہ ناجائز قرار دے دی گئی ہے ۔ اس لئے اب اُس کے سب آدمی اپنے گھر میں جمع ہوا کریں گے ۔ چُپ چُھپ کر ۔"

"تو بیٹی اس میں کیا نقصان ہے ، اب بھی تو رات دن باہر کے کمرے میں غل غپاڑہ رہتا ہے ۔"

"یہ بات یہیں تک نہیں ہے پھوپھی بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ میں اُن کے سب دوستوں سے پردہ توڑ دوں بلکہ بالکل ہی پردہ توڑ دوں ۔ انگریزی تو میں نے پڑھی نہیں ہے ۔ اتا جان اس کے بہت خلاف ہیں ۔ لیکن ان کا خیال ہے کہ ان کے دوست انگریزی پڑھا لیں گے ۔ اس کے بعد میں بھی ان کی پارٹی میں لے لی جاؤں گی ۔ وہی کیونسٹ پارٹی ہے یا کیا بلا ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں پارٹی کے کاموں کیلئے بہت مفید ہو سکتی ہوں ۔"

"خدا بچائے ۔ میں نے بچپن ہی سے کتنا کتنا روکنا چاہا کہ انگریزی نہ پڑھاؤ ۔ مگر باپ تھے اُس کے فوجی ٹرے نہ مانے ۔ پھر ولایت بھیج کر تو نہ صرف ساری عمر کی کمائی گنوائی لڑکے کو بھی ہاتھ سے کھو دیا ۔ توبہ ۔ توبہ ۔ خدا بچائے ۔۔۔ میں کچھ بھی نہیں سمجھی کہ وہ تیرا کیا کرنا چاہتا ہے ۔"

"کچھ بھی نہیں پھوپھی ، وہ یہ چاہتے ہیں کہ میں بھی اُن کی طرح انگریزی پڑھ لوں ۔ گھر کے کام کاج کی فکر نہ کروں ۔ اور اُن ہی کی طرح دیوانی ہو کر "ہندوستان کی آزادی" میں لگ جاؤں ۔ پردہ اور روزہ نماز سب چھوڑ چھاڑ دوں ۔"

"خدا کی مار ۔ لعنت ہو اس شیطان گاندھی پر جس نے شریف گھرانوں کا ستیاناس مارا ہے ۔ میں نے سُنا ہے کہ وہ اس ہندوستان کی آزادی کے قصے میں لوگوں کو جیل میں بھی تو بھیجتا ہے ۔ خدا نہ کرے یہ دن مجھے دیکھنا پڑے ۔" دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر "الٰہی شہاب کو جیل سے بچانا ۔ کیسی بدنامی ہوگی ۔"

"اور ہاں پھوپی جان آپ نے یاد دلا دیا جیل کا قصہ ۔۔۔ وہ کہتے تھے کہ یہ سال اُن کے آدمیوں کیلئے بڑا سخت سال ہے ۔ حکومت ڈھونڈ ڈھونڈ کر لڑائی کی وجہ سے انھیں پکڑ رہی ہے ۔ اور وہ چھپتے پھرتے ہیں ۔ اس لئے اسی سال کے اندر اندر انھیں کم سے کم ساٹھ ہزار روپیہ اس مقصد کیلئے جمع کر لینا چاہئے ۔ کہ ضرورت کے وقت ان کی پارٹی کے آدمی اسلحہ خرید کر اپنی حفاظت کر سکیں ۔ اور ہندوستان سے باہر بھاگ کر جا سکیں ۔"

"بیٹی ! میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا ۔"

"ان کی باتیں سب اچھی طرح تو میری سمجھ میں بھی نہیں آئیں ۔ لیکن کچھ مطلب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری پولیس اُن کے دوستوں کو اور "ہندوستان کی آزادی" والوں کو جیل بھیجنا چاہتی ہے ۔ وہ تو کہتے ہیں کیونسٹوں کو ۔ مگر میں سمجھی ہی نہیں کہ یہ

کیمونسٹ کیا ہوتے ہیں!"

"یا الٰہی بچانا اُسے ۔ بیٹا آج اپنے باپ حیدر کو ضرور مُلوانا ۔ میری بات تو وہ سُنتا نہیں ۔ شاید حیدر کے کہنے سُننے سے کچھ مان جائے۔ وہ سُسر بھی ہے اور ماموں بھی کچھ نہ کچھ لحاظ تو آہی جائیگا۔"

شہاب کے اوپر کے کمرہ میں دس پندرہ آدمی جمع ہیں ۔ باہر کے کمرے میں ایک شریف صورت نوجوان سوٹ پوش بیٹھے ہیں۔ اور جو لوگ آتے جاتے ہیں انھیں خاموشی اور آہستگی کے ساتھ اوپر پہونچاتے جاتے ہیں ۔ اوپر کمرے میں ایک بڑی سی میز بیچ میں پڑی ہوئی ہے ۔ اور آس پاس کرسیاں بچھی ہیں ۔ جن پر آنے والے بیٹھتے جاتے ہیں ۔ آخرکار آنے والوں کا یہ سلسلہ ختم ہوگیا ۔ اور شہاب نے میز کے ایک سرے پر کھڑے ہوکر انگریزی میں دوسرے آدمیوں کو مخاطب کرکے کہا ۔" ساتھیو! ہم نے کافی احتیاط سے آج کے اجتماع کی کوشش کی ہے ۔ اگرچہ ہماری دو تین ایسی کوششیں ناکام ہوچکی ہیں ۔ لیکن ایسا یقین ہے کہ آج پولس کو ہمارے اس جلسہ کا سراغ نہ مل سکے گا ۔ اس لئے ہمیں اپنی کارروائی باطمینان شروع کرنا چاہیئے۔"

ایک کھادی پوش نوجوان اٹھے اور زمانہ جنگ میں اپنی تحریک کی رفتار پر تبصرہ کرنے لگے۔

"ہم نے کوشش کی کہ ہم کھُل کر سامنے آئیں ۔ لیکن زمانہ کی رفتار ہماری طاقت کے خلاف ہے ۔ ایک طرف تو برطانوی سامراج کا سیاسی اقتدار ہمیں کچل رہا ہے ۔ دوسری طرف خود ہماری قومی تحریک جو ہمارے سرمایہ داروں کے بل بوتے پر چل رہی ہے صنعتی مزدوروں سے ایسے زمانہ میں جبکہ صنعتیں بے انتہا فائدہ بخش ثابت ہورہی ہیں مکمل خاموشی کا مطالبہ کررہی ہے ۔ اور کسی ایسے قدم کو جو مزدور اپنے معاشی مفاد کیلئے اٹھانا چاہیں پیچھے ہٹانے میں پوری سخت گیری کے ساتھ تشدد کا ساتھ دیتی ہے ۔ اور خود ہم پر یہ الزام لگاتی ہے کہ ہم عدم تشدد کے مخالف اور تشدد کے حامی ہیں ۔ ساتھیو! ـــــــــ"

سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی آواز سُنائی دی ، سب حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے ۔ اتنے میں مسٹر حیدر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولس جو شہاب کے سُسر اور ماموں تھے کمرے میں باقاعدہ وردی پہنے ہوئے داخل ہوئے ۔ پولس کی وردی دیکھ کر ہر ایک اپنی نشست پر چوکنا ہوگیا ۔ اور سوٹ پوش نوجوان نے اپنی جیب میں سے ریوالور نکال کر میز پوش کے نیچے چھپالیا۔ شہاب نے نوجوان کو مخاطب کرکے کہا "گھوش ، خبردار! یہ پولس افسر بھی ہیں اور میرے سُسر بھی ہیں ـــ ان سے پوچھنے دو کہ یہاں آنے کی تکلیف کیوں گوارا فرمائی ہے"

"میں اسی مقصد کیلئے تعینات کیا گیا تھا کہ کیمونسٹ پارٹی کی جانچ کردں ۔ اور اگر وہ خفیہ جلسے کرے تو اپنے اطمینان کے بعد شرکاء جلسہ کو گرفتار کرلوں ۔ لیکن یہ گھر میری بہن ، میری بیٹی ، میرے بھانجے اور میرے داماد کا بھی ہے ۔ اس لئے میں اپنے فرائض کی بجاآوری سے پہلے ذاتی طور پر مسٹر شہاب سے آپ صاحبان کے مواجہ میں کچھ خانگی امور کے متعلق گفتگو بھی کرنا چاہتا ہوں ۔ کیا مسٹر شہاب آپ تیار ہیں ؟" مسٹر حیدر سوال کرنیکے بعد شہاب کی طرف دیکھنے لگے۔

"ماموں جان میں جانتا ہوں کہ آپ کیا گفتگو کریں گے ۔ پچھلے چند دن میں ہم آپ گھنٹوں خانگی معاملات پر گفتگو کرچکے ہیں۔ آپ اپنے فرائض انجام دیں۔"

"تمہاری اس ضد کے باوجود بھی میں پھر ایک موقع ہاتھ سے نہیں کھونا چاہتا ـــــــــ"

"حضرات! یہ میرے داماد ہیں ، اپنی شادی کے بعد سے اب تک انھوں نے اپنی شریک حیات کے مسرت و غم میں کوئی حصہ نہیں لیا ۔ حالانکہ جب شادی کی تجویز ہوئی اس وقت بھی یہ عاقل و بالغ اور سمجھدار انسان تھے ۔ ان کی تعلیم بھی اعلیٰ ترین تعلیم تھی۔ یہ یورپ سے واپس آچکے تھے ۔ لیکن انھوں نے اپنے ارادوں کا کوئی اظہار نہیں کیا ۔ اور خاموشی کے ساتھ اس ازدواجی زندگی کو قبول کرلیا ۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ ازدواجی زندگی کی تمام سوشل ، اخلاقی اور قانونی ذمہ داریاں قبول کرنے کے لئے آمادہ تھے۔"

"میں اب بھی آمادہ ہوں" تڑخ کر شہاب نے جواب دیا۔

"بات نہ کاٹو ــــــــ تو حضرات شادی کے بعد سے انھوں نے اس قسم کی کسی ذمہ داری کو پورا نہیں کیا۔ نہ صرف میری لڑکی کی زندگی مصیبت میں ہے بلکہ اپنی بوڑھی ماں کو بھی انھوں نے زندگی سے عاجز کر دیا ہے۔ انھوں نے انتہائی ظلم یہ کیا کہ اپنی بیس پچیس ہزار روپے کی جائداد ٹھکانے لگا کر نہ صرف اپنی زندگی کو تباہ کیا بلکہ اپنی بیوی، اپنی ماں اور ایک معصوم بچی کی زندگی کو تلخ بنا دیا ہے"

"میں اس وقت ان کے آئیڈیل یا ان کے اصولوں سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ نہ مجھے اُن سے کوئی سروکار ہے۔ کیونکہ انھوں نے میری بیٹی کی زندگی اور مستقبل کو سوچے سمجھے بغیر اُسے مصیبت کا شکار بنانے میں اپنے اصولوں کو اُس وقت بالکل پیشِ نظر نہیں رکھا تھا"

"اس کے باوجود گذشتہ دو سال میں میں نے بار بار ان کیلئے حکومت سے معافی کی کوشش کی۔ اور بار بار حکومت نے انھیں معاف کر دینے پر آمادگی ظاہر کی لیکن یہ تیار نہ ہوئے۔ اور سول سروس کا کوئی عہدہ انھوں نے قبول نہیں کیا ــــ اور اب آخری ظلم یہ ہے کہ یہ اپنی بیوی سے نہایت سنجیدگی کے ساتھ ایک عجیب قسم کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یعنی یہ کہ وہ بھی ان کے ساتھ ان کی سیاسی سرگرمیوں میں شریک ہو اور اپنا نصب العین اپنی بنا ہی بنائے"

"میں سرکار کا وفادار قدامت پسند انسان ہوں اور سوسائٹی کی موجودہ حالت میں کسی تبدیلی کا سخت مخالف ہوں۔ وہ میری بیٹی ہے اور میری تربیت کے ماتحت یہ اُس کے بس کی بات نہیں۔ لیکن ان کی یہ خواہش پورے گھر کی مخالفت کے باوجود دیوانگی کی حد تک پہنچ چکی ہے ــــ اس لئے میں اپنا اور ان کا معاملہ آپ صاحبان کے سامنے انصاف حاصل کرنے کیلئے پیش کرتا ہوں۔ اسی کے ساتھ مجھے آخری بار ان سے یہ بھی کہنا ہے کہ اگر یہ میری تجویز قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہیں تو انھیں اپنی بیوی کو آزاد کر دینا چاہئے۔ اور اس سے علیحدگی اختیار کر لینا چاہئے"

"میں تیار ہوں" شہاب نے جواب دیا۔

لیکن سب خاموش رہے: وہ سب شش و پنج میں پڑ گئے تھے۔

"اچھا تو اس طلاق نامے پر دستخط کر دو"

پولس افسر نے کاغذ میز پر ڈال دیا۔ شہاب کی طرف بڑھایا۔ اور بغیر کسی تامل کے، بغیر کچھ دیکھے، جیب سے قلم نکال کر اس نے دستخط کر دیئے۔

"ٹھیک ہے" پولس افسر نے کہا "اب میری بچی آزاد ہے۔ اور تم پر اس کا مہر واجب الادا ہے۔ گیارہ ہزار روپیہ۔ اس کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ میرے پاس اب روپیہ، جائداد وغیرہ کچھ نہیں" شہاب نے غمگین لہجہ میں جواب دیا۔

"خیر، اس کا فیصلہ ہوتا رہے گا۔ لیکن اپنی ڈیڑھ سالہ بچی کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ ہم اس کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں"

شہاب جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ برابر کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور عذرا کے چیخ چیخ کر رونے کی آواز آئی ــــ وہ کہہ رہی تھی ــــ "اباجان! یہ آپ نے کیا کیا، میں آپ کو منع کرتی رہی لیکن آپ نے نہ مانا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے اپنی ساری زندگی انھیں کے ساتھ گذارنا ہے۔ اب میں ان سے علیحدہ ہونا نہیں چاہتی۔ لیکن آپ نے زبردستی کی۔ اباجان! بڑے ظالم ہیں آپ۔ میں اُن سے اب بھی علیحدہ ہونا نہیں چاہتی۔ آپ اس کاغذ کو پھاڑ ڈالئے ــــــــ ہائے میری قسمت ہائے میری بچی ــ" وہ پھر رونے لگی۔

"عذرا، تمہیں شرم نہیں آتی، یہاں اتنے مرد اور سب کے سب نامحرم بیٹھے ہوئے ہیں۔ جاؤ گھر میں جاکر بیٹھو" عذرا

کے باپ نے ڈانٹ کر کہا۔ وہ ننگے سر کمرے کے باہر نکل آئی تھی۔ اور اس کے چہرے پر اضطراب اور پریشان حواسی گہری تکلیف پتہ دے رہی تھی۔

"نہیں اباجان رہنے دیجیے۔ میری قسمت انہی کے ساتھ بننے بگڑنے دیجیے۔ وہ جس طرح چاہیں گے میں اُن کے ساتھ رہ[وں گی] اور خوش رہوں گی۔" وہ اب بھی زار و قطار رو رہی تھی۔

پولس افسر غصے سے سُرخ ہوگیا۔ "بدذات، بے حیا لڑکی! تیرا شوہر تجھے طلاق دے چکا۔ دور ہو سامنے سے ــــ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔"

"میں اس طلاقنامے کو چاک کر کے عذرا کو واپس لے سکتا ہوں۔ آپ اس پر کوئی زیادتی نہیں کرسکتے۔" شہاب نے چلا کر کہا۔ اور طلاقنامہ کی طرف جھپٹ کر ہاتھ بڑھایا جو اب تک میز پر پڑا ہوا تھا۔ لیکن کاغذ چشم زدن میں پولس افسر کے قبضہ میں تھا۔ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ لڑکی کی وقتی تکلیف اور ہنگامی جذبات پیدا ہونے کی وجہ ہے۔ وہ تمہاری شریکِ زندگی رہ کر کبھی خوش نہیں رہ سکتی۔ ہاں اپنی بچی کیلئے کیا انتظام کرتے ہو؟"

شہاب خاموش تھا۔ مگر اس پر شدید تاثرات طاری تھے۔ کوئی ماہر نفسیات بھی اس وقت شہاب کی نفسی کیفیتوں کا ایک ملے جُلے احساسات کا اندازہ لگانے میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔ کمرے میں سوائے عذرا کی ہچکیوں کے کوئی آواز سُنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہر شخص مہر بلب تھا کہ اتنے میں برابر والے کمرے سے ایک بوڑھی عورت کی آواز کچھ کہتی سُنائی دی۔ یہ شہاب کی ماں کی آواز تھی۔ جو انتہائی درد و کرب کے عالم میں کہہ رہی تھی ــ "بھیا حیدر! حیدر!! بس اتنا غصہ کافی ہے۔ شہاب مان گیا۔ بس اب رہنے دے۔"

"افسوس! بہن جان! قصہ ہی ختم ہوگیا۔ یہ سب جو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں اپنے سینے میں پتھر رکھتے ہیں۔ خیر اندر جاؤ۔" مسٹر حیدر نے کہا۔

کمرے کا ماحول سخت ڈرامائی ہوچکا تھا۔ شہاب کے چہرے پر زردی، سُرخی، اور سفیدی باری باری سے رنگ لا رہی تھی۔ "گھوش! ریوالور تیار،" نوجوان کے نتھنے پھول گئے تھے۔ اور وہ بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ "اچھا اب آپ کیا چاہتے ہیں؟" شہاب نے پوچھا۔

"ہاں اب مجھے اپنے ناخوشگوار فرائض انجام دینے ہیں ــ اچھا، مسٹر شہاب، مسٹر گھوش، مسٹر ملکوجی، مسٹر رام ناتھن، مسٹر بسمل! میں آپ پانچ صاحبان کو حضور ملک معظم کی قانونی حکومت کے خلاف جنگ کرنے اور اسلحہ استعمال کرنے یا ایسا کرنے کی کوشش کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں۔ باقی صاحبان بھی ٹھیریں۔ میں جامہ تلاشی کے بعد اجازت دوں گا کہ وہ تشریف لے جائیں۔" یہ کہہ کر پولیس افسر نے سیٹی بجائی۔

گھر کے اندر صحن میں، سڑک پر اور زینے پر دھما دھم قدموں کی آوازیں سُنائی دیں۔ ایسا معلوم ہوا یکایک آس پاس بھگدڑ مچ گئی ہے۔ کمرے کے اندر عورتیں سہم کر رہ گئیں۔ رونے دھونے کی آواز بند ہوگئی۔ زینہ پر آدمیوں کے چڑھنے کی آوازیں آنے لگیں۔

یکایک میز پوش میں ایک سرسراہٹ ہوئی۔ گھوش کی کرسی پیچھے ہٹی۔ وہ تن کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے ریوالور پولس افسر کی طرف تان کر کہا:۔

"مسٹر پولس افسر! آپ اپنے تمام ذاتی اور صفاتی فرائض انجام دے چکے۔ اب میں اپنا فرض انجام دیتا ہوں۔" فائر کی دو پیہم آوازیں آئیں۔ دونوں گولیاں تین تین انچ کے فاصلہ سے پولس افسر کے سینے میں پیوست ہوگئیں۔ ساری لاش دھڑام سے فرش پر گری۔ اور گرم خون کے دو فوارے سینے سے جاری ہوگئے۔ فرش خون سے سُرخ ہوگیا۔

"کم بخت، وقت سے پہلے تمام پروگرام ملیامیٹ کر دیا۔ اب ہم میں سے کوئی آزاد نہیں رہ سکتا"
ریوالور کی آواز سے پولس چوکنا ہو گئی۔ آٹھ دس انسپکٹر، سب انسپکٹر اور چھوٹے عہدہ دار ریوالور ہاتھوں میں لئے اندر داخل ہوئے۔ ایک دراز قامت فربہ اندام لانبی مونچھوں والے انسپکٹر نے بھاری آواز سے کہا — "تم سب لوگ گرفتار کئے جاتے ہو۔ ہاتھ اونچے کر لو۔ حکم نہ ماننے والے کو گولی مار دی جائیگی"

سب نے ہاتھ اٹھا دیئے۔

تھوڑی ہی دیر میں کمشنر، سپرنٹنڈنٹ اور بہت سے پولس افسر آپہونچے۔ اور اٹھارہ آدمیوں کو مع شہاب کے گرفتار کر لیا گیا۔
دو سال مقدمہ چلنے کے بعد گھوش کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ اس نے اقبال جرم کیا تھا۔ شہاب اور اس کے دو ساتھیوں کو ناجائز اسلحہ فراہم کرنے، ملک معظم کی حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کی سازش کرنے اور پولس افسروں کو قتل کرنے کا ارادہ رکھنے کے جرم میں حبس دوام کی سزائیں ہوئیں۔ اس کے باقی ماندہ ساتھیوں میں سے کسی کو سات سال کسی کو چار سال اور کسی کو دو سال طلاق نامے کی رو سے عذرا کی طلاق صحیح قرار دی گئی۔ اور عین اُسی دن جو شہاب کی سزایابی کا دن تھا، عذرا اور ایک "معقول" صاحب جائداد پولس انسپکٹر کا عقد ثانی ہو گیا۔ اب وہ پُرسکون زندگی بسر کر رہی تھی۔
لیکن اکثر و بیشتر آدھی آدھی راتوں کے اندھیرے میں جھلملاتے ہوئے تاروں کے سوا کوئی نہ محسوس کر سکا کہ عذرا اپنی آنکھوں کے راستے بے شمار گوہر آبدار لٹا چکی ہے ——— کس لے اس کی نوائے درد خدا نے تاریکی کے سوا نہ سُنی۔ شاید اب اس کا امتحان لیا جا رہا تھا ———

عذرا کا دوسرا شوہر کبھی کبھی عذرا کو ملول دیکھ کر کبھی ازراہ ہمدردی کبھی ازراہ طنز یہ ضرور پوچھا کرتا ہے کہ ———
"کیوں تمہیں شہاب تو یاد نہیں آتا ——— ؟" اور پھر خود ہی جواب دیدیتا ہے کہ ——— "ضرور یاد آتا ہوگا۔ بڑا اچھا آدمی تھا۔ لیکن اصولوں کی پاسداری کرنا بھی اسی طرح حماقت ہے"

لوگوں کا اقتدار ہو گیا ہے جنھیں مسلم مفاد سے کوئی لگاؤ ہے۔ اور نہ سیاست سے [illegible] ہے۔

۱۹۳۴ء میں مسٹر جناح نے مسلم لیگ کی نئی تنظیم شروع کی تو انہوں نے قوم پرور [illegible] مسلمانوں سے مسلم لیگ کی امداد کی اپیل کی۔ اس لئے قوم پرور مسلمانوں نے بڑے زور و شور سے صدائے لبیک کہا۔ مولانا [illegible] مولانا حسرت موہانی، شیخ عبدالمجید سندھی، مولانا ظفر علی خاں وغیرہ سب مسلم لیگ میں شامل ہو گئے یہاں تک کہ ۱۹۳۷ء کے عام انتخابات میں جمعیۃ العلماء کے سرکردہ اراکین نے مسلم لیگ کے امیدواروں کی مدد کی۔ لیکن انتخابات ختم ہوتے ہی مسٹر جناح نے ان تمام قوم پرستوں کو اٹھا کر پھینک دیا اور سارے ہندوستان کے انتہائی گندے قسم کے سرکار پرست، ٹوڈی سروں، خان بہادروں اور نوابوں سے ناطہ جوڑا۔ اس کے بعد مسلم لیگ ان ٹوڈی فرقہ پرستوں کا اکھاڑہ بن گئی جن کی پشت پر نہ کسی قومی خدمت کا ریکارڈ تھا۔ نہ کسی ایثار و قربانی کی تاریخ تھی اور نہ ان کے سامنے کوئی مشترک مقصد اور نصب العین تھا بلکہ

ان کی سرکار پرستی اور ٹوڈیت ہی ان کی سب سے بڑی سفارش ثابت ہوئی اور انہوں نے جوق در جوق مسلم لیگ میں داخل ہو کر مفت میں مسلم لیگ کی لیڈری لے لی۔

قائد ملت مسٹر محمد علی جناح نے ہر موقع اور محل پر، بلکہ بے موقع اور محل بھی، قوم پرور مسلمانوں کو کمر [illegible] انہیں دھتکارا اور غدار کا لقب دیا۔ اور ہر قسم کے ٹوڈی اور سرمایہ دار مسلمانوں کی پرورش کی، انہیں آگے بڑھایا، ان کی مدح سرائی کی اور انہیں مضبوط کیا ہے۔ [illegible] مسٹر جناح کے یہی پروردہ ٹوڈی جنھیں جاہ و حشم کے سوا کسی چیز سے مطلب نہیں، قائد ملت کی نہیں سنتے تو اس میں قصور کس کا ہے۔

آخر یہ لوگ مسٹر جناح کو کہاں لیجا رہے ہیں اور یہ چیز کہاں [illegible] کرے گی یہ مستقبل ہی بتلائے گا۔ لیکن اس وقت جو صورت حال ہے اور قائد اعظم کا جو طرز عمل ہے ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نظر نہیں آتی جو مسلم لیگ کی تنظیم کو انتشار اور بربادی سے بچا سکے آخر میں ہمیں اقبال کا یہ مصرعہ پڑھنا پڑتا ہے۔

جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

تبصرے

لینن گراڈ تا سمرقند

مصنفہ عشرت علی صدیقی۔ حجم ۱۲۲ صفحات۔ مطبوعہ عبدالحق اکیڈیمی حیدرآباد دکن اُردو گلی۔ قیمت ایک روپیہ ۸ آنہ۔

جاذبِ نظر گردپوش پر لینن کے مجسمہ کی تصویر ہے۔ بقول مصنف "روس کا حال میں نے ابتداً لکھنؤ کے ہفتہ وار اخبار ہندوستان کے لئے لکھا تھا۔۔۔ ان مضامین کو اب نظرِ ثانی کے بعد کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے"۔ زیرِ نظر تصنیف میں اس نئے تہذیب تمدن کی ایک جھلک دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے جو اشتراکی روس میں زیرِ تعمیر ہے اور جس کی حیرت انگیز طاقت کا اندازہ ہمیں موجودہ جنگ کے دوران میں مل رہا ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر یہ کتاب عام لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ مصنف کی کوشش ناکامیاب نہیں قرار دی جا سکتی۔ پھر بھی پوری کتاب میں جدید روس سے متعلق گہرے اور تفصیلی معلومات کا فقدان نظر آتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں "سوویٹ روس" مصنفہ محمد کلیم اللہ کا تذکرہ غالباً بیجا معلوم ہوگا جو اس موضوع پر اُردو کی بہترین تصنیف قرار دی جا سکتی ہے۔

TWENTY QUESTIONS ABOUT RUSSIA
روس سے متعلق بیس سوالات

مصنفہ۔ ایچ ڈبلیو ہنڈرسن حجم پچاس صفحات قیمت ۸ آنہ۔ کاغذ اور لکھائی چھپائی بہت معمولی اور ردی۔

معنوی اعتبار سے انگریزی کا یہ چھوٹا سا پمفلٹ انگریزی کی دسویں درجہ کی سستی صحافت نگاری (CHEAP JOUR NALISN) اور پروپگنڈہ کا ایک اچھا خاصہ نمونہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ روس کو "فردوس بریں" کا نمونہ تسلیم کر لینا بھی سادہ لوحی کی دلیل ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ روس اب تک جن چیزوں کو حاصل کر سکا ہے اُن کی حقیقت اور وجود سے بھی ڈھٹائی کے ساتھ انکار کر دیا جائے۔ پھر زیرِ بحث تصنیف میں انفرادی آزادی اور خوشحالی کے اعتبار سے روس کو برطانیہ اور امریکہ سے پست دکھلانا ہی کا دراصل مطلب یہ ہے کہ مصنف نے ہم ہندوستانیوں کو احمق سمجھ رکھا ہے۔۔۔

یہ کتاب اگر ۱۹۴۱ء سے پہلے شائع ہوئی تو غالباً مصنف کو بہت

مقصد میں زیادہ کامیابی ہوتی۔ اب جبکہ روس کے متعلق ساری دنیا بہت کچھ جان گئی ہے اس قسم کا سامراجی اور سرمایہ دارانہ پروپگنڈا زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتا۔

یوگ آسن اور مالش

مصنفہ مرزا عصمت اللہ بیگ حجم ۳۰ صفحات۔ عبدالحق اکیڈیمی اشاعت منزل۔ اردو گلی حیدرآباد دکن۔ قیمت ۱۲ آنہ

اس مختصر سی کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ زیرِ نظر تصنیف کے دیباچہ نگار محمد سجاد مرزا صاحب پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج کے لفظوں میں "مصنف نے اس کتابچہ میں یوگ آسن اور مالش کی چند ایسی آزمودہ تدبیریں بتلائی ہیں جو نہ صرف صحت اور توانائی کو قائم رکھتی ہیں بلکہ عمر کا دوران بھی بڑھا سکتی ہیں"۔ قدیم یونان کے علوم جب یورپ کے عہدِ متوسط کی ہزار سالہ "تاریک رات" سے گزر کر پندرھویں اور سولہویں صدی میں ترقی یافتہ قوموں کے ذریعہ یورپ میں پہنچے تو اس سے نشاۃ الثانیہ وجود میں آیا جس پر جدید یورپی تمدن کی بنیاد قائم ہے لیکن بیشتر مورخین کی رائے ہے کہ جسم کو ورزش کے ذریعہ حسین بنانے کا آرٹ جسے یونانیوں نے معراجِ کمال تک پہنچا دیا تھا اور جس کا کچھ واضح اندازہ اُن کے مجسموں سے ہوتا ہے، یونان کے قدیم تمدن کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تاریخ کی بوسیدہ خندقوں میں دفن ہو گیا اور جدید دنیا تک نہ پہنچ سکا۔ ہندوستان بھی اپنے موجودہ تہذیبی و تمدنی نراج (ANARCHY) کے دور میں اپنے چند بے حد مفید آبائی ورزشی اور جسمانی اصولوں کو بہت تیزی سے بھولتا جا رہا ہے۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے۔ زیرِ نظر تصنیف اس اعتبار سے مفید قرار دی جا سکتی ہے کہ اس کے اندر ہندوستان میں عام طور پر رائج جسمانی اصولوں اور قاعدوں کو قلمبند کر کے نہ صرف یہ کہ محفوظ کر دیا گیا ہے۔ بلکہ ہلکے پھلکے اور عام فہم انداز میں عام لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔



خوبصورت بال

بالوں کا حسن جس کی ہر شخص کو تمنا ہے۔ آپ کا ہو سکتا ہے
ٹامکو کوکونٹ ھیر آئل اور شیمپو کے
باقاعدہ استعمال کی عادت ڈالئے

ٹامکو سیلز ڈپارٹمنٹ جواہر اسکوائر الٰہ آباد



عورتوں کے لئے ایک عمدہ روزگار

بے غرض خدمت
باعزت زندگی۔

اے۔ این۔ ایس کی نرسیں

سماج کی اب یہ خواہش ہرگز نہیں کہ عورتوں کو صرف خانگی زندگی تک محدود رکھا جائے۔ آپ جیسی ذہین اور ترقی پسند خواتین کے لئے ہندوستان کی۔ اگزیلری نرسنگ سروس میں نہایت پرکشش، دلچسپ اور مفید روزگار موجود ہیں۔ کسی وردی یا پوشاک کو وہ مرتبہ اور وقعت حاصل نہیں جو ان رحم اور ہمدردی کی دیویوں کے سفید نورانی لباس کو حاصل ہے۔

"اے۔ این۔ ایس" کی اعلیٰ تربیت اور تجربہ کی بدولت آپ جنگ کے بعد آسانی سے غیر فوجی نرسنگ کی ملازمت حاصل کرکے کامیاب اور خوشحال زندگی بسر کرسکیں گی۔ اگر آپ کا ارادہ کچھ اس سے مختلف بھی ہو تو آپ کی یہ معلومات خانہ داری اور سماج کی خدمت کے کاموں میں بے حد مفید ثابت ہوں گی۔ اس موقعے کو ہاتھ سے نہ دیجئے۔

"اے۔ این۔ ایس" نرسوں کی تنخواہ میں اب معقول اضافہ ہوگیا ہے۔ جنرل سروس والی چھ مہینے کی شرح تنخواہ ۱۲۵ روپے سے ۱۷۵ روپے ماہوار تک ہے۔ اس کے ساتھ رہائش، خوراک اور علاج مفت۔ یہ رعایتیں نہ ہونے کی صورت میں ۳۰۰ روپے سے ۳۳۳ روپے ماہوار تک۔

بیس سے پینتالیس ۱۸ سے ۴۵ سال تک عمر کی ہر ایسی عورت کو لی جا سکتی ہے جو ملک معظم یا کسی ہندوستانی ریاست کی رعایا ہو۔

اس کام کا سابقہ تجربہ ہونا ضروری نہیں۔ البتہ سابقہ تجربہ کی بنا پر اسے زیادہ تنخواہ کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے۔

نرسوں کی اچھی طرح نگہداشت کی جاتی ہے۔ اور ہر صورت ہندوستان کے اندر ہی تعینات کی جائیں گی سوائے ان کے جو رضاکارانہ طور پر سمندر پار جانا چاہیں۔

a·n·s

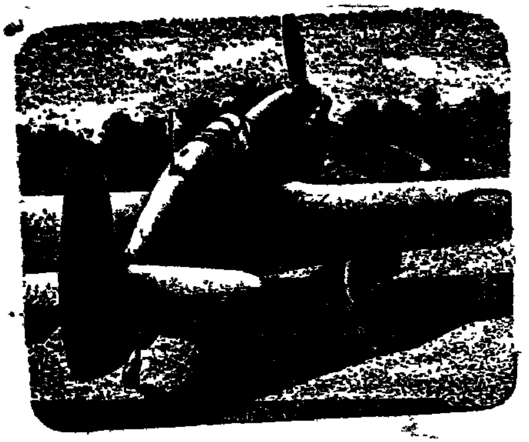
اگزیلری نرسنگ سروس

شریف عورتوں کیلئے شریف ترین مشغلہ

پوری تفصیلات کے لئے

آج ہی اپنے علاقے کی لیڈی سپرنٹینڈنٹ سینٹ جان ایمبولینس بریگیڈ یا ڈائرکٹر جنرل انڈین میڈیکل سروس نئی دہلی کو لکھئے۔

EAA 187



عالی ہمتی . . .

عالی ہمتی اور مردانہ کارناموں کا ولولہ ہندوستانی ہوائی بیڑے کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ اور دراصل اسی حیرت انگیز ولولے اور اعلیٰ جذبے کی بنا پر آئی۔ اے۔ ایف کو یہ زبردست قوت تنظیم اور امتیاز حاصل ہے۔ تاریخ کے اس اہم دور میں جبکہ دنیا کا پرانا نقشہ منسوخ اور نئی سرحدیں تعمیر ہو رہی ہیں۔ فاتح اور مفتوح کی قسمت کا دار و مدار ہوائی قوت ہی پر ہے۔ ہندوستانی ہوائی بیڑے نے اپنے ساتھیوں کے دوش بدوش جاپانیوں کو دکھا دیا کہ ہماری عالی ہمتی اور اعلیٰ تربیت کی بدولت یہ ہوائی اقتدار ہمیں کو حاصل ہو سکتا تھا اور حاصل ہے۔

اب وقت ہے کہ آپ اپنی جنگ کے بعد کی زندگی کا بھی خیال کیجئے۔

★ یہ بالکل یقینی ہے کہ ہندوستانی ہوائی بیڑے کے افسروں کو جو تربیت اور تجربہ حاصل ہوتا ہے اس [illegible] سے آدمیوں میں وہ لیاقتیں پیدا ہو جائیں گی جو ایک کامیاب اور خوشحال زندگی کے لئے ضروری ہیں۔

★ حکومت نے ذمہ لیا ہے کہ جنگ کے دوران میں ان اسامیوں کی ایک بڑی تعداد خالی رکھی جائے گی جو حکومت کے زیر اختیار ہیں۔ ان عہدوں پر جنگ کے بعد ان لوگوں کا تقرر کیا جائے گا جنہوں نے فوجی خدمات انجام دی ہوں گی۔

★ فوجی خدمت سے واپس آئے ہوئے لوگوں کو حکومت کے خرچ پر خاص خاص فنون اور پیشوں کی خصوصی تعلیم دینے کے لئے بھی منصوبے تیار کئے جا رہے ہیں۔

★ ان امیدواروں کو جو اس وقت یونیورسٹیوں میں تعلیم پا رہے ہیں، بہت سی تعلیمی رعایتیں حاصل ہوں گی جن کی بنا پر وہ جنگ کے بعد اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں گے۔ پوری تفصیلات آپ اپنی یونیورسٹی کے عہدہ داروں سے حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ کوپن کاٹ کر قریب ترین جی۔ ڈی (پائلٹس) ریکروٹنگ آفسر کو بھیج دیجئے جو آپ کو درخواست کا فارم اور ہندوستانی ہوائی بیڑے میں پائلٹ کے عہدے کے متعلق جو شرائط و قواعد ملازمت بھیج دے گا۔

نام ______________________

پتہ ______________________

____

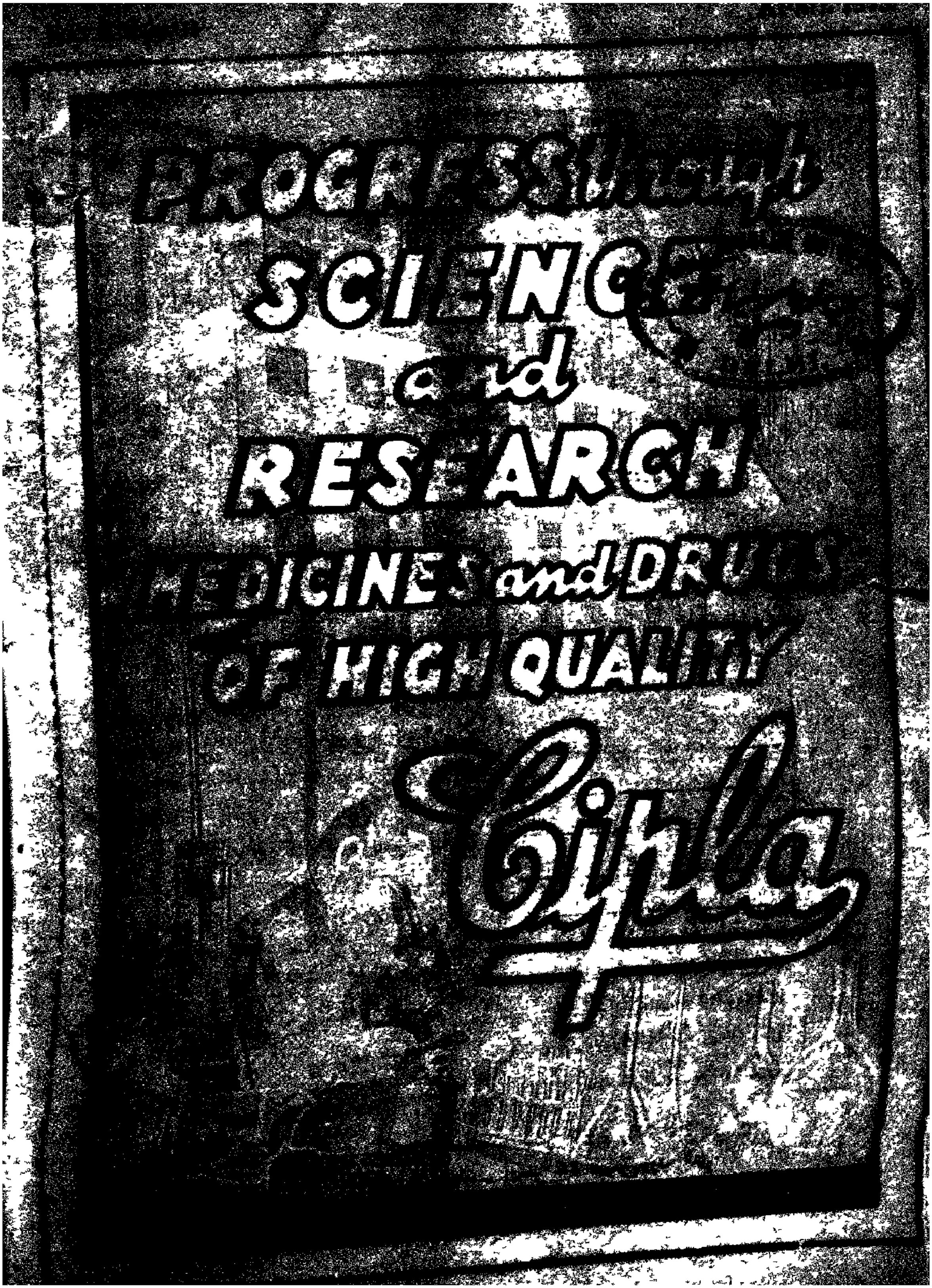
____

آئی۔ اے۔ ایف کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو جسمانی طور پر بالکل درست اور صحتمند ہوں۔ جن کی قوت سماعت ٹھیک اور عمر ۱۸ سے ۲۸ سال تک ہو۔ حالت جنگ میں ہوابازی کا بار برداشت کر سکیں۔ عام تعلیمی استعداد اچھی ہو اور انگریزی روانی سے لکھ اور بول سکیں۔

اپنا کوپن قریب ترین جی۔ ڈی ریکروٹنگ آفسر کو بھیج دیجئے۔

AAA 23

آئی۔ اے۔ ایف۔ جی۔ ٹی۔ (پائلٹس) ریکروٹنگ آفیسر۔ ۵ وے روڈ۔ لکھنؤ۔
آئی۔ اے۔ ایف۔ جی۔ ڈی۔ (پائلٹس) ریکروٹنگ آفیسر۔ ۲۸ ڈیوس روڈ۔ لاہور۔


PROGRESS through
SCIENCE
and
RESEARCH
MEDICINES and DRUGS
OF HIGH QUALITY
Cipla

5th YEAR of PUBLICATION

The

NAI ZINDAGI

اردو زبان کا واحد سیاسی رسالہ

نئی زندگی

ALLAHABAD

10

ANNAS

کفایت شعاری کے دشمن



سونٹے سے پیٹنے والا

پرانے زمانہ میں کپڑے دھونے کا عجیب طریقہ رائج تھا - یہ سمجھا جاتا تھا کہ جتنی زیادہ سختی سے کپڑوں کو پیٹا جائے گا اتنا ہی اچھا نتیجہ بر آمد ہوگا - لیکن کپڑا ایسی چیز نہیں جو اس وحشیانہ سلوک کا مقابلہ کر سکے پھر کیوں ان بیچارے کپڑوں کی زندگی کو ختم کیا جائے خصوصاً جبکہ آپ صرف مذکورہ ذیل آسان طریقوں سے انہیں نہایت صاف اور کفایت کے ساتھ دھوسکتے ہیں ؟

کپڑوں کو گرم پانی میں اچھی طرح بھگو رکھئے تاکہ میل پھول جائے



۵۰۱ صابن کا کفایت سے استعمال کیجئے اور اسے کپڑوں پر حسب ضرورت لگائیے تاکہ صابن کی بھی بچت ہو اور کپڑے بھی محفوظ رہیں



کپڑوں کو صاف پانی میں اچھی طرح دھو ڈالئے تاکہ صابن کا اثر دور ہوجائے اور میل کا نام بھی باقی نہ رہے - پھر آپ ان صاف کپڑوں پر فخر کرسکیں گے —

501

۵۰۱ واشنگ سوپ

اُردو زبان کا واحد کلچرل و سیاسی رسالہ

نئی زندگی
الٰہ آباد

بانی :- ڈاکٹر سید محمود
ایڈیٹر :- سید انیس الرحمٰن

سرپرست :- ڈاکٹر خواجہ عبدالمجید
جوائنٹ ایڈیٹر :- طفیل احمد خاں ایم اے

جلد ۵ | ماہ مئی ۱۹۴۵ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

۱	فکر و نظر	ایڈیٹر	۲
۲	رفتار عالم	ادارہ	۸
۳	رنگ اور نسل کا مسئلہ	ڈاکٹر بینی پرشاد	۱۵
۴	ہندوستان کا آئندہ دستور حکومت اور دیسی ریاستیں	سی۔ ڈی۔ ایچ۔ داؤد	۲۰
۵	اکبر اور مذہبی اتحاد	ریاض الکریم	۲۲
۶	برطانیہ کا سیاسی مستقبل	جینی لی	۲۴
۷	سکھ اور پاکستان	منظر رضوی	۲۷
۸	بعد از جنگ تعمیر کا پروگرام محض دھوکہ ہے	ڈاکٹر کاٹجو	۳۰
۹	سپرو کمیٹی کی تجاویز	ادارہ	۳۳
۱۰	سرحد میں کانگریسی وزارت اور اخبارات کی رائیں	ادارہ	۳۹
۱۱	ادبی تنقید	طفیل احمد خاں	۴۴
۱۲	ننگا ناچ (افسانہ)	گنپت شرما	۵۰
۱۳	آہ! ڈاکٹر بینی پرشاد	ادارہ	۵۵
۱۴	تبصرے	ط۔ ا۔ خ	۵۶

سالانہ چندہ :- چھ روپے | ششماہی :- تین روپیہ ۸ آنے | فی پرچہ :- دس آنے

سید انیس الرحمٰن ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے سلیمی برقی پریس یحییٰ پور الہ آباد میں چھپوا کر دفتر رسالہ "نئی زندگی" الہ آباد سے شائع کیا۔

فکر و نظر

ایڈیٹوریل

سان فرانسسکو کانفرنس پر مہاتما گاندھی کا بیان

"میں جانتا ہوں کہ خاموشی گویائی اور تحریر دونوں سے بہتر ہے۔ لیکن اصل عملی حیثیت سے کچھ واضح اور مخصوص شرطوں کا پابند ہے۔ سان فرانسسکو کانفرنس حال میں منعقد ہونے جا رہی ہے۔ مجھے اس کے لائحہ عمل کا علم نہیں ہے غالباً کوئی بھی باہر کا آدمی واقف نہیں ہے۔ بہر حال اس کا لائحہ عمل جو کچھ بھی ہو یہ ظاہر ہے کہ یہ کانفرنس آئندہ تنظیمِ عالم کے مسائل کو زیر بحث لائے گی جو بقول لوگوں کے "جنگ کے خاتمہ کے بعد وجود میں لائی جائے گی۔ مجھے خوف ہے کہ امن عالم کے تحفظ کے لئے جس سکیم کو وجود میں لانے کی کوشش کی جا رہی ہے اس کی اساس بے اعتمادی اور خوف پر قائم ہے اور یہ دونوں چیزیں جنگ کو جنم دیتی ہیں۔ میں اپنی تمام زندگی امن کا معتقد رہا ہوں اور جنگ کو ٹھکراتا رہا ہوں چنانچہ امن کے پرستار کی حیثیت سے میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ پر اپنے یقین بھرے خیالات کا اظہار کروں۔

میں ایکبار پھر اپنا یہ یقین ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ اتحادی طاقتوں اور پوری دنیا کو اس وقت تک امن دستیاب نہ ہوگا جب تک وہ جنگ کو مقدس اور اہم سمجھنا نہ چھوڑ دیں اور اس کے ساتھ جنگ ہی کی پیدا کردہ ہولناک دھوکہ بازیوں اور فریب کاریوں کو ترک نہ کر دیں اور اس حقیقی امن کو وجود میں لانے کی کوشش نہ کریں جس کی بنیاد تمام نسلوں اور قوموں کی برابری اور آزادی پر قائم ہوگی۔

جس دنیا میں جنگ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس میں ایک قوم کا دوسری قوم کے ساتھ استحصال اور لوٹ کھسوٹ کا طریقہ اختیار کرنا ہرگز ہرگز روا نہیں۔

صرف ایسی ہی دنیا میں وہ قومیں جو فوجی طاقت کے لحاظ سے کمزور ہیں طاقتور قوموں کے لوٹ کھسوٹ اور دھمکیوں سے محفوظ رہ سکتی ہیں۔

اس کی لابدی شرط یہ ہے کہ ہندوستان ہر قسم کے غیر ملکی کنٹرول سے مکمل طور پر آزاد ہو جائے نہ صرف اس لئے کہ ہندوستان سامراجی تسلط کی بدترین مثال ہے بلکہ اس لئے بھی کہ ہندوستان ایک وسیع و عریض، قدیم اور تہذیب یافتہ ملک ہے جو سنہ ۱۹۲۰ء سے اپنی آزادی کے لئے جنگ آزما ہے اور جس نے جان بوجھ کر سچائی اور عدم تشدد کو اپنی جدوجہد کا واحد ہتھیار بنایا ہے۔

اگرچہ ہندوستانی سپاہی کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے جنگ میں شامل ہوا ہے پھر بھی اس جنگ میں اس نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ جہاں تک جنگی صلاحیتوں کا تعلق ہے وہ دنیا کے بہترین سپاہی سے بھی کسی طرح کم نہیں

کہا جاتا ہے کہ ہندوستانیوں کی آزادی کی جدوجہد کے پرامن ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اندر جنگی صلاحیتیں نہیں پائی جاتیں۔ مندرجہ بالا حقیقت کو میں اس الزام کی تردید میں پیش کرتا ہوں۔ اس سے لازمی طور پر میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ ایک طاقتور قوم کا عدم تشدد اس کے تشدد سے کہیں زیادہ بہادری کا حامل ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہندوستان ابھی عدم تشدد کی بلند ترین منزل پر نہیں پہنچ سکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان نے عدم تشدد کا راستہ

[illegible] کرنے آزادی کی جدوجہد کی ہے اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوا ہے۔

۲۔ ہندوستان اگر آزاد کر دیا گیا تو دنیا کی تمام محکوم اور ستائی ہوئی نسلوں پر یہ بات ثابت ہو جائیگی کہ اُن کی آزادی کے دن بہت قریب آگئے ہیں اور آئندہ کسی حالت سے بھی اُن کے ساتھ ظلم اور استحصال کا رویہ نہیں اختیار کیا جائے گا۔

۳۔ دنیا کے آئندہ امن کی بنیاد انصاف پر قائم ہونی چاہیے جس کا تقاضا یہ ہے کہ نہ تو کسی قوم کو سزا دے کر اور نہ اس سے انتقام لے کر دنیا میں امن قائم کیا جائے۔ جرمنی اور جاپان کو ذلت کے غاروں میں دھکیلنا اس اصول کے منافی ہے۔ طاقتور کبھی انتقام نہیں لیتا چنانچہ امن کی برکتوں سے سبھی کو یکساں طور پر فائدہ اُٹھانے کا موقع دینا چاہئے۔ امن قائم ہونے کے بعد اس بات کی ضرورت ہے کہ جرمنی اور جاپان کو دوست بنانے کی کوشش کی جائے۔ اگر اتحادی طاقتیں یہ ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ وہ جمہوریت کی علمبردار ہیں تو انھیں جرمنی اور جاپان کے ساتھ یہی رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔

۴۔ مندرجہ بالا باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اُن قوموں کو جنھیں طاقت کے زور سے غیر مسلح کر دیا گیا ہے اُن پر امن کے زمانے میں مسلح طاقتوں کو نہ مسلط کر دیا جائے۔ اُن پر بین الاقوامی پولیس کے تسلط کا برقرار رکھنا انسانی کمزوری کا اظہار ہوگا۔ اس سے دنیا میں امن کے وجود کو نہیں ثابت کیا جا سکتا۔

اگر ان مندرجہ بالا اصولوں کو تسلیم کر لیا جائے جن کے بغیر عالمگیر امن کا تصور ہی غلط ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دنیا کی بین الاقوامی کانفرنس میں برطانوی سامراج کے نامزد کئے ہوئے جن لوگوں کو ہندوستان کا نمائندہ بنا کر بھیجا گیا ہے اُنھیں واپس بلا لیا جائے۔ اس قسم کی نمائندگی سے کہیں بہتر ہے کہ ہندوستان کا کوئی بھی نمائندہ کانفرنس میں شریک ہو۔ سان فرانسسکو میں ہندوستان کی نمائندگی یا تو ایک ایسے شخص کے سپرد کی جائے جو باقاعدہ انتخاب کے ذریعہ چُنا گیا ہو یا وہاں ہندوستان کا کوئی بھی نمائندہ نہ بھیجا جائے۔ کانگریس کی ۸ اگست ۱۹۴۲ء کی تجویز کے مندرجہ ذیل الفاظ سے آزاد ہندوستان کی خواہشات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"آل انڈیا کانگریس کمیٹی اس خطرے کے موقع پر ہندوستان کے کی تحفظ اور آزادی کو سب سے ضروری قرار دیتی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ کمیٹی کی یہ رائے ہے کہ دنیا کے آئندہ امن و امان، تحفظ اور پُر امن ترقی کے لئے ضرورت ہے کہ آزاد قوموں کا ایک فیڈریشن قائم کیا جائے۔ دنیا کے موجودہ مسائل کے حل کا اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں۔ اس عالمگیر فیڈریشن کے سامنے مندرجہ ذیل امور ہوں گے اُن تمام قوموں کی آزادی کا تحفظ جو فیڈریشن کے ممبر ہیں ایک قوم پر دوسری قوم کے ظلم اور استحصال کو ختم کرنا۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت۔ تمام پچھڑے ہوئے علاقوں اور قوموں کی ترقی کا انتظام کرنا۔ دنیا کے تمام طبعی اور انسانی ذرائع کو انسان کی مشترکہ خیر و فلاح کے لئے صرف کرنا۔ اس قسم کے عالمگیر فیڈریشن کے قیام کے بعد تمام ملکوں میں اسلحہ جات کا ترک کر دینا آسان ہو جائیگا۔ اس کے بعد کسی قوم کو فوج، بحری بیڑوں اور جنگی ہوائی جہازوں کی ضرورت نہ ہوگی۔ عالمگیر فیڈریشن کی فوجی طاقت جس کا کام ملکوں اور قوموں کی حفاظت کرنا ہوگا دنیا میں امن قائم رکھے گی اور تمام مظالم کا خاتمہ کر دے گی۔ اگر ہندوستان کو آزاد کر دیا جائے تو وہ اس قسم کے عالمگیر فیڈریشن کا بڑے خوشی سے ممبر بن جائے گا اور بین الاقوامی مسئلوں کے سلجھانے میں دوسرے ملکوں اور قوموں سے مساوی حیثیت سے تعاون اور اشتراک عمل کرے گا۔"

چنانچہ ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ کوئی خود غرضانہ مطالبہ نہیں ہے۔ ہندوستان کی قومیت بین الاقوامی دنیا سے اپنا رشتہ جوڑنا چاہتی ہے۔

ہندوستان کے آئندہ دستور حکومت کے متعلق

ڈاکٹر امبیدکر کا فارمولا

ڈاکٹر امبیدکر نے ۶ مئی ۱۹۴۵ء کو اچھوت ذاتوں کے فیڈریشن کے تیسرے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستان کے آئندہ دستور حکومت اور فرقہ وارانہ مسائل سے متعلق مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے:— ان کی تقریر میں اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ اکثریت والے فرقے کو کہیں بھی اتنا تناسب نہ دیا جائے کہ وہ مطلق اکثریت میں

تبدیل ہو جائے۔ ہر جگہ اور ہر شعبہ میں محض (RELATIVE) اکثریت کے اصول پر کاربند ہونا ضروری ہے۔ اس مطلق اکثریت کا مطلب یہ ہے کہ اکثریت کو کہیں بھی چالیس فیصدی سے زیادہ تناسب نہ دیا جائے اور یہ طریقہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں بھی رکھا جائے اور ہندو اکثریت کے صوبوں میں بھی۔

اگر ہندوستان کے رنگ ڈومینین اسٹیٹس چاہتے ہیں تو اُن پر خود اپنا دستور حکومت بنانے کا بھی فرض عائد ہوتا ہے حکومت برطانیہ کا اوپر سے مسلط کیا ہوا دستور کسی حالت میں بھی سازگار نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس قسم کا دستور حکومت ہمارے مسائل کو حل کر سکتا ہے جیسے ملک کا کوئی ایک طاقتور سیکشن یا متعدد سیکشن دوسرے فرقوں اور جماعتوں پر زبردستی مسلط کریں۔

دستور حکومت کی تشکیل کے لئے دستور ساز اسمبلی کا وجود اور عمل میں آنا بھی قطعی لاحاصل ہے اور تقریباً تضیع اوقات کے برابر ہے۔ صرف یہ کیا جائے کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے وہ حصے اڑا دیے جائیں جو ڈومینین اسٹیٹس کے ناموافق ہیں۔

اب تک جس نہج سے فرقہ وارانہ سوال کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں ایک خاص قسم کی "بے اصولی" کام کرتی رہی ہے۔ ایک طرف کسی طرح خوش کردو" والے اصول پر عمل کیا گیا ہے اور دوسری طرف اس اصول کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا ہے کہ "جتنا ممکن ہو سکے چھینے کی کوشش کرو" والی پالیسی پر کاربند ہونے کی کوشش کی گئی ہے۔ فرقہ وارانہ مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کوئی ایسا مشترک اصول ابھی وجود میں لایا گیا ہے جو دونوں فرقوں پر لاگو اور لازم ہو سکے۔ چنانچہ سب سے پہلے تو ہمیں ایسے بنیادی اصول مرتب کرنے ہیں جو بلا خوف اور بلا جانب داری ہر جماعت اور ہر فرقے پر لاگو ہو سکیں اور جن کی اساس پر فرقہ وارانہ مسئلے کا آخری حل تلاش کیا جا سکے۔

فرقہ وارانہ مسئلہ بنیادی حیثیت سے تناسب کا مسئلہ ہے اس تناسب کے مسئلہ کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک تو مجلس قانون ساز میں تناسب کا۔ دوسرے مجلس منتظمہ میں اور تیسرے ملازمتوں میں۔ جہاں تک ملازمتوں کا سوال ہے یہ کیا جائے کہ اس وقت جو تناسب رائج ہے اس کو باقاعدہ اور باضابطہ طور پر قانونی شکل دے دی جائے۔

مجلس منتظمہ میں ہندوؤں، مسلمانوں اور اچھوتوں کا تناسب وہی رکھا جائے جو مجلس قانون ساز میں ہو۔ جہاں تک دوسری اقلیتوں کا سوال ہے اُن کے لئے ایک یا دو نشستیں مخصوص کر دی جائیں اور ایک دستوری رواج (CONVENTION) قائم کر کے پارلیمنٹری سکریٹری کے عہدوں کی ایک مناسب تعداد اُن کے لئے مخصوص کر دی جائے۔ یورپ کے برخلاف ہندوستان میں اقلیت اور اکثریت کی اساس سیاسی نہیں بلکہ فرقہ وارانہ ہے اس لئے یہاں مجلس منتظمہ کو محض اکثریت کا نمائندہ نہ بنایا جائے بلکہ اقلیتوں کا بھی مجلس منتظمہ کو مجلس قانون ساز کی مدت حیات کے پورے ہونے سے پہلے نہ ہٹایا جائے، اور اس کے ارکان مجلس قانون ساز ہی کے ارکان میں سے چنے جائیں۔

وزیر اعظم کے لئے محض اکثریت نہیں بلکہ پورے ایوان کا اعتماد حاصل کرنا ضروری ہے۔ لیکن کابینہ کے وہ ممبر جو کسی مخصوص اقلیت کی نمائندگی کرتے ہیں اُن کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ وہ مجلس قانون ساز کے اُن ممبروں کا اعتماد حاصل کریں جو اُس مخصوص فرقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کابینہ کا کوئی ممبر اُس وقت تک نہ ہٹایا جائے جب تک ایوان اُس کے خلاف بے ایمانی اور رشوت وغیرہ یا غداری کے جرم میں ووٹ نہ پاس کرے۔

وزیر اعظم اور کابینہ کے اکثریت والے ممبروں کو پورا ایوان چنے اور کابینہ کے اقلیت والے ممبروں کو ایوان کے اُس مخصوص اقلیت والے ممبر چنیں۔

جہاں تک مرکزی مجلس قانون ساز میں نمائندگی کا سوال ہے یہ تناسب رکھا جائے۔ ہندو چالیس فیصدی۔ مسلمان تینتیس فیصدی اچھوت ذاتیں بیس فیصدی، ہندوستانی عیسائی تین فیصدی، سکھ چار فیصدی اور اینگلو انڈین ایک فیصدی۔ ان فرقوں کا ملک کی آبادی میں جو تناسب ہے وہ مندرجہ ذیل ہے۔ ہندو ۵۴ء۶۸ فیصدی۔ مسلمان ۲۸ء۵ فیصدی، اچھوت ذاتیں ۱۴ء۳۲ فیصدی ہندوستانی عیسائی ۱ء۱۶ فیصدی۔ سکھ ۱ء۴۹ فیصدی اینگلو انڈین ۰ء۰۵ فیصدی۔ ملک کی آبادی میں یہ فرقہ وارانہ تناسب قبائلی آبادی کو نظر انداز کرتے ہوئے قائم کیا گیا ہے۔

صوبہ بمبئی میں مندرجہ بالا اصول کے مطابق فرقہ وارانہ

تناسب یوں ہوگا۔

فرقہ	آبادی فیصدی	فیصدی تناسب مجلس قانون ساز میں
ہندو	۷۶٫۴۲	۴۰
مسلمان	۹٫۹۸	۲۸
اچھوت	۹٫۶۴	۲۸
ہندوستانی عیسائی	۱٫۷۵	۲
اینگلو انڈین	٫۰۷	۱
پارسی	×	۱

پنجاب میں نمائندگی کا طریقہ یہ ہوگا۔

مسلمان	۵۷٫۰۶	۴۰
ہندو	۲۲٫۱۷	۲۸
سکھ	۱۳٫۲۲	۲۱
اچھوت ذاتیں	۴٫۳۹	۹
ہندوستانی عیسائی	۱٫۷۱	۲

جن اصولوں کی بنا پر مندرجہ بالا تناسب پیش کیا گیا ہے وہ پانچ ہیں۔

۱۔ کہیں بھی اکثریت والے فرقہ کو مطلق اکثریت نہ دی جائے۔

۲۔ اکثریت چھوٹی سی چھوٹی اقلیت کے ساتھ بھی ملکر اپنی حکومت نہ قائم کرسکے۔

۳۔ سب سے بڑی اکثریت اور سب سے بڑی اقلیت ساتھ مل کر اپنی حکومت نہ قائم کرسکیں۔

۴۔ تمام اقلیتیں ساتھ مل کر اکثریت کی مدد کے بغیر اپنی حکومت قائم کرسکیں۔

۵۔ اکثریت کی "مطلق اکثریت" ختم کرنے کے سلسلے میں جو تناسب ہاتھ آئے اُسے مختلف فرقوں میں اُن کی سماجی حیثیت، اقتصادی اور تعلیمی حالات کے پیش نظر تقسیم کردیا جائے اس طرح کہ جس فرقے کی سماجی، معاشی اور تعلیمی حالت سب سے خراب ہے اُسے اُس تقسیم شدہ تناسب کا سب سے زیادہ حصہ ملے۔

اس طرح کوئی بھی فرقہ تعداد کی بنا پر دوسرے فرقوں پر اپنا راج نہیں قائم کرسکتا۔ صوبوں اور مرکز دونوں جگہ ہندوؤں کو اکثریت کے خلاف مسلمانوں کی [illegible] اکثریت کے خلاف ہندوؤں اور سکھوں کی شکایت ختم ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر امبیدکار نے اتحاد ہند پر زور دیتے ہوئے یہ کہا کہ میں پاکستان کے خلاف نہیں ہوں لیکن میری تجویزیں مسلمانوں کو بہتر تحفظات عطا کرتی ہیں۔ میں مسلمانوں کو حق خود ارادیت اس شرط پر دے سکتا ہوں کہ وہ بھی اپنے علاقوں کے غیر مسلم باشندوں کو حق خود ارادیت عطا کریں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میری تجویزیں خود مسلمانوں کے حقوق کے نکتۂ نظر سے بہتر قرار دی جاسکتی ہیں۔ اس کی تین وجہیں ہیں۔ میری تجویز کے تحت فرقہ وارانہ اکثریت کا خوف باقی نہیں رہتا جس پر پاکستان کا مطالبہ قائم ہے۔ دوسرے میری تجاویز کے تحت مسلمانوں کو آج جو اپنی آبادی کے تناسب سے زیادہ نمائندگی حاصل ہے وہ ختم نہیں ہوتی بلکہ برقرار رہتی ہے۔ تیسرے غیر پاکستانی علاقوں میں مسلمانوں کی آبادی کو بہت تقویت پہنچتی ہے اس لئے کہ اُن کے نمائندوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ لیکن پاکستان کے قیام کی صورت میں اُن علاقوں کے مسلمان بے یار و مددگار ہو جائیں گے۔

ہندوؤں کا اس بات پر زور دینا کہ اکثریت کی حکومت قائم ہونی چاہئے غلط ہے۔ اکثریت کے اصول کو ترک کرکے اب مکمل اتفاق رائے " (UNANIMITY) کے اصول پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ اصول جوری میں آزمایا جا چکا ہے جس میں جوری کا فیصلہ جج پر اُس وقت لازم ہوتا ہے جب وہ مکمل اتفاق رائے سے پاس ہوا ہو۔ جمعیتہ الاقوام بھی اس اصول پر کاربند تھی۔ پھر ہندوؤں کیلئے اس لئے بھی خوف کھانے کی بات نہیں کہ معاشی، سماجی، صنعتی اور تجارتی زندگی میں اُن کی اکثریت اور اُن کی موجودہ حیثیت بدستور قائم رہے گی۔

برما میں جاپان کی غلامی سے کے بعد

برطانوی غلامی بحال ہو جائیگی

برما کا دارالسلطنت رنگون جاپان کی غلامی سے آزاد ہوگیا ہے لیکن اس کے آئندہ طرز حکومت سے متعلق حکومت برطانیہ نے گورنر برما سر ڈورمین اسمتھ کے ذریعہ حال ہی میں جس وہائٹ پیپر کا اعلان کیا ہے

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ برما نے دستوری حکومت اور خود مختاری کی ایک طرف قدم بڑھایا تو کیا اور کئی قدم پیچھے ہٹا لیا ہے۔ ذیل میں اس وائٹ پیپر کے اہم نکات کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

- جاپانی حملوں سے برما کو شدید مادی نقصانات تو پہنچے ہی اسکے علاوہ وہاں کی اقتصادی اور سماجی زندگی کے تار و پود بھی بکھر کر رہ گئے ہیں۔ چونکہ ہر سیاسی نظام کی اساس انھیں بنیادوں پر قائم ہوتی ہے اس لئے برما میں اس طرز حکومت کا فوری انعقاد غیر ممکن ہے جو جاپانی حملوں سے پہلے موجود تھا۔ جاپانی اقتدار کے دوران میں برما کی آبادی بالکل تتر بتر ہو گئی ہے اس لئے انتخاب کے لئے گذشتہ ووٹروں کی فہرست پر قطعی نظر ثانی ہی نہیں بلکہ انتخاب کنندگان اور انتخابی حلقوں کی از سر نو تنظیم کی ضرورت ہوگی۔ پھر ذرائع آمد و رفت اور رسل و رسائل کے اچھی طرح بحال ہونے سے پہلے انتخابات کا عمل میں آنا بھی غیر ممکن ہے۔ عمارات کی از سر نو تعمیر، ریلوے، تار، اور دوسرے پبلک انتظامات اور ذرائع رسل و رسائل، دوبارہ بحال کرنا، زراعت اور ضروری صنعتوں کو ان کی پہلی حالت پر واپس لانا۔ ان فوری امور کی انجام دہی کے بغیر جمہوری طرز حکومت کے مطالبے اور ضروریات کا پورا ہونا غیر ممکن ہے عام انتخاب انھیں بنیادوں کے درست ہونے کے بعد عمل میں آسکتا ہے اور اس عام انتخاب کے عمل میں آنے سے پہلے برما میں ۱۹۴۱ء والے طرز کی حکومت کا قیام غیر ممکن ہے۔ اسلئے اس وقت تک برما کی حکومت بدستور سیکشن نمبر ۱۲۹ کے نکات کے تحت چلائی جائے گی۔ اس سیکشن کے تحت حکومت نمائندہ قانون ساز کے سامنے ذمہ دار نہیں ہوگی بلکہ حکومت برطانیہ کے سامنے۔

۱۹۴۲ء میں برما سے متعلق حکومت برطانیہ نے جو اعلان شائع کیا تھا اس کی مدت حیات دسمبر ۱۹۴۵ء میں ختم ہو جاتی ہے لیکن جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے ابھی سیکشن نمبر ۱۲۹ کے نکات کو ہٹایا نہیں جا سکتا اس لئے ۱۹۴۲ء کے اعلان کی مدت حیات میں تین سال کا اور اضافہ کیا جاتا ہے۔ یہ اعلان گویا اب ۸ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو ختم ہوگا تاکہ

مبارکباد:

ادارہ نئی زندگی اپنے فاضل مدیر جناب سید انیس الرحمن صاحب کی شادی خانہ آبادی پر اپنی حقیقی مسرت کا اظہار کرتا ہے اور مسٹر و مسز انیس الرحمن کو انکی آئندہ زندگی میں کامیابی کی دعا کرتے ہوئے دلی مبارکباد پیش کرتا ہے

"جوائنٹ ایڈیٹر"

اس دوران میں برما کے اقتصادی، مالی اور معاشرتی حالات کو بحال کیا جا سکے۔

پھر بھی حکومت برطانیہ یہ چاہتی ہے کہ اس دوران میں حکومت کے تمام امور و شعبے گورنر کے ہاتھوں میں مرکوز ہو کر نہ رہ جائیں بلکہ گورنر ان امور کو ایسے لوگوں کی رائے اور مشوروں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انجام دے جو برما کی رائے عامہ کی نمائندگی کرتے ہوں۔ اس بات کے پیش نظر "آرڈر ان کونسل" کے ذریعہ، سیکشن نمبر ۱۲۹ کے تحت جو طرز حکومت قائم ہے اسکی گرفت کچھ ڈھیلی کرنے کے لئے اس میں رد و بدل کیا جائیگا۔ چنانچہ کوشش کی جائے گی کہ جلد ہی برما میں ایک مجلس منتظمہ (Executive Council) کا قیام عمل میں آجائے جو گورنر کو حکومت کے امور میں مشورے دیگی۔ شروع شروع میں مجلس منتظمہ محض تھوڑے سے مشتمل ہوگی اور وہ ممبران بھی زیادہ تر سرکاری ہوں گے لیکن آگے چلکر اور مواقع دیکھکر اسمیں غیر سرکاری ممبروں کو بھی شامل کیا جائیگا۔ جب تک کسی باقاعدہ اور باستقل دستور حکومت کا قیام عمل میں نہ آجائے اس وقت تک اسی مجلس منتظمہ کے ذریعہ برما کے باشندے ملک کی معاشی زندگی کی بنیادوں کو درست کرنے میں حصہ لینگے۔ لیکن تمام امور پر گورنر کی نگہبانی اور کنٹرول قائم رکھا جائے گا۔

مناسب موقع دیکھکر اور گورنر اور مجلس منتظمہ کی سفارش سے ایک مجلس قانون ساز کو بھی وجود میں لایا جا سکتا ہے جس کی مدت حیات بھی عارضی ہوگی ان مجالس کے اختیارات، رکنیت اور انکے باہمی تعلقات کو پارلیمنٹ متعین کریگی۔

جس فوری مقصد کے پیش نظر سیکشن نمبر ۱۲۹ میں یہ رد و بدل کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ اس سیکشن کی گرفت کو ڈھیلا کیا جا سکے لیکن یہ تمام انتظامات بھی اسی وقت تک برقرار رکھے جائینگے جبتک سیکشن نمبر ۱۲۹ کا وجود قائم ہے جب برما کے معاشی اور سماجی حالات درست ہو جائینگے تو برما میں انتخابات عمل میں لائے جائینگے اور اس سیکشن کے تحت انتظامات کو منسوخ کر دیا جائیگا اور دستور ۱۹۳۵ء کا ایکٹ دوبارہ عمل میں آجائیگا۔ جسکے بعد پھر اسی قسم کی مجلس قانون

بقیہ ...

تمام عمل میں آئیگا جو جاپانی حملے سے پہلے موجود تھی اور اس مجلس قانون ساز کو وہی اختیارات حاصل ہونگے جو اسوقت حاصل تھے۔

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے دوبارہ عمل میں آنے کے بعد برما کی دستوری ترقی اور عروج کا ایک نیا دور شروع ہوگا جس میں برما میں مکمل خودمختارانہ حکومت قائم کرنے کے لئے زمین ہموار کی جائے گی اور فضا سازگار بنائی جائے گی۔"

برما کے سیاسی مستقبل کا جہاں تک تعلق ہے حکومت برطانیہ نے اپنے مقصد کا یوں اعلان کیا ہے۔ "برما کے عوامی نمائندے مختلف سیاسی جماعتوں اور گروہوں کی باہمی رضامندی اور اتفاق سے ایک ایسے نئے دستور حکومت کی تشکیل کریں جو اُن کے نکتۂ نگاہ سے برما کے لئے موزوں اور مفید ثابت ہوگا۔ اس دستور حکومت کی تشکیل میں نہ صرف برطانیہ کے دستور حکومت بلکہ دنیا کے دوسرے جمہوری ملکوں کے دستور حکومت کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا۔ اس دستور حکومت کو وجود میں لانے کے لئے کون سے مشینری کا قیام عمل میں آئے گا یہ حکومت برطانیہ اور برما کے سیاسی نمائندوں کی باہمی گفت وشنید کے ذریعہ طے پائے گا۔ اسکے ساتھ ہی اُن معاملات پر جو مکمل خودمختارانہ حکومت کے قیام کے بعد بھی برطانیہ کے ہاتھوں میں رہینگے برما کے نمائندوں اور حکومت برطانیہ کے درمیان ایک معاہدہ وجود میں آئے گا۔

جب برما کے باضابطہ طور پر منتخب کئے ہوئے نمائندے موزوں دستور حکومت کے معاملہ پر متفق ہو جائینگے اور یہ بات طے پا جائیگی کہ اس دستور حکومت کو برما کے عوام کی اتنی تائید حاصل ہے کہ پارلیمنٹ اُسے پاس کر سکے تو حکومت برطانیہ اور برما کے نمائندہ کے درمیان اُن معاملات پر ایک راضی نامہ وجود میں آئیگا جو بدستور حکومت برطانیہ کے زیر عمل رہینگے۔ اس راضی نامہ کے بعد برما برٹش کامن ویلتھ کے حدود کے اندر ہی مکمل خودمختاری کا درجہ حاصل کرے گا۔

جہانتک شان علاقے کی ریاستوں اور سرحدی پہاڑی علاقوں کے قبائل کا تعلق ہے جہاں کے لوگ زبان اور رسوم ورواج کے اعتبار سے برما کے دوسرے علاقوں کے باشندوں سے مختلف حیثیت رکھتے ہیں اور جو سیاسی اعتبار سے بھی پچھڑے ہوئے ہیں وہ وقتی طور پر گورنر کے براہ راست اختیارات اور تنظیم کے تحت رکھے جائینگے۔ اُن پر یہ براہ راست کنٹرول اس وقت تک قائم رکھا جائیگا جبتک اُن علاقوں کے باشندے "برما خاص" سے الحاق کی خواہش نہ ظاہر کریں۔"

اس وہائٹ پیپر کے نکات پر پہلے ہی نظر ڈالنے کے بعد ہر شخص کے سامنے مندرجہ ذیل باتیں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ دسمبر ۱۹۴۸ء تک گورنر کے براہ راست کنٹرول میں جو طرز حکومت قائم رہیگا اُس میں خود مختاری یا جمہوریت کے الفاظ بالکل بے معنی ہونگے۔ ۱۹۴۸ء کے بعد برما میں وہ دستور حکومت دوبارہ نافذ کیا جائیگا جو ۱۹۴۲ء کے پہلے قائم تھا اور جسکے "جمہوری" ہونے کی بابت ظاہر ہے کہ کسی بھی شریف آدمی کے ذہن میں قطعی کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ اس کے بعد ایک خودمختار حکومت کے قیام کے لئے فضا سازگار بنائی جائیگی۔ یعنی برما کی تمام سیاسی جماعتوں اور گروہوں کے باہم متفق اور متحد ہونے کا انتظار کیا جائے گا وہی لاانتہائی انتظار جو ہندوستان میں بہت مدت سے کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد اگر خدانخواستہ برما کی تمام سیاسی جماعتیں دستور حکومت کے معاملہ پر متفق ہو بھی گئیں اور درمیان میں ہزاروں ارادی طور پر پیدا کی ہوئی دقتیں بھی حل ہو گئیں اور برما کو "خودمختاری" مل گئی تو بھی کچھ معاملات برطانیہ کے زیر عمل رہیں گے اور برما "برٹش کامن ویلتھ" کے گھن چکر سے باہر نہ نکل سکے گا۔ اسکے علاوہ "خودمختاری" عطا ہونے کے بعد برما کے تمام سرحدی اور قبائلی علاقے جو سیاسی اور تمدنی اعتبار سے پچھڑے ہوئے ہیں وہ گورنر کے براہ راست اختیارات کے تحت ہو جائینگے۔ اس لئے کہ یہ بالکل ظاہر ہے کہ دنیا کے تمام غیر متمدن اور پچھڑے ہوئے علاقوں کو ترقی اور روشنی کا راستہ دکھلانے کا مقدس فرض اللہ میاں نے حکومت برطانیہ کے سپرد کیا ہے۔

یہ ہے وہ خاکہ جس کے تحت برما میں جاپانی غلامی اور ذلت کے استیصال کے بعد برطانوی غلامی بحال کی جا رہی ہے۔ اور جو اٹلانٹک چارٹر کے عین مطابق اور موافق ہے۔

الہ آباد کلچر سنٹر کی طرف سے مبلغ سو روپئے انعام

ایک ایسے ڈرامے کیلئے (۱) جو طبعزاد ہو (۲) جو کھیلا جاسکے (۳) جو تقریباً ایک گھنٹہ تک کھیلا جاسکے (۴) جو آسان اردو یا آسان ہندی میں لکھا گیا ہو۔ (۵) جس میں موجودہ ہندوستانی زندگی کے کسی مخصوص پہلو کو موضوع بنایا گیا ہو۔ انعام صرف اس ڈرامانگار کو دیا جائیگا جسکی تمثیل جج صاحبان بہترین قرار دینگے اور کلچر سنٹر کو اس ڈرامہ کے اسٹیج کرنیکا حق حاصل ہوگا۔ ڈرامہ کی وصولی کی آخری تاریخ ۵ اگست ۱۹۴۵ء ہے۔
پتہ:- سکریٹری ۱/۱۱، کلائیو روڈ

رفتارِ عالم

[یالٹا کانفرنس۔ سان فرانسسکو کانفرنس۔ آسٹریا، یوگوسلافیہ، فرانس، برطانیہ، لائڈ جارج، روس اور جاپان، صدر روزولٹ، ہٹلر]

یالٹا کانفرنس

یورپ کی جنگ ختم ہوگئی ہے اور بعد از جنگ یورپ اور دنیا کا سیاسی
نقشہ تاریکی اور ابہام سے نکل کر زیادہ واضح شکل اختیار کرتا جارہا ہے۔ گویا
"دنیا بعد از جنگ" کا مسئلہ تیزی کے ساتھ موجودہ خالص جنگی مسائل
کی جگہ لے رہا ہے۔ موحالات کی رفتار کے پیش نظر ایک بالکل فطری امر ہے
یالٹا کانفرنس اس مسئلہ میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔
کیونکہ یالٹا کانفرنس نے نہ صرف یہ کہ ساری دنیا کی توجہ "دنیا بعد از جنگ"
کے مسئلہ کی طرف پھیر دی ہے بلکہ دنیا کا آئندہ سیاسی خاکہ بھی ہمارے
سامنے تقریباً واضح کر دیا ہے۔

نئی زندگی نے اسی کی اشاعت میں یالٹا کانفرنس کے فیصلوں کی
بالتفصیل روئداد پیش کی جاچکی ہے۔ زیر نظر اشاعت میں اُن فیصلوں سے
متعلق دنیا اور مخصوص طور پر ہندوستان کے ذہنی ردّعمل کا ایک اجمالی اور
عام خاکہ پیش کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

یالٹا کانفرنس کے فیصلوں کا جن اہم مسائل سے تعلق ہے وہ مندرجہ
ذیل ہیں۔ فوری جنگی اقدامات یورپ کی جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد
جرمنی کے ساتھ کیا رویّہ اختیار کیا جائے۔ فرانس۔ پولینڈ اور
یوگوسلاویہ کے مسائل۔ آئندہ بین الاقوامی تنظیم کا مسئلہ جس کا تعلق ڈمبرٹن
اوکس کے منصوبوں سے ہے۔

ان مسائل میں جو سب سے زیادہ زیر بحث اور باعث نزاع ہیں وہ جرمنی
پولینڈ اور دنیا کی آئندہ بین الاقوامی تنظیم سے متعلق ہیں
جہاں تک جرمنی کا تعلق ہے زیادہ تر حلقوں کی رائے یالٹا کانفرنس
کے فیصلوں کے موافق ہے۔ متین سوچنے سمجھنے والے حلقوں میں خیال کیا جاتا
ہے کہ موجودہ حالات میں امن عالم کے تحفظ کے پیش نظر جرمنی کے ساتھ اسکے
علاوہ اور کوئی رویہ نہیں اختیار کیا جاسکتا اور یالٹا کانفرنس کے فیصلوں کا
نعم البدل پیش کرنا غیر ممکن ہے لیکن جس بنیاد پر ان فیصلوں کی موافقت
کی جاتی ہے اسمیں ہم دو حصّوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ لوگ
ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ جرمنی پر ایک مخصوص عرصہ تک محض اسلئے روس، امریکہ،
برطانیہ اور فرانس کا قبضہ برقرار رکھا جائیگا تاکہ جرمنی کی جنگی اور صنعتی طاقت کا
مکمل استیصال کرکے اُسے آئندہ جنگ کرنے کے بالکل ناقابل بنا دیا جائے اور
اس طرح یورپ کے امن کو محفوظ رکھا جائے۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو
اتحادیوں کی صف میں اشتراکی روس کی موجودگی کو ایک خاص معنی و مفہوم
اور اہمیت دیتے ہوئے یہ سمجھتے ہیں کہ سوویٹ روس کی رہنمائی اور دوسرے
اتحادی ملکوں کے عوام کی پشت پناہی میں نازیت سے نجات حاصل کرکے
بہت جلد ایک نئے جمہوری جرمنی کی تخلیق کرلیں گے اور جرمنی اپنی زندگی کے
ایک نئے اور پُرامید دور میں قدم رکھے گا۔ لیکن بین الاقوامی سیاسیات
میں دلچسپی لینے والوں کا ایک ایسا گروہ بھی ہے جو دراصل نازیت اور ہٹلر
سے پوشیدہ ہمدردی رکھتا ہے لیکن نازیت کی عالمگیر مخالفت کو دیکھتے ہوئے
کھلم کھلا اپنے جذبات کے اظہار سے معذور رہے۔ ان لوگوں نے جرمن عوام
سے ہمدردی کے پردے میں یالٹا کے فیصلوں کی زبردست مخالفت شروع
کردی ہے۔ چوتھا گروہ ہندوستان میں اُن لوگوں کا ہے جو جرمنی کے مستقبل
سے متعلق یالٹا کے فیصلوں کی طرف اپنا ایک خاص رویّہ رکھتا ہے۔ یہ گروہ
ہندوستان کے سلسلے میں برطانوی سامراج کی ناعاقبت اندیشانہ پالیسی
کے فطری ردّعمل کے طور پر یالٹا کے فیصلوں میں کسی نئی اُمید کی رمق نہیں
دیکھتا اور سمجھتا ہے کہ جرمنی پر جس آئندہ تسلط کا خاکہ تیار کیا گیا ہے اس کی
نوعیت اشتراکی روس کی شمولیت کے باوصف سامراجی ہے۔

پولینڈ اور یوگوسلاویہ کے معاملات کو یالٹا میں جس نہج سے طے کیا گیا
ہے اسکے متعلق بھی سیاسی حلقوں میں تقریباً اس قسم کی گروہ بندی پائی جاتی ہے
لیکن یہاں پر ہم انھیں دو حصّوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ہندوستان کے زیادہ تر
قوم پسند جو موجودہ سیاسی جمود و تعطل اور برطانیہ کی ناانصافانہ طرزِ عمل سے
مستقبل سے فطری طور پر مایوس ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ سوویٹ روس بھی

امریکہ اور برطانیہ جیسی سامراجی سلطنتوں کی معیت میں "تسلط کی سیاست" (Power Politics) سے دلچسپی لینے لگا ہے اور اُس نے پولینڈ کے بدلے میں یونان میں برطانوی تسلط کو پوشیدہ طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یالٹا اپنی نوعیت کے اعتبار سے ورسائی سے ایک قدم بھی آگے نہیں جاتا اور اس جنگ کے بعد ایشیائی اور نوآبادیاتی ممالک کو اگر آزادی نہ دی گئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یالٹا سے دنیا میں "تسلط کی سیاست" (Power Politics) کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی رائے میں روس کے خارجی طرز عمل اور برطانیہ اور امریکہ کے خارجی طرز عمل کی نوعیت ایک ہی ہے چنانچہ یالٹا۔ میں جس امن عالم اور بین الاقوامی تنظیم کے قیام کا اعلان کیا گیا ہے اُس سے محکوم ملکوں کے آزاد ہونے کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔ دوسری طرف سیاسی مفکرین کا ایک ایسا گروہ بھی ہے جو حالات کا ایک بالکل مختلف تجزیہ پیش کرتا ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اتحادیوں کی صف میں اشتراکی روس کی موجودگی سامراجی طاقتوں اور ان کے محکوم ملکوں کے باہمی تعلقات پر یقیناً اثر انداز ہوگی اور مستقبل میں ہمیں سامراج کے خلاف آزادی کی جدوجہد میں اس بین الاقوامی صورت حال سے زبردست مدد ملے گی۔ اُن کے نکتہ نگاہ کو مختصراً یوں پیش کیا جا سکتا ہے۔ سویٹ روس میں زراعتی اور صنعتی سرمایہ داری کا خاتمہ ہو چکا ہے اور ساتھ ہی ایک قوم پر دوسری قوم کے استحصالی تسلط کا بھی نام ونشان باقی نہیں رہا، چنانچہ موجودہ بین الاقوامی صورت حال میں سوویٹ روس کی قوموں کا آئندہ تحفظ اور مفاد دنیا کی محکوم قوموں اور مزدور طبقہ کی قسمت سے گہرے طور پر وابستہ ہے۔ یعنی خود سوویٹ ریاست کے آئندہ تحفظ کا انحصار محکوم اور ستائی ہوئی قوموں کی آزادی اور تحفظ پر ہے۔ چنانچہ بین الاقوامی سیاسیات کی دنیا میں سوویٹ روس کا طرز عمل خارجی طور پر تمام محکوم ممالک کی موافقت میں ہے۔ فاشزم کی پے در پے شکست متوازی طور پر سامراج اور تسلط والی سیاست کی بھی کمر توڑ رہی ہے۔ کیونکہ سوویت روس کی فتح اور نازیت کی شکست نے ایک طرف تو یورپ کے عوام کے ہاتھوں میں زبردست طاقت سونپ دی ہے جو اس جنگ کے بعد تیزی کے ساتھ اور بنیادی طور پر وہاں کے طرز حکومت اور سماجی نظام پر اثر انداز ہوگی۔ فی الحال یونان میں ای۔ ال۔ اے۔ ایس کی اور پولینڈ میں لبلن کی عارضی حکومت کی جیت اس بات کا واضح ثبوت ہے۔ چنانچہ یالٹا میں یوگوسلاویہ اور پولینڈ سے متعلق جو فیصلے ہوئے ہیں وہ دراصل ان ملکوں کے عوام کی موافقت میں ہیں اور یالٹا میں اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوا کہ معاملات کو خود اُن ملکوں کے عوام نے جس طرح طے کر دیا تھا اُس پر مہر تصدیق ثبت کر دی گئی۔ جہاں تک بین الاقوامی تنظیم کے قیام کا سوال ہے اس میں بھی سرمایہ دار امریکہ اور برطانیہ کے مقابلہ میں اشتراکی روس کی زبردست فتح ہے کیونکہ پچیس سال تک سوویٹ روس کے ساتھ اپنے سامراجی مقاصد کی تکمیل کی خاطر دشمنی کی پالیسی روا رکھنے کے بعد برطانیہ اور امریکہ آج بین الاقوامی معاملات میں اشتراکی روس کے ساتھ تعاون اور اشتراک عمل پر مجبور ہیں۔ اس وقت برطانیہ اور امریکہ جیسے سامراجی ملک سوویٹ روس کی سامراج دشمن پالیسی اور یورپ کی مسلح عوامی تحریکوں کی دوطرفہ گرفت میں پھنس گئے ہیں۔ چنانچہ یالٹا میں یورپ سے متعلق جن اہم امور کا فیصلہ ہوا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔ — ہٹلر کی جلد از جلد شکست۔ یورپ کے ہر ملک سے فاشزم کے ہمدردوں کو نیست نابود کرنا اور ہر قوم کو اس بات کا پورا پورا حق اور آزادی عطا کرنا کہ وہ جس قسم کا بھی طرز حکومت اور سماجی نظام اپنے یہاں چاہے قائم کرے اور اس میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے۔ ان نتائج کی بنا پر یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ یالٹا نے دراصل تسلط والی سیاست کو ختم کر دیا ہے نہ کہ اس کے ایک نئے دور کا آغاز کیا ہے۔

یہ ہیں وہ مختلف ذہنی اور فکری ردعمل جو یالٹا کے فیصلوں نے سیاسی حلقوں میں پیدا کئے۔

سان فرانسسکو کانفرنس

دنیا کی پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے بعد امن اور تہذیب و تمدن کے تحفظ کے لئے ورسائی میں جس جمعیۃ الاقوام کی بنیاد ڈالی گئی اس کا تماشہ ہم دیکھ چکے ہیں اور اس کے بنیادی اسباب سے بھی واقف ہیں، جنھیں مختصر طور پر یوں پیش کیا جا سکتا ہے۔ نوآبادیات کے ساتھ یورپ کی طاقتوں کا رویّہ، ایشیائی ممالک کی غلامی اور ان کا استحصال، سامراجی ملکوں کے باہمی مناقشے، جمعیۃ الاقوام کے جلسوں اور فیصلوں میں اشتراکی روس کے خلاف سامراجی ملکوں کی مسلسل ریشہ دوانیاں۔ اشتراکی روس کے خلاف انگلستان اور فرانس کے ناعاقبت اندیش اور غدار مدبّرین کی انہیں سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ فاشزم کی بربریت نے ساری دنیا کو جنگ کے شعلوں میں لپیٹ لیا اور دنیا کی دوسری جنگ عظیم کے چھڑتے ہی جمعیۃ الاقوام کا بے روح ڈھانچہ دسمبر ۱۹۳۹ء میں ارجنٹائن کی تجویز پر روس کے اخراج کے بعد آخر ٹوٹ کر رہا۔

۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو فاشزم کا اندھا دیوتا اشتراکی روس پر غدارانہ حملہ کر کے نہایت تیزی سے اپنی تباہی اور موت کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ اس حملہ کے بعد ناتزم

کی موت تاریخی اور مادی اعتبار سے ایک ابدی امر ہو جاتی ہے۔ اسلئے کہ اس جنگ کے بعد ساری دنیا کے عوام اور مزدور دنیا کے واحد آزاد اور جمہوری نظامِ زندگی کے نمائندے اشتراکی روس سے ناتا جوڑ کر اس کی رہنمائی میں سرمایہ داری اور سامراج کی سب سے بھیانک اور نفرت انگیز شکل فاشزم کے خلاف اپنی پوری قوت سے نبرد آزما ہو جاتے ہیں۔ یہ تاریخی اعتبار سے طے شدہ امر تھا کہ فاشزم کی شکست و ریخت کے بعد سامراج کو بھی ایک زبردست دھکا پہنچتا اور اسکی بنیادیں کھوکھلی ہو جاتیں۔ یورپ اور چین کے عوام کا دفعتاً حرکت میں آجانا اور نہ صرف فاشزم بلکہ ہر قسم کی سیاسی غلامی اور معاشی استحصال کے خلاف مسلح اور منظم ہونا اور اُن کا آئندہ اتحاد اس بات کا ضامن ہے کہ بہت جلد انقلاب کے تند و تیز طوفان میں سامراجی کشتی ڈوب کر رہیگی۔

ورسائی اور سان فرانسسکو کے سیاسی پس منظر کا یہی وہ بنیادی فرق ہے جو ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم سان فرانسسکو کو ورسائی نہ سمجھ بیٹھیں۔ جمعیتہ الاقوام کی تباہی کے دو بنیادی اسباب، سامراجی ملکوں کے استحصالی ارادے اور انکے باہمی مناقشے اور سوویت روس سے اُن کی مسلسل اور نہلک دشمنی:۔ اگر سان فرانسسکو اور اس کے بعد ان دو بنیادی اسباب کا وجود برقرار رہتا ہے تو یقیناً ہمیں مستقبل کی بین الاقوامی تنظیم اور امن و تحفظ سے متعلق تمام امیدیں منقطع کر لینی چاہئے اور دنیا کی تیسری جنگ عظیم کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو جانا چاہئے لیکن اگر یورپ، چین اور ایشیا کے نو آبادیاتی ممالک کے عوام اپنی تنظیم اور طاقت سے سامراجی ارادوں اور اُن کے باہمی مناقشوں کا خاتمہ کر دیتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ آئندہ بین الاقوامی تنظیم کے سب سے بڑے دشمن کا بلکہ سوویت روس کے خلاف تمام سامراجی ریشہ دوانیاں کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے اور دنیا کی آئندہ بین الملی تنظیم محفوظ و مامون ہو جاتی ہے۔

سان فرانسسکو کانفرنس میں اس وقت دنیا کی چوالیس قوموں کے نمائندے جمع ہیں جو زیادہ تر اپنے ملکوں کے وزیرِ خارجہ یا نائب وزیرِ اعظم ہیں۔ اس بات کے پیش نظر کہ سنہ ۱۹۱۹ء میں ورسائی میں صرف تنتیس قوموں کے نمائندے شامل تھے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سان فرانسسکو کانفرنس انسانی تاریخ کی سب سے بڑی بین الاقوامی کانفرنس ہے۔ کانفرنس کا مقصد جیسا کہ ظاہر ہے۔ ڈمبارٹن اوکس کی تجویزوں کی اساس پر دنیا کی آئندہ بین الاقوامی تنظیم کا خاکہ مرتب کرنا ہے کانفرنس کی سب سے اہم ابتدائی کارروائی یہ تھی کہ روس، امریکہ، برطانیہ اور چین نے باہمی رضا مندی سے یہ اعلان کیا کہ آئندہ تمام بین الاقوامی جھگڑوں کو انصاف کے ساتھ اور بین الملی قوانین کے مطابق طے کیا جائے۔ انھوں نے اس سے متعلق تمام تجویزوں کی موافقت کرنے کا بھی وعدہ کیا۔

کل نمائندوں کی تعداد ایک ہزار دو سو ہے۔ یہ نمائندے چار مختلف کمیشن میں منقسم ہیں اور ہر کمیشن کے ساتھ ابتدائی امور اور تفصیلات کے مطالعہ اور چھان بین کیلئے کچھ کمیٹیاں وابستہ ہیں۔ یہ چار کمیشن مندرجہ ذیل ہیں۔ عام اسمبلی، عام معاملات۔ امن و حفاظت کی کونسل اور جوڈیشیل تنظیم۔

کانفرنس کی تنظیم کے سلسلے میں جن ابتدائی مسئلوں سے سابقہ پڑا اُن میں ایک تو صدارت کا مسئلہ تھا، روس کی یہ تجویز آخر، تسلیم کر لی گئی کہ برطانیہ، امریکہ، روس اور چین کے نمائندے مخلوط طور پر کانفرنس کی صدارت کا فرض انجام دیں۔ اسمبلی کے چاروں کمیشنوں کی صدارت کا کام چھوٹی چھوٹی قوموں کو دیا گیا اور اس کے لئے بلجیم، جنوبی افریقہ، وینی زوئیلا اور ناروے کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔

روس کا مطالبہ ہے کہ عام اسمبلی میں سوویت یوکرین اور سفید روس کی بھی رکنیت تسلیم کی جائے اور انھیں ووٹ کا حق دیا جائے اس لئے کہ ان ریاستوں کا فاشزم کے خلاف جدوجہد میں بہت اہم حصہ ہے۔ برطانیہ نے خود اپنے اسی قسم کے مطالبے کے پیش نظر روس کے مطالبے کی موافقت کی ہے۔

لیکن اس وقت کانفرنس کے سامنے جو سب سے اہم مسئلہ درپیش ہے وہ پولینڈ کا مسئلہ ہے۔ پولینڈ کی موجودہ عارضی حکومت کو جو لبلن حکومت کے نام سے موسوم ہے کانفرنس میں شرکت کی دعوت دینے کے لئے روس کی تین گزارشوں کو امریکہ اور برطانیہ متحدہ طور پر ٹھکرا چکی ہے۔ موخر الذکر کا مطالبہ ہے کہ پولینڈ کو اسی وقت کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی جا سکتی ہے جب یالٹا کے متفقہ فیصلوں اور تجویزوں کی اساس پر اس کی عارضی حکومت کی تشکیل ہو جائے اور اس میں لندن کی بھگوڑی رجعت پرست پولی حکومت کے بھی کچھ افراد شامل ہوں۔ پولینڈ کے مقابلے میں ارجنٹائن کا کانفرنس میں شامل کیا جانا اس حقیقت کے پیش نظر سخت قابل اعتراض ہے کہ ارجنٹائن نے نہ صرف یہ کہ کھلم کھلا فاشسٹ طاقتوں کا ساتھ دیا تھا اور اُن سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا بلکہ اب بھی ارجنٹائن کی حکومت میں فاشسٹ عناصر کی زیادتی ہے۔ یالٹا کے فیصلوں کے بعد ارجنٹائن کا جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دینا یقیناً ان غلطیوں کا ازالہ نہیں جو اس سے ماضی میں سرزد ہوتی رہیں۔ یہی ارجنٹائن ہے جو جمعیتہ الاقوام کی کانفرنسوں میں روس کی مخالفت اور جرمنی اور اٹلی کی موافقت میں ہمیشہ پیش پیش رہا ہے اور جب روس نے جنگی ضرورت کے تحت اور ملکی تحفظ کے لئے ۳۰ نومبر سنہ ۱۹۳۹ء کو فن لینڈ پر حملہ کیا تو اس نے پہلے پہل جمعیتہ الاقوام سے روس کے اخراج کی تجویز پیش کی جس کے منظور کئے جانے کے بعد خود جمعیتہ الاقوام کی آخری ہچکی نکل گئی۔

ہندوستان کی جھوٹی نمائندگی سے متعلق روس کے وزیر خارجہ مولوٹوف کے بیان نے دنیا بھر کے سامنے سر فیروز خاں نون اور راما سوامی مودالیر کی ذلت کو آخری منزل پر پہنچا دیا ہے اور دنیا کے تمام باہوش افراد ان دو کرائے کے ٹٹوؤں کی طرف حقارت اور مسکراہٹ کے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔ اس پس منظر میں اور مخصوص طور پر اس ماحول میں جسے وجے لکشمی پنڈت نے سان فرانسسکو میں پیدا کر دیا ہے۔ سر فیروز خاں نون کا یہ مضحکہ خیز بیان کہ مہاتما گاندھی جاپان کے دوست ہیں محض دروغ گوئی کے مرادف ہی نہیں سر پیر کا معلوم ہونے لگا ہے۔ یہ دیکھ کر واقعی حیرت ہوتی ہے کہ دنیا میں اتنے ضمیر فروش لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو صرف ذاتی ناموری اور اغراض کے تحت اپنے وطن کے ساتھ ڈنکے کی چوٹ پر غداری کر سکتے ہیں۔ سر فیروز خاں نون کا یہ بیان پڑھنے کے بعد ہم ہندوستانیوں کی آنکھیں مارے حیرت کے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

آسٹریا آسٹریا کی نئی عارضی حکومت کی تشکیل اور قیام نے اقوام متحدہ کے درمیان باہمی نزاع اور اختلاف کے ایک نئے موضوع کو جنم دیا ہے۔ اس حکومت کی تشکیل اور قیام تنہا سوویٹ روس کی موافقت سے وجود میں آیا ہے اور برطانیہ و امریکہ کو ماسکو سے سویت تجاویز کی بہت دیر میں اطلاع دی گئی اس اطلاع کے پہنچنے کے فوراً ہی بعد ماسکو سے نئی عارضی حکومت کے باضابطہ قیام کا بھی سرکاری اعلان ہو گیا۔ چنانچہ برطانیہ اور امریکہ کو اس کا موقع ہی نہیں ملا کہ وہ عارضی حکومت کی تجویز پر سویت حکومت سے کسی قسم کا مشورہ کر سکے۔ لیکن اس حقیقت کے پیش نظر کہ چونکہ ویانا روسی جنگی اقدامات کا مرکز تھا اس لئے سوویت روس عارضی حکومت کے قیام کے مسئلہ کو سرعت رفتاری کے ساتھ سلجھانا چاہتا تھا لیکن جہاں تک اس عارضی حکومت کی تشکیل اور کردار کا سوال ہے زیادہ اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ ابھی سے کہ یہ عارضی حکومت فاشزم کے خلاف آسٹریا کی تمام جمہوری جماعتوں کے نمائندوں پر مشتمل ہیں۔ مثلاً کمیونسٹ، سوشلسٹ اور دوسری فاشسٹ دشمن جماعتیں۔ بلکہ اس میں کچھ ایسے لوگوں کی بھی شمولیت ہے جو کسی مخصوص جماعت سے تعلق نہیں رکھتے۔ برطانیہ کے صحافتی اور سرکاری حلقوں میں اس عارضی حکومت کے قیام کا پہلا ردعمل جو ظاہر ہوا ہے وہ لازمی طور پر یہ ہے کہ مرکزی اور مشرقی یورپ میں سوویت روس کے موافق ہر امر کی بڑھتی اور پھیلتی ہوئی طاقت انھیں سخت متوحش کر رہی ہے اور پھر انکے نکتۂ نظر سے سب سے خطرناک حقیقت یہ ہے کہ ان علاقوں کے عوام کی زبردست اکثریت جارحانہ طور پر سوویت روس کے طرز عمل کے موافق ہے۔ امریکہ کی حکومت نے تو آسٹریا کی اس عارضی حکومت کو کھلے سے تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا ہے۔ اس سے پہلے آسٹریا کی عارضی تقسیم سے متعلق اتحادی طاقتوں کے درمیان جو راضی نامہ وجود میں آیا تھا اس میں کچھ رد و بدل کیا گیا ہے جس کی رو سے غالباً فرانس کو بھی ٹائرول اور وورایبرگ کے کچھ علاقوں کا وعدہ کیا گیا ہے جو سوئٹزرلینڈ کی سرحد پر واقع ہیں۔ برطانیہ کی فوجیں اشائی رسٹے کیرنتھیا پر قابض ہونگی، روسی فوجیں نشیبی آسٹریا اور امریکن فوجیں لنز اور سالزبرگ کے علاقوں پر۔ مارشل ٹیٹو نے یوگوسلافیہ کے لئے کیرنتھیا کے جن علاقوں کا اپنی ایک گزشتہ تقریر میں دعویٰ کیا تھا ان سے متعلق اتحادی طاقتوں نے غالباً کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔

یوگوسلافیہ:- یوگوسلافیہ اور سویت روس موجودہ جنگ کے دھندلکوں سے دو ایسی طاقتوں کی حیثیت سے ابھر رہے ہیں جن کے درمیان جنگ کے بعد باہمی تعاون کا وجود اور دوستانہ تعلقات کا قائم و استوار رہنا ایک امر مسلمہ ہے۔ یہی باہمی تعاون دراصل مستقبل میں مرکزی اور مشرقی یورپ کے دائمی امن و امان کا زبردست ضامن ہوگا۔ چنانچہ مارشل ٹیٹو کے سفر ماسکو کے بعد روس اور یوگوسلافیہ کے درمیان دوستی، باہمی امداد اور تعاون بعد از جنگ کے مسائل پر ایک بیس سالہ معاہدہ وجود میں آیا ہے جس کی تقریباً وہی نوعیت ہے جو روس اور برطانیہ، روس اور فرانس اور روس اور زیکوسلاویکیہ کے درمیان پہلے ہی سے موجود ہیں۔

اس وقت یوگوسلاویہ کی توجہ ٹرائسٹے کے سرحدی علاقے کے مسئلے پر خاص طور پر مرکوز ہے۔ ٹرائسٹے کا علاقہ عالمگیر جنگ ۱۹۱۴ء-۱۸ء سے پہلے اٹلی اور آسٹریا ہنگری کے درمیان باعث نزاع تھا اور اب قدرتی طور پر یوگوسلافیہ اور اٹلی کے باہمی مناقشات کا موضوع بن رہا ہے۔ حال ہی میں یوگوسلافیہ کے ولی السلطنت بلغراد میں ٹرائسٹے پر اطالیہ کی حریصانہ نگاہوں کے خلاف مظاہرے ہوئے ہیں۔ خود اٹلی میں اس مسئلے پر اختلاف رائے پایا جاتا ہے ایک طرف تو اٹلی کے کمیونسٹ ہیں جو اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اٹلی اور یوگوسلافیہ کے درمیان آئندہ دوستانہ تعلقات کا قائم رہنا تمام باتوں سے زیادہ ضروری ہے۔ اس لئے وہ ٹرائسٹے پر یوگوسلاویہ کے قبضے کو جائز قرار دیتے ہیں اور اٹلی کی حریصانہ نگاہوں کو وہ سامراج پسندی اور غلط قسم کی قومیت پرستی سے تعبیر کرتے ہیں۔ دوسری طرف اٹلی کے لبرل، عیسائی جمہور پسند، عملی پسند اور ریپبلکن پارٹی والے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ ٹرائسٹے کا اٹلی کے علاقے میں شامل رہنا اس "اتحاد وطن" کے لئے ضروری ہے جس کی ابتدا ۱۸۶۸ء سے ہوئی تھی اور جس کی تکمیل جنگ عالمگیر ۱۹۱۴ء-۱۸ء میں آکر ہوئی جب کہ اتحادی طاقتوں کے درمیان خفیہ معاہدہ کے ذریعہ وہ علاقہ اٹلی کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ ظاہر ہے کہ ۱۹۱۴ء-۱۸ء میں اس خفیہ

کا اٹلی میں شامل کیا جانے کا مطلب یہ تھا کہ اتحادی طاقتوں نے اٹلی کے ایک خالص سامراجی مطالبہ کو پورا کیا۔ آبادی اور جغرافیائی جائے وقوع کے نکتۂ نظر سے دراصل وہ علاقہ یوگوسلافیہ کے حدود میں شامل ہونا چاہیئے تھا۔ غالباً اسی بنا پر چوتھی مئی کو مارشل ٹیٹو نے ٹریسٹے، ٹرازک، اور گورتیزا علاقوں میں حکومت یوگوسلافیہ کی اجازت کے بغیر اتحادی افواج کے داخل ہونے پر صدائے احتجاج بلند کی ہے۔

فرانس یالٹا کانفرنس میں فرانس کے عدم شرکت نے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جنرل دی گال کا طرزِ عمل دو باتوں پر خاص طور سے مرکوز ہے۔ ایک تو وہ یورپ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو فرانس کے زیر اثر لانا چاہتا ہے تاکہ وہ یورپ میں اپنے کھوئے ہوئے اقتدار اور وقار کو دوبارہ بحال کرسکے اور دوسرے اسی مقصد کے تحت وہ نوآبادیات پر اس جنگ کے بعد دوبارہ فرانس کا تسلط قائم کرنا چاہتا ہے۔ جنرل دی گال کے طرزِ عمل سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی ہے کہ وہ مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید کی نوآبادیات کو ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتا۔ انہیں مقاصد کے پیش نظر دی گال ڈمبرٹن اوکس کے اُن منصوبوں کا مخالف ہے جن کا تعلق اجتماعی تحفظ کے نظام سے ہے اور جنگ کے بعد امن و تحفظ کے مسائل کو حل کرنے کے لئے یک طرفہ معاہدوں کے پرانے طریقہ پر کاربند ہونے کی موافقت کرتا ہے۔ فرانس کے وزیر خارجہ ام بی دالت نے اندرون پر ساحتہ کے دوران میں متحدہ اقوام مخصوص طور پر برطانیہ پر آواز سے کہتے ہوئے کہا کہ فرانس کسی قیمت پر بھی اپنے کسی علاقہ سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہے۔ فرانس نے انڈوچین کے سلسلے میں صرف اتنا وعدہ کیا ہے کہ جاپان کی شکست کے بعد انڈوچین معاشیات اور مالیات کے لحاظ سے خود مختار ہوگا لیکن فرانس کے مقرر کردہ گورنر جنرل کا مشورہ تمام معاملات میں فیصلہ کن مانا جائے گا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ فرانس کے عوام کے جمہوری اور اشتراکی رجحانات جو فاشیت کے خلاف جدوجہد کے سلسلہ میں اور بھی واضح ہوگئے ہیں کیا جنرل دیگال کو دوبارہ سامراجی کشتی کھیلنے کی اجازت دیں گے اور کیا فرانس کے عوام جنرل دی گال کی خواہشات کے باوجود فرانس کو اجتماعی تحفظ کے اُس نظام سے علیحدہ اور الگ تھلگ رکھنا پسند کریں گے جو اس جنگ کے بعد قائم ہوگا یہ ہیں وہ سوالات جن کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ فرانس دوبارہ ایک سامراجی ملک نہ بن سکے گا۔ دوسرے یورپ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو فرانس کے زیر اثر لانے کی کوشش اور متحدہ اقوام کے خلاف گروہ بندی کرنا

اس حقیقت کے سامنے مضحکہ خیز اور لاحاصل ہے کہ وہاں کے مسلح عوام کی زبردست اور فیصلہ کن اکثریت روس کے موافق ہے۔

گذشتہ میونسپل انتخاب میں کمیونسٹوں کا تمام سیاسی جماعت کے مقابلے میں زیادہ ووٹوں سے کامیاب ہونا صاف بتا رہا ہے کہ ہوا کس رخ بہہ رہی ہے۔ پیرس کے انتخاب میں مختلف سیاسی جماعتوں کی نمائندگی مندرجہ ذیل ہے:—
کمیونسٹ ۲۷ نشستیں۔ سوشلسٹ ۱۲ نشستیں۔ کیتھولک ۱۴ نشستیں ریڈیکل ۶ نشستیں۔ تمام رجعت پسند جماعتیں ملا کر ۱۳ نشستیں۔

برطانیہ جیسے جیسے جنگ کا خاتمہ قریب ہوتا جا رہا ہے ویسے ویسے یہ بات واضح ہوتی جا رہی ہے کہ آئندہ انتخابات میں لیبر پارٹی کے مقابلہ میں چرچل اور کنزرویٹو پارٹی کی شکست یقینی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اختیارات کی باگ ڈور ہاتھ میں لینے کے بعد لیبر پارٹی خود اپنے مخصوص معاشی اور سیاسی لائحہ عمل پر کاربند ہوتی ہے یا نہیں اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ لیبر پارٹی کا محض انتخابات میں کامیاب ہونا ہی برطانیہ کے رجعت پرست ٹوریوں کے قدم اکھاڑنے کے لئے کافی ہے۔

لائڈ جارج اسوقت جبکہ یورپ کی جنگ ختم ہونے کے قریب ہے اور برطانیہ کے عوام نئے انتخابات کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں لائڈ جارج کی موت نے ایک خاص معنی و مفہوم پہن لیا ہے۔ لائڈ جارج کی موت کے ساتھ برطانیہ کی لبرل پارٹی کا آخری دور بھی ختم ہوجاتا ہے اس وقت برطانیہ کی قسمت کا فیصلہ کنزرویٹو پارٹی اور لیبر پارٹی کی جدوجہد کے نتیجہ پر منحصر ہے۔ اس کشمکش کو لبرل پارٹی کسی طور سے بھی فیصلہ کن انداز میں متاثر نہیں کرسکتی۔ اس وقت جبکہ انسانی سماج رجعت اور ترقی کے دو راہے پر کھڑا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے درمیانی راستہ ہمارے لئے بالکل مفقود ہوگیا ہے۔ ہر ملک میں ہر قوم کو رجعت اور ترقی کے درمیان فیصلہ کرنا ہے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی تیسری چیز نہیں جس کی موافقت میں ہم ارسطو کے "سنہرے درمیانی راستے" کے اصول پر عمل کرتے ہوئے اپنا فیصلہ صادر کرسکیں۔ کنزرویٹو پارٹی اور اشتراکیت پسند لیبر پارٹی کے درمیان کوئی تیسرا راستہ نہ پاکر برطانیہ کے سب سے زبردست لبرل لیڈر لائڈ جارج کو کشمکش سیاست کے پرشور اسٹیج کو آخر خیرباد کہنا پڑا۔

لائڈ جارج نے معاشی لحاظ سے بےحد غیر موافق ماحول میں پیدا ہونے اور پلنے کے باوجود محض اپنی فطری صلاحیت کے بل پر ترقی کی سب سے آخری منزل طے کی۔ پارلیمنٹ کا رکن ہونے کے بعد اُس نے چیمبرلین اور بالفور کے قدم اکھیڑ دیئے اور بہت جلد لارڈ اسکوئتھ کو برطانیہ کی اندرونی سیاست

کی بساط پر شکست فاش دے دی۔ ابتداء میں لائڈ جارج امراء کی سیاسی طاقت کا زبردست مخالف تھا۔ وزیر مالیات کی حیثیت سے وہ بجٹ کی تشکیل و ترتیب میں عوام کی ضروریات کا سب سے زیادہ خیال رکھتا تھا۔ نیشنل انشورنس کا قانون پاس کر کے اس نے برطانوی عوام کو زبردست فائدہ پہنچایا۔ لائڈ جارج ہی کی کوششوں سے مالیات سے متعلق تمام بلوں پر دارالامراء کا قبضہ و اقتدار ختم ہوگیا۔ لائڈ جارج نے جنگ بوار کی پرزور مخالفت کی لیکن جنگ عظیم میں وہ ایک زبردست جنگی لیڈر ثابت ہوا۔ آئرلینڈ کو خود مختاری عطا کر کے لائڈ جارج نے ٹوریوں کی ایک بہت با اثر جماعت کو اپنا دشمن بنا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۲۲ء میں سوویٹ روس کے ساتھ تجارتی سمجھوتہ کرنے کے بعد لائڈ جارج کو ٹوریوں کے مقابلہ میں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کے بعد برطانیہ کے سیاسی اقتدار کی باگ ڈور کبھی اس کے ہاتھ میں نہ آئی اگرچہ پارلیمنٹ میں اس کا بدستور ذاتی رعب و اثر قائم رہا۔ لائڈ جارج نے چیمبرلین کی فاشسٹ نواز خارجی پالیسی کی بھی سخت مخالفت کی اور ۱۹۲۹ء میں اس بات پر زور دیا کہ برطانیہ، روس کی تمام شرائط کو تسلیم کر کے جرمنی کے خلاف سمجھوتہ کرے۔ لیکن اس سب کے باوجود لائڈ جارج نے سلطنت برطانیہ کے محکوم ملکوں اور قوموں مخصوص طور پر ہندوستان کی آزادی کی موافقت میں زبان تک نہ ہلائی۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ برطانیہ کے "دوست" مدبرین کتنے ہولناک اخلاقی تضاد (Moral Dualism) کے شکار ہیں۔

روس اور جاپان

روس نے بالکل فطری طور پر جاپان کے ساتھ ۱۳ر اپریل ۱۹۴۱ء کے پنج سالہ معاہدۂ غیر جانبداری کو ختم کر دیا۔ روس کے اس طرز عمل کی تشریح کرتے ہوئے وزیر خارجہ مولوٹف نے کہا کہ یہ معاہدہ اس وقت وجود میں آیا تھا جبکہ سوویت روس پر جرمنی کا حملہ نہیں شروع ہوا تھا اور نہ جاپان نے امریکہ اور برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا۔ اب جبکہ حالات بالکل بدل گئے ہیں اور جاپان ایک طرف سوویت روس کے دشمن جرمنی کی امداد کرتا رہا ہے اور دوسری طرف روس کے مددگار برطانیہ اور امریکہ کے خلاف جنگ آزما ہے۔ اس معاہدۂ غیر جانبداری کا وجود بالکل بے معنی ہوگیا ہے۔ چنانچہ سوویت روس نے معاہدہ کے تیسرے پیراگراف کے مطابق جس کی رو سے دونوں کو ۱۳ر اپریل ۱۹۴۱ء کے اس پنجسالہ معاہدہ غیر جانب داری کو ایک سال پہلے بھی ختم کر دینے کا حق تھا باقاعدہ طور پر جاپانی سفیر ناٹو کو اپنے فیصلے سے مطلع کر دیا۔ سیاسی اور قانونی دونوں اعتبار سے روس کے اس فیصلہ کی مخالفت نہیں کی جا سکتی۔ بین الملی قانون کے نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو روس نے پورے پورے طور پر اس معاہدے کے تحت آنے والے فرائض کو نباہا اور آخر میں اس سے دستبرداری کا اعلان بھی کیا تو بین الملی قانون کے ان قاعدوں کے مطابق جو صدیوں سے مہذب اور متمدن ریاستوں کے باہمی تعلقات میں ضروری سمجھے گئے ہیں۔

اس معاہدے کے منسوخ ہو جانے کا یہ مطلب نہیں کہ سوویٹ روس جلد ہی مشرق بعید کی جنگ میں کود پڑے گا بلکہ یہ کہ اس معاہدہ کی پنجسالہ مدت حیات کے پورے ہونے کے بعد اسے دوبارہ وجود میں نہیں لایا جا سکتا۔ اگرچہ سوویت حکومت کے نکتہ نظر سے یہ معاہدہ بے معنی ہو چکا ہے اور اس کا مزید طور پر جاری رہنا غیر ممکن ہے پھر بھی ہو سکتا ہے سوویٹ روس مزید ایک سال تک اس کا احترام کرنے کا فیصلہ کرے جس کا مطلب یہ ہے کہ کم از کم اپریل ۱۹۴۶ء تک اس بات کا امکان نہیں ہے کہ سوویت روس کی جنگی طاقت جاپان کے خلاف صف آرا ہو جائے گی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مشرق بعید کی جنگ میں سوویت روس کی حیثیت اب غیر جانبدارانہ نہیں رہی۔ فاشزم کی روز بروز کمزور ہوتی ہوئی مزاحمت اور مقاومت کے اخلاقی زور پر روس کے اعلان نے ایک ضرب کاری لگایا ہے۔ دنیا کی آئندہ بین الاقوامی مجلسوں میں مشرق بعید کے مسائل میں روس اب زیادہ آزادی اور وضاحت کے ساتھ حصہ لے سکیگا۔ اس سے پہلے یہ صورت حال تھی کہ یالٹا اور طہران میں بقول صدر روزولٹ جاپان کے خلاف جنگی اقدامات کو اس لئے زیر بحث نہ لایا جا سکا کہ روس کو ان سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

صدر روزولٹ

ٹھیک اس وقت جبکہ یورپ کی تاریخ میں جمہوریت دوبارہ آمریت اور فاشزم کی قبر پر اپنی فتح کا علم لہرانے والی تھی دنیا میں جمہوریت کے ایک زبردست لیڈر کا اٹھ جانا اقوام عالم کے نکتہ نگاہ سے ایک ناقابل تلافی نقصان اور ایک عظیم سانحہ ہے۔ صدر روزولٹ نے دنیا کی دوسری جنگ عظیم کے چھڑنے سے پہلے آمریت اور فاشزم کی کھلم کھلا مخالفت کی اور جنگ چھڑنے کے بعد امریکہ کے فاشسٹ دوست سرمایہ داروں اور رجعت پرستوں کی علیحدگی پسند پالیسی کو شکست دے کر امریکہ کو جمہوریت اور آزادی کی جنگ میں لا کھڑا کیا۔ پھر جنگ کے بعد ایک پر سکون اور انصاف پرور دنیا کی تعمیر کے

لئے پنجگانہ آزادی کا تصور پیش کیا اور ایک بین الاقوامی تنظیم کا خاکہ تیار کرنے میں ہاتھ بٹایا۔ صدر روزویلٹ کی انسانی خدمات کا دائرہ صرف ریاستہائے متحدہ امریکہ نہیں بلکہ پوری دنیا پر محیط ہے۔ وہ انسانی تاریخ کے اس نازک دور کا ایک زبردست انسانی رہنما اور جارج واشنگٹن کے بعد ریاستہائے متحدہ امریکہ کا سب سے بڑا صدر تھا۔ سان فرانسسکو کانفرنس سے پہلے ہی صدر روزویلٹ کا رحلت کر جانا اس اعتبار سے ایک زبردست نقصان کے مرادف ہے کہ امن عالم کی تنظیم و تعمیر میں دنیا ایک ایسے تجربہ کار، عملی اور متحرک شخصیت کی خدمات سے محروم ہو گئی ہے جو ۱۹۱۹ء کی بین الاقوامی تنظیم کے سلسلہ میں صدر ولسن کی فاش غلطیوں سے اچھی طرح آگاہ تھی۔

۱۹۳۲ء کے صدارتی انتخاب میں روزویلٹ نے جب اپنے ریپبلکن مقابل ہربرٹ ہوور کو ستر لاکھ ووٹ سے شکست دے کر ریاستہائے متحدہ امریکہ کے امور انتظامیہ کی باگ ڈور سنبھالی تو نہ صرف امریکہ بلکہ سوویت روس کو چھوڑ کر پوری دنیا اس عالمگیر اقتصادی بدحالی اور کساد بازاری کے ہولناک اثرات میں مبتلا تھی جس کی ابتدا تاریخی اعتبار سے ۱۹۲۹ء میں خود نیویارک کے اسٹاک ایکسچینج سے ہوئی تھی اور جس نے "آناً فاناً" ایک طرف دنیا کی ایک بہت بڑی آبادی کو بیکاری اور فاقہ کشی کا شکار بنا دیا تھا اور دوسری طرف بین الاقوامی تجارت کو درہم برہم کر دیا تھا۔ اٹلی میں ۱۹۲۲ء کے بعد اور جرمنی میں ۱۹۳۳ء کے بعد سرمایہ دارانہ نظام کے ان انسان کش نتائج نے جس سیاسی اور اقتصادی رجعت اور بربریت کی شکل اختیار کی تھی اُس کی نوعیت سے صدر روزویلٹ اچھی طرح واقف تھا۔ انگلستان کے مدبرین اس نئی صورت حال کا مقابلہ کرنے سے خود کو عاجز و ناقابل پاکر ہمت ہار بیٹھے تھے اور سلطنت برطانیہ کی سیاسی رہنمائی رجعت پسند اور فاشسٹ دوست ٹوریوں کے ہاتھوں میں جا رہی تھی۔ جاپان نے اپنے لئے وہی علاج سوچ لیا تھا جو اٹلی اور جرمنی میں زیر عمل تھا اور منچوریا پر حملہ کر کے چین کے شمالی صوبوں کو تیزی کے ساتھ ہڑپ کر جانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ ایسے وقت میں امریکہ ہی ایک ایسا ملک تھا جس نے صدر روزویلٹ کی رہنمائی میں اپنی اقتصادی اور معاشی بدحالی کا علاج اُن طریقوں میں تلاش کیا جن کا جارحانہ قسم کی سامراجی پالیسی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ کے مزدوروں کی بدحالی اور بیکاری دور کرنے کے لئے سرمایہ داروں اور بینک کے مالکوں کی مخالفت کے باوجود صدر روزویلٹ نے اپنے نیو ڈیلز (NEW DEALS) کے تحت جو اقدامات لئے انہیں نیم اشتراکی بھی نہیں قرار دیا جا سکتا لیکن اس حقیقت کے پیش نظر کہ امریکہ کے سماجی نظام کے بنیادی حالات اس سے آگے جانے کی اجازت نہ دیتے تھے صدر روزویلٹ نے جو کچھ کیا اُس کی زبردست اہمیت ہے۔ دوسری طرف بین الاقوامی تجارت کو دوبارہ بحال کرنے کے لئے جو کساد بازاری اور سرمایہ دار قومی ریاستوں کے عائد کردہ محصولات کی وجہ سے تقریباً ختم ہو گئی تھی صدر روزویلٹ نے متعدد ملکوں (مثلاً ناروے، سویڈن، ترکی وغیرہ وغیرہ) سے علیحدہ تجارتی عہدنامے مرتب کئے اور بڑی حد تک گرتی ہوئی بین الاقوامی تجارت کو سنبھال لیا۔

اگر امریکہ کے علیحدگی پسند (ISOLATIONIST) اور فاشسٹ دوست عناصر کی شدید مخالفت راہ میں حائل نہ ہوتی تو صدر روزویلٹ کی رہنمائی پر امریکہ بہت جلد جرمنی، اٹلی اور جاپان کی کھلم کھلا مخالفت پر آمادہ ہو گیا ہوتا۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان عناصر کی شدید مخالفت اور مزاحمت کے باوجود امریکہ کو فاشزم کے خلاف جنگ میں لا کھڑا کرنا روزویلٹ سے کم تر شخصیت کے بس سے باہر تھا۔ موجودہ جنگ میں امریکہ کے جو عظیم الشان انسانی، مادی اور صنعتی ذرائع صرف ہو رہے ہیں اُن کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کو فاشسٹ "عہد تاریک" سے بچانے میں صدر روزویلٹ کا خاص حصہ ہے۔

ہٹلر

یورپ میں سیاسی واقعات کی تیز رفتاری دراصل پوری انسانی تاریخ کی شدید تیز رفتاری کا ایک ٹھوس مظہر ہیں۔ یوں کہنا چاہئے کہ آج انسانی تاریخ اپنی پوری قوت رفتار سے مستقبل کی طرف بھاگ رہی ہے۔ یہاں تک کہ ہم اس بھگدڑ میں اپنے ذہن کو بڑے سے بڑے واقعہ سے بھی ٹھیک طور سے ہم آہنگ نہیں کر پاتے اور ہمیں واقعات کی اہمیت کا بھرپور احساس نہیں ہوتا۔ جرمنی کی مکمل شکست اور ہٹلر کے خاتمہ کی عالمگیر انسانی اور تاریخی اہمیت کا اندازہ لگانا ہو تو اپنے ذہن کو ذرا چند سال پہلے کی دنیا کی سیاسی صورت حال کی طرف واپس لے جائیے۔ ۱۹۳۹ء یعنی صرف چھ سال پہلے ہٹلر پولینڈ پر حملہ کرتا ہے اور دنیا اس عالمگیر جنگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آ جاتی ہے جس کا لوگ نفسیاتی طور پر انتظار کرتے کرتے تھک چکے تھے۔ ۱۹۴۱ء میں جرمنی سوویت نظام پر حملہ کرتا ہے۔ اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ صرف چار سال بعد سرمایہ داری اور سامراج کی سب سے بھیانک اور نفرت انگیز قسم فاشزم ہمیشہ ہمیشہ کیلئے پردۂ دنیا سے ختم ہو جائے گی اور اس کے اثر سے خود سرمایہ داری اور سامراج کی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں گی۔ لیجئے صاحب وہ لمحہ بھی اب آ گیا۔ ۱۹۳۳ء میں ہٹلر نے جب جرمنی سے جمہوریت اور کمیونزم کے نام لیواؤں کو تقریباً نیست و نابود کر دیا تھا تو ہم یہ آرزو کرتے تھے کہ کاش جرمنی میں مزدوروں کا راج ہوتا۔ اب لیجئے مزدوروں کی فوج نے اس عمارت پر سرخ جھنڈا لہرا دیا جس کی چھت کے نیچے چھپ کر ہٹلر اور اس کے گرگوں نے دنیا

برسرِ اقتدار طبقوں اور سوویت پسند لوگوں کو غلام بنانے کے منصوبے بناتے تھے۔ انگلستان میں بیٹھ کے تاتاری کی زبردست عالمگیر اہمیت کو پورے طور پر اپنے اندر داخل کر سکا؟ اور اسکے ساتھ انسانی تاریخ کی تیز رفتاری کا بھی اندازہ لگا سکا؟

ہٹلر آسٹریا کے ایک معمولی کسٹم آفسر کا لڑکا تھا جو ۲۰ راپریل ۱۸۸۹ء کو پیدا ہوا تھا۔ تیرہ سال کی عمر میں اسکے باپ کا انتقال ہو گیا۔ ایک ثانوی اسکول میں تعلیم پانے کے بعد اسکا ارادہ مصور بننے کا ہوا۔ ویئنا (دارالسلطنت آسٹریا) جامعہ فنونِ لطیفہ نے اسے داخل کرنے سے انکار کر دیا۔ جب وہ اٹھارہ سال کا ہوا تو اسکی ماں بھی مر گئی۔ تین سال تک وہ مختلف قسم کی مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتا رہا۔ اُسے شروع ہی سے یہودیوں اور سلاف نسل کے افراد سے اور کیتھولک چرچ اور سوشلسٹوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ پان جرمنیت کا زبردست حامی تھا۔ اُسے آسٹریا کے بادشاہ سے اس لئے نفرت تھی کہ اسکی وجہ سے جرمنی اور آسٹریا کے سیاسی اتحاد میں بے شمار دقتیں اور رکاوٹیں حائل تھیں۔

وہ تیئس سال کی عمر میں میونخ پہونچا جہاں عرب اور افریقہ کی نسلوں سے اسکی نفرت اور بھی بڑھ گئی اور وہ پان جرمنیت کے اصول کا اور بھی کٹر حامی بن گیا۔ وہ گذشتہ جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء۔۱۹۱۸ء) کے چھڑنے کے بعد جرمن فوج میں داخل ہوا اور جلد ہی لیفٹیننٹ کارپورل ہو گیا جرمنی کی شکست کے بعد وہ اُس چھوٹی سی جرمن فوج کا خفیہ ایجنٹ بن گیا جسے ورسائی کے معاہدہ کے بعد اتحادیوں نے برقرار رکھنے کی اجازت عطا کی تھی۔ اسکا کام برخاست شدہ فوجیوں سے ربط قائم کر کے والنٹیریوں کی تنظیم قائم کرنا تھا جس کے سامنے دو مقاصد تھے۔ ایک تو جرمنی کی فوجی طاقت کو بکھرنے اور ٹوٹنے سے روکنا اور دوسرے سوشلزم کے خلاف جہاد کرنا۔ بعد میں ہٹلر کا چھ آدمیوں کی ایک پارٹی سے ربط قائم ہوا جن کا نام جرمن کارکنوں کی پارٹی تھا اور وہ بہت جلد اس پارٹی کا رہنما بن گیا۔ اس نے اس پارٹی کا نام بدل کر نیشنل سوشل ڈیموکریٹک جرمن ورکرز پارٹی رکھا اور یہی آگے چلکر نازی یا نازی پارٹی کہلائی ۱۹۲۳ء میں وہ بویریا (جرمنی کا ایک صوبہ) کی سیاست میں کافی نمایاں ہو چکا تھا اور اُس نے دس ہزار آدمیوں کی ایک فوج بھی بنالی تھی۔ اُس زمانہ میں بویریا کی صوبائی حکومت اور جرمنی کی مرکزی حکومت میں جھگڑا ہوا اور ہٹلر نے لوڈنڈرف کیساتھ بویریا کی حکومت کے خلاف بغاوت کی لیکن اُسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اُسے گرفتار کر لیا گیا اور پانچ سال کی سزا دی گئی۔ لیکن وہ صرف نو ماہ جیل میں رہا اسلئے کہ اس نے جس مقصد سے بغاوت کی تھی اُس سے جرمنی کے اعلیٰ دولتمند طبقے کے لوگ پورے طور پر متفق تھے۔

اُسی زمانہ میں اُس نے اپنی کتاب "میری جدوجہد" لکھی۔ یہ کتاب نازیوں کے لئے گویا قرآن اور بائبل کا درجہ رکھتی تھی۔ کتاب میں جس نظریہ کو پیش کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے۔ پوری انسانی آبادی دو نسلوں میں منقسم ہے ایک اعلیٰ اور ایک ادنیٰ آریہ نسل سب سے اعلیٰ ہے اور انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی اسی کے عمل و اقتدار پر منحصر ہے لیکن دنیا کی مختلف نسلوں کے خلط ملط ہو جانے کی وجہ سے آریہ نسل اگر سب سے خالص

شکل میں کہیں موجود ہے تو جرمنی میں۔ یہاں بھی یہودیوں اور دوسری نسلوں کے افراد نے جرمن آریہ نسل کے لئے خطرات پیدا کر دیئے ہیں اس نسل کے افراد کا پیدائشی حق ہے کہ وہ ساری دنیا کی انسانی نسلوں پر حکومت کرے چنانچہ اسکے مطابق جرمنی کا فرض ہے کہ وہ ورسائی کے معاہدہ کو توڑ پھوڑ کر نازی جماعت کی آمریت میں سب سے پہلے یورپ کے تمام جرمنوں کو ایک جھنڈے کے نیچے لے آئے۔ اس کے بعد فرانس پر جو یہودیوں کا سب سے بڑا اڈہ ہے حملہ کرے اُس کی تباہی و بربادی کے ذریعہ خود کو پشت کی جانب محفوظ و مامون کر کے سوویت روس پر حملہ کرے۔ اور سوویت کے زرخیز علاقوں کو جرمن نوآبادکاری کا مرکز بنائے بعد میں اٹلی اور برطانیہ سے نوآبادیات کے مسائل پر جنگ کرے اُس کے بعد جیسے جیسے جرمن آریہ نسل کے افراد کی تعداد بڑھتی جائے ویسے ہی ویسے دوسری نسل کے افراد کو آہستہ آہستہ نیست و نابود کر دیا جائے یہاں تک کہ آخر میں اس کرۂ ارض پر جو سورج کے گرد گھومتا رہتا ہے صرف جرمن نسل کے افراد رہ جائیں۔

۱۹۲۴ء میں نازی پارٹی نے "رائخ ستاغ" (جرمن پارلیمنٹ کا نام ہے) کے لئے اپنے نمائندے پیش کئے اور ۳۲ نشستیں حاصل کیں۔ ۱۹۲۸ء میں اسکی تعداد گھٹ گئی اور صرف ۱۲ نشستیں حاصل کیں۔ ہٹلر نے جرمنی کے مزدوروں اور عوام کو احمق بنانے کے لئے اپنی پارٹی کے پروگرام میں کچھ اشتراکی قسم کے امور بھی داخل کئے۔ لیکن دراصل نازی پارٹی جرمنی کے مل مالکوں اور بڑے بڑے سرمایہ داروں اور فوجی طبقے کی آلۂ کار بن گئی تھی۔ جرمنی کی صنعت پر غیر ملکی قبضہ کے خطرات، اور اقتصادی بدحالی کی وجہ سے کمیونسٹ انقلاب کے خوف نے ان طبقوں کو ہٹلر کا ساتھ دینے پر مجبور کیا اور ۱۹۳۲ء کے انتخابات میں جرمن پارلیمنٹ میں نازیوں کو ۱۹۶ نشستیں ملیں۔ ۳۰ جنوری ۱۹۳۳ء کو ہٹلر جرمنی کا چانسلر بن گیا۔ ہٹلر اور اس کی پارٹی کے سیاسی اختیارات حاصل کرنے کی کہانی دراصل سازش، جرم اور دھوکہ بازی کی ایک طویل اور ہولناک کہانی ہے جس کا اعادہ فضول ہے۔

ہٹلر اور اس کی پارٹی نے با اختیار ہونے کے بعد سب سے پہلے تمام مخالف عوامی اور جمہوری اور کمیونسٹ جماعتوں اور عناصر کو ہولناک بے رحمی سے ختم کر ڈالا۔ اسکے بعد وہ یہودیوں کی طرف متوجہ ہوا اور ان تمام جرمن افراد کو جن کے اندر تین پشت کے بعد سے یہودی خون کی آمیزش ہوئی تھی یا تو جرمنی سے بھگا دیا یا ہولناک مظالم کا شکار بنا دیا۔ ۱۴۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء کے شروع اکتوبر میں ہٹلر کی رہنمائی میں تخفیفِ اسلحہ کانفرنس کے دوران میں جرمنی جمعیۃ الاقوام سے علٰحدہ ہو گیا۔ ۲ راگست ۱۹۳۴ء کو صدر ہنڈنبرگ

کے انتقال کے بعد ہٹلر جرمن ریاست کا صدر بن گیا۔

سنہ ۱۹۳۴ء میں مسولینی کی مخالفت کے سبب آسٹریا کو جرمنی سے متحد کرنے کی کوشش میں آسٹریا کے نازیوں کی بغاوت ناکام رہی۔ اسی سال جرمنی اور پولینڈ کے درمیان سوویت روس کی مخالفت میں ایک دس سالہ معاہدہ وجود میں آیا۔ سنہ ۱۹۳۵ء کے ابتدائی مہینوں میں سار کا علاقہ عام ووٹ کے ذریعے جرمنی میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ مارچ سنہ ۱۹۳۵ء میں ہٹلر معاہدہ ورسائی کے ان نکات کی کھلم کھلا مخالفت کرتا ہے جن کا تعلق جرمنی کی تخفیف اسلحہ سے تھا۔ اس کے بعد ہی جرمنی میں جبری فوجی بھرتی شروع ہو جاتی ہے۔ مارچ سنہ ۱۹۳۶ء میں ہٹلر معاہدہ لوکارنو کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے اور اس کی فوجیں رائن لینڈ میں داخل ہو جاتی ہیں۔ فرانس اور برطانیہ کی حکومتیں حملہ کی تیاری کرتی ہیں لیکن دونوں ملکوں کے سرمایہ دار کمیونزم کے خوف سے اپنی اپنی حکومتوں کے اس ارادے کو بدل دیتے ہیں اور ہٹلر کو سوویت روس کے خلاف ایک دیوار سمجھ کر اس کی مدد کرنے لگتے ہیں۔

آسٹریا کے مسئلے پر ہٹلر اور مسولینی میں سمجھوتہ ہو جانے کے بعد دونوں سنہ ۱۹۳۶ء تا سنہ ۱۹۳۹ء اسپین کی خانہ جنگی میں حصہ لیتے ہیں اور اسپین کی جمہوری حکومت کے خلاف فرانکو کی مدد کرتے ہیں۔ اس کے بعد سے ہٹلر اور مسولینی میں دائمی تعاون اور دوستی کا عہد شروع ہوتا ہے۔ روس تمام جمہوری طاقتوں کو ساتھ مل کر فاشسٹ خطرات کو نیست و نابود کرنے کی دعوت دیتا ہے لیکن برطانیہ، فرانس اور امریکہ کی برائے نام جمہوریتیں کمیونزم سے اور روس کے تعاون سے شدید نفرت کے تحت اس سے انکار کر دیتی ہیں۔ اس درمیان میں مغربی جمہوریتوں کو خاموش رکھنے کے لئے ہٹلر کمیونزم کے خلاف اپنی نفرہ بازی اور بھی بلند کرتا ہے۔ ۲۵ نومبر سنہ ۱۹۳۶ء کو جرمنی اور جاپان کے درمیان "کمیونسٹ دشمن" معاہدہ وجود میں آتا ہے جس میں آگے چل کر اٹلی، مانچوکو، ہنگری اور اسپین بھی شامل ہوتے ہیں۔

فرانس میں اس وقت دو جماعتوں کے جمہوری عوامی طاقتوں اور "سرمایہ داروں کی دو سو خاندانوں" کے درمیان ایک ہولناک کشمکش جاری تھی۔ موخرالذکر کی فتح کے بعد ہٹلر کا کام اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔ برطانیہ کے سرمایہ دار اور ان کی کٹھ پتلی حکومت۔ جرمنی اور روس کو نبرد آزما دیکھنے کی امید میں بیٹھ کر جانب داری کے پردے میں ہٹلر نوازی کی پالیسی پر عمل پیرا تھی۔

سنہ ۱۹۳۸ء میں ہٹلر جنگ کے لئے خود کو بالکل تیار سمجھ لیتا ہے۔ ۱۲ فروری سنہ ۱۹۳۸ء کو وہ آسٹریا کے چانسلر ڈاکٹر شوشنگ کو اپنی قیام گاہ واقع برچیس گاڈن میں بلوا لیتا ہے اور آسٹریا کی نازی جماعت کی موافقت میں ایسی شرائط پیش کرتا ہے جن سے آسٹریا کی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ مسولینی شوشنگ کی امداد طلبی کو ٹھکرا دیتا ہے۔ مجبور ہو کر شوشنگ عام ووٹ سے آسٹریا اور جرمنی کے اتحاد کو طے کرنے پر رضامند ہو جاتا ہے لیکن ۱۱ مارچ سنہ ۱۹۳۸ء کو جس روز یہ عام ووٹ لیا جانے والا تھا، جرمن فوجیں آسٹریا میں گھس جاتی ہیں۔

ہٹلر نے آسٹریا پر قبضہ کرنے کے بعد زیکوسلاواکیہ کو فوجی اعتبار سے گویا بے دست و پا کر دیا کیونکہ زیکوسلاواکیہ کی وہ سرحد جو آسٹریا کی طرف تھی غیر مسلح تھی۔ سوڈیٹن لینڈ کی اقلیت کے حقوق کی پامالی کا جھوٹا پروپیگنڈا کر کے وہ جرمنی سے زیکوسلاواکیہ کے اس خاص علاقے کی شمولیت کا مطالبہ کرتا ہے۔ برطانیہ نے دیکھا کہ چونکہ فرانس، روس اور زیکوسلاواکیہ کے درمیان باہمی تعاون کا معاہدہ ہے اس لئے جنگ کے چھڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ چیمبرلین نے زیکوسلاواکیہ سے زبردستی ہٹلر کے مطالبات منوانے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرانس کا نازی دوست حکمراں طبقہ برطانیہ کے بغیر فرانس کی بے دست و پائی کا بہانہ کر کے انتہائی بے شرمی کے ساتھ اس معاہدہ کو توڑ دیتا ہے جو فرانس، زیکوسلاواکیہ اور سوویت کے درمیان باہمی تعاون کے لئے وجود میں آیا تھا۔ سوویت روس کی "دعوت امداد" بھی رد کر دی جاتی ہے اور زیکوسلاواکیہ کی آزادی ہٹلر کے خونیں ارادوں کی بھینٹ چڑھا دی جاتی ہے۔ سنہ ۱۹۳۹ء کے مارچ میں ہٹلر بقیہ زیکوسلاواکیہ کو بھی ہضم کر جاتا ہے اور اس کے بعد لیتھوانیا سے زبردستی میمل کا علاقہ بھی چھین لیتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۹ء کے اگست میں ہٹلر اگر چاہتا تو فرانس اور برطانیہ کے غدار حکمراں طبقوں سے بلا کشت و خون ڈینزگ اور "برساتی" کا علاقہ بھی حاصل کر سکتا تھا لیکن اب اس کی تلوار بزور بازو اپنے قاتلانہ جوہر دکھانے کے لئے بیتاب تھی اور ۱ ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء کو چار بجے صبح کے وقت نازیوں کے ٹینک پولینڈ کے میدانوں میں دوڑنے لگتے ہیں۔ پولینڈ اور فرانس کی شکست کے بعد ہٹلر اپنے پروگرام کے مطابق ۲۲ جون سنہ ۱۹۴۱ء کو دنیا بھر کے مزدوروں، غریبوں اور فاقہ کشوں کی واحد امیدگاہ سوویت روس کی عظیم الشان طاقت پر حملہ کرتا ہے اور صرف چار سال کی مدت میں لپنے کئے کی سزا پاتا ہے یعنی یورپی اقتدار کے ساتھ ساتھ نازی پارٹی اور خود ہٹلر کی زندگی کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

طفیل احمد خاں ایم اے

رنگ اور نسل کا مسئلہ

از ڈاکٹر بینی پرشاد ۔ صدر شعبہ سیاسیات الہ آباد یونیورسٹی

قومی اور نسلی تعصبات کی جڑیں در اصل ہمیں قدیم یا جدید جماعتی تعصبات کی دنیا میں ملتی ہیں۔ بنیادی طور پر قوم یا نسل در اصل چھوٹی چھوٹی جماعتوں اور خاندانوں کے پھیل جانے اور ایک دوسرے سے مربوط و ملحق ہو جانے کے بعد ہی وجود میں آتی ہے۔ پھیلنے کا یہ عمل اپنے ساتھ جماعتی اور قبائلی عصبیت کو بھی ساتھ لے کر چلتا ہے۔ ایک خاص نکتۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو شروع میں اس عصبیت یا جماعتی جانب داری نے سماجی ارتقا میں مدد پہنچائی ہے اور بعض بہت مفید امور انجام دیتے ہیں، مثلاً اس سے فرد کی ایک اہم نفسیاتی ضرورت پوری ہوتی رہی ہے۔ ہر فرد فطری طور پر کسی مخصوص جماعت سے ذہنی اور جذباتی وابستگی چاہتا ہے اور جماعتی جذبہ وفاداری اور عصبیت انسان کی اس ضرورت کی پیداوار ہے اس کے علاوہ اس نے کچھ سماجی امور بھی انجام دیتے ہیں مثلاً اس نے ہر جماعت کو ایک مربوط شخصیت اور انفرادیت عطا کر کے اس کے مخصوص اداروں، قدروں اور معیاروں کی نشو و نما کی ہے۔ جماعتوں کے ایک دوسرے میں ضم ہو کر پھیل جانے کے بعد وفاداری اور جانب داری کا یہی جذبہ نسلی اور قومی عصبیت میں بدل گیا۔

"نسل کی اصطلاح علم معاشرت کی غالباً سب سے مشکل اصطلاح ہے"۔ آثار قدیمہ اور تاریخ کے مطالعہ کے بعد ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا میں کسی مقام پر بھی خالص نسل کا وجود نہیں رہا ہے۔ اور نہ ایسے تاریخی عہد سے پہلے اور عہد قدیم میں انسانی آبادی جغرافیائی بنیاد پر جب مختلف خطوں میں تقسیم ہو گئی تو ہر جماعت رفتہ رفتہ فطری خود پسندی اور توہمات کے تحت اپنے کو دنیا کی تمام جماعتوں سے برتر شمار کرنے لگی۔

دنیا کی تمام دوسری نسلوں کے متعلق نفرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ قدیم چینی خود کو اعلیٰ ترین نسل قرار دیتے تھے۔ پولینیشیا کے باشندوں میں، انگریز ہونا احمق ہونا دونوں ایک ہی چیز سمجھا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ نسلی عصبیت جنگوں اور تہذیبی و اقتصادی اختلافات کی وجہ سے اور بھی ترقی کر رہی ہے۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو نسل کے مسئلے سے متعلق عام طور پر لوگوں کے بغیر کسی علمی یا تحقیقی دستور کے سیکڑوں غلط خیالات اور عقائد باتیں ذہن میں قائم کرتی ہیں۔ کسی بھی نسل یا جماعت کے ساتھ ہم مخصوص خصوصیات وابستہ کر لیتے ہیں ۔۔۔ کیونکہ ہر جماعت ۔۔۔ رہتے ہوئے ماحول اور حالات کے تحت مسلسل اپنی خصوصیات میں اضافہ و ترمیم کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ جامد اور فطری خصوصیات" کا در اصل کوئی وجود نہیں ہے یہ وہ لفظ جو شرمندہ معنی نہ ہوا۔

"وراثت" اور "ماحول" کے درمیان اختلاف کی صورت پیدا کرنے کا طریقہ یکسر سے غلط ہے۔ فرد کو وراثت میں در اصل کچھ مخصوص صلاحیتوں یا ابھرنے کی طاقت کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا۔ یہ سوچنا غلط ہے کہ فرد کے سائے نسلی یا جماعتی رجحانات لے کر پیدا ہوتا ہے رجحانات تو در اصل تخلیق میں ماحول تعلیم اور روایات کے۔ چنانچہ سائنس کے اعتبار سے یہ کہنا غلط ہے کہ ایک نسل دوسری نسل کی بہ نسبت اپنے اندر زیادہ تہذیبی و تمدنی عروج کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اگر تاریخ عالم کا بحیثیت مجموعی مطالعہ کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی ماحول کے اثرات کو پیش نظر رکھا جائے تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ تہذیبی انقلابات انسان کی جبلی یا جسمانی خصوصیات سے بالکل آزاد رہے ہیں۔

اگر ایک ہی قوم کے افراد مختلف حالات اور ماحول میں رکھے جائیں تو ان کے اندر مختلف خصوصیات کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ لیکن ان خصوصیات کو جبلی جامد یا غیر منقلب شمار کرنا غلط ہے۔ انسانیات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ مختلف نسلوں کے درمیان جو ظاہر جسمانی اختلافات پائے جاتے ہیں ان کی حیثیت محض چند مقداری فرقوں کی ہے، ان سے ماہیتی (QUALITATIVE) اعتبار سے

فرق نہیں پیدا ہوتا۔ مخصوص طور پر دماغ کے سلسلے میں جو فرق بتایا جاتا ہے وہ اتنا غیر اہم ہے کہ آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک اُن جسمانی خصوصیات کا تعلق ہے جو نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہتی ہیں اُن کے اندر ایک خاص قسم کی ملائمت اور لچک پائی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ اردگرد کے اثرات کے تحت عام طور پر بدل جاتی ہیں۔ مثلاً طبعی حالات و اثرات کے تحت دماغ کی ساخت میں تھوڑا بہت فرق پیدا ہو جانا لازمی ہے، جہاں تک غیر طبعی یا غیر جسمانی ساخت کا تعلق ہے اُن کا مختلف حالات کے تحت بدلتے رہنا ایک عام بات ہے اور وہ حالات ہیں تعلیم، سماجی تنظیم، ایجادات اور نئے رابطے و تعلقات، چنانچہ فرانس اور روس، جاپان اور ترکی کی مثالیں ہمارے پیش نظر ہیں، دوسری سب سے بڑی حقیقت جو نسل کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے عام طور پر لوگ بھلا دیتے ہیں یہ ہے کہ ہر جماعت میں ہر قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں، مثلاً کمزور یا مضبوط اور ... کے لوگ جذباتی یا خاموش، رومانی یا خشک رجحان کے لوگ، موٹے، فربہ اور ریاضی وغیرہ وغیرہ۔ کسی فرقہ کے تمام لوگ ایک ہی قسم کی خصوصیات کے مالک نہیں ہوتے۔

نسل کا مسئلہ اس وقت اور بھی لاینحل ہو جاتا ہے جب جسمانی و تہذیبی اختلافات کی سرحدیں، معاشی مقابلہ بازی اور سیاسی ... سے جا ملتی ہیں۔ نسل کا مسئلہ رنگ کے مسئلہ کی صورت اختیار کر کے اور بھی خطرناک ہو جاتا ہے۔ آج سے تین ہزار سال پہلے آریوں کی آمد نے ہندوستان میں رنگ کا جو سوال پیدا کر دیا تھا، وہ اس ... کوئی شک نہیں کہ تہذیبی میل جول اور نسلی اتحاد کے سبب اور ذات پات کے نظام کے قائم ہونے کے بعد تقریباً حل ہو گیا لیکن اسی وجہ سے ہندوستان کے سماجی اور سیاسی نظام میں جو بے آہنگی پیدا ہو گئی وہ آج بھی بہت حد تک باقی ہے۔

لیکن اس واحد مثال سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ دراصل رنگ کا مسئلہ ... کا مسئلہ ہے جو پندرہویں اور سولہویں صدی میں جغرافیائی دریافتوں کے سبب سفید اور رنگ دار قوموں کے درمیان تعلقات قائم ہونے کے بعد وجود میں آیا۔ اس رنگ کے تعصب نے دنیا کے امن کو اور کروڑوں انسانوں کی سرگرمیوں کو خطرے میں ڈال رکھا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اس کے اسباب کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد انھیں دور کرنے کی کوشش کریں۔ ورنہ ایک عالمگیر اقتصادی نظام مضبوط بنیادوں پر نہیں قائم کیا جا سکتا۔

رنگ کا اختلاف ایک دوسرے کو سمجھنے بوجھنے کے راستے میں بے شمار دقتیں حائل کر دیتا ہے۔ رنگ کے اختلاف سے قطع نظر بھی عام طور پر ایک آدمی دوسرے کے ذہنی رجحانات کو آسانی سے نہیں سمجھ سکتا ہے مثلاً عورت اور مرد، بچے اور بوڑھے، نوجوان اور بوڑھے اور مختلف پیشوں کے لوگ اور مختلف طبقوں اور مذاہب کے افراد بہت کم ایک دوسرے کی عادات و ذہنی رجحانات سے واقف ہوتے ہیں، عام طور پر دو قومیں ایک دوسرے کے کردار کو صحیح طور سے سمجھنے سے قاصر رہتی ہیں، لیکن جب تمدنی اور جسمانی اختلافات سے رنگ کا اختلاف جا ملتا ہے تو پھر ایک دوسرے کے خلاف غلط فہمی اور ناواقفیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ عام طور پر پڑھے لکھے لوگوں اور عالموں میں بھی یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ افریقہ کے باشندے فطرتاً اعلیٰ زندگی اور ایک بہتر تمدن کے ناقابل اور ایک ادنیٰ زندگی گذارنے پر مجبور ہیں، مگر دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں افریقہ کے پیچھے رہ جانے کے اسباب دراصل یہ ہیں کہ اوّلاً ریگستان صحرا کی عظیم الشان وسعت نے افریقہ کو شمال کی متمدن دنیا سے بالکل علیحدہ رکھا، دوسرے افریقہ، آب و ہوا کے سبب ایسے امراض کا شکار رہے جنہیں صرف جدید سائنس کی مدد ہی سے دور کیا جا سکتا ہے، پھر اقتصادی اعتبار سے پچھڑے رہنے کے سبب قبائلی جنگیں برابر ہوتی رہیں جس کی وجہ سے عرب اور اہل یورپ کو وہاں غلاموں کی خرید و فروخت کے سلسلے میں بہت آسانیاں رہیں۔ لیکن اس کے باوجود افریقہ کے بعض اندرونی علاقوں میں تہذیب و تمدن نے ایک بڑی حد تک ترقی کے منازل طے کئے، عہد جدید میں رسل و رسائل کے ترقی پانے اور بردہ فروشی اور امراض، اور قبائلی جنگوں کے ختم ہو جانے کے بعد صرف افریقہ کو آزادی اور مواقع ملنے کی دیر ہے جس کے بعد افریقہ کے متمدن اور مہذب ہونے میں ذرا بھی دیر نہ لگے گی۔

رنگ کے سلسلہ میں ایک جمالیاتی مسئلہ بھی حائل ہے، ہر جماعت نے خود اپنی جسمانی خصوصیات کی اساس پر حسن کا اپنا ایک معیار قائم کر لیا ہے۔ عام طور پر جب مختلف رنگوں اور جسمانی خصوصیات کے دو افراد پہلی مرتبہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو نفرت یا خوف کا احساس کرتے ہیں۔ سولہویں صدی میں صاف رنگ کے

چند مستشرقوں نے بھی پہلی مرتبہ اہلِ یورپ کو دیکھنے کے بعد نفرت کا اظہار کیا تھا اور ان کے رنگ کو سفید کوڑھ سے مشابہ قرار دیا تھا، یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مشرق الہند میں ان کے سفید دانتوں کی وجہ سے بندر کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر لونگسٹن نے اپنے سفرنامہ میں بیان کیا ہے کہ شروع میں افریقہ کے باشندے سفید فام یورپینوں کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتے تھے اور بھاگ کھڑے ہوتے تھے، اس خوف اور نفرت کی بنیاد محض اسباب پر ہے کہ انسان کا ذوقِ حُسن مخصوص ماحول کا عادی ہوتا ہے، چنانچہ پرتگال اور اسپین کے باشندوں میں عام طور پر رنگ کا تعصب اتنی شدید صورت میں نہیں پایا جاتا، جتنا انگلستان، جرمنی اور شمالی یورپ کے لوگوں میں کیونکہ اولاً تو پرتگال اور اسپین کے لوگ خود بھی زیادہ سفید فام نہیں ہوتے، دوسرے سیاہ فام قوموں سے اُن کو قربت اور تعلقات حاصل رہے ہیں۔ جس کے سبب سے اُن کا ذوقِ حُسن اس رنگ کا عادی ہو چکا ہے۔

فرانس کے باشندے کالے رنگ کی بہ نسبت زرد اور بھورے رنگ کے لوگوں سے بہت کم نفرت کرتے ہیں اسلئے کہ جنوبی یورپ کے لوگوں کا رنگ کچھ بھورا مائل ہوتا ہے۔

رنگ کے اختلاف اور تعصب میں معاشی مقابلہ بازی اور استحصال اور بھی پیچیدگی اور اُلجھاؤ پیدا کر دیتا ہے۔ سولہویں صدی کے بعد سے افریقہ اور ایشیا میں سیاہ فام اور کمزور قوموں کو اقتصادی اعتبار سے غلام بنانے کی مسلسل کوشش عمل میں آتی رہی ہے، موجودہ غلامی نے سیاہ رنگ کو ایک پچھڑی ہوئی اور پست زندگی سے بُری طرح وابستہ کر رکھا ہے، سیاہ فام اور سفید فام قوموں کے درمیان اقتصادی مفاد کے تصادم کی وجہ سے نفرت اور تعصب میں بہت اضافہ ہو گیا ہے امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں سفید فام باشندے رنگین باشندوں کو مخصوص علاقوں میں محدود اور محصور کر دینا چاہتے ہیں کیونکہ انہیں ڈر ہے کہ وہ اپنی سستی محنت سے اُن کی روزی نہ چھین لیں، امریکہ کے لوگ چینیوں سے دوستی کا دم بھرتے تھے لیکن جب امریکہ میں چینی باشندے زیادہ تعداد میں داخل ہونے لگے اور معاشی مفاد کا سوال پیدا ہونے لگا تو وہ اُن کی مخالفت کرنے لگے، یہ نفرت دوبارہ محبت میں بدل گئی جب قانونی کارروائیوں کے ذریعہ امریکہ میں چینی باشندوں کی آمد بالکل گھٹا دی گئی۔

یہ اقتصادی عناصر جو رنگ کے مسئلہ کو اتنا مشکل بنا دیتے ہیں سیاسی عناصر سے بہت گہرے طور پر ملحق اور متحد ہیں، ایشیا اور افریقہ کے وسیع علاقوں میں سیاہ رنگ سیاسی غلامی سے وابستہ ہو کر رہ گیا ہے۔ رنگ کا اختلاف سفید اور سیاہ باشندوں کو ایک دوسرے میں مدغم ہو جانے سے روکتا ہے۔ چنانچہ ان ملکوں میں اس اختلاف نے سیاسی اور سماجی نظام میں وسیع خلیجیں حائل کر رکھی ہیں چنانچہ بعض علاقوں میں تو سفید اور سیاہ باشندوں کے باہمی تعلقات ایک خاموش جنگ کی نوعیت رکھتے ہیں۔

یہ ہیں وہ ذہنی جمالیاتی، اقتصادی اور سیاسی تضادات و اختلافات جنہوں نے رنگ کے مسئلہ کو اس کی موجودہ حیثیت عطا کی ہے رنگ کے اس تعصب نے ہماری آنکھوں سے زندگی کی بے شمار حقیقتوں کو اوجھل کر رکھا ہے اور نفسیات، اقتصادیات، تاریخ یہاں تک کہ جغرافیہ سے متعلق بھی ہمارے ذہن میں بے شمار غلط خیالات بھر دیئے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ عام طور پر فرض کر لیا گیا ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے وسیع علاقوں کے باشندے جسمانی یا دماغی ترقی کی اہلیت نہیں رکھتے، یورپ اور امریکہ کے وہ لوگ جو غلامی کی موافقت میں تھے انہوں نے سائنس کی مدد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی نیگرو باشندے دراصل انسانی نسل سے کوئی تعلق نہیں رکھتے بلکہ بندروں کی ایک ترقی یافتہ نسل کے افراد ہیں جیسا کہ اُن کی ہڈیوں کی ساخت سے ظاہر ہوتا ہے حالانکہ تہلے جیسے ماہر سائنس نے اس نظریے کو سراسر غلط اور بے بنیاد ثابت کر دکھایا ہے۔ اسی طرح "نسلی نفسیات" کا علم بھی اسی قسم کے بے بنیاد نظریوں سے بھرا پڑا ہے جو نتیجہ ہے پرُ ود چند سائنسدانوں کے نسلی تعصبات کا پروفیسر زمرن ہمیں بتاتا ہے کہ یورپ کے بعض سائنس دانوں نے نسلی برتری سے متعلق جو نظریے قائم کئے ہیں وہ انہیں پرانے خیالات کا اعادہ ہیں جو غلامی کی موافقت میں کسی زمانہ میں پیش کئے گئے تھے، چنانچہ عام طور پر یورپ کے عالموں اور سائنس دانوں کا خیال ہے کہ افریقہ کے باشندے محنت اور مشقت سے فطری طور پر نفرت کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ افریقہ کے باشندے اسلئے بڑے بڑے کارخانوں میں کام کرنے سے گھبراتے ہیں کہ وہ ابھی ان کے عادی نہیں ہوئے ہیں دوسرے جن حالات میں وہ کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کئے جاتے ہیں وہ تقریباً ناقابلِ برداشت ہیں، انہیں اپنے رشتہ داروں سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے، پھر ان کی ضروریاتِ زندگی بھی اتنی وسیع نہیں ہوئی ہیں کہ انہیں کارخانوں اور صنعت کی

ضرورت محسوس کرائیں، جب یہ دقتیں دور ہو جائیں گی تو افریقہ کے باشندوں میں بھی صنعت و فن دونوں اور سائنس ہر گئی ترقی کرنے لگے گی (ختم)

ہندوستان کا آئندہ دستورِ حکومت اور دیسی ریاستیں

از: ــــــــ مسٹر سی۔ وی۔ ایچ۔ راؤ

۔۔۔بات طے شدہ ہے کہ ہندوستان کے لئے آئندہ جس قسم کا دستور بھی بنے گا اس میں ریاستوں کو بھی ایک باعزت مقام حاصل ہوگا۔ ریاستوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ہندوستان کے لئے کسی پائدار دستورِ حکومت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جس طرح سی۔ آر۔ داس نے بنگال کے متعلق کہا تھا اسی طرح دیسی ریاستوں کے بارے میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ "ان کو ہندوستان کے نقشہ سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔" ہندوستان کے لئے آج تقسیم اور بٹوارہ کی جتنی سکیمیں پیش کی جا رہی ہیں ان کے باوجود ہمارا نصب العین ایک ایسا متحدہ ہندوستان ہے اور ایسا دستورِ حکومت ہے جس میں ریاستوں کو بھی مجوزہ اور مناسب شرطوں پر شامل ہونے کا حق حاصل ہوگا خواہ وہ بالکل ابتدا ہی سے شامل ہوں یا آگے چل کر۔ ہندوستان کے متحدہ اور اتحاد کا تقاضا ہوگا کہ ریاستوں کا تاجِ برطانیہ سے براہ راست تعلق قائم نہ رہے کیونکہ اس قسم کی صورتِ حال ریاستوں اور برطانوی ہندوستان کے مفاد کے لئے خطرناک ہوگی۔ برطانوی ہند سے علیحدگی کی صورت میں ذہنی تحفظ اور معاشی ترقی کے لئے خود ریاستوں کے لئے غیر ممکن ہوگا جب کہ ریاستیں اتنی بڑی نہیں کہ علیحدگی کی صورت میں معاشی اعتبار سے خود کفیل ہو سکیں۔

بقیہ ہندوستان کی قومی حکومت کے لئے بھی قومی پالیسیوں کی تشکیل کے سلسلہ میں دیسی ریاستوں کے عملی تعاون کی اتنی ہی ضرورت ہوگی جتنی ریاستوں کو برطانوی ہند کے اشتراک عمل کی۔ یہ صورت بالکل قطعی ناقابل برداشت ہے کہ ہندوستان کا ایک حصہ تو ترقی کی منزلیں طے کرتا رہے اور دوسرا پسماندہ رہے کیونکہ سب سے بڑا خطرہ ہے کہ ہندوستان کے ایک حصہ کو ڈومینین اسٹیٹس عطا کیا جائے اور دوسرا حصہ برطانوی تاج کے زیر تسلط رہے۔ ہندوستان کی بڑی سے بڑی ریاست بھی حکومتِ ہند کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے براہ راست اثرات سے آزاد نہیں ہے۔ یہ بات خود دیسی حکمرانوں کے لئے باعث اہانت ہے اور بہت سے دیسی حکمران اسے محسوس بھی کرتے ہیں چنانچہ دیسی حکمرانوں کے نزدیک آئندہ ہندوستان کی قومی مرکزی حکومت کو معاہدہ کرنا زیادہ قابل ترجیح ہوگا۔ آئندہ لندن کے براہ راست اثرات کی مخالفت کریں گے۔

اگر جنگ کے ختم ہونے کے بعد ہندوستان کو ڈومینین اسٹیٹس عطا کیا جانے والا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ کے دستورِ حکومت کی کامیابی کے لئے برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں کو عملی اور شعوری طور پر تعاون کرنا ضروری ہے۔ اسی مقام پر بعض اہم دقتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ریاستوں کا مطالبہ ہے کہ تاج برطانیہ سے جتنے معاہدے کئے گئے ہیں سب ہو بہو برقرار رکھے جائیں اور ان کی آئندہ حفاظت کی جائے۔ پھر دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ تاج برطانیہ سے ان کے موجودہ دستوری تعلقات کو قائم رکھا جائے اور ان کی جگہ پر ایسی دستوری صورتِ حال نہ پیدا کی جائے جس سے ان کی علیحدہ حیثیت اور انفرادیت کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہو اور جس سے خود ریاستوں کے نقطۂ نظر سے کسی خاص خطرہ کی امید نہ ہو۔ دیسی ریاستیں اپنی اندرونی سیاسی اصلاحات اور دستوری تبدیلیوں وغیرہ کے معاملہ میں بھی کسی قسم کی دخل اندازی پسند نہ کریں گی۔ ہر دیسی ریاست کے اندرونی مسئلوں کی نوعیت مختلف ہے اور آئندہ کی قومی حکومت میں ان مسائل کا حل دریافت کرنا ضروری ہوگا۔

ریاستوں کے یہ مطالبے اگرچہ ہو بہو نہیں قبول کئے جا سکتے پھر بھی مناسب ردوبدل کے بعد انہیں قبول کرنا ضروری ہوگا ہے لیکن ایک دقت یہ ہے کہ برطانوی ہند کی سیاسی جماعتوں نے (مخصوص طور پر کانگریس نے) والیانِ ریاست کے دل میں خوف پیدا کر دیا ہے۔ ریاستوں میں دستوری حکومت کے جلد از جلد قیام کے متعلق کانگریس کا جو رویہ رہا ہے اس سے ہر شخص واقف ہے

کانگریس نے تو کئی بار ریاستی نظام کو یکسر ختم کر دینے کی موافقت کی ہے۔ کانگریس نے والیان ریاست کی حب الوطنی کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ اور انہیں ہندوستان میں برطانوی شہنشاہیت کا آلۂ کار قرار دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی دیسی ریاستوں نے جماعتی حیثیت سے اپنے آئندہ تحفظ کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ اور جب کل ہند وفاق میں شامل ہونے کا سوال آیا تو انہوں نے سب سے پہلے دستوری تحفظات کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ وفاق کو عمل میں لانے کے لئے دیسی ریاستوں سے گفت و شنید کی ناکامیابی کی ذمہ داری دراصل ہندوستان کے انتہا پسند لیڈروں اور مدبرین پر عائد ہوتی ہے۔

جنگ کے چھڑ جانے کے بعد سے ملک میں ایک مستقل سیاسی جمود کی کیفیت طاری ہے۔ کرپس اسکیم میں برطانیہ نے اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ جنگ کے ختم ہونے کے بعد ہندوستان کو ڈومینین اسٹیٹس عطا کیا جائے گا اور ریاستیں اگر چاہیں تو اس سے علیحدگی اختیار کر سکتی ہیں۔ چنانچہ یہی موقع ہے کہ دیسی ریاستیں اس بات کا فیصلہ کریں کہ اس جنگ کے بعد ہندوستان کے دستوری ارتقاء میں ان کا کیا حصہ ہو گا۔ ساتھ ہی برطانوی ہند کی تمام سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کے لئے بھی ضروری ہے کہ جنگ کے بعد کے دستوری مسائل کی جانچ پڑتال کریں۔ اور اس سے ملحقہ ریاستوں کے مسائل پر بھی غور کریں۔ اس سلسلہ میں ایک دقت یہ ہے کہ پاکستان اور اقلیت کے مسائل کو حل کئے بغیر وہ ریاستوں کے معاملہ کی طرف پوری توجہ نہیں دے سکتے۔

لیکن یہ سوچنا اب غیر مفید ہے کہ والیان ریاست رجعت پسند یا ترقی کے دشمن ہیں۔ اور ریاستوں کا وجود ہی رجعت پسندی کا گہوارہ ہے۔ یہ مسرت کا مقام ہے کہ بعض والیان ریاست نے مثلاً مہاراجہ نوانگر یا مہاراجہ بیکانیر اور مہاراجہ کشمیر نے ان الزامات کی تردید کی ہے۔ بہت سے والیان ریاست نے تو نہ صرف لفظوں ہی میں بلکہ عملی دنیا میں بھی ان کی تردید کی ہے۔ مہاراجہ بیکانیر نے گذشتہ اکتوبر کے موقع پر کہا کہ "بمبئی کی کانفرنس میں والیان ریاست نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ وہ خود کو برطانوی ہند سے علیحدہ نہیں سمجھتے اور ہندوستان کی ترقی کے راستے میں حائل ہونے کی بجائے وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان دنیا کی آزاد قوموں کی صف میں ایک باعزت مقام حاصل کرلے۔"

یہ اس بات کا مسرت انگیز ثبوت ہے کہ والیان ریاست اب حقائق کو پہچاننے لگے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابھی ریاستوں میں بہت کچھ کرنا باقی ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ بعض ریاستوں میں اتنی دستوری تبدیلیاں ضرور ہو گئی ہیں کہ محض ذرا سی مزید تبدیلی کے بعد انہیں جدید طریقہ حکومت کے معیار پر لایا جا سکتا ہے۔ دوسری ریاستوں میں ابھی کوششیں جاری ہیں اور اب والیان ریاست کے لئے ترقی کے راستے سے ہٹنا غیر ممکن ہے۔

اقتصادی نکتۂ نگاہ سے دیسی ریاستوں اور برطانوی ہند کا تعاون اور اشتراک عمل اور بھی ضروری ہے۔ بیشتر ریاستیں کچھ اس طرح واقع ہیں کہ من مانی معاشی طرز عمل اختیار کرنا ان کے لئے ناممکن ہے۔ سر سی۔ پی۔ رام سوامی آئر نے جنہیں ریاستوں کے مسئلہ پر سب سے زیادہ آگاہی حاصل ہے۔ اور جو ریاستوں کے حقوق اور برطانوی ہند سے ریاستوں کے اتحاد کے سب سے بڑے حامی ہیں اس مسئلہ پر خاص زور دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ریاستیں صرف اسی حالت میں ایک آزاد قومی حکومت کی ماتحتی قبول کر سکتی ہیں جب کہ وہ قومی حکومت پورے ہندوستان پر حاوی ہو، لہٰذا ایسی صورت میں نہیں کہ ہندوستان میں ایک سے زیادہ مرکزی حکومت قائم ہو۔

یہ بات اب بالکل واضح ہو گئی ہے کہ ہندوستان ایک اقتصادی وحدت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اسے ٹکڑوں میں نہیں تقسیم کیا جا سکتا۔ پاکستانی ریاستوں کا قیام معاشی اعتبار سے ایک بے حد مشکل اور لاینحل مسئلہ ہے۔ ملکی حفاظت کے نقطۂ نظر سے بھی ہندوستان کے لئے تقسیم نقصان رساں ثابت ہوگی۔ دیسی ریاستیں بھی اپنے مفاد کے پیش نظر فوجی اور معاشی اعتبار سے متحدہ ہندوستان کی خواہاں ہیں۔ چنانچہ والیان ریاست کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ جب ہندوستان کی تقسیم کا سوال پیدا ہو تو ان کے نکتۂ نگاہ کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ ہندوستان کے مستقبل کو بہتر بنانے کا تقاضا یہ ہے کہ ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتیں ہندو اور مسلمان اور ریاستیں متحد ہو کر آنے والے ڈومینین اسٹیٹس کے لئے دستوری اصولوں اور ایک متحد بنیاد کی تشکیل کرلیں۔ صرف اسی طرح برطانیہ کے اس الزام کا جواب دیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان متحد اور متفق نہیں ہے۔

شہنشاہ اکبر اور مذہبی اتحاد

از ریاض الکریم صاحب ایم اے، بی ایل

مورخین شہنشاہ اکبر کو دنیا کے عظیم ترین حکمرانوں میں شمار کرتے ہیں۔ تاریخ عالم ہمارے سامنے تین فرماں رواؤں کے نام ایک خاص عظمت کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ اشوک، قسطنطین اور اکبر۔ تینوں شہنشاہ رعایا کے محض مادی خیر و فلاح سے مطمئن نہیں تھے بلکہ انھوں نے رعایا کے اخلاقی اور روحانی کردار کو بھی بلند اور ارفع بنانے کی کوشش کی۔ اشوک کی زندگی کا خاص مقصد اپنی رعایا کو ایک اخلاقی اور روحانی نصب العین کی طرف لے جانا تھا۔ چنانچہ اس نے دنیا کے بعید ترین گوشوں میں مذہبی مبلغین بھیجے جن کا مقصد یہ تھا کہ بنی نوع انسان کو سچے مذہب کی تعلیم دی جائے۔ اس نے اعلیٰ ترین اخلاقی تعلیمات سے لبریز متعدد فرمان جاری کیے اور ان تعلیمات کو پتھروں، عماروں اور میناروں میں کھدوا دیا تاکہ برابر لوگوں کی نظر ان پر پڑتی رہے اور وہ اپنے حسن اخلاق کو برقرار رکھ سکیں۔ شہنشاہ قسطنطین یورپ کا پہلا فرماں روا تھا جس نے عیسائیوں کو ظلم و تشدد سے مکمل طور پر نجات دلائی۔ بعد میں اس نے خود عیسائیت اختیار کر لی اور اشوک کی طرح ایک عالمگیر مذہب بنانے کا بیڑہ اٹھایا۔ یہ اسی کی انتھک کوششوں کا نتیجہ تھا کہ عیسائیت نے جس پر پہلے انتہائی مظالم ڈھائے گئے تھے تھوڑے ہی عرصے میں سلطنت روم کے ریاستی مذہب کی حیثیت حاصل کر لی اور اس کی اشاعت کے راستے میں جو رکاوٹیں حائل تھیں وہ سب دور ہو گئیں۔ اکبر کا مقصد بھی کچھ اسی قسم کا تھا لیکن اکبر کو وہ کامیابی نہیں حاصل ہو سکی جتنی کہ ان دونوں حکمرانوں کو۔

مذاہب کا اتحاد

اکبر جب تخت نشین ہوا تو اس نے اپنی سلطنت کے دو اہم عناصر یعنی ہندو اور مسلمان کو مذہب کے معاملے میں ایک دوسرے سے دست و گریباں پایا۔ اسے یہ دیکھ کر صدمہ ہوا کہ مذہب دو قوموں میں اتحاد بلکہ ہم آہنگی کا ذریعہ ہونے کی بجائے جھگڑوں اور فساد کا باعث ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی قوم کو بار بار متنبہ کیا کہ مذہب ایک اور صرف ایک ہے۔ خدا تک پہنچنے کے راستے چاہے مختلف ہوں لیکن منزل ایک ہی ہے۔ اکبر نے اپنی قوم کے سامنے دنیا کے تمام مذاہب کے بنیادی اتحاد و ہم آہنگی کا مظاہرہ کرنے کے لیے ہر مذہب کے بہترین عناصر کو یکجا جمع کیا۔ اور دنیا کے سامنے انھیں ایک حسین گلدستے کی صورت میں پیش کیا۔ اسی طرح اس نے عملی طور پر قوم کو یہ بتایا کہ مذہبی اختلافات کو حل کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہے۔

تمام مذہبی اختلافات کی تہہ میں لوگوں کے توہمات، بغض و عناد اور خودستائی کے جذبات کارفرما ہوتے ہیں۔ ان چیزوں کا اگر قلع قمع کر دیا جائے تو مذہبی اختلافات بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ ٹھیک جس طرح آفتاب تازہ کے طلوع ہونے کے بعد دھند اور کہاسہ خود بخود غائب ہو جاتا ہے۔

اکبر کا مذہب کیا تھا اس سے متعلق بہت کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ متعصب قسم کے مسلمان یہ کہتے ہیں کہ اکبر نے دو مقاصد کے تحت اسلام ترک کر کے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی تھی۔ اولاً تو یہ کہ دنیا کے بڑے بڑے مذہب کے بانیوں میں اس کا نام شمار ہونے لگے۔ اور دوسرے سامراجی ارادوں کی تکمیل میں اس نئے مذہب سے مدد ملے۔ لیکن بچپن سے لے کر عہد عروج تک اگر اس کے دل و دماغ کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات معلوم ہو گی کہ وہ مذہب پر پورا ایمان رکھتا تھا۔ لیکن اس کا مذہب کسی خاص مذہب سے وابستہ نہ تھا۔ اس کے مذہب کی نوعیت عالمگیر تھی جس کی رو سے خدا تمام کائنات کا مالک ہے۔ اور خدا کے سامنے تمام انسان مساوی ہیں۔

حقیقت کا متلاشی

اگر اکبر کے ذہنی ارتقاء کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات معلوم ہو گی کہ اس کے اخلاص میں دینی یا دنیا پرستی کا شائبہ تک نہ تھا۔ اکبر جیسے پیدائشی فلسفی کا ذہن

[illegible] حالت اُن کی ظاہری صورت میں دیکھا گوارا نہیں کر سکتا - اس قسم کا ذہن لازمی طور پر تنقید و تجزیہ اور چھان بین کی طرف مائل ہوتا ہے - اور ان تمام اجزا عناصر کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے جو انسان کے لیے ضروری ہوتے ہیں - تاریخ عالم اس بات کی شاہد ہے کہ فطین (GENIUS) ہمیشہ عام آدمیوں سے مختلف ہوتا ہے اس قسم کا انسان کبھی پٹے پٹائے راستوں پر چلنا گوارا نہیں کرتا - وہ روایات، عقائد و توہمات کو ہٹا تا ہوا خود اپنے لیے ایک نیا راستہ پیدا کرتا ہے - اکبر اسی قسم کا ایک انسان تھا - اُسے ایک پرانے عقیدہ کو ترک کر کے اس کی بجائے ایک نیا عقیدہ جو اس کے دل کو اپیل کرتا ہو اختیار کر لینے میں کوئی پس و پیش نہ تھا - مذہب اس کی سانسوں میں بسا ہوا تھا لیکن اس کے نزدیک مذہب سے مراد محض مذہبی تکلفات و تصنعات نہ تھے - وہ مذہب کے صرف اعلیٰ و ارفع معنوں کا دلدادہ تھا - متعصب حضرات چاہے اس پر کتنی ہی لعنتیں بھیجیں لیکن اگر اُن سے بہت بلند واقع ہو تھا کہا جاتا ہے کہ اکبر نے متعدد بار اپنا مذہب تبدیل کیا - اگر یہ صحیح بھی ہے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ایمان و عقیدہ سے بہرا تھا - یا اس کے مذہبی خیالات پختہ نہیں تھے - بلکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اکبر دائمی طور پر حقیقت کا متلاشی تھا - اس نے حقیقت کو پانے کے لیے مذہبی عقائد کی دنیا میں دور دور تک کی سیر کی اور اس وقت تک دم نہ لیا جب تک اس نے حقیقت کو اچھی طرح سمجھ اور دیکھ نہ لیا -

برطانیہ کا سیاسی مستقبل

از ــــــــــــــــ جینی لی

زیر نظر مقالے میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہ برطانیہ میں لیبر پارٹی کی سیاسی رہنمائی کا کیا مستقبل ہے کیا لیبر پارٹی سیاسی اقتدار اور اختیارات کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے کر ان نیم پختہ اسکیموں اور پلانوں کے پرزے اڑا دے گی۔ جن کا موجودہ برطانوی مخلوط وزارت ڈھنڈورہ پیٹ رہی ہے؟ کیا آئندہ انتخابات کے بعد لیبر پارٹی کی وزارت کے وجود میں آنے کا امکان ہے؟ یہ سوالات صرف دائرہ برطانیہ بلکہ پوری سلطنت کی سیاست سے متعلق بنیادی سوالات ہیں جن سے ہندوستان کا مستقبل قریبی طور پر وابستہ ہے۔

(ایڈیٹر)

کیا ایسی فوج جنگ میں کامیاب ہوسکتی ہے جس کے جنرل اور کمانڈر پیچیدہ جنگی طریقوں اور چالوں سے نابلد ہوں جنھیں فتح پر یقین نہ ہو اور جو دشمن سے سمجھوتہ کر لینے میں کوئی عار نہ سمجھتے ہوں؟ برطانیہ کی لیبر پارٹی کا آج بالکل یہی حال ہے جو اس قسم کی فوج کا ہوسکتا ہے آج برطانیہ کے سیاسی حالات واضح طور پر بتا رہے ہیں۔ کہ آئندہ انتخابات تو لیبر پارٹی کی جیت یقینی ہے لیکن اگر کوئی چیز سدِ راہ ہے تو صرف یہ حقیقت کہ موجودہ لیبر پارٹی کے رہنما ہی آئندہ فتح سے خوف زدہ ہیں اور ان کے لیے آئندہ انتخابات میں شکست کھا جانے کا تصور اتنا پریشان کن نہیں ہے جتنا فتح پا جانے کا خیال۔

حکومت برطانیہ کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد کسی سیاسی جماعت پر جتنی اہم اور زبردست ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کا تقاضا ہے کہ اسے خود اپنے اوپر بھروسہ ہو۔ اس کے پاس پوری طرح عمل میں لانے کے لیے ٹھوس اور واضح اسکیمیں اور منصوبے ہوں وہ اپنی پالیسی کی عملی تشکیل کے لیے اعلیٰ ترین ماہرین کی خدمات استعمال میں لا سکتی ہو اور ہر قسم کی رکاوٹ اور مخالفت کا قلع قمع کر سکتی ہو۔ مگر کسی سیاسی جماعت میں یہ تمام باتیں اس وقت موجود نہیں ہیں تو وہ حکومت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی۔ آج سے تیرہ سال

پہلے جب لیبر پارٹی برسرِ اقتدار تھی اور جب ریمزے میکڈانلڈ وزیراعظم اور فلپ سنوڈن وزیر مالیات تھے تو لیبر پارٹی کی وزارت میں انھیں باتوں کی کمی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ وزارت انگلستان کے ٹوری رجعت پسندوں کی سیاسی چالوں اور معاشی منصوبوں کی شکار ہو کر رہ گئی۔ اس زمانہ کی یاد برطانیہ کے ذمہ دار سوشلسٹ لیڈروں کے دماغ میں ابھی تک تازہ ہے چنانچہ وہ ان لیبر لیڈروں کے کاموں پر ابھی سے بہت گہری نظر رکھتے ہیں جو آئندہ انتخابات میں کامیابی کے بعد لیبر وزارت کی باگ ڈور سنبھالنے والے ہیں۔

اس جنگ میں ایک بات بہت واضح ہو کر ہمارے سامنے آئی ہے۔ اور وہ یہ کہ لیبر پارٹی کے لیڈران بہت اچھے محکمانہ افسران اور منتظم کارتانت ہوتے ہیں مخصوص طور پر جب انھیں رجعت پسندوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اور جب سرمایہ دار استحکام حکومت کی پوری مشین اور پورا پروپیگنڈا ان کی موافقت میں ہوتا ہے چرچل کی موجودہ وزارت میں لیبر پارٹی کے دو وزراء کام کر رہے ہیں ارنسٹ بیون اور ہربرٹ مارین۔ بیون نے لیبر وزیر اور مارین نے خانگی تحفظ کے وزیر کی حیثیت سے برطانیہ کے عوام پر جتنی جان لیوا پابندیاں عائد کی ہیں اور اپنے فرائض جتنی سختی سے انجام دیتے ہیں

وہ کبھی [illegible] اور [illegible] تھا۔ لیبر پارٹی کے اُن وزراء نے لیبر پارٹی کی شہرت اور مقبولیت اور اس کی ایک صدی کی سرمایہ دشمنی سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ چنانچہ جب بھی اُنھوں نے مزدوروں پر یہ کہہ کر نئی نئی پابندیاں عاید کی ہیں کہ ان پابندیوں کے بغیر فتح ناممکن ہے تو مزدوروں نے اُن کی بات مان لی ہے۔

لیکن اب ایک نئی سیاسی صورت حال پیدا ہو رہی ہے موجودہ مخلوط وزارت ۱۹۴۰ء میں صرف ایک بحرانی اور خطرناک صورت حال کا مقابلہ کرنے کیلئے وجود میں لائی گئی تھی۔ لیکن اب اس کے گفتار و کردار سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ جنگ ختم ہونے کے بعد بھی جبکہ از سر نو تنظیم کا کام شروع ہو جائیگا تو یہ وزارت برقرار رکھی جائے گی۔ آج برطانیہ کے لوگ لازمی طور پر یہ سوال کر رہے ہیں کہ جنگ کے بعد انھیں باکار اور خوشحال رکھنے کیلئے کیا کیا جا رہا ہے اور موجودہ مخلوط وزارت نے اُنھیں مطمئن کرنے کے لئے کچھ اس قسم کی اسکیمیں اور منصوبے شائع کئے ہیں۔ جن کا تعلق دیہی اور قصباتی تنظیموں سے ہے اور جن کا مقصد آئندہ بیکاری کو دور کرنا ہے۔ اس قسم کی اور بھی اسکیمیں ابھی زیر غور ہیں۔

حکومت کی ان اسکیموں اور اعلانات نے لیبر پارٹی کو ایک عجیب احمقانہ پوزیشن میں ڈال رکھا ہے اور اس سے ملک میں اندرونی مناقشات کے پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ لیبر پارٹی کے موجودہ وزرا تو ان اسکیموں کے ساتھ ہیں لیکن سر ولیم بیوریج جیسے لبرل پارٹی کے ماہر اقتصادیات کو ان اسکیموں پر سخت اعتراض ہے۔ جہاں تک لیبر پارٹی کی عام اکثریت کا تعلق ہے وہ ان پلانوں اور اسکیموں کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہے اور ان کی بجائے سوشلسٹ اسکیموں کو ترجیح دیتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ایک عجیب صورت حال یہ ہے کہ حکومت میں سوشلسٹوں کے موجودہ نمائندے اپنے کردار اور عمل سے یہ اعلان کر رہے ہیں کہ جنگ اور قیام امن کے درمیانی عرصہ میں اور اس کے بعد ایک غیر معین عرصہ تک سوشلزم کے نظریئے اور اسکے اقتصادی منصوبے غیر موزوں ثابت ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لیبر پارٹی کے کچھ موجودہ وزرا مسٹر چرچل کے زیر قیادت اور ایک مخلوط جماعت کے نمائندوں کی حیثیت سے آئندہ انتخابات میں کھڑا ہونا چاہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ لیبر پارٹی کے یہ وزرا اپنے موجودہ اختیارات اور اقتدار کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ایسا ہونا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک لیبر پارٹی کی عام اکثریت اپنی رائے منوانے پر مصر ہے۔ لیبر پارٹی کی عام اکثریت اپنی سیاسی علٰحدگی اور خودمختاری پر زور دیتی ہے اور مخلوط وزارت کو صرف وقتی چیز سمجھ کر اسے جلد از جلد ہٹا دینا چاہتی ہے اُن کی یہ خواہش اس لئے اور بھی زور پکڑ رہی ہے کہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ رائے عامہ اب ٹوریوں اور رجعت پسندوں کے خلاف ہے۔ لاکھوں ووٹ دینے والے جنھوں نے پچھلے انتخابات میں کنزرویٹو پارٹی کے نمائندوں کو ووٹ دیا تھا یا لاکھوں وہ لوگ جنھوں نے یکسر سے ووٹ دینا ہی غیر ضروری سمجھا تھا۔ اب لیبر پارٹی کے نمائندوں کو ووٹ دینا چاہتے ہیں اور اس امید پر کہ جنگ کے بعد از سر نو تنظیم کیلئے لیبر پارٹی ترقی پسند اسکیموں اور منصوبوں کو زیر عمل لائے گی۔ یہ خواہش محض مزدور طبقہ میں نہیں پائی جاتی بلکہ متوسط طبقہ کے با اثر حلقوں میں بھی آج بنیادی معاشی تبدیلیوں کی زبردست خواہش پائی جاتی ہے چنانچہ جنگ کے دوران میں کامن ویلتھ نام کی ایک نئی جماعت وجود میں آئی ہے جو متوسط طبقہ کے ان ترقی پسند رجحانات کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس نئی پارٹی کے زیادہ تر ارکان اور زیادہ تر لیڈران متوسط طبقہ کے پیشہ ور حلقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور اس جماعت کے قیام سے ان کا مقصد لیبر پارٹی کی تحریک سے الگ یا اس کے خلاف کوئی تنظیم کھڑا کرنا نہیں ہے۔ بلکہ یہ جماعت آئندہ انتخابات میں رجعت پسندوں کے قدم اکھاڑنے کیلئے لیبر پارٹی سے باقاعدہ معاہدہ کرنے کیلئے تیار ہے۔

لیبر پارٹی ایک زبردست عوامی جماعت ہے لیکن کامن ویلتھ جماعت کچھ ایسی چھوٹی چھوٹی ہمت ور اور پرجوش کارکنوں کی ٹولیوں پر مشتمل ہے جو ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ ہمت ور اور پرجوش کارکن ان حلقوں میں اشتراکی اصولوں کی اشاعت کرتے ہیں۔ جو یا تو سیاسی اعتبار سے بالکل بے حس ہیں یا مزدور طبقہ کی مخالفت کرتے ہیں۔ چنانچہ انتخابات کے سلسلہ میں لیبر پارٹی اور کامن ویلتھ میں معاہدہ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لیبر پارٹی کی زبردست فتح یقینی ہو جائیگی اس لئے کہ وہ درجن حلقوں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ لیبر پارٹی کی طرف جھک پڑیں گے۔ اس طرح بیکاس سے لیکر سینکڑوں انتخابی حلقے صاف طور پر لیبر پارٹی کے زیر اثر آجائیں گے

کامن ویلتھ کے علاوہ دو پرانی ترقی پسند جماعتیں یعنی کمیونسٹ پارٹی اور انڈیپنڈنٹ لیبر پارٹی بھی لیبر پارٹی سے انتخابات کے سلسلہ میں مشترکہ محاذ قائم کرنے کیلئے تیار ہیں۔ موخر الذکر دونوں جماعتیں خود اپنے ٹکٹ پر کم سے کم درجن بھر ایسے نمائندوں کو کھڑا کر سکتی ہیں جن کی کامیابی میں کوئی شک نہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے انتخابی حلقوں میں بھی اُن کے پرجوش کارکنوں سے لیبر پارٹی کے نمائندوں کو زبردست مدد مل سکتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ لیبر پارٹی پرجوش اور فیصلہ کن انداز میں اپنی رہنمائی کے فرائض انجام دینے کے لئے کہاں تک تیار ہے اور وہ اُن ادھوری ترکیبوں اور منصوبوں کو ترک کرنے پر آمادہ ہے یا نہیں جنہیں موجودہ مخلوط وزارت ترتیب دے رہی ہے۔ پھر اس کے ساتھ یہ سوال بھی کم اہمیت نہیں رکھتا کہ آئندہ انتخابات کے بعد لیبر پارٹی کی وزارت کے وجود میں آنے کا امکان ہے یا نہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ لیبر پارٹی کے لیڈروں کی بے دلی اور پست ہمتی کے باوجود آئندہ انتخابات میں لیبر پارٹی کا کامیاب ہونا قطعی ممکن ہے۔ لیکن یہی صورت حال خطرات سے پُر ہے۔ لیبر پارٹی کے موجودہ بیٹھو لیڈر زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ وہ سیاسی جوش و خروش کا پارہ کم کردیں اور انتخابی حلقوں میں اتنی ذہنی اُلجھن پیدا کردیں کہ ٹوری جماعت اور لیبر جماعت دونوں کا پلّہ برابر رہے بلکہ اوّل الذکر کو مقابلتہً کچھ زیادہ ہی وزن حاصل رہے۔ ایسی صورت میں اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ ہوگا کہ دوبارہ ایک مخلوط وزارت کا قیام عمل میں آئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ صورت حال ان سوشلسٹ لیڈروں کے لئے بہت اطمینان بخش ہوگی جو آزادانہ اختیارات سے پیدا ہونے والے خطروں سے بچنے کے لئے مخلوط وزارت کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن اگر زیادہ رجائیت پسند نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو اس بات کا بھی امکان ہے کہ انتخابات کے بعد جو پارلیمنٹ وجود میں آئے گا اس میں نئے ترقی پسند عناصر اتنے مضبوط ہوں گے کہ بائیں بازو کی وزارت کو رجعت پسندوں اور ٹوریوں کا ساتھ دینے سے باز رکھ سکیں گے جہاں تک مسٹر چرچل کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ عوام میں بہت مقبول ہیں۔ لیکن حال ہی میں بعض حلقوں میں جو دوسرے انتخابات عمل میں آئے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کا نام کوئی ایسا جادو نہیں جو عوام کے دل و دماغ کو بالکل مسحور کرے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو مسٹر چرچل کو محض دوران جنگ کیلئے موزوں سمجھتی ہے اور جنگ کے بعد ٹوریوں کو رجعت پسند

سکھ اور پاکستان

از ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ منظر رضوی

مسلم لیگ کے لاہور رزولیوشن میں اقلیتوں کے حقوق کے متعلق خاص طور سے یہ کہا گیا ہے کہ :۔

اقلیتوں کے مذہبی، تہذیبی، اقتصادی، سیاسی اور دیگر حقوق ومفاد کے بچاؤ کے لئے ان کی رائے اور مشورہ سے دستور اساسی میں ضروری اکافی اور موثر تحفظات کا خاص طور سے تذکرہ ہوگا۔"

پنجاب مسلم لیگ نے اپنے منشور میں اقلیتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اس امر کا اعلان کیا ہے

پاکستان میں سکھوں کی تہذیب، مذہب، سیاسی اور اقتصادی حقوق محفوظ ہوں گے۔"

قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے اکثر بیانات میں سکھ اور دوسری اقلیتوں کو تحفظ حقوق کا یقین دلایا ہے اور سکھوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنے اقلیتی مطالبات مرتب کرکے سکھ مسلم سمجھوتہ کے لئے گفتگو کریں۔ اس میں مطلق شک نہیں کہ قائداعظم اور مسلم لیگ کو سکھوں کے مطالبہ اور حقوق سے کامل ہمدردی ہے کیونکہ مسلمانوں کو اس کا کافی تجربہ ہے کہ ایک اقلیت کو کن کن صعوبتوں اور دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے (بیان قائداعظم) اس لئے مسلم لیگ اور سکھ رہنماؤں میں کافی امکان ہے بشرطیکہ دونوں قومیں ایک دوسرے کے حق خود اختیاری کو تسلیم کریں اور سکھ مسلم سمجھوتہ کی بنیاد پر ایک متحدہ پنجابی ریاست قائم کرنے کا فیصلہ کریں جو پاکستان فیڈریشن (لاہور رزولیوشن کے مطابق) کا ایک خودمختار رکن ہوگا۔ قائداعظم اور لیگی رہنما اس امر سے اچھی طرح واقف ہیں کہ جبتک کہ پنجاب کے مسئلہ پر سکھوں سے کوئی مصالحت نہیں ہوتی مغربی پاکستان کے حدود کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

سکھ ایک مخصوص قوم ہیں جو اپنی تاریخی روایات اور تہذیب کی بنا پر دوسری پنجابی قومیت سے مختلف اور ممتاز ہیں۔ سکھ نے اپنی روایات اور تمدنی خصوصیات کو آج تک قائم رکھا ہے۔ وہ کانگرس کے ساتھ ضرور ہیں لیکن کانگرس میں ختم نہیں ہوئے۔ کانگرس سے علیحدہ رہ کر انھوں نے اپنی سیاسی تنظیم کی بنا اس طرح ڈالی جس طرح مسلم رہنماؤں نے مسلمانوں کی قومی تنظیم (مسلم لیگ) قائم کی۔ پہلی سامراجی جنگ کے دنوں میں جب سکھوں کا تصادم برطانوی سامراج سے ہونے لگا اور جب خود ملک میں ایک ہمہ گیر شورش اور بے چینی تھی جو خلافت اور سوراج تحریک کی شکل میں ظاہر ہوئی تو اس وقت سکھ قوم میں دو سامراج دشمن سیاسی جماعتیں قائم ہوگئی تھیں ایک غدر پارٹی اور دوسری شرومنی اکالی دل۔

غدر پارٹی کی بنا امریکہ صنعتی شہروں میں ڈالی گئی تھی جہاں سکھ کسانوں کی ایک بہت بڑی جماعت اپنی اقتصادی بدحالی اور جاگیر اور سامراجی نظام سے تنگ آ کر پنجاب سے منتقل ہوگئی۔ یہ سکھ امریکی فیکٹریوں اور باغات میں مزدوری کا کام کرتے تھے۔ وہاں انھیں امریکی سرمایہ داروں کے مظالم کا مقابلہ کرنا پڑا تو اپنی روایات کے مطابق وہ بابا سوہن سنگھ بھکنہ اور بابا جوالا سنگھ کی رہنمائی میں منظم ہوگئے اور نسلی امتیازات، جبری مزدوری، اور کم اجرت وغیرہ کا مقابلہ دہشت انگیزی سے کرنے لگے۔

جب سوراج تحریک کے ساتھ ساتھ اکالی تحریک شروع ہوئی (جس کا منشا گوردواروں کی جمہوری آزادیاں اور سکھ قوم کے لئے جمہوری حقوق حاصل کرنا تھا) تو غدر پارٹی نے اس تحریک کی پرزور ضمانت کی۔ اکالی تحریک کے بعض ترقی پسند عناصر جن میں سردار تیجا سنگھ سوتنتر خاص طور پر قابل ذکر ہیں اکالی تحریک کے ... ماسکو بھیجے گئے جہاں اکتوبر کی انقلاب ... ہو چکا تھا اور دونوں ... سلطان

مہاجرین (فیروز الدین، منصور اور فضل الٰہی، قربان وغیرہ بھی ماسکو میں مقیم تھے۔ سردار تیجا سنگھ نے وہاں سے امریکہ کا سفر کیا اور وہاں سے غدر پارٹی کے نوجوان کارکنوں کا ایک جتھا لیکر ماسکو واپس آئے۔ ان کی سیاسی تعلیم و تربیت سوویت یونین کے جامعہ شرقیہ میں ہوئی جو ایشیا کے محکوم ملکوں کے انقلابیوں کی تعلیم و تربیت کیلئے قائم کی گئی تھی۔
شرومنی اکالی دل کے دوسرے گروہ نے سردار موہن سنگھ جوش کی رہنمائی میں اکالی دل سے نکل کر کیرتی (مزدور) کسان پارٹی کی بنا ڈالی۔ آگے چل کر سردار تیجا سنگھ اور سردار سوہن سنگھ جوش دونوں سیاسی گروہ کمیونسٹ پارٹی میں مل گئے خود بابا سوہن سنگھ بھکنہ کمیونسٹ پارٹی میں داخل ہوئے۔

اکالی دل سے سامراج دشمن انقلابی عناصر کے اس طرح علٰحدہ ہو جانے سے اکالی جماعت رجعت پسند جاگیری عناصر کا مرکز بن گئی جو ایک طرف اکالی تحریک کی روشن روایات سے ناجائز فائدے اٹھانے اور دوسری طرف سکھ عوام کو قومی تحریک اور مزدور کسان تحریک سے علٰحدہ رکھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

چنانچہ اس وقت پاکستان اور کانگریس لیگ سمجھوتہ کی مخالفت اگر سکھوں کی کسی سیاسی جماعت نے مسلسل طور سے کی ہے تو وہ شرومنی اکالی دل اور اس کے رہنما ماسٹر تارا سنگھ وغیرہ ہیں

یہ صحیح ہے کہ سکھ پنجاب میں ایک قوم کی بعض ضروری خصوصیات رکھتے ہیں لیکن وہ کسی مخصوص اور واضح خطہ میں آباد نہیں ہیں۔ وہ پنجاب کے مرکزی اضلاع میں اس طرح پھیلے ہوئے ہیں کہ کسی مقام پر ان کی اکثریت بھی نہیں ہے اس لئے فی الحال ان کی قومی ریاست یا سکھستان کی تشکیل کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس حقیقت سے اکالی رہنما بھی بخوبی واقف ہیں۔ پھر بھی انھوں نے نہایت موقع بازی سے کام لیکر ایک انتشار انگیز اتحاد شکن اسکیم مرتب کی ہے جسے وہ آزاد پنجاب کہتے ہیں۔

امرتسر اور گرداسپور اور جالندھر ڈویژن کے اضلاع عام طور سے سکھ علاقہ تصور کئے جاتے ہیں ان اضلاع میں مختلف فرقوں کی آبادی کا تناسب حسب ذیل ہے۔

	مسلم	سکھ	ہندو
امرتسر	۳۷	۱۷	۴۰
جالندھر	۴۵	۲۶	۱۸
لدھیانہ	۳۷	۴۱	۲۰
فیروز پور	۴۵	۲۴	۲۰
گرداسپور	۵۰	۱۹	۲۴
ہوشیار پور	۳۷	۱۷	۴۰

اس سے یہ حقیقت اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے کہ ان چھ اضلاع میں کسی فرقہ کو اکثریت حاصل نہیں ہے۔ مسلمان بھی کامل طور سے اکثریت میں نہیں ہیں۔ یہ اضلاع مسلمانوں اور سکھوں کا مشترکہ وطن ہے۔ اس کے علاوہ اقتصادی تہذیبی اور لسانی اعتبار سے بھی کم و بیش یہ ایک متجانس علاقہ ہے۔ اس اعتبار سے اس علاقہ کا پاکستان سے وابستہ ہونا خود سکھ عوام کے حق میں مفید ہے کیونکہ دریائے ستلج اور راوی کے مغرب میں سکھوں کے بڑے بڑے مذہبی مرکز، گردوارے۔ ننکانہ صاحب وغیرہ قائم ہیں۔ اگر اکالی رہنما ان اضلاع کو پاکستان سے علٰحدہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تو سکھ قوم اور اس کی تہذیب و تمدن کے مرکز دو مختلف ریاستوں میں منقسم ہو جائیں گے۔ جو ان کی اقتصادی سیاسی اور تمدنی کمزوری کا موجب ہوگا۔

اکالی رہنما ان تمام حقائق سے واقف ہیں پھر بھی وہ "آزاد پنجاب" کی مانگ پر اصرار کر رہے ہیں۔ پنجاب کے جس حصہ کو انھوں نے آزاد پنجاب سے موسوم کیا ہے اس میں اضلاع امرتسر اور گرداسپور کے علاوہ انبالہ اور جالندھر کے دو ڈویژن بھی شامل ہیں اس "آزاد پنجاب" میں آبادی کا تناسب حسب ذیل ہے۔

مسلمان	۳۴٫۹	فیصدی
سکھ	۱۸٫۵	"
ہندو	۴۴٫۹	"

انبالہ ڈویژن میں سکھوں کی آبادی محض ۵ فیصدی ہے اور جالندھر ڈویژن میں ۲۴ فیصدی۔ لیکن اکالیوں نے "آزاد پنجاب" کی اس طور سے تشکیل کی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی فیصلہ کن اکثریت ختم ہو گئی ہے۔ اکالی اخبارات اور اکالی لیڈروں نے اپنے پروپگنڈے میں بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں

اتحاد یا معمولی تعاون بھی ممکن نہیں ہے۔ یہ دونوں فرقے برابر آپس میں لڑتے رہیں گے۔ اس لئے توازن اور فیصلہ کی قوت ہمیشہ سکھوں کے ہاتھ میں رہے گی۔ اس نئی ریاست کے حکمراں سکھ ہوں گے یہ ایک حقیقت ہے کہ اس "آزاد پنجاب" پر تسلط سکھوں ہی کا ہی ہوگا۔ کیونکہ ان علاقوں کی بہترین زمیں اور زیادہ تر رقبے سکھوں کی ملکیت ہیں۔

انبالہ ایک ہندوستانی خطہ ہے جس کی زبان، تہذیب اور معاشرت دلی اور صوبہ متحدہ سے ملتی جلتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ علاقہ ہندستانی خطہ (صوبہ متحدہ دلی وغیرہ) میں شامل ہو سکتا ہے۔ اس ڈویژن میں اکثریت ہندوؤں کی ہے جسے اکالی اپنی اسکیم کے ذریعہ سے اقلیت میں تبدیل کر دینا چاہتے ہیں۔

جالندھر ڈویژن، امرتسر اور گرداسپور تہذیبی، لسانی اور اقتصادی اعتبار سے مغربی پنجاب کا حصّہ ہے۔ بہ حیثیت خود سکھوں اور مسلمانوں کا مشترکہ دھن ہے۔ اسے علٰحدہ کر دینے سے مسلمان اپنے وطن کے نہایت زرخیز خطہ سے محروم ہو جائیں گے۔ مسلمان ایک بنجر اور غیر آباد پاکستان سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔

"آزاد پنجاب کی اسکیم ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلاف و نزاع کی بنیاد پر مرتب کی گئی تھی۔ اکالی رہنما یہ سمجھ کر آزاد پنجاب کے لئے چیخ رہے تھے کہ ہندو اور مسلمان پاکستان اور حق خود اختیاری کی بنیاد پر متحد نہیں ہو سکتے ہیں۔ اس لئے "برطانوی نوکر شاہی" "آزاد پنجاب" کی حمایت کرے گی" جو خود کوپلینڈ کی اسکیم کے مطابق ہندوستان کی تقسیم کی کوشاں ہے۔ لیکن راجہ فارمولا کے ظہور اور گاندھی جناح ملاقات نے اکالیوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ یہ دیکھ کر کہ پاکستان کی بنیاد ہندو مسلم اتحادی کوششیں کامیاب ہو رہی ہیں۔ اکالیوں نے "آزاد پنجاب" کو ستلج کی گہرائیوں میں غرق کر دیا۔ اور اپنی جھوٹی جنگجو اور نفاق انگیز وطنیت کا ڈھنڈورا پیٹنے لگے۔ سکھ ایک قوم ہیں۔ اس لئے وہ ایک قومی ریاست خالصتان (یعنی سکھستان) کے حقدار ہیں۔ ایک علٰحدہ سکھ ریاست کا مطالبہ دراصل گاندھی جی اور جناح صاحب پر دباؤ ڈال کر ان کی گفتگو سے مصالحت کو ناکام بنانے کی نیت سے کیا گیا تھا جس کی حمایت یونینسٹ جاگیردار اور سکھ راجگان پنجاب کر رہے تھے۔ اکالی یا کسی دوسرے سکھ لیڈر نے کبھی بھی اس کی تشریح نہیں کی کہ خالصتان سرزمین پنجاب کے کسی خطہ میں قائم ہوگا۔ اس مطالبہ کے دیوالیہ پن پر جب خود سکھ دوستی اکالی دل کی صف میں اعتراضات ہونے لگے تو شہزادوں کے اکالی ایجنٹوں نے اپنے پیروں کو مطمئن کرنے کیلئے مرکزی پنجاب کے چند اضلاع اور دیسی سکھ ریاستوں کے الحاق سے ایک متحدہ سکھ ریاست کی تشکیل" کی اسکیم کی تشریح کی۔ یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کی اسکیم ایمری اور کوپلینڈ کے ایجنٹ ہی پیش کر سکتے ہیں جس کی حمایت سکھ عوام اور ان کے محب وطن عناصر نے نہیں بلکہ بلدیو سنگھ اور برطانوی نوکر شاہی کے دوسرے ایجنٹوں نے کی تھی۔

سکھ شہزادگان اور رجعت پسند اکالیوں میں آج بھی یہ رجحان موجود ہے کہ کانگریس لیگ، اتحاد پاکستان اور قومی آزادی کی تحریکوں کو شکست دینے کیلئے ایک رجعت پسند سکھ "قومی" محاذ قائم کریں جس کی منشاء ایک ایسے سکھستان کیلئے جدوجہد کرنا ہے جس میں سکھ شہزادوں اور جاگیرداروں کا تسلط ہو۔ گیانی کرتار سنگھ کا ایک نظریہ (گیانی جی سکھ "حقوق" کے متعلق مختلف اور متضاد تقریباً نصف درجن نظریے رکھتے ہیں) یہ بھی ہے کہ دیسی ریاستیں قائم نہیں رہیں گی۔ اگر اس موقع پر سکھ شہزادوں سے مل کر ایک سکھ ریاست حاصل کر لی جائے تو وہ ریاست آگے چل کر ایک جمہوری ریاست میں تبدیل ہو جائیگی۔ "جمہوری" اور "تبدیلی" یہ دونوں الفاظ ترقی پسند اور محب وطن اکالیوں کی مخالفت کو دبانے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ دراصل یہ کوپلینڈ اسکیم کی حمایت ہے۔

پنجاب کی تقریباً اسّی فیصدی آبادی کسانوں کی ہے جس میں مسلمان اور سکھ دونوں شامل ہیں۔ پنجاب کی تقریباً تمام زرخیز زمین، زمین کے بڑے بڑے رقبے سکھ کسانوں کے قبضہ میں ہیں یعنی امیر اور خوشحال کسان ہیں مسلمان کسان غریب اور زمین سے محروم ہیں۔ ان میں اکثریت غریب کسانوں، کھیت مزدوروں اور زراعتی غلاموں کی ہے شہری بنئے اور مہاجن جو ہندو ہیں یونینسٹ جاگیردار جن میں سکھ اور مسلمان دونوں شامل ہیں، پولیس اور سامراجی نوکر شاہی۔ یہ سب مل کر سکھ اور مسلم کسانوں کا استحصال کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام زراعتی جدوجہد میں سکھ اور مسلم کسانوں نے مل کر اپنے مشترکہ دشمنوں کا مقابلہ کیا ہے اپنی باہمی اقتصادی نابرابری کے باوجود سکھ اور مسلم کسان موجودہ زراعتی نظام

میں ایک مساوی درجہ رکھتے ہیں۔

اس صورت میں سامراج دشمن جدوجہد کے اتحاد کو قائم رکھنے کی غرض سے سکھ کسانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت کمیونسٹ سکھوں کی رہنمائی میں پاکستان اور کانگرس لیگ اتحاد کی حمایت کر رہے ہیں۔ پاکستان کی ماننا اُن کے نزدیک نہ صرف قومی اتحاد قائم کرنے کا ذریعہ ہے جس پر قومی آزادی کا حصول منحصر ہے۔ بلکہ یہ ایک ہمسایہ قوم کا جائز مطالبہ بھی ہے

دوسری طرف سکھوں اور مسلمانوں کا باہمی اختلاف ہے جو تہذیب اور زبان کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پنجاب کے شہری عوام کی زبان اُردو اور دیہاتی عوام کی پنجابی ہے۔ لیکن محض دفتری تعلیمی زبان ہے روزمرّہ کی زندگی میں پنجابی بولی جاتی ہے۔ خود تعلیم یافتہ طبقہ بلا امتیاز مذہب و ملت پنجابی بولتا ہے۔ لیکن خود پنجابی زبان میں یکسانیت اور مماثلت نہیں ہے۔ (۱) دو مختلف رسم خط رائج ہیں۔ سکھ گورمکھی رسم الخط استعمال کرتے ہیں جو ہندی سے کسی قدر مختلف ہے مسلمان اردو رسم الخط استعمال کرتے ہیں وارث شاہ اور دوسرے مسلمان پنجابی ادیبوں کی تصانیف اردو رسم الخط میں شائع ہوتے ہیں (۲) گورمکھی (سکھوں کی پنجابی) پر سنسکرت اور ہندی کا نمایاں اثر ہے۔ علمی زبان کے ہر فقرہ سے یہ اثر پھوٹ پھوٹ کر ظاہر ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی پنجابی پر اُردو، فارسی اور عربی اثر غالب ہے (۳) مسلمانوں کی پنجابی پر اسلامی تہذیب حاوی ہے اور گورمکھی پر روایتی تہذیب کا غلبہ ہے (۴) خود دیہاتی تہذیب دو حصّوں میں تقسیم ہوگئی ہے مغربی پنجاب کے دیہات اور ان کی معاشرت مشرقی پنجاب کے دیہاتوں سے بالکل مختلف ہے یہ فرق گوجرانوالہ، سیالکوٹ، گورداسپور اور جالندھر وغیرہ کے دیہاتوں میں بھی نمایاں ہے اس اختلاف کی بنا پر ترقی پسند سکھوں میں بھی پاکستان سے علٰحدگی کا ایک خیال موجود ہے جسے موقع باز اکالی رہنما اپنے رجعت پسند سیاسی مقاصد کیلئے استعمال کر رہے ہیں۔ سکھوں کے اہل فکر طبقہ کو اس کا شک ہے کہ پاکستان میں سکھ تہذیب یا تمدن کی نشوونما کے پورے مواقع حاصل نہیں ہوں گے ایک ترقی پسند سکھ ادیب سردار گوربخش سنگھ نے جو سکھ مسلم اتحاد اور پاکستان کے زبردست حامی ہیں یہ تک کہا کہ اگرچہ پنجاب میں سکھ تہذیب و تمدن کی ترقی اور نشوونما کا تو کوئی موقع نہیں ہے، لیکن پاکستان پنجاب میں کم از کم اسّی فیصدی مواقع فراہم حاصل ہوں گے مسلم لیگ ہی اس شبہہ کو دور کر سکتی ہے جو ایک پاکستان دوست سکھ محب وطن کے ذہن میں بقیہ بیس فیصدی موقع کے متعلق ہے۔

یہ ایسے شبہات کی بنا پر کمیونسٹ سکھ سردار سوہن سنگھ جوش اور سردار تیجا سنگھ سوتنتر نے سکھ حقوق اور سکھ مسلم اتحاد کے لئے ایک پلیٹ فارم پیش کیا ہے جس پر اس وقت سکھ اور مسلم اخباروں میں بحث ہو رہی ہے جوش اور سوتنتر کی اتحاد پسندی اور پاکستان دوستی پر پنجاب کے لیگی رہنماؤں کو کامل طور سے اعتبار ہے کیونکہ گذشتہ سات ماہ میں جس انہماک سے انھوں نے اکالیوں کی تفرقہ پرداز مخالفت کا مقابلہ اور سکھ عوام میں پاکستان کا پروپگنڈہ کیا ہے اس کا اعتراف پنجاب کے مسلم لیگ نے کسان جلسوں اور اتحادی مہموں میں شرکت اور اسمبلی میں متحدہ کانگرس لیگ سکھ محاذ قائم کر کے کیا ہے۔

اس پلیٹ فارم میں مجملاً سکھ قومی تحریک کے رجحانات کی تشریح کی گئی ہے اور آخر میں سکھ مسئلہ کو حل اور سکھ مسلم اتحاد قائم کرنے کے لئے دو صورتیں پیش کی گئی ہیں جو حسب ذیل ہیں:-

ایک متحدہ پنجاب کی تشکیل جو پاکستان فیڈریشن کا رکن ہوگا جس میں سکھوں کے اقلیتی حقوق محفوظ ہوں گے۔ اقلیتی حقوق کی تشریح کی گئی ہے۔ گورمکھی زبان اور رسم الخط کی ترقی۔ سکھوں کی تعلیم کیلئے گورمکھی کی بنیاد پر جداگانہ اسکول گوردواروں کی مذہبی آزادی یعنی اپنے نظم و نسق میں وہ خود مختار ہوں۔ پارلیمنٹ میں نشستوں کا تحفظ ملازمت میں آبادی کے تناسب سے نمائندگی۔ وزارت میں انکی موثر نمائندگی سکھ مسئلے سکھ نمائندوں کی رائے سے حل ہوں۔

(نوٹ) انبالہ ڈویژن اور کانگڑہ ضلع متحدہ پنجاب میں شامل نہیں ہوگا۔

(۲) جالندھر ڈویژن (فیروزپور، جالندھر، لودھیانہ، ہوشیارپور) اور امرتسر اور گورداسپور کی ایک خودمختار ریاست جو سکھوں اور مسلمانوں کی مشترکہ ریاست تسلیم کی جائیگی اور جو پاکستان فیڈریشن کا رکن ہوگی (اسے پاکستان فیڈریشن سے علٰحدگی کا حق حاصل نہیں ہوگا کیونکہ اس کی حیثیت ایک خودمختار علاقہ (AUTONOMOUS REGION) کی ہوگی۔

کمیونسٹ سکھوں کی اس پلیٹ فارم سے دو غرضیں ہیں (۱) سکھ قوم اس کی بنیاد پر متحد کرنا (۲) سکھ مسلم اتحاد اور کانگرس لیگ اتحاد کے لئے مہم کرنا جس کی بنیاد پاکستان ہے۔

بعد از جنگ تعمیر کا پروگرام محض دھوکہ ہے

از ــــــــ ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو

جنگ کے بعد زندگی کے ہر شعبے کی از سرِ نو تنظیم کے لئے دنیا بھر میں اس وقت بے شمار منصوبے اور اسکیمیں پیش کی جا رہی ہیں۔ اتحادی طاقتیں اپنے اپنے ملک کے عوام سے پے در پے وعدے کر رہی ہیں کہ جنگ کے ختم ہونے کے بعد اُن کی زندگی خوشحال، پُرسکون اور آرام دہ ہوگی۔ صدر روزویلٹ نے عوام سے چار قسم کی آزادیوں کا وعدہ کر رکھا ہے۔ جنگ کے مصائب میں پسے ہوئے عوام کی اخلاقی ہمت اور سکت کو برقرار رکھنے کے لئے تین سال سے اٹلانٹک چارٹر کے اصولوں کا پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ روزویلٹ نے امریکی عوام سے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ جنگ کے بعد بیکاری کا خاتمہ کر کے براعظم امریکہ میں رہنے سہنے کے عام معیار کو بہت بلند کر دیا جائیگا۔ یہ ظاہر ہے کہ ان منصوبوں کو عملی شکل دینے کے لئے امریکہ کو وسیع بازاروں کی ضرورت ہوگی تاکہ وہاں امریکہ کے تیار شدہ مال فروخت ہو سکیں۔ لیکن اتنے وسیع بازاروں کو حاصل کرنے کے لئے امریکہ کو خود اپنی ایک سامراجی پالیسی اختیار کرنی ہوگی جس کے بغیر امریکہ کے مقاصد کا عملی شکل اختیار کرنا محال ہے۔

اس طرح انگلستان میں بیورتج اسکیم کو خوب اُچھالا جا رہا ہے جس کے تحت یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ ہر شہری کو اجتماعی تحفظ حاصل ہوگا۔ اور غربت، بیکاری اور بیماری کی حالت میں حکومت ان کی زندگی اور تحفظ کی ذمہ دار ہوگی۔ ان تعلقات کے تحت برطانیہ کے مزدور کو وہ تمام چیزیں حاصل ہوں گی جن کے لئے وہ سالہا سال سے جدوجہد میں مصروف ہے۔ چونکہ انگلستان اور امریکہ آزاد ملکوں کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے وہاں کی حکومتیں اپنی خواہش کے مطابق سب کچھ کر سکتی ہیں۔ لیکن ہندوستان کی حالت کچھ اور ہی ہے۔ ہندوستان بھی آج جنگ کے بعد آنے والے دنوں کے لئے از سرِ نو تنظیم کی فکر میں مبتلا ہے۔ اس کی اوّلیں ابتدا کانگریس کے نیشنل پلاننگ کمیٹی سے ہوتی ہے۔

لیکن کانگریس جس فضا میں کام کر رہی تھی وہ بالکل مختلف تھی۔ نیشنل پلاننگ کمیٹی اس وقت قائم کی گئی تھی جب کہ ہندوستان کے سات صوبوں میں کانگریسی وزارتیں کام کر رہی تھیں۔ صوبجاتی خودمختاری کے حدود کے اندر ہی کانگریسی وزارتیں اس پوزیشن میں تھیں کہ صنعتی ترقی کو فروغ دینے کے لئے خود اپنی اسکیموں پر عمل کر سکیں۔ اس کمیٹی سے اس بات کا وعدہ کیا گیا تھا کہ تحقیق و تفتیش کے کام میں صوبائی حکومتیں اُن سے پورے پورے طور پر تعاون کریں گی۔ بنگال اور پنجاب کی حکومتوں سے بھی (اگرچہ ان صوبوں کی اسمبلی میں کانگریس مخالف جماعت کی حیثیت رکھتی تھی) نیشنل پلاننگ کمیٹی سے تعاون کا وعدہ کیا تھا۔ غالباً حکومت ہند بھی اس کمیٹی کے تحقیق و تفتیش کے کام میں اعداد و شمار کی فراہمی کے ذریعہ ضرور مدد کرتی۔ پنڈت جواہر لال نہرو اس کمیٹی کے صدر تھے۔ اُن کی قابل اور پُرجوش رہنمائی میں کمیٹی نے ایسے حالات میں اپنے فرائض کی انجام دہی شروع کی جو بہت موافق تھے۔ ملک کی دماغی صلاحیتیں بجوشی اس کام میں لگ چکی تھیں اور مختصر سے عرصہ میں بہت کچھ کر لیا گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد جنگ آدھمکی اور کچھ ایسے سوالات ہمارے سامنے آ کھڑے ہوئے جو بہت بنیادی دوررس اور اہم تھے۔ کانگریسی وزارتیں مستعفی ہوگئیں۔ اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد ملک کے رہنماؤں کو جیل جانا پڑا اور پلاننگ کمیٹی نے اپنا کام بند کر دیا۔

گذشتہ چار سال میں جو کچھ ہوا ہے اُن کو یہاں دُہرانا لاحاصل ہے۔ کانگریس نے پورے ملک کو آزاد کرانے کے لئے مردانہ وار جدوجہد کی ہے اور باوجود اس کے کہ کئی موقعوں پر بظاہر اسے شکست کھا کر پیچھے ہٹنا پڑا ہے لیکن آزادی کے راستہ سے کانگریس نے کبھی قدم پیچھے نہیں ہٹایا اور نہ اپنا جھنڈا نیچا کیا۔ کانگریس اپنے آزادی کے مطالبے پر ثابت قدم ہے۔ کانگریس کے لئے آزادی کا حصول ایک مقصد کی حیثیت رکھتا ہے۔

برطانیہ خوشی سے ہندوستانیوں کو اختیارات سونپنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ برطانیہ نے اس بات کا تہیہ کر لیا ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں کی آزادی کی جدوجہد کو شکست دیکر ہندوستان میں اپنے رفتار کو برقرار رکھو۔ لیکن اب ہندوستان کی آزادی کا سوال سلطنت برطانیہ کا خانگی سوال نہیں رہا امریکہ، روس اور چین

میں اب اسے تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ہندوستان میں برطانیہ کا اقتدار امن عالم کے لئے ایک مسلسل خطرہ کا باعث ہے چنانچہ ہندوستان کا سوال اب ایک عالمگیر مسئلے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور اسے حل کرنے کیلئے دنیا بھر کے مدبرین کو اپنی توجہ صرف کرنی ہے۔ لیکن ہندوستان کی آزادی کے عظیم تر مسئلہ سے لوگوں کے ذہن کو منعطف کرنے کے لئے برطانیہ کی پروپیگنڈا مشین نے ایک نیا طریقہ اختیار کیا ہے۔

سیاسی دنیا میں بار بار یہ کہا جا رہا ہے کہ برطانیہ ہندوستانیوں کے ہاتھ میں اختیار سونپنے پر بالکل رضامند ہے بشرطیکہ ہندوستان والے آپس میں دستور حکومت کے سوال پر باہم متفق ہو جائیں۔ اس موقعہ پر برطانیہ نہایت معصومانہ انداز اختیار کر لیتی ہے کہ بس ہم تو محض ضامن ہیں اور اس ضمانت کے کام سے عاجز آ چکے ہیں لیکن اخلاقاً مجبور ہیں کہ ہندوستانیوں کو آپس میں لڑ کر تباہ و برباد ہونے سے بچائے رکھیں۔ اگر یہ ہندوستانی آپس میں متفق ہو جائیں تو ہم خوشی اور شکریہ کے ساتھ اس ضمانت کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ ہندوستان سے متعلق اسی قسم کے خیالات روس، امریکہ اور مشرق وسطیٰ کے عوام میں پھیلائے جا رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اب خود ہندوستانیوں سے کہا جا رہا ہے کہ ہماری زندگی کے مسائل در اصل سیاسی نہیں بلکہ اقتصادی ہیں اور سیاسی آزادی وغیرہ کے مسئلہ کو بالائے طاق رکھ کر ہمیں ان کاموں میں لگ جانا چاہئے مثلاً عوام کے رہنے سہنے کے معیار کو بلند کرنا ان کی قوت خرید میں اضافہ کرنا، ملک سے امراض کا قلع قمع کرنا، صحت عامہ کو فروغ دینا۔ جہالت دور کرنا اور ہر قسم کی صنعت کو ترقی دینا وغیرہ وغیرہ۔

لارڈ ویول سے لے کر سب سے نچلے درجہ کا سرکاری افسر بھی آج انہیں چیزوں پر زور دے رہا ہے۔

ایک سو پچاس سال تک حکومت برطانیہ نے جس من مانے طور پر اس بدنصیب ملک میں حکومت کی ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے اور آج اس حکومت کے تحت عوام کا جو حال ہے وہ بالکل واضح ہے لیکن پروپیگنڈا کرنے والوں کو اس بات پر بھروسہ ہے کہ عوام کی یادداشت بہت کمزور ہے اور عوام کو آسانی سے دھوکہ دیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ حکومت نے لمبی چوڑی اسکیموں اور تعمیری پروگراموں کا ایک سیلاب بہا رکھا ہے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے تمام شعبے اسکیموں کی تیاری میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے میں مصروف ہیں، ان کی اسکیمیں اتنی مبہم، غیر یقینی اور مبالغہ آمیز ہیں کہ ان کا عملی صورت اختیار کرنا غیر ممکن ہے

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے روپیہ کی قیمت کچھ نہیں رہی ہے چنانچہ ان اسکیموں کے سلسلے میں بڑی بڑی رقمیں زیر بحث ہیں۔ جس طرح کسی زمانہ میں ہزاروں اور لاکھوں کی لا انتہا دولت کا اندازہ لگایا جاتا تھا اسی طرح کروڑ اور ارب کا تو کچھ شمار ہی نہیں۔ کروڑ اور ارب کی وہی اہمیت ہے جو جنگ سے پہلے سو اور ہزار کی تھی۔ لیکن اس کا کسی کو پتہ نہیں کہ یہ رقمیں آئیں گی کہاں سے حکومت برطانیہ تو یہ سوچ کر مطمئن ہے کہ آزادی کے سوال سے لوگوں کے ذہن کو منعطف کرنے کا یہی سب سے بہترین طریقہ ہے۔ یہ بڑی بڑی رقمیں تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کی بے کاری دور کرنے کے لئے صرف کی جائیں گی۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سیاسی احتجاج کو خاموش کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ احتجاج کرنے والوں کو ملازمتیں دے کر خاموش کر دو۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ اگر حکومت کی اسکیموں کا تھوڑا سا حصہ بھی زیر عمل آ گیا تو تعلیم یافتہ طبقے کی بے کاری کا خاتمہ ہو جائے گا پھر حکومت برطانیہ کے نکتۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو ہندوستانی سرکاری افسران وفاداری میں یکتا اور حکومت برطانیہ کی الفت میں سرشار ہیں۔ چنانچہ نئی اسکیموں کے تحت افسروں میں اضافہ کا مطلب یہ ہے کہ وفادار لوگوں کی تعداد میں بھی زبردست اضافہ ہوگا۔ یہ ہیں وہ امیدیں جن کی بنا پر حکومت نئے پلانوں اور اسکیموں کا پروپیگنڈا کر رہی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ ایسی قومی حکومت کی عدم موجودگی میں جسے عوام کی موافقت اور ہمدردی حاصل ہو ان اسکیموں کے عمل میں آنے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ رشوت بازی اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو جائے گا جنگ کے سلسلہ میں گذشتہ چار سال کے اخراجات سے ہر شخص کو اندازہ ہو گیا ہے کہ ٹھیکیدار اور بے ایمان سرکاری افسران کتنے مطلب پرست اور رشوت باز ہوتے ہیں۔ پھر نئی اسکیموں کے تحت اور بھی بڑی بڑی رقمیں لگائی جائیں گی اور انھیں پہلے کی نسبت کہیں زیادہ حرام خوری کا موقع ملے گا۔ موجودہ افسر شاہی نہ صرف یہ کہ احمق اور نا قابل ہے بلکہ اخلاقی اعتبار سے بھی بہت گری ہوئی ہے۔

اب تک تو موجودہ افسر شاہی کی اخلاقی حالت اور قابلیت کے متعلق اختلاف رائے تھا یعنی عوام انھیں نالائق سمجھتے تھے لیکن حکومت ان کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔ لیکن خدا کا فضل ہے کہ خود حکومت ان سے شاکی ہے اور حکومت کو اس بات کا اعتراف کرنا پڑا کہ ملک میں ایک عظیم پیمانہ پر رشوت کا بازار گرم ہے۔ اس کی روک تھام کے لئے حکومت کی تمام کوششیں بے کار ثابت ہوئی ہیں۔ چنانچہ صاف ظاہر ہے کہ از سر نو تنظیم کے کاموں میں موجودہ افسر شاہی پر ہرگز ہرگز اعتبار نہیں کیا جا سکتا اور ان کے ذریعہ ملکی

قومی تنظیم کی اسکیموں کا پایہ تکمیل تک پہنچنا غیر ممکن ہے۔ ان تمام قومی اسکیموں کو عمل میں لانے کے لئے غور و فکر، تخئیل، صلاحیت، جوش و خروش، ارادہ، یکسوئی اور جذبۂ وطنی کی ضرورت ہے، پھر اُن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہے دل و دماغ کی ہم آہنگی اور قومی حکومت کے بغیر اسی چیز کا ہونا غیر ممکن ہے۔

موجودہ افسر شاہی متذکرہ بالا تمام خوبیوں سے یکسر عاری ہے۔ تربیت، تجربہ، جوش و خروش اور عوام کی خدمت کا جذبہ۔ ان تمام چیزوں کا اُن کے اندر کوسوں پتہ نہیں۔ اُن کا مطمح نظر پوزیشن، ترقی، تنخواہ، فرصت اور پنشن تک محدود ہے۔ وہ عوام کے جوش و خروش کو نہیں اُبھار سکتے۔ جس فضا میں اُن کی پرورش ہوئی ہے وہ ملکی اور قومی خدمت کی روایات سے یکسر خالی ہے۔ غیر ملکی مالکوں کی خوشامد کرتے کرتے وہ خود کو عوام کا خادم نہیں بلکہ مالک سمجھتے ہیں۔

میری اپنی رائے یہ ہے کہ جنگ کے بعد کے ان تنظیمی پروگراموں کا بیشتر حصہ خالص پروپگینڈا اور دھوکہ بازی پر مشتمل ہے جو دنیا کو احمق بنانے کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک کو پلان کے مطابق ترقی دینے کی سخت ضرورت ہے اور میں اس کی اہمیت کو پورے پورے طور پر محسوس کرتا ہوں۔ جنگ کے بعد جو دنیا ہوگی اس کی زندگی اور ترقی میں حصہ لینے کے لئے اور ایک باعزت مقام حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کو زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کرنا ضروری ہے۔ لیکن ہندوستان کے لئے ایسا کرنا اُسی وقت ممکن ہے جب اُس کی زندگی کی باگ ڈور خود ہندوستانی لیڈروں کے ہاتھوں میں ہو۔ غیر ملکی حکمراں چاہے کتنی ہی میٹھی آوازیں ہمیں عمل کے لئے سنائیں اُن کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوگی۔

سپرو کمیٹی کی تجاویز

از ——— ادارہ

ہندوستان کے آئندہ دستور حکومت سے متعلق سپرو کمیٹی کی تجاویز میں مندرجہ ذیل خاص باتیں ہیں۔

۱۔ مجلس دستور ساز، مجلس قانون ساز اور مجلس منتظمہ میں ہندوؤں (اچھوتوں کو چھوڑ کر) اور مسلمانوں کو برابر کا درجہ دیا جائے۔ لیکن اس شرط پر کہ مسلمان اتحاد ہند اور مخلوط انتخاب کے اصول پر راضی ہو جائیں۔ ۲۔ ان تجاویز میں پاکستان کی سخت مخالفت کی گئی ہے۔ چنانچہ کوئی صوبہ نہ تو وفاق ہند سے علیحدہ رہنے کا فیصلہ کر سکتا ہے اور نہ ایک بار اس میں شامل ہو کر علیحدگی اختیار کر سکتا ہے۔ (مسٹر ان۔ ایم۔ جوشی نے ان نکات کی مخالفت کی ہے۔ ۳۔ دیسی ریاستوں سے متعلق کمیٹی نے ایک علیحدہ وزیر کے تقرر کی تجویز پیش کی ہے جس کے ساتھ کم سے کم تین ماہرین کی ایک کمیٹی وابستہ ہوگی۔ جو وزیر کو ریاستوں سے متعلق معاملات پر مشورہ دے گی۔ ۴۔ اس کے بعد بنیادی حقوق کے اعلان اور اقلیتوں کے تحفظ کے لئے ایک کمیشن کے تقرر کی تجویزیں ہیں، ساتھ ہی پنجاب میں اقلیتوں سے متعلق خاص تجاویز بھی شامل ہیں۔

یہ تجویزیں محض ایک خاکہ پیش کرتی ہیں اور ان کا تعلق محض برطانوی ہند سے ہے۔ نئی زندگی کے صفحات پر محض وہ حصے شائع کئے گئے ہیں جو بہت اہم ہیں

ادارہ

کمیٹی کی رائے میں مجلس دستور ساز کی تشکیل انہیں اصولوں پر ہونی چاہئے جو کہ ہیں تجاویز کے دفعہ ڈی (D) میں درج ہیں لیکن مندرجہ ذیل رد و بدل کے ساتھ

۱۔ مجلس دستور ساز میں کل ملا کر ایک سو ساٹھ ممبران ہوں گے جو فرقہ وارانہ بنیادوں پر چنے جائیں گے۔ نمائندگی کا یہ طریقہ ہوگا۔

(۱) مخصوص طبقے (تجارت پیشہ، صنعت پیشہ، زمیندار، یونیورسٹی، مزدور طبقہ، عورتیں) ۱۶
(۲) ہندو (اچھوت ذاتوں کو چھوڑ کر) ۵۱
(۳) مسلمان ۵۱
(۴) اچھوت ذاتیں ۲۰
(۵) ہندوستانی عیسائی ۷
(۶) سکھ ۸

(۷) پچھڑے ہوئے علاقے اور قبیلے ۳
(۸) اینگلو انڈین ۲
(۹) یوروپین ۱
(۱۰) دوسری جماعتیں ۱

۲۔ ملک معظم کی طرف سے اعلان ہو کہ دفعہ ڈی (D) کے تحت تمام صوبے مجلس قانون ساز کے ارکان مخلوط طریقہ انتخاب کے ذریعہ جو متناسب طریقہ انتخابات پر مبنی ہو گا دستور ساز اسمبلی کے ارکان کو چنیں گے چنانچہ اسی اصول کے مطابق کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اگرچہ اچھوتوں کو چھوڑ کر بھی ملک کی ہندو اور مسلم آبادی میں بہت فرق ہے پھر بھی ہندوؤں کو چاہئے کہ فراخ دلانہ تعاون کا دستور ساز اسمبلی میں مسلمانوں کو برابر کا درجہ دینے پر راضی ہو جائیں یعنی دستور ساز اسمبلی میں اچھوتوں کو چھوڑ کر ہندو اور مسلمانوں نمائندوں کی تعداد برابر ہو جائے۔

۳۔ جب تک دستور ساز اسمبلی کے وہ ارکان جو وہاں پر موجود ہوں اُن کی تین چوتھائی تعداد کسی فیصلہ کے موافق نہ ہو اس وقت تک وہ فیصلہ آخری اور جائز نہ تسلیم کیا جائے۔

۴۔ ملک معظم کی حکومت اس دستور ساز اسمبلی کے انھیں جائز فیصلوں کی بنیاد پر ہندوستان کے دستور حکومت کی تشکیل کرے۔ لیکن جن معاملات پر تین چوتھائی اکثریت نہ حاصل کی جا سکے گی اُن کے متعلق ملک معظم کی حکومت خود اپنے احکام (AWARDS) پیش کرے

تقسیم ہند کا سوال

کمیٹی نے مندرجہ ذیل چیزوں پر اچھی طرح غور کیا ہے۔
۱۔ لیگ کی تجویز پاکستان جو ۱۹۴۰ء میں لاہور میں پاس کی گئی
۲۔ لیگ کی اور دوسری قرار دادیں۔
۳۔ مسٹر جناح اور مہاتما گاندھی کی گفتگو جو چھپ چکی ہے۔
۴۔ راجگوپال آچاریہ اور گاندھی جی کی تحریریں اور ان پر غور و خوض کے بعد کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی ہے اور اس پر بہت زور دیتی ہے کہ ہندوستان کو دو یا دو سے زیادہ علیحدہ آزاد اور مکمل طور پر خود مختار ریاستوں میں تقسیم کرنا کوئی جواز نہیں رکھتا۔ اس سے پورے ملک کا امن و امان اور پورے ملک کو پُر امن ترقی خطرے میں پڑ جائے گی لیکن کسی فرقہ کو اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ اسلئے ہندوستان کے سیاسی اتحاد کو برقرار رکھا جائے۔

دیسی ریاستیں

ہندوستان کے آئندہ دستور حکومت میں اس بات کا التزام کیا جائے کہ ریاستیں وفاق کی رکن بن سکتی ہیں جن شرائط پر کسی ریاست کو وفاق کی رکن بننے کی اجازت دی جائے گی وہ خود اسی وقت باہمی گفت و شنید اور سمجھوتے سے طے پائیگی۔ لیکن وفاق کے قیام کو ریاستوں کی شمولیت پر مشروط نہ کیا جائے۔ یعنی چاہے ایک بھی ریاست نہ شامل ہو تو بھی وفاق کے قیام اور اس کے عمل میں آنے میں کوئی تاخیر نہ ہونی چاہئے۔

برطانوی ہند کے کسی صوبے کو اس بات کا حق نہ دیا جائے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ ہم ہندوستانی وفاق میں شامل ہونا نہیں چاہتے۔ یعنی برٹش انڈیا کے ہر صوبہ کو لازمی طور پر مجوزہ وفاق کی رکنیت اختیار کرنی پڑے گی۔

کسی صوبہ کو بعد میں وفاق سے علیحدہ ہونے کا بھی حق نہ حاصل ہوگا۔ اسی طرح کوئی ریاست وفاق میں ایک بار شامل ہونے کے بعد دوبارہ اس سے علیحدگی نہیں اختیار کر سکتی۔

صوبوں کی تقسیم

لسانی یا تہذیبی بنیادوں پر صوبوں کا تعین اور تقسیم ضروری ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ نئے دستور حکومت کا نفاذ اس کام کے مکمل ہونے پر اُٹھا رکھا جائے دستور حکومت کے ذریعہ اس کام کی انجام دہی کے لئے کسی کمیٹی کا تعین عمل میں آنا ضروری ہے اور اس کے ساتھ ہی اس طریقہ عمل (PROCEDURE) کا بھی تعین ہو جائے جس کے مطابق دستور حکومت کے نفاذ میں آجانے کے بعد پُرانے صوبوں کی تقسیم اور ان کے صوبوں کی تشکیل عمل میں آئے گی۔ اگر صوبوں کی تقسیم و تشکیل کی وجہ سے دستور حکومت میں کسی ترمیم و تنسیخ کی ضرورت پیش آئے تو اس کا کر دینا ضروری ہے۔

وفاق کا صدر (HEAD OF THE STATE) کون ہوگا؟

اس مسئلہ سے متعلق یہ کمیٹی کچھ تجویزیں دستور ساز اسمبلی کے غور و خوض

۱؎ یعنی ملک میں مختلف سیاسی جماعتوں کو اپنی اپنی کیا طاقت ہے اسی کی مناسبت سے۔

کے لئے پیش کرتی ہے۔ یہ تجویزیں کمیٹی ہی کے ایک ایسے رکن کی پیش کردہ ہیں جسے دیسی ریاستوں کے نظمی امور کا زبردست تجربہ حاصل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ریاستوں کے سلسلے میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے اطلاق اور اُس کے عمل میں آنے سے متعلق بھی تجربات حاصل ہیں۔ چونکہ اس کمیٹی میں ایسی ریاستوں کا کوئی نمائندہ نہیں ہے اور متذکرہ بالا تجویزیں بہت ضروری اور دور رس اہمیت کی مالک ہیں اس لئے اس کے علاوہ جو تجویزیں پیش کی گئی ہیں ان پر اظہار خیال کرنا ضروری نہیں سمجھتی ہے۔ وفاق کے صدر کا ہونا ضروری ہے۔ کمیٹی نے کچھ ایسی قراردادیں منظور کی ہیں جن میں اس پر زور دیا گیا ہے۔ یہ قراردادیں وفاق کے صدر کے وجود کو فرض کرتی ہوئی اس کے اختیارات اور امور سے بحث کرتی ہیں۔ کمیٹی کے جس رکن نے اس مسئلہ سے متعلق تجویزیں پیش کی ہیں اس کا خیال ہے کہ اس قسم کی تجویزوں یا اسی قسم کی دوسری تجویزوں میں اگر دیسی ریاستوں کی شمولیت کا سوال پیدا ہو تو وہ اس وقت نہ پاس کی جائیں جب تک دیسی ریاستیں اپنی رضامندی کا اظہار نہ کریں۔

۱۔ ہندوستانی وفاق کا ایک صدر ہوگا جس کے ہاتھوں میں اس قسم کے اختیارات اور فرائض ہوں گے جو دستور حکومت اُن کو عطا اور ان پر عاید کریگا۔ اس کے علاوہ اس کے ہاتھوں میں وہ بھی اختیارات ہونگے جو اس وقت ملک معظم کے ہاتھوں میں ہیں جن میں وہ اختیارات بھی شامل ہیں جن کا تعلق تاج برطانیہ اور دیسی ریاستوں کے باہمی امور سے ہے۔ لیکن یہ اختیارات اس شرط پر ہندوستانی وفاق کے صدر کو سونپے جائیں گے کہ وہ اُن کو زیر عمل لانے کے سلسلے میں اُن روایات رسوم و رواج اور قاعدوں کی پابندی کرے گا جو ہر سلطنت کے تسلیم شدہ صدر کے لئے لازمی ہوتے ہیں۔

۲۔ ریاست کا صدر پانچ سال تک اپنے عہدے پر فائز رہے گا اور عام طور سے یہ قاعدہ رکھا جائے گا کہ ایک آدمی ایک مرتبہ سے زیادہ صدر نہیں ہوگا۔

پہلا نعم البدل

وفاق کی مجلس قانون ساز دونوں ایوانوں کے تمام ارکان مل کر صدر کا انتخاب کریں گے۔ انتخاب کے سلسلے میں دو صورتیں ہیں یا تو انتخاب کنندگان پر کوئی پابندی نہ عائد کی جائے یعنی وہ جس شخص کو بھی مناسب سمجھیں صدر چن لیں، یا یہ پابندی عائد کی جائے کہ وہ صرف والیان ریاست میں سے کسی کو صدر چن سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ضرور ۔ ۔ ۔ دستور حکومت کے ذریعہ اس بات کا یقین ہو جائے کہ کم سے کم کسی آبادی۔ اور کتنی سالانہ آمدنی والی ریاست کا حکمران خود کو صدارت کا حقدار قرار دے سکتا ہے۔

دوسرا نعم البدل

ہندوستانی وفاق کے صدر کا انتخاب متذکرہ بالا والیان ریاست کریں گے۔ اور خود والیان ریاست میں سے۔

تیسرا نعم البدل

ہندوستانی وفاق کے صدر کا انتخاب کا کام ملک معظم شاہ انگلستان کے سپرد کیا جائے اور وہ اس کام کو ہندوستانی وفاق کی مجلس وزرا کے رائے مشورہ سے انجام دیں گے۔ کس آدمی کو صدر بنایا جائے اس سلسلے میں یا تو ملک معظم پر کوئی پابندی نہ عائد کی جائے یا یہ پابندی رکھی جائے کہ وہ صرف والیان ریاست ہی میں سے کسی کو صدر بنا سکتے ہیں۔

اگر تیسرا نعم البدل اختیار کیا جائے گا اور تاج برطانیہ سے ہندوستان کا تعلق برقرار رکھا جائے گا تو ایسی صورت میں سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا (ناظم ریاست ہند) کا عہدہ ختم کر دینا ضروری ہے اور اس کے ساتھ ان تمام اختیارات کا ختم ہو جانا بھی ضروری ہے جو ناظم ریاست ہند یا برطانوی مجلس وزرا کو ہندوستان کے امور سلطنت پر حاصل ہیں۔

وفاق میں شامل صوبوں (دیسی ریاستیں نہیں) کے صدر کے تقرر کا اختیار پورے وفاق کے صدر کے ہاتھوں میں ہوگا اور وہ یہ اختیار وفاق کی مجلس وزراء کے رائے مشورہ سے عمل میں لائے گا۔

وفاق ہند کی مجلس قانون ساز

۱۔ وفاق کی مجلس قانون ساز کے تین حصے ہوں گے۔

(۱) صدر وفاق (۲) اسمبلی (۳) کونسل آف اسٹیٹ

۲۔ اسمبلی کے ارکان کی تعداد کے تعین میں "دس لاکھ آدمیوں میں ایک نمائندہ" کے اصول پر عمل کیا جائے گا۔

۳۔ نشستوں کی مجموعی تعداد کا دس فی صدی حصہ مندرجہ ذیل طبقوں کے نمائندوں کے لئے مخصوص رہے گا

زمینداران۔ تجارت پیشہ اور صنعت پیشہ لوگ، مزدور طبقہ۔ عورتیں۔

۴۔ بقیہ نشستیں مندرجہ ذیل فرقوں میں تقسیم کردی جائینگی۔

ہندو۔ (اچھوتوں کو چھوڑ کر)

مسلمان

سکھ

ہندوستانی عیسائی

دوسرے فرقے

۵۔ اگر مسلم فرقہ علیحدہ فرقہ وارانہ نشستوں کے ساتھ مخلوط انتخاب پر راضی ہوجائے تو ہندوؤں کو چاہیئے کہ وہ قومی اتحاد کی خاطر وفاق کی مرکزی اسمبلی میں برعائتی ہندو مسلمان نمائندوں کو برابر تعداد میں نشستیں دینے پر راضی ہوجائیں لیکن ان نشستوں کو چھوڑ کر جو مذکرہ بالا مخصوص طبقوں (زمیندار، تجارت پیشہ وغیرہ) کے لئے وقف ہیں۔ اس سلسلے میں ہندوؤں سے مراد ہے اچھوت ذاتوں کو چھوڑ کر۔ لیکن اگر مسلمان اس پر راضی نہ ہوں تو ہندو اگر چاہیں تو مسلمانوں کو برابر تعداد میں نشستیں دینے سے انکار کرسکتے ہیں۔ اس کے ساتھ اگر وہ چاہیں تو کیونل اوارڈ پر نظر ثانی کا مطالبہ بھی کرسکتے ہیں۔

کمیٹی اس بات پر زور دینا چاہتی ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں اچھوت ذاتوں اور سکھوں کو جس تعداد میں نشستیں عطا کی گئی ہیں وہ اکائی ہیں اور ... پر مبنی ہیں اس لئے ان کو زیادہ نشستیں ملنی چاہئیں اور ... کے تعین کا اختیار مجلس دستور ساز کو عطا کیا جائے۔

۶۔ مرکزی اسمبلی کی وہ نشستیں جو مخصوص طبقوں کے لئے وقف ہیں ان کو چھوڑ کر تمام ... کے انتخابات میں ہر بالغ کو ووٹ دینے کا حق ہوگا۔

۷۔ وہ نشستیں جو مخصوص طبقوں کے لئے وقف ہیں خاص خاص انتخابی حلقے ... بنائے جائیں گے وفاق کی اسمبلی کے نمائندے براہ راست انتخاب کے ذریعے چنے جائیں گے۔ کونسل آف اسٹیٹ کا انتخاب کس طرح عمل میں آئے گا اس کا تعین مجلس دستور ساز کے ذریعے عمل میں آئے گا۔

اختیارات کی تقسیم

(DISTRIBUTION OF POWERS)

دستور حکومت میں یہ درج ہوگا کہ امن و امان قائم رکھنے اور اعلیٰ تنظیم برقرار رکھنے اور قانون بنانے اور ان پر عملدرآمد کرنے کے سلسلے میں کون کون اختیارات مرکزی حکومت کے تحت ہیں اور کون کون سے صوبائی حکومتوں کے تحت۔ اس سلسلے میں دستور اسمبلی اگر مندرجہ ذیل اصولوں پر عمل کرے تو اچھا ہے۔

(۱)۔ مرکزی حکومت کو جتنا ممکن ہوسکے کم اختیارات دئے جائیں لیکن مرکزی حکومت کو مندرجہ ذیل معاملات میں اختیارات ضرور دئے جائیں ایسے معاملات جن کا تعلق پورے ہندوستان سے ہے مثلاً امور خارجہ، دیسی ریاستوں سے ملکی تحفظ کے سلسلے میں کیا تعلقات ہوں گے۔ صوبوں کے درمیان ذرائع رسل و رسائل، تجارت، محصولات، سکہ، ڈاک اور تار۔ صوبوں کے باہمی مناقشات، مختلف صوبوں میں امور تنظیم اور قانون سازی سے متعلق امور کے درمیان باہمی ربط و انحصار قائم کرنا۔ ہندوستان کے کسی حصہ کے امن و اماں اور تحفظ کے معاملات، یا ہندوستان کی سیاسی وحدت اور اقتصادی اتحاد کو برقرار رکھنا یا کسی نازک صورت حال کا مقابلہ کرنا۔

(۲) وہ تمام اختیارات جو ان اختیارات کے علاوہ ہیں جو مرکزی حکومت کو پورے طور پر یا مشترکہ طور پر عطا کئے گئے ہیں، صوبوں کو عطا کئے جائیں گے اور اُن کی ایک فہرست تیار کی جائے گی جو دستور حکومت میں شامل رہے گی۔ اس کے علاوہ دستور حکومت میں یہ بھی درج ہوگا کہ وہ اختیارات جو نہ مرکزی حکومت کے اختیارات کی فہرست میں شامل ہیں اور نہ صوبائی حکومتوں کے اختیارات کی فہرست میں وہ صوبائی حکومتوں کے تحت سمجھے جائیں۔

(۳) صوبوں کے درمیان تجارتی محصولات کی دیواریں توڑدی جائینگی اور پورے وفاق کے اندر تجارت کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ حائل ہوگی لیکن اگر اس سے کسی صوبہ کے مالیات کو نقصان پہنچیگا تو اس کے بدلے میں مرکزی حکومت اس کی مالی امداد کرے گی۔

وفاق کا شعبۂ منتظمہ

(EXECUTIVE)

۱۔ وفاق کی مجلس منتظمہ میں مندرجہ ذیل فرقوں کے نمائندے شامل ہوں گے۔

(۱) ہندو (اچھوت ذاتوں کو چھوڑ کر)

(۲) مسلمان

(۳) اچھوت ذاتیں

(۴) سکھ

(۵) ہندوستانی عیسائی۔

(۶) اینگلو انڈین

۲۔ مجلس منتظمہ میں فرقہ وارانہ تناسب وہی ہوگا جو مجلس قانون ساز کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔

۳۔ اگر کوئی پورا فرقہ مجلس منتظمہ میں عارضی طور پر اپنے نمائندے بھیجنے سے انکار کردے تو بھی مجلس منتظمہ کی تشکیل مکمل سمجھی جائے گی اور وہ بدستور امور سلطنت انجام دیتی رہے گی بشرطیکہ ایسی مجلس منتظمہ کو مجلس قانون ساز میں اکثریت حاصل ہو۔ ایسی صورت میں خالی جگہوں پر دوسرے فرقوں کے لوگوں کا تقرر عمل میں آئے گا۔

۴۔ مجلس منتظمہ، اجتماعی حیثیت سے مجلس قانون ساز کے سامنے امور سلطنت کے لئے ذمہ دار ہوگی۔

۵۔ وزیر اعظم کے ذمہ مجلس قانون ساز کی رہنمائی اور اس کو مجتمع رکھنے کے امور ہوں گے۔ عام طور سے یہ وزیر اعظم ایک ایسی جماعت کا لیڈر ہوگا جو اکیلی یا دوسری جماعت کی مدد سے مجلس قانون ساز میں ایک پائدار اکثریت کی مالک ہوگی۔ اس قسم کا ایک غیر تحریری دستوری رواج (CONVENTION) وجود میں لایا جائے کہ وزیر اعظم اور نائب وزیر اعظم کے عہدے ہمیشہ کسی ایک فرقے کے ہاتھوں میں نہ رہیں۔

۶۔ مجلس وزراء کے دوسرے ممبران وزیر اعظم کے رائے مشورے سے مقرر کئے جائیں۔

۷۔ ان وزراء میں سے ایک نائب وزیر اعظم کہلائے گا اور یہ قاعدہ رکھا جائیگا کہ وزیر اعظم اور نائب وزیر اعظم دونوں ایک ہی فرقے کے نہ ہوں۔

نعم البدل

یہاں تمام وہی باتیں ہیں صرف مندرجہ ذیل تجویزوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔

مرکزی مجلس قانون ساز کے دونوں ایوان مخلوط نشستوں میں مجلس وزراء کا انتخاب کرینگے۔ ہر رکن کو صرف ایک ووٹ دینے کا حق ہوگا۔ منتخب شدہ وزراء اس وقت تک اپنے عہدوں پر قائم رہیں گے جب تک مجلس قانون ساز کا دوسرا الیکشن نہیں ہوتا۔ وزراء میں سے مجلس قانون ساز اپنے صدر اور نائب صدر کا انتخاب کرے گی۔ یہ دونوں عہدے کسی ایک ہی فرقے کے نمائندوں کے پاس نہ ہوں گے۔

دیسی ریاستوں کے وزراء

مجلس وزراء کا ایک رکن ان امور کا ذمہ دار بنایا جائے گا جن کا تعلق دیسی ریاستوں سے ہوگا۔ اس وزیر کے ماتحت کم سے کم تین اور زیادہ سے زیادہ پانچ اشخاص کی ایک کمیٹی ہوگی جو ان امور پر وزیر کو مشورے دے گی۔ ان اشخاص کا طریقۂ انتخاب ریاستوں کی رضامندی سے طے پائے گا۔ وزیر ریاستوں سے متعلق تمام اہم معاملات پر اس کمیٹی سے مشورہ لے گا اور کچھ ایسے معاملات پر اس کمیٹی کی رضامندی سے فیصلہ کرے گا جو دستور حکومت میں درج ہوں گے۔

ملازمتوں میں فرقہ وارانہ تناسب

جب تک نئے دستور حکومت کے تحت وفاق کی باقاعدہ تشکیل نہ ہو جائے اس وقت تک ملازمتوں کے سلسلے میں مرکزی حکومت کے موجودہ طریقوں پر کاربند رہنا ضروری ہے لیکن کمیٹی کی رائے ہے کہ ۸ $\frac{۱}{۳}$ فی صدی نشستیں آج کل جو سکھوں، ہندوستانی عیسائیوں اور اینگلو انڈین اور پارسیوں کے لئے وقف ہیں ان کی مندرجہ ذیل اصول پر تقسیم ہونی چاہئے۔

(۱) سکھ	۳ $\frac{۱}{۲}$ فی صدی
(۲) ہندوستانی عیسائی	۳ فی صدی
(۳) اینگلو انڈین اور پارسی	۱ $\frac{۵}{۶}$ فی صدی

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے دفعہ نمبر ۲۴۲ کے مطابق کچھ ملازمتوں میں اینگلو انڈین فرقہ کے لئے جو خاص انتظامات ہیں وہ بدستور برقرار رکھے جائیں۔

بنیادی حقوق کا سوال

ہندوستان کے آئندہ دستور حکومت میں بنیادی حقوق کی ایک جامع فہرست کا شامل رہنا ضروری ہے۔ جن میں مندرجہ ذیل حقوق اور آزادیاں دی گئی ہوں (۱) انفرادی آزادی (۲) انجمنیں قائم کرنے اور تحریر و تقریر کی آزادی (۳) پیدائش، مذہب، رنگ، ذات اور عقیدے کا امتیاز کئے بغیر تمام افراد کے شہری حقوق میں مساوات کا برتاؤ (۴) مکمل مذہبی آزادی جس میں یہ بھی شامل ہو کہ کسی کے مذہبی عقائد اور عمل اور مذہبی اداروں کے ساتھ مداخلت نہ کی جائے (۵) تمام فرقوں کی زبان اور تہذیب کا تحفظ کیا جائے۔ اقلیتوں اور اچھوت ذاتوں کی سب کمیٹیوں کے رپورٹ کے مطابق اچھوت ذاتوں کے خلاف تمام پرانے رسوم و رواج کو منسوخ کر دیا جائے جب نیا دستور حکومت تشکیل پانے لگے تو ان حقوق اور آزادیوں کی مکمل

اور با تفصیل فہرست تیار کرنے کے لئے ماہرین کی ایک خاص کمیٹی مقرر کی جائے۔

اقلیتوں کے کمیشن کا تقرر

دستور حکومت کی رو سے مرکز اور صوبوں میں ایک "اقلیت کمیشن" کا تقرر عمل میں آئے گا جس کی حیثیت ... کمیشن میں ہر فرقہ کا ایک نمائندہ شامل ہوگا جس کے نمائندے ... موجود ہیں۔ ایکن کوئی ... اقلیت ... فرقہ کا ایک فرد ہو جس کی وہ نمائندگی کرتا ہے اقلیت ... سے ارکان کا انتخاب یوں عمل میں آئے گا کہ ہر فرقے کے وہ نمائندے جو مجلس قانون ساز میں ممبر ہیں ماہرین کسی شخص کو ووٹ کے ذریعہ چن لیں گے اور وہ شخص اقلیت کمیشن میں اس فرقے کی نمائندگی کرے گا لیکن مجلس قانون ساز کا کوئی ممبر اقلیت کمیشن کا رکن نہیں ہو سکتا۔ اس کمیشن کی مدت حیات وہی ہوگی جو مجلس قانون ساز کی۔ اس کمیشن کا کام یہ ہوگا کہ وہ اپنے مخصوص علاقے میں اقلیتوں کے مفادات پر نظر رکھے کہ آیا وہ خطرے میں تو نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں کمیشن ... تو حکومت سے ضروری اطلاعات طلب کر سکتی ہے ... (مثلاً ... عرصہ میں ایک بار) یہ کمیشن اس ... کرے کہ مجلس منتظمہ یا مجلس قانون ساز نے کوئی ایسا قدم ... اٹھایا جس سے اقلیتوں ... دستور حکومت کے عطا کردہ مبادی حقوق ... خطرے میں پڑ جانے کا ... اس معاملہ کے بعد ...

کی رپورٹ پیش کرے گی جب مجلس وزراء اس رپورٹ پر غور و خوض کرے گی تو یہ رپورٹ مجلس قانون ساز کے سامنے پیش کی جائیگی۔

یہ کمیٹی یہ خواہش ظاہر کرتی ہے کہ پنجاب کی مجلس قانون ساز میں سکھوں، ہندوؤں اور ہندوستانی عیسائیوں کی جو نمائندگی ہے اس پر مجلس دستور ساز اچھی طرح غور و خوض کرے۔

ملک سے اپیل

کمیٹی کا خیال ہے کہ مندرجہ بالا تجویزوں میں جن اصولوں کو پیش کیا گیا ہے ان کی اساس پر ہندوستان میں ایک منصفانہ اور پائدار سیاسی سمجھوتہ بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ یہ کمیٹی تمام اقلیتوں اور جماعتوں سے گزارش کرتی ہے کہ وہ ان تجاویز کو قبول کر لیں۔ یہ کمیٹی ان صوبوں کی اکثریت والی سیاسی جماعتوں سے خاص طور پر گزارش کرتی ہے جن پر اس وقت گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کا دفعہ ۹۳ نافذ ہے کہ اب وہ حکومت کی ذمہ داریاں اپنے سر لینے پر راضی ہو جائیں۔ اگر ملک کے فرقے اور سیاسی جماعتیں ان تجاویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیں اور کسی اور سمجھوتہ پر راضی نہ ہوں تو یہ کمیٹی ملک معظم کی حکومت سے گزارش کرتی ہے کہ وہ ہندوستان میں ایک عارضی حکومت قائم کرنے کے بعد اور مندرجہ بالا اصولوں کی بنیاد پر ایک نئے دستور حکومت کی تشکیل کیلئے ایک مجلس دستور ساز وجود میں لائے۔ اور جب یہ نیا دستور حکومت مرتب ہو جائے تو اسے پارلیمنٹ میں پاس کرنے کے بعد جلد از جلد نافذ کرے۔

سرحد میں کانگریسی وزارت کا قیام

اُردو اخبارات کی موافقانہ اور مخالفانہ رائیں :—

قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں سات صوبوں کی کانگریسی وزارتیں مجلس عاملہ کے فیصلہ کے مطابق اس بنا پر مستعفی ہوئی تھیں کہ برطانیہ نے اپنے مقاصد جنگ کا اعلان نہیں کیا۔ ہندوستان کو آزادی دینے کا وعدہ کرنے پر تیار ہوئی۔

لیکن مارچ ۱۹۴۵ء کے وسط میں اچانک سرحد اسمبلی کی کانگریس پارٹی نے گاندھی جی کے مشورے سے مسلم لیگی ... جو دو سال سے اپنی کمی تعداد اور غیر نمایندہ پوزیشن کے باوجود کانگریس کی خاموشی اور گورنر کی عنایت کی وجہ سے ... سرحد میں کانگریس نے وزارت قبول بھی کر لی۔ اگرچہ ابتک قبول وزارت کا یہ واقعہ تنہا اور انفرادی ہی ہے اور یہ توقع بہت کم ہے کہ مستقبل قریب میں کانگریس اور صوبوں میں بھی وزارتیں قائم کرے گی جیسا کہ گاندھی جی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ واقعہ کافی اہم ہے۔

ذیل میں ہم چند اردو اخبارات کی موافقانہ اور مخالفانہ رایوں کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

"ایڈیٹر"

روزنامہ "تیج" دہلی

روزنامہ "تیج" دہلی ۱۷ مارچ کی اشاعت میں لکھتا ہے :—

چھ برس تک ویرانی میں رہنے کے بعد کم سے کم ایک صوبہ میں کانگریس نے پھر نظم و نسق کی باگ ڈور سنبھال لی ہے۔ ملک کی سیاسیات میں ۱۹۴۲ء سے جو انتشار پھیلی ہوئی ہے اس میں یہ پہلی امید افزا علامت پیدا ہوئی ہے۔ لیگی وزیر اعظم سردار اورنگ زیب خاں نے اپنی وزارت کی شکست کے بعد نہایت معقولیت سے کہا کہ صوبہ میں گورنر کا راج نہیں ہونا چاہئے۔ چاہے کوئی بھی پارٹی حکومت کی باگ ڈور سنبھال لے۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ سرحد کے لیگی وزیر اعظم کا ریکارڈ جماعتی یا شخصی ہر اعتبار سے دوسرے صوبوں خاص کر سندھ کے لیگی وزیر اعظم سے بہتر رہا۔ لیکن ایک بات جو سب لیگی اور نیم لیگی وزارتوں میں مشترکہ ہے یہ ہے کہ انھوں نے اسمبلی میں اپنی اکثریت کو آنچ سے محفوظ رکھنے کے لئے کانگریسی ممبروں کو نظر بند رکھنا یا رہائی کے بعد ان پر پابندی لگانا مناسب سمجھا۔ سندھ۔ آسام اور سرحد میں ہی نہیں پنجاب میں بھی جہاں کی وزارت شوکت حیات کے سانحہ سے پہلے نیم لیگی ضرور تھی یہی دستور روا رکھا گیا۔ سرحد میں غالباً چار یا پانچ کانگریسی ممبر اب بھی جیل میں بند ہیں۔ اگر انھیں بلا سماعت و ثبوت جرم محض سیاسی مصلحت سے نظر بند کیا جاتا تو سردار اورنگ زیب کو اب سے کہیں پہلے وزارتی کرسی چھوڑنی پڑتی گورنر کا راج پڑا ہے۔ مگر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ڈیفنس آف انڈیا رولز کے سہارے کسی وزارت کا برسر اقتدار رہنا اس سے بھی بد تر ہے کیونکہ یہ پہلے درجہ کی سیاسی بددیانتی اور اخلاقی پستی ہے۔

سرحد میں کانگریسی وزارت کی بحالی اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ باوجود احساسِ ... مجبوری ویرانی میں رہنے کے اور سرکاری کے زبردست پروپیگنڈا کے باوجود کانگریس کی ہردلعزیزی اور طاقت کم نہیں ہوئی بلکہ بڑھ گئی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ جن صوبوں میں گورنروں کا راج ہے اگر وہاں موقعہ دیا جائے تو کانگریس کی وزارتیں نہایت آسانی سے بحال ہو سکتی ہیں۔

روزنامہ "اجمل" بمبئی

روزنامہ "اجمل" بمبئی ۱۴ مارچ کی اشاعت میں لکھتا ہے :—

صوبہ سرحد میں لیگی وزارت کی شکست مسلم لیگ کے وقار کے لئے ایک کاری ضرب ہے اس لئے کہ سرحد اسمبلی میں بنگال یا پنجاب کی طرح غیر مسلم ممبران کی کافی تعداد نہیں ہے اور اسی لئے مسلم لیگی حضرات کے لئے یہ کہنا ناممکن ہے کہ "ہندوؤں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے مضبوط وزارتیں قائم نہیں کی جا سکتیں"۔ سرحد ایک خالص اسلامی صوبہ ہے اس لئے جس طرح صوبہ اڑیسہ میں مسلمان وزارت کو کسی طرح تنگ نہیں پہونچا سکتے اسی طرح صوبہ سرحد میں ہندو بھی وزارت کا سفینہ غرق کرنے کی بات نہیں کر سکتے وہاں لیگی وزارت کو خود مسلمانوں کے ہاتھوں شکست اٹھانا پڑی ہے اور یہ ایک ایسا ناقابل ذکر واقعہ ہے جسے لیگی رہنما کسی طرح دنیا کی نگاہوں سے

نہیں چھپا سکتے!

پھر ایک چیز اور
دو سال تک صوبہ سرحد میں لیگی وزارت باقی رہی اگر یہ وزارت عوام میں ہردلعزیزی حاصل کرلیتی یا ایسے امور عمل میں لاتی جن کی وجہ سے عوام میں اسکا اثر و رسوخ قائم ہوجاتا تو کانگریس پارٹی کے مسلم اراکین کے لئے اس وزارت کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کرنا کچھ آسان نہ ہوتا۔ بنگال میں یہ بھی ہوچکا ہے۔ مسٹر فضل الحق نے جب مسلم لیگ سے علیحدہ ہوکر وزارت بنائی تو مسلم عوام میں چونکہ لیگ کا اثر و نفوذ تھا اس لئے یہ وزارت چند ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہ سکی۔ اور اس دوران میں کلکتہ نیز دوسرے مقامات پر وزارت کے خلاف اتنے مظاہرے کئے گئے کہ وزارت کے قدم ڈگمگا گئے پھر اسمبلی کے جلسوں کے دوران میں مسٹر فضل الحق کے خلاف کلکتہ کے مسلمانوں نے اتنے مظاہرے کئے کہ ان کی مقبولیت کا جڑی جلد تک خاتمہ ہوگیا اور ان کے بہت سے مسلمان ساتھیوں کو مجبوراً ان کا ساتھ چھوڑ دینا پڑا۔ مگر سرحد میں ہم اس کے بالکل برعکس چیزیں دیکھ رہے ہیں وزارت کی حمایت میں مسلمانان صوبہ سرحد نے کوئی مظاہرہ وغیرہ نہیں کیا۔ ایک مظاہرہ ہوا بھی تو وہ وزارت کے خلاف تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانان سرحد موجودہ وزارت سے تنگ آچکے ہیں اور کانگریس پارٹی نے اس وزارت کو توڑ کے حقیقی معنوں میں جمہور کی ترجمانی کا حق ادا کیا ہے۔

روزنامہ "ملاپ" لاہور

ملاپ لاہور ۱۲ مارچ کی اشاعت میں لکھتا ہے۔

سرحد میں آج صوبائی انقلاب ہوا۔ لیکن صوبائی ہوتے ہوئے بھی اس انقلاب کی ایک آل انڈیا اہمیت ہے۔ جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سرحد کے اس انقلاب نے ثابت کیا کہ ۱۹۳۹ء میں کانگریس کی جو پالیسی تھی وہ آج نہیں ہے۔ ۱۹۳۹ء کی پالیسی درست تھی یا غلط۔ اس پر بحث کرنے کی آج ضرورت نہیں۔ کانگریس میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اس پالیسی کو درست سمجھتے تھے اور ایسے بھی جو اسے نادرست خیال کرتے تھے۔ لیکن اس وقت درست کیا تھا اور غلط کیا۔ اس پر بحث کئے بغیر موجودہ حالت کو دیکھئے تو سرحد کے انقلاب کے پیش نظر تسلیم کرنا ہوگا کہ کانگریس کی پالیسی بدل چکی ہے کچھ لوگ اس تبدیلی کو کانگرس کی کمزوری سمجھتے ہیں۔ میرا احساس ہے کہ یہ کمزوری نہیں بلکہ کانگرس کی طاقت کا ثبوت ہے۔ سیاست مذہب نہیں ہے کہ جس راستے پر آدمی ایک بار چل پڑے۔ اسی پر چلتا چلا جائے۔ ایک راستے کو ایک بار اختیار کرکے اسی پر چلتا جانا سیاست کی دنیا میں احمق پن ہے سیاستداں کا مقصد اپنی منزل پر پہنچنا ہے۔ اس کے لئے وہ مختلف راستوں کو اختیار کرسکتا ہے اور پہلے ترک کئے ہوئے راستوں پر دوبارہ چل بھی سکتا ہے لیکن اس بحث کو بھی نظر انداز کردیجئے تو اس بات سے انکار نہیں ہوسکتا کہ کانگرس کی پالیسی بدل چکی ہے۔ ۱۹۳۹ء کی پالیسی کے بدلنے کا ثبوت سرحد کا انقلاب ہے اور ۱۹۴۲ء کی پالیسی کے بدلنے کا ثبوت گاندھی جی کی تقریریں اعلان کا وہ طرز عمل ہے۔ جو انھوں نے رہائی کے بعد اختیار رکھا۔ گاندھی جی کے بعد اس ملک میں متعدد کانگریسی نیتا رہا ہوئے۔ ان کے رہا ہونے سے ملک نے تاثی اور چین کا سانس لیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے دل پر جو بھاری بوجھ پڑا تھا۔ اس میں کمی ہوگئی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ تو اور کچھ نہیں ہوا گاندھی جی کے متعلق مسٹر ایمری اور چرچل نے جو لغو اور بیہودہ باتیں کہی تھیں وہ تو کہیں بھی ظاہر نہیں ہوئیں۔ ملک میں کوئی مسلح بغاوت نہیں ہوئی۔ کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ کوئی آسمان نہیں ٹوٹا۔ تب بھی کانگرس ورکنگ کمیٹی کے ممبر اور دوسرے کانگریسی نیتا اور ورکر اب تک جیلوں میں ہیں۔ تب بھی کانگرس پر وہ پابندیاں موجود ہیں۔ جن کی موجودگی کسی بھی جمہوریت پسند ملک یا حکومت کے لئے شرمناک ہونی چاہئے کیا ہندوستان کی حکومت بتا سکتی ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اب وہ کون سی وجہ ہے جس کے کارن ملک کی اہم ترین اور سب سے بڑی نمائندہ جماعت کے لیڈر اور کارکن جیلوں میں ہیں؟ کیا اب بھی اس بیہودہ پالیسی کو جاری رکھنے کی ضد اور انتقامی اسپرٹ کے سوا اور کوئی وجہ ہے؟"

روزنامہ انصاری۔ دہلی۔

یہ اخبار لکھتا ہے۔

گاندھی جی نے غالباً یہ مشورہ اس مقصد کے لئے سرحدی کانگریس کو دیا ہوگا کہ مسلم لیگ کو اپنی صحیح طاقت اور صحیح پوزیشن کے متعلق ایک بار پھر سوچنے کا موقع مل جائے۔ لیکن یہ مقصد بجائے خود مستحسن نہیں کہا جا سکتا۔ نہ اس سے اس اختلاف کی خلیج کو پاٹا جا سکتا ہے جو کانگرس اور لیگ کے درمیان حائل ہوگئی ہے اور جس کی موجودگی میں گذشتہ چار سال کے اندر ہندوستان کو جس قدر عظیم الشان نقصان پہونچا ہے اس کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

سرحد کی کانگریسی وزارت کی تشکیل سے ہم اس لئے تو خوشی کا اظہار کرسکتے ہیں کہ ممکن ہے کہ مجموعی طور پر اس کا ردعمل دوسرے صوبوں میں بھی وزارتوں کی ذمہ داریاں عوام کے حقیقی اور منتخبہ نمائندوں کو اپنے ہاتھ میں لینے کا خیال پیدا ہوجائے۔ لیکن جہاں تک کانگرس کے اندر یہ خیال پوری قوت سے قائم رہے گا کہ وزارتیں خالص کانگریسی وزارتیں ہوں اور

[illegible] (COMPOUNDS) وزارتیں دیجائیں۔ ہندوستان کے اندر آئندہ بھی فرقہ وارانہ مناقشے باقی رہیں گے اور مختلف قومیتوں کا مسئلہ اور خصوصاً ہندو مسلمانوں کا مسئلہ حل نہ ہوگا۔ اس طرح جب تک مسلم لیگ کی یہ ضد باقی رہے گی کہ ہر صوبے کی وزارت میں مسلمان محض مسلم لیگ کا لیبل لگا کر وزارت میں اور وزارتی پارٹی میں شامل ہوں۔ موجودہ تعطل دور نہ ہوسکے گا اور سرحد کی کانگرسی وزارت کے برسرِ اقتدار آجانے کے بعد بھی ہم پوری پوری طرح اپنی اس خواہش میں یقین رکھتے ہیں کہ مرکز میں جب تک کانگریس لیگ کے اتحاد سے ایک قومی حکومت بنانے کے متعلق فیصلہ ہوکر کسے منظر عام پر نہیں لایا جاتا اور جب تک صوبوں میں مخلوط وزارتیں بنانے کے لئے کوئی سمجھوتہ نہیں ہوتا ہندوستانی جمود کا مسئلہ اسی طرح باقی رہے گا اور برطانیہ کا یہ عذر قائم رہیگا کہ ہندوستانی کسی مسئلے پر متفق نہیں ہوسکتے ہیں۔

مسلم لیگ کا آرگن روزنامہ منشور

سرحد میں کانگرس کی وزارت مسٹر گاندھی کے ایماء سے قائم ہوئی اور خان عبدالغفار خان سے جیل میں مشورہ کے بعد۔ صرف اسی قدر نہیں بلکہ مسٹر گاندھی نے ڈاکٹر خان کو ایک سر بمہر خط بھیجا۔ یہ نئی خبر نہیں ہے بلکہ صوبۂ سرحد میں وزارتی دشواریاں پیدا ہونے سے قبل ہی معلوم ہوچکا تھا کہ مسٹر گاندھی نے صوبہ سرحد کے ان کانگریسیوں کے ہاتھ جو ان سے ملنے گئے تھے ڈاکٹر خان کے نام سر بمہر خط بھیجا۔ اس خط میں یہی ہدایت ہوگی کہ مسلم لیگ کی وزارت کو توڑا جائے اور بجائے اسکے کانگریسی وزارت قائم کی جائے۔ یہ لوگ بھی یقیناً ڈاکٹر خان صاحب کا کوئی خط ہی لیکر مسٹر گاندھی کے پاس گئے ہوں گے جس میں انھوں نے یہ توقع ظاہر کی ہوگی کہ صوبہ سرحد میں کانگریس کی وزارت قائم ہوسکتی ہے۔ مسٹر گاندھی نے صوبۂ سرحد کے خاص حالات کی طرف اشارہ کرکے کانگریس کی پارلیمنٹری پارٹی کو یہ اختیار دیدیا ہو کہ وہ جسطرح مناسب سمجھے عمل کرے۔

مسلم لیگ کی وزارت ٹوٹ گئی اور کانگریس کی وزارت قائم ہوگئی معمولی حالات میں یہ محض ایک صوبے کا واقعہ ہے لیکن جب غور سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ مسٹر گاندھی کی اس پالیسی کی طرف نشان دہی کرتا ہے جو وہ پورے ہندوستان کے لئے اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ وزارتیں قبول کرنا اور قائم کرنا اب کانگریس کی پالیسی ہے۔ یقیناً اب مسٹر گاندھی اس کے حامی ہیں۔ ہندو اکثریت کے صوبوں میں بغیر حکومت کی منظوری کے یہ ممکن نہیں ہے۔ ورنہ ہر جگہ کانگریس وزارتیں قائم کرنے لگی ہوتی۔ صوبہ سرحد میں آئینی تاقد ہے ایک وزارت قائم تھی اور اس کے بعد دوسری وزارت قائم ہونے میں کوئی زحمت نہ تھی۔ صوبہ سرحد میں مسٹر گاندھی نے اپنی نئی سیاسی زندگی آزمانے کے لئے پسند کیا ہے۔ صوبۂ سرحد میں کانگریسی وزارت یہ کوشش کرے گی کہ اس کے طرزِ عمل سے حکومت ایسی مطمئن ہو جائے کہ دیگر صوبوں میں کانگریس کی وزارتوں کے قیام سے اسے کوئی خوف اور خدشہ باقی نہ رہے۔

روزنامہ خلافت بمبئی

۱۷ر مارچ کی اشاعت میں خلافت لکھتا ہے۔

گاندھی جی نے کانگریس کے سنہ ۴۲ء اور اس کے بعد کے فیصلوں کے بالکل خلاف سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب کو کانگریسی وزارتوں کے قیام کی اجازت دیدی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس نے حکومت کے رویہ میں ذرہ برابر تبدیلی ہوئے بغیر اپنے رویہ میں تبدیلی شروع کردی ہے اور شاید وہ ایک بار پھر نہایت ذلت کے ساتھ جاکر حکومت کے پیر پکڑنے کی کوشش کررہی ہے ہم یہاں کانگریس کا نام عمداً استعمال کررہے ہیں کیونکہ ہمارے نزدیک گاندھی کانگریس ہے اور کانگریس گاندھی۔ کانگریسی وزارتوں کو استعفا دینے کا حکم دیتے وقت کانگریس کی مجلس عاملہ نے جو تجویز منظور کی تھی اس میں یہ الفاظ تھے۔

"اس حالت میں ظاہر ہے کہ وہ برطانیہ کی کوئی مدد نہیں کرسکتی۔ کیونکہ اسکا مطلب اس شہنشاہی پالیسی کی تصدیق کرنا ہوگا جسے کانگریس نے ہمیشہ ختم کرنے کی کوشش کی ہے اس سلسلے میں پہلے قدم کے طور پر کمیٹی کانگریس وزارتوں کو حکم دیتی ہے کہ وہ اپنے استعفے داخل کردیں"۔

ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ کانگریس وزارتوں کو شہنشاہیت کے ہاتھ مضبوط کرنے کے مرادف خیال کرتی ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب ایسا کیوں نہیں رہا کیا حکومت نے شہنشاہی پالیسی ترک کردی ہے یا کانگریس نے شہنشاہیت کی پوجا شروع کردی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی ہے۔ گاندھی جی کو چونکہ معلوم ہوچکا ہے کہ زبردستی سے وہ حکومت سے کچھ نہیں حاصل کرسکتے ہیں اس لئے اب انھوں نے حکومت کو اپنی بدلی ہوئی روش کا احساس کرانا شروع کردیا ہے۔ پہلے انھوں نے ستیہ گرہ کی تحریک چلانے کے اختیار کے خاتمہ کا اعلان کیا۔ پھر وائسرائے سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ پھر حکومت کے سامنے کچھ شرطیں رکھیں۔ پھر سر تیج بہادر سپرو کی مصالحتی کمیٹی کو آشیرباد دی اور اب سرحد میں وزارت بنانے کا حکم دیدیا۔ ان کی اس پالیسی کا اثر حکومت پر بھی ہورہا ہے چنانچہ آج پہلی مرتبہ ہم نے مسٹر ایمری کی زبان سے کانگریسی لیڈروں کے بارے میں کچھ نرم الفاظ سنے ہیں۔ مجلس عاملہ کے لیڈروں کو اپنے اپنے صوبوں میں بھیجا جارہا ہے اور شاید وہ جلد ہی رہا ہوجائیں گے۔

اس کے علاوہ اس طرح گاندھی جی کو مسلم لیگ پر ایک اور ضرب لگانے

کا موقع مل رہا تھا اور انھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ کیونکہ چاہے کچھ بھی ہو انھوں نے مسلم لیگ کے متعلق اختیار کردہ روش میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں کی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ لیگ سے مصالحت کا خیال بھی اپنے دل سے نکال چکے ہیں اور ہندو مسلم اتحاد کیطرف سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔

ہمیں اس پر کوئی افسوس نہیں کہ گاندھی جی اپنی روش کیوں تبدیل کر رہے ہیں اور انھوں نے سرحد میں کانگریسی وزارت کے قیام کی اجازت کیوں دی بلکہ ہمیں تو اسپر خوشی ہے کیونکہ اب گاندھی جی اسی طرف کو آ رہے ہیں جس طرف انھیں مسلم لیگ لانا چاہتی تھی اور وہ ثابت کر رہے ہیں کہ ؎

ہر کہ دانا کند کند ناداں
لیک بعد از خرابیٔ بسیار

لیکن ہمیں افسوس اس بات پر ہے کہ گاندھی جی نے ساتھ ہی ساتھ پھر اس طرح سے چلنا شروع کیا ہے جس سے ان کا گرنا منصوبی ہے۔ ایک پارٹی کی مخالفت کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔ اس سے مسلم لیگ کی تنظیم اور اسکی قوت کو تو کوئی نقصان نہیں پہونچیگا۔ اگر ہندو مسلم اور لیگ و کانگریس کے اختلافات اور بڑھ جائیں گے جن سے ملک کو مجموعی طور پر نقصان پہونچنا یقینی ہے۔ گاندھی جی کو چاہئے کہ وہ سوچ سمجھکر قدم اٹھائیں اور ملک کو موجودہ مصیبت سے نجات دلانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے سخت فرقہ وارانہ کش مکش میں مبتلا نہ کردیں۔

روزنامہ انقلاب بمبئی

۲۲ مارچ کی اشاعت میں انقلاب لکھتا ہے۔

کھلی ہوئی بات ہے اس طرح گاندھی جی، مسلم لیگ کو زک دینے کی کوشش کر رہے ہیں وہ لیگ یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ وہ مسلم صوبوں میں کانگریسی وزارت بنا سکتے ہیں۔ لیکن یہ ان کی غلط فہمی ہے، جب تک نئے انتخابات نہیں ہوجاتے وہ ایک بار نہیں سو بار کانگریسی وزارت سرحد میں یا کسی دوسرے صوبہ میں غدار اور قوم فروش مسلم ممبران کے تعاون سے بنا سکتے ہیں، لیکن نئے انتخابات کے بعد وہ کسی صوبہ میں بھی کانگریسی وزارت نہیں بنا سکیں گے بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ پنجاب میں خضر حیات اور سرحد میں ڈاکٹر خان کا باوجود وجاہت و ثروت اسمبلی کا ممبر منتخب ہونا بھی مشکل ہو جائے گا، لہذا چند روز کے لئے وہ اگر اپنا یہ عارضی فروغ محفل دکھانا چاہتے ہیں شوق سے دکھالیں، یہ مدت جلد گزر جائیگی اور پھر وہ نہ صرف سرحد بلکہ ہر مسلم صوبے میں پس غبار کارواں بن کر رہ جائیں گے۔"

مساعیِ جنگ میں تعاون

وزارت کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ مساعی جنگ میں حکومت سے غیر مشروط تعاون کرے، کانگریس کمیٹی اس پر رضامند نہیں ہے، لیکن سرحد اسمبلی کی کانگریسی پارٹی غیر مشروط تعاون کے لئے سر آنکھوں پر تیار ہے۔ وہ اتنی زیادہ غیرت مند اور باحمیت ہے کہ صدر کانگریس ابوالکلام، "ناخدائے کانگریس جواہر لال" اور ممتاز کانگریس و ممبران مجلس عاملہ کی نظر بندی کے باوجود، حکومت سے تعاون کریگی۔ مساعی جنگ میں حکومت کا ساتھ دے گی، سچ تو یہ ہے کہ ایسی اصول پرستی کی مثال کانگریس کیا غداروں کی تاریخ میں بھی مشکل سے ملے گی۔

ہمیں گاندھی جی پر حیرت ہوتی ہے وہ نہایت انکسار بلکہ ذلت نفس کے ساتھ حکومت کے سامنے بار بار کے جھڑکے جانے پر بھی جھک سکتے ہیں لیکن ان سے یہ نہیں ہو سکتا کہ مسلم لیگ کا جائز مطالبہ مان لیں پاکستان کا اصول قبول کریں۔ مسلمانوں کے حق خود ارادیت کے تسلیم کرنے میں تامل نہ کریں۔

حکومت کے سنگ در پر بار بار ناک رگڑنے سے بھی آزادی نہیں ملی اور نہ آئندہ مل سکے گی، مسلمانوں کا حق مان لینے سے آج اور ابھی آزادی مل سکتی ہے، لیکن گاندھی جی اور ان کے رفقا، حکومت کے سنگ آستاں پر سجدہ ریزی کئے جا رہے ہیں اور مسلم لیگ کے جائز اور مبنی بر انصاف مطالبے کو قبول کرنے سے صاف انکار کر رہے ہیں۔

بہرحال ہمیں دیکھنا ہے کہ آئندہ چند روز میں کانگریسی صوبے خان صاحب کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے ہیں یا اپنی کوئی نئی راہ ایجاد کرتے ہیں؟

روزنامہ انجام دہلی۔

دہلی کا اخبار انجام رقمطراز ہے

جن لوگوں نے اورنگ زیب منسٹری کی شکست اور خان منسٹری کے قیام کو کانگریس کے مقابلہ میں مسلم لیگ کی شکست و ہزیمت کا نشان سمجھا ہے۔ وہ غلطی پر ہیں۔ انھیں واضح رہنا چاہئے کہ اورنگ زیب منسٹری مسلم لیگ نہ تھی۔ بہت سے مسلم لیگی بھی اورنگ زیب منسٹری سے اسی قدر نالاں تھے۔ جس قدر دوسرے نالاں رہے ہوں گے۔ ایسے مسلم لیگی بھی ہر جگہ ملیں گے۔ جو خود مسلم لیگ کے تھے اور اسکے علم کے سایہ میں مسلمانان سرحد کی بہتر تنظیم کی خاطر اورنگ زیب منسٹری کی شکست چاہتے تھے۔

انھیں یہ واقعہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے ۱۹۳۶ء کے انتخابات کے نتائج کی فضا میں ہو رہا ہے اور ۱۹۳۶ء کا زمانہ وہ تھا جب مسلم لیگ مسلم لیگ نہ تھی۔ پھر اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہئے کہ ضمنی انتخابات کے نتائج تقریباً سو فیصدی مسلم لیگ کے حق میں رہے ہیں اور ہمیں اس میں شبہ نہیں ہے کہ پاکستان کے مسئلہ کو سامنے رکھ کر جب کبھی اور جہاں کہیں کانگریس مسلم لیگ کا انتخابی مقابلہ ہوگا فتح مسلم لیگ کے حصہ میں اور شکست کانگریس کے حصہ میں آ

زمیندار - لاہور

سرحد میں کانگریسی وزارت کے قیام کے سلسلہ میں بہت سی دلچسپ باتیں بھی کہی گئی ہیں لیکن سب سے دلچسپ انکشاف مولانا ظفر علی خاں کے اخبار زمیندار لاہور نے کیا ہے۔ ملاحظہ ہو زمیندار ۱۶ ر مارچ کی اشاعت میں لکھتا ہے۔

کانگریسی وزارت کے قیام سے کانگریس اصول وعقیدہ کے اعتبار سے مردہ ہو جائے گی۔ اور یہ حقیقت منظر عام پر آجائے گی کہ گاندھی جی نے اگست کی قرارداد بالواسطہ طور پر واپس لے لی ہے۔ کیونکہ اس قرارداد کی بنا ہی ڈیڈلاک پر ہے جب ایک صوبے میں کانگریسی وزارت قائم کی جارہی ہے تو پھر قرارداد کے کوئی معنی نہیں رہے۔ لہذا کانگریس کو اصولی طور پر شکست ہوئی ہے اور یہ اصول شکنی صرف ایک وزارت کے لئے جائز سمجھی گئی۔ اس کے بعد کانگریس کو اس کے اصول وعقیدہ کی چلتی پھرتی قبر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ کانگریس معنوی وحقیقی طور پر مر چکی ہے اور اس بے اصولی کی فتح کا سہرا سرحد کے سرپے ڈاکٹر خان صاحب نے صرف وزارت بنانے کا وعدہ نہیں کیا بلکہ گورنر کو یہ بھی یقین دلا دیا ہے کہ سول نافرمانی کسی حالت میں بھی نہیں کیا جائیگی۔ اس سے ثابت ہوا کہ اگست قرارداد کلیتہً منسوخ ہو چکی ہے۔ کیونکہ قانون شکنی کا یقین بھی گاندھی جی کی ہدایت ہی کے مطابق دلایا گیا ہوگا لہذا گاندھی جی نے خود ہی زود پشیمانی کا ثبوت دیتے ہوئے اگست قرارداد منسوخ کردی ہے۔ اب آئینی طور پر کانگریس اور مسلم لیگ میں کوئی فرق نہیں رہا۔ دونوں وزارتوں کی راہ پر گامزن ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب گاندھی جی نے عملی طور پر اگست قرارداد منسوخ کردی ہے۔ تو اس کے واپس لے لینے کا اعلان کیوں نہیں کردیتے تاکہ ایک طرف تو حکومت مطمئن ہو کر کانگریسی قیدیوں کو رہا کردے۔ دوسری طرف مسلم لیگ کو دست تعاون بڑھانے کا موقع مل سکے۔ جو چیز گاندھی جی سربمہر لفافے کی وساطت سے قبول کر رہے ہیں اس کا زبان سے اعلان کیوں نہیں کردیتے ؟ یہ مضحکہ خیز نعطلی کب تک قائم رہے گی ؟

ادبی تنقید

ترقی پسند تحریک اور کیفی اعظمی

از طفیل احمد خان ایم اے

۱۹۳۶ء سے پہلے اردو کے ترقی پسند ادیبوں کے سامنے ایک واضح اور متعین راستہ تھا۔ اور یہ خود اس بات کا مظہر تھا کہ ملک کی سیاسی فضا میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ یہ ضرور تھا کہ ترقی پسند ادیب کے نئے انقلابی نظریوں میں گہرائی اور پختگی کا فقدان تھا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ ابھی وہ کسی قسم کے سیاسی الجھن کا شکار نہیں ہوا تھا۔ "اصلاح نہیں بلکہ انقلاب ہمارے دکھوں کا علاج ہے۔ یہ انقلاب جو محض سیاسی نہیں بلکہ سماجی بھی ہوگا۔ مزدوروں اور کسانوں کی قوت بازو سے اور ان کی رہنمائی میں وجود میں آئے گا۔ اشتراکیت کا ساتھ دو۔ روس کا غیر طبقاتی سماج ہمارا مقصد ہے۔ لیکن سماجی انقلاب سے برطانوی شہنشاہیت کے خلاف ایک کامیاب مسلح بغاوت ہی سے وجود میں آ سکتا ہے۔" یہ وہ نظریاتی پس منظر تھا جس نے جوش مجاز اور مخدوم، احسان دانش اور جاں نثار اختر، سردار جعفری اور مسعود جمال، جذبی اور مطلبی، سلام اور جمیل مظہری جیسے نوجوان شاعروں کو انقلابی نغمے گانے پر اکسایا اور جن کی ادبی کاوشوں نے اردو شاعری کو چند حسین ترین شہکار عطا کئے اس سے قطع نظر کہ سرمایہ داری اور شہنشاہیت کے خلاف ان کا ردعمل انفرادی اور ہراجی قسم کا تھا اور وہ تخریب و منفیت کے پجاری ہو کر رہ گئے۔ ان کا ذہن متوسط طبقہ کی مخصوص عصبیت سے نجات نہ پا سکا یا یہ کہ وہ ذاتی اور جسمانی طور پر بڑھتی اور پھیلتی ہوئی انقلابی تحریکوں کا ساتھ نہ دے سکے۔ ان تمام حقائق سے قطع نظر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے ادبی سعی و عمل نے آزادی اور انقلاب کے نصب العین کو نوجوان نسل کے دل و دماغ کے محفوظ ترین گوشوں میں پہنچا دیا اور ان کے نوخیز پر شباب نغموں نے اردو ادب کی رگ و پے میں ایک تندرست رجائیت کے سرخ اور تازہ خون دوڑا دیئے۔

ترقی پسند بدعت کی مخالفت کا جن لوگوں نے اعلان کیا تھا وہ ان ادبی اور سیاسی رجعت پسندوں کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے جن سے ہم سب اچھی طرح واقف ہیں اور جن کی ذہنی اور علمی صلاحیت کے بارے میں ہم میں سے کسی کے دماغ میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے لیکن اس حقیقت کی ذمہ داری تاریخ کے بے رحم قانون پر عائد ہوتی ہے کہ اس جماعت کے دست و بازو شل ہو چکے تھے۔ اس کا جذبہ ایمان و عقیدہ ایک سسکتے ہوئے تمدن کے سرد اور بے جان کھنڈروں سے چٹا ہوا تھا۔ ترقی اور انقلاب سے کے خلاف اس کی نحیف صدائے مخالفت بغاوت کے پرجوش نعروں میں گم ہو کر رہ گئی اور وہ اس جماعت کو اتنی تیز رفتاری کے ساتھ اپنی ادبی جمانیت چھنتے ہوئے دیکھ کر اور نوجوان ادیبوں کے مقابلہ میں ایک حسرت ناک احساس پستی کا شکار ہو کر اور دل پر انتہائی جبر کرتے ہوئے آخر خاموش ہو جانا پڑا۔ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے اس بے ہنگم اور غیر منظم جماعت کا ذہن روایتی اسلوب مخصوص طور پر غزل کے حدود سے باہر جانے سے قاصر تھا، در مواد کے لحاظ سے اس جماعت کے شاعروں نے پٹے پٹائے اور تے کئے ہوئے خیالات کو اتنی بار دہرایا تھا کہ نوجوان نسل کو نہ صرف اپنے دل و دماغ بلکہ سروں، کندھوں اور سینوں پر اکتاہٹ اور تھکاوٹ کے نکی تن بوجھ کا احساس ہونے لگا تھا۔ یہ تھی ۱۹۳۶ء کے پہلے کی ادبی جماعت بندی دو گروہ جن کے اپنے اپنے راستے صاف اور متعین تھے۔

میرے تجزیہ کی رو سے ۱۹۳۹ء میں دنیا کی دوسری سامراجی جنگ نے خاصیتی اعتبار سے جماعت بندی میں کسی قسم کا کوئی فرق پیدا نہیں کیا۔ سوائے اس کے سامراجی جنگ کے عہد میں ترقی پسند شاعروں کی دقتیں اور بنیادی خرابیاں جو پہلے سے موجود تھیں زیادہ واضح اور نمایاں ہو کر سامنے آنے لگیں۔ چونکہ بیسویں صدی کے اوائل سے اردو شاعری سیاسی ماحول سے براہ راست طور پر متاثر ہوتی رہی ہے اس لیے نقاد مجبور ہے کہ وہ اس تبدیلی کے سبب بھی سامراجی جنگ کے چھڑ جانے کے بعد ملک میں رونما ہونے والے سیاسی حالات

کا نیا ہی تلاش کرے۔ کانگریسی وزارتیں مستعفی ہو چکی تھیں اور عوام کی گردن پر افسر شاہی کے خونخوار پنجے مضبوط ہوتے چلے جا رہے تھے۔ شہری آزادی چھن چکی تھی اور ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کانگریس کی بے عملی اور غلط پالیسی نے انفرادی سول نافرمانی جیسی بے معنی شکل اختیار کر لی تھی۔ عوام کے اُبھرے ہوئے انقلابی جذبات پھوٹ پڑنے کے لیے بیتاب تھے۔ لیکن ان پر سے بے عملی کا سرہانہ اٹھنے کا نام نہ لیتا تھا۔ نوجوان شاعروں کی انقلابی قوت عمل کی واضح طور پر تخریب ہو رہی تھی۔ اس زمانہ میں جوش کی نظم "ایسٹ انڈیا کے فرزندوں سے خطاب" اور مخدوم محی الدین اور سردار جعفری کی کچھ ایسی نظمیں وجود میں آئیں جو جنگ کی مخالفت میں لکھی گئی تھیں۔ اسی دور میں فیض احمد فیض منظر عام پر آتے ہیں جن کا دھیما لب و لہجہ خستگی اور تھکن اس دور کے بڑھتے ہوئے احساس ناکامی شکست اور تکلیف انتظار کو نہایت واضح طور پر پیش کرتا ہے۔

اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا۔

اس دور میں ذاتی اور سماجی حقائق سے فرار اختیار کر کے جنسیت اور تحت الشعور میں پناہ لینے کا رجحان بھی تیزی سے ترقی کرنے لگتا ہے۔ اور مخصوص طور پر بالکل نوخیز شاعر تیزی سے اس رجحان کے شکار ہونے لگتے ہیں۔ اسی فرار، مایوسی، پستی، اندوہناک قنوطیت اور یاس پرستی کا رجحان آگے چل کر اختر الایمان کی شاعری میں ظاہر ہوتا ہے اور اس کی نظمیں ایک ایسے کمرے کے تاریک ماحول سے آشنا کراتی ہیں جس میں ایک نحیف بدقسمت اور ہارا ہوا انسان تکیہ پر سر رکھے ہچکیوں پہ ہچکیاں لے رہا ہو۔

۱۹۴۱ء کے جون میں نازیت دنیا کے سب سے پہلے اشتراکی ملک پر حملہ کر کے اس کے غیر طبقاتی سماج کو ختم کر دینے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ غیر طبقاتی سماج جو ہندوستان اور دنیا بھر کے ترقی پسند اور انقلابی ادیبوں شاعروں کی امیدوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اور اسی وجہ سے ترقی پسند شاعروں کے ذہن میں ایک نئے الجھاؤ کے پیدا ہونے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان کے ذہن میں انگلستان اور امریکہ جیسے سامراجی ملکوں سے اشتراکی روس کی وابستگی نے غلط قسم کے مشکوک و شبہات کو جنم دیا۔ پھر اس کے ساتھ ہندوستان کے ساتھ برطانوی سامراج کے طرز عمل نے ان کے ذہنی الجھاؤ کو اور بھی بڑھا دیا۔ وہ بین الاقوامی حالات کی روشنی میں فسطائیت کے خلاف اتحادیوں سے کھلم کھلا ہمدردی رکھتے تھے لیکن جب بین الاقوامی دنیا سے ہٹ کر ان کی نظر ہندوستان پر پڑتی تو ان کے ذہن کو یہ سوال پریشان کر دیتا کہ فسطائیت کے خلاف اس جنگ سے ہندوستان کو کیا فائدہ پہنچیگا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ برطانوی سامراج کے اس طرز عمل نے ہندوستانی ادیب کے ان شکوک و شبہات کو قوی تر کر دیا۔ یہاں تک کہ جاپانی فاشزم کا ملک سے اس قدر قریب آ جانا بھی ان شکوک و شبہات کی مضبوط دیواروں کو نہ ہلا سکا کیونکہ جنگ کا جد و جہد کا روایتی طریقہ اس حقیقت کے سمجھنے سے قاصر تھا کہ جنگ کو اس طرح موافقانہ بنایا جا سکتا ہے کہ خود فاشزم کی مخالفت، ملکی حفاظت اور عوامی مسائل کی بنیاد پر عوامی طاقتوں کو اس طرح اور اس حد تک منظم اور مضبوط کیا جائے کہ سامراج اختیارات دینے پر مجبور ہو جائے۔ برطانوی سامراج اپنے اس طرز عمل پر ڈٹا رہا۔ کہ جہاں تک ہو سکے اور دوران جنگ تک ہندوستانی عوام کی طاقتوں اور ذرائع کو دبائے رکھو تاکہ جنگ کے دوران میں اور اس کے بعد وہ ایک خطرناک انقلابی حربے میں نہ تبدیل ہو سکیں۔ ۱۹۴۲ء کے ہنگامے سیاسی تعطل اور اس سے پیدا ہونے والے احساس پستی، قنوطیت اور تھک کر بیٹھ جانے کا احساس ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس عام ذہنی اور جذبی ماحول میں نئے شاعروں کا ذہن لازمی طور پر فرار و گریز کی طرف مائل ہوا۔ اور جو متوسط طبقہ کے طبقاتی اور رجعت پسندی کے رجحانات پہلے دبے ہوئے اور محض ابتدائی شکل میں تھے وہ ۱۹۴۲ء کے بعد بہت واضح ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اردو کی تازہ ترین نظموں میں بے کیف نفسیاتی تجزیہ، ذہنی ابہام اور سستی قسم کی جنسی تسکین کی خواہش کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔ یہ ہے اردو شاعروں کا تیسرا گروہ جو ان ترقی پسند شاعروں کو افادیتی اور اخباری شاعر کہہ کر ٹال دیتا ہے۔ جو سیاسی تعطل اور ملک کے عام احساس ناکامی سے مجہول طور پر متاثر ہونے اور ہمت کا کھلونا بن جانے کی بجائے اب بھی فاشزم اور سامراج کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے ہمیں سماجی انقلاب کا راستہ دکھا رہے ہیں۔

آل انڈیا انجمن ترقی پسند مصنفین کے تیسرے سالانہ اجلاس

منعقدہ مئی ۱۹۴۳ء کے بعد پرانے ترقی پسند شاعروں میں سے کچھ اپنی مجہول ذہنی کیفیت سے نجات پانے کی کوشش کرتے ہیں اور کھلم کھلا فاشزم کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے عوامی تحریکوں سے اپنے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں اور ہمیں روشنی، امید اور رجائیت کے ایک نئے دور کی طرف لے جانے کی سعی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اس چھوٹے مگر بے حد امید افزا اور متحرک و باعمل گروہ میں مخدوم محی الدین سب سے پیش پیش ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیفی اعظمی نے اگر اپنے مبارک ادبی سعی و عمل کا سلسلہ اتنے ہی خلوص و تندہی کے ساتھ جاری رکھا تو وہ تمام ترقی پسند شاعروں سے بازی لے جائے گا اور ایک نئی ترقی پسند اور انقلابی شاعری جو بیشتر گذشتہ کمزوریوں اور خامیوں سے پاک ہوگی اس کی بنا ڈالنے اور اس کی ابتدائی رہنمائی کا سہرہ کیفی ہی کے سر ہوگا۔ کیفی کی شاعرانہ عمر ابھی بہت تھوڑی ہے لیکن آیئے ہم دیکھیں کہ اس کی ہی تھوڑی سی ادبی کاوش کس حد تک اس نئی انقلابی شاعری کے امکانات اپنے اندر رکھتی ہے جو گذشتہ خامیوں اور کمزوریوں سے بہت حد تک پاک ہوگی۔

سجاد ظہیر صاحب کیفی کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ ایک طالب علم قسم کے نوجوان ہیں جن کی تعلیم کا باقاعدہ سلسلہ عربی مدرسوں میں عربی فارسی کے امتحانوں کی سندیں حاصل کر لینے کے بعد تھوڑی ہی مدت پہلے ختم ہو چکا ہے۔ انگریزی زبان سے ناواقف ہیں۔" لیکن اس کے باوجود اشتراکیت اور انقلاب سے متعلق کیفی کی صحیح اور واضح سمجھ بوجھ کا اندازہ لگانا ہو۔ تو کیفی کی نظم "کشمکش" کے کچھ بند ملاحظہ فرمایئے جن میں شاعر نے یہ الفاظ خود "طبقاتی جنگ میں متوسط طبقہ کی سراسیمگی" کا نقشہ پیش کیا ہے۔

میرے اللہ
میں کدھر جاؤں
پھر ہے فطرت نے آگ بھڑکائی   دو حریفوں میں ہے صف آرائی
اک طرف قیصری و دارائی   اک طرف مفلسی ہے جھلائی
میرے اللہ
میں کدھر جاؤں
اک طرف زور ہے حکومت ہے   مال ہے ملک ہے سیاست ہے
اک طرف ولولے ہیں محنت ہے   شور ہے جوش ہے بغاوت ہے
میرے اللہ
میں کدھر جاؤں
جب ادھر کی ہوائیں آتی ہیں   دل کے ہر تار کو بجاتی ہیں
اس طرف جب نگاہیں جاتی ہیں   بجلیاں سر میں کڑکڑاتی ہیں
میرے اللہ
میں کدھر جاؤں
جذب ہوتے جہاں میں جاتا ہوں   خود کو کچھ اجنبی سا پاتا ہوں
کر کے ہمت ادھر جو آتا ہوں   نام اجداد کا مٹاتا ہوں

کیفی کی حیرت انگیز نظریاتی وضاحت کی تشریح اور ثبوت میں اگر طوالت کا خوف مانع نہ ہوتا اور بھی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی تھیں۔ لیکن فی الحال اس کے مندرجہ ذیل اشعار اور بندوں پر اکتفا کیا جا سکتا ہے

بینک یہ بینک، یہ فردوس ہوس جنت زر
یہ چمکتی ہوئی لبریز خزانوں کی کمر
بحر بے سیل و تلاطم کے یہ خوش آب گہر
باغ بے خار و خزاں کے یہ طلا پوش شجر
تاں مری فالتو محنت کے سوا کچھ بھی نہیں
"حقیقتیں" صفحہ ۶۳)

ہٹو میدان میں ہم آرہے ہیں
یہ آندھی اور یہ طوفان تو بہ
یہ لاشیں اور یہ میدان تو بہ
بلکتے چیختے انسان تو بہ
کہاں تک ہم یوں ہی دیکھا کرینگے   ہٹو میدان میں ہم آرہے ہیں
قیامت ڈھا چکی رجعت پسندی
عذاب برسا چکی رجعت پسندی
سروں تک آ چکی رجعت پسندی
ہٹو کہ اب بڑھ کے ہم حملہ کرینگے   ہٹو میدان میں ہم آرہے ہیں
یہ طیارے، یہ غبارے، یہ فوجیں
سرنگیں، تار پیڈو، ٹینک، توپیں

نہیں ان میں یہ طاقت ہم کو روکیں
کریں گے ان پہ ہم قبضہ کرینگے ہٹو سیدان میں ہم آرہے ہیں
(موجودہ جنگ اور ترقی پسند عناصر صفحہ ۶۳)

یہ سیہ فام چمنی سے اٹھتا دھواں کارخانہ کا ڈھالا ہوا آسماں
گھمسٹا ہوا گاہ کھنچتا ہوا انفرادی شکنجہ میں بھنچتا ہوا
دامن تار پر جابجا نقش گیر خون مزدور کی آڑی ترچھی لکیر
یہ دھواں آہ کیفی یہ اندھا دھواں ایک مدت سے ہے جو یوں ہی پرفشاں
سطح سے نفع خوروں کی ابھرے اگر توڑ لے چاند تارے ابھی جھوم کر
(دھواں صفحہ ۲۲)

دوست میں ا دیکھ چکا تاج محل
——— واپس چل
یہ دھڑکتا ہوا گنبد میں دل شاہجہاں
یہ در و بام پہ ہنستا ہوا ملکہ کا شباب
جگمگاتا ہے ہر اک تہہ سے مذاق تفریق
اور تاریخ اڑھاتی ہے محبت کی نقاب
خود بخود بھر گئے تلووں میں یہ انداز سوال
وہ جو رستوں پہ پڑے رہتے ہیں لاشوں کی طرح
خشک ہو کر جو سمٹ جاتے ہیں بے رس اعصاب
دھوپ میں کھوپڑیاں بجتی ہیں تاشوں کی طرح
دوست میں دیکھ چکا تاج محل واپس چل
("تاج محل" صفحہ ۸۶)

اوپر تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کے اندر یہ بنیادی خرابی تھی کہ وہ جسمانی طور پر عوامی اور انقلابی تحریکوں سے علیحدہ رہنے کے باعث انفرادیت کے پھندے سے نجات نہ پا سکے تھے۔ متوسط طبقے کی ذہنی اور جذباتی عصبیت اشتراکی نصب العین کے قبول کر لینے کے بعد بھی ان کے دل و دماغ میں پورے طور پر کارفرما تھی۔ ان کی انقلابیت پرخلوص ہونے کے باوجود رومانی اور انفرادی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے باہر کا کوئی آدمی اپنے انفرادی جذبۂ انسانیت کے تحت مزدور کسان سے ہمدردی کا اظہار کر رہا ہے اور انھیں ایک ایسی بغاوت کے لیے اکسا رہا ہے جس کا مقصد تخریب اور محض تخریب ہے کیفی کے کلام سے کم سے کم یہ احساس نہیں ہوتا کہ ایک تیسرا شخص باہر سے اور عوامی تحریکوں سے باہر رہ کر مزدور کو انقلاب کے لیے للکار رہا ہے۔ بلکہ پوری نظم کا ماحول اور انداز بیان، لب و لہجہ ہمارے اندر غیر شعوری طور پر یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ شاعر خود ان تحریکوں کے بیچ میں کھڑا ہے۔ اور وہاں سے اپنے ساتھیوں کو للکارتا ہوا خود بھی آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ ہے وہ خصوصیت جو کیفی کی اس شاعرانہ کم عمری کے دور میں ایک خاص اعتبار سے مخدوم محی الدین کو چھوڑ کر تمام دوسرے ترقی پسند شاعروں سے الگ کرتی ہے۔

آج ہر دن سے زیادہ ہے ہلاکت کا شر
درد ہر رگ میں ہے دوہری ہوئی جاتی ہے کمر
یہ گرانی یہ مرا خرچ، یہ کچھ سکۂ زر
قرض خواہوں کی یورش ہو گی ابھی سے گھر پر
اور گھر میں غم حسرت کے سوا کچھ بھی نہیں۔
اُف یہ بچے، یہ شب و روز کی محنت کا کمال
جن کا پانا بھی وبال اور نہ پانا بھی وبال!
جن کو مٹھی میں ذرا دیر ٹھہرنا ہے محال
کھینچے لیتا ہے جنھیں سود دستانوں کا جلال
حق مرا ان پہ زیارت کے سوا کچھ بھی نہیں
وہ رفیقہ، وہ مری مونس اخلاق پناہ
جس کی مدتوں جواتی ہے مصائب کی گواہ
دامن قصد تبسم میں سمیٹے ہوئے آہ
دیر سے ہو گی مرے واسطے جو چشم براہ
نذر کو اس کی ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں
مرے قبضہ میں تو محنت کے سوا کچھ بھی نہیں
(حقیقتیں صفحہ ۶۲)

یہ بازو، یہ بازو کی میرے صلابت
یہ سینہ، یہ گردن، یہ قوت، یہ صحت
یہ جوش جوانی، یہ طوفانی جرات
یہ این وصف کچھ بھی نہیں میری قیمت
حیات و عمل کا گنہگار ہوں میں بڑا دکھ ہے مجھکو کہ بیکار ہوں میں۔
پکاریں زمینوں کے کانوں کے مالک

جبیں جگمگاتی دوکانوں کے مالک
کہاں ہیں کہاں کارخانوں کے مالک
خریدیں مجھے خزانوں کے مالک
کہ محنت فروشی کو تیار ہوں میں   بڑا دکھ ہے مجھکو کہ بے کار ہوں میں
کہاں تک یہ با جبر مر مر کے جینا
بدلنے لگا ہے مسل کا قرینا
لہو میں ہے کھولن، جبیں پر پسینا
دھڑکتی ہیں نبضیں سلگتا ہے سینا
غرض اب بغاوت کو تیار ہوں میں   بڑا دکھ ہے مجھکو کہ بے کار ہوں میں

صفحہ (۳۳)

لیکن اس کی بغاوت سے مراد محض تخریب نہیں بلکہ اس میں تعمیر، روشنی، اور رجائیت کا خون رواں دواں ہے۔ اس ذاتی مشکلات بیکاری اور عدم رواداری، اسے یاسیت، پسندی طرف نہیں مائل کرتیں وہ اپنے انفرادی دکھ سکھ کو چٹخارہ لے کر بیان نہیں کرتا ور اسے حسین، رومانی لباس پہنا کر نہیں پیش کرتا۔ اس کے لب ولہجہ میں مایوسی نہیں وہ یہ نہیں کہتا کہ۔

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

بلکہ

کہاں تک یہ با جبر مر مر کے جینا
بدلنے لگا ہے عمل کا قرینا
لہو میں ہے کھولن، جبیں پر پسینا
دھڑکتی ہیں نبضیں سلگتا ہے سینا
غرض اب بغاوت کو تیار ہوں میں   بڑا دکھ ہے مجھکو کہ بے کار ہوں میں

وہ اپنے ذاتی مسئلہ کو اجتماعی ماحول سے الگ کرکے اس کو ایک دل خوش کن المیہ بنا کر نہیں پیش کرتا بلکہ اپنے ذاتی مسائل کی سرحدیں اجتماعی مسائل سے ملا کر اس کا حل خود انہیں اجتماعی مسائل کے حل میں تلاش کرتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے۔ جہاں انفرادیت اور اجتماعیت کی حدیں مٹ جاتی ہیں، دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ اور کیفی کی یہی امتیازی خصوصیت ہے جس کی بنا پر مستقبل میں اس کی شاعری سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

۰۰ ہندوستانی سماج میں عورت کی مظلومیت کو ایک دلکش رومان بنا کر نہیں پیش کرتا۔ اس کی مجبوری اور کمزوری کو اس کی نزاکت اور حسن سے تعبیر نہیں کرتا۔ بلکہ اسے بغاوت کا پیغام سنا کر سماج میں اپنے صحیح مقام کو حاصل کرنے پر اکساتا ہے۔ اس سے پہلے مجازؔ بھی تقریباً یہی پیغام سنا چکے ہیں لیکن ان کا لب ولہجہ غیر شعوری طور پر اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ وہ سماج میں عورت کی موجودہ حیثیت اور اس کی اشکوں بھری آنکھوں اور تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں میں رومان و دلکشی محسوس کر رہے ہیں۔

اگر خلوت میں تو نے سر اٹھایا بھی تو کیا حاصل
بھری محفل میں آکر سر جھکا لیتی تو اچھا تھا

فیض کی آئیڈیل لڑکی۔ اس سے بھی زیادہ نازک غمزدہ اور مظلوم ہے۔ بقول کسی کے وہ اپنی آئیڈیل لڑکی کو ایک خاموش دھیمے دھیمے روشن کمرہ میں تنہا بٹھا کر اس سے اپنا انتظار کرتا ہے اور ٹھنڈی آہیں بھرواتا ہے۔ یہاں تک کہ انتظار کی تھکن اس کے نازک شانوں کو بوجھل کر دیتی ہے اور اس کی بھیگی ہوئی سرمئی آنکھوں میں مایوسی اور احساس شکست کے بادل چھا جاتے ہیں۔ یہ تصور امتیاز علی تاج کی انارکلی کی یاد تازہ کرتا ہے۔ اور بہت حد تک مشرق کے اس بیمار اور لاغر تصور حسن کی تخلیق ہے جو صرف ایک گرتے اور ختم ہوتے ہوئے تمدن ہی میں پیدا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ سجاد ظہیر عام ترقی پسندوں کے اپنے محبوبہ کے ساتھ تم میرے ساتھ کہاں جاؤ گی " والے جس طرز عمل کے شاکی ہیں وہ بھی اس تصور حسن کا مظہر ہے۔ تمام ترقی پسند شعراء عورت کو انقلاب کا پیغام سناتے ہوئے بھی غیر شعوری طور پر یہی چاہتے رہے ہیں کہ عورت اتنی ہی غم زدہ، نازک اور گڑیا بنی رہے جیسی کہ ہمیشہ بنی رہی ہے۔ برخلاف اس کے کیفی کا عورت سے متعلق تصور صحت مند اور انقلابی ہے۔ وہ عورت کی نزاکت کو آئیڈیل بنا کر نہیں پیش کرتا۔

تو کہ بے جان کھلونوں سے بہل جاتی ہے
تپتی سانسوں کی حرارت سے پگھل جاتی ہے
پاؤں جس راہ میں رکھتی ہے پھسل جاتی ہے
بن کے سیماب ہر اک ظرف میں ڈھل جاتی ہے
زیست کے آہنی سانچے میں بھی ڈھلنا ہے تجھے

[illegible] ہوتے ہیں [illegible]

[illegible] ہے سپر کے [illegible]
[illegible] کا لہو کا [illegible] آنسو ہیں تسبیح
[illegible] میں ہے قسمت تم گیسوؤں میں نہیں
جنت اک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں
[illegible] پر بھی چلنا ہے تجھے
[illegible] ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

[illegible] سے جبیں
[illegible] وقت بھی رکنے کا نہیں
لڑکھڑائے گی کہاں تک کہ سنبھلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے
(عورت صفحہ ۵۹)

[illegible] کیوں ہو؟
[illegible] کو چھپاتی کیوں ہو؟

ظلم تم نے کوئی ڈھایا تو نہیں
ابن آدم کو ستایا تو نہیں

[illegible] میں تنہائی کیوں ہو
[illegible] کو ....

پردہ ہے داغ چھپانے کے لئے
شرم ہے کذب پچھانے کے لئے
عشق اک گیت ہے گانے کے لیے

[illegible] میں جاتی کیوں ہو
[illegible] کو چھپاتی کیوں ہو

آؤ اب گھٹنے کی فرصت ہی نہیں
اور بھی کام ہیں الفت ہی نہیں
[illegible] خادمی بھی خدمت ہی نہیں

[illegible] شاعروں کی طرح سرمایہ داری اور
[illegible] کی طرف نہیں [illegible]
[illegible] اور یقین سے بھرا
[illegible] ہے۔

[illegible]
[illegible] کی [illegible]
[illegible] کی [illegible]
[illegible] آگ میں [illegible]
[illegible] کی چادریں [illegible]
[illegible] لال جھنڈا [illegible]

چلی آتی ہے شرمائی لجائی [illegible]
بھرے گھر میں قدم تھم تھم کے [illegible]
یہ سادہ سادہ گرد دل پہ [illegible]
پیا پہلے کامیابی سے [illegible]

ان اشعار میں کیفی نے جن بالکل نئی [illegible]
اُن سے اس اہم حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ [illegible]
کے اندر کھڑا ہے اور یا بقول سجاد ظہیر [illegible]
ہم آہنگی ہے:

کیفی کی خالص رومانی اور عشقیہ [illegible]
مندی، تازگی، فرحت اور [illegible]
اور اجتماعیت ہی کے اثر کا نتیجہ ہے [illegible]
جنسیت سے قطعی مبرا ہے۔ وہ اپنے [illegible]
اور غیر مبہم انداز میں ہمارے سامنے پیش کرتا [illegible]
دماغ پر نہایت سادگی، صفائی اور وضاحت [illegible]
ہیں۔ نہ تو اس کے جذبات میں ابہام اور [illegible]
اور نہ اس کے طرز بیان میں میراجی کے قسم کی [illegible]
پیچیدگی ہے۔ شاید یہ اصول ابد [illegible]
جتنی ہی اعلیٰ ہوگی اتنی ہی سادہ اور [illegible]
صرف خلوص اور سچائی کے عنصر سے پیدا ہو سکتی [illegible]
بجائے خود پیدا اداسیں اس حقیقت کا کیفی نے [illegible]
کے لیے وقف کر دیا ہے۔

[illegible]
[illegible]

ننگا ناچ

از گنپت شرما

انیس سو تیس، اکتیس کی تحریک سول نافرمانی میں یوں تو سب چھوٹے بڑے آدمی جی جان سے حصہ لے رہے تھے، مگر شوالا ان سے ملک سب پیچھے تھے۔ سیٹھ گوبند داس شوالا نے جس طرح انیس سو چودہ کی ودالی، اور انیس سو تیس کی شدھی سنگٹھن تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ویسا ہی انہوں نے اس تحریک میں بھی لیا۔ انہوں نے اپنے کارخانے میں کانگریس کو امداد دینے والی کمیٹی ہی نہیں مقرر کی بلکہ سینکڑوں بے کار مزدوروں کو بھی روزگار بھی دیا۔ حالانکہ اس کام میں انہیں کافی روپیہ خرچ کر کے نئی مشینیں منگانی پڑیں۔ مگر ملک کے فائدے کے سامنے انہوں نے اپنے روپیہ کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

دیسی کپڑے کے بائیکاٹ میں وہ پیش پیش تھے۔ انہوں نے اس تحریک کو زوردار بنانے کے لیے اپنا مل رات دن چلایا۔ اور شدھ کھدر کے تعمیری پروگرام کو انقلابی بنایا۔ اپنے مل میں آٹھ اور دس نمبر سوت تیار کرا کر موٹا کپڑا بنوایا۔ جسے بازار میں شدھ کھدر کی مانگ کو پورا کیا۔ اس پر مخالفوں نے آوازے کسے اور دھوکا دہی کا الزام لگایا۔ مگر سیٹھ گوبند داس نے کوئی پرواہ نہ کی۔ دیس سیوا میں اٹل رہے اور اپنے راستے کو نہ چھوڑا۔ اور وہ چھوڑتے بھی کیوں؟ وہ جو کچھ کر رہے تھے دیس کے لیے ہی تھا۔ اپنے منافع کا خیال تو انہیں ذرہ برابر بھی نہ تھا۔ اور پھر ان کی گنتی چوٹی کے لیڈروں میں ہوتی تھی۔ سارستی تک ان کی پہنچ تھی۔ ہزاروں روپیہ ماہوار ان کے مل سے جاتا تھا۔ ہندوستان بھر میں ایسی اعلیٰ اور دین دکھیوں کا خیال رکھنے والی ہستی اور کوئی نہ تھی۔ ملک میں اس کونے سے لے کر اس کونے تک ان کا نام پھیلا ہوا تھا۔ سیاسی اداروں کا کوئی آدمی ایسا نہ تھا جو ان کے نام سے واقف نہ ہو۔

کانگریس پرچار کے سلسلے میں شہر کے دوسرے حصوں کی طرح ان کے مل کے مزدوروں میں بھی جلسے ہوتے تھے۔ جلوس نکلتے تھے قومی لیڈر آتے تھے۔ اور قوم و ملک کے نام پر مزدوروں سے اپیل کرتے تھے۔ سیٹھ جی فراخ دل تھے۔ مزدوروں سے چندہ جمع کر کے اور کچھ خود بڑھا کر لیڈروں کو تھیلیاں نذر کرتے۔ دعوتیں کھلاتے اور آئندہ کے لیے زیادہ امداد دینے کے وعدے فرماتے۔

اخباروں میں ان امدادوں کا ذکر جلی حرفوں میں ہوتا۔ کالم کے کالم سیٹھ شوالا کی تعریفوں سے سیاہ ہوتے اور انہیں دان ویر، دینا دیالو، پرشیندر اور نہ جانے کیا کیا خطابات سیاسی اداروں اور اخبارات کی طرف سے دیئے جاتے۔

سول نافرمانی کر کے جیل جانا سیٹھ جی کے بس کا نہ تھا۔ یوں وہ زندہ دل آدمی تھے۔ دوسروں کو جیل جانے میں امداد کرتے تھے۔ روپیہ دے کر بھیجتے بھی تھے۔ اپنے مل کے مزدوروں سے تحریک میں حصہ لینے کے لیے اپیل کرنا ان کا کام تھا وہ ایسے مزدوروں کو جو جیل جا کر دیش کی خدمت کرنے کی خواہش رکھتے ہوں، امداد کرنے کا وعدہ کرتے تھے۔ کوئی بھی مزدور جیل جا سکتا تھا۔ وہ اسے دس پندرہ روپیہ ماہوار بطور امداد دے سکتے تھے۔ قومی لیڈروں کے آنے پر وہ ہمیشہ اپنا یہ اعلان کرتے۔ جیسے پانی پڑتے پڑتے پتھر کی سل گھس جاتی ہے۔ ایسے ہی مزدوروں پر بھی اثر ہوا۔ وہ بھی مسلمان ہو گئے اور ایمان لے آئے۔ سیٹھ جی کی اپیل پر لبیک کہنے لگے۔ ایک دن ایسا ہی جلسہ ہو رہا تھا کہ آشا رام، جو کئی سال سے سیٹھ جی کے مل میں دو سانچے چلا کر چالیس پینتالیس روپیہ ماہوار پیدا کر لیتا تھا۔ خدمت ملک کے جذبے سے سرشار —— "میں جیل جانے کو تیار ہوں۔" کہہ کر مزدوروں کی بھیڑ میں سے کھڑا ہو گیا۔ سیٹھ جی نے اس کی کمر تھپتھپائی اور یہ کہتے ہوئے کہ —— "ایسے بہادروں کی میں قدر کرتا ہوں، ایسے ہی آدمی میرے اور میرے مل کے نام کو دوبالا کریں گے۔" آشا رام کو جلسے میں آئے قومی لیڈروں کے حوالے کر دیا۔ آشا رام مزدور تو تھا ہی خاموشی کے ساتھ دیوی کے بکرے کی طرح قومی لیڈروں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ فوراً گیندے کے ہار چڑھائے گئے

پھولوں کا ایک ہار اس کی گردن میں ڈال دیا گیا اور "سیٹھ شولا زندہ باد" کے نعرے لگنے لگے ——————— ان دنوں گرفتاریوں کا زور دور تھا ہی۔ آشا رام دوسرے دن ہی پکڑا گیا۔ جیل میں مقدمہ ہوا۔ اور چھ ماہ کی سخت قید کا حکم سنا دیا گیا اور غریب کو تباہ کرنے کے لیے ایسی جیل میں بھیج دیا گیا۔ جہاں خطرناک کمیونسٹ، سوشلسٹ اور کوئی کوئی دہشت انگیزی کے مجرم بند تھے۔

——————— (۳) ———————

آشا رام کے چلے جانے پر مزدوروں میں اس کے چرچے ہونے لگے، اور جوش بڑھنے لگا۔ اور کیوں نہ بڑھتا؟ تحریک خوب زوروں سے چل نکلی تھی۔ کانگریس کا رنگ تمام ملک پر چھا گیا تھا۔ ہر آدمی جس میں ذرہ برابر بھی ہوش اور انسانیت تھی کانگریس کے رنگ میں آ گیا تھا۔ انقلاب زندہ باد اور بندے ماترم کے آسمان توڑ نعرے ملک کے کونے کونے میں گونج رہے تھے۔ جگہ جگہ نمک قانون توڑا جا رہا تھا۔ بدیسی کپڑوں کی ہولیاں جلائی جا رہی تھیں۔ شراب اور بدیسی کپڑوں کی دکانوں پر پکٹنگ ہو رہے تھے۔ دیہاتوں سے رضاکاروں کے جھنڈ کے جھنڈ مارچ کرتے ہوئے پایہ تخت دہلی کی طوفان کی طرح دوڑے چلے آ رہے تھے۔ معمولی نمک قانون کو توڑنے والی تحریک امید کے خلاف اس قدر بڑھی کہ کسانوں اور مزدوروں میں پہنچ گئی۔ حکومت نے خطرہ محسوس کیا۔ لیڈروں کی تحریک عوام کی تحریک بن گئی۔ اگر نہ کچلا اور دبایا گیا تو طاقت ضرور ہاتھ سے چلی جائے گی۔ اس لیے تحریک کو دبا دینے کی ٹھانی اور آرڈیننس راج قائم کر دیا۔ مگر تحریک پھر بھی نہ دبی۔ سرکار نے اور سختی کا رخ کیا۔ گرفتاریوں کا سلسلہ گرم ہو گیا۔ جگہ جگہ لاٹھیاں اور گولیاں۔ جلسے جلوسوں کو منتشر کرنے کے لیے استعمال ہونے لگیں۔ بچے یتیم ہونے لگے۔ سہاگنوں کے سہاگ اجڑے اور جنت نشان ہندوستان میں دودھ کے بجائے خون کی لہریں بہائی جانے لگیں ——————— لیکن ——————— یہ تیل تھا جس نے آگ کو بھڑکا دیا۔ تحریک میں نئی جان ڈال دی۔

یو۔پی میں دیہاتوں کے کسان جواہر لال کی جے کا نعرہ لگاتے ہوئے، لگان بندی کے جھنڈے کو لے کر کھڑے ہو گئے۔ بپھرے ہوئے طوفان کی طرح انہوں نے مزدوروں کے بغیر ہی بڑھنا شروع کیا۔ اور تحریک کو انقلابی شکل دے دی۔ رہنماؤں کو انہیں دیکھا وہ جیل کے سینخوں کے اندر ہی اندر پریشان ہو رہے تھے۔ ان کے سامنے یو۔پی کے دیہات اور بار بار دلی گھوم رہی تھی۔ وہ گھبرا کر چیخ اٹھے عوام کے جوش کو دیکھ کر اپنے عدم تشدد اور سچائی کے فلسفے کو قوم کے نام پر بڑا کاسٹ کرنے لگے۔ اور جب عوام نئے راستے پر چلنے کی تیاری کرنے لگے، تو رہنماؤں نے دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور بے چین عوام کو سمندر کی طرف دیکھتے رہنے کا پیغام دیا۔ جیسے وہ دور سے بے چینی کی دوائی لانے والے ہوں۔ کسانوں نے یقین کیا اور وہ تحریک بند ہو گئی۔ مگر مزدور اس میں شامل نہ ہوئے۔

——————— (۴) ———————

اس حشر کے بعد وہ سب قیدی جو سول نافرمانی کر کے جیل گئے تھے یا بھیجے گئے تھے چھوڑ دیے گئے۔ آشا رام بھی جیل سے آیا، مگر کچھ کھویا ہوا سا۔ اس کے سامنے ان انقلابیوں کی بتائی ہوئی باتیں جن کے ساتھ وہ جیل میں رہا تھا، اور جو مادر وطن سے سعادت مند فرزند کی طرح محبت کرنے کے الزام میں ابھی تک جیل کی چہار دیواری کی گندی اور تاریک کوٹھریوں میں بند ہیں، ایک ایک کر کے گھوم رہی تھیں۔ وہ جیل کیا ہو آیا تراز دیے انصاف ساتھ لے آیا ——— انقلابیوں نے اسے چند ایک کتابیں کیا پڑھائیں، اس کے دماغ کو ہی بدل دیا۔ سوچنے کی عادت ڈال دی۔

اب آشا رام بالکل بدل گیا تھا۔ تمام دن نہ جانے کیا سوچتا رہتا تھا۔ اب اس کے سانچے بھی پہلے کی طرح تیزی سے نہ چلتے تھے وہ بہت بہت دیر تک، سانچوں کے بند ہونے کا خیال کیے بغیر نگاہ اٹھائے، دیر سائلین اور پیلے کی طرف دیکھتا رہتا تھا جس میں لپٹ کر کتنے ہی مزدور اب تک اپنی زندگی کو موت کے حوالے کر چکے تھے اس کی نظریں چلتے ہوئے پٹے پر ایسے پڑتی تھیں، جیسے وہ اس میں الجھ کر مرنے والے مزدوروں کو تلاش کرتا ہو۔ اور ان سے پوچھنا چاہتا ہو، کہ تمہیں کس نے موت کی نیند سلایا؟ کس نے تمہارے ترچے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کیے؟

پہلے آشا رام کو پڑھنے سے نفرت تھی، مگر تصویر کا رخ بدل چکا تھا۔ بجائے نفرت کے محبت اور لگن ہو گئی تھی۔ دو چار کتابیں یا کوئی اخبار ہر وقت اس کے سانچوں کے قریب والے صندوقچہ پر پڑے رہتے تھے جنہیں وہ فرصت ملتے ہی اٹھا لیتا تھا۔ اور پڑھ

بیٹھ جاتا تھا ــــــــ شاید انہیں پڑھ کر ہی وہ عجیب و غریب باتیں کیا کرتا تھا جنہیں سن کر مستری ماسٹر اسے سنکی کہنے لگے تھے۔ ان مستری اور مہتیوں میں ایسے بھی تھے جو "پنڈت" کہہ کر اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اور مزدوروں کو اس سے بچنے کی صلاح دیا کرتے تھے۔ ــــــــ لیکن مزدور آشا رام کے دلدادہ تھے۔ نہ جانے کیا سمجھ کر اس کی بے حد عزت کرتے تھے۔ چھٹی کے وقت جو وہ اس کے گرد جمع ہو جاتے اور وہ انہیں کوئی کتاب یا اخبار پڑھ کر سناتا یا زبانی کچھ بتاتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزدور کارخانہ میں ہونے والی تکلیفوں کے چرچے کرنے لگے۔ اور ان کے ازالے کی ترکیبیں سوچنے لگے

ــــــــ (۴) ــــــــ

سیٹھ شولا کوئی گاؤدی تو تھے نہیں، وہ مزدوروں میں چلنے والی ان تمام باتوں سے واقف تھے۔ بڑے ہوشیار اور چالاک آدمی تھے۔ مزدوروں میں پھیلنے والی باتوں کو جاننے کے لیے وہ کئی لوگوں کو مفت تنخواہ دیتے تھے۔ ایسے ہی لوگوں کی بدولت انہوں نے اپنے مل کو باغیوں سے ہمیشہ پاک و صاف رکھا تھا۔ باغیوں کی بو ان کو بالکل نہ بھاتی تھی۔ ۱۹۲۸ء میں وہ ایسے کئی باغیوں کو مل سے نکال چکے تھے۔ باغیوں کو مل سے نکالنا تو ان کا اصول بن گیا تھا بس پتہ چلنے کی دیر تھی کہ باغی مزدور در در ہے۔ یہ بھی روک دیا جاتا تھا آشا رام سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ مگر وہ ان کے لیے وبال جان ہو رہا تھا۔ مزدوروں میں اس کی وقعت تھی۔ اس لیے اسے مل سے نکال کر خطرہ مول لینا تھا اور نہ نکالنا ہے ہی سانپ کو پالنے کے مترادف تھا سیٹھ جی اکثر اپنے پرس ملس کرتے کہ کیوں انہوں نے آشا رام کو کانگریس کی تحریک میں حصہ لینے کے لیے بھیجا۔ کبھی کانگریس اور قومی رہنماؤں کو کوستے۔ مگر اندیشہ جوں کا توں سوار رہا ہے۔ خطرہ کم نہ ہوا۔ بڑھتا ہی گیا

سیٹھ جی پریشان رہنے لگے۔ اور خطرہ سے بچنے کی ترکیبیں سوچنے لگے وہ کسی ایسی ترکیب کو ڈھونڈھ نکالنا چاہتے تھے، جس سے آشا رام بھی مل سے نکل جائے۔ اور کوئی گڑبڑ بھی نہ ہو۔ کئی دن تک سوچنے کے بعد بھی جب ان کی سمجھ میں کوئی ایسی ترکیب نہ آئی تو انہوں نے مستری ماسٹروں اور دیگر حلال خوروں کو اس مسئلہ کے حل کرنے کے لیے اپنی کوٹھی پر بلایا۔ اور ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ "چاہے روپیہ کتنا ہی خرچ ہو۔ مگر اس بلا کا علاج ضرور ہو جانا چاہیے"

مستری ماسٹروں اور حلال خوروں کی یہ میٹنگ بڑی اہم تھی۔ کوٹھی کے دائیں طرف باہر کے بڑے دروازے کے پاس والے کمرے میں سیٹھ جی کی زیر صدارت منعقد ہو رہی تھی۔ کوٹھی کے باہر چپ بورہ کی طرف سے کوڑا کرکٹ ڈالنے کے لیے ایک ٹین کا بڑا سا ڈھول پڑا تھا۔ جس کے چاروں طرف چیل کوؤں اور کتوں نے گھیرا ڈالا ہوا تھا ہر جانور اس بچے کھچے کھانے پر ٹوٹ رہا تھا۔ جو نوکروں نے وہاں ڈال دیا تھا۔ کتے کھانے کے علاوہ چیل کوؤں پر بھی جھپٹ رہے تھے۔ اور مال غنیمت کی طرح سب کو چٹ کر جانا چاہتے تھے۔

کوؤں کی کائیں کائیں اور کتوں کی بھوں بھوں کی اس آواز میں مستری ماسٹر بھی بول رہے تھے اپنی اپنی عقل کے مطابق سیٹھ جی کے سامنے ہر ایک ترکیبیں پیش کر رہا تھا ــــــــ

ــــــــ مالک اور غلاموں کی اس میٹنگ میں آشا رام کا علاج کرنے کے لیے بہت سی ترکیبیں آئیں۔ مگر سیٹھ جی کو ان میں سے کوئی پسند نہ آئی اور انہوں نے مستر انعریٹیو دی ونگ ماسٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "آشا رام کو صاف کرنے کے لیے ایسی ترکیب ہونی چاہیے۔ جس سے سانپ مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ تب ہی مزدوروں میں پھیلی ہوئی بے چینی کو دور کیا جا سکتا ہے۔" سیٹھ جی اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ آشا رام نے اسی وقت دروازہ کھول کر اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ "وہ بے چینی دور کرنے کا ایک اور بھی بہت ہی آسان طریقہ ہے" ــ سب کے چہرے زرد پڑ گئے۔ میٹنگ میں کھلبلی مچ گئی تمام آدمیوں کے منہ کھلے اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کسی نے خوف زدہ لہجہ میں کہا "آ...... شا ر ۔ ا ...... م ـ"

"ہاں میں آشا رام ہوں۔ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا درست!" آشا رام نے کہا اور کاغذ جیب میں سے نکالتا ہوا سیٹھ جی کی طرف بڑھا سیٹھ جی کاغذ دیکھنے سے پہلے ہی گرج کر بولے "آشا، یہاں کیسے آئے؟ نکل جاؤ یہاں سے، ورنہ پولیس کے حوالے کر دوں گا!

آشا رام جیسے پتھر کی مورت ہو۔ یا خدا کے اس فرمان کو سنبھالے ہو جس میں اس نے انسان سے کہا ہے کہ "ہم نے تجھے اشرف المخلوق بنایا" خاموش کھڑا سیٹھ جی کے غصہ کو دیکھتا رہا۔ اور وہ کاغذ جسے وہ ہاتھ میں لے رہا تھا ان کی میز پر رکھ دیا۔ سیٹھ جی نے اسے پھاڑ کر پھینک

دیا۔ آشارام نے کہا ـــــــــــ "سیٹھ جی پڑھ تو لیا ہوتا۔ اس کاغذ میں مزدوروں نے اپنی تکلیفیں درج کی تھیں، اور اس کٹوتی کو بند کرنے کی مانگ کی تھی جو دین دکھیوں کو امداد دینے کے بہانے کاٹی جاتی ہے، جس نے آپ کو داں دیر بنا دیا۔ جواب جاننے کے لیے مزدور بے تاب ہیں۔ اور کوٹھی کے باہر کھڑے ہیں۔"

اتنا سننا تھا کہ سیٹھ جی بگڑ گئے۔ غصہ کا پارہ بڑھ گیا۔ سانس ناک کی راہ آنے لگی۔ دانت کٹکٹاتے ہوئے بولے۔ آشا... آ... !

تو میرے مزدوروں کو بھڑکا رہا ہے۔ تو جس برتن میں کھاتا ہے۔ اسی میں سوراخ کرتا ہے۔ تو نمک حرام ہے۔ ذلیل، کمّا!"

اب آشارام سے نہ رہا گیا بولا ـــ "سیٹھ جی یہ سب آپ کس کے لیے کہہ رہے ہیں۔؟ معلوم ہوتا ہے کہ غصہ میں آپ اس شرابی کی طرح بڑبڑا رہے ہیں جو نشہ میں اپنے گناہوں کی حقیقت کو چھپاتا ہوا لڑکھڑاتا چلا جاتا ہے۔ اور نالی میں جا لوٹتا ہے۔ خیر کچھ ہی کہئے مگر جواب تو دے دیجئے۔ میں مزدوروں سے جا کر کیا کہہ دوں؟"

"نکل جا یہاں سے! تیرے جیسے نمک حرام کو میں کوئی جواب نہیں دیتا۔ بدمعاش!" سیٹھ جی نے چیختے ہوئے جواب دیا

"تو پھر کل سے ہڑتال ہوگی۔" آشارام نے کہا۔

"ہڑتال ہوگی۔" سیٹھ جی نے آنکھ نکال کر رعب ڈالتے ہوئے پوچھا ـــــ

"جی ہاں" آشارام نے جواب دیا۔ سیٹھ جی نے کہا۔ "دیکھ لوں گا!!"

ـــــــ :(۵): ـــــــ

اس دن اتوار تھا۔ چھٹی کا دن۔ رات بھر بارش ہوتی رہی۔ صبح کے چار بج گئے۔ مگر بوندیں بند نہ ہوئیں۔ ساڑھے چار بجے مل کا بھونپو بولا۔ سوتے ہوئے مزدور جاگ اٹھے اور جاگتے ہوئے مزدوروں میں کھلبلی مچ گئی۔ ٹولیاں بنا کر مل کے گیٹ کی طرف دوڑنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے مل گیٹ پر ہزاروں کی بھیڑ جمع ہو گئی۔ کچھ لوگ نیم کے درخت کے نیچے بوندا باندی سے بچنے کے لیے جا کھڑے ہوئے۔ نیم کا درخت جھک رہا تھا رات کی موسلا دھار بارش نے لب سڑک اس گرد و غبار سے اٹے ہوئے نیم کے درخت کو اس طرح چمکا دیا تھا، جیسے احساس عقل کو جگمگا دے۔ نیم کے صاف اور شفاف پتے برقی لیمپ کی روشنی میں کسی ننھی بوندوں کی وجہ سے آسمان کے ستاروں کی طرح چمک رہے تھے چاروں طرف سے آ آکر نئے مزدور اسی نیم کے درخت کے نیچے کھڑے ہو رہے تھے۔ جوشیلے مزدور زور زور سے انقلاب زندہ باد، سرمایہ داری برباد ہو۔ آج کیا ہے؟ ہڑتال ہے کے فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ پکٹنگ کرنے والے رضاکار مل میں جانے والے مزدوروں کو سمجھا سمجھا کر اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر، روک رہے تھے۔ رضاکاروں کی ٹولیاں ادھر سے ادھر گشت لگا رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ہندوستان میں سرخ فوج تیار ہو گئی ہو

سیٹھ جی کا عجیب حال تھا غصہ سے لال انگارہ بنے مل کے گیٹ میں کھڑے مزدوروں کے جمگھٹ کو گھور رہے تھے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ادھر ادھر کسی کی تلاش میں گھوم رہی تھیں جب آشارام بھیڑ کے بیچ میں داخل ہوا۔ تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ انہوں نے غصہ میں جھلاتے ہوئے اپنے پاس کھڑے ہوئے کسی جلال خور سے کچھ کہا۔ اور آشارام کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ کیا۔ جیسے وہ بتا رہے ہوں وہ ہے! وہ ہے!

آشارام بھیڑ کے بیچ میں کھڑا زور زور سے لیکچر دے رہا تھا۔ مزدور ایک ایک جملے پر انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند کر رہے تھے دوپہر کا وقت ہو چکا تھا مگر جوش بڑھتا ہی جاتا تھا۔ آشارام مزدوروں کی آشا بن گیا تھا۔ ان کے سینے چراغِ امید مزدور اس کے حکم پر قربان ہونے کے لیے تیار تھے۔ اس کا صرف ایک لفظ مل کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتا تھا۔ لیکن وہ سیاسی لیڈر سے سیکھ چکا تھا۔ ناصح قوم کی طرح مزدوروں کو رہنمائی دے رہا تھا۔ اور ایک تجربہ کار ماہر کی طرح تقریر کر رہا تھا۔ اچانک ایک پتھر اس کے پیروں میں آ کر گرا مزدوروں میں آتشِ انتقام بھڑک اٹھی۔ جوابی حملے کے لیے ہر ایک مزدور پتھر ڈھونڈنے لگا۔ ـ ـ ـ اس وقت آشارام نے معاملے کی نزاکت کو پہچانا، اس نے فوراً تجربہ کار لیڈر کی طرح مزدوروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ساتھیو! آپ کوئی ایسی حرکت نہ کریں۔ کیونکہ ہمیں عام جنتا کی ہمدردی حاصل کرنی ہے۔ اگر ہم نے پتھر کا جواب پہلے دن پتھر سے دیا۔ تو ہمیں بھاری نقصان اٹھانا پڑے گا اور ہماری لڑائی . . . ابھی جملہ پورا نہ ہوا تھا کہ دوسرا پتھر ٹھیک اس کے سر پر آ کر پڑا۔ اس نے سر کو پکڑ کر لیکچر جاری رکھنے کی کوشش کی۔ مگر بے سود وہ ایک لفظ بھی نہ بول

تھا اور آہستہ آہستہ زمین پر بیٹھ گیا۔ لیٹتے ہوئے اس نے مزدوروں سے پھر اپیل کی مگر اب مزدور جوش میں آ چکے تھے جو اپنی حد ہو چکا تھا۔ اب مزدوروں کو روکنا آسان نہ تھا ——

اُدھر دلیپ بھگت سیٹھ جی اس موقع کی تلاش میں تھے مزدوروں کو کچل دینے کے لیے انہوں نے پہلے ہی سے ہتھیار بند پولس بلا لی تھی وہ پہلے ہی فیصلہ کر چکے تھے کہ چاہے کتنا ہی روپیہ کیوں نہ خرچ کرنا پڑے لیکن انہیں پروا تھوڑا ہی تھی محنت اور خون پسینہ کی کمائی ہوئی دولت کون لٹاتا ہے۔ چور اور ڈاکوؤں کے پاس مالِ غنیمت ہوتا ہے اگر اس میں سے کسی کو دے دیا جائے، راضی سے نہیں زبردستی، مجبوراً۔ اگر نقصان ہی کیا؟ ہر صورت میں فائدہ رہے گا۔ منافع ہی منافع ہے ——— قانون کچھ بھی بڑا تھا۔ پتھر چلنے کے چند ہی سکنڈ بعد ہی لاٹھی چارج شروع ہو گیا۔ لیکن پتھروں کی لگاتار بارش نے سپاہیوں کے چھکے چھڑا دیے ہوش گم ہو گئے۔ ان بے چاروں کو ایسا موقع کبھی پیش نہ آیا تھا۔ لاٹھیاں بے کار گئیں تاب نہ لا کے لیے اسٹیم مارموا ... کی اور ساتھ سرمایہ داری

کا ننگا ناچ شروع ہو گیا۔ رائفلوں نے آگ اگلنی شروع کر دی گرتے پڑتے خون سے لت پت مزدور پھر بھی ڈٹے رہے۔ لیکن کب تک نہ اس رقصِ عریاں کی تاب نہ لا سکے ——

ہڑتال نہیں ٹوٹی۔ ملں آنند رام گرفتار کر لیا گیا۔ اس کا زخمی سر کپڑے سے، اور ہاتھ ہتھکڑی سے بندھے ہوئے تھے۔ اور اُسے جیل لے جایا جا رہا تھا۔ وہ کچھ سوچتا ہوا جا رہا تھا شاید تجربہ اور نئے سبق حاصل کرے۔ سر متعلق پہلے بھی اس نے اسی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی تھی بہت کچھ سیکھ چکا تھا۔ اب پھر وہی مدرسہ ہے ...

دیولی کیمپ جیل راجپوتانہ

بقیہ مضمون سلسلہ صفحہ ۴۹

پچھلے پہر کا نرم دھندلکا تھا پرفشاں
مایوسیوں میں جیسے امیدوں کا کارواں
ذہن سے تیرگی کے سحر چھوٹتے کو تھی
مشرق کے حاشیے میں کرن پھوٹنے کو تھی

یہ ہیں کیفی کی خصوصیات جن سے دو نتیجے مرتب ہوتے ہیں (۱) کیفی دوسرے ترقی پسند شعراء سے بعض بنیادی باتوں کے لحاظ سے بہت حد تک مختلف ہے۔

(۲) کیفی انقلابی شاعری کے ایک نئے دور کا املیں شاعر ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ کیفی اپنی موجودہ منزل میں اول درجہ کا فن کار ہے۔ اس بات کا دعوی کرنا جو کیفی کے ... بے انصافی ہوگی ہمیں دراصل صرف اس کی شاعری کی ان امکانات اور خصوصیات سے بحث ہے جن کی بنا پر مستقبل کے لیے ہم توقعات قائم کی جا سکتی ہیں۔ سجاد ظہیر نے اپنے پیش لفظ میں تین باتوں کا تذکرہ کیا ہے جو کیفی کے ... نظر پڑتی ہیں۔

(۱) کسی شاعر کی شاعرانہ زندگی کا آغاز مشکل سے اس سے بہتر ہو سکتا ہے۔"

(۲) ان کے کلام میں معنویت اور فن دونوں اعتبار سے قدرتی ترقی ہے

(۳) کیفی کا رُخ صحیح طرف ہے اور ان کے قدم آگے بڑھ رہے ہیں

لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف نہ کرنا غلط ہوگا کہ کیفی کے کلام میں گہرائی اور ابدیت کے عناصر کی کمی ہے۔ لیکن ہمیں امید کرنی چاہیے کہ کیفی اپنے مزید تجربوں اور مشاہدوں، غور و فکر اور علمی طور سے اس کمی کو ضرور پورا کر لیں گے خاص کر جب کہ ان کا رُخ صحیح طرف ہے اور وہ دوسرے انقلابی شاعروں کی طرح کچھ ابتدائی اور بنیادی خامیوں کے شکار نہیں ہیں۔

آہ! ڈاکٹر بینی پرشاد

ہم نہایت حسرت و یاس کیساتھ ناظرین کو یہ اطلاع کرتے ہیں کہ ۸ اپریل بروز اتوار ۱۰ بجے دن علمی زندگی کے مخصوص قلمی معاون جناب ڈاکٹر بینی پرشاد صاحب صدر شعبہ سیاسیات الہ آباد یونیورسٹی نے حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب اس دار فانی سے عالم جاودانی کو کوچ فرمایا۔ ادارہ اس حادثۂ جانکاہ پر اپنے دلی صدمہ کا اظہار کرتا ہے اور لواحقین سے اپنی پُرخلوص ہمدردیوں کا اظہار کرتا ہے۔

ڈاکٹر بینی پرشاد صاحب کا شمار جدید ہندوستان کے سب سے زبردست سیاست اور علوم معاشرت کے عالموں میں ہوتا تھا دستور ہند اور تحفظات کے مسائل پر ان کے مضامین اور مقالے غیر ممالک میں بھی دلچسپی کیساتھ پڑھے گئے ہیں تاریخ دستور حکومت کا اتنا گہرا اور وسیع مطالعہ سیاست کے بہت کم عالموں کو حاصل تھا۔ اس وقت جبکہ ملکی سیاست ایک پر امید صورت اختیار کر رہی ہے اتنے بڑے ماہر دستور کا رحلت کر جانا ایک اہم قومی نقصان کے مرادف ہے۔ اُنکی مشہور و معروف انگریزی تصنیفات جو ہندوستان سے باہر کے ممالک میں بھی معیاری تسلیم کی جاتی ہیں مندرجہ ذیل ہیں۔ جہانگیر، قدیم ہندوستان کا ریاستی نظام، ہندوستان کا قدیم تمدن، جمہوری طرز عمل، ہندو مسلم مسائل (موخر الذکر تصنیف کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے) فیڈرلزم (Federalism) اور تعلیم و سیاست کے مسئلہ پر اُنکی تصنیفات اُن کی بے وقت موت کے سبب نامکمل رہ گئیں تعلیم و سیاست کے کچھ اجزاء ڈاکٹر صاحب کی اجازت سے سالنامہ نئی زندگی (۱۹۴۴ء) کے صفحات کو زینت بخش چکے ہیں۔ یوروپین زبانوں کے علاوہ ڈاکٹر صاحب سنسکرت اور فارسی کے بھی عالم مانے جاتے تھے، چنانچہ انھوں نے شیخ سعدی کے گلستاں کا ہندی میں ترجمہ کیا۔

ڈاکٹر صاحب کا تعلیمی کیریر بیحد شاندار تھا، میٹریکولیشن کے امتحان میں وہ پورے صوبے میں اوّل آئے اور الہ آباد یونیورسٹی سے تاریخ میں فرسٹ کلاس فرسٹ ڈویژن پاس کیا۔ لندن یونیورسٹی میں تاریخ و سیاست کے ایک بیحد ذہین طالبعلم کی حیثیت سے وہ اپنے استاد پروفیسر ہیرالڈ جے لاسکی کی نگاہوں میں بہت عزت و وقعت رکھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے دو مضامین میں ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی ایک تاریخ اور دوسرے اقتصادیات میں۔ جہانگیر پر اُن کی تصنیف پر انھیں تاریخ کے ڈاکٹر کی ڈگری ملی تھی مگر کتہ الآراء تصنیف شمار کی جاتی ہے۔

انھوں نے ۲۰ سال تک الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ و سیاسیات کی خدمت کی اور اس عرصہ میں الہ آباد یونیورسٹی کی شہرت کو پورے ہندوستان میں پھیلا دیا۔ بہت سے طالب علم صرف اُنکی علمیت اور قابلیت سے متاثر ہو کر دوسری یونیورسٹیوں سے تاریخ و سیاست کے مطالعہ کے لئے الہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لیتے تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے طلباء میں وہ (Intellectualgiant) کے نام سے مشہور تھے ڈاکٹر صاحب نے انڈین پولیٹکل سائنس کانگریس اور سکنڈری ایجوکیشن کانفرس کی صدارت کے بھی فرائض انجام دئے تھے۔

سیاسی اعتبار سے وہ قومیت پسند تھے۔ لیکن قومیت سے متعلق اُن کا نظریہ ٹھوس مطالعہ کے سبب ہر قسم کی خامی سے پاک تھا۔ ان کے سیاسی نظریوں پر اشتراکیت کا بھی گہرا اثر پڑا تھا لیکن وہ اشتراکیت کی مادی بنیادوں سے اختلاف رکھتے تھے اور مشرق کے روحانی اصولوں کی صحت مند تجدید کو امن عالم اور ایک بہتر تمدن کے قیام کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ اُن کے روحانی نظریوں میں تمام مذاہب اور تمام تمدنوں کے بہترین اور اعلیٰ ترین عناصر کا ایک دلکش امتزاج (Synthesis) پایا جاتا تھا وہ روحانیت اور اخلاقیات کے سلسلے میں Ecclecticism (انتخابیت) کے ہمنوا اور قائل تھے۔ مذہبی تنگ نظری، لسانی، نسلی اور قومی تعصب سے سخت نفرت کرتے تھے ہندو مسلم اتحاد کو ہندوستان کی آزادی اور ترقی کے لئے بنیادی طور پر ضروری سمجھتے تھے یونیورسٹی اور یونیورسٹی سے باہر اُن کا عمل اور کردار غیر فرقہ وارانہ غیر جانبداری اور ہندو مسلم کلچر کے ملاپ کا ایک اعلیٰ اور مکمل ترین نمونہ تھا۔ یونیورسٹیوں کے مشاعروں اور اردو سے متعلق ہر قسم کے FUNCTION میں وہ لازمی اور لابدی طور پر موجود رہتے تھے اور اس میں خاص دلچسپی لیتے تھے۔ کلاس لکچر کے دوران میں دنیا کے مختلف تمدنوں اور سیاسی نظریوں کے تجزیہ و تشریح میں اُن کا طریقہ کار (METHOD) خالص SECULAR اور سائنٹفک تھا۔ چنانچہ الہ آباد یونیورسٹی میں ایک خالص غیر مذہبی اور غیر فرقہ وارانہ (SECULAR) فضا اور ماحول پیدا کرنے میں ڈاکٹر تارا چند کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر بینی پرشاد صاحب کا بھی زبردست حصہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب طلباء کے بہت ہمدرد تھے انھوں نے بیشمار غریب و ضرورتمند طلباء کی مالی اعانت اور تمام ممکن ذرائع سے اُن کی مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر صاحب کی موت سے علمی اور تعلیمی دنیا کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔

[illegible] صاحب کی غزلوں اور نظموں [illegible]

[illegible] اکیڈمی حیدرآباد دکن۔ قیمت قسم اول [illegible] ضخامت ایک سو ساٹھ صفحات۔ کاغذ کھائی [illegible] رنگین [illegible] جس پر موضوع سے متعلق کچھ فن [illegible] کتاب کے چوتھے صفحے پر مصنف کی تصویر ہے [illegible] صاحب کے کلام کا غالب رنگ عمومی قسم کا شباب [illegible] گہرائی اور پائدار تجربات کا حامل نہیں ہے [illegible] موضوعات پر بھی دو چار نظمیں نکل آئی ہیں لیکن [illegible] رجحان کی نمائندگی نہیں کرتیں۔ ایسا معلوم ہوتا [illegible] صاحب گذشتہ آٹھ نو سال کی سماجی اور ادبی تحریکوں [illegible] بہت کم متاثر ہیں۔ ان کی شاعری کا دور تقریباً [illegible] اختر شیرانی کا تخلیق کردہ رومانی دور کہا جاتا ہے اور جو [illegible] شاعری میں اپنا آخری جلوہ دکھا کر انقلابی اور ترقی پسند [illegible] طوفان میں غائب ہو جاتا ہے۔ بہرحال ان کے فن [illegible] کے پیش نظر اور ان کی عمر کا خیال رکھتے ہوئے یہ توقع [illegible] اگر انھوں نے اپنے آرٹ کو زندگی کے ٹھوس حقائق [illegible] کوشش کی اور تہذیب کے ساتھ مشق سخن کا سلسلہ [illegible] یقیناً خوشگوار ہوگا۔

[illegible] بہرحال قابل مطالعہ ہے۔ اور امید ہے کہ جدید اردو [illegible] دلچسپی لینے والے حضرات یقیناً اس طرف متوجہ ہونگے [illegible] کھائی اور چھپائی کی عمدگی موجودہ "طباعت کش" دور کے [illegible] ہے۔

[illegible] مصنفہ میر عابد علی خاں بی۔ اے۔ ملنے کا پتہ دار الاشاعت سیاسیات و دکنی حیدرآباد دکن [illegible] عمدہ لکھائی چھپائی عمومی۔ گرد پوش حسین اور دیدہ [illegible] ت۔ سائز عام طور پر جو ہوتا ہے۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے زیر نظر تصنیف میں [illegible] کے ذہنی مشاہیر کے حالات زندگی اور ان کے نظریوں [illegible] کا مختصر لیکن بہت حد تک جامع تذکرہ ہے۔ کتاب [illegible] ملک [illegible] ویرس یات سین، چیانگ [illegible] کے نام [illegible] انتخاب کا ثبوت ہیں۔ طرز ادا عام طور پر رواں اور [illegible] کہیں پر جدید اصطلاحات کی صنعت کے تحت [illegible] طور پر کچھ بھاری بھرکم سا ہو گیا ہے۔ مثلاً "صنعتی انقلاب نے استعماریت اور نو آبادکاری کو مغربی ممالک کا جزو سیاست قرار دے دیا"۔ معلومات عامہ کے نکتہ نظر سے زیر بحث تصنیف کا مفید ہونا ایک امر مسلمہ ہے

عالمگیر افسانہ نمبر ۱۹۴۵ء

[illegible] کھائی چھپائی [illegible]

ٹائٹل کا صفحہ خاص طور پر نظر زیب۔ حجم ایک سو چار صفحات قیمت [illegible] ایک روپیہ جو رسالہ کی مالی اور ادبی حیثیت کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ عالمگیر اردو کا بہت پرانا اور وقیع رسالہ ہے۔

جنگ کے اس ادبی اور کاغذی قحط کے زمانہ میں اس قدر [illegible] افسانہ نمبر نکالنا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ عالمگیر کی معاشی اور ادبی بنیادیں دونوں بہت مضبوط ہیں۔ تمام افسانے چاہے اردو افسانہ نگاری کے بالکل حالیہ رجحانات کی نمائندگی نہ کرتے ہوں لیکن دلچسپ اور [illegible] ضرور ہیں اور امید ہے کہ شائقین ادب اسے ہاتھوں ہاتھ خرید کر عالمگیر کی ادبی خدمات میں ہاتھ بٹائیں گے۔ افسانہ نگاروں کی فہرست میں [illegible] اور مرزا ادیب کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

دکن کی سیاسی تاریخ

[illegible]

[illegible] ملنے کا پتہ دار الاشاعت سیاسیات [illegible] حجم تین سو صفحات۔ سائز جو عام طور پر [illegible] کتاب کا [illegible]

تاریخ نادرشاہ کے حملوں (۱۷۳۹ء) سے آگے نہیں بڑھتی۔ باب اوّل نظام الملک بانی ریاست آصفیہ کے اسلاف و خاندان سے متعلق تحقیق و تفتیش پر مشتمل ہے اور آخر میں دکن کا ایک نقشہ بھی شامل ہے جس میں ریاست حیدرآباد کے قدیم و جدید حدود دکھلائے گئے ہیں اور اس کے ساتھ نظام الملک کے عہد حکومت میں جن صوبوں اور اضلاع پر ریاست حیدرآباد مشتمل تھی اُن کا بالتفصیل بیان ہے۔ عالمگیر کی وفات کے بعد خانہ جنگیوں سے لے کر نادرشاہ کے ہندوستان سے رخصت ہونے تک کے اُن واقعات کو نہایت تفصیل اور تحقیق و تفتیش کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ جن کا تعلق کتاب کے موضوع سے ہے اور معلومات کا وافر ذخیرہ فراہم کردیا گیا ہے۔ واقعات اور ابواب کی تنظیم و ترتیب اور کتاب کا مجموعی ڈھانچہ پسندیدہ ہے۔ اگرچہ کتاب کا زیادہ تر حصّہ محض واقعہ نویسی پر مشتمل ہے جو حقیقی فن تاریخ نویسی سے بالکل علیحدہ اور کم پایہ کی چیز ہے پھر بھی اسے مکمل طور پر "محض واقعہ نویسی" کا نمونہ نہیں قرار دیا جاسکتا اس لئے کہ فاضل مصنف نے باب دوم کے اس حصہ میں جس کا عنوان "انقراض سلطنت اور دکن کی علیٰحدگی کے اسباب" ہے سلطنت مغلیہ کے انتشار اور ریاستوں کی علیٰحدگی کے اسباب سے بحث ہے۔

چنانچہ یہاں پر کچھ ایسے سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں جن کا تعلق فلسفۂ تاریخ سے ہے اور جن میں "تاریخی انقلابات اور سیاسی عروج و انحطاط کے کچھ بنیادی اصولوں سے بحث چھڑ جاتی ہے۔ فاضل مصنف نے عام اردو داں پبلک کی سادہ لوحی اور سماجی علوم سے عمومی ناواقفیت پر بھروسہ کرتے ہوئے ہمیں یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ عروج و عریض سلطنت مغلیہ کے انتشار کا سبب یہ تھا کہ اکبرؔ، جہانگیرؔ اور شاہجہاںؔ کے پرسکون زمانہ حکومت میں تہذیب و تمدن انتہائی منازل عروج طے کرچکا تھا۔ تہذیب و تمدن کی ترقی کو سیاسی انحطاط کا سبب قرار دینا فلسفہ تاریخ کا ایک ایسا عجوبہ نظریہ ہے جو معاشرتی علوم (Social Sciences) کے ہر ابتدائی طالبعلم کو بحر تحیّر میں غرق کردینے کے لئے کافی ہے۔

"ملک کی عام زندگی بھی تمدن و تہذیب کی ترقی سے اتنی مسموم ہوگئی کہ۔۔ "

[صفحہ ۱۹۰ (ایک سو نوّے) سطر ۱۷ اور ۱۸]

"تمدن و تہذیب نے اہل ملک کو آرام طلب و عیش پسند بنادیا"

[صفحہ ۱۹۲ سطر ۱۰]

تہذیب و تمدن کے عروج کے خلاف اس قسم کا ردِّعمل (REACTION) یا تو ہمیں ازمنۂ قدیم کی بربریت میں ملتا ہے یا زمانہ حال کے فاشسٹ نظریہ و عمل میں۔ تاریخ کا مطالعہ تو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ سیاسی ترقی اور تہذیبی و تمدنی ترقی دونوں دست بدست ایک دوسرے کے متوازی حرکت و رواں دواں رہی ہیں۔ مثال کے طور پر ملکہ الیزبیتھ کے زمانہ کا انگلستان انیسویں صدی کا انگلستان اور زمانۂ حال کے سوویٹ روس کو پیش کیا جاسکتا ہے انسان کے مادی ذرائع اور آسائیوں کی فراوانی ہی وہ مقاصد ہیں جن کے لیے سیاسی تنظیمیں وجود میں لائی جاتی ہیں۔ اور سیاسی نظام کی برتری اُن کے حصول کو آسان اور سہل بناتی ہے۔ سیاسی تنظیم کو معاشرت کا مقصد نہیں قرار دیا جاسکتا' معاشرتی زندگی کا مقصد انسان کے مادی اور خارجی ذرائع کو مکمل اور بھرپور بنانا ہے تاکہ ایک اعلیٰ تر اخلاقی اور داخلی زندگی کا حصول ممکن ہوسکے۔ سیاسی نظام محض ایک ذریعہ ہے ان مقاصد کے حصول کا۔ عیش پسندی، تعیش پرستی، تساہلی کو سیاسی انحطاط کا بنیادی سبب قرار دینے کی مثال ویسی ہے جیسے کوئی آدمی گھوڑے کے آگے گاڑی رکھنے کی کوشش کرے۔ سماجی انحطاط کی یہ علامتیں دراصل خود سیاسی جمود و تعطل سے پیدا ہوتی ہیں اور اس وقت خطرناک نتائج پیدا کرنے لگتی ہیں جب سماج کا ایک مخصوص طبقہ اپنے مخصوص مفادوں کے پیش نظر رائج سماجی نظام کو (جو تہذیب و تمدن کی "مزید" ترقی کے منافی ہوتا ہے) زبردستی برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاسی جمود کا پیدا کردہ سماجی اور اخلاقی انحطاط آگے چل کر سیاسی واقعات کے رخ کو بھی متاثر کرتا ہے لیکن صرف سطحی طور پر اور ایک مخصوص حد تک۔ فاضل مصنف نے اسی اخلاقی انحطاط کو سیاسی زوال کا بنیادی سبب قرار دیا ہے جو زیادہ سے زیادہ ایک سطحی تجزیہ ہے۔ فاضل مصنف نے یہ نہیں بتایا کہ سلطنت مغلیہ کے آخری دور کا اخلاقی انحطاط بجائے خود تخلیق تھا اس سیاسی جمود کا جسے اورنگ زیب کی سیاسی رجعت پسندی نے فروغ دیا تھا۔ اس کی تشریح یوں ہے۔ مغل حکمرانوں کے پرامن عہد حکومت نے اور دکن میں یورپ والوں کی آمد نے تجارتی سرمایہ داری کو ایک ایسی منزل پر پہنچادیا تھا جہاں ترقی پسند سیاسی رجحان کا تقاضا تھا کہ ہندوستان کے مخصوص علاقے اگر مکمل طور پر آزاد نہیں تو کم سے کم خود مختار ضرور ہوجائیں۔ لیکن ترقی کا یہ رجحان (جس پر ہندوستان کے جمہور کی تہذیب و تمدن کی مزید ترقی کا دارومدار تھا) مستحکم سلطنت کی مرکزیت کے منافی تھا۔ اورنگ زیب کی ذہنی جدوجہد کا مقصد اسی مرکزیت کو زبردستی برقرار رکھنا اور تجارتی سرمایہ داری کے پیدا کردہ

مادی حالات کے تحت مقامی خود مختاری کے ترقی پسند رجحان کو کچلنا تھا تہذیب و تمدن کی ترقی کی رفتار کو برقرار رکھنے کے لئے جس سیاسی انقلاب کی ضرورت تھی اُسے اورنگ زیب نے تلوار کے زور سے ایک خاص مدت تک روکے رکھا۔ اس کے مرنے کے بعد مغل سلطنت کا بے ڈول ڈھانچہ ٹوٹ کر رہا لیکن اسوقت جبکہ مغرب کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ سرمایہ داری ہندوستان کو اپنا مرکز نگاہ بنا چکی تھی۔ مغل سلطنت کے آخری دور کے سیاسی جمود نے لازمی طور پر وہ اخلاقی اور سماجی انحطاط پیدا کیا جو آگے چل کر خانہ جنگیوں اور حکمرانوں کی فوجی کمزوری ناقابلیت اور تعیش پرستی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ دکن میں نظام الملک کی "مستقل ریاست کا قیام" جس عام سلسلہ کا واقعہ ہے اُس کی تشریح وہی ہے جو اوپر پیش کی جا چکی ہے۔ یعنی خود مغل سلطنت کے زمانۂ امن کے پیدا کردہ اقتصادی اور مادی حالات جن کا منطقی تقاضا مرکزیت کے منافی تھا مقامی خود مختاری کے رجحان کے موافق تھے۔

عالمگیر کی وفات کے بعد نالائق آدمیوں کی کیابی کو مغل سلطنت کے زوال کا سبب قرار دینا تاریخی واقعات کا ایک ایسا فرسودہ اور سطحی تجزیہ ہے جو عہد جدید کے سائنٹفک ذہن کے مطالبات پورا کرنے سے قاصر ہے۔ شخصیتیں بجائے خود سیاسی ماحول کی پیداوار ہوتی ہیں اور تاریخی میلانات و رجحانات پر محض سطحی طور پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ شخصیتیں تاریخی واقعات کا رخ یکسر بدل دینے سے قاصر ہیں اس لئے کہ اُن واقعات کی جڑیں زندگی کے خارجی اور مادی حقائق میں ہوتی ہیں اور مدبرین کے داخلی ارادوں اور خواہشات سے آزاد۔ اس کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ اورنگ زیب کی عظیم الشان اور زبردست شخصیت بھی سلطنت مغلیہ کو ٹوٹ کر بکھر جانے سے نہ روک سکی۔

ط۔ ا۔ خ

نئی زندگی کا جولائی (۴۵ء) نمبر

سان فرانسسکو نمبر ہوگا

جسمیں

موجودہ انقلاب انگیز بین الاقوامی سیاسیات، سان فرانسسکو کانفرنس میں ممالک عالم کے اتحاد اور اسکی نوعیت و اہمیت پر ملک کے بہترین مفکر اور رہنماؤں کے مضامین ہونگے

اگر آپ موجودہ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات اور اسکی پیچیدہ سیاسیات کو سمجھنا چاہتے ہیں تو آپکے لیے اس نمبر کا مطالعہ ضروری ہے جو

اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہوگی

اس خاص نمبر کی مزید تفصیلات کا اعلان نئی زندگی کے جون نمبر میں کیا جائیگا

کاغذ کی دقتوں کے سبب آرڈر کے مطابق کاپیاں چھاپی جائینگی۔ لہذا ۱۲؍ (معہ محصول) بھیجکر فوراً اپنی کاپی محفوظ کرا لیجئے

قیمت خاص نمبر ۱۲؍ ایک روپیہ ۴؍ مستقل خریداروں کو مفت

مشتہرین اپنی جگہ مخصوص کرالیں ایجنٹ حضرات کاپیوں کی تعداد سے جلد مطلع کریں

منیجر رسالہ نئی زندگی۔ الہ آباد (یو۔پی)

۱۹۴۵ء کا عالی شان پروگرام

منروا مووی ٹون میں عظیم الشان ساز و سامان کے ساتھ تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے

عمر خیام

شمع

مہاراجہ رنجیت سنگھ

ایک دن کا سلطان

جاری کردہ

منروا مووی ٹون سیوری بمبئی


خرچ کم کیجئے
خود بھی فائدہ اٹھائیے
ملک کو بھی فائدہ پہنچائیے
ہندوستان کے غریبوں کی خاطر اپنے خرچ میں کمی کیجئے۔ آج کل ہر قسم کی اشیا اور وسائل کی مانگ حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ ہر شخص کو خود بخود چیزوں کا استعمال کم کر دینا چاہیے تاکہ کوئی شخص بالکل محروم نہ رہے۔ یہ ایک قومی فرض ہے۔ یہ کفایت شعاری آپ کے حق میں رحمت ثابت ہوگی۔ اسے خندہ پیشانی سے اختیار کیجئے۔ کفایت کرنے سے بچت ہوتی ہے۔ بچت کی خاطر خود درستی سے کام لیجئے۔
کاغذ بچائیے۔ چھوٹے پرچے استعمال کیجئے۔ پرانے لفافے کام میں لائیے۔
دعوتیں اور تواضع کم کر دیجئے۔
خوراک ضائع نہ کیجئے۔ یہ ایک قومی خدمت ہوگی
ٹیلیفون کی ٹرنک کال کم کیجئے۔
ڈور دھاگے وغیرہ ضائع نہ کیجئے۔ یہ کمیاب اور مہنگے ہیں۔
کھلونے درست کرا لیجئے۔ نئے نہ خریدئیے
تیز رفتار، زیادہ بوجھ اور کم ہوا سے ٹائر خراب نہ کیجئے۔
کفایت شعاری سے قلتوں کو دفع کیجئے
اشد ضرورت کے بغیر کچھ نہ خریدئیے۔
حکومت ہند کے محکمۂ اطلاعات و نشریات نے شائع کیا
AAG 1



PROGRESS through
SCIENCE
and
RESEARCH
MEDICINES and DRUGS
OF HIGH QUALITY
Cipla

NAI ZINDAGI

نئی زندگی

ALLAHABAD



نیا مال
ایک دام
سرکہ
یہ سرکہ تمام نقصان پہنچانے والے
تیزابوں سے پاک ہے اور اس سے آپکا
پکوان اور سلاد زیادہ لذیذ ہو جائیگا
ڈی - سی - ایم اسٹورس میں پرانا اور ایسا مال
جو مشکل سے بکے نہیں رکھا جاتا اسمیں نیا مال
سستا بکنے کے لئے آتا رہتا ہے جس کی
قیمت ملیں مقرر کرتی ہے ۔
ساڑیاں
خوبصورت کنارے والی
اور دوسری قسم کی عمدہ ساڑیوں کا
بہترین ذخیرہ موجود ہے ۔
فینسی شوگر
کیوب - کسٹر - آئسنگ
اور دیارا شکر بہترین گنے کی
شکر سے بنائی جاتی ہے ۔
سوٹ کا کپڑا
عمدہ اور پائیدار
نمایاں اور دیدہ زیب
مختلف اقسام میں
گولڈن سیرپ
جام سے زیادہ اچھا ہے
اسمیں غذائیت زیادہ اور لذیذ
بچونکو جتنا چاہیں دیسکتے ہیں
دہلی کلاتھ ملس کی ایجنسی اسٹورس
حضرت گنج - چوک اور صدر بازار لکھنؤ - ان کے علاوہ حسب ذیل مقامات پر
میرٹھ - مظفرنگر - آگرہ - بریلی - علیگڈھ - ہردوار - دہرہ دون مرادآباد اور

اردو زبان کا واحد کلچرل و سیاسی رسالہ

نئی زندگی

الہ آباد

بانی :- ڈاکٹر سید محمود
سرپرست :- ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید

ایڈیٹر :- سید انیس الرحمٰن
جوائنٹ ایڈیٹر :- طفیل احمد خاں - ایم - اے

جلد ۵	ماہ جون ۱۹۴۵ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

۱	فکر و نظر	ایڈیٹر	۳
۲	رفتار عالم	ادارہ	۹
۳	سرپیر وفار سوسے پر اخبارات کی رائیں	ادارہ	۱۳
۴	ممالک غیر میں صحافتی سرگرمیاں	سید محمد تقی امروہوی	۱۷
۵	یونان کی شہری ریاستیں	سید شمس العارفین ایم - اے	۲۵
۶	ہم مہرے ہیں یا آدمی ؟	سائرل مودک	۳۲
۷	سوویت روس میں عربی تہذیب	کلیم اللہ	۳۸
۸	نئے نظام عالم کے لئے کن چیزوں کی ضرورت ہے	مسٹر ار - بی - بھنڈارکر	۴۰
۹	سرحد کی سیاسی صورت حال	سید سجاد ظہیر	۴۲
۱۰	کیا یورپ میں اب کمیونزم پھیل جائے گا	ستیش چندر ایم - اے	۴۵
۱۱	ادبی تنقید	طفیل احمد خاں - ایم - اے	۵۱
۱۲	سوداس (افسانہ)	راہل سنکرتیاین	۵۳
۱۳	تبصرہ	ط - ا - خ	۶۱

سالانہ چندہ :- چھ روپے   ششماہی :- تین روپے ۸ آنے   فی پرچہ :- دس آنے

سید انیس الرحمٰن ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے سٹی پریس کٹرہ الہ آباد میں چھپوا کر دفتر رسالہ "نئی زندگی" الہ آباد سے شائع کیا

نئی زندگی کا اگست نمبر

سان فرانسسکو نمبر ہوگا

جس میں موجودہ انقلاب انگیز بین الاقوامی سیاست اور سان فرانسسکو کانفرنس کی نوعیت اور اہمیت پر ملک کے بہترین مفکر
اور رہنماؤں کے مضامین و مقالے شائع ہوں گے ذیل میں مخصوص موضوعات
کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے:۔

(۱) بین الاقوامی تنظیم کی تاریخ (عہد قدیم سے لیکر زمانہ حال تک)

(۲) جمعیتہ الاقوام، آغاز اور انجام، زوال و ناکامی کے اسباب ۱۹۱۹ء کے بعد سیاسی حالات کی روشنی میں۔

(۳) بین الاقوامی تنظیم کے مسائل اور اُن کا حل، دنیا کی بین الاقوامی تنظیم کا مستقبل۔

(۴) ڈمبارٹن اوکس کے منصوبے

(۵) سان فرانسسکو کانفرنس کی مکمل روداد (۲۵ر اپریل کے بعد سے)

(۶) سان فرانسسکو کانفرنس کے موقع پر مدبرین عالم کی تقریریں

(۷) سان فرانسسکو کانفرنس مختلف قوموں اور ملکوں کے نکتہ نگاہ سے مثلاً برطانیہ، امریکہ، روس نوآبادیات اور چھوٹی چھوٹی قومیں۔

(۸) سان فرانسسکو کانفرنس اور ہندوستان

(۹) سان فرانسسکو کانفرنس سے متعلق اہم مقالے، مضامین، بیانات وغیرہ وغیرہ

زیر بحث اشاعت اردو کے سماجی اور سیاسی ادب میں بالکل ایک نئی چیز ہوگی جس میں موجودہ سیاسیات عالم کی عمیق اور جامع تفسیر اور تجزیہ ہوگا علاوہ بریں ٹھوس تاریخی اور سیاسی معلومات اور اعداد و شمار کا ایک بیش بہا خزانہ فراہم ہوگا

آپ کو ایک ہی جگہ اردو کے کسی بھی رسالے یا کتاب میں اتنے سارے معلومات اور اعداد و شمار فراہم کئے ہوئے نہیں مل سکتے۔

اشاعت چونکہ محدود ہوگی اسلئے شائقین حضرات مبلغ ایک روپیہ چار آنے معہ محصولڈاک پیشگی جمع فرماکر اپنی اپنی کاپیاں محفوظ کرالیں مستقل خریداروں کو مفت نذر ہوگا۔
۱۵ر جون سے پہلے سالانہ چندہ چھ روپئے بذریعہ منی آرڈر دفتر کو وصول ہوجانا چاہیئے:۔

ایجنٹ: ۔حضرات ۱۵ر جولائی تک کاپیوں کی ٹھیک تعداد سے مطلع فرمائیں۔

مشتہرین

۱۵ر جولائی سے پہلے اپنی جگہ مخصوص کرالیں اور نرخ جلد خط و کتابت سے طے کریں

منیجر رسالہ "نئی زندگی" الہ آباد (یو۔پی)

(نوٹ)۔ مئی کے شمارہ میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ جولائی ۴۵ء میں نئی زندگی کا سان فرانسسکو نمبر شائع کرینگے، لیکن فرانسسکو کانفرنس ہمیں پچیس جون سے پیشتر ختم ہوتی نظر نہیں

فکر و نظر

اڈیٹوریل

ہندوستان کے آئندہ دستور سے متعلق سپرو کمیٹی کی تجاویز کا خلاصہ نئی زندگی کے گذشتہ شمارہ میں پیش کیا جا چکا ہے، اور ناظرین نے اس پر غور و خوض کیا ہوگا۔ یہاں ہم اس رپورٹ سے متعلق اختصار کے ساتھ اپنے خیالات پیش کر دینا چاہتے ہیں۔

ہمیں اس دستور میں، یا خواہ کسی دستور میں بھی سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ اس نے ہمارے مخصوص بنیادی مسائل سے متعلق کیا حل پیش کیا ہے، اور اسی لحاظ سے ہمیں اس کی اچھائی برائی کا اندازہ لگانا ہے۔ وہ مخصوص بنیادی مسائل یہ ہیں :—

(۱) ہندوستان اور برطانیہ کے مابین تعلقات کے حدود۔

(۲) اندرون ملک کے مختلف فرقوں کے درمیان اختیارات و حقوق کی تقسیم۔

(۳) برطانی ہند اور دیسی ریاستوں کے درمیان تعلقات اور

(۴) مرکز اور مختلف صوبوں کے مابین حدود اختیارات اور طاقت کی تقسیم۔

ہندوستان کے دستور اساسی کے مرتب کے سامنے یہی چار بنیادی مسائل آئیں گے، اور انہی کو قابلیت اور وسعت نظری سے حل کرنے پر جس سے ہر جماعت اور فرقہ مطمئن ہو جائے مرتب کی کامیابی کا دارومدار ہے۔ ذیل میں ہم ان امور پر سلسلہ وار تفصیلی نگاہ ڈالیں گے۔

(۱)

سپرو رپورٹ میں ہندوستان کا سیاسی درجہ (DOMINION — STATUS) یعنی ایک نوآبادی کا رکھا گیا ہے، جو تاج برطانیہ کے تحت، دوسری نوآبادیوں، مثلاً کناڈا، اسٹریلیا وغیرہ کے مساوی برطانی دولت مشترکہ کا ایک رکن ہوگا۔ نہرو رپورٹ اور کرپس تجاویز میں بھی ہندوستان کا درجۂ سلطنت "ڈومینین اسٹیٹس" تھا۔ لیکن فرق یہ ہے کہ کرپس کی تجاویز میں یہ حق بھی دیا گیا تھا کہ اگر ہندوستان بعد کو برطانیہ سے قطعی علیحدگی کا فیصلہ کرے تو وہ تاج برطانیہ کے زمرے سے باہر بھی نکل سکتا ہے، لیکن سپرو رپورٹ اس معاملے میں مبہم ہے۔ شکل سلطنت، وہی آل انڈیا فیڈریشن ہے، جو نہرو رپورٹ، گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ اور کرپس مسودے کا مطمح نظر تھا اگرچہ کرپس نے فیڈریشن کے بجائے یونین (UNION) کا لفظ استعمال کیا تھا۔

سپرو رپورٹ نے مجلس دستور ساز کی تشکیل کی بنیاد ان ہی اصولوں پر رکھی ہے جن پر کرپس تجاویز کا خاکہ بنا تھا۔ کرپس تجویز میں جیسا کہ ناظرین کو یاد ہوگا، یہ صورت رکھی گئی تھی کہ موجودہ جنگ کے خاتمے پر ہندوستان کے تمام صوبوں میں عام انتخابات ہوں گے اور تمام صوبجاتی اسمبلیوں کے اراکین، ہر دس ممبر پر ایک ممبر کے تناسب سے، دستور ساز اسمبلی کے لئے ممبر چن لیں گے۔ یعنی دستور ساز اسمبلی کے اراکین کی تعداد صوبجاتی اسمبلیوں کے اراکین کی مجموعی تعداد سے $\frac{1}{10}$ حصہ ہوگی۔ لیکن سپرو کمیٹی نے یہ تبدیلی کی ہے کہ اراکین کی تعداد ۱۶۰ مقرر کر دی ہے۔ جن میں سے اکاون، اکاون فیصدی مسلمانوں اور اونچی ذات کے ہندوؤں کو ساوی طور پر تقسیم کر دیا ہے اور اچھوت ذاتوں کو ۲۰ سکھوں کو ۸ عیسائیوں کو ۷ اور صنعت و حرفت، زمینداراں یونیورسٹی، مزدور طبقہ اور عورتوں کے لئے

۱۴ نشستیں مخصوص رکھی ہیں، اور یہ تعداد اس طرح ۶۰ تک پہنچ جاتی ہے۔

دستور ساز اسمبلی سے متعلق انڈین نیشنل کانگریس کا یہ مطالبہ رہا ہے کہ ملک کے تمام بالغوں کے ووٹ سے دستور ساز اسمبلی کے نمائندے چنے جائیں، اور اگر مسلمان چاہیں کہ وہ جداگانہ انتخاب کے ذریعہ آئیں تو آسکتے ہیں لیکن مجلس دستور ساز کے جو فیصلے اقلیتوں سے متعلق ہوں گے، وہ اکثریت کے ووٹ سے نہ ہونگے بلکہ متعلقہ اقلیت کے فیصلے کے مطابق کئے جائیں گے اور اگر کسی معاملے میں دستور ساز اسمبلی اور کسی واحد اقلیت کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہ ہوسکے گا تو وہ معاملہ آزاد بین الاقوامی ثالثوں پر چھوڑ دیا جائے گا۔

لیکن سپرو کمیٹی نے جناح گاندھی مذاکرات کی ناکامی کے بعد موجودہ جمود کو حل کرنے کی خاطر اور مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے اونچی ذات کے ہندوؤں (جنکی تعداد ۲۳ کروڑ ہے) اور مسلمانوں کو (جنکی تعداد دس کروڑ ہے) مساوی نشستیں دی ہیں۔ اور ہندوؤں سے یہ اپیل کی ہے کہ وہ ملی اتحاد کی خاطر یہ قربانی منظور کرلیں۔ اسکے بعد اقلیتوں کے خوف وہراس کو مزید دور کرنے کے لئے سپرو کمیٹی نے ایک شرط یہ بھی لگادی ہے کہ جبتک کوئی فیصلہ دستور ساز اسمبلی سے ¾ کی اکثریت سے پاس نہ ہو وہ فیصلہ آخری اور جائز نہ سمجھا جائیگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۶۰ اراکین میں سے اگر صرف ۴۱ اراکین نے بھی یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ دستور ساز اسمبلی کا کام آگے نہ بڑھنے دینگے تو وہ ایسا کرسکتے ہیں اور اس دباؤ سے وہ اپنے مطالبات منوا سکتے ہیں۔ یہ ماننا پڑیگا کہ سپرو کمیٹی نے یہ دفعہ اقلیتوں کے حق میں شامل کرکے ایک ایسا اقدام کیا ہے جو انتہائی خطرناک صورت اختیار کرسکتا ہے۔ لیکن سپرو کمیٹی نے نہایت نیک نیتی اور فراخدلی سے ملکی اتحاد کی خاطر یہ خطرہ مول لیا ہے۔

سپرو کمیٹی نے آگے چل کر ایک ایسی دفعہ شامل کردی ہے، جس نے ہمارے خیال میں کمیٹی کے تقریباً سارے کام پر پانی پھیر دیا ہے یعنی یہ کہ جن معاملات میں دستور ساز اسمبلی میں ¾ اکثریت نہ حاصل ہوسکے گی، ان معاملات میں ملک معظم کی حکومت دخل انداز ہوگی اور اپنا فیصلہ (AWARD.) صادر کریگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کے دستور بنانے میں کسی نہ کسی شکل میں ملک معظم کی حکومت کو ویٹو حاصل رہے گا، اور اس طرح کچھ لوگوں کو قابو میں کرکے برطانی حکومت اپنا پانسہ پھینک سکتی ہے اور ہندوستان کے معاملات میں دخیل اور دست انداز ہوسکتی ہے۔ یہاں ہمیں سپرو کمیٹی کی روائتی اعتدال پسندی کا پورا پورا عکس مل جاتا ہے، جنھیں ابتک برطانیہ پر اعتماد ہے بہرحال ممکن ہے سپرو کمیٹی نے یہ شق صرف اسلئے رکھی ہو، کہ اقلیتوں کو اور بھی زیادہ اطمینان ہوجائے، کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ڈیڑھ سو سال سے ہندوستان میں برطانی حکومت نے اقلیتوں کی 'مائی باپ' کا روپ دھارن کر رکھا ہے، اور بدقسمتی سے اقلیتوں کو بھی یہ غلط فہمی ہے کہ برطانی حکومت انکی سب سے بڑی محافظ اور رکشک ہے۔

بہرحال سپرو کمیٹی کی یہ دفعہ بدترین رجعت پسندانہ ذہنیت کا مظاہرہ ہے، اور ہمیں اقرار کرنا پڑتا ہے کہ کرپس تجویز اس معاملے میں اس سے زیادہ ترقی پسندانہ ہے، کیونکہ اس میں حکومت برطانیہ کی دستور ساز اسمبلی کے تمام فیصلوں کی پابندی لازمی ہے خواہ وہ فیصلہ صرف ایک عدد ووٹ کی اکثریت سے ہوا ہو۔

(۲)

جہاںتک فرقہ وارانہ سوال یا یوں کہئے کہ ہندو مسلم مسئلے کا تعلق ہے سپرو کمیٹی نے 'آل انڈیا مسلم لیگ کی لاہور کی تجویز' اور جناح گاندھی مراسلات کی روشنی میں یہ فیصلہ صادر کیا ہے کہ ہندوستان کو دو یا دو سے زیادہ آزاد حکومتوں میں تقسیم کردینا کوئی جواز نہیں رکھتا۔ اس سے سارے ملک کا امن وامان اور سارے ملک کی پرامن ترقی خطرے میں پڑجائیگی۔ اور اس سے نہ ہندو مسلم سوال حل ہوگا اور نہ کسی فرقہ کو کوئی خاص فائدہ پہنچے گا۔

تقسیم ہند کا نعم البدل۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا، سپرو کمیٹی نے یہ رکھا ہے کہ مجلس دستور ساز میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے مساوی نشستیں دیدی جائیں تو انھیں دائمی طور پر مرکزی اسمبلی میں ہندوؤں کے برابر نشستیں دیدی جائیں۔ کمیٹی نے دوسری اقلیتوں، مثلاً اچھوتوں اور سکھوں کو مزید نمائندگی دینے کی سفارش کی ہے اور یہ بتلایا ہے کہ کمیونل اوارڈ کے تحت انھیں جتنی نشستیں دی گئی ہیں وہ حق و انصاف کو مدنظر رکھتے ہوئے کم ہیں۔ پنجاب میں سکھوں کو مزید نشستیں دئے جانے کے لئے بھی سفارش کی گئی ہے۔

مجلس منتظمہ یعنی کابینۂ وزارت میں یہ اصول رکھا گیا ہے کہ اسمیں تاحدامکان تمام فرقوں کی نمایندگی ہو، اور مرکزی اسمبلی میں مختلف فرقوں کی جو تعداد ہو، وہی کابینۂ وزارت میں بھی منعکس ہو۔ مثلاً اگر مرکزی اسمبلی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو پچاس پچاس فی صدی نشستیں حاصل ہوں، تو کابینہ میں بھی اُن کا یہی تناسب جاری رہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے علاوہ اس کابینہ میں اپنے تناسب کے لحاظ سے اچھوت، سکھ، ہندوستانی عیسائی، اور اینگلو انڈین بھی شامل ہونگے۔

کابینہ کے لئے یہ ایک شرط قرار دی گئی ہے کہ وزیر اعظم اور نائب وزیر کے عہدے کسی ایک فرقے کے ہاتھوں میں نہ ہونگے۔ وزیر اعظم وہی ہوگا جو مرکزی اسمبلی میں اکثریت کا لیڈر ہوگا، خواہ یہ اکثریت ایک یا ایک سے زیادہ جماعتوں سے مل کر بنی ہو۔ پھر وزیر اعظم حسب دستور اپنے ساتھی وزراء کا انتخاب کریگا اور کابینہ وزیر اعظم کی منشا کے مطابق عمل میں آئے گی۔

لیکن چونکہ کابینہ کی اس ترکیب سے اقلیتوں کو شبہات پیدا ہوسکتے ہیں، اور وہ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اکثریت کا لیڈر من مانی کریگا، اس لئے سپرو کمیٹی نے اس کا نعم البدل بھی پیش کردیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مرکزی مجالس (یعنی اسمبلی اور کاونسل آف اسٹیٹ) کے دونوں ایوانوں کی مشترک نشست میں وزراء کا انتخاب ہو اور ہر ممبر صرف ایک ووٹ دینے کا مجاز ہو۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ کابینہ میں ہر فرقے کی نمائندگی اسکی تعداد اور منشاء کے مطابق ہوجائے۔

اقلیتوں کے حقوق کی محافظت اور دیکھ بھال کیلئے سپرو کمیٹی نے ایک "مائناریٹی کمیشن" مقرر کرنے کی سفارش کی ہے۔ جسکی حیثیت خودمختارانہ ہوگی، اور جو کسی کے تحت نہ ہوگا۔ اس کمیشن کا تقرر اس طرح عمل میں آئے گا کہ مختلف فرقے کے نمائندے، جو مرکزی اسمبلی میں موجود ہونگے، وہ اپنا اپنا نمائندہ اس کمیشن کے لئے چن لیں گے، لیکن اس میں ایک کام کی شرط یہ رکھی گئی ہے کہ مرکزی مجالس کا کوئی رکن اقلیت کمیشن کا رکن مقرر نہ ہوسکے گا۔ یعنی اقلیت کمیشن میں مجالس متعلقہ سے باہر کے آزاد آدمی ہونگے۔ اس کمیشن کے فرائض یہ ہونگے کہ وہ اپنے مخصوص علاقے میں اقلیتوں کے مفاد پر نظر رکھے۔ اس سلسلے میں کمیشن صوبائی اور مرکزی حکومتوں سے کاغذات بھی طلب کرسکتا ہے۔ کمیشن ہر چھ ماہ پر اس بات کا جائزہ کریگا کہ کسی جگہ اقلیتوں کے ساتھ بدانصافی تو نہیں ہوئی ہے، اور پھر اپنی ششماہی رپورٹ مجلس وزراء کے ذریعہ مجالس متعلقہ کے سامنے پیش کیا کریگا۔

(۳)

دیسی ریاستوں کے متعلق کمیٹی کا یہ نقطۂ نگاہ ہے کہ ریاستوں پر اس وقت جو سیادت (PARAMOUNTCY) حکومت برطانیہ کو حاصل ہے وہ ہندوستانی کابینہ کو منتقل ہوجائے۔ جو ریاستیں ہندوستان فیڈریشن کی رکن بننا چاہیں وہ وفاق میں شامل ہوسکتی ہیں۔ ایک مخصوص ریاست کن شرائط پر وفاق میں شامل ہوگی، یہ چیز باہمی گفتگو سے طے پائے گی۔ لیکن وفاق میں ریاستوں کی شمولیت برطانوی صوبوں کی طرح لازمی نہیں بلکہ رضاکارانہ ہے۔ یعنی اگر کوئی ریاست وفاق سے الگ رہنا چاہے تو رہ سکتی ہے، لیکن اسکے برعکس برطانوی صوبوں کو لازمی طور پر وفاق میں شامل ہونا پڑیگا۔ اس سلسلے میں کرپس تجویز یہ تھی کہ جو ریاست یا صوبے وفاق (یونین) میں نہ شامل ہونا چاہیں، وہ علیحدہ رہ سکتے ہیں اور اُن سے برطانوی حکومت ایک علیحدہ سمجھوتہ کرے گی، اور کرپس تجویز کی اسی شق سے پاکستان کے امکانات ہوسکتے تھے، لیکن سپرو کمیٹی نے ہر صوبے کا شمول لازم کردیا ہے اور یہ بھی شرط لگادی ہے کہ کوئی صوبہ یا ریاست ایک بار وفاق میں شامل ہونے کے بعد دوبارہ اس سے علیحدگی نہیں اختیار کرسکتی۔

چونکہ ریاستوں کی سیادت برطانیہ سے ہندوستانی حکومت کو منتقل ہوجائے گی، اسلئے قومی کابینہ میں ایک رکن ریاست کے محکمے کیلئے ہوگا۔ اس رکن کے ماتحت کم سے کم تین اور زیادہ سے زیادہ پانچ اشخاص کی ایک مشاورتی کمیٹی ہوگی، جو وزیر مخصوص کو ریاستی معاملات کے انصرام میں مدد دے گی۔

بہرحال ریاستوں سے متعلق سپرو کمیٹی کا رویہ نہایت رجعت پسندانہ ہے اور ہندوستان کا آزادی پسند طبقہ اسے ہرگز قبول نہیں کرسکتا کیونکہ ظاہر ہے کہ اس بیسویں صدی میں قرون وسطیٰ کے اس جاگیردارانہ نظام کی کوئی جگہ نہیں اور اسے ختم ہونا چاہیئے اور کیا اچھا ہو، اگر برطانوی حکومت کے ساتھ ساتھ یہ استبدادی نظام بھی ختم ہو، جسکے لئے

کوئی جواز ہے نہ معقولیت۔

دیسی ریاستوں کا معاملہ نہایت اہم ہے۔ ریاستی دنیا میں ۱۰ کروڑ ہندوستانی آباد ہیں، اور اس عظیم الشان ملک کا ۲/۵ حصہ ریاستوں پر مشتمل ہے لہٰذا نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے! ریاستوں کی حکومت کی باگ ان کے عوام کے ہاتھوں میں آنی چاہئے اور برطانوی ہند کی طرح یہاں بھی نمائندہ اسمبلیاں بننی چاہئیں اور حکومت کے سارے اختیارات اس اسمبلی کے ہاتھوں میں آنے چاہئیں۔ تمام چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ملا کر علٰحدہ صوبہ بنا دینا چاہئے یا انھیں پڑوس کے صوبوں میں مدغم کر دینا چاہئے۔ ان اصولوں کے علاوہ کسی دوسرے اصول پر ریاستی مسئلے کا حل نہیں ہو سکتا۔

(۴)

جہاں تک مرکز اور صوبوں کا تعلق ہے۔ سپرو کمیٹی نے نہایت دانشمندانہ رائے دی ہے کہ مرکزی حکومت کو جہاں تک ممکن ہو کم سے کم اختیارات سونپے جائیں، اور صوبوں کو اپنے حدود کے اندر زیادہ سے زیادہ وسیع اختیارات اور خود مختاری دی جائے۔ لیکن مرکز کو کسی طرح کمزور بھی نہ ہونا چاہئے، اس لئے حسب ذیل اختیارات اور محکمے مرکز کے سپرد ہونے چاہئیں:۔

مالیات، دفاع، امور خارجہ، رسل و رسائل، چنگی، سکّہ، صرافہ و تبادلہ، پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف، صوبوں اور ریاستوں کے باہمی معاملات۔

ان امور کے علاوہ تمام معاملات صوبوں کو تفویض ہونگے، اور مابقیہ اختیارات یعنی جو اختیارات نہ صوبوں کی فہرست میں درج ہونگے اور نہ مرکز کی فہرست میں۔ وہ اختیارات بھی صوبوں ہی کو حاصل ہونگے۔

سپرو کمیٹی نے لسانی اور تہذیبی اعتبار سے صوبوں کی جدید تقسیم کی بھی سفارش کی ہے۔ لیکن یہ چیز بھی واضح کر دی ہے کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ جب تک صوبوں کی جدید تقسیم نہ ہو، دستور حکومت کا نفاذ ہی عمل میں نہ آئے کیونکہ صوبوں کی تقسیم کا کام بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ یہ وہ حل ہے جو ہندوستان کے مذکورہ چار اہم معاملات سے متعلق سپرو کمیٹی نے ملک کے سامنے پیش کیا ہے۔

ہزار اختلافات کے باوجود ہر شخص کو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ کمیٹی کی مندرجہ بالا سفارشات ہندوستان کے موجودہ مسائل کا یقینی ایک حل پیش کرتی ہیں۔ اعتراضات ہو سکتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ صرف اعتراض کرنے سے تو کوئی راستہ نہیں نکل سکتا۔ جناح گاندھی گفت و شنید کی ناکامی اور کسی واضح پاکستانی اسکیم کی عدم موجودگی کے بعد اب اس کے سوا کون سا راستہ باقی رہ جاتا ہے کہ ہندوستان مذکورہ بالا مشوروں کو ردو بدل کے ساتھ تسلیم کرنے اور موجودہ جمود سے نجات حاصل کرے اور غالباً انھی بنیادوں پر (یعنی مرکز میں پچاس پچاس فی صدی) مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی اور نواب زادہ لیاقت علی خاں کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہوا ہے جو فی الحال صیغۂ راز میں ہے، اور جسکی بنا پر وائسرائے ہند لارڈ ویول برطانی [illegible] سے گفت و شنید کر رہے ہیں۔

سپرو کمیٹی کی تجاویز کے اُس حصّے پر زیادہ اعتراضات ہوئے ہیں، جو دستور اساسی سے متعلق ہیں، حالانکہ ہمیں زیادہ تر اسکیم کے اس حصّے سے لگاؤ رکھنا چاہئے جو دستور ساز اسمبلی کے قیام سے متعلق ہے کیونکہ دستور ساز اسمبلی کے وجود میں آنے کے بعد یہ اُس کا کام ہوگا کہ وہ ہندوستان کا دستور مرتب کرے۔ بہرحال اگر سپرو اسکیم کو کوئی سو فی صدی نامنظور بھی کر دے تو بھی اُسے یہ ماننا پڑیگا کہ سپرو کمیٹی نے اگر ہندوستان کا دستور پیش نہیں کیا، تو بعض ایسی چیزیں یقینی پیش کی ہیں جو آئندہ دستور کا ڈھانچہ بن سکتی ہیں، اور جنکی بنیاد پر بحث ہو سکتی ہے اور اس کے لئے سپرو کمیٹی کی کاوشیں قابل مبارکباد ہیں۔

اعتراضات تو ہو سکتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ہمیں ملک کے سیاسی مسئلے کو حل کرنا ہے یا نہیں؟ اگر حل کرنا ہے تو ہمیں یہ منفی رویہ ترک کر دینا چاہئے، ورنہ زمانے کی رفتار اب اس نہج پر آگئی ہے کہ وہ ہمارا زیادہ دنوں تک انتظار نہ کرے گی۔

(بقیہ اخبارات کی رائیں صفحہ) ہو رہے ہیں مسلم لیگی جنکو اُنکے حقوق سے محروم [illegible] دیے گئے۔ مسلم لیگیوں کی اس ناراضگی کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] بھی پوری نہیں ہو سکیگی۔ اور خیال تو یہ ہے کہ اگر مسلم لیگیوں سے کہا جائے کہ [illegible] تم پاکستان ہی لے لو۔ پھر بھی ممکن ہے مسلم لیگی یہ کہنا شروع کر دیں کہ ہندوستان کا ایک الگ حصہ دینے کا جو مطالبہ منظور ہو رہا ہے۔ ہو نہ ہو اس میں کوئی چال ہے جب مسلم لیگ [illegible] مطالبہ [illegible] لگے پاکستان تو دیتے ہو۔ لیکن پاکستان کا خرچ کون دیگا؟ پہلے یہ منظور کرو کہ پاکستان کے اخراجات بھی ہندوستان ہی پورے کریگا۔ تب مسلم لیگی پاکستان [illegible]

سندھیا اسٹیم نیوی گیشن کمپنی لمیٹڈ

ہندوستان میں تجارتی جہاز رانی کے پیشرو

(ایجنٹ)

نروتم مرارجی اینڈ کمپنی





مال اور مسافروں کی سروس

مال اور مسافروں کی بکنگ اور روانگی کی تاریخوں کے لئے
براہ کرم سندھیا ہاؤس سے خط و کتابت کیجئے
کونکن کراچی اور ساحلی سروس کے لئے

ملحق کمپنیاں

- دی بنگال اسٹیم نیویگیشن کمپنی لمیٹڈ
- دی انڈین کاپریٹو اور ٹرانسپورٹ کمپنی لمیٹڈ
- دی رتناگر اسٹیم نیویگیشن لمیٹڈ
- دی حج لائن لمیٹڈ
- دی بمبئی اسٹیم نیویگیشن کمپنی لمیٹڈ
- دی ایسٹرن اسٹیم نیویگیشن کمپنی لمیٹڈ

ہندوستان [illegible]
[illegible]
[illegible]

رفتارِ عالم

از: ادارہ

جنگ اور امن

دنیا کے آئندہ امن و امان کا انحصار اس بات پر ہے کہ متحدہ طاقتیں یالٹا کے فیصلوں کو عملی [illegible] دے سکتی ہیں یا نہیں۔ بہت سے لوگ یہ سمجھ کر یالٹا کے فیصلوں کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ یہ امن چاہے عارضی ہی کیوں نہ ہوں لیکن کم سے کم انسانیت کو فوری طور پر جنگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آجانے سے تو بچایا جا سکتا ہے اس لئے کہ حقیقی امن کا تصور اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک یورپ اور دنیا سے سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ نہ ہو جائے لیکن یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس جنگ نے یورپ کے ہر ملک میں ایسی عوامی طاقتوں کو بیدار، منظم اور متحرک کر دیا ہے کہ اُن کا منطقی نتیجہ انقلاب اور صرف انقلاب ہی ہو سکتا ہے۔ یہی انقلاب اُس معاشی نظام کو نیست و نابود کرے گا جو بنیادی طور پر تمام جنگوں کی اصل جڑ ہے۔ اسی لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یالٹا کے فیصلے ہمیں محض عارضی امن کی امید نہیں دلاتے بلکہ اُن سے دائمی اور مستقل امن کی قوی توقع ہے۔

اس سلسلہ میں دو باتوں کا تذکرہ قطعی اہم ہے جو موجودہ بین الاقوامی صورت حال کے درمیان مابہ الامتیاز ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ فاتحین کی صف میں سوویت روس کی موجودگی ہے اور دوسرے یہ کہ موجودہ جنگ ہندوستان کے سوا دنیا بھر کے عوام کی مدد سے جیتی گئی ہے اور لڑی جا رہی ہے۔ یورپ میں جنگ کی عملی نوعیت تو اور بھی عوامی رہی ہے۔ یورپ میں آج مزدوروں اور کسانوں کے ہاتھ میں براہ راست طور پر جتنی زبردست فوجی اور سیاسی طاقت آگئی ہے اور آج وہ جس حیرت انگیز طور پر منظم ہیں اس کا ۱۹۱۹ء میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ موجودہ بین الاقوامی صورت حال کے متعلق اور پُرامید کرنے کا ایک سب سے زبردست بات یہ ہے کہ یورپ کے تمام ملکوں میں پرانے رجعت پسندوں اور شاہی حکومتوں کے قدم اکھڑ گئے ہیں اور وہاں کی حکومتوں کی باگ ڈور عوام کے نمائندوں کے ہاتھ میں آگئی ہے۔

اتحادیوں کی صف میں سوویت روس کی موجودگی کتنی عالمگیر اور دوررس اہمیت کی حامل ہے اس کا واضح اندازہ لگانے کے لئے یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ یورپ کی جنگ دراصل سوویت روس ہی کی قوت بازو سے فتح کی گئی ہے سرخ فوج ہی نے نازی فوج کے "ناقابل شکست" ہونے کے وہم کو توڑا۔ سرخ فوج ہی کی عظیم الشان طاقت نے [illegible] میں انسان کی آئندہ تاریخ کی باگ موڑ دی اور سرخ فوج ہی کی قوت نے مغربی محاذ جنگ کو ممکن بنایا۔ غرض موجودہ جنگ میں یہ بات اظہر من الشمس ہو گئی ہے کہ سرخ فوج دنیا کے کسی بھی ملک کی فوج کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ طاقتور اور تجربہ کار ہے۔ ایسی جنگ کے شعلوں سے گزرنے کے بعد سوویت روس کا معاشی اور سیاسی نظام بھی پہلے ہی کہیں زیادہ مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گیا ہے۔ اور سرخ فوج کی اخلاقی حالت، ہمت اور جوش و خروش پہلے سے دو چند ہے۔ خود فتح اس حقیقت کا نتیجہ تھی کہ سوویت روس کے نظام میں نہ تو ایک طبقہ دوسرے طبقوں پر حکومت کرتا اور ایک قوم دوسری قوم کی محکوم ہے سوویت روس کا معاشی نظام چند سرمایہ داروں کی نفع خوری کے پیش نظر نہیں قائم ہے بلکہ اس کا مقصد پوری آبادی کی ضروریات کو پورا کرنا ہے۔ سوویت روس کا سیاسی نظام بھی ایسا ہے کہ اس سے اگر حکومت کے فیصلوں میں ایک طرف عوام کی خواہشات اور ارادوں کا واضح جھلک نمایاں ہے تو دوسری طرف اندرون ریاست میں ملک و قوم کے غداروں کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔ غرض یہ فتح بنیادی طور پر اشتراکی جمہوریت کی فتح ہے اور اس کی ناقابل شکست طاقت کے سامنے مغرب کی سرمایہ دارانہ جمہوریت کی کمزوری بھی صاف طور پر ثابت ہو گئی ہے یہی وجہ ہے کہ آج ایک طرف اسٹالن تو یہ کہہ رہا ہے کہ جنگ کے بعد سوویت روس کا اشتراکی اقتصادی نظام پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہو گیا ہے اور دوسری طرف برطانیہ اور امریکہ کی حکومتیں یہ شکایت کر رہی ہیں کہ جنگ کی وجہ سے اُن کی اقتصادی صورت حال معاشی نظام پر بہت دباؤ پڑ رہا ہے۔ برطانیہ اور

امریکہ کے عوام اور فوجوں میں جنگ سے بیزاری کے آثار نمایاں ہیں لیکن روس کی سرخ فوج اور وہاں کے عوام پہلے سے بھی زیادہ پُراُمید اور کمربستہ ہیں۔

جب یہ ظاہر ہے کہ برطانیہ اور امریکہ روس کی مدد کے بغیر جرمنی کی طاقت کو نہ توڑ سکے تو وہ آخر کس طرح آئندہ بین الاقوامی تنظیم روس کی مدد کے بغیر تعمیر کر سکیں گے۔ بات دراصل یہ ہے کہ چونکہ برطانیہ اور چرچل براہِ راست طور پر ہمارے سروں پر سوار ہیں اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ وہ اسی طرح ساری دنیا کے سر پر سوار ہیں۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ بین الاقوامی امور میں برطانیہ اور امریکہ کی حکومتیں سوویت روس کی رضامندی اور تائید کے بغیر ایک انچ بھی نہیں ہل سکتیں۔ یہ بات بار بار دُہرائی جا چکی ہے کہ فاشزم خود سرمایہ داری اور سامراج ہی کی شدید ترین صورت ہے اس لئے جس طاقت نے فاشزم کو شکست دی اُس کے سامنے سرمایہ داری اور سامراج کی ایک بھی نہیں چل سکتی۔ یہ سوسائٹی کی خارجی اور مادی زندگی کا ایک اٹل قانون ہے جو لابدی طور پر اپنے منطقی نتیجہ پر پہنچ کر رہیگا۔

یہ ہے اتحادیوں کی صف میں اشتراکی روس کی موجودگی کی زبردست عالمگیر اہمیت۔

مسئلہ زیرِبحث کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ اس جنگ کا نتیجہ یورپ کے ہر ملک میں عوامی حکومت کے قیام کی صورت میں ظاہر ہوا ہے اور یہ تغیر بھی دنیا کی آئندہ امن ہی کے حق میں ہے۔

جب نازی فوجوں کا نہ رُکنے والا سیلاب یورپ کے تمام ملکوں میں پھیل گیا تو وہاں کی حکومتوں کے ارکان نے اپنی اپنی قوموں کو بے دست و پا چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کیا سرمایہ دار اور فیوڈل طبقوں نے نفع خوری کی خاطر نازی حملہ آوروں سے سازباز کرنا شروع کیا اور اس طرح اُن ملکوں کے عوام مفلس، لاچار، بیمار، ویرانیاں اور نازی مظالم کا شکار بننے کے لئے چھوڑ دئے گئے۔ لیکن عوام نے اپنے حقیقی رہنماؤں کی قیادت میں فوراً خود کو منظم کرنا شروع کیا اور کھلم کھلا اور خفیہ طور پر نازیوں اور ان سے سازباز کرنے والوں کی مدافعت شروع کر دی۔ یورپ کی عوامی جماعتیں جنگ سے پہلے کے سیاسی اختلافات کو ختم کر کے مشترکہ دشمن کے خلاف متحد اور منظم ہو گئیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نازی تسلط کے خلاف ان عوامی تنظیموں اور تحریکوں کے ساتھ ایک طرف برطانیہ اور امریکہ اور دوسری طرف سوویت روس کا کیا رویّہ رہا ہے۔ سوویت روس کی حکومت نے اسٹالین کے اعلان مورخہ تین جولائی سنہ ۱۹۴۱ء پر عمل کرتے ہوئے ان تحریکوں کی عملی امداد کرنی شروع کی۔ ان کا رویہ یہ رہا ہے کہ ان عوامی تحریکوں کو اسلحہ جات فراہم کرو اور جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد انھیں کو اپنے اپنے ملک کی قومی فوج بن جانے دو۔ اس کے برخلاف برطانیہ اور امریکہ کا یہ طرزِ عمل رہا ہے کہ یورپ کی ان عوامی تحریکوں کی صرف اسی حد تک مدد کرو جس حد تک فاشزم کی شکست کے لئے ضروری ہو اور جب اُن کی ضرورت ختم ہو جائے تو انھیں غیر مسلح کر کے اُن کی جگہ پر وہی پُرانے رجعت پسندوں اور پٹھوؤں کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور دے دو۔ پولینڈ، یوگوسلافیہ اور آسٹریا میں سوویت روس کا رویّہ اور ڈنمارک بلجیم اور یونان میں برطانیہ کا رویہ اس بات کا واضح ثبوت ہے۔ سوویت روس نے ہر ملک میں اُسی حکومت کو منظور کیا جو وہاں کی عوامی تحریک مدافعت کے ذریعہ وجود میں آئی تھیں۔ لیکن برطانیہ نے عوامی تحریکوں کو بے دست و پا کر کے اسے عوام کے سر پر ایک رجعت پرست حکومت مسلط کرنے کی کوشش کی۔

لیکن اب دنیا بھر کے سامنے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ کون سی پالیسی کامیاب ثابت ہوئی اور کون سی ناکامیاب۔ یہ ظاہر ہے کہ سنہ ۱۹۴۳ء میں برطانیہ اور امریکہ کے مدبرین نے جنگ کے بعد آزاد یورپ کے لئے جو پلان بنایا تھا۔ وہ سراسر ناکامیاب رہا۔ اس کی ناکامیابی کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہ تھی کہ امریکہ اور برطانیہ کی حکومتوں نے آزاد یورپ کی تعمیر و تشکیل میں صرف اپنی فوجی طاقت پر بھروسہ کیا تھا۔ اور عوام کو قطعی نظرانداز کیا تھا۔ برخلاف اس کے موجودہ یورپ کی سیاسی صورتِ حال میں سوویت روس کو اس لئے پے در پے فتح ہو رہی ہے کہ سوویت روس نے اپنی پوری پالیسی کا دار و مدار خود انھیں ملکوں کی عوامی تحریکوں پر رکھا۔

یورپ کی موجودہ عوامی حکومتوں کے سامنے جو امور پیش ہیں وہ بلا کسی اختلافِ رائے کے پوری تندہی اور توجہ سے انجام دے رہی ہیں۔ مندرجہ ذیل ہیں۔ یورپ کی حکومتیں اپنے اپنے ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کے اتحاد کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ایک صحیح معنوں میں قومی فوج کی تعمیر کر رہی ہیں۔ ان لوگوں کو [illegible]

رہی ہیں جنھوں نے نازیوں کے ساتھ ساز باز کیا' یورپ کے ملکوں میں آج اقتصادی نظام بھی آہستہ آہستہ ختم کیا جا رہا ہے جو ہر قسم کی رجعت پرستی کی اصل جڑ ہے۔ یعنی خاص خاص صنعتیں جو ہٹلر کے ساتھ ساز باز کرنے والے بڑے بڑے کارخانے داروں کی ملکیت میں تھیں انھیں قومی ملکیت بنایا جا رہا ہے۔ فیوڈل امراء کی زمینیں چھین کر کسانوں میں تقسیم کرنے کی پالیسی پر سنجیدگی سے غور کیا جا رہا ہے اور اجارہ داروں اور سرمایہ داروں کے اثرات سے ملک کی سیاست کو پاک و صاف کیا جا رہا ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر ملک میں' اقلیتوں کے مسئلہ کو ایک بالکل نئے انداز سے سلجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یعنی ہر اقلیت کو خود مختاری دیکر ملک کے مشترکہ وفاق میں شرکت کا فیصلہ خود اقلیت ہی کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ مثلاً یوگوسلافیہ میں کروٹ' سلاوینہ اور بوسینا کی اقلیتوں کو خود مختاری دے دی گئی ہے۔ اسی طرح زیکوسلاویکیہ میں بھی صدر بینس کی حکومت کا ریتھیا یوکرین کی اقلیت کو اس بات کا مکمل اختیار دیدیا ہے کہ وہ اگر چاہیں تو زیکوسلاویکیہ سے علیحدہ ہو کر سوویت یوکرین سے اپنا الحاق کرا سکتے ہیں۔

اگرچہ ابھی یورپ کی نئی حکومتوں میں پرانے رجعت پسند عناصر موجود ہیں لیکن اولاً تو عوام کے سامنے اُن کی کچھ نہیں چلتی اور دوسرے یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آنے والے انتخابات میں یہ حکومتیں سرے پاؤں تک ایک بالکل مختلف نوعیت کی مالک ہوں گی۔ اس کا اندازہ فرانس کے گزشتہ میونسپل انتخابات اور فن لینڈ کے انتخابات سے لگایا جا سکتا ہے۔

مندرجہ بالا باتوں کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ یورپ کی سیاست اب سرمایہ داروں اور اجارہ داروں کے ہتھکنڈوں سے آزاد ہو چکی ہے اور اب وہاں برطانیہ اور امریکہ کے حکمراں طبقوں کی چالیں بھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔

مندرجہ بالا سطور میں یورپ اور دنیا کا جو واضح نقشہ پیش کیا گیا ہے اُس کے پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو موجودہ بین الاقوامی تنظیم کے مسائل کا سمجھنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ پرانی جمعیتہ الاقوام اور نئی زیر تعمیر بین الاقوامی انجمن کے درمیان جو بنیادی فرق ہیں اُنھیں یوں پیش کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جمعیتہ الاقوام نوزائیدہ اشتراکی روس کے خلاف تعمیر کی گئی تھی لیکن موجودہ بین الاقوامی تنظیم کا پہلا دارومدار اشتراکی روس کے تعاون پر ہے۔ امریکہ گذشتہ جنگ سے باہر تھا لیکن آج امریکہ میں علیحدگی پسند اور رجعت پرست عناصر کو شکست دی جا چکی ہے اور آج امریکہ بین الاقوامی انجمن کی تعمیر میں عملی حصہ لے رہا ہے۔ گذشتہ جنگ کے بعد یورپ کے عوام خوابیدہ تھے اور وہاں کی حکومتیں سامراجیوں کے ہاتھوں کا کھلونا بنی ہوئی تھیں آج یورپ کی حکومتوں پر انقلاب پسندوں اور عوام کا قبضہ ہے اور وہ سوویت روس کے زیر قیادت سرمایہ دارانہ استحصال سامراج اور جنگ کے تمام بنیادی اسباب کو نیست و نابود کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔

سان فرانسسکو کانفرنس میں دنیا کی آئندہ بین الاقوامی تنظیم کا جو خاکہ تیار کیا جا رہا ہے اُس کے جلد از جلد بروئے کار آنے میں کوئی دقت نہ ہوگی جیسا کہ خود حالات ابھی سے بتا رہے ہیں۔ لیکن آگے چل کر جو سب سے مشکل مسئلہ درپیش ہوگا وہ اُن اصولوں کا عملی اطلاق ہے۔ اسی عملی اطلاق کے سلسلے میں ایک طرف برطانیہ اور امریکہ اور دوسری طرف روس اور اس کے ساتھ یورپ کی تمام حکومتیں۔ ان دو جماعتوں کے درمیان اختلاف اور مناقشوں کا سلسلہ شروع ہوگا۔ لیکن کانفرنس کی اب تک کی روداد سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت کی طرح آئندہ بھی سوویت روس کے زیر قیادت سامراجی ارادوں کو مسلسل طور پر شکست نصیب ہوگی۔ ارجنٹائن' اسپین' ہندوستان' محکوم اقوام کے سیاسی حقوق اور انفرادی تعلیم اور روزگار کے مسائل پر سوویت روس کے طرز عمل سے اب یہ بات واضح ہوتی جا رہی ہے کہ ہر مسئلہ پر سامراجی ملکوں کو پیچھے ہٹنا پڑ رہا ہے۔ یہ رفتار اس وقت بہت تیز ہو جائے گی جب یورپ کے ملکوں میں نئے انتخابات کے بعد سان فرانسسکو میں صحیح معنوں میں جمہوری اور عوامی نمائندے بھیجے جائیں گے اور جو ہر قدم پر سوویت روس کی' امن پسند پالیسی کی حمایت کریں گے۔

یوگوسلافیہ اور اٹلی

ٹرائسٹ کا جھگڑا آخر طے پا گیا اور متحدہ اقوام کے درمیان اختلاف اور مناقشات کی ایک اور اہم بنیاد ختم ہو گئی۔ جس نوعیت سے یہ معاملہ طے پایا ہے وہ تقریباً وہی ہے جو پولینڈ یا یونان کے سلسلے میں پیش نظر آئی ہے۔ یعنی یہاں بھی سامراجیوں یا اُن کے پٹھوؤں کو شکست ہو

...ٹیم کو فتح حاصل ہوئی ہے۔ جب شمالی اٹلی میں انقلاب شروع ہوا تو مارشل ...تو بینڈار کے زیر کمان اٹلی میں مقیم اتحادی فوجیں اس طرف دوڑ پڑیں تاکہ شہر ٹرائیسٹے اور اس علاقے کو انقلابیوں کے ہاتھوں سے چھین کر اتحادی فوجوں کی گرفت میں لے لیا جائے۔ لیکن اسی وقت ... مارشل ٹیٹو کی فوجیں بھی وہاں آدھمکیں اور اتحادیوں کے پہنچنے سے پہلے شہر اور اس کے گردو نواح کے علاقے پر قابض ہو گئیں ... مارشل ٹیٹو کی فوجوں نے اتحادی افواج کے لئے جگہ خالی کرنے سے انکار کر دیا تو ایسا معلوم ہونے لگا جیسے عنقریب جھڑپ ہونے والی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پہلے اس شہر میں اتحادی افواج کے سپاہیوں کو مسلح گھومنے کی اجازت تھی لیکن بعد میں مارشل ٹیٹو نے احکام جاری کئے ... تصادم کو روکنے کے خیال سے اسے بند کرا دیا۔ اسی درمیان میں مدبرین میں باہمی گفت و شنید کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد معلوم ہوا ... برطانیہ کی فوجیں دریائے آئیسو نزو کے مغربی علاقے پر قابض ہو گئیں ہیں ... اس علاقے میں کچھ آسانی کی راہیں تھیں، جب شہر ٹرائیسٹے کی آبادی بھوک سے مرنے لگی تو برطانوی افسروں نے مارشل ٹیٹو کے آدمیوں کو ان ... کو استعمال کرنے سے روک دیا۔ ان باتوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے حالات نے بہت نازک صورت اختیار کر لی ہے۔ لیکن باہمی گفت و شنید سے معاملہ طے پا گیا شہر کے امور انتظامیہ ایک مجلس منتظمہ کے سپرد کر دئے گئے ہیں جس میں اطالوی اور سلاوی نمائندے شامل ہیں اس مجلس منتظمہ کو اقوام متحدہ نے باقاعدہ طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ ۱۹ مئی کو امریکہ، برطانیہ اور سوویت روس کے نمائندوں نے مجلس منتظمہ کے افتتاحی جلسہ میں بھی شرکت کی۔ اس مجلس کے گیارہ ممبران اطالوی ہیں اور سات یوگوسلاوی۔

مارشل ٹیٹو کون ہے؟ یہ کہانی بھی بہت دلچسپ ہے۔ مارشل ٹیٹو کا اصلی نام جوزف بروز ہے لیکن وہ ٹیٹو ہی کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۹۱۴ء کی عالمگیر جنگ کے دوران میں وہ یوگوسلافیہ کی فوج کا ایک معمولی سپاہی تھا۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ مشرقی محاذ جنگ پر زار روس کے خلاف جنگ کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ لیکن نسلی احساسات کی بنا پر وہ اور اس کے دوسرے ساتھی جرمن افواج سے بغاوت کرکے روس کی فوجوں میں جا ملے۔ اس لئے کہ روس کے باشندے اور یوگوسلافیہ کے باشندے ایک ہی سلف و نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ مارشل ٹیٹو روس میں ۱۹۲۳ء تک رہا۔ اس دوران میں اس نے انقلابی روس کی سرخ فوج کے ساتھ انقلاب کی دشمن سفید فوج کے خلاف لڑا اور مداخلت کرنے والے اتحادیوں کے خلاف بھی اس نے اپنے سپاہیانہ جوہر دکھائے۔ اُسے ان جنگوں میں اس قدر تجربہ حاصل ہو گیا کہ بعد جلد وہ فوجی چالوں اور طریقۂ جنگ کا ماہر سمجھا جانے لگا۔ وہ روس کی سرخ فوج میں اس وقت تک رہا جب تک فتح یقینی نہ ہو گئی اس کے بعد وہ روس میں مستقل قیام کرنے کی بجائے یوگوسلافیہ چلا آیا۔ یہاں رجعت پسند یوگوسلافی حکومت نے اُسے سخت پریشان کیا وہ ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۸ء کے درمیان متعدد بار جیل میں بند رہا قید ہی کے دوران میں اُس نے محسوس کیا کہ ایک خفیہ فوجی تنظیم کے بغیر مزدور انقلاب کے نصب العین کا حصول قطعی غیر ممکن ہے۔ چنانچہ اس نے خفیہ مزدور تحریک کو تقویت دینے کے لئے ایک خفیہ فوجی تنظیم بھی قائم کی۔ چنانچہ جب ۱۹۴۱ء میں جرمنی نے یوگوسلافیہ پر حملہ کیا تو اس وقت گویا مارشل ٹیٹو اپنی ان دونوں تنظیموں کی مدد سے جرمنی کے خلاف جدوجہد کے لئے بالکل تیار تھا۔ فاشزم کی کامیاب مدافعت اور اس کے خلاف زبردست جدوجہد کے بعد مارشل ٹیٹو ...

...خود اندرون ملک کی رجعت پسند اور عوام دشمن شاہی حکومت کو ختم کر دیا۔ آج یوگوسلافیہ تیز رفتاری کے ساتھ ایک اشتراکی انقلاب کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔

سر سپرو فارمولے پر اخبارات کی رائیں

از ـــــــــــ ادارہ

ہم سپرو کمیٹی کی سفارشات پر اردو اخبارات کے تبصروں کا خلاصہ درج کرتے ہیں اس سے کمیٹی کی سفارشات کا حکم قارئین کے ذہن میں آ سکتا ہے۔ ـ ایڈیٹر

روزنامہ خلافت بمبئی اپنی ۱۱ اپریل کی اشاعت میں لکھتا ہے۔

سر سپرو کی نام نہاد اور خود ساختہ "مصالحتی کمیٹی" نے ہندوستان کے آئندہ دستور حکومت کے متعلق جو تجاویز شائع کی ہیں وہ نہایت لغو ہیں۔ ان سے ملک کو اس کے سوائے اور کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا کہ ان کی وجہ سے ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں میں کانگریس اور برطانیہ کے خلاف مزید اشتعال اور غصہ پیدا ہوگا۔ کیونکہ سر سپرو کی تو مسلمانوں کے نزدیک ذرہ برابر بھی وقعت نہیں ہے، ہاں وہ کانگریس اور حکومت کو ہندوستان کے مسئلہ کی معجون مرکب کے اہم اجزا ضرور سمجھتے ہیں۔ گاندھی جی سر سپرو اور ان کی کمیٹی کو کامیابی کی آشیرباد دے چکے ہیں اور لارڈ ویول ان سے بہت سی توقعات وابستہ کر چکے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کمیٹی کے پردے کے پیچھے ان کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔ اسی لئے مسلمان ان دونوں سے ہی اور بدظن ہوں گے۔

سر سپرو کمیٹی نے امید اور عادت کے عین مطابق پاکستان کی شدید مذمت کی اور اسے ہندوستان کی ترقی اور امن کے لئے مضر بتایا ہے۔ یہ بات اتنی پرانی ہو گئی ہے اور اس کے خلاف اتنا کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے کہ اب اس پر مزید بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہم صرف سر سپرو، ان کے ساتھیوں اور بہی خواہوں کو ایک بار پھر یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان پاکستان سے کم کسی چیز پر راضی ہو ہی نہیں سکتے چاہے اس قسم کی کتنی ہی رپورٹیں شائع ہو جائیں اور کتنی ہی تجویزیں پیش کر دی جائیں۔

سر سپرو کی مصالحتی کمیٹی کی رپورٹ میں یہ تجویز بھی پیش کی گئی ہے کہ کسی صوبہ کو ہندوستان کی یونین میں شامل نہ ہونے یا اس سے علیحدہ ہونے کا حق نہیں ملنا چاہئے یہاں سر سپرو اکھنڈ ہندوستان کی محبت میں گاندھی جی کانگریس اور حکومت برطانیہ سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں کیونکہ کانگریس کی مجلس عاملہ کی دہلی والی تجویز، گاندھی جی کے فارمولے اور کرپس کی تجویزوں میں صوبجات کے حق خود اختیاری کو تسلیم کر لیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رپورٹ مرتب کرتے وقت سر سپرو اس چراگاہ میں پہونچ گئے تھے جس میں ہوا کھانے کا لارڈ ویول نے کلکتہ کی تقریر میں ہندوستانیوں کو مشورہ دیا تھا اور اس مشورہ کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ ہندوستان کو پاکستان جیسے بڑے آپریشن کی ضرورت نہیں ہے۔

اندھے کی ریوڑیاں ـ سر سپرو کی تجویز ہے کہ متحدہ مرکز میں جو حکومت قائم ہو اس میں اور مرکزی اسمبلی میں اونچی ذات کے ہندؤں اور مسلمانوں کو مساوی نمائندگی دیدی جائے بشرطیکہ مسلمان مخلوط انتخاب قبول کریں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ دس فیصدی نشستیں مختلف مفاد کے لوگوں مثلاً عورتوں تاجروں زمینداروں اور کارخانہ داروں کو دینا چاہتے ہیں اور اچھوتوں، سکھوں عیسائیوں اور اینگلو انڈینوں کے لئے بھی کافی اور قابل اطمینان نمائندگی کی سفارش کرتے ہیں ظاہر ہے کہ اگر نمائندگی کی قوت کو تین حصہ کیا گیا اور ان میں سے ایک حصہ مسلمانوں کو دیدیا گیا ایک ہندؤں کو اور ایک حصہ باقی ماندہ اقلیتوں اور مفادوں پر تقسیم کر دیا گیا تب بھی مسلمان اس اسمبلی اور حکومت میں بے اثر اقلیت بنکر رہ جائینگے۔ کوئی کہے کہ دوسری اقلیتیں اور مفاد ان کا ساتھ دے سکیں گے تو یہ بھی قطعی دھوکا ہوگا۔ کیونکہ باقی ماندہ تمام نشستوں کی اکثریت ہندؤں کے قبضہ میں چلی جائے گی مثلاً تاجروں کی نشستیں کارخانہ داروں کی نشستیں وغیرہ۔ چھوٹی اقلیتیں بھی اپنے فائدہ کی خاطر ہندؤں کی طرف ہی جھکیں گی اور اس طرح مسلمان وہاں بیٹھ کر ان کا منہ دیکھنے یا میزوں پر گھونسے مارنے کے اور کچھ نہ کر سکیں گے۔

مسلم لیگ کا دوسرا ترجمان روزنامہ منشور وقت لکھتا ہے:۔

سپرو کمیٹی کی سفارشات ۱۹۴۵ء لغو ہی نہیں بلکہ شر انگیز بھی ہے اور اب کوئی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ غیر جانبداروں کی یہ کمیٹی مسلمانوں کے قومی مطالبہ کے بدترین دشمنوں پر مشتمل ہے اور اس نے مسلمانوں سے وہی سلوک کیا جو ایک بدترین دشمن کر سکتا ہے۔ سب سے اہم اور بنیادی سوال یہی تھا کہ ہندوستان میں "اکھنڈ راجیہ" قائم کیا جائے یا مسلمانوں کو بھی حق خود اختیاری حاصل ہو اور وہ اپنی اکثریت کے علاقوں میں اپنی آزاد۔ خود مختار اور جداگانہ ریاستیں قائم کریں۔ سپرو کمیٹی نے مسلمانوں کی مجلس آئین ساز میں مشترکہ انتخابات (جن پر کئی سال ہوئے مسلمان خیر باد کہہ چکے) سے مشروط برابر نمائندگی کا لالچ دے کر ایک یونین کی سفارش کی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ کمیٹی نے مسلم لیگ کی منظور کی ہوئی کئی قراردادوں کا (جن میں قرارداد لاہور بھی شامل ہے) بغور مطالعہ کیا ہے۔ گاندھی جناح گفت و

شنید راجہ فارمولا اور مسٹر گاندھی کی تجاویز پر بھی غور کیا ہے۔ کمیٹی پورے غور و خوض کے بعد جیسے دور سے اس رائے کا اظہار کرتی ہے کہ دو یا زیادہ آزاد و خود مختار ریاستوں میں ہندوستان کی تقسیم غیر منصفانہ ہے اور اس سے ملک کے امن و امان اور ترقی کو خطرہ لاحق ہے اور کسی فرقہ کو بھی مناسب فائدہ نہ پہنچیگا۔ اس لئے ہندوستان کی سیاسی وحدت کو قائم رکھنا ضروری ہے۔

سپرو کمیٹی نے اسی پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ انصاف پسندوں کا یہ گروہ کرپس تجاویز کانگریس کی قرارداد دہلی اور مسٹر گاندھی کے آخری موقف سے بھی انحراف کرگیا اور یہ فتویٰ سنا دیا کہ "ہندوستان کے کسی صوبہ کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ یونین سے باہر رہ سکے۔" یہی نہیں بلکہ اس کے بعد انصاف پسندی اور غیر جانبداری کا ایک اور مظاہرہ یہ اعلان ہے کہ کسی صوبہ یا اکائی کو یونین میں شامل ہونے کے بعد اس سے علیحدگی کا حق نہ ہوگا۔

ریاست بھوپال کا سرکاری اخبار ندیم ۱۹ اپریل کی اشاعت میں لکھتا ہے۔

سپرو کمیٹی کی سفارشات و تجاویز منظر عام پر آچکی ہیں، اخبارات نے ان پر نہایت شد و مد کے ساتھ تبصرے بھی شروع کر دئے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ملک کی اکثریت انہیں انتہائی ناپسندیدہ نظر سے دیکھتی ہے۔

اگر ان تجاویز کو بعض اعتبارات سے سر اسٹیفورڈ کرپس کی تجاویز کا ایک بھونڈا اور بھدا عکس کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

سپرو کمیٹی کی سفارشات میں بالفاظ صریح پاکستان کے نظریہ سے اختلاف کیا گیا ہے، دلائل وہی استعمال کئے گئے ہیں جو ہندو مہاسبھا اور کانگریس کی جانب سے ابتک پیش کئے جا چکے ہیں، یہیں سے مسلمانوں کو سپرو کمیٹی تجاویز سے اختلاف پیدا ہو جاتا ہے، کیونکہ مسلمان اس سیاسی حقیقت کو ابھی عرصہ ہوا سمجھ چکے ہیں کہ بغیر حق خود ارادیت حاصل کئے ہوئے ہندوستان کے کسی آئین میں ان کے حقوق اور مفاد محفوظ نہیں رہ سکتے، یہ مسلمانوں کا بنیادی مطالبہ ہے جس سے وہ ایک قدم بھی پیچھے ہٹنا نہیں چاہتے۔

حکومت کو اس اخبار نے حسب ذیل مشورہ دیا ہے۔

ایسی حالت میں حکومت کو دانشمندانہ طریقہ سے سپرو کمیٹی کی سفارشات پر نظر ڈالنا چاہئے اور پاکستان کے مطالبہ کی اس اہمیت کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ جسے سپرو کمیٹی نے قطعاً نظر انداز کر دیا ہے۔

لکھنؤ کا اخبار حقیقت ۱۸ اپریل کی اشاعت میں لکھتا ہے۔

ہندوستان کے نئے آئین کے بارے میں بالآخر سپرو مصالحتی کمیٹی کی رپورٹ شائع ہو گئی۔ اس رپورٹ میں کمیٹی نے جو سفارشیں کی ہیں، وہ موجودہ حالات میں ہمارے نزدیک بالکل مناسب ہیں۔ کمیٹی نے اپنی تجویزیں اس بات کو خصوصیت سے مدنظر رکھا ہے کہ اگر ایک چیز مسلم لیگ کے مقاصد کے خلاف تجویز کی ہے تو دوسری مہاسبھائیوں کی چڑھ ہے، مثلاً کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ وہ پاکستان کو قطعی ناپسند کرتی ہے کیونکہ "اگر کسی صورت میں بھی ہندوستان کی تقسیم کی گئی تو اس سے ملک کے امن و امان اور منظم ترقی میں خلل پڑ جائے گا اور کسی قوم کو بھی اس تقسیم سے سوا نقصان کے کوئی فائدہ نہیں پہونچے گا، اس لئے ہندوستان کو بہرحال متحد رہنا چاہئے۔"

کمیٹی کی اس رائے سے ہمیں بالکل اتفاق ہے، لیکن مسلم لیگی حضرات کمیٹی کی اس رائے سے جتنے چراغ پا ہونگے وہ ظاہر ہے، برخلاف ازیں مہاسبھائی ہندو سپرو کمیٹی کی اس سفارش سے بہت خوش ہونگے لیکن انکی یہ خوشی بھی غصہ سے بدل جائے گی، جب کمیٹی کی دوسری سفارش پڑھیں گے، جس میں اس نے یہ رائے دی ہے کہ ہندوستان کی متحدہ مرکزی اسمبلی قائم کی جائے جس کے ارکان میں ہندو مسلمانوں کی تعداد مساوی ہوگی (اچھوتوں کو چھوڑ کر) بشرطیکہ مسلمان بجائے جداگانہ انتخاب کے مخلوط انتخاب مان لیں، یہ تجویز بھی نہایت مناسب اور معقول ہے مگر مہا سبھائی ہندو جو ہمیشہ ہندوستان میں ہندو راج کا خواب پریشان دیکھا کرتے ہیں، بھلا وہ کب یہ گوارا کر سکتے ہیں کہ ۳۲ فیصدی مسلمانوں کو پچاس فیصدی حق نیابت دیا جائے۔ دوسری طرف مسلم لیگیوں کے لئے انتخاب جداگانہ کو ترک کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ لیگ کی بنیاد ہی فرقہ وارانہ اختلاف و نفاق پر رکھی گئی ہے اور یہ مقصد صرف انتخاب جداگانہ کے برقرار رکھنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

بہ حیثیت مجموعی سپرو کمیٹی کی تجاویز ہمارے خیال میں اسقدر معقول اور مناسب ہیں کہ معمولی ترمیم و اصلاح کے بعد برٹش گورنمنٹ کو کمیٹی کی سفارشوں کو منظور کر لینا چاہئے۔ اسکی توقع کرنا فضول ہے کہ مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا جیسی فرقہ دار جماعتیں کبھی بھی ہندوستان کے سیاسی و آئینی مسئلہ کا تصفیہ کرنے کے لئے باہمی رواداری اور سمجھوتہ کی اسپرٹ سے کام لیکر کوئی مشترکہ اور متفقہ تصفیہ کر سکیں گی!!!

لکھنؤ کا دوسرا اخبار حق لکھتا ہے۔

بہرحال سپرو مفاہمتی کمیٹی اپنا کام ختم کر چکی یہ بات دوسری ہے کہ وہ مفاہمت پیدا کرانے میں کامیاب ہونے کے بجائے مخالفت کے

میں ضمنا کا جواب ہوگی۔ اس کمیٹی کی سفارشات نے ہندوستان کی کل ذمہ دار پارٹیوں میں خصوصیت منافرت کی ایسی زبردست لہریں پیدا کردی ہیں کہ اچھا ہے کہ اس کی مکمل رپورٹ شائع ہوکر پبلک کے سامنے لانے کے بجائے سر سپرو خود ہی سے دریا برد کردیں۔

<u>مرکزی مسلم لیگ کا ترجمان خصوصی منشور کانسٹی ٹیوشن اسمبلی کے ارکان</u> کی تعداد بتاتے ہوئے لکھتا ہے۔

سپرو کمیٹی کی تجویز یہ ہے کہ ہندوستان کا آئین کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی وضع کرے اس کے ارکان کی مجموعی تعداد ۱۶۰ ہو۔

مسلمانوں پر بڑا کرم کیا گیا ہے کہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو اور انھیں مساوی رائیں دینا تجویز کیا گیا ہے اور اسکو ہندوؤں کی قربانی قرار دیا گیا ہے۔ مگر واقعی اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی تمام ہندوستان میں تعداد ہے کتنی؟ اگر صحیح اعداد و شمار حاصل ہوسکیں تو معلوم ہوگا کہ وہ کسی طرح مسلمانوں سے زیادہ نہیں ہیں۔

یہ اخبار تمام ہندوؤں کو مسلمانوں کا مخالف قرار دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ

مسلمانوں کو اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی برابر نیابت دے کر جو عنایت کی گئی ہے۔ اسکی حقیقت یہ ہے کہ اچھوت اور پست اقوام ہندوؤں کی بدسلوکی کی وجہ سے کتنے ہی ان سے بیزار ہوں، لیکن وہ ہندو ہیں اور صرف اسکے لئے وہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں سے لڑ رہے ہیں کہ ان کو معزز ہندو سمجھا جائے۔ ڈاکٹر امبیدکر اچھوت ہیں۔ مگر جس وقت سے وہ وائسرائے کی کونسل کے ممبر ہوئے ہیں مسلمانوں کے خلاف ان میں اور دوسرے ہندوؤں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کے محکمہ میں بھی مسلمانوں کے لئے اسی طرح کوئی گنجائش نہیں ہے جس طرح سر جے۔ پی سریواستو کے محکمہ میں اور مسلمانوں کی مسجدوں کے اور ان کے مذہبی حقوق کے وہ بھی ایسے ہی دشمن ہیں۔ جیسا کوئی پنڈت ہوسکتا ہے۔ عجب نہیں جس وقت ہندو انھیں علیحدہ حق نیابت دیدیں اور معاشرتی امور میں ان کے ساتھ تھوڑی سی رواداری برتیں تو اپنے ہزاروں برس کے ہندو آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے یہ اچھوت مسلمانوں کے ساتھ عداوت اور مخالفت میں ان سے بھی زیادہ جوش کا اظہار کریں لازماً مجلس واضعان قانون میں اچھوتوں کے ووٹ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے ساتھ جائیں گے۔ سکھ ہندوؤں کا ہی ایک فرقہ ہے۔ ہر معاملہ میں یہ ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہیں اور کسی زمانے میں بھی مسلمانوں کے ساتھ انھوں نے دوستی اور وفا نہیں کی۔ سکھ ووٹ بھی ہندوؤں ہی کے رہیں گے۔ ۱۴ ووٹ جو تجارت صنعت و حرفت، یونیورسٹیوں، زمینداروں اور عورتوں کو دئے گئے ہیں وہ بھی اکثریت کے ساتھ ہندوؤں کے رہیں گے۔ تجارت اور صنعت و حرفت کامل طور پر ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے صنعت و حرفت بھی اب ہندو زیادہ ہیں اور ہندوستان کی جتنی یونیورسٹیاں ہیں ان پر ہندو قابض ہیں۔ زیادہ سے زیادہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کو ایک نشست مل جائیگی لہذا مرکزی اسمبلی واضعان قانون کی نیابت کی اس تقسیم سے جو سپرو کمیٹی نے تجویز کی ہے مسلمانوں کو کوئی نفع نہیں ہوسکتا۔ جس طرح اس وقت مسلمان اقلیت میں ہیں اُسوقت بھی رہیں گے۔

آخر میں منشور لکھتا ہے کہ

مسلمان ہرگز سپرو کمیٹی کی تجاویز منظور نہیں کرسکتے۔ ان تجاویز سے کسی طرح وہ مقاصد حاصل نہیں ہوتے جن کے لئے پاکستان اسکیم وضع کی گئی ہے۔ مسلمان ہندوستان میں ایک جُداگانہ قوم ہیں اور ہندوستان میں بعض خطے ایسے موجود ہیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور وہ مسلمانوں کے بحیثیت قوم وطن ہیں کسی اقتصادی اور سیاسی مصلحت کے لئے یا بین الاقوامی، برطانوی یا ہندو مصلحت کے لئے مسلمان اپنی آزادی اور استقلال کے حق کو قربان نہیں کرسکتے۔ ہندوستان کے اس مسئلہ کا حل کہ ہندوستان کی تمام اقوام کو آزادی اور استقلال حاصل ہو اور مسلمان ہندو استیلا کے خطرے سے نجات پائیں۔ اسکے سوا اور کوئی نہیں ہے کہ پاکستان اسکیم کے اصولوں کے مطابق ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئے۔

<u>خالص ہندو اخبارات نے کمیٹی کی سفارشات کا جن ملے جلے جذبات کیساتھ استقبال کیا ہے ان کا کچھ اندازہ روزنامہ ملاپ کی مندرجہ ذیل رائے سے ہوسکتا ہے۔</u>

سپرو کمیٹی رپورٹ میں بہت کچھ اچھی باتیں ہیں اور کچھ ترمیم کے قابل سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ سپرو کمیٹی کے ہندو مسلمان سکھ ممبروں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہندوستان کے حصے بخرے نہیں کئے جاسکتے۔ یہ اکھنڈ ہے اور اکھنڈ ہی رہیگا۔ سپرو کمیٹی کا یہ فیصلہ ہندوستان کے تمام محب وطنوں۔ دیش بھگتوں اور حب الوطنوں کو اطمینان کا سانس لینے کا موقعہ دیگا کچھ برسوں سے ہندوستان کی اشانتی کا سب سے بڑا کارن پاکستان کا خیال بنا رہا ہے اور ہندوستان کی ترقی کے راستہ میں پاکستان کا خیال ہمالیہ پربت ثابت ہو رہا ہے مسٹر راجہ گوپال اچاریہ نے اس خیال کو کچھ طاقت دیدی تھی۔ اسلئے دیش بھگت مسٹر راجہ جی سے ناراض ہوگئے تھے لیکن جب لارڈ ویول نے ہندوستان کی تقسیم کو ناممکن العمل بتلایا تو پھر کچھ آشا بندھی کہ معاملہ شدھر جائیگا۔ سر تیج بہادر سپرو کمیٹی کے متعلق یہ اندیشہ ظاہر کیا جارہا تھا کہ کہیں ہندوستان کی تقسیم کو مان نہ دے۔ لیکن رپورٹ نے اس اندیشہ کو دور کردیا ہے۔ سپرو کمیٹی نے پاکستان کے خیال کو سختی سے انکار کرکے پھینک دیا ہے۔ اسلئے کہ لارڈ ویول بھی اس خیال کے [illegible] سپرو کمیٹی کی اس رپورٹ سے قدرتی طور پر لارڈ ویول کو تقویت پہنچیگی اور [illegible]

[illegible] یقین رکھنا چاہئے کہ [illegible] مسلمان پاکستان سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ خیال خود مسلمانوں کے لئے [illegible] ہوا دی [illegible] پاکستان کی راہ [illegible] زیادہ دیر تک روشن نہیں [illegible]

جناب نیاز فتحپوری کی تصانیف

قیمت

تاریخ الدولتین — تاریخ بنی امیہ اور بنی عباس کے تاریخی حالات پر ایک ناقدانہ نظر — ہلعہ/

ترغیبات جنسی — جنسی میلانات اور رجحانات پر ایک فاضلانہ تاریخی کتاب مجلد — للعہ/

جذبات بھاشا — ہندی بھاشا کے جواہر پاروں کا انتخاب معہ تشریح — ۱۲/

جمالستان — مولانا نیاز کے افسانوں کا دوسرا عظیم مجموعہ — للعہ/

حسن کی عیاریاں — بڑا ہی رنگین اور پُرلطف افسانہ — ۶/

شاعر کا انجام — حسن و عشق کی کیفیات۔ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے بے نظیر — ۱۲/

شہاب کی سرگذشت — سیاسی سیرت نگاری کا عجیب و غریب نمونہ اپنے قسم کا پہلا افسانہ — عہ/

علمائے قدیم — تین علمی مضامین (۱) چند گھنٹے علمائے قدیم کی روحوں کے ساتھ (۲) مارکسن کا مذہب — عہ/

(۳) حرکت کے کرشمے۔ بہت ہی دقیق اور عمیق خیالات — عہ/

فراست الید — [illegible] یعنی ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر قسمت کا حال بتانا — عہ/

قربانی [illegible] — [illegible] کا ایک تاریخی افسانۂ محبت — ۴/

گہوارۂ [illegible] — [illegible] ترقی اور تہذیب میں عورتوں کا [illegible] — ۶/

[illegible] — [illegible] کی مشہور کتاب کا سب سے عمدہ ترجمہ — عہ/

مقالات نیاز — [illegible] تنقیدی اور رنگین مضامین کا قابل [illegible] مجموعہ — عہ/

مذہب — [illegible] مصنف کی آزادانہ تنقیدیں — عہ/

مجموعہ استفسارات و جوابات — استفسارات تین جلدوں میں۔ جلد اول زیر طبع جلد دوم و سوم فی — ے/

مسئلہ [illegible] — مصطفیٰ کمال پاشا کی ایک نادر تصنیف کا ترجمہ — ۶/

مکتوبات نیاز — مصنف کے مخصوص رنگ میں لکھے ہوئے ادبی تنقیدی اور رنگین خطوط ۲ جلدوں میں — ے/

نقاب اٹھ جانے کے بعد — مسلم سوسائٹی کے تباہ کرنے والے ملاؤں اور چندہ خوروں کے حالات — ۸/

نگارستان — مولانا کے شاہکار افسانوں کا مجموعہ — ے/

انتقادیات — معرکۃ الآرا تنقیدی مضامین کا مجموعہ — ے/

ملنے کا پتہ

صدیق بک ڈپو لکھنؤ

ممالک غیر میں صحافتی سرگرمیاں

از ـــــ سید محمد تقی بی کام امروہوی

چین چین صحافت کا گہوارۂ اولیں ہے۔ دنیا میں سب سے پہلی مرتبہ چینیوں نے اخبارات کو مرتب کرنا شروع کیا۔ دی اسٹریٹڈ چیمبرانسائیکلوپیڈیا نے صحافت کی ایجاد کا سہرا اطالیہ کے سر باندھا ہے۔ لیکن یہ دعویٰ تاریخی شواہد کی روشنی میں غلط ہے۔ ڈاکٹر موائر ولیمز نے ورلڈ پریس نیوز' میں پیلک گزٹ کو دنیا کا سب سے پہلا پرچہ قرار دیا ہے۔ مشہور اخبار نویس خاتون میڈام بینس نے بھی اپنے مقالے میں پبلک گزٹ کی اس خصوصیت کا اعتراف کیا ہے۔ چینی صحافت کی ابتدا سن مسیحی سے بھی پہلے ہوئی ہے۔ پبلک گزٹ کا چینی نام 'تی چاؤ' ہے جس کے معنی ہیں۔ پایہ تخت کا اخبار۔ اس اخبار کی عمر گیارہ سو برس سے بھی زیادہ ہے۔ شنگھائی کے مشہور اخبار نویس وائی پی وانگ ایڈیٹر روزنامہ تنپاؤ نے چین کا سب سے پہلا اخبار "تنگ پاؤ" کو قرار دیا ہے جس کی نسبت فرانسیسی سفیر متعینہ کنٹن ایم ہوارٹ کا خیال یہ ہے کہ اس کی اشاعت چھٹی صدی مسیحی کی ابتداء میں شروع ہوئی تھی۔ تی چاؤ کی باقاعدہ اشاعت خاندان ٹانگ کے عہد حکومت (۶۱۸ء لغایۃ ۹۰۶ء) میں جاری رہی اس کی لمبائی ۷½ انچ اور چوڑائی ۱۳½ انچ تھی اور یہ مٹیالے کاغذ پر مرتب کیا جاتا تھا۔ ہر ورق میں سرخ روشنائی سے سات کالم بنائے جاتے تھے۔ ہر کالم میں نیچے سے لیکر اوپر تک چوکلہ حروف چھپتے تھے۔ اس اخبار کے مستقل عنادین تین تھے۔ پہلا عنوان "کنگ من چینگ" کے نام سے موسوم تھا جس میں شاہی فرامین و اطلاعات ہوتے تھے۔ دوسرا عنوان شانگ یو تھا یعنی دربار شاہی کی خبریں تیسرا عنوان 'تو ڈیاؤ' کہلاتا تھا۔ اس میں حکام کی عرضیاں اور شاہی احکام درج ہوتے تھے۔ تی چاؤ ٹائپ کے حروف میں چھپتا تھا۔ ٹائپ کے حروف یا بید اور چنار کی لکڑی کے ہوتے تھے اور یا چینی مٹی کے۔ چینی عوام و خواص اس اخبار سے بہت دلچسپی لیتے اور ہر صوبہ کے صدر مقام سے اس اخبار کا خلاصہ شائع کیا جاتا تھا۔ اس اخبار کا خاتمہ ۱۹۱۱ء میں خاندان مانچو کے زوال پر ہوا۔ چینی جمہوریت نے ڈاکٹر سین یات سین کی زیر قیادت اسی سال میں جنم لیا تھا۔ عرصۂ دراز تک تی چاؤ (پبلک گزٹ) ہی چینی صحافت کا واحد علمبردار رہا۔ ۱۸۲۳ء میں ایک شیخ تاجر نے یاٹ چانٹا کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ ولندیزیوں کی دیکھا دیکھی انگریز تاجروں نے بھی ہانگ کانگ۔ کینٹن اور شنگھائی سے تجارتی اخبارات نکالے۔ ان پرچوں میں 'نارتھ چائنا ہیرلڈ' زیادہ مشہور ہے جو ۱۸۵۰ء میں نکالا گیا۔ اس زمانے میں بہت سے امریکن، فرانسیسی اور دوسرے غیر ملکی باشندے چینی صحافت کی ترقی اور مقبولیت میں کوشاں تھے۔ غیر ملکی اخبار نویسوں کے علاوہ خاص چینی ارباب قلم کا ایک گروہ فن صحافت کی سرپرستی کر رہا تھا۔ چنانچہ ۱۸۷۲ء سے چینی علماء نے شنگھائی سے روشن پاؤ' نامی اخبار جاری کیا۔ چین پر جاپانی حملہ (۱۸۹۴ء) نے چینی قومیت کے خون کو گرما دیا۔ پھر سلسلۂ مواصلات کے استحکامات اور ملک کی عام بیداری نے اخبارات کو بہت ترقی دی۔ جریدۂ سشن پاؤ ۱۹۱۱ء میں منسے یانگ زسے کی زیر ادارت آیا اور اس نے اس نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کرلی۔ تھوڑے ہی عرصے میں چینی صحائف و جرائد کی تعداد ایک ہزار تک جا پہونچی۔ یہ اخبارات اپنی ظاہری و معنوی خوبیوں کے اعتبار سے غیر ملکی پرچوں سے کسی طرح کم نہ تھے۔ چین کا صحافتی مسلک' چین کے مشہور جرنلسٹ ایل چینگ نے حسب ذیل لفظوں میں بیان کیا ہے۔

"دس برس پہلے اخبار کے متعلق میرا نظریہ یہ تھا کہ ...

میں وہ چیزیں پیش کی جائیں جن کی عوام کو طلب ہو مگر اب میرا خیال بدل گیا ہے۔ اب میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں عوام کی طلب سے زیادہ انکی ضرورت کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔

چین کی دیسی صحافت کے سرکردہ روزناموں میں تسینہ پاؤ، اسٹرن ٹائمز، ستیپاؤ اور [illegible] پاؤ نے بہت اہمیت حاصل کر لی تھی۔ بعض اخبارات ایسے بھی ہیں جو چینی زبان [illegible] لاطینی رسم الخط میں شائع ہوتے تھے جیسے شنگھائی ایکسپریس جو ۱۹۲۵ء سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ اور چین کی تعداد اشاعت [illegible] لاکھ سے [illegible] سنہ ۱۹۱۱ء کے جمہوری انقلاب نے پریس کو [illegible] اخباروں کی تعداد آٹھ سو تک جا پہنچی۔ چین کے سرکردہ اخبارات ورسائل حسب ذیل ہیں۔

(۱) برٹش چیمبر آف [illegible] (۳) روزنامہ چائنا [illegible] (۴) چائنا کوارٹرلی (۵) چائنا ویکلی ریویو (۶) [illegible] (۷) چائنیز جرنل [illegible] (۸) [illegible] (۹) چائنیز ریکارڈر (۱۰) چائنیز [illegible] ایڈ پولیٹیکل [illegible] ریویو (۱۱) [illegible] ریویو (۱۲) فنانس اینڈ کامرس (۱۳) ہانگ کانگ ڈیلی ایکسپریس (۱۴) نارتھ چائنا ڈیلی نیوز (۱۵) نارتھ چائنا ہیرالڈ (۱۶) ڈیلی نیوز (۱۷) لائٹ آف اسلام (۱۸) اسلامک ریویو [illegible] (۱۹) [illegible] الہلال [illegible] (عربی میں شائع ہوتا ہے) (۲۰) اسلامک [illegible] وغیرہ وغیرہ

[illegible] ایسے ہیں جنھوں نے جیسی جاپانی جنگ کے زمانے میں [illegible] ہے یا مقام [illegible] کر دیا ہے۔

جاپان جاپان کی جدید زندگی کے تمام شعبوں کی طرح جاپانی صحافت کی ابتدا بھی ۱۸۶۲ء میں ہوئی۔ جب جاپان نے گذشتہ بے حسی اور جمود کو خیرباد کہہ کر مغربی اقوام کے دوش بدوش کھڑے ہونے کا ارادہ کیا۔ جاپانی صحافت نے بہت تیزی کے ساتھ ترقی کی اور ابھی انیسویں صدی ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ جاپانی صحافت نے ملک میں خاص وقار حاصل کر لیا۔ روس سے قطع نظر جاپان کی صحافت تمام مشرقی ممالک کے مقابل زیادہ مضبوط اور با اثر ہے۔ اگرچہ ترقی پسند اور آزاد نہیں۔ کیونکہ حکومت جاپان کی سامراجی گرفت نے آزاد پریس کا گلا پہلے ہی گھونٹ دیا ہے۔ جاپانی اخبارات نے کثرت اشاعت کے اعتبار سے کتنی ترقی کی ہے؟ اس کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ وہاں ہر آٹھ آدمیوں کے لئے ایک اخبار ہے۔ یعنی جاپانی صحائف و جرائد کی مجموعی تعداد اشاعت ڈیڑھ کروڑ ہے۔ آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ جاپان کی داخلی تجارت کا اہم جزو اخباری بزنس ہے۔ ایک جاپانی اخبار کی سالانہ آمدنی ۲ کروڑ پچیس لاکھ روپیے کے قریب ہے جس کا ½ حصہ خالص منافع ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جاپان میں تعلیم عام ہے اور پھر صنعتی سرگرمیوں کی وجہ سے اخبارات ورسائل کو اشتہاری بزنس کافی ملتی ہے۔ ٹوکیو اور اوساکا کے چند اخباروں کی روزانہ اشاعت ۵ اور ۷ لاکھ کے درمیان ہے۔ ان میں دو اخبار عالمگیر شہرت کے مالک تھے۔ (۱) اوساکا مائینچی (۲) ٹوکیو نچی نچی۔ یہ دونوں اخبار اوساکا مائینچی کمپنی کی ملکیت ہیں۔ اول الذکر کی اشاعت ۱۳ لاکھ اور آخر الذکر کی ۸ لاکھ ہے۔ موجودہ جنگ میں نچی نچی شمبون نامی اخبار کا اکثر ذکر آتا ہے۔ یہ نیم سرکاری حیثیت رکھتا ہے۔ اسکی تعداد اشاعت بھی لاکھوں تک پہونچتی ہے۔ جاپان ٹائمز اینڈ ایڈورٹائزر جاپانی وزارت خارجہ کا انگریزی ترجمان ہے۔ اس کے بعد اوساکا اساہی کمپنی کے دو پرچے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ (۱) اوساکا اساہی (۲) ٹوکیو اساہی۔ ان دونوں کی مجموعی اشاعت ۲۰ لاکھ ہے اوساکا دنیا کا سب سے زیادہ کثیر الاشاعت اخباروں میں سے ہے۔ اس کا مقابلہ روس کا مشہور روزنامہ۔ پراودا اور ریڈ اسٹار۔ پیرس کے جرنل اور پتی پاریزان۔ لندن کے ٹائمز اور ڈیلی میل۔ امریکہ کے نیویارک ٹائمز اور ہیرالڈ۔ جرمنی کا نیشنل زتیانگ اور اطالیہ کا پوپولی ڈی اطالیہ ہی کر سکتے ہیں۔ بقیہ اخبارات کی اشاعت ایک لاکھ سے لے کر ۵ لاکھ تک ہے۔ اوساکا مائینچی کمپنی انگریزی روزنامہ بھی شائع کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ٹوکیو سے چند انگریزی اخبارات اور بھی شائع ہوتے ہیں۔ اخبار اوساکا مائینچی روزانہ تیرہ ضمیمے تک شائع کرتا ہے۔ جاپانی اخبارات کا سلسلۂ خبر رسانی بہت مستحکم اور حیرت انگیز ہے۔ مستقل نیوز ایجنسیوں کے علاوہ اخبارات کے نامہ نگاروں کا ایک جال ہے جو تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ رپورٹر دنیا کے ہر گوشہ کی تازہ ترین خبریں، لاسلکی اور تار کے ذریعہ اپنے

اخبارات کو روانہ کرتے ہیں۔ بعض اخبارات کے پاس ان کی فضائی سروس ہے۔ مشہور ہے کہ اوساکا مانیچی نے ۱۹۲۳ء کے مشہور جاپانی زلزلے کی خبریں حاصل کرنے پر ۲۴ ہزار پونڈ صرف کئے تھے۔ جاپانی اخبارات خبر رسانی کے جدید ذرائع پر ہی قناعت نہیں کرتے بلکہ بعض حالات میں پیام رساں کبوتروں کو بھی استعمال کرتے ہیں حال ہی میں جاپان نے سیام، ملایا، منچوریہ، نانکنگ، اور برما کے پریس کو از سر نو منظم کیا ہے تاکہ وہ جنگی مقاصد کو بوجہ پورا کر سکے۔ ایک نقاد نے جاپانی صحافت کے متعلق ان لفظوں میں اظہار خیال کیا ہے کہ وہ ایسا خوبصورت اور تنومند ہے۔ جس میں زندگی کی گرمی اور تازگی ہی نہیں۔ یہ مقولہ سولہ آنہ صحیح ہے۔ ۱۹۲۵ء کے پریس ایکٹ کی رُو سے جاپانی اخبارات پر یہ پابندی عائد کردی گئی ہے کہ وہ موجودہ سیاسی وسماجی نظام کے خلاف کوئی مضمون نہ شائع کریں۔ جاپان میں پریس کس قدر مجبور ہے؟ اس کا اندازہ روزنامہ آشی کے واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ نایابی غذا سے مجبور ہوکر فاقہ کش انسان نے بلوہ کیا۔ پولیس نے غیر معمولی سختی سے کام لیکر بلوہ کو دبا دیا روزنامہ آشی نے پولیس کی زیادتی پر نکتہ چینی کی۔ اس جرم پر سنسر نے اخبارات کا پورا اسٹاف تبدیل کر دیا۔ ایک دوسرے موقعہ پر پولیس نے ٹوکیو کے مشہور اخبار نویس مزآیاما کو بازار میں زدوکوب کیا۔ اور انھیں جیل میں ڈال دیا۔ ان واقعات نے جاپانی اخبارات کو بہت محتاط کر دیا ہے اور وہ حکومت پر ذرا سا نکتہ چینی کرتے ہوئے بھی گھبراتے ہیں۔

ترکی مشرقی ممالک میں ترکی پریس اپنی آزاد خیالی اور ترقی پسندی کے لئے مشہور ہے۔ ترکی اصلاحات کی تمام تر تاریخ، ترکی صحافت کی جد و جہد اور سرگرمیوں سے لبریز ہے۔ یہ ترکی پریس ہی تھا جس نے ترکی قوم کے تن مردہ میں روح حیات پھونکی اور اسے دنیا کی زندہ اور توانا قوموں میں جگہ دلائی۔ مصطفےٰ کمال پاشا مرحوم کو اپنی جنگ آزادی میں ہرگز کامیابی نصیب نہ ہوتی اگر ترکی کا آزادی خواہ اور غیور پریس انقلاب کیلئے زمین نہ ہموار کر چکا ہوتا۔

ترکی میں سب سے پہلا مطبع ۱۷۲۸ء میں قائم ہوا۔ ۵ جولائی ۱۷۲۷ء کو سلطان کا ایک فرمان صادر ہوا جسکی رو سے کتابوں کے طبع و نشر کی اجازت دی گئی۔ ترکی میں صحافت کی بنیاد فرانسیسیوں نے ڈالی۔ ورمن ہاک وہ سب سے پہلا شخص ہے جس نے ۱۷۹۵ء میں استنبول سے فرانسیسی زبان میں اخبار جاری کیا۔ جس کا نام گزٹ تھا۔ ورمن ہاک سلطان سلیم ثالث کے دربار میں حکومت فرانس کا سفیر تھا۔ ۱۸۱۱ء میں ایک دوسرا فرانسیسی اخبار جاری ہوا جو چند روز کے بعد بند ہوگیا۔ اس کے بعد اسپکٹیر ڈی اورینٹ موسیو الیگزینڈر بلیک نے سمرنا سے نکالا۔ اس کی تاریخ اشاعت ۱۸۲۸ء ہے کچھ عرصہ کے بعد اس کا نام کوریر ڈی سمرنا ہوگیا، اب باب عالی کو بھی صحافت کی طرف توجہ ہوئی چنانچہ خود فرمان سلطانی سے "نوفیلر آٹومن" کی اشاعت شروع ہوئی جو فرانسیسی زبان میں پہلا سرکاری اخبار تھا۔ سلطان محمود ثانی کے ایما سے ترکی زبان کا سب سے پہلا جریدہ (تقویم وقائع) ۴ مئی ۱۸۳۲ء سے نکلنا شروع ہوا ۱۸۴۳ء میں چرچل نامی ایک انگریز نے قسطنطنیہ سے جریدۂ حوادث جاری کیا۔ اس کے بعد مشہور ترکی ادیب شناسی بے نے ۱۸۶۰ء میں ترجمان احوال نامی اخبار کی اشاعت شروع کی۔ جس نے ترکی ادب اور ترکی افکار کو بہت متاثر کیا۔ ترجمان احوال شناسی بے اور آغا آفندی نے مشترکہ طور پر جاری کیا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد شناسی بے نے اپنا ذاتی اخبار تصویر افکار نکالا۔ جس نے بہت جلد بین الاقوامی شہرت حاصل کرلی۔ ۱۸۶۲ء میں مشہور ترکی ڈرامہ نگار اور ادیب نامق کمال بھی ترجمان افکار کے ادارہ میں شامل ہوگیا۔ تصویر افکار ۶۵ برس تک جاری رہا۔ آخر ۱۹۲۵ء میں اس نے اپنی اشاعت بند کردی۔ ۱۸۶۵ء میں علی سعادی بے نے مخبر نامی پرچے کی اشاعت شروع کی۔ اس سنہ میں باب عالی نے پریس پر احتساب عاید کردیا۔ کیونکہ ترکی پریس کی آزاد نگاری اور جرأت ارباب اقتدار کے لئے خطرناک ثابت ہورہی تھی۔ حکومت کی سخت گیری سے عاجز آکر کچھ اولوالعزم جرنلسٹ ترکی سے نکل گئے بعد انھوں نے ۱۸۶۷ء میں لندن سے حریت جاری کیا۔ جس کی ہزاروں کاپیاں خفیہ طور پر ترکی میں تقسیم کی جاتی تھیں ۱۸۶۷ء سے ۱۸۷۶ء تک ترکی میں اصلاحات کی جو تحریک جاری تھی وہ تمام تر پریس کی ہی پیدا کردہ تحریک تھی۔ اس زمانے میں نامق کمال نے عبرت نامی جریدہ کو قومی تحریک کا ترجمان بنایا

معدود مرتبہ بابعالی کی مداخلت سے بند ہوا۔ جدید ترکی کی تعمیر میں شناسی بے، ضیا پاشا، اور نامق کمال نے جو حصہ لیا ہے وہ ہم اخباروں کے لئے نمونہ عمل ہے۔ ۱۸۶۰ء میں ترکی صحافت ... روزناموں، دو سہ روزہ اخباروں، پانچ ہفتہ وار پرچوں اور ... سات فرانسیسی، گیارہ ارمنی، چار بلغاروی، سات یونانی اور ایک عبرانی اخبار پر مشتمل تھی۔ ۱۸۷۶ء میں صرف قسطنطنیہ سے ۴۷ پرچے نکلتے تھے۔ تیرہ ترکی زبان میں اور بقیہ یونانی، عربی، فرانسیسی، ارمنی، بلغاری، عبرانی اور انگریزی زبانوں میں۔ صوبائی اخبارات کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ سلطان مراد کے بعد جب ستمبر ۱۸۷۶ء میں سلطان عبدالحمید خاں سریر آرائے حکومت ہوئے تو انھیں پریس کی طاقت سے بہت خطرہ محسوس ہوا اور انھوں نے استنبول کے بہت سے اخبار نویسوں کو سلطنت کے مرکز سے دور دیگر دور دراز صوبوں میں بھیج دیا۔ اس طرح جب صحافیوں اور انقلاب پسند اہل قلم کا جتھا ٹوٹ گیا تو انھوں نے صحافت کی باقی ماندہ طاقت کو پاش پاش کر دیا۔ سلطان نے خفیہ طور پر اخبارات کو ہدایت کر دی کہ وہ سیاسی مسائل پر قلم نہ اٹھائیں۔ اس طرح انھوں نے سیاسی جرائد کو علمی و ادبی رسالوں میں تبدیل کر دیا۔ مگر اس سے بھی ترکی علم و ادب کو کافی فائدہ پہونچا۔ ۱۸۹۲ء میں احمد رضا بے نے پیرس سے مشورت جاری کیا جس نے ترک نوجوانوں کی خوابیدہ روح بیدار کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ سلطان عبدالحمید پریس سے اس قدر خوفزدہ ہوگئے تھے کہ انھوں نے ۱۹۰۸ء کے انقلاب سے دس برس قبل تک کسی نئے اخبار کا ڈکلریشن منظور نہیں کیا۔ پھر بھی ترکی اخبار اندر ہی اندر اپنا کام کر رہے تھے۔ ۵ مارچ ۱۸۹۸ء کے مشورت میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ترک قومیت کے حقوق کی حفاظت کرنے کے لئے سات نئے اخبارات جاری ہوگئے ہیں۔ مگر وہ مالی دشواریوں کی بنا پر بہت جلد بند ہوگئے۔ یہ زمانہ ترکی صحافت کے لئے بہت صبر آزما زمانہ تھا۔ اخبارات کی ساکھ گر چکی تھی اور مالی حالت اتنی سقیم ہوگئی تھی کہ چیف ایڈیٹر کی تنخواہ صرف ساٹھ ڈالر ماہوار (۱۵۰ روپے) تھی۔ ایک تجربہ کار جرنلسٹ کو ۴۰ ڈالر ماہوار دیئے جاتے تھے۔ معمولی مترجم ۲۵ ڈالر اور نامہ نگار دس ڈالر سے تیس ڈالر ماہانہ تک کما سکتا تھا۔ ترکی صحافت کے درخشندہ ستارے شناسی۔ نامق کمال۔ ضیا پاشا۔ رضا بے۔ توفیق فکرت اور فوق آپ ضیاء حکومت کے استبداد کا شکار تھے۔ مگر یہ دور بہت کم عرصہ رہا اور ۲۲ جولائی ۱۹۰۸ء کو انجمن اتحاد و ترقی نے ملک میں جمہوری انقلاب برپا کر دیا۔ اس انقلاب نے صحافتی ترقی کے نئے راستے کھول دیئے اور آناً فاناً ملک کے ہر گوشے میں سیکڑوں نئے اخبار جاری ہوگئے ۵ اپریل کو حکومت کی مخالف جماعت کے ایک اخبار سربستی کا ایڈیٹر حسن فہمی گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ اس واقعہ نے انجمن اتحاد و ترقی کے مخالفوں کو پراپیگنڈہ کا نادر موقع دے دیا اور بہت سی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے بعد ۱۴ اپریل ۱۹۰۹ء کو باغیوں نے جمہوریت کو ناکام بنا دیا۔ اس زمانے میں فوجی حلقوں نے بھی صحافت کی طرف توجہ مبذول کی اور صاعقہ، حسام، سلام اور سیف کے جنگی ناموں سے متعدد فوجی روزنامے جاری ہوئے۔ باہمی کشمکش کے انہی دنوں میں بعض غیر ملکی طاقتوں نے بھی ترک اخبارات پر اثر ڈالا۔ طرابلس کی جنگ کے زمانے میں انجمن اتحاد و ترقی نے پریس پر مزید پابندیاں عاید کر دیں۔ ابھی طرابلس کا ہنگامہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان شروع ہوگئی۔ اس جنگ نے ترکی صحافت کو بہت متاثر کیا اور وہ باہمی اختلافات کو مٹا کر ایک مرکز پر اکٹھی ہوگئی۔ وہ مرکز دفاع ملک و وطن کا متفقہ محاذ تھا۔ ۱۹۱۲ء سے پہلے ترک اخبار اپنے سیاسی تبصروں کے لئے مشہور تھے۔ مگر اب انھوں نے خبروں کی طرف زیادہ توجہ شروع کی اور اخبار کو صحیح معنی میں (علمی رسالہ نہیں بلکہ) اخبار بنا دیا۔ ترکی پریس پر پابندیاں عائد ہونے کی وجہ سے اخبارات نے اپنا رنگ بدل دیا اور انھوں نے سیاسیات کے بجائے ادبیات، مغربی علوم و فنون اور سائنس کی ترویج و اشاعت کو اپنا مقصد قرار دیا۔ ۱۹۱۱ء میں روزناموں کی تعداد تیرہ تھی۔ لیکن دو برس کے بعد صرف چھ روزنامے رہ گئے زامیہ اخبار سات کے بجائے تین ہوگئے۔ البتہ مصور رسالوں کی تعداد میں معتد بہ اضافہ ہوا۔

۱۹۰۸ء میں ترکی کی سب سے پہلی نسوانی انجمن "جماعت نسواں" نے عالم نسواں کے نام سے عورتوں کا اخبار جاری کیا تھا۔

تین برس بعد تین نئے پرچے عالم وجود میں آ گئے۔ مذہبی رسالے چار سے بڑھ کر چھ ہو گئے۔ نئے رسالوں میں پانچ زرعی رسالے، پانچ فوجی اور بحری رسالے اور تین کے بجائے سات سائنٹفک اخبار جاری ہو گئے۔ ان کے علاوہ ایک سرکاری روزنامہ آٹھ ہفتہ وار اخبارات مختلف محکموں کی طرف سے نکلنے لگے۔ فرانسیسی مطبوعات کی تعداد چودہ سے گھٹ کر دس رہ گئی۔ یونانی اخبار تیرہ سے اٹھارہ، آرمنی سولہ سے تئیس، عربی دو سے تین، اور عبرانی ایک سے چار ہو گئے۔ ۱۹۱۳ء میں صوبائی پریس کے اعداد و شمار حسب ذیل ہیں۔

۱۱۷ عربی، ۱۰۸ ترکی، ۲۵ یونانی، ۱۹ آرمنی، ۱۱ عبرانی، ۴ البانی، ۱۰ فرانسیسی، یعنی کل رسائل و جرائد کی تعداد ۳۲۸ تھی۔ جنگ کے زمانہ میں پریس پر احتساب اور سخت ہو گیا۔ ۱۹۱۶ء تک صحافت کا یہی عالم رہا۔ البتہ اس سال معاشی تحریک نے اخباروں کو بڑی طاقت بخش دی اور حکومت نے پریس کو تھوڑی بہت آزادی بیان بھی دیدی۔ پچھلی لڑائی کے زمانہ میں کاغذ کی درآمد بند ہو جانے کی وجہ سے صحافت سخت پریشانی کے عالم میں مبتلا ہو گئی۔ ترک اخباروں کی اس پریشانی سے جرمن سفارت خانہ کے پریس لیئیژ نے ترک اخبارات کو کاغذ فراہم کرنے کی پیشکش کی جسے ترکی پریس نے مجبوری قبول کر لیا۔ جرمن سفارتخانہ ترک اخباروں کو جو کاغذ سپلائی کرتا تھا وہ بازار کی مروجہ قیمت سے ¼ اور ½ تھا۔ ۱۹۱۷ء میں عثمانیہ ایسوسی ایشن قائم ہوئی۔ اس ایسوسی ایشن کی جد و جہد سے احتسابی پابندیاں بہت کم ہو گئیں۔ جرمنی کی شکست کے بعد ۱۹۱۸ء میں ترکی پر اتحادیوں کا اقتدار قائم ہو گیا۔ دسمبر ۱۹۱۸ء میں اتحادیوں نے اپنا شعبۂ احتساب قائم کیا۔ ۱۹۱۹ء میں جو ترکی وزارت قائم ہوئی وہ حد درجہ رجعت پسند اور آزادی کی دشمن تھی۔ اس وزارت کی پوری کوشش یہ تھی کہ وطنی تحریک کو (جس کے قائد مصطفےٰ کمال پاشا تھے) کچل دیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے پہلے آزادی پرست پریس کو کچلنا ضروری قرار دیا گیا مگر ترک اخبار نویسوں نے حکومت کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اور انھوں نے اناطولیہ کی وطنی تحریک کی پوری پوری سرپرستی کی۔ آخر وطنی مجاہدوں کو فتح حاصل ہوئی اور ترکی نے اپنے قائد مصطفےٰ کمال کی رہنمائی میں اپنی زندگی کے نئے دور میں قدم رکھا۔ پچھلے چوبیس برس ترکی صحافت کی شاندار ترقیوں سے لبریز ہیں۔ روزناموں، سہ روزہ اخباروں اور علمی رسالوں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہو گیا ہے۔ لاطینی رسم الخط اختیار کرنے کی وجہ سے طباعت میں بہت آسانیاں ہو گئی ہیں۔ ترکی پریس علی العموم جمہوریت پسند اور روشن خیال ہے اور رائے عامہ پر بے مثال اقتدار رکھتا ہے۔ اسوقت یوں تو ترکی میں بے شمار روزنامہ اخبار نکل رہے ہیں مگر سولہ روزنامے بہت اہم ہیں۔ ان میں بعض کی اشاعت نصف لاکھ کے قریب ہے۔ جبکہ اب سے بارہ سال قبل کسی اخبار کی اشاعت بارہ ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ اسوقت ترکی صحافت کے اہم مرکز استانبول، ازمیر اور انقرہ ہیں۔ استانبول سے فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں بھی بعض محدود اشاعت رکھنے والے پرچے نکلتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی اب ترکی میں اجنبی زبانوں کے جرائد کی کوئی گنجائش نہیں۔ سال گذشتہ ۱۶ جنوری کو ترک اخبار نویسوں کا ایک وفد ہندوستان آیا تھا۔ اس وفد میں موسیو ملیک (آپ بہت آزاد خیال صحافی ہیں)، مسٹر بلجی (ترکی مجلس صحافت کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر جنرل) مسٹر اربل (ترکی وزارت خارجہ کے چیف پروٹوکول) موسیو تحسین سی (اناطولیہ نیوز ایجنسی کے ڈائرکٹر) موسیو صادق (مجلس ملّیہ کے رکن اور اخبار آقشام کے مدیر اعلیٰ) اور مسٹر عطائی (اخبار علوس کے چیف ایڈیٹر اور ترکی پریس ایسوسی ایشن کے صدر) شامل تھے۔ مسٹر عطائی ترکی وفد کے چیرمین تھے۔ یہ وفد ۲۶ فروری کو ہندوستان سے رخصت ہوا۔ اس دوران میں ترکی وفد نے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کی سیاحت کی۔ وفد ہندوستانی صحافیوں سے ملا اور انھیں ترکی آنے کی دعوت دی۔ ترکی وفد کے اس دورے کی وجہ سے ہندوستانی اور ترکی پریس میں بہت قریبی اور دوستانہ تعلقات پیدا ہوئے۔ اسوقت ترکی کے مشہور روزنامے ینی صباح، علوس، اقشام، وطن، اقدام، اور جمہوریت وغیرہ ہیں۔

روس

روسی صحافت کو ترقی اور نشو و نما کے لحاظ سے دو زمانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، زمانۂ قبل از انقلاب، اور

روسی انقلاب کے بعد۔ انقلاب سے قبل روسی صحافت زارشاہی احتساب کے فولادی پنجوں میں گرفتار تھی۔

اخبارات کو نہ تنقید کی آزادی حاصل تھی اور نہ بیان کی۔ پورے ملک میں غلامی، جیل، افلاس، اور خوف و دہشت کا دور دورہ تھا۔ لیکن جب نومبر سنہ ۱۹۱۷ء میں روس کے اندر عوامی انقلاب برپا ہوا اور بالشویک پارٹی نے نوجوان روس کی بنیاد ڈالی تو پریس کو سب سے پہلی مرتبہ تنقید و تبصرہ اور تحریر و نگارش کی آزادی نصیب ہوئی۔ اس محدود مقالے میں روسی صحافت کی پوری تاریخ بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ صرف یہ دکھلانا ہے کہ بالشویک حکومت کے زیر سایہ آج روسی صحافت کس قدر مضبوط اور منظم بنیادوں پر قائم ہے۔ اب سے ۲۵ برس قبل روسی اخباروں کے لئے کاغذ تمام تر باہر سے درآمد کیا جاتا تھا۔ لیکن انقلاب کے بعد بیرونی کاغذ کی درآمد بند کر دی گئی اور ملک میں ہی صنعت کاغذ سازی کو ترقی دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ شروع شروع میں بہت مشکلات پیش آئیں اور اخبارات کی اشاعت (کمی کاغذ کے سبب) ایک کروڑ سے بھی کم رہ گئی لیکن آہستہ آہستہ تمام دشواریوں پر قابو پا لیا گیا اور سنہ ۱۹۳۸ء میں خود روس کے اندر اتنا کاغذ تیار ہونے لگا جو تقریباً چار کروڑ کاپیوں کے لئے کافی تھا۔ روسی صحافت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی فرد کی ملکیت نہیں بلکہ مختلف اداروں اور پنچایتوں کے ترجمان ہیں مثلاً ٹریڈ یونین۔ عورتوں کی انجمنیں نوجوان سبھائیں اور زراعتی پنچایتیں وغیرہ اس کے علاوہ فوج محکمہ بحر اور محکمہ فضائی وغیرہ کے اخبارات جداگانہ ہیں۔ روسی صحائف و جرائد کی اشاعتیں بھی ہمارے لئے حیرت انگیز ہیں۔ مثلاً ازوستیا کی اشاعت پندرہ لاکھ ہے۔ یہ سرکاری پرچہ ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کے آرگن پراودا کی اشاعت ۲۵ لاکھ ہے۔ فوجی اخبار "ریڈ اسٹار" ۲۰ لاکھ چھپتا ہے اور نوجوان سبھاؤں کا ترجمان کومس کومولسکایا ۷ لاکھ چھپتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں روسی اخباروں کی تعداد ۸۵۲۱ تھی۔ جن کی مجموعی اشاعت ۳۶ کروڑ ایک لاکھ ۴۷ ہزار تھی۔ کسانوں کے اخبار کی اشاعت بارہ لاکھ ہے۔ اخبارات کے علاوہ ۱۸۸۰ رسالے نکلتے ہیں جن کی اشاعت ۲۵ کروڑ

ہے، یہ اخبارات و رسائل ۶۹ زبانوں میں مرتب کئے جاتے ہیں روس میں اخباروں کی ایک اور قسم بھی ہے۔ جنھیں دیواری اخبار کہا جاتا ہے۔ یعنی روزانہ کی اہم خبریں دیواروں پر لکھی جاتی ہیں۔ اس قسم کے اخباروں کا شمار ناممکن ہے۔ روسی اخبار بہت باریک ٹائپ میں چھپتے ہیں تاکہ ان میں زیادہ سے زیادہ مواد آجائے۔ سرخیاں بہت کم اور محدود لگائی جاتی ہیں۔ اشتہارات کی بزنس برائے نام ہوتی ہے۔ عریاں اور فحش اشتہاروں کی اشاعت سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ سنسنی پھیلا دینے والی خبریں محتاط پیرایے میں دی جاتی ہیں، مختصر یہ ہے کہ روسی صحافت دل کے بجائے دماغ کو اپیل کرتی ہے۔

برطانی پریس

برطانی پریس دنیا کا سب سے زیادہ قدیم، سب سے زیادہ مضبوط اور سب سے زیادہ باوقار پریس ہے۔ انگلستان میں سب سے پہلا مطبع سنہ ۱۴۷۶ء میں لگایا گیا اور سنہ ۱۴۷۷ء میں سب سے پہلی کتاب چھاپی گئی۔ برطانیہ کا سب سے پہلا ہفتہ وار اخبار سنہ ۱۶۶۲ء میں نکلا۔ برطانی پریس کی قدامت کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ حال ہی میں انگلستان کے ایک چھوٹے سے اخبار سسٹر جرنل نے اپنی ۲۵۰ ویں سالگرہ منائی ہے۔ اس نے آٹھ برطانی تاجداروں اور دو حکمران عورتوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ انقلاب فرانس اور امریکہ کا اعلان آزادی اس کی زندگی کے واقعات میں سے ہیں۔ سائنس کی تمام موجودہ ترقیاں اس کے سامنے ہوئی ہیں سسٹر جرنل ایک چھوٹا سا اخبار ہے لندن کے فلیٹ اسٹریٹ میں متعدد اخبار اپنی عمر و ترقی کے لحاظ سے سسٹر جرنل پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے کم از کم پندرہ اخبارات کی روزانہ اشاعت ۵۰، ۶۰ لاکھ کے درمیان ہے یہ واقعہ ہے کہ برطانی اخبارات بہت سخت جان واقع ہوئے ہیں۔ موجودہ جنگ کے خونیں ہنگامے بھی ان اخبارات کے پائے عزم و استقلال میں لغزش نہیں پیدا کر سکتے۔ ٹھیک اسوقت جبکہ جرمن طیاروں نے لندن کی شہری زندگی کے ہر شعبہ کو زیر و زبر کر دیا تھا، لندن کے اخبارات کی روزانہ اشاعت ایک کروڑ تھی اور کبھی اس تعداد میں کمی نہیں ہوئی۔ جنگ نے برطانی

اخبارات کی ضخامت اور حجم پر بہت اثر ڈالا اور وہ گھٹ گھٹا کر بہت چھوٹے رہ گئے ہیں۔ ان کی قیمت اب فی کاپی ہے۔ برطانی اخبارات خریداروں کے سہارے نہیں، بلکہ اشتہارات کے سہارے چلتے ہیں۔ امن کے زمانے میں اشتہارات سے ان کی آمدنی ۳۵ اور ۴۰ کروڑ روپے سالانہ کے درمیان تھی اور عام طور پر اشتہار کی فی انچ کالم کی قیمت چھ پونڈ۔ باتصویر اخبارات کا اشتہاری نرخ اس سے بھی زیادہ ہے جنگ کے زمانہ میں بھی اشتہارات کے نرخ یہی ہیں۔ آمدنی البتہ گھٹ گئی ہے انگلستان میں ایک نامہ نگار علاوہ دیگر اخراجات اور ریلوے کے فرسٹ کلاس کے آٹھ پونڈ فی ہفتہ کما لیتا ہے۔ اخبارات کی طرف سے انہیں اجازت ہوتی ہے کہ وہ قہوہ خانوں اور ہوٹلوں میں جی کھول کر خرچ کریں ڈیلی میل اور سنڈے ایکسپریس کے خاص خاص کالم نویس چالیس ہزار روپیہ سالانہ تک تنخواہ پاتے ہیں۔ برطانی اخبارات طباعت کی رنگینی، تصاویر کی زیبائی اور ہاف ٹون بلاکوں کی کثرت کی وجہ سے تمام یورپی اخبارات پر فوقیت رکھتے ہیں۔ برطانی اخبارات کی سرپرستی رائٹر نیوز ایجنسی کرتی ہے۔ برطانیہ کی صحافتی تاریخ میں لارڈ نارتھ کلف آنجہانی کا نام ہمیشہ یادگار رہے گا۔ کیونکہ برٹش جرنلزم کی موجودہ ترقیاں انھیں کی رہین منت ہیں۔ اس جنگ میں برطانی اخبارات نے سنجیدہ تبصرہ کا جو معیار پیش کیا ہے وہ ان کی شاندار روایات کے شایان شان ہے۔

یوروپی پریس

جرمنی، اطالوی، ہنگرین، رومانی، فنی اور یورپ کے دوسرے پریس کا بیشتر حصہ اب سے کچھ پہلے تک حکومت کی آہنی گرفت میں رہا۔ وہ اپنی تمام حریت پسندانہ روایات کو ضائع کر چکا۔ جرمنی میں اخبارات کو آزادانہ تنقید و تبصرہ کی قطعی اجازت نہیں۔ اُسے صرف منتخب خبریں شائع کرنے کی آزادی ہے۔ صرف وہ خبریں جو سرکاری ذرائع سے حاصل ہوں اٹالیہ کے موجودہ سیاسی انقلاب سے قبل اطالیہ کے پریس پر مسولینی کی اسقدر سخت گرفت تھی کہ وہ پوپولی ڈی اطالیہ (فاشی ترجمان) نامی اخبار کے علاوہ جو براہ راست مسولینی کی سرپرستی میں تھا کسی دوسرے اخبار سے نقل و اخذ کی جرأت بھی نہ کر سکتا تھا۔ اسپین کے اخبارات جنرل فرانکو اور فلنگ پارٹی (برسر اقتدار جماعت) کے قصیدہ خواں بنکر رہ گئے ہیں۔

پرتگالی صحافت کا بھی یہی حال ہے۔ پیرس میں اخبار نویسی کا معیار اب وہ نہیں ہے جو اس جنگ سے قبل تھا۔ بہت سے اخبارات فرانس پر نازی قبضہ کے بعد بند ہوگئے۔ جو باقی رہ گئے وہ ڈاکٹر اور ڈی۔ این۔ بی (جرمن خبر رساں ایجنسی) کے اشارۂ چشم و ابرو پر رقص کرنے کو مجبور تھے۔ بلجیم، ہالینڈ، ناروے، پولینڈ اور چیکوسلواکیہ کے پریس کا بھی یہی حال تھا۔ یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ آج یورپی پریس اپنی تمام اہمیت اور ترقی پسندی کی ہر روایت کو زائل کر چکا ہے۔ اس کی حیثیت محض سرکاری پراپیگنڈہ کی رہ گئی ہے اور بس — البتہ سوئٹزرلینڈ اور سویڈن میں کبھی کسی حد تک پریس کی آزادی کا احترام کیا جاتا ہے۔ آج کل سویڈن کا پریس (اپنی غیر جانبداری کی وجہ سے) جنگی خبروں کے اہم ماخذ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ البتہ یہ سچ ہے کہ یہ تمام اخبارات اپنی کثرت اشاعت کے اعتبار سے اب بھی نمایاں درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن جنگ نے جو نئی کروٹ لی ہے اس سے حالات کی رفتار بھی بدل گئی ہے۔ چنانچہ آزاد یورپ کے پریس پر کمیونزم کا اثر صاف نمایاں نظر آتا ہے۔

امریکی پریس

یورپ کے مقابل جب ہم امریکی پریس پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو ہمیں ایک جداگانہ عالم نظر
۱۴ آتا ہے۔ امریکی صحافت اپنی گوناگوں خصوصیات کے اعتبار سے دنیا بھر میں بے مثل ہے۔ کثرت اشاعت میں دنیا کے بہت کم اخبارات نیویارک ٹائمز - نیویارک ٹریبون - کرسچین سنچری - ہیرالڈ ٹریبون - جرنل اینڈ امریکن - نیشن پک - نیویارک پوسٹ، رینالڈس، نیوز ویک - لاس اینجلز ٹائمز اور میامی ڈیلی نیوز جیسے اخبارات و رسائل کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ امریکہ میں چودہ ہزار اخبارات نکلتے ہیں ۱۹۴۲ء کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ محض روزناموں کی تعداد اشاعت چار کروڑ بیس لاکھ روزانہ ہے۔ رسائل ان چودہ ہزار اخبارات سے الگ ہیں۔ ان کی تعداد بھی ۲۰ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ بعض امریکی نامہ نگاروں کا اوسط آمدنی ایک لاکھ تک پہونچتا ہے۔ بعض کالم نویسوں کی ہفتہ وار آمدنی پانچ ہزار روپے سے کم نہیں ہوتی۔ امریکہ کی صنعت اخبار نویسی بہت نفع آور صنعت ہے۔ اکثر اخبارات لمیٹڈ کمپنیوں کی ملکیت ہیں۔ تصاویر کی طباعت کے اعتبار سے امریکی اخبارات و رسائل کا

مقابلہ نہ برطانی صحافت کرسکتی ہے نہ فرانسیسی و جرمنی!

غیر یورپی پریس

غیر یورپی وغیر امریکی پریس میں مصری صحافت بھی نمایاں طور پر ترقی یافتہ ہے۔ مصر کے المقطم۔ البلاغ۔ المصری اور الشعلہ کا شمار بہترین عربی اخبارات میں ہے۔ حجاز سے ام القری شائع ہوتا ہے۔ جو وہاں کا سرکاری پرچہ ہے۔ عراق سے بھی بعض اچھے پرچے نکل رہے ہیں۔ ایرانی صحافت نے بھی گذشتہ چند سال سے بہت ترقی کی ہے۔

اطلاعات اور شفق سرخ بہترین ایرانی روزناموں میں ہیں۔ ایران کا روزنامۂ کاوہ تو اپنی علمی و ادبی خصوصیات کی بنا پر دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ہندوستان سے تقریباً تین ہزار اخبارات و رسائل نکلتے ہیں۔ جن میں ۱/۳ اردو میں چھپتے ہیں۔ ہندوستانی صحافت میں، گجراتی، مرہٹی اور بنگالی پریس بہت زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اردو اور ہندی کی صحافت کسی حد تک مشترکہ نوعیت رکھتی ہے۔

یونان کی قدیم شہری ریاستیں

اُن کی ذہنی۔ معاشرتی اور سیاسی زندگی پر ایک نظر

از ـــــــ سید شمس العارفین بی۔ اے

انسان ارتقائے تخلیق کا وہ درشا ہوار ہے جسکی زندگی اسکے ذہنی معاشرتی، معاشی مذہبی اور سیاسی افکار کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی ارتقائے تخلیق میں قوم کی زندگی اور فلاح کا راز مضمر ہوتا ہے۔ بشریت کا یہ تقاضہ ہے کہ ہر قوم ایک جداگانہ تہذیب اور طرز معاشرت کی حامل ہوتی ہے۔ تاریخی و سیاسی زندگی اس کے انھیں خیالات اور جذبات کی جیتی جاگتی تصویر ہوتی ہے۔ اور مسرت اور زندہ دلی کی یہ جاذبیئ نظر اس کے رگ و ریشہ میں پیوست ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر کسی قوم کی بشریت مذہب کے خمار سے مدہوش ہوتی ہے تو دوسری قوم مادیات کی لے میں ڈوبی ہوتی ہے اگر ایک قوم عقلیات کا شکار رہوتی ہے تو دوسری قوم پر سیاسیات کا غلبہ ہوتا ہے۔ غرضکہ ہر قوم کے ذہنی و معاشرتی رجحانات اور ان کے نشو و نما اس کے ماحول اور سیاسی افکار کا آئینہ ہوتے ہیں اور انھیں افکار پر قوم کی ذہنی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کا دار و مدار ہوتا ہے، چنانچہ کسی قوم کی ذہنی، معاشرتی اور اجتماعی سیرت کے سمجھنے کے لئے ان باتوں کا جاننا نہایت ہی اہم ہے۔ لہٰذا اگر یونان کی سیرت اور وہاں کی طرز معاشرت ہمارے پیش نظر ہے تو ہم ان چیزوں کا بغور مطالعہ کریں گے اور پھر ایک اہم پہلو کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کریں گے۔ تاکہ اہل یونان کی سیرت اور زندگی کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

یونانیوں کے ذہن میں دین اور دنیا، انفرادی اور اجتماعی فرائض ذاتی شوق اور معاشرتی ذمہ داریاں الگ الگ چیزیں نہ تھیں۔ ان کے فلسفۂ حیات نے ان کے زندگی کے جزو کل میں ایک ربط اور ہم آہنگی قائم کر دی تھی جو کسی اور تاریخ میں نظر نہیں آتی۔ ان کی زندگی بیجا مذہبی فساد اور جھگڑوں سے پاک تھی اور اگر یوں کہا جائے کہ عقل زیادہ تر ان کے خیالات کی رہنمائی کرتی تھی تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ انکی ریاستیں چھوٹی چھوٹی تھیں اور سیاسی مسائل پر ہر شخص کی نظر ہوتی تھی۔ یہ سیاسی مسائل ان کے ذاتی تجربات اور افکار کا نتیجہ ہوتے تھے۔ ذہن اور نظر کی یہ صفائی خود بخود حاصل نہیں ہوئی تھی بلکہ ان کے ماحول کا نتیجہ تھی۔ اس وجہ سے اگر ہم ان کے ذہنی اور اجتماعی زندگی کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں تو ہم کو چاہیے کہ وہاں کے فلسفۂ حیات کے آشنا ہوں اور وہاں کی تاریخ اور سماجی زندگی کا مطالعہ کریں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ کس طرح سے اس قوم نے ان سیاسی اور سماجی افکار پر روشنی ڈالی اور کس طرح اس ماحول سے افلاطون کی "ریاست" (Republic) اور ارسطو کی سیاسیات (Politica) عالم وجود میں آسکیں۔

کہا جاتا ہے کہ مصر و چین کا تمدن یونان سے بھی قدیم ہے لیکن فلسفۂ حیات کا اتنا بہتر نقشہ جو ہمیں یہاں ملتا ہے اور کہیں نہیں مل سکتا۔ یہی وہ ملک ہے جس نے فلسفۂ سیاسیات کے دقیق مسائل پر ایک عالمانہ اور محققانہ نظر ڈالی۔ جس کے حسن سیرت اور زندگی کا صحیح نقشہ افلاطون کی 'ریاست' اور ارسطو کی 'سیاسیات' میں ملتا ہے۔

یونان کا ملک پہاڑوں اور سمندروں سے گھرا ہوا ہے پہاڑوں کے درمیان وادیاں ہیں اور ان وادیوں میں زرخیز میدان ہیں جو کاشت کے لئے بہت عمدہ ہیں۔ چونکہ قدیم یونان متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا جو ان وادیوں میں آباد تھیں۔ پہاڑ اونچے تھے اس وجہ سے گذرنا دشوار تھا نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ہر ریاست ایک جداگانہ طرز معاشرت اور سیاسی زندگی

کی عادی بن گئی ۔

روایتوں کے ذریعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یونان نے جس قوم کو سب سے پہلے اپنے گہوارے میں پالا وہ پلاسگی (PELASGI) تھے جن کی سیرت اور تاریخی حالات کا علم ہم کو حاصل نہیں ہے لیکن اس کے کچھ ہی دنوں بعد یونان جنت نشان اس قوم کی جادونگاری کا شکار ہوا جس کو آرین (ARYAN) کہتے ہیں لیکن یہ آریہ قوم بھی بہت جلد یہاں کے قدیم باشندوں میں جذب ہو گئی اور ایک دوسری قوم اس کے دلبستگی کا سامان بنی ۔ جس کو (AE GEAN) اے جین کہنا زیادہ مناسب ہوگا ۔ لیکن چودھویں صدی مسیح تک یہ اے جین تہذیب دنیا کی ظالمانہ اور جابرانہ نظر کا شکار ہو جاتی ہے اور اے کین (ACHACANS) اس ملک کو آکر زندگی بخشتے ہیں اور یونانی تہذیب کے بابرکت نظام کی بنیاد ڈال دیتے ہیں اور یہی یونانی ایتھنس (ATHENS) کو اپنا مولد و ماویٰ بناتے ہیں اور اس طرح سے یونانی تہذیب کی ابتدا ہوتی ہے جس کی سیرت اور زندگی ڈورین تہذیب کے برخلاف ایک دوسرے ہی سانچے میں ڈھلی ہوئی ملتی ہے چنانچہ سپارٹا (SPARTA) اس کے برخلاف (DORIAN) ڈورین تہذیب کی جدت اور وسعت ہمہ گیری کا شکار ہو جاتا ہے جس میں جسمانی تندرستی، ذہنی اور دماغی ترقی پر فائق رہتی ہے نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ ملک کا ملک سپاہیانہ زندگی کا عادی بن جاتا ہے ۔ اور عقلی برتری کی طرف لوگوں کا رجحان زیادہ نہیں رہتا ۔

ان سب واقعات کا علم ہم کو روایتوں کے ذریعہ سے حاصل ہوا ہے ۔ لیکن آٹھویں صدی قبل مسیح سے شہری ریاستوں کی بنیاد پڑ جاتی ہے اور باضابطہ تاریخی زندگی کا آغاز ہوتا ہے ہومر کی نظموں سے ہم کو بادشاہت کا علم حاصل ہوتا ہے لیکن اس کی نظمیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ یہ حالت نویں اور آٹھویں صدی قبل مسیح کی ہے کیونکہ اس کے بعد ہی بادشاہی آٹھویں صدی کے نصف تک ہر جگہ ختم ہوتی ہوئی ملتی ہے اور اس کی جگہ اشرافیہ (ARISTOCRECY) قائم ہو جاتی ہے ۔ ہومر کی نظمیں بہت کچھ اس زمانے کی زندگی کا آئینہ ہیں اور ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بادشاہی استبدادی حکومت نہ تھی بلکہ بادشاہ اپنے تمام آئین و قوانین کو مشورہ سے بناتا تھا ۔ امرا و اعیان دانش کی ایک کونسل ہوتی تھی جس کو یونانی زبان میں (BOULE) بادلی کہتے تھے ۔ اور بادشاہ (BASILENS) ان ممبران کونسل سے ملکی رسم و رواج اور مذہب کے بارے میں صلاح لیتا تھا ۔ اس کے علاوہ تمام آزاد لوگوں کی ایک اسمبلی ہوتی تھی جس کو اگورا (AGORA) کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے ۔ جنگ اور صلح کے معاملات پر یہ اسمبلی اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کرتی تھی ۔ بادشاہ کی ملکی ذمہ داریاں بہت اہم تھیں ۔ وہ ایک ہی وقت میں سپہ سالار اعظم، قاضی القضاۃ، اور مذہب کا صدر اعظم ہوتا تھا ۔ لیکن یہ حالت بہت جلد بدلنے لگی اور بادشاہی کے بجائے اشرافیہ ہر جگہ قائم ہونے لگی ۔ ایتھنس میں بھی یہ صورت پیش آئی ۔ لیکن وہاں یہ تغیر یکایک وجود میں نہیں آیا بلکہ رفتہ رفتہ شاہی ذمہ داریاں بادشاہ سے چھین لی گئیں اور وہ مذہب کا صدر اعظم ہو کر رہ گیا ۔ اس کی شہری ذمہ داریاں (ARCHON) آرکن انجام دینے لگے اور اس کی فوجی خدمت (POLEMARCH) پول مارک کے سپرد کر دی گئی ۶۸۳ قبل مسیح سے ان مجسٹریٹوں کی تعداد دس کر دی گئی اور سالانہ انتخاب ہونے لگا ۔ اس طرح سے حکومت بجائے شخصی ہونے کے متعدد امیر کنبوں کے ہاتھوں میں چلی گئی ۔ جو حکومت کی تمام ذمہ داریاں یہی لوگ انجام دینے کے قابل تھے ۔ وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ ملک کے قانون اور رسم و رواج سے واقف تھے لیکن رفتہ رفتہ دولت اور امارت کا نشہ انھیں ایسا بیخود اور مخمور کر دیتا ہے کہ آئین و قوانین کا نازک شیشہ عالم بیہوشی میں ہاتھوں سے گر کر چور چور ہو جاتا ہے ۔ وہی لوگ جو قانون اور انصاف کو اپنا آئین جانتے تھے بہت جلد دولت کا شکار ہو جاتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ساتویں صدی قبل مسیح سے یہ اشرافیہ حکومت چندسری حکومت (OLIGARCHY) میں تبدیل ہو جاتی ہے اس حکومت کے جابرانہ اور یک طرفہ انصاف سے لوگ بہت

بیزار ہونے لگتے ہیں۔ اور تمام ملک میں ایک بےچینی اور اضطرابی کیفیت رونما ہونے لگتی ہے۔ لوگ فاقوں اور مصیبتوں میں مبتلا ہونے لگتے ہیں۔ معاشی بےچینیوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوآبادیاں (COLONISATION) قائم کرنے کا طریقہ جاری ہو جاتا ہے اس کے علاوہ حکومت کا کوئی ایک فرد اس بےچینی اور اضطراری کیفیت سے فائدہ اٹھا کر کے اس چند سری حکومت کو ختم کر دیتا ہے اور اس طرح سے وہ حکومت شروع ہوتی ہے۔ جس کو (TYRANNIS) ٹیری نس یا ظالمانہ حکومت کہتے ہیں اس کے علاوہ کہیں کہیں لوگ ایک ثالث (ARBITER) مقرر کرتے ہیں جو ملک کی سماجی اور معاشی حالت کو درست کر کے وہاں کے لئے قانون نافذ کرتا ہے لوگوں کی معاشی اور سیاسی بےچینی کو رفع کرنے کے لئے اصلاحیں پیش کرتا ہے۔ ایتھنس میں ڈریکو (DRACO) اور سولن (SOLON) بطور ثالث کے بہت مشہور ہیں۔ سولن نے پہلے معاشی اصلاحیں کیں اور کس طرح سے غریب کاشتکاروں کو امیروں کا غلام اور قرضدار بننے سے روکا۔ اس کے بعد دستوری اصلاحیں کیں اور لوگوں کو ان کی جائداد کی بنا پر چار طبقوں میں تقسیم کیا۔ یہ چار طبقے یہاں پہلے سے قائم تھے۔ اس نے ان چاروں یونانی قبیلوں کو سیاسی حقوق دئیے۔ چنانچہ اس نے ہر ایک طبقہ سے سو سو آدمیوں کو باولی (BOULE) کی ممبری کا حق دیا۔ اس کے علاوہ اس نے جوری عدالتیں (JURY COURTS) قائم کیں اور اس طرح سے جوری عدالتیں قائم کر کے اس نے ملک میں جمہوریت کا بیج بو دیا۔ لوگوں کا طبعی میلان جمہوریت کی طرف راغب ہونے لگا۔ لیکن اس نے ایک بہت بڑی غلطی یہ کی کہ طبقہ وارانہ ذہنیت کو ختم کر دینے کی کوشش نہ کی۔ جو کہ ملک کے نظام کو درہم برہم کئے ہوئے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے چند سال بعد پی سس ٹرے ٹس نے (PEISISTRATUS) جو چھوٹے زمینداروں کی مدد سے ایتھنس کا بادشاہ ہو گیا تھا۔ ملک میں ایک ظالمانہ حکومت قائم کر دی اور وہ لوگ جو اس کے خلاف کوئی کارروائی کر سکتے تھے شہر بدر کر دئیے گئے۔ بادشاہ کی ذمہ داریاں تمام انصاف و قوانین پر حاوی ہو گئیں۔ لیکن اس کی حکومت جابرانہ اور ظالمانہ نہ تھی بلکہ اس کو بادشاہت لوگوں کی مدد سے حاصل ہوئی تھی۔ لہذا اس کا زمانہ بےچینی اور اضطراب کا نہ تھا۔ یہ بادشاہت ۳۵ برس تک قائم رہی اور اس کے ختم ہوتے ہی جمہوریت کی صدا گونج اٹھتی ہے اور کلائس تھے نیز (CLEISTHENES) اصلاحیں پیش کر کے اس طبقہ وارانہ ذہنیت کو بالکل مٹا دیا اور لوگوں میں یکجہتی اور یگانگت کا بیج بو دیا۔ رفتہ رفتہ امیر و غریب کی تفریق یکقلم محو ہونے لگی اور لوگوں میں برادرانہ رواداری کے جذبات پھیلنے لگے۔ اس نے لوگوں کو دس قبیلوں (TRIBES) میں تقسیم کیا اور ہر ایک قبیلہ اپنے پچاس آدمی باولی (BOULE) میں بھیج سکتی تھی۔ اس طرح سے چند سری کی داغ و بیل رفتہ رفتہ مٹ جاتی ہے اور ۴۸۰ قبل مسیح سے فارس یونان کے ہاتھوں نے شکست کھایا ہے۔ تو ایتھنس جمہوریت اور یکجہتی کا مرکز بن جاتا ہے۔ ہر ایک شخص ان سیاسی و سماجی معاملات میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایتھنس میں اس زمانے سے ایک تازہ روح اور نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے چونکہ ایتھنس نے یونان اور ایشیائے کوچک کے بہت سی جگہوں کو فارس کی جابرانہ اور استبدادی حکومت سے بچایا تھا لہذا فارس سے دوبارہ جنگ کرنے اور پناہ لینے کے لئے ایتھنس ایک لیگ قائم کرتا ہے جو کہ ڈیلین (DELIAN LEAGUE) لیگ کے نام سے موسوم ہے۔ جس لیگ کا صدر اور رکن اعظم ایتھنس ہی تھا کیونکہ ایتھنس ہی سمندر پر فارس کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ صدر ہونے کی حیثیت سے تمام (EXECUTIVE) (اکزیکیوٹو) عاملی اور مالی معاملات کا بار اسی کے ذمے تھا۔ رفتہ رفتہ ایتھنس اپنی ذمہ داری اور صدر ہونے کا بیجا فائدہ اٹھا کر کے ایک ظالمانہ اور جابرانہ طریقۂ حکومت شروع کرتا ہے اور ان حکومتوں سے جو اس کے حکم کی تابعداری پر آمادہ نہیں ہوئیں سختی سے برتاؤ کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ سپارٹا (SPARTA) بھی اس سے خوف کھانے لگتا ہے بالآخر جزیرہ سسلی (SICILY) کے ایک

واقعہ سے سپارٹا اور ایتھنس میں جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ اس جنگ میں یونان کی ہر ایک ریاست تقریباً حصہ لیتی ہے۔ اس جنگ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایتھنس بری طرح سے شکست کھاتا ہے۔ اور سپارٹا کامیاب ہوتا ہے۔ لیکن ان کے چند دنوں بعد ایتھنس پھر دوبارہ ایک لیگ قائم کر لیتا ہے لیکن اس لیگ کی بنیاد ہی کمزور تھی۔ لہذا اس لیگ کے اختتام پر ایتھنس کی شہری زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے سکندر اعظم کی سلطنت قائم ہو جانے سے شہری ریاستوں کو بہت سخت صدمہ پہنچتا ہے اور اجتماعی و سیاسی زندگی مٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔ بالآخر روم یونان کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیتا ہے اور اس طرح وہ آزادی اور عقلی زندگی (RATIONAL LIFE) کا اہم جزو تھی دنیا سے ناپید ہو جاتی ہے لیکن یہی یونانی تہذیب دنیا کے سامنے ایک مشعل اور نمونہ تھی اور مشعل سے روم کی آنکھیں روشن ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ چنانچہ یونانی تہذیب نے روم کی تہذیب پر ایک بہت گہرا نقش ڈالا اور جب تک روس تہذیب قائم رہی یونانی تہذیب ان کی عقل و بصیرت کی کافی رہنمائی کرتی رہی۔

وہاں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ وہاں کے ذہنی، معاشرتی اور اجتماعی زندگی کا کیا حال تھا اور کس طرح سے اس زندگی کے فلسفہ سیاسیات کی بنیاد پڑی وہی اجتماعی، ذہنی و معاشرتی زندگی سے انصاف، آزادی دستوری حکومت اور قانون کے ادب پر لوگوں نے روشنی ڈالی اور ان چیزوں پر اپنے خیالات ظاہر کئے۔ چونکہ آزادی انصاف اور دستوری حکومت کے معنی ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے یونانیوں کے سیاسی افکار کا جائزہ لینے کے لئے ہم کو چاہئے کہ وہاں کی طرز معاشرت اور سیاسی کا علم حاصل کریں کیونکہ جس ماحول میں موجودہ زمانے کے لوگ رہتے ہیں اور جو خیالات اور افکار ان کے ذہن میں آتے ہیں اور جن اشیار کے بارے میں وہ غور و فکر کیا کرتے ہیں وہ یونانیوں کے ماحول اور خیالات سے بالکل مختلف ہیں اور جس اخلاقی معیار پہ سیاسی زندگی کا دارومدار ہے وہ موجودہ زمانے کے بالکل برعکس تھی۔ ان چیزوں کا علم حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس بات کے جاننے کی کوشش کریں کہ کس طرح کے ادارے (INSTITUTIONS) ان کے پیش نظر تھے ان کی اصطلاح میں شہریت کے کیا معنی تھے؟ اور وہاں کی پبلک شہریت کے معیاری اور علمی (IDEAL) معنی میں کیا تفریق کرتی تھی۔

ایتھنس کی آبادی تقریباً دو تین لاکھ تھی اور اس میں سے آدھے سے زیادہ غلام (SLAVES) اور اغیار (ALIENS) تھے۔ اس طرح سے تمام آبادی تین حصوں میں منقسم تھی۔ سب سے نیچے طبقہ میں غلام تھے کیونکہ غلامی پرانے زمانے میں عام تھی۔ ان کی تعداد تقریباً ایک تہائی ہوگی۔ معاشی زندگی کے لئے غلامی بہت ضروری تھی۔ کیونکہ زراعت، کاشتکاری اور معاش کے کام یہی لوگ انجام دیتے تھے۔ اس وجہ سے شہریوں کو سیاسی زندگی کے بارے میں زیادہ غور و فکر کرنے کا موقع ملتا تھا۔

دوسرے طبقے میں وہ لوگ شامل تھے جو اغیار کہلاتے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر ایسے تھے جو تجارت کی غرض سے ایتھنس میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ جن کو کسی قسم کے سیاسی حقوق حاصل نہ تھے۔

سیاسی حقوق محض شہریوں کو حاصل تھے جو شہر کی سیاسی زندگی میں شریک ہو سکتے تھے۔ شہری اور سیاسی حقوق زیادہ تر میراثی ہوتے تھے۔ سیاسی حقوق کے حاصل ہونے کی وجہ سے ہر ایک شہری اس قابل سمجھا جاتا تھا کہ وہاں کی اسمبلی کونسل یا جوری کی عدالت کا ممبر بن سکے۔ بادشاہی اور چندسری حکومت کے زمانے میں یہ حقوق بہت تھوڑے تھے۔ لیکن جمہوریت کے قائم ہو جانے کے بعد ایتھنس میں تمام شہریوں کو یہ سیاسی حقوق حاصل ہو گئے۔ یونانیوں کے خیال میں شہریت میں ایک قسم کے خاندانی حصے کے طور پر ایک حصہ تھی۔

اگر یونان کی سیاسی زندگی ہمارے پیش نظر ہے تو ان اداروں کے بارے میں بھی جاننا نہایت ہی اہم ہے کیونکہ

ایتھنس کی شہریوں کی سیاسی زندگی کا دارومدار بھی انھیں اداروں پر منحصر تھا۔ بیس برس کی عمر ہو جانے پر تمام مرد شہری اکلیسیا (یا شہر کی قانون ساز مجلس میں حصّہ لے سکتے تھے۔ جس کی نشست سال میں دس مرتبہ ہوتی تھی اور اس کے علاوہ کونسل کی مدد سے خاص قسم کے اجلاس بھی ہوتے تھے۔ ملک کی پالیسی اور اہم معاملات اسی اسمبلی کی کارگذاری کا نتیجہ ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ کونسل اور جوری عدالتیں تھیں۔ تمام ملک میں (DIRECT DEMOCRACY) ڈائرکٹ جمہوریت تھی اور اپنی زندگی میں ہر ایک شہری سیاسی اور سماجی کاموں کو انجام دیتا تھا۔

ایتھنس میں پانچویں اور چوتھی صدی قبل مسیحؑ میں تمام شہری اس اجتماعی اور سیاسی زندگی میں برابر کے شریک تھے اور ہر ایک کو رائے دینے اور اظہار خیال کرنے کا حق حاصل تھا۔ یہاں تک کہ ہم کو یونانی فلسفیوں اور عالموں میں شاید ہی کوئی ایسا ملے گا جس نے زندگی میں عام فرائض سے کنارہ کشی اختیار کی ہو۔ ملک کی لڑائیوں اور جدوجہد میں برابر کا شریک نہ ہوا ہو یا اپنی سیاسی ذمہ داری کو انجام دینے سے گریز کیا ہو۔ یہی نہیں کہ یونانی اپنے سیاسی خدمت کو انجام دینا اپنا ایک فرض سمجھتے تھے بلکہ ان کے ذہن میں وسعت ہمہ گیری کے ساتھ اعتدال پسندی بھی تھی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ علم اور عمل کبھی ان سے جدا نہ ہوئے وہ ہمیشہ ایسے علم کو بیکار سمجھتے تھے جس سے عمل کی اصلاح نہ کی جا سکے۔ اور ایسے عمل کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے جسکی بنیاد علم پر نہ ہو۔ موجودہ زمانے کے برخلاف یونان میں ہر ایک شہری خصوصیت کے ساتھ سیاسی زندگی میں حصّہ لیتا تھا اور سیاسیات کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ اس میں فرد کا تقریباً ہر قول اور فعل شامل تھا اور اس سے باہر نکلنا گویا انسانیت سے ہاتھ دھونا تھا۔ اس طرح سے ہر ایک فرد کی انفرادیت اس کے مذہبی، تہذیبی اور خاندانی تعلق کا ایک جز تھی اور اس کا پیدا کرنا ہر ایک کی زندگی کا لازمی جز تھا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اجتماعی اور معاشرتی زندگی ایتھنس کے ہر ایک شہری کے مد نظر رہتی تھی انھیں باتوں کا نتیجہ ہے کہ ارسطو اپنی کتاب سیاسیات میں لکھتا ہے کہ انسان سیاسی حیوان ہے (MAN IS A POLITICAL ANIMAL)

یہ خیال ارسطو کا نہیں ہے بلکہ یونان کی اجتماعی اور ذہنی زندگی کا آئینہ ہے اور صدیوں کے افکار و خیالات کا نہایت مختصر مگر نہایت جامع اظہار ہے۔

یونانی دیوتاؤں اور سورماؤں کی پرستش کرتی تھے۔ بالخصوص ان کی جن کے روایات قدیمہ کے ذریعہ سے ان کا کوئی خاندانی یا تاریخی تعلق ثابت ہوتا تھا اور اس کے علاوہ شہر کی آبادی کے مختلف قبیلوں اور خاندانوں کے الگ الگ اور مخصوص دیوتا ہوتے تھے چنانچہ ہر شریف خاندان کا کوئی نہ کوئی مورث اعلیٰ ہوتا تھا اور وہ خاندان اس کی پرستش و عبادت کرتا تھا۔ آبا و اجداد کی روحوں کی بہبود کے لئے چند مقررہ رسموں کو ادا کرنا بھی لازمی تھا۔ ان سب باتوں سے پتہ چل جاتا ہے کہ یونانیوں کا مذہب انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی تھا۔ اس کے ذریعہ سے جو آئین حیات، رسم و رواج اور معاشرت کا طریقہ قائم ہوا اس کا تعلق براہ راست فرد سے نہیں بلکہ جماعت سے، اور افراد کے لئے اپنا فرض ادا کرنا اور اپنی ذمہ داریاں پوری کرنا کوئی ذاتی معاملہ نہ تھا۔ چنانچہ انفرادی نقطۂ نظر سے گناہ اور ثواب کی حیثیت بھی بہت کم تھی، بلکہ اس کا تعلق زیادہ تر جماعت سے سمجھا جاتا تھا اور فرد کو حسن عمل پر اپنی فلاح سے زیادہ جماعت کی بہبود کی خیال مجبور کرتا تھا۔ اس وجہ سے ظاہر ہے کہ مذہبی فرائض ہر شخص کی نظروں میں کس قدر اہمیت رکھتے ہوں گے اور مذہب کو جزو کل، فرد اور جماعت میں ربط قائم رکھنے میں کتنا دخل رہا ہوگا۔

خاندانی محبت بھی یونانیوں کی سیرت کی تشکیل کا ایک جز لاینفک تھی اور بچپن ہی سے یونانیوں کو یہ سکھایا جاتا تھا کہ کنبے اور خاندان کے مفاد کو ذاتی اور شخصی اغراض پر مقدم سمجھیں اور ہر ممکن کوشش اس بات کی کی جاتی تھی کہ خاندانی اصول، تربیت، وفاداری اور ایثار کے جذبے کو بیدار کریں تاکہ اصلی سیاسی زندگی انسان کی سیرت کا ایک جز بن جائے۔ ہر ملک میں اخلاقی تعلیم دی جاتی ہے اور اخلاق حمیدہ کی تکمیل پر ہر جگہ زور دیا جاتا ہے لیکن انفرادیت کو محو کر دینے اور شخصی اغراض کو اس قدر ثانوی بنانے کی مثال کسی اور ملک میں نہیں بالخصوص اپنی

ذات کو خاندان اور کنبے میں ضم کر دینا۔ حقوق کے بجائے فرائض پر زور دینا یونان ہی میں ممکن ہو سکا۔ اور اسکی وجہ یہ تھی کہ وہاں کی معاشرت، رسم و رواج، وہاں کے طور طریقے، وہاں کی سیاسی اور اجتماعی زندگی انھیں اصولوں پر قائم تھی۔ یونانیوں کے نزدیک عقلی زندگی بہترین زندگی تھی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کے خیالات اور جذبات میں ایک ربط اور ہم آہنگی ہونی چاہیے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو ربط اور ہم آہنگی ان کی زندگی کا شعار تھی اور دوسری جگہ نہیں ملتی۔ ان سب چیزوں نے وہاں کی سیرت اور زندگی میں اور بھی حصہ اس وجہ سے لیا کہ وہاں کی جغرافی حالت کچھ اس کے موافق تھی یونانیوں کی بستیاں چھوٹی چھوٹی وادیوں میں تھیں جو ہر طرف اونچے اونچے پہاڑوں سے گھری ہوتی تھیں، آمد و رفت ہوتی تھی مگر کم، کیونکہ تجارت بدیسیوں کے لئے چھوڑ دی گئی تھی۔ اور چونکہ زراعت پیشہ لوگوں کو زیادہ سفر کرنے کی حاجت نہیں ہوتی۔ اس لئے ہر بستی میں زندگی کی جلوہ نمائیاں ایک دوسرے ہی رنگ میں ہوئیں اور مذہب اور خاندانی روایات اور اخلاق نے اس نرالے پن کے احساس کو اور بھی زیادہ کر دیا۔ رفتہ رفتہ جب یہی بستیاں بڑھ کر شہری ریاستیں ہو گئیں تو ہر ریاست جداگانہ مذہبی، قانونی، رسمی اور تہذیبی خصوصیات کا مجسمہ بن گئی۔ ایتھنس کی حکومت بادشاہی سے شروع ہوئی اور آخر میں جمہوریت کا بہترین اور بے مثل مجسمہ بن گئی۔ ایتھنس کی تہذیب اہل دنیا کے لئے ایک بہترین نمونہ ہے۔ دنیا کے سامنے اس نے آرٹ، فلسفہ، ادب، شاعری فلسفہ، سیاسیات اور طبیعات کی بہترین مثالیں پیش کیں۔ جو اس کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی کا نتیجہ تھیں۔ اس کے برخلاف سپارٹا میں ڈورین تہذیب کے اثر سے ایک جداگانہ فوجی چند سری حکومت قائم ہوسکی اور وہ عقلی زندگی جس پر ایتھنس کی ساری سیاسی اور اجتماعی زندگی کا دار و مدار تھا یہاں پر نہ پھیل سکی۔ ملک کا ملک ایک سپاہیانہ زندگی کا عادی ہو گیا اور وہاں سے جوانمردی اور بہادری کے قصے داستانوں کی آرائش کا سامان بنے۔

یونانیوں کی سیرت بھی کچھ ایسی واقع ہوئی تھیں کہ ریاست اور اس سے خاندانی تعلقات کی محدود زندگی ان کے لئے موزوں ثابت ہوئی۔ ہر شہری سیاسی و سماجی زندگی میں دلچسپی لیتا تھا۔ عورت گھر کے کام کاج کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اور اس وجہ سے مرد فطرتاً خانگی زندگی سے مناسبت نہیں رکھتا تھا، وہ بڑے شوق سے لوگوں سے ملتا، بازاروں اور میلوں میں ٹہلتا۔ جہاں اس کے دوست آشنا جمع ہوا کرتے تھے۔ وہ شہر میں تقریباً ہر شخص کو جانتا تھا۔ اور اس طرح سے لوگ آپس میں مل کر سیاسی بحثیں کیا کرتے تھے جو روزانہ کی زندگی کا آئین تھے۔ ان مباحث میں ہر ایک فرد بہت دلچسپی لیتا تھا۔ اور چونکہ یونانی عقل کی مدد سے اپنے سارے کام انجام دیتے تھے۔ اس لئے ان کو (RALATION ANIMAL) "حیوان عاقل" کہا گیا ہے۔ ان بحثوں میں ہر ایک شخص دوسرے کا پاس و لحاظ رکھتا تھا۔ بہت سے ملک کے اہم معاملات پہلے انہیں بحثوں کے ذریعہ سے عالم وجود میں آئے تھے۔ ملک کے بڑے بڑے لوگوں کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرتے تھے (اکلیسیا یا شہر کی قانون ساز مجلس) کے جلسے مقدمے، سب کھلے میدان میں ہوا کرتے تھے۔ ہر تیسرے چوتھے روز کوئی نہ کوئی تہوار ہوتا جس میں ادھر ادھر سے لوگ آتے اور دنیا کی خبریں سناتے، لوگ ان خبروں کو بڑے غور سے سنتے اور ہر ایک اپنی اپنی عقل کے مطابق رائے زنی کرتا، اس طرح سے بحث و مباحثہ کا موقع ہر وقت تھا۔ افلاطون کے مکالموں سے یہاں کی زندگی کا اچھا خاصہ نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ چنانچہ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیاسی مباحثے ایتھنس والوں کی زندگی کا مرکز تھے۔ ان کے بغیر انہیں جینا دوبھر ہو جاتا۔ یہی حال یونان کے کم و بیش ہر شہر کا تھا۔ یونانی اسے اپنا حق سمجھتے تھے کہ تمام سیاسی کارروائیاں بر سر بازار ہوں اور ہر شخص رائے زنی کا شوق پورا کر سکے۔ یونانیوں کی سیاسی کارگزاری فراغت اور بے فکری کا نتیجہ ہے۔

چونکہ ہر قوم کا کچھ نہ کچھ معیار زندگی ہوتا ہے۔ جس سے وہاں کی ذہنی اور اجتماعی زندگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ بغیر ایک معیار کے کوئی قوم زندہ رہ ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ انہیں اصولوں پر اس کی معاشرتی، سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ جو قومیں ان اصولوں کو چھوڑ دیتی

ہیں وہ بہت جلد قعرِ مذلت میں گر جاتی ہیں۔ قوم کی ذہنی اور سیاسی ترقی اسی وقت ہو سکتی ہے۔ جبکہ قوم کا نصب العین اعلیٰ ہو۔

پے رک لیبز (PERICLES) کی تقریر سے جو کہ تھیوسی ڈی ڈیسز (THUCY DIDES) نے نقل کی ہے جس سے ایتھنس کی جمہوریت کی روح اور اس کی مخصوص تہذیب کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور جس کا ترجمہ مجیب صاحب نے اپنی تاریخ فلسفۂ سیاست میں درج کیا ہے۔ لکھا جاتا ہے تاکہ لوگ ایتھنس کے معیارِ زندگی کا صحیح اندازہ کر سکیں" ہمارا طرزِ حکومت ہمسایوں کو دیکھا دیکھی قائم نہیں ہوا۔ ہم خود دوسروں کیلئے نمونہ ہیں۔ ان کے مقلد نہیں ہیں۔ ہمارا دستور جمہوری کہلاتا ہے، اس لئے کہ یہ حکومت چند لوگوں کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ پوری جماعت کے ہاتھ میں ہے۔ ذاتی جھگڑوں میں ہمارا قانون سب کے ساتھ یکساں قانون کرتا ہے اور ہماری رائے عامہ زندگی کے ہر شعبے میں جہاں کارنمایاں کا موقع ہو ہنر کی قدر اور عزت کرتی ہے۔ کسی فرقے کی رعایت سے نہیں بلکہ کام کی خوبی دیکھ کر۔ ہم سیاسی زندگی میں ہر ایک کو اپنا جوہر دکھانے کا موقع دیتے ہیں۔ اور یہی اصول ہم اپنے روزمرہ کے باہمی تعلقات میں برتتے ہیں۔ ہمارا ہمسایہ اپنے مذاق کے مطابق خوشی منائے تو اسے ہم نہ تیکھی نظروں سے دیکھتے ہیں نہ برا بھلا کہتے ہیں۔ ہم ان چھوٹی چھوٹی بدتمیزی کی حرکتوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ جن کی چوٹ چاہے دکھائی نہ دے مگر جن کے دل پر لگتی ہے انہیں دکھ دیتی ہے۔ ملنے ملانے میں ہم بے ریا اور بامروت ہیں مگر اپنی ریاست کے انتظامی معاملات میں ہم سختی سے قانون کی پیروی کرتے ہیں ان چیزوں کو جو احترام کے قابل ہیں ہم احترام کرتے ہیں۔ جو کوئی برسرِ اقتدار ہو۔ اس کی ہم فرمانبرداری کرتے ہیں قوانین کی اطاعت کرتے ہیں۔ خصوصاً ان کی جو مظلوموں کی حمایت میں بنے ہوں اور اس اخلاقی معیار کا بہت پاس رکھتے ہیں جس کی خلاف ورزی باعث شرم و بدنامی ہے۔ پھر بھی ہمارا شہر محض کام کاج لوگوں کی بستی نہیں۔ کسی اور شہر میں تفریح کا اتنا سامان نہیں آئے دن ورزشی مقابلے اور قربانیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ایسی ایسی عمارتیں موجود ہیں۔ جن کے ہر حصہ کا لطف کر ۔۔۔ ولکہ

سرور حاصل ہوتا ہے ..... اگر ہم یہی مناسب سمجھتے ہیں کہ اپنے کو سخت جسمانی تربیت کی زنجیر میں جکڑ کر نہیں بلکہ بے تکلفی سے خطرات کا سامنا کریں اور ریاست کی سکھائی ہوئی بہادری کے بجائے اپنی خلقی جوانمردی پر بھروسہ کریں، تب بھی ہم فائدے میں رہتے ہیں۔ اس لئے کہ ہم آنے والی مصیبتوں کیلئے تیاری کی کلفتوں سے بچتے ہیں اور جب ہم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو ہم اتنے ہی مردمیدان ثابت ہوتے ہیں۔ جتنے ہمارے کچھوے کی چال چلنے والے حریف اور باتوں کی طرح اس معاملے میں بھی ہمارے شہر نے ایک ایسی مثال پیش کی ہے جو تعریف کی مستحق ہے ..... ہم حسن پرست ہیں، مگر اعتدال کے ساتھ، اس نادانی کے قدردان ہیں۔ جس سے مردانگی میں فرق نہ آئے، دولت ہمارے لئے محض کھاؤ اور لاف زنی کا سامان نہیں بلکہ اعلیٰ مقاصد کا ذریعہ ہے۔ ہم اسے حقیر نہیں سمجھتے جو غریب ہو، بلکہ اسے جو غربت کو دور کرنے کی کوشش نہ کرے، ہمارے شہری فہاق اور قومی فرائض یکساں انجام دیتے ہیں۔ اور اپنے خانگی مشغلوں میں ایسے منہمک نہیں ہو جاتے کہ شہر کے معاملات سے غافل ہو جائیں۔ عمل میں ہم سے زیادہ منچلا کوئی نہیں، لیکن عمل سے قبل ہم سے زیادہ کوئی غور بھی نہیں کرتا .... بنی نوع انسان میں بس ہم ہی ایسے ہیں جو اپنے فائدے کو سوچ کر نہیں بلکہ آزادی پر دلیرانہ بھروسہ کرکے غیروں پر احسانات کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ میں اپنے شہر کی نسبت دعویٰ کرتا ہوں کہ وہ یونان کیلئے ایک نمونہ ہے اور اگر فرداً فرداً مقابلہ کیا جائے تو اس کی شہری زندگی، کمالات کی رنگارنگی اور ذہنی اور جسمانی خود اعتمادی میں کسی سے کم نہیں ہے۔ سچ ہے ایتھنس کا شہری کسی سے کم کیوں ہو۔ ان کے پاس جوانمردی اور ایثار کے نمونے موجود تھے۔ اور پے رک لیبز کی طرح ان کا بھی عقیدہ تھا کہ ساری دنیا اعلیٰ شخصیتوں کی یادگار ہے۔ ان کی داستان صرف ان کے وطن میں ان کے سنگ مزار پر کندہ نہیں ہے۔ بلکہ دور تک اور دور تک بغیر کسی ظاہری علامت کے لوگوں کی زندگی میں سمائی ہوئی اور بسی ہوئی رہتی ہے۔

لیکن یہ نصب العین بہت دنوں تک قائم نہیں رہا۔ اور ایتھنس کی اخلاقی اور معاشرتی حالت بہت گر گئی۔ انصاف کا خون ہونے لگا اور اخلاقیات کو بہت سخت صدمہ پہنچنے لگا۔ ذہنی اور اجتماعی زندگی میں انتشار پیدا ہونے لگا۔ ایتھنس کا برتاؤ دوسری حکومتوں کے ساتھ جابرانہ اور ظالمانہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایتھنس کے خلاف ایک بےچینی سی پھیلنے لگی۔ اسی زمانے میں سپارٹا اور ایتھنس سے جنگ شروع ہو گئی۔ جس میں سپارٹا نے فتح حاصل کی۔ لیکن ایتھنس نے کچھ ہی دنوں بعد اپنی آزادی پھر حاصل کر لی۔ لیکن ایک بےچینی اور اضطراب کی کیفیت ہر جگہ نمودار ہونے لگی۔ اور لوگ اس بات کے دریافت کرنے کی کوشش کرنے لگے کہ ایتھنس کی حالت کیوں بدل گئی۔ اخلاقیات اور سیاسیات اور ہر ممکن امر پر لوگوں نے غور و فکر کرنا شروع کیا۔ اسی زمانے میں سقراط اور افلاطون (PLATO) پیدا ہوئے اور انھوں نے بھی ان مسائل پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ سیاسی اور اخلاقی تنزل کا اس وجہ سے ہوا کہ لوگوں کو اخلاق اور معاشرت کا صحیح علم حاصل نہیں تھا۔ جب تک کہ ان کی ذہنیت پرانی روایات اور قدیم اخلاقی تعلیم کا اثر رہا تب تک وہ لوگ سنبھلے رہے لیکن بعض میں خود غرضی اور نفس پرستی علمی نظریوں کا جبین بنا کر چھو بار میں پھیل گئی اور ایک صدی کے اندر ہی اندر ایتھنس کی عظمت خاک میں مل گئی لیکن اسی انحطاط کے زمانے میں فلسفۂ سیاست کی بہترین کتابیں لکھی گئیں اور ارسطو و افلاطون اسی دور کی یادگار ہیں۔

ہم طوطے ہیں یا آدمی؟

از ——————— سائرل مودک

نہر سوئز کے اُس طرف یعنی مغرب میں طوطوں کو آدمی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسے آدمی جو بندوق چلا سکیں۔ نہر سوئز کے اس طرف یعنی مشرق میں آدمیوں کو طوطا بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسا طوطا جو ہر بات پر "جی حضور" کہے۔ ہندوستان کا طوطا اگر اچھی نسل کا ہوتا ہے یعنی اگر وہ اپنے مالک کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ بہت جلد رٹ لیتا ہے تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا شعبۂ تعلیم کا ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ ہوجاتا ہے۔ اور وہ شخص جو خود اپنی سوچی سمجھی ہوئی بات منہ سے نکالتا ہے۔ تاریکی اور گمنامی کی حالت میں پڑا سڑتا رہتا ہے۔ چنانچہ پرائمری اسکول سے لیکر یونیورسٹی تک ہندوستان کے طالبعلم کو چالاک طوطا بننے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ لیکن کیا طوطا بننا ہماری قومی خصوصیات سے کوئی مطابقت رکھتا ہے؟ کیا ہم کامیاب طوطے بن کر آج خوش ہیں یا آج ہم اپنی اس حالت پر نفریں بھیج رہے ہیں؟

یہ ظاہر ہے کہ ہم اس صورت حال سے قطعی طور پر برگشتہ ہیں اور چونکہ ہم میں سے بیشتر لوگ برگشتہ خاطر ہیں اسی لئے ہم ہر چیز سے بغاوت پر آمادہ ہیں۔ ڈسپلن، سماجی حالات، معاشی صورت حال غرض تقریباً ہر چیز کے خلاف ہم بغاوت کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ خود ہمارے دلوں میں بغاوت کا طوفان گرم ہے ہماری خواہش تو اپنی ذات اور اپنی شخصیت کو جلا دینے اور اُبھارنے کی ہے، ہم باوقت انسانی ہستی بننا چاہتے ہیں لیکن ہم موجودہ نظام تعلیم میں طوطا بننے پر مجبور ہیں۔ وہ لوگ جو ممالک غیر کی سیر و سیاحت کر چکے ہیں اُن کی بغاوت نے اور بھی تند و تیز شکل اختیار کرلی ہے اس لئے کہ وہ دیکھ چکے ہیں کہ برطانیہ یا فرانس، اطالیہ یا جرمنی روس یا امریکہ کا نظام تعلیم قومی خصوصیات اور قومی کردار کی نشوونما کرنے کے علاوہ اُسے جلا دیکر نکھارتا اور نمایاں بھی کرتا ہے۔

انگریز کی نگاہوں میں زندگی ایک کھیل ہے جسے اُس مخصوص کھیل کے قاعدوں کے مطابق کھیلنا ضروری ہے۔ یعنی ہر نازک صورت حال کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا جائے اور ہر شکست پر نیک نیتی کا ثبوت دیتے ہوئے غصہ اور تکلیف کے احساس کے ساتھ مسکرا جائے اور حریف کے مقابلے میں آئندہ خود کو بہتر اور برتر ثابت کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا جائے۔ چنانچہ اس قومی خصوصیت کا اظہار بہت سے عام انگریزی محاروں اور کہاوتوں میں ہوا ہے۔ مثلاً

Play the Game" یا This isn't Cricket یا
Keep your Chin Up یا Fair-Play

برطانیہ کے نظام تعلیم کا مقصد یہی ہے کہ فرد کی عملی صلاحیتیں اور عملی دور بینی کو اُبھارا جائے جو انگریزوں کے نزدیک منطقی تجزیہ سے کہیں زیادہ اہم چیز ہے۔ موقع کی نسبت سے صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تمام ممکن ذرائع کو پورے پورے طور پر کام میں لاؤ۔ پہلے سے پلان اور منصوبے بنانا غیر ضروری ہے۔ نازک صورت حال میں پامردی اور استقلال کے ساتھ اپنے مقصد پر جمے رہنا پہلے ہی سے تیار رہنے کے مقابلہ میں زیادہ مفید ہے۔ "پاؤ بھر عمل سیر بھر اصول پرستی سے بہتر ہے" چنانچہ برطانیہ کا نظام تعلیم نظریئے اور اصول رٹنے کی بجائے عمل کی تربیت دیتا ہے۔ انگریز کا دماغ منطق پر ایمان نہیں لاتا بلکہ اُسے شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔ پہلے ہی سے پلان اور منصوبہ بناکر رکھنا انگریزوں کے قومی کردار کے منافی ہے۔ ایک انگریزی کہاوت ہے کہ "چوہوں اور انسان کے بہترین اور خوب سوچے سمجھے ہوئے منصوبے بھی غلط ثابت ہوتے ہیں" خود برطانیہ کے نظام حکومت کی نشوونما اور اس کا عروج کسی مخصوص پلان یا ارادی طور پر سوچے ہوئے منطقی نظریوں کے مطابق نہیں ہوا ہے۔ بلکہ واقعات کی گود میں پلا اور بڑھا ہے۔ غیر منظم تاریخی واقعات نے اس کی شکل و صورت اور خصوصیات متعین کی ہے۔ سلطنت برطانیہ بھی کسی ارادی یا شعوری

پالیسی کی تخلیق نہیں ہے۔ بلکہ کچھ مسلسل اور اتفاقی طور پر وجود میں آنے والے تاریخی واقعات کی پیداوار ہے۔ شعوری پالیسی تو اس وقت اختیار کی گئی جب سلطنت برطانیہ وجود میں آچکی تھی اور اس سے پیدا ہونے والی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے اُس کی ضرورت محسوس ہوئی برطانیہ کے نظام تعلیم کی نشو و نما بھی اسی ڈھنگ سے ہوئی ہے، ہر بار کسی نئی صورت حال کے فوری مطالبوں کو پورا کرنے کے لئے نظام تعلیم میں کچھ تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی اور وہ کردی گئی۔ اس طور پر برطانیہ کا نظام تعلیم بدلتا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ برطانوی راج کے تحت ہندوستان میں تعلیمی اصلاحات کی رفتار اتنی سست رہی ہے اور ساتھ ہی سطحی اور غیر عقلی (IRRATIONAL) بھی۔ لیکن جہاں تک برطانیہ کے نظام تعلیم کا تعلق ہے وہ پورے طور پر برطانیہ کے قومی کردار سے ہم آہنگ ہے اور اس سے برطانوی قوم کی ضروریات اور مطالبے بھی یقینا پورے ہوتے رہتے ہیں۔

فرانسیسیوں کے نزدیک زندگی [illegible] سمجھنا اور منطق ہی کی رو سے حل کرنا [illegible] ری ہے۔ عمل سے پہلے اصول اور نظریے کا بالکل ٹھیک ٹھاک رہنا [illegible] منطق کی رُو سے خیال میں قطعیت، پختگی اور تکمیل کا موجود ہونا۔ پہلے ہی سے کوئی مخصوص پلان تیار رکھنا اور کیل کانٹے سے درست [illegible] خصوصیات جو فرانسیسیوں کو بہت عزیز ہیں۔ آندرے (ANDRE MEUROIS) نے ایک بار کہا تھا [illegible] بالکل تمدن کی مشکلوں کے علاج [illegible] ایک مخصوص [illegible] سمان بس اتفاق سے [illegible] اور اصول کے تحت [illegible] خیال سے عمل کا تعین [illegible] چاہیئے نہ کہ کسی مخصوص صورت حال [illegible] لیکن جب فرانس کے لوگ [illegible] ہیں اور کسی مخصوص نظریئے کی تعمیر کرتے [illegible] اُن کے لئے غیر ممکن ہو جاتا ہے۔ زندگی [illegible] ہے چاہے ادبی طرز ہو یا اقتصادی [illegible] سماجی تنظیم [illegible]

تعلقات انگریزوں کو اُن کے نظام تعلیم کے ذریعہ یہ بتلایا جاتا ہے کہ اجتماعی خیال و عمل کی دنیا میں ضرورت کے مطابق اپنے اصول اور نظریوں میں کچھ تبدیلی پیدا کرلینا ضروری ہے۔ لیکن فرانسیسیوں کے نزدیک غیر عقلی قسم کی انفرادیت کی روک تھام کے لیے سماجی کنٹرول کا ہونا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ فرانسیسی نظام تعلیم ایک طرف تو فرد کے لئے قومی تہذیب اور علمی روایات کو حاصل کرنے کے ذریعے مہیا کرتی ہے اور دوسری طرف فرد میں ہر چیز کے متعلق صفائی اور وضاحت کے ساتھ سوچنے اور سمجھنے کا مادہ پیدا کرتی ہے۔ منطق کے اصولوں کو پیش نظر رکھنا اور واقعات اور حالات کا عام جائزہ لیتے وقت انھیں کے مطابق عمل سے پہلے پلان تیار کرلینا۔ غور و فکر کے انداز میں بولنے چالنے میں اور زندگی کے ہر معاملے میں، حرکت توازن دونوں کا خیال رکھنا ——— یہ ہیں وہ خصوصیتیں جو فرانسیسی نظام تعلیم طلباء میں جنم دیتا ہے انگلستان میں فرد کے کردار کی تربیت اور تعمیر آزاد طور پر ہوتی ہے اور اس کا انحصار خود فرد کے اپنے غور و فکر اور عمل پر ہے۔ سماج محض عام قاعدوں کی پابندی پر زور دیتا ہے۔ لیکن فرانس میں شروع اسکول ہی سے براہ راست طور پر اخلاقی تربیت پر زور دیا جاتا ہے۔ انگلستان میں لڑکوں اور لڑکیوں کو یہ بتلایا جاتا ہے کہ سماجی ڈسپلن کوئی اوپر سے مسلط کرنے کی چیز نہیں ہے۔ بلکہ کھیل کے قاعدوں کے مطابق [illegible] طور پر قبول کئے جانے کی چیز ہے۔ فرانس میں لڑکوں اور لڑکیوں کو خارجی باتوں میں خاندان کے تسلط اور رہنمائی کو قبول کرنا سکھایا جاتا ہے۔ اور یہ بتلایا جاتا ہے کہ ریاست اور مذہب ایک ایسی زندگی کی منطقی پیداوار ہیں جس کی اساس اصول اور منطق پر قائم ہے

جرمنوں کے نزدیک زندگی متضاد اور مخالف طاقتوں کے تصادم [illegible] اس تصادم کو حل کرنے کے لئے ایک مخصوص طریقۂ کار تنظیم اور [illegible] کی ضرورت ہے۔ جرمنوں میں فطرتاً غور و فکر میں کھوئے رہنے کا مادہ ہوتا ہے اور طبعی رجحان کے اعتبار سے اُن کے [illegible] شگفتگی اور جولویت پائی جاتی ہے۔ وہ ایک طرف تو ہر بات کو منطقی دلائل اور بحث مباحثے کے ذریعہ طے کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف وہ فطرتاً مابعد الطبیعاتی، تخیلی اور جذباتی بھی بہت ہوتے ہیں ہیگل اور مارکس جرمن قوم کے جذباتی اور منطقی ذہن کی نمائندگی کرتے

ہیں ایکہارٹ (ECHHART) اور شلیر میخر (SCHLIERMACHER)
مابعد الطبیعاتی اور تخیلی پہلو کو پیش کرتے ہیں اور گوئٹے، موزارٹ اور
بی تھوون جذباتی پہلو کو۔ ان صنفوں کے علاوہ جرمن قوم میں انتھک محنت
و مشقت اور تنظیم کی بھی زبردست صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ ہر
کام میں تکمیل، جامعیت اور ڈسپلن کے قائل ہیں۔ انھیں خصوصیات کی
بنا پر جرمن قوم نے سائنس، فلسفہ، میکانکی ایجادوں اور صنعت و حرفت
میں عظیم الشان ترقیاں کی ہیں۔ جرمنی کے نظام تعلیم کا مقصد ہمیشہ افراد
میں یہی تکمیل اور جامعیت کی صلاحیت پیدا کرنا اور ذریعہ اور مقصد کی مکمل
ہم آہنگی پر زور دینا رہا ہے۔ تنظیم، ڈسپلن اور مخصوص طریقۂ کار کی سختی سے
پابندی۔۔ یہ جرمن نظام تعلیم کی اہم خصوصیات ہیں۔ اس پر قومیت کے
شدید احساس نے جرمن قوم کے کردار کی ان خصوصیات پر اور بھی جلا
پھیر دیا ہے اور جرمنی کے لوگ اس جذبے کے تحت ڈسپلن اور تنظیم
کے دلدادہ ہوگئے ہیں۔ جسمانی، دماغی اور اخلاقی ڈسپلن انگریزوں اور
امریکنوں کے لئے پریشان کن چیز ہے۔ لیکن جرمن قوم کے افراد ان چیزوں
کو خوشی کے ساتھ قبول کرتے ہیں اور خود کو اُن کا عادی بنانے کی کوشش
ہیں۔ چنانچہ فوجی زندگی اُن کی فطرت سے قطعی طور پر ہم آہنگ ہے۔
انھیں تعلیمی نظام کے ذریعے ہر کام کو سختی کے ساتھ برتنے، ایسے کام میں
لگے رہنے اور ہر کام کو تکمیل اور جامعیت کے ساتھ انجام دینے کی تربیت
دی جاتی ہے۔ وہ ایک طرف تو موسیقی سے اور قدرت کے حسن سے لطف
اندوز ہو سکتے ہیں اور دوسری طرف زندگی کی تخیلی [illegible] سنیوں کو بھی
[illegible] رکھتے ہیں۔ اُن کے اندر انتہائی شدید عقل پرستی بھی پائی جاتی
ہے [illegible] اندازہ تخئیلیت اور مابعدالطبیعیاتی میلان بھی۔ جرمن قوم
[illegible] کے یہ متضاد پہلو جرمنی کے نظام تعلیم میں [illegible] ہوئے ہیں۔
[illegible] طور پر جرمنی کا نظام تعلیم قومیت [illegible] پر قائم ہے
[illegible] سے اس نظام تعلیم نے جرمن قوم کو [illegible] احساس قوم
[illegible] مدد کی ہے۔

[illegible] باشندوں کے نزدیک زندگی [illegible] تماشا
[illegible] زندگی کے فرائض، مذہبی رسوم اور [illegible]
[illegible] اختیار اپنے اپنے مقامات حاصل [illegible] قومی کردار
[illegible] کیتھولک مذہب کا اور کچھ سماجی روایات کا [illegible] ہے۔

ان دو اثرات کے تحت اطالوی قوم کے افراد ایسی حکومت سے مطمئن
اور مسرور رہتے ہیں جو انھیں امن و سکون عطا کرتی ہے اور انھیں
فرائض اور مذہبی رسوم کی ادائیگی کی اجازت دیتی ہے اور ساتھ ہی جو
زندگی کے رنگ و بو سے تھوڑی دیر کے لئے لطف اندوز ہونے کا موقع
بھی عطا کرتی ہے۔ اطالوی قوم کا فاشزم کو قبول کرلینا ایک فطری امر
تھا اس لئے کہ فاشزم کے تحت اُنھیں امن سکون حاصل ہوا اور
زندگی کے کچھ پائیدار اور غیر متقلب ہونے کا احساس ہوا۔ فاشزم نے
ہر فرد کے فرائض متعین کردئے اور اطالوی قوم کو ایک رنگین و حسین سمبولزم
(SYMBOLYSM) عطا کیا۔ مسولینی سے "ڈسپلن" فرض اور
ہم آہنگی کے جو نعرے پیش کئے تھے وہ اطالوی طرز حیات سے قطعی
مطابق تھے۔ ہر کام کو ڈرامائی انداز میں انجام دینا جو مسولینی کا پسندیدہ
طرز تھا اطالوی قوم کے لئے باعث مسرت تھا۔ فاشزم نے اطالوی قوم
سے قدیم تمدن اور طرز حیات کی تجدید کا وعدہ کیا تھا اور ساتھ ہی امن و
امان اور عظمت و جلال کا بھی۔ فاشسٹ نظام تعلیم کا مقصد ریاست
کے افراد میں روحانی اور داخلی اتحاد کو فروغ دینا تھا۔ ساتھ ہی اسکا
مقصد قومیت کے احساس اور شعور کو پختگی اور گہرائی عطا کرنا تھا اور
ان دونوں چیزوں کا مقصد یہ تھا کہ اطالوی قوم میں اپنے عظیم ماضی اور
شاندار مستقبل کا اور گہرا شعور پیدا ہو۔ فاشسٹ طرز تعلیم ایک قسم کے
نظام مدارج (HIERARCHY) پر قائم ہے جس کے تحت مختلف
قسم کے طالب علموں کو مختلف تعلیمی درجوں میں تربیت و تعلیم سے آراستہ
کیا جاتا ہے۔ یہ تمام تعلیمی ادارے ایک ہی نظام مدارج میں منسلک و
منضبط ہوتے ہیں۔ لیکن تعلیمی نظام میں جو یہ مختلف درجے اور سیڑھیاں
ہیں اور جنھیں ایک ہی مرکزی اقتدار کے تحت چلایا جاتا ہے اطالوی
قوم کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے [illegible] اطالوی قوم کا کردار پہلے
ہی سے رومن کیتھولک مذہب کے قائم کردہ [illegible] مدارج کا عادی ہے۔
[illegible] کے علاوہ [illegible] ہر فرد کے
[illegible]
پورا موقع [illegible] نئے تعلیمی تجربوں کی بھی بہت اہمیت [illegible]
ہے۔ کلچر کی نشوونما ہر قسم کے مرکزی اقتدار سے قطعی آزاد ہے اور اس
کا [illegible] اطالوی قوم کے افراد

فاشسٹ نظامِ تعلیم کو نہ صرف یہ کہہ کر زیادہ مفید اور کارآمد سمجھتے ہیں بلکہ فاشزم کے پہلے جو نظامِ تعلیم رائج تھا اس کے مقابلے میں اُسے اپنے قومی کردار سے زیادہ ہم آہنگ قرار دیتے ہیں۔

امریکیوں کے نزدیک زندگی گیا ہے گویا کسی کام میں سرمایہ لگانے کے برابر ہے جس میں نفع کی امید اگر ہے تو صرف اس شرط پر کہ فرد محنت و مشقت سے کام لے، خود آگے بڑھ کر ہر کام میں حصہ لے، اپنے اوپر بھروسہ کرے اور ساتھ ہی اس کے اندر نفع کی امید پر خطرات کے مول لینے کا جذبہ بھی ہو۔ اس نظریہ حیات نے امریکہ کے باشندوں میں ہمیشہ آگے بڑھنے کا ایک بے چین جذبہ اور ذوق پیدا کر دیا ہے۔ "آگے بڑھو" امریکی قوم کے تصورِ حیات اور زندگی کا پیدا کردہ ایک فطری نعرہ ہے۔ امریکی قوم کے افراد پُرانی روایات میں بندھے ہوئے جکڑے پڑے رہنا نہیں چاہتے وہ خود نئی روایات کی تخلیق کرنا چاہتے ہیں وہ مسائل کا فوری اور نیا بنایا حل تلاش کرتے ہیں۔ اُن کے موجودوں میں بے اندازہ رجائیت اور امید کا وجود پایا جاتا ہے۔ وہ سماجی برابری کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ ان تمام باتوں نے ملکر امریکیوں میں ایک بے مثال قومی کردار کی تعمیر کی ہے جس میں عہدِ طفلی کی اچھی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں اور طاقت جوش اور زندگی بھی۔ امریکی قوم کے افراد نے ہر کام میں کامیابی حاصل کرنا اور انسانی خدمت کو اپنا مقصدِ نصب العین قرار دیا ہے۔

امریکی باشندوں کے نظریۂ حیات کا تقاضا یہ ہے کہ انسان عملی نتائج کو پیشِ نظر رکھنے کی کوشش کرے۔ جس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم کو بھی اس کی عملی قدر و قیمت کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ امریکہ کے نظامِ تعلیم میں افراد کے لئے مواقع کی یکساں فراہمی کے اصول پر کافی زور دیا جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ تعلیم کے کردار کو تجارتی رنگ ڈھنگ دینے کی کوشش بھی کارفرما نظر آتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس سے افراد کے ذہن میں وسعت تو پیدا ہوتی ہے لیکن اس کے بجائے گہرائی نہیں پیدا ہوتی۔ لیکن امریکی نظامِ تعلیم سے امریکی باشندوں کے قومی کردار کے مطالبے اور حاجتیں ضرور پوری ہوتی ہیں یعنی افراد میں آگے بڑھ کر ہر بات میں پیش پیش رہنے اپنے اوپر بھروسہ کرنے، اور آئندہ منفعت کی امید میں مشکل کاموں

ہاتھ ڈالنے کی صلاحیتیں ضرور پیدا ہوتی ہیں۔ امریکہ کے نظامِ تعلیم کا اثر یہ ہے کہ افراد میں نئے نئے تجربہ کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے اُن کے اندر وہ انفرادیت اور سماجی تعلقات کے سلسلے میں وہ بے تکلفی اور دوستانہ پن پیدا کیا جاتا ہے جو امریکہ کے باشندوں کی نمایاں خصوصیت میں شامل ہے۔ چنانچہ اسی کے زیرِ اثر امریکہ کے باشندے یورپ والوں سے کئی باتوں کے لحاظ سے الگ الگ سے نظر آتے ہیں، مثلاً اُن کے سوچنے سمجھنے کا طرز اور انداز جداگانہ ہوتا ہے۔ وہ بعض ایسی چیزوں اور پہلوؤں پر زور دیتے ہیں جن پر یورپ والے زور نہیں دیتے اور اسی طرح امریکہ کے باشندے جن پہلوؤں پر زور دیتے ہیں انھیں یورپ والے غیر اہم سمجھتے ہیں، پھر امریکی باشندوں کا کاموں کے انجام دینے کا طرز اور طریقۂ کار بھی یورپ والوں سے کچھ مختلف ہوتا ہے۔ جس طرح امریکہ کے باشندوں کا نصب العین "آگے بڑھو" کے الفاظ سے ظاہر ہوتا اُسی طرح امریکہ کا نظامِ تعلیم بھی طلباء میں اُن کے فطری دین کا لحاظ کرتے ہوئے جسمانی، دماغی اور اخلاقی اعتبار سے اُس نصب العین کے مطابق چلنے کی طاقت اور صلاحیت پیدا کرتا ہے۔

روسیوں کے لئے زندگی ایک ایسے جوا کی حیثیت رکھتی ہے جس میں اُنھیں بڑے بڑے نقصانات کے مقابلے میں تھوڑے بہت فائدے ہوتے رہے ہیں۔ مذہبی جبر و قہر اور حکومت کے ظلم و جبر نے روسی اقوام کے افراد کو دنیا بھر کے توہمات کا شکار بنا دیا ہے۔ اور انھیں بے حس بھی کر دیا ہے۔ اُن کے ارادوں اور اُمنگوں کو کبھی پھولنے پھلنے کا موقع نہ ملا اور نہ ان کی دماغی صلاحیتوں کو کبھی تہذیب و تربیت نصیب ہوئی۔ اُن کا جمالیاتی ذوق مذہبی رموز اور رسوم و عبادات یا کچھ تہواروں میں تسکین تلاش کرنے پر مجبور رہا ہے۔ چنانچہ انقلاب اور کمیونسٹ ریاست کے قیام کے بعد سے سوویت نظامِ تعلیم کے سامنے یہ مسئلہ درپیش رہا ہے کہ کس طرح ایک بالکل نئے ٹائپ کا روسی باشندہ وجود میں لایا جائے تاکہ سماج کا کردار ایک نیا ڈھنگ اختیار کرے۔

بقول البرٹ پنکویچ

"سوویت روس میں عام تربیت اور جسمانی پرورش کا مقصد یہ ہے کہ ایک ایسے انسان کی تخلیق کی جائے جس کی شخصیت کی ہر سمت میں ترقی ہوئی ہو۔ جو ہر لحاظ سے صحت مند، توانا، منضبط

نڈر اور بہادر ہو، جس میں آزاد خیالی اور آزاد عمل کی صفتیں موجود ہوں جو رائج کلچر کے بہت سارے پہلوؤں سے واقفیت رکھتا ہو۔ جو مزدور طبقہ کے مفادات کے تحفظ کی خاطر زندہ ہو اور اس کے لئے جنگ آزما ہونے کا عزم اور ارادہ رکھتا ہو۔ اور مزدور طبقہ کا سپاہی ہونے کی حیثیت سے دراصل پوری انسانیت کے مفادات اور فلاح و بہبود کا حامی ہو"

اس طرح سویت نظام نے جس تعلیمی آدرش کو عملی صورت دینے کی کوشش کی ہے وہ یہ ہے کہ "تعلیم زندگی ہے اور زندگی تعلیم" سویت نظام تعلیم سویت ریاست کے معمار پیدا کرتا ہے۔ یہ معمار ایسے ہوتے ہیں جن کی شخصیت جامع اور مکمل ہوتی ہے۔ جن کے معلومات وسیع ہوتے ہیں جن کے اندر تربیت کا مادہ ہوتا ہے جو جسمانی لحاظ سے تندرست اور توانا ہوتے ہیں جن کا دماغ چوکنا اور پھرتیلا ہوتا ہے۔ جن کے دماغ اجتماعی زندگی گزارنے کے نصب العین اور آدرشوں سے معمور ہوتے ہیں۔ اور جن کے دلوں میں زندہ رہنے کی مسرتیں جوش اور اُمنگ پیدا کرتی ہیں۔ کمیونسٹ نظام کے تحت سائنس نے مذہبی توہمات کی جگہ لے لی ہے اور وہ لوگ جو زندگی کو پُر الم اور بدبختوں کا گہوارہ سمجھتے تھے آج اُن کے دل زندگی کے جوش و خروش اور امنگوں اور آرزوں سے معمور ہیں۔ سویت نظام میں زندگی کے معنی ہیں لامعلوم، مشکل اور خطرناک دنیاؤں میں امید، رجائیت اور کامیابی کے یقین کے ساتھ ایک چھلانگ مارنا۔ اور سویت روس کے باشندے ایسا انفرادی طور پر نہیں کرتے بلکہ اجتماعی طور پر۔

برطانیہ ہو یا فرانس، اٹلی ہو یا جرمنی، امریکہ ہو یا سودیت روس ہر جگہ تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ سماج کے اُن پائدار اور انفرادی اقدار و خصوصیات کی حفاظت کی جائے جو اُسے ورثے میں ملی ہیں، سماج کی نقصان رساں خصوصیات کو بدلنے کی کوشش کی جائے اور سماج کے مخصوص قومی کردار کو برقرار رکھنے کا انتظام کیا جائے۔ اس طرح گویا ہر تعلیمی نظام انسان کو انسان بنانے کی کوشش کرتا ہے نہ کہ اُسے طوطا بننے پر مجبور کرتا ہے اس طرح گویا ہر ملک کے تعلیمی اداروں کے پیش نظر یہ مقصد ہوتا ہے کہ اپنے افراد کو دوسروں کا نقال نہ بنایا

جائے بلکہ اس کے اندر خود اپنی قومی خصوصیات کی بہترین نمائندگی کی صلاحیتیں پیدا کی جائیں۔ اور فرد کے کیرکٹر وطنی صفتوں سے بے تعلق اور بے ربط نہ کیا جائے۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ قومی کیرکٹر کو ترقی دینے اور اس کی حفاظت کرنے کا مقصد نسلی نفرت اور غیریت کو تقویت دینا ہے میرا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ہندوستان کا تعلیمی نظام جاپانیوں کی طرح اپنی قوم کے علاوہ ساری دنیا کی قوموں سے نفرت کرنا سکھائے یا نازی جرمنی کی عبرانیت دشمنی کی طرح نسلی منافرت اور تعصب کی بنیادوں پر اس کی تعمیر کی جائے یا جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا کی طرح نظام تعلیم کے ذریعہ رنگ کے تعصب کو فروغ دیا جائے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جغرافیائی حالات، سماجی تاریخ، پیداوار اور اکسچینج کے ذرائع اور آلات کی ترقی ہر قوم کی زندگی اور اس کے عادات و افکار پر اثر ڈالتے ہیں اور موخر الذکر اس مخصوص قوم کے کردار اور اس کے تہذیبی اقدار کی تعمیر کرتے ہیں۔ چنانچہ نظام تعلیم کا فرض ہے کہ اس قومی کردار اور سماجی اقدار کو نشو و نما اور فروغ دینے کی کوشش کرے نہ کہ اُسے دبانے اور کچلنے کی۔ یہی وجہ ہے کہ غیر ملکی نظام تعلیم کا زبردستی کسی قوم پر مسلط کردینا اس کے لئے ناقابل تلافی نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ ہندوستان کا قومی کردار کافی ترقی یافتہ واقع ہوا ہے لازمی طور پر غیر ملکی نظام تعلیم یہاں کبھی اس سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا اور اسکی ناکامیابی یقینی ہے۔ ذرا سوچئے کہ فرانسیسی نظام تعلیم کو اگر انگلستان پر مسلط کردیا جائے یا جرمن نظام تعلیم کو فرانس پر تو کتنے تباہ کن نتائج برآمد ہوں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ان ملکوں کے لوگ طوطا بن جائیں گے۔ مان لیا کہ انھیں فائر کرنا ضرور آجائے گا لیکن سرکس میں بھی تو جانوروں کو فائر کرنا ضرور سکھلایا جاتا ہے۔ انھیں غیر ملکی زبان میں کمال صفائی اور روانی کے ساتھ بولنا آجائے گا لیکن چالاک طوطے یہی کر لیتے ہیں صرف ایک ایسا قومی نظام تعلیم جو ماضی کے اور حال کی ضرورتوں سے ہم آہنگ ہو اور مستقبل کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے آہستہ آہستہ وجود میں لایا گیا ہو۔ ہمیں نقال ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔ ورنہ ہم خارجی باتوں کے اعتبار سے تو انگریزوں کے نقال بن جائیں گے اور داخلی اعتبار سے ہم انگریزوں کی ان علمی خصوصیات سے عاری رہیں گے جو اُن کی قومی کردار کی تعمیر کرتی ہیں۔ صرف اسی قسم کے نظام تعلیم کے تحت وہ بغاوت جو مایوسی اور پستی کے احساس کی وجہ سے ہمارے دلوں میں کارفرما ہے تخلیقی سی وکل میں بدل سکتی ہے۔ جس کے بعض پہلو چاہے انقلابی ہی کیوں نہ ہوں پھر بھی وہ تخلیقی ہوں گے۔

سویت روس میں عربی تہذیب اور زبان کا فروغ

از — کلیم اللہ

سویٹ یونین میں عربی زبان اور تہذیب کی تحقیقات اور ترقی پر خاص توجہ کی جاتی ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ سویت یونین میں دنیا کے تمام ملکوں کی زبان اور تہذیب سے دلچسپی لی جاتی ہے - بلکہ قازقستان ازبکستان اور قفقاز وغیرہ کے اسلامی ممالک کی تہذ اور زبان کی بنیاد عربی تہذیب اور زبان پر ہے بخارا تاجکستان اور ازبکستان میں ایسے لوگ بکثرت ملتے ہیں جن کے آبا و اجداد تیمور کے زمانے میں عرب سے آکر بس گئے تھے قفقاز کیسپین کے علاقوں میں ایسے کئی لوگ ملتے ہیں جن کی مادری زبان اب تک قدیم عربی ہے - داغستان میں کافی لوگ نہ صرف مقامی زبان کے علاوہ اس قدیم عربی میں بات چیت کرتے ہیں بلکہ شعر و شاعری بھی کرتے ہیں - اس کے لئے نہ صرف لینن گراڈ میں مشرقی علوم کے انسٹی ٹیوٹ میں عربی شعبہ کو خاص اہمیت حاصل ہے بلکہ ملک میں ایک عربی دانوں کی انجمن بھی قائم ہے جس کے رکن تمام قوموں کے علماء اور محققین ہیں - اس انجمن کی سرگرمی میں سویت کے مشرقی علاقوں اور قفقاز میں قدیم عربی تہذیب کی بے شمار یادگاریں تلاش کر کے نکال لی گئی ہیں -

عربی دانوں کی ان انجمنوں کی کوشش سے جو تحقیقاتی کام انجام پایا ہے اور روس کا جو عربی زبان کا لٹریچر جمع کیا گیا ہے اس سے سویت روس اور خاص طور سے مشرقی علاقوں کی تاریخ کی ترتیب میں بڑی مدد مل رہی ہے - ماسکو کی تاریخی عجائب گھر کی جانب سے عربی کی تمام پرانی اور نئی کتابوں کو شائع کیا گیا۔

شامل (۱۷۹۸-۱۸۷۱) جو قفقاز پہلا انقلابی شاعر تھا اور جس نے زار شاہی کے خلاف سب سے پہلے علم بغاوت بلند کیا تھا، عربی زبان ہی میں لکھتا تھا - اس کی تحریریں نہ صرف خاص اہتمام سے شائع کی گئی ہیں بلکہ ان کے ترجمے بھی روسی اور دوسری زبانوں میں ہوئے ہیں شامل کی تصنیفات سے اس زمانے کی سیاسی اور سماجی زندگی پر کافی روشنی پڑتی ہے -

وسطی ایشیا میں رہنے والے عربوں کی زبان کے بارے میں بہت بڑے پیمانے پر تحقیقاتی کام انجام دیا جا رہا ہے یہ زبان مقامی بول چال کی زبان اور عربی زبان سے مل کر بنی ہے -

عربی زبان پر جو کام ہو رہا ہے اس سے بہت ہی دلچسپ باتوں کا پتہ چل رہا ہے مثلاً یہ معلوم ہوا ہے کہ کتنے زمانے سے روسیوں اور عربوں میں تہذیبی تعلقات قائم ہیں عرب زبان میں پشکن اور شیفنکو مسکی وغیرہ کے قدیم ترجمے ملتے ہیں - مشہور روسی شاعر لرمان تاف پر عربی ادب کا خاصا اثر پڑا تھا - حال ہی میں ایک کتاب "گورکی اور عربی ادب" کے نام سے کئی جلدوں میں شائع ہوئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ آجکل کے عربی ادب پر مشہور روسی ادیب گورکی کا کیا اثر پڑا ہے اور خود گورکی پر عربی ادب اور تہذیب نے کیا اثر ڈالا ہے -

جنگ کے باوجود تحقیقاتی کام جاری ہے، عربی زبان کا ایک بہت بڑا لغت روسی اور دوسری زبانوں میں تیار ہو رہا ہے - اس کے علاوہ عربی زبان کی تاریخ اور عربی کلچر پر بھی بڑے پیمانہ پر تحقیقاتی کام کیا جا رہا ہے اس سلسلے میں نہ صرف قدیم تہذیب اور ادب کا مطالعہ کیا جاتا ہے بلکہ جدید ادب اور تہذیب پر بھی توجہ کی جاتی ہے اور ان تحقیقاتوں کے نتائج ملک کی تقریباً تمام زبانوں میں شائع کئے جاتے ہیں جنگ کے دوران ہی میں لینن گراڈ سے سیمینوف کی لکھی ہوئی ایک بہت بڑی اور مشہور کتاب "جدید عربی ادبی زبان کی نچوڑ" شائع ہوئی جس کا شہرہ ساری دنیا کے عربی دانوں میں ہو رہا ہے -

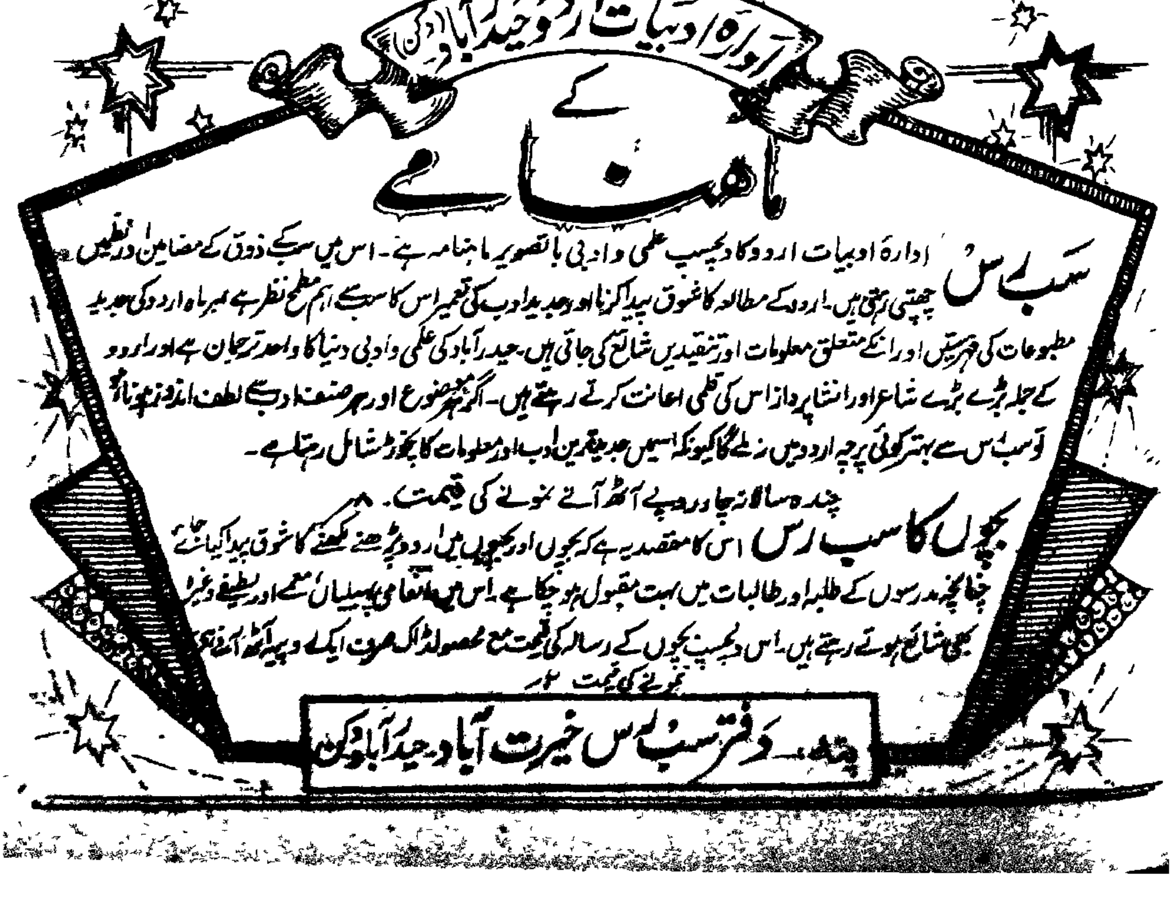
سویت یونین میں "دنیا کی تاریخ" "سویت روس کی تاریخ" اور "دنیا کی تہذیبی تاریخ" پر جو کام ہو رہا ہے عربی دانوں کی انجمن بھی اس کا

ایک حصہ مرتب کر رہی ہے۔

مشرقی روس میں عربی کلچر اور زبان پر تحقیقاتی کام کے علاوہ قدیم اور جدید عربی کتابوں کا بھی بڑے پیمانہ پر روسی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ صرف پروفیسر کراچکوفسکی نے تقریباً دو سو کتابوں کے ترجمے کئے ہیں اور تقریباً دو سو کتابیں مشہور عربی ادیبوں اور شاعروں پر لکھی ہیں اس علمی خدمت کے صلے میں انھیں حال ہی میں حکومت کی جانب سے "لینن انعام" ملا ہے۔

ان اداروں میں تحقیقاتی کام کے لئے بڑے بڑے کتب خانے قائم ہیں جن میں بے شمار مطبوعہ اور غیر مطبوعہ قدیم اور جدید تصنیفات جمع کر دی گئی ہیں۔ اُزبک اکاڈمی آف سائنس کے مشرقی علوم کے کتب خانے میں تقریباً ۷۰ ہزار کتابیں جمع کی گئی ہیں۔ یہ کتب خانہ مشرقی علوم کا دنیا کا سب سے بڑا کتب خانہ ہے اس کتب خانے میں ۸۰۰ھ سے لے کر آج تک کی مطبوعہ اور قلمی کتابیں موجود ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ فارسی کی، اس کے بعد عربی اور اس کے بعد ترکی زبان کی کتابیں ہیں۔ اس کتب خانے سے نہ صرف محققین فائدہ اٹھاتے ہیں بلکہ ایک عملہ متعین ہے جو ان کتابوں کے متعلق ہر قسم کا مواد مختلف اداروں کو بہم پہنچاتا ہے۔ مثلاً اکثر ڈاکٹر وغیرہ معلوم کیا کرتے ہیں کہ مختلف بیماریوں کے علاج کے قدیم عربی طریقے کیا تھے۔ تھیٹر کے لوگ آتے ہیں جو لباس اور رسم و رواج وغیرہ کے لئے مواد لے جاتے ہیں۔

ازبکستان کے علاوہ عربی زبان اور اسلامی علوم سے متعلق تحقیقاتی ادارے اور کتب خانے دوسری جمہوریتوں میں بھی قائم ہیں خود لینن گراڈ میں عربی زبان اور اسلامی کلچر پر بہت بڑے پیمانے پر کام کیا جا رہا ہے اور وہاں کے کارکیا کتب خانے میں بھی مشرقی علوم کی قدیم اور جدید کتابوں کا بہت بڑا اور نادر ذخیرہ ہے۔



نئے نظام عالم کیلئے کن کن چیزوں کی ضرورت ہے

از مسٹر او پی بھٹناگر لکچرار شعبہ تاریخ الہ آباد یونیورسٹی

جنگ ختم ہو رہی ہے اور ایک نئے نظام عالم کا مسئلہ زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور اہم صورت اختیار کرتا جا رہا ہے یہ بالکل فطری ہے کہ آج جنگ کے پیدا کردہ مسائب اور تکالیف کے سبب ہر فرد ایک نئے نظام عالم کی ضرورت محسوس کر رہا ہے۔ ایک عام آدمی کا مطمح نظر یہ ہے کہ جنگ کے بعد روزگار میں اور خوشحالی نصیب ہو۔ چنانچہ ہر ملک کے رہنما اپنے اپنے عوام سے اسی چیز کا وعدہ کر رہے ہیں اور اس مقصد کے حصول کیلئے پلان پر پلان پیش کر رہے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایک ایسے نظام عالم کی تخلیق اور قیام کیلئے جس میں امن و امان اور خوشحالی کا دور دورہ ہو محض منصوبہ بندی سے کام نہیں چلتا۔ سب سے پہلے چند بنیادی باتوں کی وضاحت شدید طور پر ضروری ہے۔ سب سے پہلے تو ہمیں ماضی کی ان غلطیوں کا ازالہ کرنا ہے جس کی وجہ سے موجودہ تباہی و بربادی وجود میں آئی۔ تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ارتقائے تمدن کے مختلف ادوار میں انسانی تعلقات میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی رہی ہیں اور اس قسم کی جنگ وجود میں آتی رہی ہیں جنکی وجہ سے انسان کی زندگی اور مادی خیر و فلاح خطرے میں پڑ گئی ہے چنانچہ ایک نئے نظام عالم کی از سر نو تعمیر کیلئے تجربوں کی روشنی میں ماضی کا گہرا اور غیر جانبدارانہ مطالعہ قطعی ضروری ہے۔ کسی خاص فرد یا کسی خاص قوم کے سر پر الزام تھوپ کر علیحدہ ہو جانے سے کام نہیں چلتا بنیادی باتوں کا حل تلاش کئے بغیر ان غلطیوں کو قلع قمع کرنا غیر ممکن ہے جن کی وجہ سے موجودہ مصیبت نازل ہوئی اور یہ ظاہر ہے کہ اگر آئندہ یہ غلطیاں ہوتی رہیں تو ہمیں بہت جلد ایک اور جنگ کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ہمارا آدرش یا نصب العین یہ ہے کہ ہر فرد اور ہر جماعت کو اس بات کی پوری آزادی حاصل ہو کہ وہ جو جی میں آئے کرے۔ بشرطیکہ اس سے انسانیت کے مشترکہ "احساس مسرت" میں اضافہ ہوتا ہو۔ لیکن آدرش کے حصول کی راہ میں ایک ایسا سیاسی اور اقتصادی نظام سنگ گراں بن کر حائل ہے جو کسی مخصوص زمانے ہی کے لئے موزوں تھا اور جس سے بجز نقصان کے اور کسی فائدہ کی امید نہیں کیجا سکتی۔ اس نظام کے مضبوط پنجے فرد اور جماعت کے خیال و عمل پر اس بری طرح حاوی ہیں کہ نجات پانا مشکل ہے۔ اس کے علاوہ بھی انسانی تعلقات کے کچھ ایسے اہم عناصر ہیں جن سے فرد اور ملک کی زندگی میں پیچیدگیاں اور مناقشے رونما ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً نسلی تعصب اور منافرت، زبان کا اختلاف، تہذیبی افتراق، مذہب اور جنسی تعلقات۔

انسان آپس میں ہمیشہ لڑتا تو رہا ہے لیکن عین دوران جنگ میں بھی امن و دوستی کی خواہش اس کو بیچین کرتی رہتی ہے لیکن ابتک اس امن و دوستی کو بروئے کار لانے اور فسادات اور مناقشوں کو ختم کرنے کیلئے جتنی ترکیبیں کی گئیں وہ سب ناکام رہیں۔ اس لئے کہ ان بنیادی عناصر پر اچھی طرح غور و خوض نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ایک نئے نظام عالم کی تخلیق کیلئے ان بنیادی مسائل کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے ورنہ نہ تو ہر فرد کو خوش حال بنانے کا آدرش پورا ہو سکتا ہے اور نہ پچھلی غلطیوں کا ازالہ ہی ہو سکتا ہے۔

سب سے تو پہلے ایک ایسے عالمگیر وفاق کی ضرورت ہے جس کے تحت ہر ملک اور ہر قوم کو مکمل آزادی نصیب ہو اور جو ہر ملک اور ہر قوم کی آزادی کے تحفظ کا ذمہ دار ہو۔ کچھ ملکوں کا محکوم رہنا ہی وہ چیز ہے جو کہ ان قوموں کے درمیان رشک و حسد اور منافرت کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ جو آگے چل کر جنگ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ عالمگیر وفاق کے ذمہ یہ کام ہو کہ ہر ملک کی آزادی کی حفاظت کرے چاہے وہ ملک منطقہ حارہ میں ہو منطقہ بارده میں۔ اور پھر ملک کے اندر ہر فرد کو کسی قسم کی آزادی نصیب ہو۔ اسکا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ وہ فرد یا وہ ملک ایسا طرز عمل نہ اختیار کرے جس سے دوسرے افراد اور دوسرے ممالک کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ سیاسی مدبرین کا اصلی کام اس قسم کے نظام حکومت کو وجود میں لانا ہے۔ اسی سے ملحق دنیا کے آئندہ اقتصادی نظام کا

کا مسئلہ ہے ۔ ظاہر ہے کہ دنیا کی از سرِ نو تنظیم اس وقت تک ہوائی بات رہے گی ۔ جب تک سیاسی آزادی کے ساتھ ساتھ معاشی آزادی بھی نہ قائم ہو جائے ۔ صنعتی انقلاب کے بعد سے انسان کی معاشی تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کی اقتصادی زندگی کی بنیادیں اب مشین پر قائم ہیں ۔ مستقبل کی معاشی کی زندگی کی تعمیر میں ان کو مزید اور مزید مشینوں کی ضرورت ہوگی ۔ مستقبل کی سوسائٹی کی تعمیر میں اس بات کا خیال رکھنا ہے کہ ہر قسم کا استحصال اور معاشی لوٹ کھسوٹ بالکل نیست و نابود ہو جائے ایسی تجارتی اور صنعتی مقابلہ بازی سے جس پر ریاست کا کچھ بھی کنٹرول نہ ہو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دولت چند مخصوص افراد یا جماعتوں کے ہاتھ میں جمع ہو جاتی ہے ۔ اس قسم کی مقابلہ بازی ایک ملک سے دوسرے ملک میں پھیل کر غیر قوموں کی غلامی اور محکومی پر مبنی ہوتی ہے ۔ صنعتی اعتبار سے کسی اعلیٰ ترقی یافتہ ملک میں اگر ایسی بڑی بڑی صنعتوں اور کارخانوں کا وجود ہے جن میں انتہائی تیز رفتاری کیساتھ مال پیدا ہوتا ہے تو اس سے صرف دو ہی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں ، یا تو خود اسی ملک کے بازاروں میں فاضل مال بھر جائیگا جن کی کھپت ناممکن ہوگی یا ایسے غیر ملکی بازاروں کی ضرورت ہوگی ۔ جہاں یہ مال کھپت کے لئے بھیجا جا سکے اور جہاں سے اس کے بدلے کچا مال حاصل کیا جا سکے ۔ عہد قدیم کے دلال سے لیکر موجودہ عہد کے اعلیٰ صنعتی نظام تک کی جو معاشی تاریخ ہے اس کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ کس طرح اس بے ہنگم اور غیر منظم اقتصادی نظام نے نشو و نما حاصل کیا ہے اور اس کے نتائج کیسے ہولناک ثابت ہوئے ہیں ۔ چنانچہ نئے نظام عالم میں ہر ملک میں اقتصادی آزادی کا مطلب یہ ہونا چاہئے کہ ملک کے تمام مادی ذرائع اور ان کی پیداوار پر ریاست کا کنٹرول قائم رہے ۔ اور ہر قسم کے استحصال اور لوٹ کھسوٹ اور نفع خوری کو نیست و نابود کر دیا جائے ۔ ریاست ہر فرد کی معاشی ضرورتوں کی کفیل بن جائے ۔ پھر بین الاقوامی نظام میں معاشی لحاظ سے پچھڑے ہوئے ملکوں اور ترقی یافتہ ملکوں کا سوال پیدا ہوگا ۔ یہاں پر عالمگیر وفاقی مجلس منتظمہ کا فرض ہوگا کہ پچھڑے ہوئے ملکوں کو ترقی یافتہ ملکوں کی معاشی گرفت سے چھٹکارہ دلائے اور دنیا کے تمام ملکوں کے درمیان معاشی تعاون اور انحصار کو وجود میں لانے کی کوشش کرے ۔ اس سے پیدا ہونیوالی دقتوں اور مشکلات کو اعلیٰ طور پر منظم ایکسچینج کے ذریعہ دور کیا جا سکتا ہے

سیاسی اقتصادی تنظیم کے علاوہ ہمارے سامنے نسل، زبان، مذہب اور جنسی تعلقات سے متعلق مسائل بھی درپیش ہوں گے ۔ سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے ترقی یافتہ ممالک کے علماء اور مفکرین کا فرض ہوگا کہ وہ لوگوں میں ان مسائل سے متعلق صحیح سمجھ بوجھ پیدا کریں ۔ سیاسی اور معاشی آزادی کے اندر ذہنی آزادی بھی شامل ہے ۔ چنانچہ ہر ملک میں تمام نسلی خصوصیات اور ہر زبان اور ہر تہذیب کو نشو و نما حاصل کرنے کا پورا پورا موقع عطا کیا جانا چاہئے ۔ جب معاشی استحصال کا خاتمہ ہو جائیگا تو ان مسائل پر آج جو جھگڑے پائے جاتے ہیں وہ بھی ابدی طور پر ختم ہو جائیں گے ۔

مذہب کا مسئلہ دنیا کے سب سے الجھے ہوئے مسائل میں شمار کیا جاتا ہے لیکن اگر گہرا تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ مذہبی اختلافات کی سیاسی اور معاشی بنیادوں کو اگر ختم کر دیا جائے تو یہ مسئلہ اس قدر مشکل نہیں رہ جاتا بلکہ مذہب ہماری اقتصادی اور سیاسی زندگی میں مداخلت کرنا ترک کر دے تو پھر مذہب کچھ دلچسپی کی چیز نہیں رہ جاتا ۔ مذہب کے زیر بحث ایسے مسائل ہوتے ہیں ۔ جن کو خارجی طور پر صحیح یا غلط نہیں ثابت کیا جا سکتا ۔ ان مسائل کا تعلق خالصتاً انسان کی داخلی زندگی سے ہے ۔ جب سوسائٹی میں معاشی استحصال ختم ہو جائیگا اور اس کی بنیاد اساس اخلاقی اصول پر قائم ہوگی تو مذہب صرف محققین اور عالموں کے بحث مباحثہ کی چیز ہو کر رہ جائیگا اور ہماری عملی زندگی سے اس کے خطرناک رشتے منقطع ہو جائیں گے ۔ صدیوں سے مفکرین اپنے سعی و عمل میں مصروف ہیں لیکن آج تک وہ انسانی روح کے سربستہ رازوں کا انکشاف نہ کر سکے ۔ ایک جماعت مذہب کے فائدوں پر زور دیتی ہوئی اسے تعصب اور عقائد سے تعبیر کرتی ہے تو دوسری جماعت اسی کے رد عمل میں مذہب کو بیکار اور لاحاصل چیز سمجھ کر انتہائی متعصبانہ طرز اختیار کر لیتی ہے ۔ لیکن صحیح بات تو یہ ہے کہ چونکہ انسانی روح کے رازوں کا آج تک انکشاف نہ ہو سکا ۔ اس لئے مذہب کا مسئلہ کوئی طے شدہ مسئلہ نہیں ہے ۔ بلکہ اس میں مزید تحقیق و تلاش کی لامتناہی گنجائش ہے ۔ اگر مذہب کا مسئلہ نہیں محققین اور عالموں پر چھوڑ دیا جائے تو زیادہ بہتر ہے ۔ مذہب اگر تلاش

حقیقت" کا دوسرا نام ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا برقرار رہنا ایک فطری امر ہوگا۔ اس نوع کی تلاش حقیقت اگر اپنے حدود سے باہر جانیکی حماقت میں نہ مبتلا ہو تو انسانی ترقی کیلئے بالکل خطرناک نہیں ہے اور جب یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب گویا وہ تلاش حقیقت ہی کے مختلف راستے ہیں تو پھر یہ [illegible] جھگڑے کیسے؟

نئے نظام عالم کے سلسلے میں جنسی تعلقات کا مسئلہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے اس لئے اس کی وجہ بھی افراد اور جماعتوں میں جھگڑے اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جنسی تعلقات کے سلسلے میں غلط طرز عمل اختیار کرنے کی وجہ سے ہی انسانی سوسائٹی پر قسم قسم کے مصائب نازل ہوتے رہے ہیں [illegible] کی جلد میں محبت کو ایک اعلیٰ ترین [illegible] ثابت ہونے کی کوشش میں [illegible] کر دی گئی ہیں۔ اس [illegible] شک نہیں کہ سوسائٹی میں تعلقات اور محبت کی اہمیت [illegible] کافی زور دیا جا چکا ہے لیکن ابتک لوگوں کی سمجھ میں یہ نہیں آیا ہے کہ انسان کے جنسی جذبے [illegible] ماحول اور حالات کا کیا اثر پڑتا ہے۔ [illegible] سیاسی اور معاشی حالات کے [illegible] کے رسوم و [illegible] کے نظام میں [illegible] ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے جنسی تعلقات پر [illegible] کا [illegible] اثر پڑتا ہے۔ آئندہ نظام [illegible] جنسی تعلقات کے سلسلہ میں [illegible] اور عورتوں کو آزادی [illegible] قطعی ضروری ہوگا۔

موجودہ پابندیوں اور جکڑ بندیوں کے رہتے ہوئے مردوں اور عورتوں کے درمیان صحت مند جنسی تعلقات نہیں قائم کئے جا سکتے اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ [illegible] ہے جس کی تعریف ہم شاعروں اور افسانہ نگاروں [illegible] سے سنتے ہی آئے ہیں لیکن اصل سوال تو [illegible] کو عملی شکل کیسے دی جائے۔ ظاہر ہے کہ [illegible] ہی سوسائٹی میں اس آدرش کا حصول ممکن ہے جس میں افراد کا ذہن صحت مند اور توانا ماحول میں پلا اور بڑھا۔ اور جہاں ذہنی اور نفسیاتی امراض کو قطعیت [illegible] کر دیا گیا ہو۔

حقیقی ترقی کا دارومدار ایک ایسے تعلیمی نظام پر ہے جس کا مقصد صحیح دماغی رجحانات کی تخلیق اور نشو و نما کرنا ہو۔ موجودہ سماجی حالات میں ہماری داخلی زندگی کی تربیت و تہذیب میں تعلیم بالکل مدد نہیں کرتی۔ آخر وہ تعلیم انسانی مسرت میں کیوں کر اضافہ کر سکتی ہے جس کا ہمارے داخلی طرز عمل اور ہمارے کردار کے سنوارنے میں کوئی حصہ نہ ہو؟ انسانی تاریخ شاہد ہے کہ اتنی مدت سے تعلیم کے پیش نظر اتنے اعلیٰ مقاصد رکھے گئے ہیں لیکن ابتک ان میں ایک بھی پورے طور پر نہیں حاصل کیا جا سکا۔ علم و تعلیم کے باوجود آج بھی 'غیر رواداری' بیرحمی' بے ایمانی' اور خیانتوں کا اسی طرح راج قائم ہے جس طرح پہلے تھا۔ صرف ایک ایسا نظام تعلیم جو نئے حالات اور نئے ماحول کے مطابق ہو۔ جن کا اصول انفرادی اور جماعتی رواداری کو فروغ دینا ہو۔

انسانی فطرت کے تمام اعلیٰ اور حسین عناصر کی نشو و نما کر سکتا ہے اور ان کو اجاگر کر سکتا ہے۔

دنیا تشدد سے عاجز آچکی ہے اور ہر شخص کے دل میں امن اور عدم تشدد کی تمنا ہے۔ چنانچہ نئے نظام عالم کی بنیاد بھی مکمل عدم تشدد کے اصول پر قائم ہونی چاہئے یہ مسئلہ ہمارے سامنے مقصد اور ذریعہ کا سوال پیش کرتا ہے عدم تشدد انسان کو "مقصد بعید" حیثیت سے تسلیم کرنا ضروری ہے لیکن ہمارا ذریعہ بھی عدم تشدد ہی ہونا چاہئے تشدد کے ذریعہ عدم تشدد کبھی نہیں حاصل کیا جا سکتا دنیا کے وہ مدبرین جو آج جمہوریت اور آزادی کی جنگ کی رہنمائی کر رہے ہیں اگر ان بنیادی مقاصد کو پیش نظر رکھیں تو انکی کوششوں سے جنگ کے ختم ہونے کے بعد مصیبت زدہ انسانیت کیلئے مسرت کا حصول ممکن ہے تبھی ان کا یہ دعویٰ پورا ہو سکتا ہے کہ وہ ہر فرد کی آزادی کیلئے جنگ آزما اور کوشاں ہے۔ اور تبھی موجودہ ہولناکیوں کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم کیا جا سکتا ہے۔ جب تک بنیادی حقائق و واقعات کی طرف توجہ نہ کیجئے گی اس وقت تک چاہے کتنے ہی تفصیلی پروگرام اور پلان تعمیر کئے جائیں اور انھیں کتنے ہی خوشنما الفاظ میں پیش کیا جائے لیکن اس قسم کا نظام عالم کا قیام پھر بھی غیر ممکن ہوگا۔ ایک عام انسان چاہتا ہے اور جس کا وہ بیچینی سے انتظار کر رہا ہے اسلئے کہ اس قسم کے نظام کیلئے ہر ملک کے ہر فرد کے بے غرض اور بے لوث عمل کی ضرورت ہوگی۔

اگر ہم نے ماضی کے تجربوں سے فائدہ اٹھایا تو مستقبل میں انسانی مسرت کا حصول اور اسکا تحفظ ممکن ہے اور اگر پچھلی غلطیوں کو پھر دہرایا گیا تو پھر انسانی مستقبل کا اللہ ہی مالک ہے۔

صوبۂ سرحد کی سیاسی صورتِ حال

از : سید سجاد ظہیر

۲۱ر، ۲۲ اور ۲۳ر اپریل کو پشاور میں جو سیاسی کانفرنس منعقد ہوئی تھی وہ صوبۂ سرحد کے پٹھانوں، سکھوں اور ہندوؤں کے اتحاد کا سب سے بڑا مظاہرہ تھا۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ سنہ ۱۹۲۱ء کے بعد کانگریس میں اتنا بڑا کوئی مظاہرہ نہیں ہوا۔ کانگریسی وزارت کے قیام نے آزادی پسند سرحدیوں کے حوصلے بڑھا دیے ہیں اور سارے ملک کی نگاہیں ان کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ چالیس ہزار آدمیوں نے کانفرنس میں شرکت کی، مشہور کانگریسی لیڈر مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی اور ڈاکٹر محمود نے تقریریں کیں، تجویزوں میں کانگریسی لیڈروں کی رہائی اور مرکز میں ذمہ دار قومی حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا گیا۔ وزیرستان کے قبائل پر انگریزی بمباری کی مذمت کی گئی۔ کانگریسی حکومت کے قیام اور پشاور کانفرنس کے بعد صوبۂ سرحد کی سیاسی زندگی نے ایک کروٹ لی ہے۔ اس نے سارے ملک کو نئی راہ دکھائی ہے۔

کانگریسی رہنماؤں کے اعتراضات

لیکن کانگریسی لیڈروں نے اپنی تقریروں میں بعض ایسی نامناسب بات کہیں جن سے لیگی حلقے مشتعل ہوگئے ہیں اور لیگ کے اردو اخبار کانگریس کے خلاف طرح طرح کی باتیں لکھ رہے ہیں۔ سرحدی کانگریس کے صدر خان علی گل خاں نے اپنی تقریر میں لیگ پر حملہ کیا اور کہا کہ لیگی وزارت برطانوی سامراج کی کٹھ پتلی تھی۔ انھوں نے بڑے تلخ طنز کے ساتھ کہا کہ میں بھی پاکستان کے حق میں ہوں لیکن میرا پاکستان کا تصور لیگ کے تصور سے مختلف ہے۔ میرے نزدیک پاکستان کا مطلب ہے بیرونی اقتدار سے مکمل آزادی۔ کانفرنس کے صدر ڈاکٹر سید محمود نے تو یہ کہا کہ یہ کانفرنس لیگی وزارت کے زوال پر خوشی منانے کے لئے منعقد نہیں کی گئی ہے۔ لیکن انھوں نے سادہ لوحی سے مسٹر جناح، ڈاکٹر ساورکر اور ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کو یہ کہہ کر کانگریس میں شریک ہونے کی دعوت دی کہ یہی تنہا ملک کی قومی جماعت ہے۔ گاندھی جی کی رہبری پر اعتماد کی تجویز میں بھی یہ کہا گیا کہ "مہاتما گاندھی کی آواز سارے ہندوستان کی آواز ہے اور مہاتما گاندھی کی رائے سارے ملک کی رائے ہے۔"

رائے بہادر مہر چند کھنہ نے، جنھیں اب بھی صوبۂ سرحد کی کانگریس میں کافی اقتدار حاصل ہے کہا کہ مسلم اکثریت کے صوبے میں لیگی وزارت کے زوال کا یہ مطلب ہے کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی اکثریت کی حمایت حاصل نہیں ہے۔

مسلم لیگ کا جواب

لیگی روزنامہ زمیندار (لاہور) نے خان علی گل خاں کی تقریر کے جواب میں یہ لکھا ہے کہ "مسلم لیگ بھی یہی چاہتی ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے وطنی علاقے آزاد ہوں پھر لیگی پاکستان میں اور کانگریسی پاکستان میں کیا فرق ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ خان صاحب نے اصل حقیقت معلوم کرنے کی تکلیف نہیں گوارا کی ہے۔ شاید کانگریس کے تصورِ آزادی اور لیگ کے تصورِ آزادی میں یہ فرق ہے کہ کانگریس ترنگے کو یونین جیک کے سائے میں اور مسلمانوں، اچھوتوں، سکھوں اور عیسائیوں کو ترنگے کے سائے میں غلام بنا کر رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن لیگ چاہتی ہے کہ ہر قوم آزاد ہو۔"

(۲۴ر اپریل)

لیگی اخبارات کانگریس کو "بے اصولی" کا بھی الزام دیتے ہیں۔ چنانچہ زمیندار لکھتا ہے کہ "مسٹر ڈیسائی کہتے ہیں کہ ڈاکٹر خان صاحب نے کانگریسی وزارت محض انسدادِ رشوت ستانی کے لئے قائم کی ہے۔ تو کیا یو۔ پی، سی۔ پی، بہار، بمبئی، مدراس اور اڑیسہ میں دیوتاؤں کی حکومت ہے؟ وہاں رشوت کا بازار گرم نہیں؟ اگر کانگریس رشوت ہی کا انسداد کرنا چاہتی ہے تو ان صوبوں میں وزارتیں کیوں نہیں قائم کی جاتیں؟"

(۲۵ر اپریل)

واقعہ یہ ہے کہ کانگریس کے بعض عناصر صوبۂ سرحد میں کانگریسی وزارت کے قیام کو بہانہ بنا کر لیگ کو گالیاں دیتے ہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ اب وہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ لیگ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت نہیں ہے۔ اس طرح وہ امیری اور سامراجیوں سے بحث میں جیت سکتے ہیں۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ اس طرح لیگ پر دباؤ ڈال کر اُسے سمجھوتہ کرنے پر مجبور کر دیں گے۔ اس سیاسی کھیل میں وہ اکثر ایسے اتحاد دشمن سامراجی عناصر کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن جاتے ہیں جیسے مہر چند کھنہ جن کی زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ کانگریس اور لیگ کے درمیان اختلاف کی خلیج کو وسیع کیا جائے۔ وہ لوگ اس حقیقت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھنے کو تیار نہیں ہیں کہ مسلمانوں کے حق خود اختیاری اور پاکستان کے خیال نے سرحد کے باشندوں کے بھی دل میں گھر کر لیا ہے۔

لیکن لیگ جس طرح سرحد کے اصل حالات کی طرف سے بے خبر ہے وہ کانگریسیوں کی تنگ نظری سے بھی بڑھ کر ہے۔ وہ طوطے کی طرح انھیں الزامات کو رٹ رہے ہیں جو انھوں نے عام طور سے تمام کانگریسی مسلمانوں پر عاید کر رکھے ہیں۔ صوبہ سرحد کے کانگریسیوں پر قائداعظم کا یہ الزام ہے کہ "انھیں واردھا سے احکامات ملتے ہیں"۔ اس لئے عام لیگی خدائی خدمتگاروں کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ "وہ اسلام کے تابع نہیں ہیں بلکہ گاندھیائی اہنسا کے فلسفے، گائے کی پرستش اور ہندو اقتدار کے تابع ہیں"۔ ظاہر ہے کہ سرحد میں ان احمقانہ باتوں کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ وہاں سُرخ پوشوں کی تحریک اب بھی چھائی ہوئی ہے اور خصوصیت کے ساتھ دیہات میں۔ وہاں کا ہر پٹھان چاہے پاکستان کا حامی ہی کیوں نہ ہو خان عبدالغفار خاں کی عزت کرتا ہے اور خدائی خدمتگاروں سے محبت کرتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے پٹھانوں کی خدمت بڑی بے لوثی کے ساتھ کی ہے اور پٹھانوں کی آزادی کے لئے تکلیفیں جھیلی ہیں۔

کانگریسی وزارت

صوبۂ سرحد میں کانگریسی وزارت کا قیام وہاں کے عوام کی خواہش کا اظہار ہے۔ وہ لوگ پچھلی وزارت کے دور کی رشوت ستانی اور نوکر شاہی کی بد دماغی سے اکتا چکے تھے خود وہاں کے لیگی عوام نے اس تبدیلی کا خیر مقدم کیا ہے۔ لیکن لیگی لیڈران حقائق سے سبق سیکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

ان کے نزدیک سرحدی عوام کے مصائب اور مسائل کوئی معنی نہیں رکھتے وہ بس اس فکر میں ہیں کہ کسی طرح اگلے الکشن میں کانگریس کو شکست دے کر صوبۂ سرحد کو لیگی صوبہ بنا لیں۔ ان کا خیال ہے کہ لیگ کو منظم کر کے اور خدائی خدمت گاروں کے خلاف پروپگنڈا کر کے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ اس طریقے سے صرف تلخیاں بڑھیں گی اور لیگ یا عوام کسی کو بھی فائدہ نہیں ہوگا۔

سرحد کی لیگ میں ویسے ہی بہت سے ٹولیاں ہیں۔ لیگ کی مجلس عمل نے سرحد کی تمام لیگ کمیٹیوں کو توڑ دیا ہے۔ صوبائی، ضلع یا شہری کمیٹی کچھ بھی باقی نہیں۔ اورنگ زیب خاں کے گروپ نے گذشتہ سال خان بخت جمال کے گروپ کو لیگ سے نکال دیا تھا۔ بخت جمال پُرانے سُرخ پوش ہیں اور لیگ کے سرگرم اور مخلص کارکن ہیں۔ ۱۹ر اپریل کو جب صوبائی لیگ کا جلسہ ہوا تو بخت جمال کا گروپ پھر اکثریت میں تھا۔ ۹۶ میں سے اورنگ زیب خاں کے ساتھی صرف ۱۵ تھے اس لئے اورنگ زیب خاں وہاں سے چلے گئے۔ نئے الکشن میں بخت جمال صدر اور محمود گیلانی سکریٹری چنے گئے۔ لیگ کی مجلس عمل نے اس انتخاب کو رد کر دیا۔ اب مجلس عمل کی نگرانی میں نیا انتخاب ہوگا۔

بہت سے مخلص لیگی ان حالات سے دل برداشتہ ہیں اس میں شبہ ہے کہ مجلس عمل کی مداخلت سے حالات بہتر ہو سکیں گے۔ قاضی محمد عیسٰی کو مجلس عمل نے سرحد کی لیگ کی تنظیم کے لئے بھیجا تھا۔ لیکن انھیں ناکامی ہوئی۔ انھوں نے بڑے زور شور سے یہ اعلان کیا کہ اس سال سرحد میں لیگ کے اسّی ہزار ممبر بنے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ دس ہزار سے زیادہ ممبر نہیں بنے تھے۔

بہرحال پارٹی بازی کو بند کرنے اور سرحد میں لیگ کو مضبوط کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔

کانگریس، خدائی خدمتگار، لیگ غرض ہر کیمپ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو حق خود اختیاری، جمہوریت اور عوام کی مشترکہ خدمت کی بنیاد پر ایک دوسرے کی طرف دست تعاون بڑھا رہے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اس مقصد کے حصول میں موجودہ وزارت بہت مدد دے سکتی ہے۔ لیکن ہر کیمپ کے لیڈروں کی اکثریت اب بھی اپنے ہی گروپ کے متعلق سوچتی رہتی ہے۔ باہمی اتحاد کی بنیاد ابھی تک قائم نہیں کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انتشار کا خطرہ کافی شدید ہے۔

کیا یورپ میں اب کمیونزم پھیل جائے گا؟

از: ستیش چندر ایم۔ اے

ماسکو کانفرنس میں دنیا کی تین سب سے بڑی طاقتوں نے یہ اعلان کیا کہ جنگ کے ختم ہونے کے بعد یورپ کے عوام کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ اپنے اپنے ملک میں جس قسم کا طرز حکومت چاہیں قائم کریں۔ لیکن زیادہ تر لوگ کہتے ہیں کہ یہ اعلان تو بہت دل خوش کن ہے لیکن ۱۹۱۴-۱۹ء کی جنگ عظیم کے بعد صدر ولسن کے چودہ نکات اور اُن کے انجام سے واقفیت کی بنا پر ہمیں معلوم ہے کہ اس قسم کے اعلانات کا آگے چل کر کیا حال ہوتا ہے۔ یہ قطعی ممکن ہے کہ یہ تینوں طاقتیں یورپ کو مختلف حلقوں میں تقسیم کرکے انھیں اپنا اپنا زیر اثر حلقہ بنا لیں اور اپنے اپنے حلقے میں طرز حکومت اور سماجی نظام کی تشکیل و تعین کا اختیار بھی ہتھیا لیں اور اس طرح دنیا میں "طاقت کی سیاست (POWER POLITICS) کا پھر ایک نیا دور شروع ہو جائے۔ پُرانے سیاسی مفکرین کے نکتۂ نگاہ سے ایسا ہونا تقریباً لازمی ہے لیکن آئیے ہم دیکھیں کہ موجودہ سیاسی حالات کی روشنی میں کہاں تک اس کا امکان ہے۔

برطانیہ نے اپنے سامراجی مقاصد کے تحت یورپ کی سیاست میں ہمیشہ توازن کی پالیسی اختیار کی ہے۔ یعنی یورپ کی کسی دو سب سے بڑی حریف طاقتوں کے درمیان ہمیشہ ایک توازن برقرار رکھنے کی پالیسی پر عمل کیا ہے۔ برطانیہ کے موجودہ مدبرین کا یہ خیال ہے کہ موجودہ جنگ نے اس طرز عمل کی ضرورت، کامیابی اور اہمیت ثابت کر دکھایا ہے۔ "سیاست کی طاقت" کا ہمیشہ یہ تقاضا رہا ہے کہ کسی ایک طاقت کو دوسری حریف طاقت کے مقابلہ میں بہت نمایاں طور پر کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ چنانچہ اس بات کے پیش نظر یہ حقیقت ہے کہ موجودہ اتحاد ثلاثہ، چاہے آئندہ بھی قائم رہے یا نہ رہے لیکن برطانیہ کی پوری کوشش یہ ہوگی کہ سوویت روس کی عظیم الشان طاقت کے خلاف توازن قائم کرنے کے لئے کسی اور طاقت کو آگے بڑھا کر منظر عام پر لایا جائے اور بین الاقوامی سیاست کی بساط پر اس کی پشت پناہی اور تائید کی جائے۔ برطانیہ کے مدبرین اب جرمنی یا جاپان کو اس کام کے لئے منتخب نہیں کر سکتے اس لئے کہ یہ دونوں طاقتیں برطانیہ کے نکتۂ نگاہ سے ذرا نا قابل اعتبار ثابت ہوئی ہیں۔ اس لئے آج برطانیہ کے ذہن میں یورپ کے سیاسی توازن کو برقرار رکھنے کے لئے ایک نئی اسکیم چکر کاٹ رہی ہے اور وہ یہ کہ یورپ کے ملکوں میں ایسی فیڈریشن معرض وجود میں لائی جائیں جو روس کے خلاف اور برطانیہ کے موافق ہوں۔ امریکہ اس قسم کے اسکیم کی پوری تائید کرے گا اس لئے کہ جہاں تک کمیونزم کا تعلق ہے برطانیہ اور امریکہ کے حکمراں طبقوں کے رویہ اور طرز عمل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ لوگ کمیونزم سے سخت نفرت کرتے ہیں اس لئے کہ کوئی پچیس سال سے کمیونزم کا ہوّا انھیں مستقل اور مسلسل طور پر ڈرا رہا ہے۔ انقلاب روس کے بعد ان لوگوں نے کمیونزم کو ختم کرنے کے لئے پہلے تو روس کی نوزائیدہ انقلابی حکومت کے خلاف جنگ چھیڑ دی لیکن جب مزدوروں کی لال فوج نے ان اسکیموں اور ارادوں کو خاک میں ملا دیا تو یہ لوگ کمیونزم کے خلاف دیوار قائم کرنے کے لئے نازیزم کی طرف متوجہ ہوئے اور اس پالیسی کا نتیجہ میونخ اور زوال فرانس کی صورت میں ظاہر ہوا۔ لیکن ان ہولناک نتائج کے باوجود یہ ظاہر ہے کہ برطانیہ کا حکمران طبقہ آسانی سے اپنے ارادے اور اپنے نظریے نہیں بدل سکتا۔ ہم بجدود نیل کا غالباً اس کا سب سے خراب تجربہ ہے۔ پھر چرچل کے ان نقروں کو کبھی نہ بھولنا چاہئے جن میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ "کمیونزم قوموں کی روح کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔" موجودہ حالات میں چرچل نے کمیونزم سے صلح ضرور کی ہے لیکن اُن کا بنیادی رویہ بالکل نہیں بدلا ہے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ یورپ کے عوام سماجی نظام اور طرز حکومت کے سلسلے میں اگر کمیونزم کے حق میں فیصلہ کریں تو کیا چرچل اس صورت حال کو برقرار رہنے کی اجازت دیں گے؟ غالباً اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ محض اصول کی خاطر اور ایسے وقت میں جب کہ برطانیہ کا حکمراں طبقہ فتح کے نشے میں چور ہے۔ اگر جنگ کے بعد کمیونزم پورے یورپ پر چھا گیا تو چرچل کے نکتۂ نگاہ سے یہ بات ہٹلر کے تسلط سے بھی بدتر ہوگی۔ یورپ میں کمیونزم کے قیام سے برطانیہ کے ہاتھوں سے وسیع بازار تو چھن ہی جائیں گے لیکن سب سے خطرناک بات

یہ ہوگی کہ اس کے بعد انگلستان میں کمیونسٹ خیالات کی اشاعت کو روکنا نہ تو برطانیہ کے بحری بیڑہ کے بس کی بات یہ ہوگی اور نہ بحر اطلانٹک کی پرشور لہروں کے بس کی۔ یورپ میں کمیونزم قائم ہونے کے بعد دنیا کی کوئی طاقت برطانیہ میں کمیونزم کے سیلاب کو نہیں روک سکتی۔

برطانیہ کے حکمراں طبقہ کی ہمیشہ سے یہ خاصیت رہی ہے کہ جب کسی خاص اصول سے اُس کے مفاد کو نقصان پہنچنے لگتا ہے تو وہ فوراً اُسے ترک کرکے دوسرا اصول اختیار کرلیتا ہے۔ گرگٹ کی طرح اس طرح پر رنگ بدلنے کے لئے جس خاص قسم کے دل و دماغ اور ذہنیت کی ضرورت ہے اُس کے لئے کمی نہیں کہ برطانیہ کے پبلک اسکولوں میں اس قسم کی ذہنیت کی پرورش کی جاتی ہے۔ آج برطانیہ کا حکمراں طبقہ یہ دعوی کرتا ہے کہ یہ جنگ جمہوریت کے تحفظ کے لئے لڑی جارہی ہے لیکن ذرا آپ رک جائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ جہاں یورپ میں کمیونزم کے آثار شروع ہوئے یہی حکمراں طبقہ جمہوریت اور آزادی کے اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر یورپ کے عوام پر زبردستی ایسی حکومتیں مسلط کرنے کی کوشش کرے گا جو کمیونزم کی مخالف اور برطانیہ کے موافق ہوں گی۔

یہ محض خیالی باتیں نہیں ہیں بلکہ واقعی امریکہ اور برطانیہ کے حکمراں طبقے اسی بات کے لئے کوشاں ہیں۔ یوگوسلاویہ میں ان لوگوں نے مارشل ٹیٹو کے خلاف سدا میخائیلووچ کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور اٹلی میں انھوں نے پرانے فاشسٹ لیڈر بدولیو کو با اختیار بنانے کی کوشش کی ساتھ ہی وہاں کے بدنام اور رسوائے زمانہ بادشاہ کی بھی تائید کی۔ فرانس میں انھوں نے جنرل دی گال کے مقابلہ میں جیراد کو آگے بڑھانا چاہا۔ اور اگر فرانس کے واقعات اُن کو اس طرزِ عمل کے بدلنے پر مجبور نہ کردیتے تو یہ غالباً جنرل دی گال کی رہنمائی کو کبھی باقاعدہ طور پر تسلیم نہ کرتے۔ اس کے علاوہ چرچل نے جنرل فرانکو کی بھی تعریف و توصیف کرنے میں کبھی کوتاہی سے کام نہیں لیا ہے۔ پولینڈ میں یہ لوگ رجعت پسندانہ کارروائی بگوڑی اور انتہا درجہ کی غیر مقبول حکومت کو پھر سے پولی عوام کے سر پر مسلط کرنے پر تلے ہیں۔ پروفیسر توین کا یہ خیال بہت صحیح ہے کہ برطانیہ اور امریکہ کی آفیشل پالیسی یہ ہے کہ اس جنگ کو پرانے رجعت پسندوں کی مدد سے جیتنے کی کوشش کرو۔ اور فاشزم کی شکست کے بعد آنے والے سماجی انقلاب کے راستے میں روڑے اٹکاؤ۔ ابتک تو یورپ کے ملک میں برطانیہ اور امریکہ کے نامزد امیدواروں کو شکست ہوتی رہی ہے۔ یوگوسلاویہ میں مارشل ٹیٹو کی منظم طاقت کے سامنے ان کی ایک بھی نہ چل سکی۔ فرانس میں تحریک مقاومت کے رہنماؤں نے ان کے ارادوں کو پامال کردیا۔ اور اٹلی میں عوام کے زبردست اتحاد اور سوویت روس کی پرزور تائید کے سامنے بدلیو اور دوسرے سامراجی نمایندوں کی کوششیں ناکام رہیں۔ چنانچہ ان ملکوں میں ایسی حکومتوں کو انھیں تسلیم کرلینا پڑا۔ جن کو عوام کی تائید اور موافقت حاصل ہے۔ یہ خاص بات ہے کہ ان ملکوں میں بھی جہاں اس وقت امریکہ اور برطانیہ کی فوجیں قیام پذیر ہیں عوام ہی کے ارادے عملی صورت اختیار کر رہے ہیں

اب ہم ذرا سوویت روس کی طرف آتے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ سوویت روس کے خارجی طرزِ عمل سے متعلق لوگوں کو صحیح اور واضح سمجھ بوجھ حاصل ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ روس پر جرمنی کے حملے سے پہلے باہری دنیا کو سوویت روس سے متعلق صحیح معلومات نہیں حاصل تھیں۔ اگرچہ اب بھی پردے کا صرف ایک گوشہ ہی اٹھا ہے۔ اب سوویت روس کے خارجی طرزِ عمل کے متعلق کم سے کم اتنا ضرور تسلیم کرلیا گیا ہے کہ عالمگیر جنگ ۱۹۱۴-۱۹ء اور موجودہ جنگ کے درمیانی حصّے میں سوویت روس ہمیشہ امن عالم کو برقرار رکھنے کیلئے کوشاں رہا ہے۔ لیکن اب بھی ایسے لوگوں کی خدا کے فضل سے کمی نہیں ہے جو اپنے فرسودہ انداز میں سوویت روس کو ہوا بنا کر پیش کرنے کی کوشش کئے جارہے ہیں۔ یہ بیچارے دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش میں حیران و سرگرداں پھر رہے ہیں کہ اشتراکیت کے پردے میں روس ساری دنیا میں اپنا سامراجی تسلط قائم کرنا چاہتا ہے آئیے ہم دیکھیں کہ اس دعویٰ کی بنیادیں کتنی کھوکھلی ہیں۔

سوویت روس کے خارجی طرزِ عمل کا بنیادی مقصد یہ رہا ہے کہ سوشلسٹ سماج اور سوشلسٹ ریاست کی تعمیر کیلئے باہری حملوں سے ملک کو محفوظ رکھا جائے۔ یہ تحفظ تین طریقوں سے حاصل ہوسکتا تھا یا تو یورپ پر کمیونزم کا تسلط قائم ہوجائے یا دوسری ریاستوں کے ساتھ مل کر بہت مضبوط اور طاقت ور گروہ بندی وجود میں لائی جائے یا یورپ میں غیر ملکی طاقتوں کا ایسا توازن قائم ہوجائے جو سوویت

روس کے موافق پڑے۔ سب سے پہلا طریقہ سوویت روس نے جولیتا کیا وہ یہ تھا کہ ہر ملک کی کمیونسٹ پارٹی کے ذریعہ سرمایہ دارانہ اور سامراجی طاقتوں کو اندر سے کھوکھلا کرنے کی کوشش کی جائے۔ گروہ بندی والا طریقہ روس اس وقت اختیار کر رہا ہے اور توازن والا طریقہ روس نے جنگ سے پہلے اختیار کیا۔ اس وقت اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا اور دوسرے دو طریقے یورپ اور دنیا کے سامراجی ہتھکنڈوں کی وجہ سے خطرناک اور لاحاصل ہوگئے تھے یہاں پر ہمیں پہلے طریقہ سے بحث کرنی ہے یعنی یورپ اور ساری دنیا میں کمیونسٹ انقلاب کے ذریعہ سرمایہ داری اور سامراجی انقلاب کو ہمیشہ کیلئے ختم کرکے سوشلزم کے اور روس کے ساتھ سوویت روس کے دشمنوں کو ختم کر دینا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سوویت روس جنگ کی بعد والی دنیا میں پھر اس طرز عمل کی طرف لوٹے گا یا نہیں؟ اس کے متعلق عام طور پر دو بالکل مخالف رائیں پائی جاتی ہیں۔ ایک طرف تو کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اسٹیلین ان تمام ملکوں میں جو اس وقت سوویت روس کے قبضہ میں ہے سیدھے طور پر سوشلزم قائم کر دے گا ہٹلر اور مسولینی نے اسی رائے کا دنیا بھر میں پروپگنڈا کیا۔ اور یورپ اور دنیا کے سرمایہ پرستوں کو روس کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی۔ دوسری طرف کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ روس اپنے گذشتہ تجربوں کی بنا پر کبھی ایسا کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اس لئے کہ ایسا کرنا اولاً تو عملی اعتبار سے غیر ممکن ہے اور دوسرے خطرناک ہے۔ پروفیسر شومین کا یہی خیال ہے۔

لیکن درحقیقت ان دونوں باتوں میں کوئی بھی صحیح نہیں ہے جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ سوویت روس دوسرے ملکوں میں سوشلزم قائم کرنے کی کوشش کرے گا۔ ۱۹۲۷ء میں ہی اسٹالن اور ٹراٹسکی کے درمیان اس مسئلے پر گرما گرم بحث ہو چکی ہے۔ ٹراٹسکی مستقل اور دائمی انقلاب کے موافق تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ روس کی نئی پیر ولتاری حکومت اپنے تمام ذرائع دوسرے ملکوں میں انقلاب پیدا کرنے میں صرف کرے۔ اسٹالین نے یہ نظریہ پیش کیا کہ روس کی نئی مزدوروں کی حکومت ایک ہی ملک میں اشتراکیت کی تعمیر کی طرف متوجہ ہو۔ باقی رہا اور ملکوں میں اشتراکیت کے قیام کا سوال تو یہ ہر ملک کے اپنے اپنے مزدور طبقہ کا کام ہے۔

اسٹالین کی پالیسی کامیاب رہی اور اب تک روس کا طرز عمل اس کے مطابق ہے جس کا ثبوت ہمیں بلغاریہ، رومانیہ اور فن لینڈ کی مثالوں سے ملتا ہے۔ جہاں پرانا نظام اب تک برقرار ہے۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ انقلاب کے نصب العین سے انحراف کیا گیا ہے۔ روس کی کمیونسٹ حکومت کا مقصد اب بھی ساری دنیا میں انقلاب پیدا کرنا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ روس طاقت اور اختیار حاصل کرنے کے جذبات کے تحت ایسا کرے گا بلکہ تمام مارکسسٹوں کا خیال ہے کہ روس دنیا کے تمام عوام کی زیادہ سے زیادہ بہتری اور خیر و فلاح کے مقصد کے پیش نظر ایسا کرنا چاہتا ہے مقصد وہی ہے صرف طریقہ اب بدل گیا ہے اور بدل کر زیادہ پیچیدہ بھی ہوگیا ہے۔ روس کے کمیونسٹ ہر ملک کے کمیونسٹ تحریک کو پوری مدد پہنچانے کی کوشش ضرور کریں گے۔ لیکن وہ ایسے ملک پر جہاں کہ عوام سوشلزم قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہے۔ زبردستی انقلاب کو اوپر سے مسلط کرنے کی کوشش نہ کریں گے۔ اس لئے کہ ایسا کرنا خود "انقلاب عالم" کے نصب العین کو دھکا پہنچائے گا۔

باوجود اس کے کہ آج یورپ سے متعلق واضح اور وافر خبریں ہمیں نہیں مل رہی ہیں لیکن کم سے کم اتنا تو یقینی ہے کہ جرمنی کے تسلط کے دوران میں یورپ کے ہر ملک میں نازیت اور فاشیت کے خلاف ایک خفیہ مسلح انقلابی تحریک بڑی تیزی سے آگے بڑھی جس کا مقصد جرمنی کے تسلط کو بزور بازو ختم کرنا تھا۔ اس تحریک میں کسان اور مزدور پیش پیش رہے۔ اس تحریک کے رہنما بھی کمیونسٹ ہیں یا کم سے کم وہ لوگ جو کمیونسٹوں سے کوئی بنیادی اختلاف نہیں رکھتے یہ بات قطعی حیرت انگیز نہیں۔ کمیونسٹوں نے اپنے نظریہ کے مطابق جرمنی کے تسلط کے بعد ملک سے بھاگ کر جلاوطنی میں پناہ نہیں لی۔ بلکہ اپنے ملکوں کی شکست کے اثرات سے جلد از جلد نجات حاصل کرکے انھوں نے تحریک مقاومت میں حصہ لینا شروع کیا اور اب یہ بات اظہر من الشمس ہوگئی ہے کہ انھوں نے جرمن فوج کے ہاتھوں ہولناک مصائب برداشت کرنے کے باوجود بڑی پامردی اور استقلال سے مقابلہ کیا اور آج یہ کیفیت ہے کہ یورپ کے عوام میں لفظ کمیونسٹ ایک

خاص احترام اور عزت کا حامل ہو گیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس تحریک کی رہنمائی میں یورپ کے عوام نے اس لئے میں کہ جان دی ہے اور مصائب برداشت کئے ہیں کہ انھیں چند زمینداروں اور کارخانہ داروں کی حکومت قائم ہو جائے بلکہ انھوں نے اپنے بنیادی، سیاسی، سماجی اور معاشی حقوق کیلئے جان دی ہے۔ آج عوام میں اپنے حقوق حاصل کرنیکا ایک نیا جذبہ اور ایک نیا جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے حقوق منوا کر رہیں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب برطانیہ اور امریکہ میں عوام کے ان حقوق اور مطالبات کو پرانا نظام نہ پورا کر سکا تو پھر یورپ کے ان مفلس ملکوں کے پرانے نظام سے کیوں کر امید کیجا سکتی ہے کہ اس کے برقرار رہتے ہوئے عوام کے یہ حقوق اور مطالبے پورے ہونگے یہی وجہ ہے کہ آج نہ صرف یورپ بلکہ ساری دنیا کے ہر ملک میں سوشلزم کی طرف لوگوں کا رجحان اتنی شدید تیز رفتاری کے ساتھ بڑھ رہا ہے

جہاں تک میرا خیال ہے یورپ میں سوشلزم تک پہنچنے کے لئے دو منزلوں سے گذرنا ہوگا۔ عوام کی حکومت جو جنگ کے فوراً بعد قائم ہوگی، وہ کچھ عرصہ تک قائم رہے گی۔ اس حکومت میں محض سوشلسٹ یا کمیونسٹ نہیں ہوں گے بلکہ بائیں بازو کے تمام وہ لوگ شامل ہونگے جو جرمنی کے تسلط کے خلاف تھے اور جنھوں نے جرمنی سے ساز باز نہیں کیا۔ اور جو کمیونسٹوں سے اشتراک عمل اور تعاون کیلئے تیار ہیں۔ اس دوران میں کوئی بنیادی سماجی اور معاشی انقلاب رونما نہ ہوگا سوائے اس کے کہ وہ اہم صنعتیں جو پہلے جرمنی کے یا جرمنی سے ساز باز کرنیوالوں کے قبضہ میں تھیں ان کے قبضہ اور ملکیت سے نکال کر پوری قوم کے قبضہ اور ملکیت میں رکھ دیا جائے گا۔ غداروں کو ختم کر دیا جائیگا اس کے بعد سوشلزم کی دوسری منزل شروع ہوگی۔ اس وقت فرانس، اٹلی اور بلقان کے ممالک پہلی منزل سے گذر رہے ہیں۔ ملکوں کی موجودہ حکومتوں میں کمیونسٹوں کو جو طاقت اور پوزیشن حاصل ہے وہ بہت اہم اور پُر معنی ہے۔

سامراجی ہتھکنڈوں کے باوجود فرانس مسلسل طور پر سوشلزم کی طرف بڑھتا رہا ہے۔ اس لئے کہ وہاں کے عوام کی تحریک بہت مضبوط اور متفقہ منظم ہے۔ وہاں کی عارضی حکومت نے وعدہ کیا ہے۔ کہ فرانس کے آئندہ دستور حکومت کی تشکیل کے لئے ایک دستور ساز اسمبلی کا قیام عمل میں آئے گا۔ جس کے ممبروں کے انتخاب کیلئے ہر فرد اور ہر شخص کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہوگا۔ اس طرح گویا فرانس میں پہلی مرتبہ عورتوں کو بھی ووٹ دینے کا حق دیا جا رہا ہے جنرل دیگال کا یہ اعلان بہت اہم ہے کہ حکومت ان صنعتوں کو انفرادی ملکیت میں چھوڑنا گوارا نہیں کرے گی جو قومی معاشی نظام پر گویا ایک بوجھ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان اجارہ داروں اور فرانس کے ان بدنام "دو سو خاندان" کا اثر اقتدار بالکل ختم کر دیا جائے گا۔ جن کی چالوں سے فرانس کو اتنی ذلتیں برداشت کرنی پڑیں۔

بنیادی اور اہم صنعتوں کو ابھی سے انفرادی حیثیت سے نکال کر قومی ملکیت بتایا جا رہا ہے۔ جہاں تک فرانس کے مزدوروں کی تنظیم کا سوال ہے۔ اس کی مضبوطی کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

فرانس کے چودہ روزانہ اخبارات میں کمیونسٹ پارٹی کے اخبار کی اشاعت دو لاکھ ہے اور سوشلسٹ ڈیموکرائٹ جماعت کے اخبار کی اشاعت ایک لاکھ ساٹھ ہزار ہے۔ بقیہ تمام اخبارات کی کل اشاعت ملاکر ایک لاکھ بیس ہزار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فرانس کی موجودہ وزارت میں جو ٢٢ ارکان پر مشتمل ہے صرف دو کمیونسٹ ہیں اور چار سوشلسٹ ڈیموکرائٹ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ "فرانس کی اندرونی فوج" جس پر ترقی پسند جماعتیں چھائی ہوئی ہیں فرانس کی پوری فوجی طاقت کی اصل جڑ ہے۔

بلقان کے ملکوں میں یونان اور یوگوسلاویہ کو چھوڑ کر ابھی عوامی حکومتوں کی طاقت کمزور ہے۔ لیکن ان حکومتوں کو سرخ فوج کی زبردست اعانت حاصل ہے۔ بلغاریہ اور رومانیہ میں جو عوامی حکومتیں قائم ہوئیں تو بائیں بازو والی سیاسی جماعتوں کی وجہ سے نہیں بلکہ سرخ فوج کے دباؤ اور اثر سے۔ لیکن ان ملکوں میں رفتہ رفتہ سرخ فوج کی مدد سے بائیں بازو والی سیاسی جماعتوں کو طاقت حاصل ہو رہی ہے اس لئے کہ انھیں ٹریڈ یونین کی تنظیم کی آزادی حاصل ہے، یہ جماعتیں ہٹلر کے ساتھ ساز باز کرنے والوں کو سزا دے سکتی ہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پروپیگنڈا اور اشاعت کے تمام ذرائع سرخ فوج کے ہاتھوں میں ہیں۔ ان دونوں ملکوں کی حکومتوں میں کمیونسٹوں کو اہم پوزیشن حاصل ہیں۔ رومانیہ میں کمیونسٹ پیٹرسیس کینو، وزیر "سیاست و انصاف" ہے۔ بلغاریہ میں جہاں مزدوروں کی تحریک ہمیشہ مضبوط اور طاقت ور رہی ہے، داخلی حکومت کا وزیر ایک کمیونسٹ ہے اور اسی کے زیر اختیار پولیس کا نظام بھی ہے۔ بلغاریہ کی ایجنسی کونسل کے بھی دو ارکان میں ایک کمیونسٹ ہے۔ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کمیونسٹوں کا حکومت کی خاص خاص پوزیشن پر رہنا اتنا اہم نہیں جتنا کہ مختلف بائیں بازو کی جماعتوں کا اتحاد اور اشتراک عمل اہم ہے۔ اس لئے کہ جن ملکوں میں مثلاً فن لینڈ میں بائیں بازو کی سیاسی جماعتیں کمزور ہیں وہاں عوامی حکومتیں نہیں قائم ہو سکی ہیں۔

یوگوسلاویہ اور یونان میں عوامی حکومتوں کے لئے عوام کی جدوجہد بڑی صبر آزما اور قربانیوں سے پُر ہے۔ پھر چونکہ یہ ممالک بحیرۂ روم کے ساحل پر واقع ہیں اس لئے ان ملکوں سے حکومت برطانیہ کے بہت خاص مفاد وابستہ ہیں۔ حکومت برطانیہ کے بہت خاص مفاد وابستہ ہیں۔ حکومت برطانیہ نے ان ملکوں کے اندرونی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر خود اپنے پٹھوؤں کو

حمایت کی۔ یہ پٹھو وہی لوگ ہیں جو پرانے فیوڈل جاگیردار اور بڑے بڑے دولت مند اجارہ دار ہیں جو جنگ کے بعد اپنا سیاسی اور معاشی تسلط برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ یونان میں کئی مہینوں کی کشمکش اور جھگڑوں کے بعد ای۔ اے۔ ایم کو ایوان حکومت میں جگہ ملی جو یونان کی سب سے طاقتور گوریلا تحریک ہے۔ ایوان حکومت میں جگہ پا لینے کے بعد بھی انھیں مخالفتوں اور جھگڑوں سے نجات نہ ملی۔ یوگوسلاویہ میں اب سے پہلے جو شخصی حکومت قائم تھی اُسے مجبوراً آخر مارشل ٹیٹو کی گوریلا تحریک کے سامنے سر جھکا دینا ہی پڑا۔ چنانچہ آج یوگوسلاویہ میں تمام اصلی اختیارات مارشل ٹیٹو ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ ٹیٹو نے یوگوسلاویہ کے مختلف قومی علاقوں کو یعنی کروشیا، سربیا، سلووینیا وغیرہ کو مکمل قومی حقوق دے دئے ہیں لیکن ابھی تک اس بات کی صحیح اطلاع نہیں مل سکی ہے کہ کسانوں میں زمین کی تقسیم سے متعلق مارشل ٹیٹو کا رویہ کیا ہے۔ قرینہ یہ ہے کہ چونکہ یہ مسئلہ ذرا اختلافی نوعیت رکھتا ہے اس لئے شاید ابھی طے نہ پائے۔

اٹلی کے سامنے دو دو دقتیں ہیں۔ نہ تو یہاں مزدوروں کی کوئی مضبوط تحریک ہے اور نہ اٹلی کے پاس سوویٹ روس کی پر زور اور اثر کن امداد پہنچ سکتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اٹلی بہت سست رفتاری کے ساتھ عوامی حکومت اور سوشلزم کے نصب العین کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اخبار "ریڈرس ڈائجسٹ" کے اگست کی اشاعت میں اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی کی تیز رفتار ترقی کا ثبوت ملتا ہے۔

اب ہم جرمنی کے مسئلہ کی طرف آتے ہیں۔ جرمنی سے متعلق یہ ظاہر ہے کہ ہمیں وافر معلومات نہیں حاصل ہیں۔ جرمنی میں ہٹلر کے خلاف ایک خفیہ تحریک ضرور قائم تھی اور ہے۔ لیکن یہ تحریک اس قدر کمزور اور دبی ہوئی رہی ہے کہ اس کے ذریعہ جرمنی میں عوامی حکومت کا قیام غیر ممکن ہے لیکن عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ ہٹلر کی شکست و زوال کے فوراً ہی بعد جرمنی میں کمیونزم قائم ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ سمرویلز نے بھی اپنی تازہ تصنیف "فیصلہ کا وقت آگیا ہے" میں اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اس معاملہ میں خود جرمنی کے کمیونسٹوں کا بیان بالکل مختلف نتیجہ پیش کرتا ہے۔ ایک مشہور جرمن کمیونسٹ ولہلم کوئنی مقیم لندن کہتا ہے "وہ لوگ جو یہ امید کرتے ہیں کہ ہٹلر کی شکست کے فوراً ہی بعد ہم جرمنی میں حقیقی سوشلزم قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جرمنی کی گذشتہ دس سال کی تاریخ نے ہمارے ملک کی صورت حال بالکل بدل دی

فاشسٹ حکومت نے جرمنی کی مزدور تحریک کو موت کی ضرب لگائی ہے۔ یہیں سے شروع سے ابتدا کرتا ہے۔ مزدور تحریک کو زندہ کرنے کے لئے بقول لینن تنظیم اور محض تنظیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جرمنی کے اصلی ترین تنظیمی صلاحیت رکھنے والے بھی ہٹلر کی موت کے دس سال بعد تک مزدور تحریک کی دقتوں اور مشکلات کو فتح نہیں کرسکتے۔ اس کے علاوہ ایک اور دقت راہ میں حائل ہے اور وہ یہ کہ فاشسٹ جرمنی اور کمیونسٹ روس کے درمیان اس لڑائی کے دوران میں شدید باہمی نفرت کے جذبات بھڑک اُٹھے ہیں بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ جان بوجھ کر نفرت کے ان جذبات کو بھڑکایا اور اُجاگر کیا گیا ہے جرمنی کو فاشسٹ عناصر سے مکمل نجات حاصل کرنے کے لئے کم سے کم دس سال تک غیر ملکی تسلط کی تلخی برداشت کرنی ہے تب کہیں جاکر وہ اس قابل ہوگا کہ وہاں عوامی حکومت کا قیام ممکن ہوسکے۔ یہ خبر آئی ہے کہ روس میں جرمن قیدی کمیونسٹ خیالات سے متاثر ہو رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہی لوگ آگے چلکر جرمنی میں کمیونزم کے حق میں سب مفید ثابت ہوں پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں کی مدد سے زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ غیر ملکی تسلط کا عرصہ کم ہوجائے لیکن یہ سوچنا تو بالکل غلط ہے کہ انکی مدد سے فوری طور پر جرمنی میں کمیونزم قائم ہوجائے گا۔

آخر میں یہ سوال رہ جاتا ہے کہ عوامی حکومتوں کا دور کس طرح سوشلزم کے دور میں منتقل ہوگا۔ یہ ظاہر ہے کہ سوشلزم کا قیام آسانی سے عمل میں نہیں آئیگا ہر سیاسی جماعت اختیار و اقتدار کے حصول میں کوشاں ہوگی، اس مقصد کے پیش نظر مختلف سیاسی جماعتیں آپس میں متحد ہوں گی یا ایک دوسرے کی مخالفت کریں گی اور انہیں باتوں پر سوشلزم کے قیام یا شکست کا انحصار ہوگا اس کے بعد یورپ کے ملکوں میں سوشلزم کا دور آئے گا لیکن یک بیک نہیں بلکہ موقع اور حالات کی مناسبت سے یکے بعد دیگرے۔ ایک طرف تو رجعت پسند لوگ ہوں گے جنکی امریکہ اور برطانیہ کی حکومتیں حمایت کریگی اور دوسری جانب انھیں ملکوں کے عوام ہونگے جن کی مدد سوویت روس کریگا۔ ان دونوں جماعتوں میں جلد جلد اور کشمکش شروع ہوگی جو خانہ جنگی کی صورت بھی اختیار کرسکتی ہے اور اس خانہ جنگی میں دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں اس طرح ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رہیں گی جیسے اسپین کی خانہ جنگی میں ہوئی تھیں۔ لیکن اس بات کا امکان زیادہ ہے کہ عوامی حکومتوں سے سوشلزم کے دور میں منتقل ہونے کا عمل پُرامن ہوگا۔ اسلئے کہ بعض اہم حقائق و واقعات اس طرف اشارہ کرتے ہیں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ سوشلزم کے جو سب سے کٹر دشمن ہیں وہ تو ہٹلر سے ساز باز کرنے کے الزام میں پہلے ہی ختم کئے جاچکے ہوں گے پھر سوشلزم کی موافق طاقتوں کو سوویت روس کی زبردست حمایت حاصل رہے گی۔ برطانیہ اور امریکہ اس دوران میں جاپان کی طرف متوجہ اور مصروف ہوں گے۔ پھر سوشلزم کا قیام یورپ کے ملکوں کی سوشل ڈیموکراٹ جماعتوں کے طرزِ عمل اور رویہ پر بھی منحصر ہے۔ مصیبت تو یہ ہے کہ سوشل ڈیموکراٹ جماعتوں کے رہنما نہ تو پچھلے واقعات سے تجربہ حاصل کرتے ہیں اور نہ پچھلی دشمنی اور منافرت ہی کی یاد ان کے دل سے نکلتی ہے۔ یہ انھیں لوگوں کی غلط پالیسی سے اٹلی اور جرمنی میں فاشزم کو کامیابی حاصل ہوئی۔ اگر ان کے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تو پھر خانہ جنگی جس سے وہ اس قدر خوف زدہ ہیں برپا ہوکر رہے گی اور اگر انھوں نے مزدور طبقے کے اتحاد کو توڑنے کی کوشش نہیں کی تو سوشلزم کی منزل پر پہنچنا آسان اور پُرامن ہوگا۔ اس بات کا واضح امکان ہے کہ بلقان کی ریاستوں کا ایک متحدہ سوویت فیڈریشن قائم ہو۔ یہ فیڈریشن سوویت روس کے اندر بھی رہ سکتا ہے اور اس سے باہر بھی فرانس میں سوشلزم کا قیام اسقدر سہل اور آسان نہ ہوگا اگرچہ حقائق واقعات سوشلزم کی حمایت ہی میں ہیں۔ اٹلی میں دونوں باتوں کا قوی امکان ہے۔ ہاں یہ بات ہے کہ اگر عارضی طور پر رجعت پسند عناصر کو کامیابی بھی حاصل ہوئی تو بھی پرانا نظام زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ کی موجودہ صدی کے آئندہ پچاس سال اس صدی کو "سوشلسٹ صدی" بناکر چھوڑیں گے۔

بقیہ صفحہ ۶۰

(بقیہ سیالکوٹ) وہ گھر موجود تھا۔ جہاں اسکو اپالا سے محبت ہوئی تھی۔ لیکن وہاں اب نہ جیتا تھا اور نہ اسکی پیاری اپالا دونوں مرچکے تھے۔ اپالا کو مرے صرف ایک ہی سال ہوا تھا۔ اس گھر میں اپالا کا وہ بھائی جو کوڑھی ہوگیا تھا اور بعد کو واپس آگیا تھا اور اسکا خاندان رہتا تھا۔ سو داس کی ہمت نہ پڑی کہ اب اس گھر سے چر اجنبیت بڑھے وہ اپالا کی ایک سہیلی سے ملا۔ اسنے اپالا کے ان رنگین نئے لباس، کرتی، چیلا، ساڑی اور گھڑی کو سامنے رکھکر آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا میری سہیلی نے ان کپڑوں کو آخری وقت میں پہنا تھا۔ اور مرتے وقت اسکے یہ آخری الفاظ تھے "میں نے سوداس کو قول دیا ہے کہ میں تیرے لئے مرد پور میں انتظار کرونگی" سوداس نے ان کپڑوں کو اٹھا کر اپنے پیشانی اور آنکھوں سے لگا لیا۔ ان کپڑوں سے اپالا کے جسم کی مہک آرہی تھی۔ ٭

٭ یہ آج سے ۴۳۰۰ برس پہلے کی ایک آریہ قبیلہ کی کہانی ہے اسی زمانہ میں قدیم بزرگ رشی وششٹھ وشوامتر بھاردواج رگ وید کی نظموں کو ترتیب دے رہے تھے اسی زمانے میں آریہ پروہتوں کی مدد سے کورو پنچال کے آریہ سرداروں نے اہل قبیلہ کے اختیارات پر آخری اور سب سے زبردست ضرب لگائی۔

ادبی تنقید

جنسیات اور ادب

طفیل احمد خاں ایم۔ اے

بھوک اور جنسی خواہش زندگی کی سب سے بنیادی حقیقتیں ہیں اور اگر موجودہ نظام شمسی میں کوئی بے حد غیر متوقع انقلاب رونما نہیں ہوا تو اُن کے آئندہ بھی رہنے کا امکان ہے۔ شاید ان دو کے درمیان کبھی ہمیں یہ طے کرنا باقی ہے کہ کون نسبتاً زیادہ بنیادی ہے اور ایسے موقعوں پر ہم شیخ سعدی کا یہ مشہور شعر دہرائے بغیر نہیں رہ سکتے

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

دراصل کسی خاص عہد میں جنسی خواہشات کی تسکین کے لئے کس قسم کے اجتماعی نظام کو سماج نے گوارا کیا ہے اس کا انحصار اس بات پر کہ اس زمانہ میں بھوک کے دور کرنے کا کیا نظام قائم تھا۔ ایک بے حد قدیم زمانہ میں جبکہ انسان نے بھوک کے دور کرنے کا کوئی واضح طور پر اجتماعی نظام نہیں قائم کیا تھا اس وقت جنسی خواہش کا مسئلہ بھی خالص طبیعی (PHYSICAL) مسئلہ تھا جس طرح اب بھی جانوروں میں پایا جاتا ہے بھی اس کا سماجی پہلو تقریبًا ناپید تھا۔ اس زمانہ میں بھوک اور جنسی خواہش کے باہمی انحصار کی نوعیت بھی محض طبیعی تھی۔ لیکن جب انسان نے سامان خورد و نوش کے حاصل کرنے کا ایک اجتماعی نظام قائم کر لیا تو جنسی خواہش کا مسئلہ بھی محض طبیعی اور انفرادی نہیں رہا بلکہ اب اس نے ایک اجتماعی نوعیت اختیار کر لی۔ اور جیسے جیسے تدریجی طور پر ترقی کرتے اور پیچیدہ ہوتے ہوئے آلات کے استعمال سے انسان زیادہ سے زیادہ پیچیدہ معاشی نظام قائم کرتا گیا ویسے ہی ویسے "بھوک" اور "جنسی خواہش" کے باہمی ربط و انحصار میں بھی زیادہ استواری پیدا ہوتی گئی۔ چنانچہ جنسی خواہش کا مسئلہ انسانی زندگی کا محض ایک جسمانی اور طبیعی مظہر نہیں ہے بلکہ اس کا ایک سماجی پہلو بھی ہے۔ ہماری پسند طرز عمل کا تقاضا ہے کہ ہم دونوں کے باہمی ربط و انحصار کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اس کے سماجی پہلو پر زیادہ زور دیں۔ ہم سماجی پہلو پر کیوں زور دیں اس کے جواب میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا کافی ہو

کہ اگرچہ ہمارے جنسی مسائل کی بنیادی نوعیت جسمانی ہے لیکن اس کا حل سماجی ہے۔ دراصل آج ہماری تمام انفرادی جسمانی ضرورتوں کا حل سماجی ہے مثال کے طور پر ہم موجودہ معاشرتی نظام کو بدل کر ہی "بھوک" کا مسئلہ حل کر سکتے ہیں اسی طرح ہم موجودہ معاشرتی نظام کو بدل کر ہی اپنے تمام جنسی امراض (خواہ وہ ذہنی اور نفسیاتی ہوں یا جسمانی) دور کر سکتے ہیں وہ لوگ جو موجودہ جنسی مسائل کو محض طبیعی قرار دیتے ہیں۔ اُن کا کامیاب حل دریافت نہیں کر سکتے موجودہ دور میں اس سماجی حل کے بروئے کار آنے میں جو تاخیر ہو رہی ہے اس کے سبب بھوک کے مسائل اور جنسی مسائل زیادہ سے زیادہ تباہ کن صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں اور ادب میں ان کا اس شدید اور بحرانی شکل میں ظاہر ہونا لازمی سا ہو گیا ہے ان مسائل کے وجود اور ان کی اہمیت اور شدت سے انکار کرنا قدیم نظام کے اور اس کے بہی خواہوں کے بس کی بات نہیں چنانچہ ان پرانی قدیم اخلاق نے لاعلمی اور جہالت کی جو بندشیں قائم کر دی تھیں وہ اب بڑی تیزی کے ساتھ ادھیڑی جا رہی ہیں اور اس طرز عمل کے لئے ہمارے پاس ایک تاریخی اور مادی وجہ جواز موجود ہے۔ دراصل انقلابات اسی وقت ظہور پذیر ہوتے ہیں جب سماج میں ایک محدود اور کم تعداد طبقہ کے علاوہ بقیہ تمام طبقوں کی ابتدائی ضروریات کی تکمیل میں دقتیں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ چنانچہ ایسے موقعوں پر اُن ضروریات کا ہماری اوّلین توجہ کا مرکز بنانا ایک لابدی امر ہے اس لئے کہ ہمیں انھیں ضروریات کی تسکین کے لئے ایک نئے سیاسی، سماجی اور اخلاقی نظام کا ڈھانچہ تیار کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ یہ شکایت مضحکہ خیز اور تاریخ کے غلط شعور پر قائم ہے کہ آج ہمارے ادیب کیوں ان مسائل پر اتنی توجہ صرف کر رہے ہیں۔ لیکن یہ کہا جا چکا ہے کہ اس بات کا کافی خطرہ موجود ہے کہ ہم ان مسائل کی سماجی نوعیت کی لاعلمی کے سبب اُن کو محض طبیعی یا نفسیاتی قرار دینے لگیں اور آج بھی ایسا ہی ہو رہا ہے اس قسم کی صورت حال میں یہ بالکل فطری ہے کہ بیشتر

موجودہ جنسی الجھنوں اور جنسی رجحانات کو ایک خالص نفسیاتی مسئلہ قرار دے چکے ہیں۔ ذہنی طور پر ان کا طریقۂ کار (METHOD) اور تکنیک بھی نفسیاتی ہے۔ جنسی رجحانات کے طویل تجزیوں بلکہ ان کی چیر پھاڑ پر اتر آتے ہیں جس سے ایک قسم کی بے مقصدیت پیدا ہوتی ہے۔ درآنحالیکہ زندگی کے کسی بھی پہلو کے تجزیہ و تشریح میں بے مقصدیت اتنی خطرناک نہیں جتنی جنسی معاملات کے تجزیہ و تشریح میں۔ ہمارے بیشتر ادیب موجودہ نسل کے شائستہ افراد کے جنسی دباؤ اور اس سے پیدا ہونے والی ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں اور پیچیدگیوں کا تجزیہ تو کر دیتے ہیں لیکن اُن کی سماجی اور طبقاتی جڑیں نہیں تلاش کر سکتے۔ چنانچہ ان کا تجزیہ بے مقصد معلوم ہونے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ بنگال کے موجودہ حالات میں ایک بہت بڑے پیمانہ پر اور تباہ کن انداز میں جو جنسی بے راہ روی پائی جاتی ہے اُسے اگر ادیب دیکھ لے کر تفصیل کے ساتھ بیان کرنا شروع کر دے اور اس کے خارجی اسباب و علل کی طرف اشارہ نہ کرے تو اس قسم کا ادب کسی بھی اخلاقی نظام کے لئے کتنا مضرت رساں ہوگا اس کا اندازہ مشکل نہیں۔ اردو کے بیشتر جوشیلے ادیبوں کا آج یہی رویّہ ہے۔

بعض ادیبوں نے جنسیات کے موضوع میں خود اپنے ذاتی جنسی مسائل حل کرنے کی مریضانہ کوشش کی ہے۔ چنانچہ اُن کے افسانوں میں "چٹخارہ پن" کا ضرورت سے زیادہ عنصر پیدا ہو گیا ہے۔ بعض چوٹی کے ادیبوں نے جنسی افسانہ نگاری کو پیسے کمانے کا ذریعہ بنا لیا ہے چنانچہ ان کے بیشتر افسانوں میں ایک سستے قسم کے رومان اور سنسنی کے علاوہ کچھ نہیں ملتا اور اگر اُن کی تکنیک کی بعض خوبیوں کو نظر انداز کر کے دیکھا جائے تو ان کی ادبی کاوشوں کو (FRENCHYFR…ICS) کی قسم کی چیزوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ سماجی نظام زوال میں کوک شاستر غالباً اس قسم کے ادب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن اردو کے بیشتر اوّل اور دوم درجے کے ادیبوں نے جنسیات میں ایک خاص قسم کا فرار اختیار کیا ہے۔ اسلئے کہ انھیں اجتماعی دنیا میں "بھوک" کا حل نظر نہ آسکا۔ اُس کے فوری اسباب کی تلاش و جستجو کی جائے تو ہمیں مندرجہ ذیل باتیں نظر آئیں گی وہ موجودہ اجتماعی زندگی کی شدید تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ وہ ایک قریب تنی ابتدا کی تلاش میں پیچیدہ تر تمام حقائق و واقعات سے اپنے ذہن کو ہم آہنگ کرنے سے انکار کر رہے ہیں یا اپنے اندر اسکی سکت نہیں پاتے۔ ہو سکتا ہے کہ اُنکے اندر تاریخی شعور کی کمی ہو یا وہ زندگی کو بحیثیت مجموعی دیکھنے سے قاصر ہوں۔ سماجی علوم سے ناواقفیت کی بنا پر خود ادب اور آرٹ سے متعلق اُن کا تصوّر غیر متوازن اور غیر صحت مند ہے۔ اور وہ سماج میں موخر الذکر کے صحیح مقام اور اہمیت نہیں سمجھ سکے ہیں بہت سے ادیبوں کو بالکل پیش نظر سیاسی صورت حال نے اتنا بد دل کر دیا ہے کہ وہ جنسیات میں یا نئی لوازمات کی دنیا میں ذہنی فرار تلاش کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں اور حالات پر اثر انداز ہونے کی بجائے انھوں نے مجہول طریقہ سے حالات کی لہروں پر خود کو آزاد چھوڑ دیا ہے۔ بہرحال اس پوری صورت حال کو دو لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے ادیبوں نے زندگی کے اجتماعی مسائل سے فرار اختیار کر کے جنسیات میں پناہ لینے کی کوشش کی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جنسیات جو بجائے خود ایک سماجی اور اجتماعی مسئلہ ہے اُن کے ہاتھوں میں پہنچ کر ذہنی عیاشی کا آلۂ کار بن گیا ہے چنانچہ اُن کے ادب میں اُن تمام کمزوریوں اور مریضیت کا پیدا ہو جانا لازمی ہو گیا ہے جو تاریخ کے اس مخصوص عہد میں انفرادیت کے غیر منفک عناصر ہیں۔ "بھوک" اور "جنسیات" کی یہ علیحدگی سراسر مصنوعی ہے۔ اس خطرناک میلان کو ختم کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ہمارے ادیب زندگی کے ان دو سب سے بنیادی مسائل کے باہمی ربط و انحصار کو وضاحت کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں یعنی "بھوک" کے پس منظر میں "جنسیات" کا مطالعہ کریں۔ دوسرے لفظوں میں وہ جنسی مسائل کو موجودہ عہد کی سماجی اور طبقاتی کشمکش کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کریں اس لئے کہ آج زندگی کا کوئی پہلو اور کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو براہ راست طور پر اس طبقاتی کشمکش سے متاثر نہ ہو۔ وہ طبقاتی کشمکش جو آج ایک زبردست بین الاقوامی پیمانہ پر ہماری آنکھوں کے سامنے جاری ہے۔ صرف یہی طریقہ ہے جس سے جنسی افسانوں سے مریضیت اور چٹخارہ پن دور کر کے اسے خارجی زندگی کے بعض بے حد پیچیدہ اور اہم مسائل کے سمجھنے کا ایک صحت مند اور صالح ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔

سوداس

ملک۔ کورو پنچال (مغربی یوپی کت پرانت)

قوم:۔ ویدک آریہ

زمانہ۔ ۱۵۰۰ قبل مسیح

راہل سنکر اتیاین

بسنت رُت ختم ہو رہی تھی چناب کے کچھار میں دور تک پکے گیہوں کے پودے کھڑے ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔ جن کے درمیان جگہ بہ جگہ مرد و عورت گاتے ہوئے کھیت کاٹنے میں مصروف تھے۔ کئی کھیتوں میں اُگی ہوئی ہری گھاس چرنے کیلئے بہت سی بچھیروں والی گھوڑیاں چھوڑ دی گئی تھیں۔ دھوپ میں مسافر آگے کی طرف اپنے بھورے بالوں کی جٹا کو دکھلاتے ہوئے سر پر پھٹے کپڑوں کی پگڑی باندھے جسم پر ایک پرانی چادر لپیٹے گھٹنوں تک کے تہبند پہنے ہاتھ میں لاٹھی لئے خراماں خراماں چلا جا رہا تھا۔ تشنگی سے اس کا تالو سوکھ رہا تھا۔

راہ گیر نے ہمت باندھی تھی اگلے گاؤں میں پہنچنے کی۔ لیکن راستے کے نزدیک ایک کچے کنوئیں اور چھوٹے سے سایہ دار درخت کو دیکھ کر اس کی آس ٹوٹ گئی۔ اس نے پہلے اپنی پگڑی کا کپڑا پھر ننگے ہو کر دھوتی پھر ایک مرتبہ دونوں کو جوڑ کر سرے کو پانی میں ڈبانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر کار۔ مایوس ہو کر اس درخت کے سہارے بیٹھ گیا۔ اسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ اس جگہ سے پھر نہ اٹھ سکے گا اسی وقت ایک کندھے پر مشک دوسرے کندھے پر رسی اور ہاتھ میں چمڑے کی بالٹی لئے ایک دوشیزہ ادھر آتی ہوئی دکھائی دی۔ مسافر کی کھوئی ہوئی امید واپس آ گئی۔ نوجوان لڑکی نے کنوئیں پر آ کر مشک کو رکھ دیا اور جس وقت وہ بالٹی کو کنوئیں میں ڈالنے جا رہی تھی۔ اس وقت اس کی نظر مسافر کے چہرے پر پڑی اس کا چہرا مرجھایا ہوا تھا ہونٹ پھٹے، گال پچکے، آنکھیں دھنسی ہوئی، پیر ننگے اور دھول بھرے تھے لیکن ان سب کے پیچھے سے اس کے شباب کی جھلک نمایاں تھی۔

راہ گیر نے سنہری زلفوں پر دوشیزاؤں کا سا اپنا سنگار جسم پر چادر اور لنگی کی آراستگی کو دیکھا۔ جو سادگی کا نمونہ تھے۔ دھوپ میں چلنے کی وجہ سے نوجوان کا چہرہ زیادہ سرخ ہو گیا تھا۔ اور پیشانی اور اوپر کے ہونٹھ پر پسینے کے قطرے جھلک رہے تھے۔ نوجوان لڑکی نے کچھ دیر تک اس اجنبی شخص کی طرف دیکھ کر قدرتی دوشیزاؤں کی ہلکی مسکراہٹ کو حسین ہونٹھوں پر لا کر نوجوان کی آدھی پیاس کو بجھاتے ہوئے شیریں لہجہ میں کہا۔ "میں سمجھتی ہوں تو پیاسا ہے بھائی"

راہ گیر نے ہمت کے ساتھ اپنے گرتے کلیجہ کو مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں میں بہت پیاسا ہوں"

"تو میں پانی لاتی ہوں"

نوجوان لڑکی نے بالٹی میں پانی بھرا تب تک نوجوان بھی آ کر اسکے پاس کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا دراز قد اور موٹی ہڈیاں بتا رہی تھیں کہ ابھی اس کے اندر سے غیر معمولی انسانی قوت زائل نہیں ہوئی ہے مشک سے لٹکتے چمڑے کے گلاس کو راہ گیر کے ہاتھ میں دے کر نوجوان لڑکی نے اس میں بالٹی سے پانی بھر دیا۔ راہ گیر ایک بڑا گھونٹ گلے سے اتارنے کے بعد نیچے منہ کر کے بیٹھ گیا۔ پھر ایک سانس میں گلاس کے پانی کو پی گیا۔ گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اور سنبھلتے سنبھلتے

وہ پیچھے گر گیا۔ نوجوان لڑکی ذرا دیر کیلئے حیرت زدہ ہو کر اسے دیکھتی رہی۔ نوجوان کی آنکھیں الٹ گئی ہیں۔ وہ بیہوش ہو گیا ہے نوجوان لڑکی نے فوراً اپنے سر پر بندھے رومال کو پانی میں ڈبو کر نوجوان کے چہرہ کھا اور پیشانی کو پونچھنا شروع کیا۔ چند لمحات کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں پھر نوجوان کچھ شرمندہ ہو کر کمزور لہجہ میں بولا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں تکلیف دی۔"

"مجھے قطعی تکلیف نہیں ہوئی بلکہ میں ڈر گئی تھی کہ ایسا کیوں ہوا۔"

"کوئی خاص بات نہیں خالی پیٹ تھا۔ پیاس میں زیادہ پانی پی گیا لیکن اب کوئی ہرج نہیں۔"

"خالی پیٹ کہہ کر" راہ گیر کو بغیر کچھ کہنے کا موقع دیئے نوجوان لڑکی وہاں سے دوڑ گئی اور تھوڑی دیر میں ایک کٹورے میں دہی، ستو اور شہد لے آموجود ہوئی۔ نوجوان کے چہرے پر پس و پیش اور شرمندگی کی لہر آتے دیکھ کر لڑکی نے کہا۔ راہ گیر تم پس و پیش نہ کرو۔ میرا بھی ایک بھائی کئی سال ہوئے گھر سے نکل گیا ہے۔ تمھاری امداد کرتے ہوئے مجھے اپنا بھائی یاد آ رہا ہے۔"

"راہ گیر نے کٹورے کو سنبھالا۔ نوجوان لڑکی نے بالٹی سے پانی دیا نوجوان ستو گھول کر دھیرے دھیرے ۔۔۔ پانی پینے کے بعد اس کے چہرے کی آدھی مرجھاہٹ جاتی رہی اور ۔۔۔ وہ اپنی خاموشی سے شکریہ کا اظہار کرتے ہوئے کچھ بولنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ نوجوان لڑکی نے اس کے ارادہ کو سمجھ کر کہا "تکلف کرنے کی ۔۔۔ نہیں برادر تم دور سے آئے معلوم ہوتے ہو"

"ہاں بہت دور پورب کی طرف سے ۔۔۔"

"کہاں جاؤ گے؟"

یہاں۔ وہاں" کہیں

"پھر بھی"

"فی الحال کام کی تلاش ہے ۔۔۔ اپنے ۔۔۔ اور کپڑوں کا انتظام کر سکوں۔

"کھیتوں میں کام کرو گے؟

"کیوں نہیں، میں کھیت کاٹ بو اور جوت سکتا ہوں کھلیان کا کام کر سکتا ہوں گھوڑے گائے کی چرواہی کر سکتا ہوں۔ میرے

جسم میں قوت ہے۔ گو ابھی سوکھ گیا ہے۔ لیکن تھوڑے عرصہ میں میں گراں محنت کا کام بھی کر سکوں گا۔ میں نے ابھی تک کسی آقا کو ناراض نہیں کیا"

"تو میں سمجھتی ہوں کہ والد تجھے کام پہ لگا لیں گے۔ پانی بھر لوں تو میرے ساتھ چلنا۔"

نوجوان نے مشک لے چلنے کیلئے اصرار کیا لیکن نوجوان لڑکی راضی نہ ہوئی۔ کھیت میں ایک سرخ خیمہ لگا ہوا تھا جس کے باہر قریب چالیس مرد و عورت بیٹھے تھے۔ نوجوان اپنے محسن کے والد کو پہچان نہ سکتا تھا۔ سب کے سادے لباس یکساں زرد بال گورا جسم اور خود دار چہرے تھے نوجوان لڑکی نے مشک اور بالٹی کو اتار کر بیچ میں بچھے ہوئے چمڑے پر رکھا پھر ساٹھ برس کے ایک ضعیف لیکن تندرست اور قومی آدمی کے قریب جاکر کہا۔ "یہ پردیسی نوجوان کام کی تلاش میں ہے پتا جی؟"

"کھیتوں میں بیٹی؟

"ہاں! جہاں کہیں ملے!"

"تو یہاں کام کرے جو اجرت دوسرے آدمیوں کو ملتی ہے وہی اسے بھی مل جائیگی۔"

نوجوان سن رہا تھا۔ ضعیف مرد نے یہی بات اس کے سامنے دہرائی جسے اس نے قبول کر لیا۔"

"پھر ضعیف مرد نے کہا۔ آؤ نوجوان تم بھی آ جاؤ" ہم سب دوپہر کھانا کھانے جا رہے ہیں۔"

"ابھی میں نے ستو پیا ہے" تمھاری لڑکی نے دیا تھا آریہ بزرگ"

"آریہ وارہ نہیں۔ میں جینا سرجو کا بیٹا ماتر ہوں۔ تم جو کچھ بھی کھا سکو۔ کھا پی لو۔ اپالا میرا دکھی شراب دینا گھوڑی کے دودھ سے تیار کی گئی ہے۔ یہ دھوپ سے چل کر آنے کے بعد مفید ہوتی ہے۔ باتیں شام کو کروں گا۔ اس وقت صرف تمھارا نام جاننا چاہتا ہوں۔

"سوداس پنچال زادہ"

"سوداس نہیں بلکہ سُداہ۔ اچھا خیرات دان دینے والا تم پورب کے باشندے ٹھیک طور پر زبان سے بھی واقف نہیں ہو پنچال قبیلہ سے آئے ہو! اچھا اپالا کے یہ مشرقی لوگ بڑے شرمیلے ہوتے ہیں۔ انھیں کھلانا تاکہ یہ شام تک کچھ کام کرنے کے لائق ہو جائے"

سوداس نے اپالا کے گھر پہ میر پہ دکھی شراب کے دو تین پیالے

پیے اور ایک آدھ ٹکڑا روٹی کا حلق کے نیچے اتارا۔ دو دن سے بھوکے رہنے کی وجہ سے اس کی اشتہا مر سی گئی تھی۔

جیسے جیسے سورج کی تیزی کم ہوتی جا رہی تھی ویسے ویسے سوداس اپنے اندر نئی زندگی اور پھرتی پیدا ہوتی محسوس کر رہا تھا۔ اور شام کو کام چھوڑنے کے پہلے گیہوں کاٹنے میں وہ کسی سے کم نہ تھا۔

رات کو لوگ وہاں سے دور کھلیان گھروں کے پاس گئے جیتا کی کھیتی وسیع تھی، تمام کاٹی ہوئی فصل رات کو کھلیان میں جمع ہوئی دو سو سے زیادہ کام کرنے والے تھے۔ کھلیان کے گھروں میں کھانا پکانے والے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ ایک بہت بڑا بیل مارا گیا تھا جس کی ہڈیوں انتڑیوں اور گوشت کو بڑے بڑے دیگوں میں تین گھنٹہ دن رہتے ہی چڑھا دیا گیا تھا۔ باقی آدھ آدھ سیر کے ٹکڑے الگ نمک کے ساتھ ابالے جا رہے تھے۔ گھروں کے باہر ایک بہت وسیع ہموار میدان کھلیان کے لئے تھا۔ جس کے ایک طرف ایک پختہ کنواں اور پانی سے بھرا تالاب تھا مرد و عورتوں نے تالاب پر جا کر ہاتھ منہ دھویا۔ بعضوں نے جسم بھی دھویا۔ اندھیرا ہونے کے ساتھ قطار سے بیٹھے ہوئے مرد و عورتوں کے سامنے روٹی، گوشت کے ٹکڑے اور شراب کے کوزے رکھے گئے۔

سوداس کے شرمیلے پن کا خیال کر کے اپالا یعنی پانی لانے والی لڑکی نے اسے اپنے پاس بٹھایا۔ اگرچہ اس میں اس کے شرمیلے پن کا خیال اتنا نہ تھا جتنا پردیس گئے ہوئے بھائی سمرتی کا۔ کھانا کھانے کے بعد ناچ اور گانا شروع ہوا۔ جس میں اگرچہ سوداس آج شریک نہ ہو سکا لیکن آگے چل کر وہ ہر دلعزیز گویا اور ناچنے والا بنا۔

کھیت کی کٹائی، ڈھلائی اور دنوائی ڈیڑھ مہینے تک جاری رہی۔ لیکن دو ہفتے گذرنے کے بعد ہی سوداس پہچان نہیں پڑتا تھا اس کی بڑی بڑی نیلی آنکھیں ابھر آئی تھیں۔ اس کے گالوں پر سرخی دوڑ گئی تھی۔ اس کے جسم کی رگیں اور ہڈیاں گوشت سے ڈھنک گئی تھی۔

جیتا نے ہفتہ بھر کے بعد ہی اس کو نئے کپڑے بنوا دئے تھے۔

کھلیان قریب اٹھ چکا تھا۔ چھ، سات، آدمی جن میں باپ بیٹے اور سوداس بھی تھے کو چھوڑ کر باقی لوگ اپنے اناج لیکر چلے گئے تھے۔ ان لوگوں کے پاس کھیت تھوڑے تھے اس لئے اپنے کھیتیں کو کاٹ کر وہ جیتا کے کھیتوں میں کام کرنے لگے تھے۔ ان ڈیڑھ مہینے میں جیتا اور اس کی لڑکی اپنے نوجوان کام کرنے والے کی خوش مزاجی سے واقف ہو گئے تھے۔ ایک دن شام کی شراب کے بعد جیتا نے سوداس سے پورب والوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ اپالا بھی بیٹھی سن رہی تھی۔ جیتا نے کہا: "سوداس پورب میں میں بہت دور تک تو نہیں گیا ہوں لیکن پنچال پور کو میں نے دیکھا ہے۔ میں اپنے گھوڑے کو بیچنے کو سم سرا میں گیا تھا۔

"پنچال درو ملکھنڈ کیسا معلوم ہوا آریہ بزرگ۔

"قبائل میں کوئی عیب نہیں وہ مدر کی طرح تندرست اور دولتمند ہیں بلکہ ان کے کھیت یہاں سے بھی زیادہ زرخیز معلوم ہوئے لیکن ...."

"لیکن کیا؟"

"معاف کرنا سوداوہاں انسان نہیں بستے!"

"انسان نہیں تو کیا دیو یا راکشش بستے ہیں۔

"میں اتنا ہی کہوں گا۔ وہاں انسان نہیں بستے"

"میں ناراض نہ ہوں گا آریہ بزرگ" تمھیں کیوں ایسا خیال ہوا"

"سوداس تو نے دیکھا۔ میرے کھیتوں میں کام کرنے والے دو سو مرد و عورتوں کو؟"

"ہاں"

"کیا میرے کھیت میں کام کرنے والوں کو میرے ہاتھ سے اجرت پانے کی وجہ سے ذرا بھی عاجزی برتتے ہوئے دیکھا ہے۔

نہیں" بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ تمام لوگ تمھارے خاندان کے آدمی ہیں۔"

ہاں ان کو انسان کہنے میں یہ میرے ہی خاندان کے ہوئے تمام لوگ مادر اور مادریاں ہیں۔ مشرق میں ایسی بات دیکھنے کو جی ترستا ہے۔ وہاں غلام اور آقا پائے جاتے ہیں۔ انسان یا دوست نہیں ملتے۔"

"سچ کہا آریہ بزرگ" انسان کی قیمت میں نے ستلج پار کر کے خاص کر اس مدر کی سرزمین میں آکر دیکھا۔ انسانوں میں رہنا خوشی فخر اور مقدر کی بات ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ بیٹا تو نے برا نہیں مانا۔ اپنی اپنی پیدائشی سرزمین سے سب کو محبت ہوتی ہے۔"

لیکن محبت کا یہ مطلب نہیں کہ اپنے عیوب کو نظر انداز کر دیں۔

"میں نے کورو پنچال کا سفر کرتے وقت کئی بار غور کیا۔ یہاں کے بھی پنڈتوں سے مشورہ کیا۔ مجھے اس عیب کی ابتدا کا سبب تو معلوم ہو گیا لیکن اس کے دفع کرنے کا طریقہ نہیں معلوم ہوا۔

"اس کی کیا وجہ؟ آریہ بزرگ"۔

"اگرچہ پنچال قبیلہ کی سرزمین پنچالوں کی کہی جاتی ہے لیکن اس کے باشندوں میں آدھے بھی پنچال قبیلہ کے نہیں ہیں"

"نو وارد بہت ہیں"

"نو وارد نہیں بیٹا۔ قدیمی باشندے بہت ہیں۔ وہاں کے صنعت گروں کے طبقہ کے سوداگر وہاں کے غلام پنچال قبائل کے اس سرزمین پر قدم رکھنے کے بہت پہلے سے موجود تھے" ان کا رنگ کیسا ہے؟

"ہاں پنچال قبائل سے بہت ہی کالا سانولا یا تانبے کے رنگ کا۔ اور اہل پنچال کا رنگ مدروں کی طرح گورا ہوتا ہے"۔

"بہت کچھ"۔

ہاں بہت کچھ ہی۔ کیونکہ دوسرے رنگ کے لوگوں کے ساتھ مل جل جانے سے رنگ میں تبدیلی پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مدر کی طرح وہاں بھی آریہ زرد بال ہی والے بستے ہیں تو شاید انساں وہاں بھی دکھلائی پڑتے یا آریہ طرز کے اونچے نیچے کی تفریق سے زمانے کے لوگ اسو رکتے تھے ان میں پہلے ہی اونچ نیچ اور غلام آقا ہوتے تھے،

"ہاں لیکن پنچال آریہ ہی قبیلہ کے لوگ تھے ایک خون ایک ہی جسم سے پیدا ہوئے تھے پھر بھی ان میں اونچ نیچ کا دستور ویسا ہی پایا جاتا ہے پنچالوں کے بادشاہ دیو داس نے کچھ گھوڑے خریدے تھے۔ چنانچہ پتہ ایک دن اس کے سامنے گیا۔ وہ سڈول جسم اور قوی نوجوان تھا لیکن اس کے سر پر لال پیلی پگڑی بندھی، کمر پر زریں دو شالہ، بیٹھے کانوں پر بڑے بڑے چھلے۔ ہاتھوں اور گلوں میں کئی قسم کے زیور تھے یہ سب دیکھ کر مجھے اس سے ہمدردی معلوم ہوئی۔ چاند میں گہن لگ گیا ہو اس کے ساتھ اسکی بیوی بھی تھی جو حسن میں مدر کی حسین عورتوں سے کم نہ تھی، لیکن ان لال پیلی بوجھوں سے بیچاری جھکی جا رہی تھی۔

سوداس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنے جذبات کا اثر چہرے سے ظاہر کرنے کی پوری کوشش کی۔ لیکن ناکامیابی ہوتے دیکھ کر بدلنے کی غرض سے کہا۔ "پنچال بادشاہ نے گھوڑے خریدے تھے۔ آریہ بزرگ"؟

"ہاں خریدا اور اچھی قیمت بھی دی یاد نہیں کتنی اشرفیاں (اسرفیاں) لیکن وہاں یہ دیکھ کر بخار چڑھ رہا تھا کہ پنچال قبائل بھی اس کے روبرو گھٹنے ٹیک کر بندگی کرتے اور گڑگڑاتے ہیں۔ مر جانے پر بھی کوئی مدر ایسا نہیں کر سکتا تھا بیٹا"۔

"مجھے تو ایسا نہیں کرنا پڑا آریہ بزرگ"

"اگر مجھ سے ایسا کہا جاتا تو میں تو لڑ سکتا۔ پورب والے بادشاہ ملو ویسا کرنے کو نہیں کہتے۔ یہ ہمیشہ سے دستور رہا ہے۔

"کیوں اس کا سبب"

"تم سبب پوچھتے ہو بیٹا۔ اس کا بڑا قصہ ہے۔ جب مغرب سے آگے بڑھتے بڑھتے پنچال قبائل گنگا جمنا اور ہمالیہ کے بیچ (شمالی اور جنوبی علاقوں کے پنچالوں) کے سرزمین میں گئے تو وہ بالکل مدروں کی طرح ایک خاندان ایک برادری کی طرح رہتے تھے۔ اہل اسورسے میل جول بڑھنے پر ان کی دیکھا دیکھی ان آریہ پنچالوں میں سے کچھ سردار راجہ اور پروہت بننے کے خواب دیکھنے لگے۔

"کیوں ایسا کیوں ہوا"

لالچ کی وجہ سے بغیر محنت کے دوسرے کی کمائی کھانے کیلئے بادشاہوں اور پروہتوں نے پنچالوں میں اونچے نیچے طبقوں کی تفریق پیدا کی۔ شخص انسان نہ رہنے دیا" یہ کہتے کہتے جیتا کسی کام کیلئے اٹھ گیا۔

مدر پور (سیال کوٹ) میں جیتا کے قبیلہ میں رہتے ہوئے سوداس کو چار سال گذر گئے تھے۔ جیتا کی بیوی مر چکی تھی اس کی بیاہی بیٹوں اور بیٹیوں میں وہ ایک برابر اس کے گھر میں رہتی تھیں لیکن گھر کے مستقل رہنے والے صرف جیتا سوداس اور اپالا ہی تھے اپالا اب بیس سال کی ہو رہی تھی۔ ان کے اطوار سے پتہ لگتا تھا کہ اپالا سوداس میں باہمی محبت ہے۔ اپالا مدر پور کی حسینوں میں گنی جاتی تھی اور وہاں خوبصورت نوجوان لڑکیوں کی کمی نہ تھی اس طرح سوداس جیسے خوبصورت نوجوان کیلئے بھی وہاں خوبصورت لڑکیوں کی کمی نہ تھی لیکن لوگوں نے ہمیشہ سوداس کی اپالا اپالا کو سودا

کے ہی ساتھ ناچتے دیکھا۔ جیتا کو بھی اس کا علم تھا۔ اور وہ اسے پسند بھی کرتا۔ اگر سوداس مدرپور میں رہنے کے لئے تیار ہو جاتا۔ لیکن سوداس اکثر اوقات اپنے والدین کے لئے پریشان و فکرمند ہو جاتا تھا جیتا جانتا تھا کہ سوداس اپنے ماں باپ کا اکیلا بیٹا ہے۔

ایک دن ایالا اور سوداس پہیلیوں کی ندی چناب میں نہانے گئے تھے۔ نہاتے وقت کئی بار سوداس نے ایالا کے ننگے سرخ و سفید جسم کو دیکھا تھا۔ لیکن آج پچاسوں ننگی حبشی عورتوں کے درمیان اس کے حسن کے موازنہ کرنے کا اس کو موقع ملا۔ اور آج ہی اس کو ایالا کے بےمثل حسن کا احساس ہوا۔ راستے میں لوٹتے وقت اسے خاموش دیکھ کر ایالا نے کہا: "سوداس آج تم خاموش کیوں ہو۔ کیا زیادہ تھک گئے ہو چناب کی دھار کو دو مرتبہ پار کرنا بھی کم ہمت کی بات نہیں ہے۔ ضرور تم تھک گئے ہو۔"

"تم بھی تو ایالا آر پار تیر گئی تھیں۔ میں تو دو مرتبہ کیا موقع پڑے تو دس مرتبہ بھی چناب جیسی دریا کو پار کر سکتا ہوں۔"

"باہر نکلنے پر میں نے دیکھا تمہارے بازو اور سینے کے پٹھے کس قدر پھول گئے تھے۔ تمہارے بازو اور جانگھوں کے پٹھے کتنے موٹے ہو گئے تھے"

"تیرنا بھی بڑی ورزش ہے۔ یہ جسم کو مضبوط اور خوبصورت بناتا ہے لیکن تمہارے حسن میں اس سے بھلا کیا اضافہ ہو سکتا ہے۔ جب کہ تم یوں ہی دنیا کی تمام حسینوں سے حسین تر ہو۔"

"اپنی نظر کے لحاظ سے کہتے ہو نہ سوداس۔"

"ہاں۔ لیکن خوشامد سے نہیں۔ ایالا تم جانتی ہو۔"

"ہاں کبھی تم نے بوسہ تک نہیں مجھ سے مانگا۔ اگرچہ مدر کی دوشیزہ اس معاملہ میں بہت فیاض ہوتی ہے۔"

"بغیر مانگے بھی تو تم نے اسے دینے کا ارادہ کیا ہے۔"

"لیکن صرف اس وقت جبکہ میں تجھ میں بحالہ شریت تیرا کو دیکھا کرتی تھی۔"

"اور کیا اب نہ دو گی۔"

"مانگنے پر بوسہ کیوں نہ دونگی۔"

"اور مانگنے پر تم میری........"

"کہ سوداس انکار کرنے پر مجھے تکلیف ہو گی۔"

"لیکن تکلیف کا موقع نہ آنے دینا بھی تو تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

"نہیں بلکہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

"یہ کیونکر۔"

"کیا تم ہمیشہ کیلئے میرے باپ کے گھر میں رہنے کو تیار ہو۔"

سوداس کو کئی بار ان نازک ہونٹوں سے ان کڑوے الفاظ کے نکلنے کا ڈر تھا۔ آج آخرکار بجلی کی طرح یکایک وہ اس کے کانوں کو چھید تے ہوئے دل پر جا لگے۔ کچھ دیر کیلئے اس کے ہوش و حواس گم ہو گئے لیکن اس کو یہ گوارا نہ تھا کہ ایالا کو اس کے دل کا حال معلوم ہو جائے۔ لمحہ بھر کے بعد اس نے اپنے دل کو مضبوط کر کے کہا "میں تجھ سے کتنا پریم کرتا ہوں ایالا۔"

"یہ میں جانتی ہوں اور میرے متعلق بھی تمہیں معلوم ہے میں ہمیشہ کے لئے تمہاری ہو جانا چاہتی ہوں۔ والد بھی اسی سے خوش ہوں گے۔ لیکن تمہیں پھر ہمیشہ کیلئے پنچال کو چھوڑ دینا ہو گا۔"

"پنچال کو چھوڑ دینا مشکل نہیں ہے۔ وہاں میرے ضعیف والدین رہتے ہیں۔ میرے سوائے انکی دوسری اولاد نہیں ہے ماں نے مجھ سے قول لیا ہے کہ مرنے کے پہلے میں ان کو ایک مرتبہ ضرور دیکھوں۔"

"میں اس قول کو تڑوانا نہیں چاہتی۔ میں تم سے ہمیشہ محبت کرونگی سوداس تمہارے چلے جانے پر بھی۔ میں جانتی ہوں کہ تمہارے چلے جانے کے بعد میں تمہارے لئے تمام زندگی رویا کروں گی۔ لیکن ہمیں وہ قول نہ توڑنا چاہیئے۔ تمھیں اپنی ماں کے قول کو اور مجھے اپنے دل کے قول کو۔"

"تمہارا دل کا قول کیا ہے ایالا۔"

"کہ میں انسانوں کی دنیا سے وحشیوں کی دنیا میں نہ جاؤں گی۔"

"پنچالوں کی سرزمین وحشیوں کی دنیا ہے۔"

"ہاں جہاں انسان کی وقعت و قیمت نہیں۔ عورتوں کو آزادی نہیں وہ اور کیا ہے۔"

"میں بھی تم سے اتفاق کرتا ہوں۔"

"اس کے انعام میں میں تمہیں بوسہ دیتی ہوں۔ کہتے ہوئے آنسوؤں سے تر رخساروں کو ایالا نے سوداس کے ہونٹوں پر رکھ دیا سوداس کے بوسہ لینے کے بعد اس نے کہا۔ تم جا کر ایک مرتبہ ماں کو دیکھ آؤ۔ میں مدرپور میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

سوداس اپنی ماں سے بہت محبت کرتا تھا۔ سوداس کا باپ دیوداس بڑا باعظمت بادشاہ تھا جسکی تعریف ہی وشسٹھ وشوامتر اور بھاردواج جیسے بڑے رشیوں نے منتر پہ منتر بنائے۔ لیکن اس کھلم کھلا خوشامد کو رگ وید میں جمع کر دینے سے انکی چاپلوسی چھپ نہیں سکتی۔ سوداس کی محبت صرف ماں کیلئے تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اسکی طرح بہت سی بیویاں اور لونڈیاں دیوداس کے پاس ہیں۔ وہ اس کے سب سے بڑے لڑکے اور پنچال کے تخت کے وارث کی ماں ہے۔ اس وجہ سے وہ تھوڑا بہت خیال اس کا چاہے کرے بھی لیکن دیوداس ان نوجوان خوبصورت لڑکیوں کے مقابلے میں جن سے اس کا زنانخانہ بھرا ہوا تھا اسکی ماں سے جس کے منھ میں دانت تک نہ رہ گئے تھے کیوں محبت کرنے لگا تھا۔ ماں کا اکلوتا بیٹا ہونے پر بھی وہ باپ کا اکلوتا لڑکا نہ تھا اسکی عدم موجودگی میں پرتردن دیوداس کا وارث ہوتا۔

کئی سال گذر جانے کی وجہ سے ماں لڑکے کی طرف سے مایوس ہوگئی تھی اور روتے روتے اس کی آنکھوں کی بینائی بھی کم ہوگئی تھی۔ سوداس ایک دن بغیر پہلے اطلاع دیئے اور بغیر باپ سے ملے ہوئے ماں کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا۔ کمزور بینائی والی آنکھوں سے اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ کر سوداس نے کہا۔ "میں ہوں تیرا سوداس"

"اس کی آنکھیں یکایک چمک اٹھیں" پھر بھی اپنی جگہ سے بغیر ہلے اس نے کہا "اگر تو در اصل میرا سوداس ہے تو غائب ہونے کیلئے وہاں کیوں کھڑا ہے۔ کیوں نہیں میرے گلے سے لگ جاتا۔ کیوں نہیں اپنے سر کو میری گود میں رکھ دیتا"

سوداس نے اپنے سر کو ماں کی گود میں رکھ دیا۔ ماں نے ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا وہ ہوا میں غائب ہونے والا نہیں بلکہ ٹھوس سر تھا۔ اس نے اس کے منھ گال پیشانی اور بالوں کو بار بار چھوکر آنسوؤں سے تر کر دیا کئی بار گلے لگایا۔ ماں کے آنسوؤں کی قطار بند نہ ہوتے دیکھکر سوداس نے کہا "ماں اب تو میں تیرے پاس آگیا ہوں اب کیوں روتی ہے"

"آج ہی دن بھر کیلئے بیٹا۔ آج گھڑی بھر کیلئے بیٹا۔ یہ آخری آنسو ہیں سوداس میری آنکھوں کے تارے"

آخرکار یہ خبر بادشاہ تک پہنچی۔ وہ دوڑا ہوا آیا اور سوداس کو گلے لگاکر خوشی کے آنسو بہانے لگا۔

دن گذرتے گذرتے مہینے اور اسی طرح دو سال بیت گئے۔ والدین کے سامنے سوداس اپنے چہرے پر خوشی کا اظہار کرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن تنہائی میں اس کے کانوں میں جدائی کے وقت کے اپالا کے وہ الفاظ گونجتے تھے "میں تیرے لئے مدرپور میں انتظار کرونگی" اور سامنے وہی ہلتے ہوئے لال لبوں کا نقشہ آجاتا۔ جو اس وقت تک اس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوا تھا۔ جبتک آنسوؤں سے اسکی آنکھیں دھندلی نہ ہوجاتیں۔ سوداس کی نظروں میں دو محبتیں تھیں۔ ایک طرف اپالا کی مد کشش محبت اور دوسری طرف ضعیف ماں کا نازک بھرا دل۔ ماں کے بیکس دل کو توڑنا اسے یکلخت کمینہ پن اور خود غرضی معلوم ہوئی۔ اس لئے اس نے ماں کے جیتے جی پنچال نہ چھوڑنے کا پکا ارادہ کرلیا۔ لیکن سلطنت کے وارث کی حیثیت سے حکومت کے عیش و آرام کو قبول کرنا اسے اپنے بس کے باہر کی بات معلوم ہوتی تھی۔ باپ کے سامنے وہ ہمیشہ ادب کرتا اور اس کے احکام کی تعمیل میں مستعدی دکھاتا تھا۔

ضعیف دیوداس نے ایک دن بیٹے سے کہا۔ بیٹا سوداس میں زندگی کی آخری منزل پر پہنچ گیا ہوں۔ میرے لئے پنچال کا بار اٹھانا اب ممکن نہیں ہے"

"تو آریہ۔ کیوں نہ یہ بار پنچالوں ہی کو دیدیا جائے۔

"پنچالوں کو بیٹا۔ تیرا اشارہ میں نہیں سمجھا۔

"آخر آریہ یہ راج پنچالوں ہی کا تو ہے۔ ہمارے گذرے ہوئے پنچال ان کے بزرگ تھے۔ اس وقت پنچال کا کوئی بادشاہ نہ تھا۔ پنچال کے قبیلہ والوں ہی کے سپرد تمام پنچال کا انتظام تھا جس طرح آج کل مدر اور گندھار میں وہاں کے اہل قبائل کرتے ہیں۔ پھر ہمارے دادا مدشو کے کسی گذرے ہوئے بزرگ کو لالچ یعنی عیش و آرام کی طمع دوسروں کی محنت کے کمائی کے تصرف کی لالچ ہوئی۔ وہ سردار قبیلہ یا سردار فوج کے عہدے پر رہا ہوگا۔ اور قبیلہ کی کسی جنگ میں فتح پاکر اہل قبائل کے دل میں ہر دلعزیز بن گیا ہوگا جس کی طاقت کے بھروسہ نے اہل قبیلہ کو فریب دیا۔ اہل قبیلہ کا نظام ہٹاکر اس نے اہل رسور کی طرح بادشاہ کی حکومت قائم کی۔ اہل رسور کی طرح وشسٹھ وشوامتر کے کسی معزز بزرگ کو رشوت دیکر اپنی طرف ملانے کے لئے پروہت کا عہدہ دیا۔ جس نے اہل قبیلہ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کہنا شروع کیا

رگ وید - ۳ - ۲۶ - ۲ - ۲۵ -

کراندر، آتش، سوم، ورون، وشنو دیو نے اس بادشاہ کو تمہارے اوپر حکومت کرنے اور تمہارے نظام چلانے کیلئے بھیجا ہے، اس کے احکام کی تعمیل کرو اس پر محصول عائد کرو۔ یہ سراسر بے ایمانی تھی بلکہ چوری تھا پتا جس سے اختیارات ملے اسی کے نام تک کو بھول جانا اس کے لئے شکریہ کا ایک لفظ بھی زبان پر نہ لانا۔"

"نہیں بیٹا۔ وشنو (پاڑسے) قبیلہ کو ہم اپنا راجہ بنانیوالا قبول کرتے ہیں تخت نشینی میں عہد کرنے کے وقت وہی ہمیں عصائے شاہی یعنی کا ڈنڈا دیتے ہیں"۔

"اب تخت نشینی کا عہد تماشہ جیسا ہے لیکن دراصل کیا قبیلہ کے بادشاہ میں آقا ہیں۔ نہیں یہ تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بادشاہ اپنے قبیلہ کے درمیان برابری سے بیٹھ نہیں سکتا۔ اس سے غلا ملا نہیں رکھنا کیا مدر یا گندھار کے قبائل کا سردار ایسا کر سکتا ہے"

"یہاں اگر ہم ویسا کریں تو کسی دن بھی دشمن ہمیں مار دیگا یا زہر دے گا۔"

"یہ خوف بھی صرف چور یا غاصب ہی کو ہو سکتا ہے۔ قبیلہ کے سردار چور یا غاصب نہیں ہوتے۔ وہ درحقیقت اپنے کو قبیلہ کا ایک فرد سمجھتے ہیں ویسا ہی برتاؤ بھی کرتے ہیں۔ اس لئے ان کو ڈر نہیں۔ بادشاہ چور ہے اور قبیلہ کے اختیار کو غصب کر لینے والا ہے۔ اس لئے ان کو ہر وقت خوف رہتا ہے۔ بادشاہوں کا زنان خانہ۔ انکی سونے چاندی کی چیزیں ان کے غلام اور لونڈیاں، ان کا تمام عیش و آرام ان کی محنت کا کمایا ہوا نہیں ہوتا۔ یہ سب غصب کر کے اکٹھا کیا گیا ہے۔

"بیٹا۔ اس کے لئے تم مجھے مجرم ٹھہراتے ہو؟"

"قطعی نہیں آریہ۔ تمہاری جگہ لینے پر خواہ میں چاہوں یا نہ چاہوں مجھے بھی ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ میں اپنے والد دیوداس کو اس کا مجرم قرار نہیں دیتا"

"تم حکومت کو اہل قبیلہ کو لوٹا دینے کا مشورہ دیتے ہو کیا یہ ممکن ہے تمہیں سمجھنا چاہئے بیٹا قبیلہ کے کھانے پینے کا غاصب صرف پنچال کا بادشاہ دیوداس ہی نہیں ہے۔ بلکہ وہ مختلف غاصبوں اور چوروں میں سے ایک ہے۔ وہ سب سے بڑا ضرور ہے لیکن انکی مشترکہ قوت کے سامنے ہیچ ہے۔ کئی ملکی سردار، شہزادے (شاہی خاندان) اکثر افراد اور سالانہ فوج کے ساتھ ساتھ سب سے بڑا سردار تو پروہت ہے۔"

"ہاں میں تو پروہت کی طاقت کو جانتا ہوں۔ چھوٹے شہزادے بادشاہ تو بن نہیں سکتے۔ اسی لئے وہ پروہت (برہمن) بن جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں میرا چھوٹا بھائی پرتردن بھی ویسا ہی کریگا۔ ابھی راجا اور پروہت میں صرف اتنا فرق ہے کہ ایک تخت کا مالک ہے دوسرا یگیہ اور پوجا کا۔ لیکن کیا معلوم آگے چل کر چھتری، برہمن دو الگ الگ قومیں دو الگ الگ طبقہ بن جائے۔ قندھار میں تلوار اور منتر دا آگ میں گھی ڈالنے کا چمچہ دونوں کو ایک ہی ہاتھ سنبھال سکتا ہے۔ لیکن پنچال پور میں مذہبی رہنمائی وشوامتر کے ہاتھ میں ہوگی۔ اور حکومت اور جنگی رہنمائی دیوداس کے ہاتھ میں۔ قبیلہ کی تقسیم یہاں صرف تین طبقوں میں ہوئی ہے۔ سردار کی وجہ سے یا قبیلہ کی دولت غصب کرنے کی وجہ سے۔ یا معزز ماں باپ کی اولاد ہونے کی وجہ سے۔ بادشاہ اور پروہت ایک ہی ہیں لیکن دونوں کے نام چھتری اور برہمن ہو کر ابھی سے الگ الگ شمار کئے جانے لگے ہیں اور دونوں کے اقتدار میں بھی ٹکر لگنے لگی ہے۔ اسی لئے برہمن چھتری کی قوتوں کو ملا دینے اور ان میں اشتراک پیدا کرا دینے کی بڑی کوشش کی جا رہی ہے قبیلہ کے ان دو طبقوں کے علاوہ قبیلہ میں دوسرے افراد کی بھی ایک بڑی تعداد ہے۔ جو تیسرا طبقہ ہے۔ آج اس معزز طبقہ کا نام بدل کر اسے رعایا کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے۔ کیسی بے انصافی ہے جو کہ ابتدا میں قبیلہ کی ابتدا ہوئی تھی آج اس کو رعایا اور دوسروں سے کمتر شمار کیا جاتا ہے اے بزرگ کیا یہ سراسر بے انصافی نہیں ہے۔

"اور بیٹا! تم نے ایک بہت بڑی تعداد والے طبقے کو شمار نہیں کیا"

"ہاں آریوں سے مختلف رعایا یعنی کاریگر، صنعت گر، سوداگر غلام اور لونڈیاں شاید انہیں کی وجہ سے سردار قبیلہ کے اختیارات غصب کر لینے میں سردار کامیاب ہوئے۔ اپنے محکوم قبیلے کو اپنی ہی طرح کسی کے ذریعہ دوسرے کا دست نگر ہوتا دیکھ کر آریوں کی تمام رعایا کو اطمینان حاصل ہوا۔ اسی کو راجہ نے اپنا انصاف کہا۔ "شاید بیٹا تو غلطی نہیں کر رہا ہے، لیکن یہ تو بتا حکومت کی باگ ڈور کس کو سونپا جائے، چوروں، غاصبوں اور سوداگروں کے علاوہ آریہ قبائل میں آریہ اور غیر آریہ رعایا کی بہت بڑی تعداد ہے۔ کیا وہ راج سنبھال سکیں گے، اور ادھر مذہبی رہنما اور حکومت کے کارندے میرے ہٹتے ہی رعایا کو نوچ کھانے کے لئے تیار ہیں۔

کورو پنچال میں اہل قبیلہ کے ہاتھ سے عنان حکومت چھنے صرف چھ یا سات پشتیں گذری ہیں اس لئے ہم قبیلہ کے ان پچھلے دنوں کو بھولتے نہیں ہیں اس وقت اس سرزمین کو دیوداس کی سلطنت نہیں لکہ پنچالہ رساعے پنچال والے کہتے اور سمجھتے تھے۔ لیکن آج مجھے اس پرانے دستور و نظام پر واپس لوٹنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں پڑتا۔"

"ہاں راستہ میں یہ وششٹھ وشوامتر جیسے مخالف دشمن جو بیٹھے ہوئے ہیں" اور ہم مجبور رہیں نہ مانے نوپٹ نہیں سکتے۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم کل کہاں ہونگے۔ مجھے نہایت خوشی ہے کہ مجھے سوداس جیسا بیٹا ملا ہے۔ میں بھی کبھی جوان تھا۔ میری جوانی کے دور میں وششٹھ اور وشوامتر کی نظموں اور ان کے ساتھیوں کے دل کو ایمان کو فتح کر لینے والے جھوٹ کے متعدد رہتے تھے۔ میں سوچا کرتا تھا کہ بادشاہ کی اس ترابی کو کم کردوں۔ اپنے کو ایسا کرنے کے قابل نہ پایا بلکہ پرانے رواج کی تقلید کیلئے مجبور رہا۔ اس وقت میرے لئے تیری ماں بھی سب کچھ تھی۔ جب میں اپنے نفس سے مغلوب مفتوح ہوگیا تو خواہشات غالب آئیں تو ان پروہتوں نے نہ صرف اپنی نظموں بلکہ عورتوں کے پھندے میں بھی مجھے پھنسایا۔ اور رانی کو لونڈیوں کی مثال دیکر سینکڑوں لونڈیوں سے میرا زنان خانہ بھر دیا۔ دیوداس کی اس شکست سے سبق حاصل کر کے تم ہوشیار رہنا ایسی کوئی صورت ہوسکے تو نکالو کہ جس سے بادشاہ کی ترابی اور ظلم دجبر معدوم ہو جائے۔ لیکن سوداس جیسے نرم دل قزاق کو ہٹا کر پرتردن جیسے سنگ دل ظالم و قزاق کے ہاتھ پنچال کو دینا اچھا نہ ہوگا بیٹا۔ میں تیری کوششوں اور تنظیم کی دنیا (عقبیٰ) میں بڑے اطمینان سے دیکھتا رہوں گا۔

دیوداس اپنے بزرگوں کی دنیا کو چلا گیا (فوت ہوگیا) سوداس اب اس پنچال کا بادشاہ ہوگیا تھا ایشیوں کی ... اس کے گرد ... ہے سوداس کو اب معلوم ہوا کہ اندر۔ ورن، سوم آنی سوم کے نام سے ان سفید ڈاڑھی والوں نے لوگوں کو کتنا اندھا بنایا ہے۔ اس کے شکنجے میں سوداس اپنے کو جکڑا ہوا پاتا ہے جب کہ نئے بھی وہ کچھ کرنا چاہتا ہے۔ وہ لوگ اس کے مطلب کو الٹا سمجھنے کیلئے اور اسے مذہب کا مخالف قرار دینے کیلئے تیار رہتے ہیں۔ سوداس کو ... وہ دن یاد آنے لگے جب وہ ننگے پیر پھٹے کپڑوں کے ساتھ اجنبی دیسوں میں گھومتا پھرتا تھا۔ اس وقت وہ زیادہ آزاد اور بے فکر تھا۔ سوداس کے دل کی حالت کو سمجھنے والا اس کی رائے سے اتفاق کرنے یا اس سے ہمدردی جتانے والا وہاں ایک بھی آدمی نہ تھا۔ پروہت اور رشی اس کے پاس اپنی پوتیاں اور پرپوتیاں بھیجتے تھے۔ اور سلطنت کے مختلف علاقوں کے سردار بھی اپنی لڑکیوں دختروں کو لیکن سوداس اپنے کو ایسے گھر میں بیٹھا پاتا تھا جس میں چاروں طرف آگ لگی ہو۔ سوداس چناب کے کنارے عہد و پیمان کرتی ہوئی ان نیلگوں آنکھوں کو بھول نہ سکتا تھا۔ سوداس نے اب تمام اہل قبیلہ خواہ وہ آریہ ہوں یا غیر آریہ کی خدمت کرنے کی ٹھان لی۔ لیکن اس کے لئے دیوتاؤں کی دلدل میں پھنسے ہوئے لوگوں کو پہلے یہ یقین دلانا تھا کہ سوداس پر دیوتاؤں کی مہربانی ہے اور دیوتاؤں کی مہربانی ہونے کا ثبوت اس کے پاس اس کے علاوہ کچھ نہ تھا کہ رشی اور برہمن اس کی تعریف کریں۔ آخرکار خوشنودی حاصل کرنے کیلئے انھیں سونا، چاندی، جانور، غلہ غلام اور لونڈیوں کا تحفہ دینے کے علاوہ اسے کوئی راستہ نہ سوجھا۔ گائے کے دودھ پیتے بچے کے گوشت اور شیریں سوم اس نے پیٹ بھلائے۔ ان رشیوں کی راہ میں وہ اب سب سے بڑا خیرات دینے والا گردانا گیا۔ ان چٹورے رشیوں کا سوداس کے حق میں یہ فیصلہ کہ وہ بڑا ہی خیرات دینے والا تھا۔ اگر رگ وید کی نظموں میں جگہ جگہ پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ کسی کو معلوم ہے کہ سوداس ان نظموں کو جن میں اس کے گن گائے گئے ہیں اور ان کے کہنے والوں کو کتنی حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔

سوداس کی نیک نامی اور تعریف کے گانے تمام شمالی پنچال روہلکھنڈ ہی میں نہیں بلکہ دور دور تک گائے جاتے تھے۔ اپنی عیش و آرام سے خالی زندگی میں جہاں تک اس سے ہوسکتا تھا۔ وہ عوام کے بہبود کی کوشش کرتا تھا۔

باپ کے مرنے کے کئی سال بعد سوداس کی ماں نے انتقال کیا برسوں سے جو زخم سرسری طور پر بھتا رہا تھا اگرچہ اس کا عادی ہو چکا تھا لیکن اب معلوم ہوا کہ وہ ناسور بن گیا ہے، اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر وقت اپالا اس کے سامنے کھڑی ہے اور آنسو بھری آنکھوں اور کانپتے لبوں سے کہہ رہی ہے "میں تیرے لئے مدر پور میں انتظار کروں گی" اس آتشیں کیفیت کی سوزش کو سوداس کی آنسوؤں سے بجھا نہیں سکتا تھا۔ ہمالیہ میں تپسیا کرنے کا ارادہ کر

تبصرے :

مقالات جمال الدین افغانی

مترجمہ سید سار زالدین فعت ایم اے (عثمانیہ) قیمت حصہ اول تین روپئے آٹھ آنے اور قسم دوم دو روپئے آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ دارالاشاعت سیاسیہ اشاعت منزل اردو گلی حیدرآباد دکن حجم دو سو بہتر صفحات۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت عمدہ

زیر بحث تصنیف علامہ جمال الدین افغانی کے اکیس مقالوں کا مجموعہ ہے جس کے موضوعات مختلف سیاسی، سماجیاتی اور تعلیمی موضوعات ہیں۔ شروع میں مترجم صاحب کے دیباچے کے علاوہ جناب قاضی عبدالغفار صاحب کا مقدمہ بھی ہے۔ اور آخر میں علامہ جمال الدین افغانی کے چار خطوط شامل ہیں۔

جمال الدین افغانی ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۹۷ء میں انتقال فرما گئے۔ یہ عہد نہ صرف اسلامی ممالک بلکہ پورے ایشیا اور افریقہ کے لیے ابتلا کا دور کہا جا سکتا ہے اسی لئے کہ اسی زمانہ میں یورپ کے سامراجی ملکوں نے ایشیا اور افریقہ کے تمام ملکوں کو آپس میں تقسیم کرکے یا تو اُن پر پورا قبضہ جما لیا یا کم سے کم اُنکی معاشی اور تجارتی زندگی کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ ممالک اسلامیہ مخصوص طور پر ایک دوہری گرفت میں مبتلا تھے۔ ایک طرف تو فرانس اور برطانیہ کی تجارتی اور صنعتی سرمایہ داری ممالک اسلامیہ کی طرف اپنا خوفناک ہاتھ بڑھا رہے تھے اور ہر وقت اُن کی سیاسی خودمختاری معرض خطر میں تھی اور دوسری طرف رجعت پرست سلطنت عثمانیہ کا بے ڈول اور بے روح فیوڈل نظام زبردستی اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ عثمانی سلاطین کی سیاسی رجعت پرستی اور ترقی دشمنی کے تحت اسلامی ملکوں کے عوام بڑھتے اور پھیلتے ہوئے یوروپین سامراج کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھے۔ جمال الدین افغانی کا سیاسی اور فلسفیانہ تصور یوروپین سامراج اور اسلامی ممالک کے اسی تصادم کی ایک فطری پیداوار ہے یہ بالکل لازمی تھا کہ یوروپین سامراج کے خلاف ان کے اندر جو ردّ عمل ہوا اُس نے مذہبی اور دینی شکل اختیار کی جیسا کہ مشرق کے بیشتر فلسفیوں کے یہاں ہوا۔ مثلاً اقبال اور گاندھی چنانچہ جمال الدین افغانی کا پان اسلامسٹ ہو جانا کوئی حیرت کی بات نہیں اس لحاظ سے دیکھا جائے تو جمال الدین کا یورپ کے تمدن اور سیاست کے خلاف ردّ عمل بالکل فطری نوعیت رکھتا ہے اور اسے مشرق کے ایک ایسے سیاسی مفکر کی حیثیت دی جا سکتی ہے جس نے اسلامی مشرق کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ یہ ... کے سامنے جو علاج پیش کیا یقینی وہ بنیادی طور پر خامیوں اور کمزوریوں سے پر تھا۔ یوروپین سامراج کے خلاف کامیاب مدافعت صرف اسی حالت میں ہو سکتی تھی کہ سلطنت عثمانیہ کا نظام ختم ہو جاتا اور تمام اسلامی ممالک کو آزادی اور خودمختاری دیدی جاتی۔ لیکن جمال الدین افغانی ہمارے سامنے جو علاج پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ تمام اسلامی ممالک پان اسلامزم کے مصنوعی اور غیر فطری نظام کے غلام بنے رہیں۔ یہ بات اُن معاشی اور ذہنی حالات اور ماحول کے خلاف تھی جو یورپ کی تجارتی اور صنعتی سرمایہ داری کے تصادم سے مشرق قریب میں پیدا ہو گئے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ سماج کے خارجی تقاضے اور اسکی رفتار ہمیشہ فلسفیوں اور مفکرین کی خواہشات اور آرزوؤں سے آزاد رہی ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ حالات کو سمجھنے کی سعی کر سکتے ہیں یا اُن پر اثر انداز ہو سکتے ہیں ہم یکسر اُن کے رُخ کو نہیں بدل سکتے۔ چنانچہ وہی بات جو انیسویں صدی کے مشرق کے سیاسی مفکر جمال الدین افغانی کے ذہن میں نہیں آ سکتی تھی۔ آخر ۱۹۱۴ء ۱۹۱۸ء کی عالمگیر سامراجی جنگ کے نتیجہ کے طور پر ہو کر رہی یعنی ترکی کے مہتم بالشان سیاسی اور سماجی انقلاب کے بعد سلطنت عثمانیہ اور پان اسلامزم کی بھی آخری ہچکی نکل گئی اور ممالک اسلامیہ تاریخ کے فطری رحجان کے تحت تیزی کے ساتھ قومیت کے نصب العین کی طرف بڑھنے لگے۔

جمال الدین افغانی کے سلسلے میں یہ سوال بھی بہت اہم ہے کہ آیا اُسے محض سیاسی مصلح اور مفکر قرار دیا جائے یا سیاسی فلسفی بھی۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں باتوں میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ مثلاً ہم مصطفےٰ کمال کو سیاسی مصلح اور مفکر ضرور قرار دے سکتے ہیں لیکن روسو اور ہیگل کی طرح اسے سیاسی فلسفی نہیں قرار دے سکتے۔ جمال الدین افغانی کے مقالوں اور مضامین میں ہم ایک فلسفیانہ ماحول اور ایک فلسفیانہ انداز ضرور پاتے ہیں، ساتھ ہی وہ اپنے سیاسی معتقدات کو فلسفیانہ اساس دینے کی بھی کوشش کرتے ہیں پھر بھی انھیں اس لحاظ سے سیاسی فلسفی نہیں قرار دیا جا سکتا کہ اُن کے یہاں شروع سے آخر تک کوئی ایک ہی واضح، مستقل اور منطقی فلسفیانہ نظام" (Stoucture) نہیں پایا جاتا جیسا کہ کانٹ اور ہیگل یا اسپینوزا وغیرہ میں پایا جاتا ہے جمال الدین

افغانی کے پورے سیاسی افکار میں ایک ہی منطقی وحدت (Logical - wholeness) کا کہیں بھی پتہ نہیں۔ چنانچہ ہم زیادہ سے زیادہ انھیں سیاسی مصلح قرار دے سکتے ہیں اور بس۔

کتاب کا ترجمہ اچھا ہے۔ یہ مسرت کا مقام ہے کہ اردو میں اب خالص تخلیقی ادبیات کی بھرمار کے بعد سماجیاتی اور سیاسی ادب کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے اور مترجمین و مصنفین حضرات اس طرف توجہ کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ زیرِ نظر تصنیف اعلیٰ اور سنجیدہ حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ خریدی جائے گی۔

THE MIND OF MAHATMA GANDHI.

دی مائنڈ آف مہاتما گاندھی

مؤلفہ آر۔ کے پربھو اور یو۔ آر۔ راؤ۔ قیمت تین روپئے مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ایمن ہاؤس۔ لندن۔ ای۔ سی۔ ۴۔ ملنے کا پتہ ویسلی پریس اینڈ پبلشنگ ہاؤس میسور سٹی۔ حجم ایک سو نوّے صفحات۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت عمدہ۔ زرد رنگ کا گرد پوش دیدہ زیب ہے۔ کتاب مہادیو ڈیسائی مرحوم و مغفور کے نام سے معنون ہے اور شروع میں رادھا کرشنن کا پیش لفظ شامل ہے۔

کتاب میں بیتیس مختلف مسائل اور موضوعات پر گاندھی جی کی تحریروں کے اقتباس درج ہیں۔ کچھ اہم موضوعات یہ ہیں: حقیقت کیا ہے۔ حقیقت اور حُسن۔ عدم تشدد کا عقیدہ۔ عدم تشدد امن اور جنگ کی حالت میں۔ ستیاگرہ۔ ذاتی ملکیت کا نہ رکھنا۔ برہمچریہ۔ برتھ کنٹرول۔ طبقاتی جنگ جدوجہد۔ شیطانی تمدن۔ کیمونزم اور سوشلزم۔ قومیت اور بین الاقوامیت۔ ہندوستان کا مشن وغیرہ وغیرہ۔ انتخاب اور ترتیب کی خوبی یہ ہے کہ ان تمام اقتباسات کا مطالعہ کرنے کے بعد پڑھنے والے کے ذہن پر ایک مجموعی اثر پڑتا ہے اور اُس سے گاندھی جی کے فلسفۂ حیات کا ایک واضح نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ کتاب کی تیاری اور ترتیب میں بقول مولفین بارہ سال صرف ہوئے ہیں اس لئے کہ گاندھی جی کی بے شمار ادھر اُدھر پھیلی ہوئی اور بے ترتیب تحریروں کے صبر آزما اور گہرا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کتاب تدوین کی گئی ہے۔ بقول مصنفین اس کتاب کے مطالعہ کے بعد "عدم تشدد" قومی آزادی صنعت سازی اور برت وغیرہ سے متعلق گاندھی جی کے طرزِ عمل کی منطق زیادہ بہتر طور پر سمجھ میں آنے لگتی ہے۔

اس صدی کی ایک عظیم الشان ہستی کے خیالات اور ذہن کا واضح اندازہ لگانے کے لئے اس سے آسان اور کوئی تصنیف نہیں قرار دی جا سکتی۔ ضرورت ہے کہ اس کا ہندوستان کی ہر زبان میں ترجمہ کیا جائے۔

نرس کا کام

دنیا کا سب سے زیادہ معزز اور شریفانہ مشغلہ

نرسنگ یا تیمارداری انسانیت کی بہترین خدمت ہے۔ اِس فن میں ذہین اور ہوشیار عورتوں کے لئے قدرتی طور پر ایک کشش اور جاذبیت موجود ہے۔ اور مسلّمہ طور پر جنگ کی اصلی خدمت ہے۔ اے۔ این۔ ایس کی سفید پوش نرسیں لڑنے والے بہادروں ہی کی دیکھ بھال اور تیمارداری کرتی ہیں۔

اِس زمانے میں جبکہ عورتوں کا گھر میں بیکار پڑے رہنے کی نسبت کام کرنا باعزت سمجھا جاتا ہے، آپ کو بھی اِن قابلِ قدر خواتین میں شامل ہو جانا چاہیئے جو ہسپتالوں میں لوگوں کے دُکھ درد کو دُور کرنے میں مصروف ہیں۔

اے۔ این۔ ایس کی اعلیٰ درجے کی تربیت آپ میں ایسی لیاقت پیدا کر دیگی جو جنگ کے بعد ایک کامیاب اور خوشحال روزگار حاصل کرنے کے لئے نہایت مفید ہوگی۔ اگر آپ کے اِرادے اِس سے مختلف بھی ہوں تو تیمارداری کا یہ تجربہ سماجی فلاح و بہبود کے کاموں میں آپ کے لئے مفید ہوگا اور زندگی بھر کام آئے گا۔
اِس موقعے کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔

جنرل نرس یا عمومی صیغے کی شرح تنخواہ حسب ذیل ہے۔

(۱) غیر سند یافتہ نرسوں کے لئے مبلغ ۱۰۰ روپے سے ۱۲۶ روپے ماہوار تک۔

(۲) سند یافتہ نرسوں کے لئے ۱۲۵ روپے سے ۱۷۵ روپے ماہوار تک۔ دونوں کے لئے پوشش، خوراک اور ایندھن مفت۔

یہ ملازمت ۲۱ سے ۳۵ سال کے درمیان عمر کی ہر اُس عورت کو حاصل ہو سکتی ہے جو برطانوی حکومت یا کسی ہندوستانی ریاست کی رعیت ہو۔

سابقہ تجربہ یا سند ضروری نہیں مگر وہ عورتیں جو نرسنگ کا تجربہ رکھتی ہوں بہتر شرح تنخواہ پر بھرتی ہو سکتی ہیں۔

تمام اُمیدواروں کے لئے ضروری ہے کہ انگریزی روانی سے لکھ اور بول سکیں۔ درخواست کا فارم منگانے کے لئے انگریزی میں خط لکھیں۔

نرسوں کی اچھی طرح نگہداشت کی جاتی ہے۔ اور ہر صورت میں ہندوستان کے اندر ہی تعینات کی جائیں گی سوائے اُن کے جو سمندر پار جانے کے لئے خود اپنی خدمات خاص طور پر پیش کریں۔

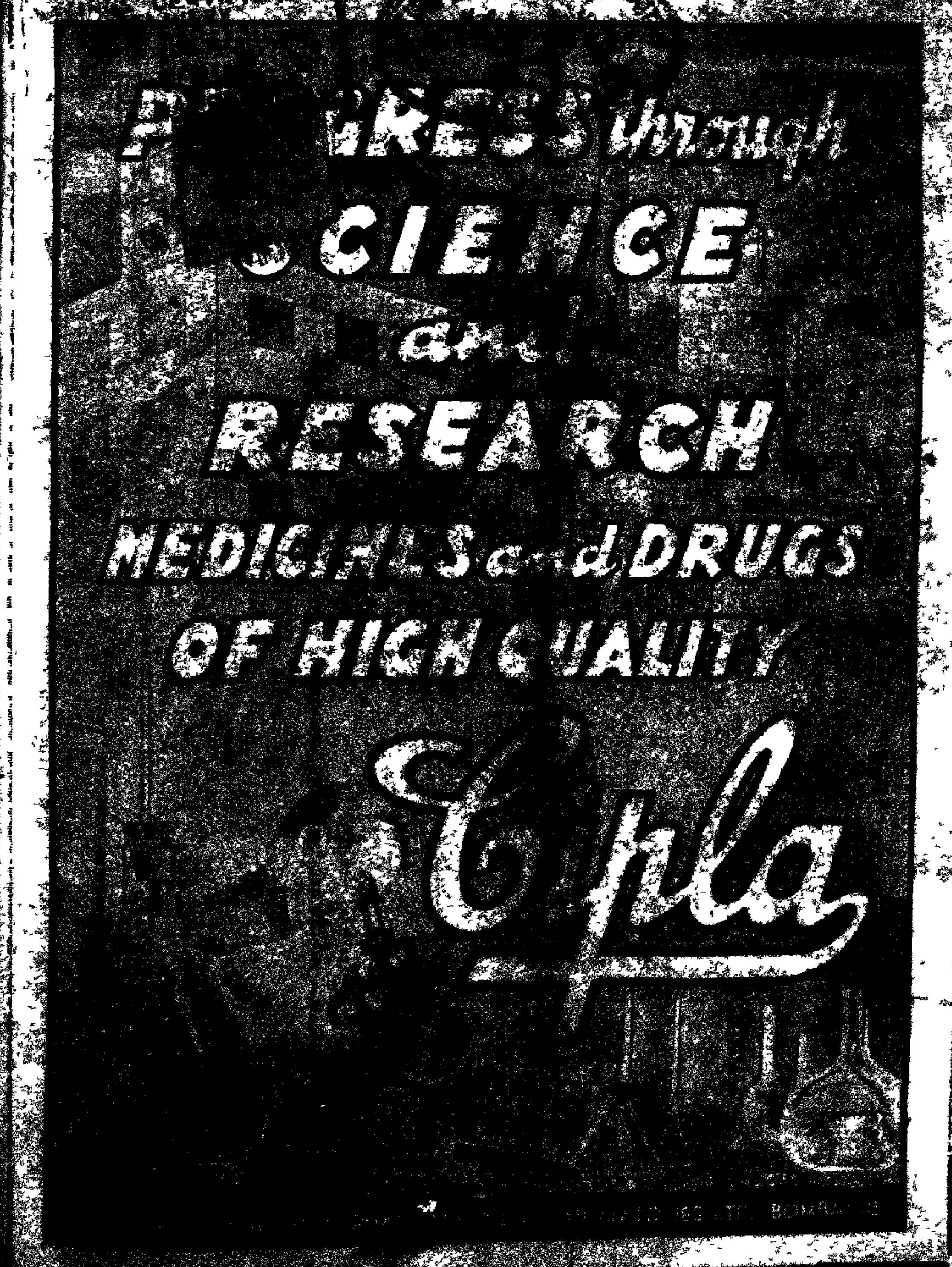
پوری تفصیلات کے لئے

آج ہی اپنے علاقے کی لیڈی سپرنٹنڈنٹ سینٹ جان ایمبولینس بریگیڈ، یا ڈائرکٹر جنرل انڈین میڈیکل سروس۔ نئی دہلی، کو لکھئے۔

AAA1198




کفایت شعاری کے گُر
اپنے وطن کی خاطر
اور اپنی خاطر
فوجوں کی مدد کرنے کے لئے آجکل ہم میں سے ہر شخص کو بہت سی چیزوں کے استعمال میں کمی کر دینی چاہیئے۔ آپ چیزیں کم صرف کریں تو یہ اُن لوگوں کے لئے زیادہ مقدار میں مہیا ہو سکیں گی جنہیں واقعی اِن کی شدید ضرورت ہے۔ آپ رفو کی ہوئی قمیص اور پیوند لگا ہوا جوتا پہن کر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ اِن دونوں سادگی پسندی اور خودداری، امن و ضعداری اور حبِ وطن کا ثبوت ہے۔
اس میں ایک فائدہ اور بھی ہے۔ پُرانی چیزوں سے کام چلانے اور ہر چیز کے استعمال میں کفایت برتنے کے معنی ہیں زائد بچت۔ یعنی جب قیمتیں گھٹیں گی تو آپ کے پاس خرچ کرنے کے لئے زیادہ روپے موجود ہوں گے۔
کفایت شعاری سے قلتوں کو دفع کیجئے
۱ تھوڑی دور جانا ہو تو پیدل یا سائیکل پر جائیے۔ ایک ایک آنے کی بچت کیجئے۔
۲ ٹوتھ پیسٹ احتیاط اور کفایت سے استعمال کیجئے۔ پرانے ٹیوب ردّی کے ذخیروں (سکریپ ڈپو) میں جمع کرا دیجئے۔
۳ لیمپ اچھی حالت میں رہے تو تیل کم خرچ ہوتا ہے۔
۴ دسترخوان پر کم کھانے چنئے۔
۵ پنسلیں، سیاہی، خط کے کاغذ اور اسٹیشنری کا دوسرا سامان احتیاط سے خرچ کیجئے۔
۶ نئے زیورات نہ خریدئیے۔ آپ کو اپنے روپے کا اچھا بدل نہیں ملتا۔
اشد ضرورت کے بغیر کچھ نہ خریدئیے


GRESS through
CIENCE
RESEARCH
MEDICINALS and DRUGS
OF HIGH QUALITY
Cipla


کفایت میں برکت ہے...
مرمّت کر کے کام چلائیے!
جب کبھی آپ سادگی اور کفایت سے کام لیں آپ کا روپیہ بچتا ہے۔ اِسی طرح روزانہ تھوڑی بہت کفایت برت کر آپ ہفتوں اور مہینوں میں کتنا کچھ بچا سکتے ہیں۔
آج کل جُزرسی سے کام لینا آپ کا فرض ہے۔ کیونکہ ضروری ساماں کی کمی ہے۔ اور آپ ضرورت سے زیادہ خریدیں تو غریبوں کو میسّر نہیں آسکتا۔ کفایت شعاری کو اپنا فرض سمجھ کر آپ اپنے مُلک کی مدد کریں گے اور خود بھی مالی فائدہ اُٹھائیں گے۔
کفایت شعاری سے قِلّتوں کو دفع کیجئے
پُرانی قمیصوں، پتلونوں، پاجاموں اور دھوتیوں وغیرہ کی مرمّت کرلیجئے۔
حتی الامکان نئے کپڑے نہ خریدیئے
پُرانے تولیوں، پلنگ کی چادروں اور میز پوشوں میں رفو کرکے
ان کی عمر بڑھائیے
پُرانے جوتوں کی مرمّت کرائیے۔
پھینک نہ دیجئے
بچّوں کے کپڑے ماں باپ کے پُرانے کپڑوں میں سے بنائے جاسکتے ہیں۔
دیکھئے بُرے نہیں لگتے
پُرانے ٹرنکوں، بکسوں اور بستر بندوں کی مرمّت کروائیے۔
نئے بہت مہنگے ہیں
نئی چھتری نہ خریدیئے۔
پُرانی درست کرا لیجئے
اشد ضرورت کے بغیر کچھ نہ خریدیئے

اردو زبان کا واحد کلچرل و سیاسی رسالہ

نئی زندگی الٰہ آباد

بانی :- ڈاکٹر سید محمود
ایڈیٹر :- سید انیس الرحمٰن
سرپرست :- ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید
جوائنٹ ایڈیٹر :- طفیل احمد خاں ایم-اے

جلد ۵ | ماہ جولائی سنہ ۴۵ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

۱	نٹشے کے فلسفہ کا انجام اور محمدؐ کا پیغام (نظم)	میر نور بخش ناز سیالکوٹی	۴
۲	فکر و نظر	ایڈیٹر	۵
۳	رفتار عالم	ادارہ	۱۳
۴	ہندوستانی پرچار کے طریقے	جعفر حسن بنجارا ہل حیدر آباد	۱۷
۵	مولانا سید احمد بریلوی	منظر رضوی	۲۳
۶	ہندوستان اور چین	آر-سی-مجمدار ایم-اے-پی-ایچ-ڈی	۲۸
۷	برطانیہ اور ہندوستان	پروفیسر ایچ-سی مکرجی ایم-اے	۳۲
۸	ہندوستان اور تبت کے تہذیبی تعلقات	ادارہ	۳۹
۹	برطانیہ پر ہندوستان کا ۱۵-ارب روپے کا قرضہ	مسٹر منو صوبیدار ممبر سنٹرل اسمبلی	۴۲
۱۰	ویول پلان پر اخبارات کی رائیں	ادارہ	۴۶
۱۱	چکبست اور قومی شاعری	ناظر کاکوری	۵۰
۱۲	بادشاہ کا خواب (افسانہ)	قدوس صہبائی	۵۴
۱۳	تبصرہ	ط-ا-خ	۵۹

سالانہ چندہ :- چھ روپے
ششماہی :- تین روپے ۸ آنے
فی پرچہ :- دس آنے

سید انیس الرحمٰن ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے اسرار کریمی پریس جانسین گنج الٰہ آباد میں چھپوا کر دفتر رسالہ نئی زندگی الٰہ آباد سے شائع کیا

نٹشے کے فلسفہ کا انجام

اور

محمدؐ کا پیغام

دنیا کے عناصر ٹکرائے انھیں پیچھے ہٹانا کیا جانیں — دل دل سے کیسے ملتا ہے۔ ہم صلح کرانا کیا جانیں
تہذیب کے رُخ سے رنگ اُڑا۔ تدبیر کی نبضیں چھوٹ گئیں — تقدیر نے بخشی بیہوشی۔ انھیں ہوش میں لانا کیا جانیں
قوت کے پجاری ڈوبے ہیں۔ خونِ جہاں کی موجوں میں — ان ظالم خونی حیوانوں کو۔ پار لگانا کیا جانیں
بارود کے شعلے پھونک رہے ہیں۔ باغِ جہاں کے غنچوں کو — نمرود کی آتش تیز ہوئی۔ اب اسکو بجھانا کیا جانیں
بیباک ہوس کی بجلی نے اک عالم کو ویران کیا — کلیوں کا بچانا کیا سمجھیں۔ پھولوں کا ہنسانا کیا جانیں
گرداب میں ہے تقدیرِ امم، سیلاب میں ہے، تعمیرِ امم — کس شان میں ہے تخریبِ امم تسخیرِ زمانا کیا جانیں
اک خوابِ پریشاں نٹشے کا دو عالم میں بدنام ہوا — اس شاعرِ برترِ انساں کا اسطرح گرانا کیا جانیں
زردشت فرنگی کا نغمہ کیوں دنیا کو مرغوب رہا — اس زہر کا اب تریاق کہاں یہ راز بتانا کیا جانیں
کس طرح خیالِ نو کرتا ہے۔ وعدہ برترِ انساں کا — اس لڑنے والے حیواں کو انسان بنانا کیا جانیں

پیغامِ محمدؐ اے ماثرؔ فانوس ہے۔ کالی راتوں کا
کس طرح اُجالا ہوتا ہے۔ ہم اسکو جلانا کیا جانیں

میر نور بخش ماثرؔ سیالکوٹی

نوٹ:۔ یہ نظم یورپ میں جنگ ختم ہونے سے پہلے کہی گئی تھی۔

فکرونظر

اداریہ

ہندوستان کا سیاسی جمود اور ویول اسکیم

۱۴ جون ۱۹۴۵ء کو وائسرائے ہند لارڈ ویول نے ہندوستان کے سیاسی جمود کو ختم کرنے سے متعلق اپنی تجاویز کا اعلان کیا، جس کا ہندوستان بڑی بے چینی سے منتظر تھا۔

قبل اس کے کہ ہم اس اسکیم پر بالتفصیل غور کریں، لارڈ ویول کی جد وجہد اور اخلاص کی داد نہ دینا بد انصافی ہوگی۔ لارڈ ویول کا لب ولہجہ اور طریق کار گذشتہ تمام برطانی مدبروں سے جداگانہ ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ برطانیہ اب خلوص نیت سے ہندوستان کے مسئلے کو حل کرنا چاہتا ہے اور ہماری باہمی مشکلات میں اضافہ نہیں بلکہ انکے حل کرنے میں امداد و اعانت کرنیکا خواہشمند ہے۔ غرضیکہ دو سو سال کی برطانی حکومت میں پہلی بار برطانوی اخلاص و ہمدردی کا ثبوت ملا ہے اور یہی سبب ہے کہ ملک کے ہر طبقے نے لارڈ ویول کی آواز پر لبیک کہا۔ اور اسی پُرخلوص جذبے کے تحت ہندوستان کی تمام جماعتیں لارڈ ویول کے مشن کو کامیاب بنانے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ یہ اسی اخلاص کا نتیجہ ہے کہ ہر صاحب بصیرت اس امر پر متفق ہوگا کہ گذشتہ دو ہفتوں کے اندر انگریزوں کے معاملے میں سارے ہندوستان کی فضا ہی بدلتی ہوئی نظر آتی ہے۔

بہرحال ہمیں یہاں یہ غور کرنا ہے کہ برطانی حکمت عملی میں یہ انقلاب کس طرح آیا اور ویول پلان کے محرکات کیا کیا ہیں۔

لارڈ ویول نے اپنے براڈکاسٹ میں اپنی نئی کانسل کے حسب ذیل مقاصد بیان کئے۔

(۱) جاپان کے خلاف پوری طاقت سے جنگ کرنا اور اسوقت تک کرتے رہنا جب تک جاپان کو مکمل طور پر شکست نہ ہو جائے۔

(۲) برطانی ہند کی حکومت کو، تعمیر مابعد از جنگ کے تمام فرائض کو مدنظر رکھتے ہوئے چلانا اور اسوقت تک چلانا جبتک کہ ہندوستان کا ایک مستقل دستور اتفاق آرا سے مرتب ہو کر جاری و نافذ نہ ہو جائے۔

(۳) وہ ذرائع دریافت کرنا، جس سے تمام جماعتوں میں اتفاق پیدا ہو جائے اور سبھوں کی رائے سے ایک متفقہ دستور ترتیب دینے کی تدابیر پیدا کرنا۔ لارڈ ویول نے اس آخری شق پر خاص طور پر زور دیتے ہوئے کہا کہ موجودہ اسکیم پیش کرنے کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ اسکے ذریعے ہندوستان ایک متفقہ اور مستقل دستور تک پہنچ جائے۔

لیکن ہمارے خیال میں مندرجہ بالا محرکات کے علاوہ اور بھی اسباب ہیں، جو اس پیشکش کا موجب ہوئے، لیکن لارڈ ویول ان اسباب کا اظہار کسی طرح اپنی زبان سے نہ کر سکتے تھے۔ برطانیہ کی موجودہ پیشکش تمامتر بین الاقوامی حالات پر منتج ہے اور اسکا سب سے اہم سبب روس کا خطرہ ہے۔ برطانیہ، روس کی روزافزوں طاقت اور مقبولیت سے قطعاً خوش نہیں اور اسکے ارادوں سے بالکل مطمئن نہیں۔ یہی سبب ہے کہ برطانیہ ہندوستان کو مضبوط بنانا چاہتا ہے اور اسے اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کا خواہشمند ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ آزاد ہندوستان، اپنے قوم پرست لیڈروں کی [illegible] کسی قوم کا لقمۂ تر نہ بن سکے گا، اس طرح مضبوط [illegible] پر لگام کا کام دیگا۔ غرضیکہ اس لڑائی نے برطانیہ کو یہ سبق [illegible] ہندوستان کو اب زیادہ دنوں تک کمزور رکھنا، خود اپنے فوری مفاد کے حق میں بھی اچھا نہیں۔

چند مہینے ہوئے سر محمد ظفر اللہ کی ایک تقریر نے جو آپ نے لندن میں کی تھی، تمام لوگوں کو اچنبھے میں ڈال دیا تھا۔ سر ظفر اللہ نے ہندوستان کے لئے درجہ نوآبادیات کا فوری مطالبہ کیا تھا۔ اسوقت لندن میں تمام حلقوں

کی کانفرنس ہو رہی تھی اسلئے سر ظفراللہ کو کافی پبلسٹی بھی ملی۔ سر ظفراللہ کی یہ آواز وائٹ ہال کی آواز تھی۔

اس پیشکش کا دوسرا اہم سبب جیساکہ ہزاکسلنسی نے بیان کیا، جاپان کی جنگ ہے۔ لارڈ ویول کمانڈر ہونے کی حیثیت سے اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہندوستانی سپاہی جنھوں نے جاپان کا چھکا چھڑا دیا ہے۔ آزادی ملنے پر کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ جاپان کے خلاف جنگ کے لئے ہندستانی بہترین سپاہی ثابت ہوئے ہیں، اور ہندوستان بہترین کیمپ (BASE) لیکن کوئی مدبر اس اہم مورچے کو اسکی مرضی کے خلاف بنیادی طور پر کمزور رکھنا کبھی پسند نہ کرے گا لارڈ ویول اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہندوستان اس جنگ میں اپنی مرضی سے شامل نہیں۔ کیونکہ جس ملک کی حفاظت کے لئے ان سے کہا جاتا ہے اسے وہ اپنا نہیں سمجھتے۔ لہذا اگر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں طاقت سونپ کر انھیں یہ محسوس کرا دیا جائے کہ یہ ملک تمھارا ہے اور تم اپنے ملک کے لئے لڑ رہے ہو، تو چالیس کروڑ آبادی رکھنے والا یہ براعظم، جو دنیا کے تمام ضروری سامان کا مخزن ہے، کیا نہیں کر سکتا۔

برطانیہ کو یہ اچھی طرح علم ہے کہ جاپان کو سرکرنا اتنا آسان نہیں، جتنا لوگ سمجھ رہے ہیں۔ جاپان کے پاس اب بھی کافی طاقت محفوظ ہے اور وہ ایک لمبی لڑائی جاری رکھ سکتا ہے۔ جاپانی جزیرہ تو یقیناً ایک چھوٹا سا مقام ہے اور ٹوکیو کو بموں سے مسمار کر دینا بھی کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ لیکن اصلی جاپان اس نام کے جزیرے میں نہیں، بلکہ پہلے چین میں ہے جسپر جاپان کا قبضہ ہے۔ اس صورت حال میں ہندوستان بہت کچھ کر سکتا ہے اور جاپان کی شکست کا سب سے اہم عنصر بن سکتا ہے۔

لیکن یہ تمام جدوجہد اسی وقت ہو سکتی ہے جب ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے اور یہ ملک اپنی قومی حکومت کے ماتحت ہو۔ یہی سبب ہے کہ لارڈ ویول ذاتی جانفشانی اور جدوجہد کے ساتھ اس امر پر تُل گئے ہیں کہ ہندوستان میں جلد سے جلد ایک قومی حکومت قائم کر دیں، جو بڑی بڑی سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو اور جسکے پیچھے سارے ملک کی رائے عامہ ہو۔

برطانیہ کو ہندوستان میں ایک قومی حکومت کی اسلئے بھی ضرورت ہے کہ جنگ کے بعد ہندوستانی فوج کو منتشر کرنا ہے۔ دنیا میں جنگ کے بعد ہمیشہ ہنگامے ہوا کرتے ہیں، کیوں لاکھوں آدمی بیکار اور بیروزگار ہو جاتے ہیں۔ اور ملک میں عام کساد بازاری پھیل جاتی ہے اور ہنگامے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ چنانچہ گزشتہ جنگ عظیم کے بعد ۱۹۱۹ء میں جو بے چینی پھیلی وہی پیداوار عدم تعاون اور خلافت کی تحریکیں تھیں۔ لہذا موجودہ جنگ کے اختتام پر یہ مسئلہ اور زیادہ شدت سے ملک کے سامنے آنے والا ہے اور اگر اس وقت ملک میں کوئی قومی حکومت نہ ہوئی جو ان بیروزگاروں کو سمجھا بجھا کر دوسرے پُر امن پیشہ میں لگا سکے تو ہندوستان میں ایک عام خلفشار کا اندیشہ ہے۔

علاوہ اسکے جنگ کے بعد نئے حالات کے ماتحت سارے ملک کی از سر نو تعمیر کا مسئلہ بھی نہایت اہم ہے۔ جو ایک قومی حکومت ہی کے ہاتھوں بخیر و خوبی انجام پذیر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ قومی حکومت کو ملک کی وہ اخلاقی حمایت حاصل ہوگی جو ایک بیرونی طاقت کو حاصل نہیں ہو سکتی اور وہ ملک سے جو باتیں منوا سکتی ہے اور قوم کو جسقدر قربانیاں پر آمادہ کر سکتی ہے ایک غیر ملکی حکومت نہیں کر سکتی۔

غرضیکہ ان حالات کی بنا پر ملک کی سب سے اہم ضرورت اور حالات کا سب سے اہم تقاضا یہی ہے کہ جلد سے جلد ایک قومی حکومت قائم ہو اور لارڈ ویول ہماری مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس امر کو اس آخری وقت میں محسوس کر لیا اور اسپر سرگرمی سے عمل پیرا ہیں۔

ویول اسکیم کی نوعیت

جہاں تک ویول اسکیم کی خوبیوں اور برائیوں کا تعلق ہے۔ موجودہ حالات میں ہم یہی کہیں گے کہ غنیمت ہے۔ اگر ہم کرپس اسکیم سے اسکا مقابلہ کریں تو بعض لحاظ سے یہ کرپس اسکیم سے بہتر ہے، اور بعض لحاظ سے خراب۔ کرپس اسکیم میں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ آزادی کا مطالبہ کسی نہ کسی حد تک مان لیا گیا تھا، اور جنگ ختم ہوتے ہی درجۂ نوآبادیات تفویض کر دینے کا وعدہ تھا۔ لیکن ویول تجاویز میں سرے سے ان باتوں کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ پھر کرپس اسکیم میں اختیارات کی حدود زیادہ وسیع تھیں، یہانتک کہ ڈیفنس ممبر بھی ہندوستانی تجویز کیا گیا تھا، اور دفاع کا محکمہ، سوائے کمانڈر انچیف کے اختیارات کے جسے فوجوں کی نقل و حرکت پر پورا اختیار دیا گیا تھا، ہندوستانی وزیر کے سپرد کیا جانے والا تھا۔ لیکن ویول اسکیم میں محکمہ دفاع کا سارا چارج کمانڈر انچیف کے ماتحت رکھا گیا ہے۔

غالباً ناظرین کو یاد ہوگا کہ کرپس مشن کے وقت واشنگٹن کے ویٹو پر

بنا گرم مباحثہ ہوا تھا اور حکومت کسی طرح ویٹو کے حق سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھی۔ یہانتک کہ کانگریس نے یہ تجویز رکھی کہ کابینہ کے متفقہ فیصلوں کو وائسرائے مان لیا کرے، لیکن اس پر بھی حکومت رضامند نہ ہوئی آگے چل کر کانگریس نے یہ مطالبہ کیا کہ وائسرائے یہ یقین دلائیں کہ وہ حتی الامکان ویٹو کا استعمال نہ کرینگے مگر یہ مطالبہ بھی تسلیم نہ کیا گیا اور بالآخر اسی معاملے پر ساری گفت وشنید ٹوٹ گئی۔ لیکن اسکے برخلاف اب لارڈ ویول اور مسٹر ایمری دونوں نے نہایت صاف الفاظ میں یہ یقین دلایا ہے کہ حتی الامکان ویٹو کا استعمال نہ کیا جائیگا اور اگر شاذ ونادر استعمال کیا بھی گیا تو وہ ہندوستان کے حق میں ہوگا نہ کہ برطانیہ کے حق میں۔

لیکن ویول پلان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ متنازعہ فیہ مسائل سے قطعاً دامن بچا کر نکل گیا ہے اور اس میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں جس سے ہندوستان کے آئندہ دستور سے متعلق کسی جماعت کے مطالبہ کی تائید یا نفی ہوتی ہو۔ ہماری مراد مسئلہ "متحدہ ہندوستان بنام پاکستان" سے ہے۔

ویول اسکیم کا سب سے اہم اور بنیادی ٹکڑا یہ ہے کہ اس میں ہندو مسلم سوال کا ایک نیا حل پیش کیا گیا ہے، اور پہلی بار ہندوؤں اور مسلمانوں کو سیاسی سطح پر مساوات کا درجہ دیا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ لارڈ ویول کا بڑا دلیرانہ اقدام ہے، اور کانگریس نے بھی اسے تسلیم کرکے بڑی جرأت اور فراخدلی کا ثبوت دیا ہے۔

لارڈ ویول نے دوسری سپاہیانہ دلیری کا یہ ثبوت دیا کہ ہندو مہاسبھا کو قطعاً نظر انداز کر دیا، اور اسکا کوئی نمائندہ شملہ کانفرنس میں نہ بلایا گیا۔ حالانکہ برطانی کانفرنسوں کا ہمیشہ سے یہ طرۂ امتیاز رہا ہے کہ اس میں فرقہ پروروں اور رجعت پسندوں کو زیادہ یاد فرمایا جاتا ہے، تاکہ انکی آواز میں قوم پرستوں کی آواز دڑوب جائے۔ لیکن لارڈ ویول کا یہ جرأت آمیز اقدام اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ برطانیہ کو اب ان رجعت پسند فرقہ پروروں اور جی حضوریوں کی ضرورت نہیں رہی، بلکہ سرفروش قوم پرستوں کی ضرورت ہے، جو ملک کو طاقتور بنائیں اور ترقی کی طرف لیجائیں۔

جہانتک ہندوستان کو اختیارات منتقل کرنے کا سوال ہے سوائے فوج کے، تمام محکمے، جنمیں ہوم ڈپارٹمنٹ مالیات اور امور خارجہ بھی شامل ہیں ہندوستانیوں کے سپرد کئے گئے ہیں۔ یہ محکمے آج تک کسی ہندوستانی ممبر کے سپرد نہیں کئے گئے تھے۔ وائسرائے عموماً اپنی کانسل کی اکثریت کے فیصلوں کو مان لیا کریگا، اور انتہائی خاص حالات اور مجبوریوں میں ویٹو کا استعمال کریگا۔ لیکن ہندوستان کے دستور کے سلسلے میں کسی قسم کی تبدیلی نہ آئیگی اور یہ تمام چیزیں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے حدود کے اندر ہی ہونگی۔ یہ نئی کانسل اسوقت تک با اختیار رہیگی تاوقتیکہ ہندوستان کا ایک مستقل دستور بن کر نافذ نہ ہو جائے۔

بہر حال ویول اسکیم ایسی ہے جسے درمیانی عرصے کے لئے عارضی طور پر قبول کیا جا سکتا ہے اور اگر تمام جماعتیں سر جوڑ کر کوشش کریں، اور ملک کے بہترین لوگ اس کاؤنسل میں شامل ہوں تو اس سے ملک آزادی کی منزل تک بھی پہونچ سکتا ہے اور یہی وہ توقعات ہیں، جنکی بنا پر کانگریس نے اس حکومت میں شامل ہونا منظور کر لیا ہے۔ کانگریس کے سامنے ایک اور بھی اہم چیز ہے اور موجودہ بین الاقوامی حالات میں اسوقت بین الاقوامی سیاسیات میں ہندوستان کی جگہ خالی ہے اور ہندوستان اس موقعہ سے، اگر چاہے تو زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

مسٹر ایمری نے پارلیمنٹ میں ویول اسکیم کو پیش کرتے ہوئے کہا:-

"ان تجاویز میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جو ممبران کانسل کو اس امر سے روک سکے کہ وہ تعمیر مابعد از جنگ کے پروگرام کو جس صورت میں چاہیں چلائیں۔ یہ اُن کے اختیار میں ہوگا کہ وہ ملک کی صنعتی، زراعتی اور اقتصادی پالیسوں کی مہارت کے فرائض انجام دے اور ہندوستان کن کن ملکوں میں اپنے نمائندے بھیجنا چاہتا ہے، یہ تمام باتیں اس کانسل ہی کے فیصلہ کرنے کی ہونگی۔ ان تجاویز میں کوئی ایسی رکاوٹ موجود نہیں، جو ہندوستان کی آزادی کے راستے میں، خواہ اس ملک کے اندر یا باہر کی دنیا میں، روڑا بن سکے۔"

غرضیکہ تمام صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد ہر محب وطن ہندوستانی کو اس فیصلہ پر پہونچنا ہوگا کہ فی الحال ویول اسکیم کو قبول کر لینا چاہئے اور لارڈ ویول کے مشن کو کامیاب بنانے کے لئے تمام جماعتوں اور فرقوں کو انکی پوری پوری مدد کرنی چاہئے۔

مسلم لیگ کا انکار

لیکن ہمیں یہ معلوم کرکے سخت افسوس و حیرت ہوئی کہ مسلم لیگ نے

نئی کونسل میں شمولیت سے انکار کردیا ہے، اور اُسنے اپنے نمائندوں کے نام نہیں پیش کئے۔ اس انکار کا سبب یہ بتلایا جاتا ہے کہ چونکہ وائسرائے نے مسلم لیگ کے چند مطالبات سے متعلق اطمینان نہیں دلایا، اسلئے مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی نے کونسل میں شرکت سے انکار کردیا۔ مسلم لیگ نے وائسرائے کے سامنے کون سے مطالبات پیش کئے تھے، انکا خاکہ اخبارات کی رپورٹ کے مطابق، ذیل میں پیش کیا جاتا ہے :۔

(۱) مسلم لیگ کو تمام مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرلیا جائے، اور پانچ نشستوں کا جو کوٹا مسلمانوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے ان کے لئے تمام کے تمام نمائندے مسلم لیگ نامزد کرے۔

(۲) وائسرائے اس امر کا وعدہ کریں کہ اگر مجلس منتظمہ کی اکثریت کسی امر کا فیصلہ کرے (جو مسلمانوں کے حق میں نقصان رساں ہو) اور مسلم ممبران منتظمہ اسکی مخالفت کریں، تو وائسرائے اپنے ویٹو کا حق استعمال کرکے اکثریت کے اس فیصلے کو رد کردے۔

(۳) ہندوستان کے آئندہ دستور سے متعلق وائسرائے مسلمانوں کے حقِ خود ارادیت یعنی مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کا یقین دلادیں۔

واحد نمائندگی کا مطالبہ

سب سے پہلے ہم یہاں مسلم لیگ کے اس دعویٰ کی چھان بین کرینگے کہ وہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ ہے یا نہیں اور دوسری کسی جماعت کو بھی مسلمانوں کی طرف سے بولنے کا کوئی حق حاصل ہے یا نہیں۔

ہمارے خیال میں یہ دعویٰ قطعاً صحیح نہیں، اور کوئی سنجیدہ انسان حالات کی روشنی میں اسے تسلیم نہیں کرسکتا۔

"بے مسلم لیگ، کو مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت کی حمایت حاصل ہے، لیکن ملک میں اور بھی اسلامی جماعتیں ہیں جو مسلمانوں کے الگ الگ طبقوں اور خیالات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ مثلاً جمعیتہ العلمار ہند، مسلم مجلس، مجلس احرار، خدائی خدمتگار، آل انڈیا مومن کانفرنس، آل انڈیا شیعہ پولیٹیکل کانفرنس :۔ جماعتیں مسلمانوں کے خاص خاص طبقوں اور خیالات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ تمام جماعتیں قدیم ہیں اور انھوں نے مسلمانوں کی کافی خدمت کی ہے اور اپنے اصول کی خاطر قربانیاں بھی کی ہیں۔ علاوہ ان کی دوسری جماعتیں کرشک پرجا پارٹی بنگال، اتحاد ملت پارٹی پنجاب اور انڈیپنڈنٹ مسلم پارٹی بہار، بھی ہیں، جو مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ ماننا پڑیگا کہ ان تمام جماعتوں کا کسی نہ کسی حد تک اور کسی نہ کسی حلقے میں مسلمانوں پر اثر ہے۔

مسلم لیگ کا واحد نمائندگی کا دعویٰ زیادہ تر مسلم اکثریت کے صوبوں کے بل پر ہے، اسلئے آئیے ذرا اسکا بھی جائزہ لیں۔

یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ مسلم لیگ بنگال، پنجاب، صوبۂ سرحد یا سندھ میں آجتک باوجود کوششوں کے مسلم لیگی وزارت قائم نہ کرسکی اور اسکا واحد سبب ظاہرا اسکے سوا کچھ نہیں کہ مسلم ممبروں کی اکثریت اسکے ساتھ نہیں۔ گذشتہ عام انتخابات میں بنگال میں صرف ۳۹ مسلمان مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے اور تقریباً ۴۰ مسلمان کرشک پرجا پارٹی اور جمعیت لیگ کرشک پارٹی کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے۔ جس وقت مسٹر فضل الحق نے بنگال کی وزارت سنبھالی تو یہی ۳۹ مسلم اراکین اپوزیشن پارٹی میں تھے۔ لیکن بنگال نے حال میں جس طرح سر ناظم الدین کی وزارت کو اُٹھا کر پھینکا ہے، اس سے بنگال میں مسلم لیگ کی پوزیشن اور بھی زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔ سر ناظم الدین کی وزارت کے خلاف، ۱۰۶ کی حمایت اور ۹۷ کی مخالفت سے عدم اعتماد کی تحریک پاس ہوئی۔ واضح رہے کہ اس ۹۷ کی تعداد میں ۲۶ یورپینوں کے ووٹ بھی شامل تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بنگال میں مسلم لیگ کی وزارت ہمیشہ ان ۲۶ یورپینوں ہی کے دم قدم سے چلتی رہی۔

اب دوسرے مسلم اکثریت کے صوبے کو لیجئے، جو پاکستان کی جان ہے۔ یعنی پنجاب جہاں شروع سے یونینسٹ پارٹی کی وزارت قائم ہے، اور گذشتہ سال جب مسٹر جناح نے مسلم لیگی وزارت قائم کرنے کی کوشش کی تو اس کا کیا حشر ہوا یہ سبھوں کو معلوم ہے۔ اسوقت پنجاب اسمبلی کے تقریباً ۱۰۰ ممبروں میں صرف ۲۱ اراکین مسلم لیگ کے ساتھ ہیں اور کانگریس کے ساتھ حزبِ مخالف میں بیٹھتے ہیں۔

جہاں تک صوبائی سرحد کا سوال ہے، اسمیں کسی شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ سرحد کی مسلم اکثریت کانگریس کے ساتھ ہے۔ کانگریسی رہنماؤں کی نظر بندی سے فائدہ اُٹھا کر قائداعظم نے مسلم لیگی وزارت تو قائم کرادی لیکن جیوں ہی ڈاکٹر خان صاحب اور دوسرے ممبران رہا ہوکر آئے مسلم لیگی وزارت ایک ہی جھٹکے میں پاش پاش ہوگئی۔

غیر لیگی مسلمانوں کو کس طرح محروم کیا جا سکتا ہے۔

قائد اعظم نے اپنے ایک بیان میں بتلایا کہ ۹۹ فی صدی مسلمان مسلم لیگ میں شامل ہیں اور غیر مسلم لیگی مسلمانوں کی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں ہمارا خیال ہے کہ قائد اعظم حساب میں بہت کمزور ہیں۔ اگر نیشنلسٹ مسلمانوں کی تعداد ایک فیصدی بھی مان لی جائے تو دس کروڑ مسلمانوں میں دس لاکھ مسلمان نیشنلسٹ ہیں اور دس لاکھ کی تعداد کوئی معمولی تعداد نہیں ہوا کرتی۔

قائد اعظم کے سامنے یہ تمام صورت حال موجود ہے اور انھیں اس امر کا اچھی طرح احساس بھی ہے۔ لیکن وہ ان باتوں کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد مسلم لیگ عوام الناس میں مقبول ہوئی ہے اور اسوقت کوئی جماعت انتخابات میں مسلم لیگ پر فتح حاصل نہیں کر سکتی۔

یہ دعویٰ کسی حد تک صحیح بھی ہو تو بھی اس امر کا کیا علاج ہے کہ کسی جماعت کی مقبولیت اور عدم مقبولیت کی واحد کسوٹی الیکشن ہے اور یہی ایک سائنٹفک طریقہ ہے جانچنے کا جو ساری دنیا میں رائج ہے۔ لہذا جب تک مسلم لیگ نئے انتخابات میں اپنی سو فیصدی مقبولیت کا ثبوت نہ دیدے اسے سارے مسلمانوں کی قسمت کا مالک کسطرح بنایا جا سکتا ہے۔ شملہ کانفرنس میں مسٹر جناح اس مسئلے پر بحث کر رہے تھے کہ مولانا آزاد نے صرف ایک جملہ کہہ کر انھیں خاموش کر دیا۔ مولانا نے کہا:—

"اس کانفرنس کی بنیاد ۱۹۳۷ء کا الیکشن ہے، اور جتنے صاحب اس کانفرنس میں تشریف فرما ہیں ان میں اکثر اس انتخاب کی بنا پر مدعو کئے گئے ہیں۔"

مختصر یہ کہ مسٹر جناح کا واحد نمائندگی کا دعویٰ کس دلیل اور معقولیت پر مبنی نہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو مسلمان مسلم لیگ میں شامل نہیں انھیں وہ مسلمانیت ہی سے خارج کر دینا چاہتے ہیں اور تمام پاور مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ خود اپنی پارٹی مسلم لیگ کے لئے چاہتے ہیں۔

بہت ممکن ہے کہ یہ مسئلہ اس قدر سخت ہو جائے کہ اسی کی بنا پر شملہ کانفرنس ٹوٹ جائے اور ملک کو آگے بڑھانے کا جو موقع ہاتھ آیا ہے وہ جاتا رہے۔ کیونکہ مسٹر جناح اور مسلم لیگ کے اکثر ارباب، ملکی اور وطنی معاملوں میں بہت کم سوچتے ہیں۔ مسٹر جناح اسلئے اڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ کانفرنس کامیاب ہو یا ناکامیاب مسلم لیگ کے دونوں ہاتھوں میں

اب رہا صوبۂ سندھ اور آسام کا سوال، تو یہ حقیقت سبھوں پر آشکارا ہے کہ ان صوبوں کی وزارتیں، کانگریسی اراکین کی حمایت پر قائم ہیں، اگر خان بہادر مولا بخش کو کانگریس کی حمایت حاصل ہوتی تو آج شملہ کانفرنس میں سر غلام حسین نہیں بلکہ خان بہادر مولا بخش ہوتے۔ آسام کی کانگریس پارٹی کو، کانگریس نے خاص حالات کے تحت مسلم لیگ سے مل کر وزارت بنانے کی ہدایت دی ہے، اور جس وقت بھی یہ حمایت واپس لے لی جائے، سر سعد اللہ کی وزارت ختم ہو سکتی ہے۔

اگر ان حقائق کی روشنی میں یہ کہا جاتا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو مسلمانوں کی سو فیصدی حمایت حاصل نہیں اور مسلم لیگ تمام اسلامیانِ ہند کی طرف سے بولنے کا حق نہیں رکھتی، تو مسٹر جناح کو کیوں برا لگتا ہے یہ سمجھ میں نہیں آتا۔

نواب زادہ لیاقت علی نے اپنے ایک بیان میں بتلایا کہ تمام صوبوں اور مرکزی مجلس مقننہ میں مسلم اراکین کی مجموعی تعداد ۶۰۰ ہے جنمیں ۴۲۰ اراکین مسلم لیگ میں شامل ہیں اور ۱۸۰ اراکین مسلم لیگ میں شامل نہیں۔ لیکن نواب زادہ صاحب نے ابھی تفصیلات کو واضح نہیں کیا کہ یہ تمام اراکین مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے یا کسی اور پارٹی کے ٹکٹ پر اور پھر لیگ میں شریک ہو گئے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس تعداد میں ۱۰۰ ممبر بھی ایسے نہیں جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر آئے ہوں۔ پنجاب میں مسلم لیگ کا صرف ایک امیدوار کامیاب ہوا تھا اور بہار میں ایک بھی نہیں۔ یعنی بہار میں مسلم لیگ نے انتخابات میں حصہ ہی نہ لیا تھا۔ بہر حال مسلم لیگی ممبروں کی تعداد کسی طرح سو سے زیادہ نہیں بڑھ سکتی، اور ان ۴۲۰ ممبروں میں زیادہ تر اراکین ایسے ہیں جو کسی دوسرے ٹکٹ پر منتخب ہونے کے بعد اپنی جماعت کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے، اور کوئی سنجیدہ سیاسی جماعت بھی دیانتداری سے ان اراکین کو اپنا نہیں سکتی۔

بہر حال اگر نواب زادہ صاحب کا یہ بیان مان بھی لیا جائے تو بھی ۱۸۰ ممبران یعنی مجموعی تعداد (۶۰۰) کا ۳۰ فی صدی۔ ایسے ہیں جو مسلم لیگ میں شامل نہیں۔ غرضیکہ اس طرح مسلم لیگ تقریباً ڈھائی کروڑ مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مسلمانوں کی نمائندگی کون کریگا؟ جبکہ ۶۰ لاکھ سکھوں اور ایک کروڑ ...ستانوں کو ایک ممبر کی نمائندگی کا حق دیا جا رہا ہے تو ان ڈھائی کروڑ

لازم ہے اگر انکی خدمات لی گئی اور مسلم لیگ کو سارے مسلمانوں کا ٹھیکیدار تسلیم کرلیا گیا تو مسٹر جناح کے دل کو یہ تسلی تو ہو جائیگی کہ انھوں نے کانگریس کو ہندو جماعت ثابت کردیا اور اگر ان کی خدمات نہ لی گئی اور وائسرائے نے کانگریس کے ساتھ ملکر اپنی مجلس منتظمہ بنالی، تو انھیں انتخابات کے لئے ایک نہایت تیر بہدف نسخہ ہاتھ آجائیگا اور وہ مسلمانوں کو پکار پکار کر کہینگے کہ وہ لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ثابت کردکھائیں ــــ غرضیکہ دونوں صورتوں میں مسلم لیگ کی جیت ہے، ملک خواہ جہنم میں جائے۔

مسلم لیگ کا دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ کانسل کی اکثریت اگر کوئی ایسا ریزولیوشن پاس کرے جو مسلم مفاد کے خلاف ہو اور مسلم لیگی ممبران اسکی مخالفت کریں تو وائسرائے اپنا ویٹو استعمال کرکے اسے روک دے۔ اب سوال یہ ہے کہ اسکا فیصلہ کون کرے گا کہ کوئی خاص تجویز مسلم مفاد کے خلاف ہے یا نہیں مسٹر جناح کہتے ہیں کہ اسکا فیصلہ بھی وہ خود کرینگے کہ منتظمہ کا کون سا عمل مسلمانوں کے حق میں ہے اور کون سا مضر۔ اب فرض کیجئے کہ منتظمہ کے سامنے ہندوستان میں موٹر سازی کا کارخانہ کھولنے کا سوال پیش ہو مسٹر جناح یقینی اس کی مخالفت کریں گے کیونکہ یہ کارخانے یقینی برلا، ڈالمیا، یا ٹاٹا کی ملکیت ہوں گے اور وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس تجویز سے ہندو سرمایہ داری کو فروغ ہوتا ہے اور مسلمانوں کی غربت میں اضافہ ہوتا ہے۔ پھر وائسرائے یہ کب چاہیں گے کہ ہندوستان میں صنعتی ترقی ہو اور انگلستان کے لوگ بھوکوں مریں لہذا انھیں ایک بہانہ ہاتھ آئیگا اور وہ جھٹ اپنا ویٹو استعمال کرکے منتظمہ کے فیصلے کو مسترد کردیں گے۔ غرضکہ ہندوستان کے اصلی ڈکٹیٹر یا مسٹر جناح ہونگے، یا یوں کہئے کہ یہ ایک "برطانی۔مسلم لیگی" سازش ہوگی جو ہر موقع محل پہ ہندوستان کی قوم پرست تحریکوں کو کچلتی اور ترقی کے پروگراموں کا گلا گھونٹتی رہے گی۔

مختصر یہ کہ یہ وائسرائے کا نہیں، بلکہ مسٹر جناح کا ویٹو ہوگا اور یہ حقیقت ہے کہ کچھ عرصے سے مسٹر جناح ہندوستان کی ہر تحریک آزادی کے لئے 'ویٹو' بنے ہوئے ہیں۔ اور برطانی حکمت عملی نے اپنی خاص مصلحتوں کی بنا پر انھیں ویٹو بنا رکھا ہے۔ حکومت برطانیہ یہ کہتی ہے کہ ہندوستان کو آزادی اسلئے نہیں دی جاسکتی کہ ملک کے مختلف فرقوں میں جھگڑے ہیں، اور اس صورت میں انگریزوں کا رہنا بہت ضروری ہے۔ اگر ہندوستانی آپس میں سمجھوتہ کرلیں تو ہم ہندوستان کی ذمہ داری سے ہر وقت دستبردار ہونے کو تیار ہیں۔ مسٹر جناح اور ان کی آل انڈیا مسلم لیگ ہمیشہ اس امر کا ثبوت بہم پہنچاتی رہتی ہے کہ برطانیہ کا یہ دعویٰ صحیح ہے۔

غرضیکہ اب مسئلہ اس طرح درپیش ہے کہ انگریز اسوقت تک ہندوستان سے نہ جائینگے تاوقتیکہ مسٹر جناح انھیں جانے کی اجازت نہ دیدیں، اور مسٹر جناح انھیں جانے کی اسوقت تک اجازت نہ دیں گے جب تک وہ اپنے من مانے مطالبات نہ تسلیم کرالیں۔ غرضیکہ اب ہندوستان کی ساری آزادی اور ترقی کا دارومدار مسٹر جناح کی ہاں اور نہیں پر ہے۔ مسٹر جناح اگر چاہیں تو ہندوستان آزاد ہوسکتا ہے ورنہ نہیں۔

ہم یہاں صرف اتنا کہدینا چاہتے ہیں کہ مسٹر جناح ملک کے راستے میں اسطرح روڑے اٹکا کر اور انگریز انکا سہارا لیکر، ملک کے نوجوانوں کے صبر کو بڑی سخت آزمائش میں ڈال رہے ہیں۔

شملہ کی تازہ ترین اطلاعات کچھ زیادہ امید افزا نہیں اور بہت ممکن ہے مسٹر جناح کی ضد کا سہارا لیکر لارڈ ویول اس کانفرنس کی ناکامی کا اعلان کردیں۔ بعض مبصرین کا یہ خیال بھی ہے کہ شملہ کانفرنس برطانوی الیکشن جیتنے کے لئے مسٹر چرچل اور مسٹر ایمری کا شعبدہ ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ برطانیہ ایسی حرکت نہ کریگی اور ہندوستان کے جذبات سے اس طرح کھیلنا پسند نہ کریگی۔ کرپس مشن کے بعد ہندوستان کے دلوں میں برطانیہ کے خلاف جو طوفان بھڑک اُٹھے اور اسکے بعد ہندوستانی اپنے قوت بازو پر بھروسہ کرکے برطانیہ کی بلائی ہوئی اس قسم کی تمام کانفرنس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہدیں۔ کیونکہ اگر لارڈ ویول نے کوئی بہانہ ڈھونڈھ کر موجود دور نہ کیا تو برطانی وعدوں اور حکومت کے الفاظ پر آئندہ کبھی کوئی ہندوستانی یقین نہ کریگا۔

کانگریس اور مسلم لیگ کا عدم سمجھوتہ یقینی کوئی بہانہ نہیں بن سکتا۔ کیونکہ یہ چیز روز روشن کی طرح آشکارا ہے۔ ایک عرصہ سے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان باوجود ساری کوششوں کے سمجھوتہ ناممکن ہوگیا ہے۔ لہذا اس قدیم صورت حال کو تازہ بہانہ بناکر لارڈ ویول کبھی چھٹکارا نہیں پاسکتے۔ اگر مسلم لیگ راضی نہیں ہوتی تو اگر

...ور دوسری جماعتوں سے ملکر مرکزی حکومت بنا دینی چاہیئے اور اگر کانگریس آنا نہیں چاہتی تو کانگریس کے بغیر مسلم لیگ اور دوسری پارٹیوں کو لیکر کام شروع کر دینا چاہیئے۔ مقصد یہ ہے کہ ہر حال میں ہندوستانیوں کے ہاتھ میں طاقت منتقل ہو، جو موجودہ صورت حال میں اشد ضروری ہے۔

بہر حال ہمیں لارڈ ویول کے سپاہیانہ اقدام اور دانشمندی پر پورا بھروسہ ہے اور ہمیں یقین ہے کہ وہ اس کانفرنس کو ناکام نہ ہونے دیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں مسٹر جناح سے بھی ایسی امید نہیں کہ وہ ملک کی موجودہ ناگفتہ بہ حالت کو مدّنظر رکھتے ہوئے محض اپنی "واحد نمایندگی" کی بیجا ضد سے ایک اتنے بڑے تاریخی موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہ دینگے۔

ہم کانگریس مسلم لیگ اور ملک کی تمام اقلیتوں سے مرکب، ایک مضبوط قومی حکومت کے لئے دست بہ دعا ہیں، جو ملک کے موجودہ مسائل کو حل کرے، عوام الناس کو مصائب سے نجات دلائے اور آزادی وطن کا دروازہ کھولے۔

مبارکباد

ادارہ "نئی زندگی" اپنے فاضل جوائنٹ ایڈیٹر مسٹر طفیل احمد خاں صاحب کی شادی خانہ آبادی پر اپنی حقیقی مسرت کا اظہار کرتا ہے اور مسٹر و مسز طفیل کو انکی آئندہ زندگی میں کامیابی کی دعا کرتے ہوئے دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

"منیجر"

رفتار عالم

ا۔ن۔ ـــــــــــــ ادارہ

پان عرب تحریک

مشرق قریب مستقبل میں دنیا کے لئے سیاسی کھلبلی کا سب سے خطرناک اڈہ بننے والا ہے۔ گذشتہ نومبر میں لارڈ موائن مشرق قریب کے برطانوی ریذیڈنٹ کا قتل اور مصر کے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کے بعد وزیر اعظم احمد مہر پاشا کا قتل ـــ یہ دونوں واقعات اس بات کا ڈرامائی اظہار ہیں کہ دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں میں مشرق قریب کے معاملے پر کھتی رقابت اور باہمی مقابلہ کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔ اس مقابلہ بازی کا تعلق پٹرول اور تجارتی آسانیوں، اقتصادی، قومی اور تہذیبی دشمنی سے ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں میں ان معاملات پر زبردست اختلافات موجود ہیں۔

اگرچہ کریمیا کانفرنس کے باضابطہ اور باقاعدہ اعلان میں مشرق قریب کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ لیکن اندازہ کیا جاتا ہے کہ کریمیا کانفرنس میں مشرق قریب کے کچھ مسائل پر ضرور کچھ نہ کچھ بحث ہوئی ہے۔ اس معاملے پر طاقت ثلاثہ کی خاموشی کا غالباً مطلب یہ ہے کہ کوئی خاص سمجھوتہ نہ ہوسکا لیکن دراصل مشرق قریب کی موجودہ سیاسی صورت حال میں مستقبل کے خطرناک سیاسی واقعات کلبلا رہے ہیں اور انھیں کے ذریعہ آئندہ دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کے باہمی رشتے متعین ہوں گے۔ سیاسیات عالم میں مشرق قریب کی اہمیت کا اندازہ اُن ملاقاتوں سے بھی ہوسکتا ہے جو مسٹر چرچل، روزولٹ اور عرب بادشاہوں کے درمیان ہوئی ہیں۔

شام اور لبنان کو چھوڑ کر جن پر ابھی تک فرانس کا قبضہ ہے مشرق قریب پر برطانیہ کا سیاسی اور معاشی اثر قائم ہے۔ لیکن موجودہ جنگ کے دوران میں برطانیہ کے واحد تسلّط کے خلاف دنیا کی دوسری طاقتوں نے صاف جو چیلنج دیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ مشرق قریب سے اٹلی اور جرمنی اور جاپان کے اثرات کو ختم کردیا گیا ہے لیکن اُنکی بجائے سویت روس اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ مشرق قریب کی سیاست میں اہمیت کے ساتھ داخل ہوتے ہیں۔ عرب اور ایران کے تیل کے خزانے روسی اور امریکی مداخلت کا سبب ہیں۔ ابھی تک امریکہ نے تیل سے متعلق اپنے مفادات کی حفاظت کے لئے کسی مشرق قریب کے ملک پر دباؤ نہیں ڈالا ہے۔ لیکن جب گذشتہ دفعہ روس کے مطالبہ کو ایرانی حکومت نے ٹھکرادیا تو روسی حکومت نے ایران کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کی ضرور کوشش کی۔

برطانیہ نے اپنے حلقۂ اثر میں روس اور امریکہ کی مداخلت کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک نئی چال اختیار کی ہے۔ اس چال کو یوں پیش کیا جاتا ہے کہ طاقت ثلاثہ میں سے ایک طاقت بقیہ دو طاقتوں کے سامنے ایک ایسی سیاسی صورت حال پیش کرے کہ انھیں اول الذکر کی بات ماننے بغیر کوئی چارہ نہ رہے۔ سویٹ روس نے مشرقی یورپ میں اپنا ایک حلقۂ اثر قائم کرنے کے لئے یہ چال کامیابی کے ساتھ اختیار کی تھی۔ امریکہ اسی چال کے تحت پان امریکی تحریک کو فروغ دے رہا ہے جسکی شکل و صورت کو شہر میکسیکو کے کانفرنس میں متعین کرنے کی کوشش کی گئی۔ برطانیہ نئی پان عرب تحریک کی تائید و موافقت کررہی ہے۔ یہ پان عرب تحریک پان عرب ریاستوں کی لیگ کی شکل اختیار کررہی ہے۔

پان عرب اتحاد کا تصور کوئی نئی چیز نہیں ہے نئی بات صرف یہ ہے کہ آج اُسے برطانوی تائید حاصل ہے۔ اگرچہ لبنان اور فلسطین

فلسطین کو چھوڑ کر تمام عرب ممالک مذہب اسلام کے پیرو ہیں پھر بھی پان عرب اتحاد قائم کرنے کی گذشتہ کوششیں ناکامیاب ثابت ہوئیں اسلئے کہ محض مذہبی اتحاد اس تصور کو عملی صورت دینے کے لئے کافی تھا۔ باہم تہذیبی اور معاشی اختلافات موجود تھے شروع شروع میں برطانیہ نے "نفاق پیدا کرو اور حکومت کرو" کے اصول پر عمل کرتے ہوئے خود اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ موجودہ پان عرب تحریک کی جڑیں اگرچہ خود ملکی سیاست میں ملتی ہیں پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ اس تحریک کی موجودہ صورت دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کی سیاسی چالوں کا کھلونا بنی ہوئی ہے۔ برطانیہ کو اس وقت عرب ممالک کے متحدہ طرز عمل کی سخت ضرورت ہے تاکہ جب آیندہ مشرق وسطے کے مسائل پر امریکہ، روس اور برطانیہ کی کوئی کانفرنس ہو تو عرب ممالک کا متحدہ طرز عمل روس اور امریکہ کے خلاف استعمال کیا جا سکے۔

انیگلو عرب ساز باز کی ابتدا ۱۹۳۹ء سے ہوتی ہے۔ جب حکومت برطانیہ نے قرطاس ابیض شائع کر کے فلسطین میں یہودیوں کی مزید آمد پر سخت قسم کی پابندیاں عاید کر دیں۔ ۱۹۴۱ء میں عراق میں برطانیہ کے خلاف بغاوت ہوئی اگرچہ اس بغاوت کو نازیوں کی سازش سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن در اصل اگر مقامی حالات اس بغاوت کے موافق نہ ہوتے تو یہ کبھی رونما نہ ہوتی۔ اس بغاوت نے برطانیہ کو اور بھی صلح جو پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ ۱۹۴۳ء کی نومبر تک جب لبنان میں خطرناک سیاسی صورت حال پیدا ہو چکی تھی تو عربوں اور برطانیہ کے باہمی تعلقات بہت خوشگوار ہو گئے۔ لبنان کے عرب لیڈروں نے برطانیہ سے فرانس کے خلاف مداخلت کرنے کی درخواست کی۔ اسکے علاوہ مصر کے وزیر اعظم مصطفےٰ نحاس پاشا نے لبنان کے واقعات و حالات میں زبردست دلچسپی دکھائی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اگرچہ لبنان کی سیاسی بے چینی پان عرب تحریک کی پیداوار تھی لیکن اُسے برطانیہ کی تائید بھی حاصل تھی۔ برطانیہ کی یہ چالیں اب پھل لا رہی ہیں۔ پان عرب کانفرنس منعقدہ قاہرہ کے رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ عرب لیڈروں کا موجودہ اتحاد جس بنیاد پر قائم ہے وہ محض یہ ہے کہ وہ فلسطین میں یہودیوں کی آمد اور لبنان اور شام میں فرانسیسی تسلط کے خلاف ہیں۔

چنانچہ یہ امید کرنا غلط نہیں ہے کہ عرب لیگ آئندہ حکومت برطانیہ سے بہت گہرے دوستانہ تعلقات رکھے گی۔ اس روشنی میں عرب ممالک کی گذشتہ سیاسی تبدیلیوں کے معنی و مفہوم کو زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے اس سے پہلے اسکندریہ میں جو پان عرب کانفرنس ہوئی تھی اُسمیں برطانیہ کو عرب ممالک کی طرف سے تعاون اور اتحاد عمل کی وافر گارنٹی نہ ملی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برطانیہ نے پان عرب اتحاد کی تائید کرنے سے انکار کر دیا۔ اسکے بعد یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ اسوقت پان عرب مسئلہ پر بحث و مباحثہ میں جن سیاسی شخصیتوں نے حصہ لیا تھا۔ اُس میں کوئی بھی اس وقت سیاسی طور پر با اختیار نہیں ہے۔ چنانچہ اسوقت جو پان عرب کانفرنس ہوئی ہے۔ اسمیں حصہ لینے والے تمام لوگ برطانیہ کے پٹھو ہیں۔

برطانیہ اور عرب حکومتوں میں آج کیوں اتنا اتحاد قائم ہے اسکو سمجھنے کیلئے یہ بات ذہن میں واضح رکھنی چاہیئے کہ پان عرب لیگ دراصل رجعت پسند عرب سرمایہ داروں اور دولتمندوں کی تخلیق ہے۔ برطانیہ اور عرب کا سیاسی طور پر با اختیار طبقہ اس بات سے خوف زدہ ہے کہ عرب ملکوں کے عوام میں موجودہ غیر مساوی نظام آراضی کے خلاف رد عمل پایا جاتا ہے اور وہ عرب کے زمینداروں کے حقوق و مراعات کے سخت مخالف ہیں اِس خانگی بے چینی کے زیر اثر جو جنگ کے پیدا کردہ حالات میں اور بھی بڑھ گئی ہے۔ عرب کے عوام میں سویٹ روس کا اثر بہت بڑھ رہا ہے۔ یہ اثر عرب کے متوسط اور مزدور طبقوں میں بہت بڑھ رہا ہے۔ یہ لوگ عرب ممالک کے پرانے فیوڈل نظام کے مخالف ہیں جسطرح عربوں کو فلسطین اور شام میں فرانس اور یہودیوں کے خلاف برطانوی امداد کی ضرورت ہے۔ اسی طرح برطانیہ بھی عرب ممالک کے موجودہ حکمران طبقوں کی موافقت کر رہی ہے اسلئے کہ انھیں طبقوں سے برطانیہ کا کاروبار ہے اور ان طبقوں کے رہتے ہوئے عرب ممالک میں کسی عوامی انقلابی تحریک کا خطرہ نہیں ہے۔

موجودہ جنگ کے بعد مشرق وسطے میں برطانیہ سیاسی توازن برقرار رکھ سکیگی۔ یا نہیں اسکا انحصار دو باتوں پر ہے ایک تو یہ کہ کیا اتحادی طاقتیں مشرق وسطے میں برطانیہ کے تسلط کو تسلیم کرتی ہیں یا نہیں اور دوسرے اس بات پر کہ عرب ملکوں میں خانگی سیاسی صورت حال کیا رنگ اختیار کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ برطانیہ اس بات پر مجبور ہوگی کہ امریکہ اور سویٹ روس کو کچھ د[illegible] مراعات [illegible] برطانیہ کا واحد تسلط اب قائم نہیں رہ سکتا اسکے علاوہ جنگ کے زمانہ میں جو پابندیاں عاید تھیں انکے ہٹ جانے کے بعد عرب ملکوں کی [illegible] آگے بڑھیں گی۔ یہ تحریکیں نہ صرف برطانیہ کی مخالف ہیں بلکہ عرب ملکوں کے قدیم حکمران طبقوں کی بھی [illegible] ان تحریکوں کے رہنما عرب حکمران طبقوں [illegible]

ہندستانی پرچار کے طریقے

انس ——— جعفر حسن 'بنجارا ہل' حیدرآباد

ہندوستانی بھاشا کا سوال ہمارے دیس کے انتہائی کٹھن سوالوں میں ہوگیا ہے۔ ایک طرف پرانتی (صوبائی) بھاشائیں بڑھتی ہوئی اہمیت حاصل کررہی ہیں دوسری طرف ہندی اردو کی پھوٹ زیادہ ہوتی جارہی ہے اور سب پر طرہ یہ کہ سارے دیس پر انگریزی چھائی ہوئی ہے اور اسکا زور دھیرے دھیرے بڑھتا جارہا ہے۔

اب وہ سمے نہیں رہا کہ انگریزی صرف سرکاری دفتروں اور پاٹھ شالاؤں کی زبان ہو، اب تو انگریزی ہماری بیوپاری، راج کاری، سائنسی اور سماجی زبان بھی ہوتی جارہی ہے۔ سادھارن بیوپاریوں سے لے کر بڑے بڑے تاجروں تک اکثر دوکانوں، فرموں اور کمپنیوں کے نام، سائن بورڈ اور دفتری کاروبار سبھی انگریزی میں ہوتا ہے۔ اکثر بنکوں اور کارخانوں کا بھی یہی حال ہے۔ کانگریس، مسلم لیگ، ہندو مہا سبھا اور دوسرے راج کاری اداکاروں کا کام کاج زیادہ تر انگریزی میں ہوتا ہے۔ تمام ریزولیوشن انگریزی میں لکھے جاتے ہیں، لیڈروں کے پیام اور بیان انگریزی میں نکلتے ہیں، انکا ہندی انوواد یا اردو ترجمہ اگر چھپتا بھی ہے تو غلط سلط یا ادھورا بنارس کی ہندو یونیورسٹی اور علیگڑھ کی مسلم یونیورسٹی دونوں کے ہاں انگریزی کا راج ہے۔

سماج میں بھی انگریزوں کا بول بالا ہوتا جارہا ہے۔ شادی بیاہ کے کارڈ چھپتے ہیں تو انگریزی میں سماجی ملاقاتوں میں بھی بات چیت ہوتی ہے تو انگریزی میں باپ بیٹے کو، بیٹا ماں کو، بیوی میاں کو اور بہن بہن کو خط لکھتا ہے تو انگریزی میں اور یہ حال تمام شہروں کے کئی کھاتے پیتے گھرانوں کا ہے اور یا ہوتا جارہا ہے۔

اس لئے میرا یقین ہے کہ اردو ہو یا ہندی، دونوں میں اتنا آپسی بیر نہیں جتنا دونوں کا انگریزی سے ہے۔ ہندی اور اردو میں تھوڑا سا آپسی جھگڑا ضرور ہے مگر دونوں کو جتنا نقصان انگریزی کے کارن ہورہا ہے اس کا پاؤ بھی آپس کے جھگڑے کی وجہ سے نہیں ہورہا ہے۔ اگر ہندی پریمی اور اردو کے حامی ایک دوسرے کا پیچھا کرنا چھوڑ کر اپنے اپنے گھربار کو انگریزی سے اور ہندوستان کی حد تک بھولی بسری زبانوں سے بچانے کی کوشش کریں تو میرا پورا یقین ہے کہ ہندی اردو دونوں کی بھلائی ہوگی، دونوں آپ ہی آپ ایک دوسرے کے قریب تر ہوتے جائیں گے اور ان دونوں کے میل سے ہندوستانی کا پرچار ہوگا۔ گویا ہندوستانی پرچار کے لئے یہ پروپگنڈا ضرور کرنا چاہئے کہ ہندی پریمی اور اردو کے حامی اپنی اپنی غیر نائیں آپس کے جھگڑے کم کریں اور اس کا مقابلہ کریں جس سے ان دونوں کو گھاٹا ہورہا ہے۔

مثال کے طور پر دیکھئے کہ اردو گھرانوں میں اردو کی کیسی بے عزتی ہورہی ہے اور ہندی پریمیوں کے کارن ہندی کا کیسا گھورا پمان ہورہا ہے! سرکاری زبان اردو ہو یا ہندی دیس کے ہر پرانت میں ہزاروں مال دار اور تعلیم پائے ہوئے خاندانوں کے سپوت انگریزی کی پوجا کرتے ہیں۔ بچے اور لڑکے لڑکیاں اور نوجوان سب کے سب انگریزی مدرسوں، ہائی اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ ماں کو "ممی" باپ کو ڈیڈی، خالہ کو آنٹی، چچا یا ماموں کو انکل کہنا معصوم بچوں کو سکھلایا جاتا ہے۔ پتا جی یا ابا جان کہلائے جانے سے انہیں شرم آتی ہے، پاپا کہا جائے تو انکی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ آپکو یاد ہوگا کہ دو تین سال قبل ناگپور میں اردو کی کل ہند کانفرنس ہوئی تھی۔ اس کانفرنس کی طرف سے بعض رقعے اور دعوت نامے تقسیم ہوئے تھے جو انگریزی میں چھپے تھے حیدرآباد کی ہندی پرچار سبھا نے دعوتی رقعہ بھیجا تو انگریزی بھاشا میں! میں خود ایسے بہت اردو گھرانوں کو جانتا ہوں۔ جہاں صرف انگریزی اخبار آتا ہے۔ ماہانہ رسالے بھی انگریزی کے پڑھے جاتے ہیں! کئی ہندی گھرانوں میں ایک روزانہ ہفتہ

داری یا ماما: پتر ہندی کا نہیں آتا TIMES ڈیلی اردو بکلی پڑھا جاتا ہے: ایسے ہندی پریمی یا اردو کے حامی ہیں جو انگریزی پتروں کے پڑھنے سے ہندی یا اردو کی ترقی چاہتے ہیں!!

ہندوستانی کی ترقی کے لئے ایک طریقہ تو یہی ہے جس کا میں نے بھی ذکر کیا ہے یعنی لوگوں کو یہ بتانا، سمجھانا اور لگاتار پرچار کے ذریعے یہ یقین دلانا ضروری ہے کہ ہندی کی ترقی چاہتے ہو یا اردو کی ترقی ہر حال میں اپنے آپ کو انگریزوں سے بچا کر اپنی ماتر بھاشا کے سچے بھگت بنانا لازمی ہے اور اپنی ماتر بھاشا کے سچے بھگت بننے کے لئے اپنی زبان کو آسان بنانا لازمی ہے۔

زبان کو آسان بنانے کے تین طریقے بہت اہم ہیں۔ ایک تو یہ کہ تلفظ یا اچارن آسان ہو اور ہم چاہے ناگری اکشروں میں لکھیں یا اردو حرفوں میں "جیسا لکھیں ویسا ہی پڑھیں اور جیسا پڑھتے ہیں ویسا ہی لکھیں" مطلب یہ کہ دونوں لکھاوٹوں کو آسان کر دیا جائے اور آخر میں جو نئے نئے شبد یا اصطلاحیں بنانی پڑیں انھیں جہاں تک بن پڑے چالو لفظوں کی سہاتا سے بنانے کی کوشش کریں۔ اس کوشش سے اردو اور ہندی ایک دوسرے سے قریب ہوتی جائینگی اور دونوں بھاشاؤں میں ملے جلے لفظوں کی جو پونجی ہے اس میں اضافہ ہوگا۔

میں جانتا اور مانتا ہوں کہ ادبی اردو یا ہندی ساہتیہ کو بدلنا ممکن نہیں۔ مجھے ہندی ساہتیہ سے اتنا ہی پریم ہے جتنا انگریزی یا جرمن لٹریچر اور اردو ادب سے ہے۔ میں کبھی نہیں چاہونگا کہ کبیرداس جی یا تلسی داس جی، دردا اور بھوشن، رحیم اور ملک محمد جائسی کے کرتوں کو سمجھنے والے اور ان سے آنند اٹھانے والے کم ہو جائیں۔ اسی طرح غالب، انیس، حالی اور اقبال کے ادب میں جو انمول ادبی خزانہ ہے اسکی قدر ہر وہ شخص کریگا جسے ادب سے لگاؤ ہے ظاہر ہے کہ ان مہاکویوں کی زبان بدلنا آسان نہیں اور نہ ہم یہ چاہیں گے کہ آئندہ جو بڑے بڑے ادیب اور شاعر ہوں وہ اپنی زبان بدل کر ایسی زبان لکھیں جو کسی کو پسند نہ آئے مگر یہ ہم ضرور کر سکتے ہیں اور ہمیں آپس کے فائدے کے لئے اور خود اپنے فائدے کے لئے یہ کرنا ہی ہوگا کہ اپنے علمی سائنسی اور کاروباری شبدوں کو

آسان بنائیں اور ایسے شبد بھی بنائیں جو ہندی اور اردو دونوں کے لئے موزوں ہو سکیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر اصطلاح کے لئے کسی ایسے شبد کی تلاش کرنا جو اردو اور ہندی دونوں میں چل سکے ممکن نہیں مگر تھوڑی سی کوشش سے اس قسم کے بیسوں ہی نہیں سینکڑوں بلکہ ہزاروں لفظ بن سکتے ہیں۔ مثلاً Right angle ہندی میں سم کون समकोण اور اردو میں زاویہ قائمہ کہتے ہیں۔ اگر ہم سیدھا کونا کہیں تو دونوں کے لئے آسانی ہے Lowland کو تحت بوم یا نشیبی زمین کہنے سے نچلی زمین کہنا ہر حال بہتر ہے۔ Law of Diminishing Return کے لئے پچیس تیس سال ہوئے "قانون تقلیل حاصل" کی ڈراؤنی اصطلاح بنائی گئی تھی۔ اسکو ہندی کی سائنسی بھاشا میں "کرماگت ہراس نیم" کہا جاتا ہے۔ پانچ چھ سال ہوئے اسکا ترجمہ "گھٹتی اپج کا قانون" کیا گیا ہے جو ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں چل سکتا ہے۔ بہار کی ہندوستانی کمیٹی نے Planet کیلئے جل تارا، Isthmus کے لئے زمین جوڑ، Strait کیلئے پن جوڑ، Axiom کیلئے آپ سچ، Postulate کیلئے مان سچ جیسے شبد تجویز کئے ہیں میری رائے میں یہ لفظ بہت اچھے ہیں اور اردو اور ہندی دونوں میں چل سکتے ہیں۔ ہندی پریس ایسے شبدوں کو چھوڑ کر نئے ہندی شبدوں کے بنانے میں بلا وجہ سنسکرت سے مدد لیتے ہیں اور اردو کے حامی فارسی اور عربی سے! یہ بھی ایک وجہ ہے کہ ہندی کو ہندی کے نام نہاد پریمیوں سے اور اردو کو اردو کے نام نہاد حامیوں سے بڑا نقصان ہو رہا ہے دونوں اپنی اپنی زبان کو بھاری بھاری اور بھیانک شبدوں سے کٹھن اور بوجھل بنا رہے ہیں۔ سچا ہندی پریم بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ اکثر ہندی پریمیوں کے دل دماغ میں انگریزی کی لگن، سنسکرت کی پوجا اور اردو کی مخالفت پائی جاتی ہے ہندی سے لگن، ہندی کی پوجا اور ہندی کی سیوا کرنے کا دھیان بہت ہی کم لوگوں کو ہے۔ یہی حال اردو کے حامیوں کا ہے۔ وہ انگریزی پر فریفتہ ہیں عربی اور اس سے زیادہ فارسی سے ان کے دل دماغ مرعوب ہیں اور ہندی سے چِڑ ہے۔ تب ہی تو یہ لوگ آسان لفظوں کو چھوڑ کر موٹے موٹے عربی فارسی لفظ ڈھونڈتے ہیں

سے تلاش کرکے نکالتے ہیں اور آسانی کا ذکر کیا جائے تو کہتے ہیں "دیکھو ہندی والوں کو! وہ کیسے کیسے سنسکرت کے لفظ ہماری زبان میں ٹھونس رہے ہیں"۔ میں ہندی پریمیوں اور اردو کے حامیوں دونوں سے کہتا ہوں کہ دوسرا فریق مانے یا نہ مانے تم خود ٹھیک راستے پر چلو اور جیت اسی کی ہوگی جو اپنے بوجھ کو ہلکا کریگا۔ سنسکرت شبدوں سے لدی ہوئی ہندی اور عربی فارسی لفظوں اور ترکیبوں سے لدی ہوئی اردو خود اپنے آپ کو سب سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہے۔ اسی لئے میں ہندی پریمیوں سے کہتا ہوں :

"آپ کو سب سے زیادہ نقصان انگریزی اور کٹھن ہندی کی وجہ سے ہو رہا ہے اور ان دونوں سے ہشیار رہیئے۔"

اردو والوں کو مخاطب کرکے میں کہتا ہوں۔

"آپ کو ہندی سے زیادہ نقصان نہیں ہوا ہے بلکہ انگریزی سے اور مشکل اردو سے۔"

لہذا ہندی پریمی ہوں یا اردو کے حامی دونوں کا فرض ہے کہ جہاں تک بن پڑے، اپنی زبان اور لکھاوٹ کو آسان بنائیں۔ زبان کو آسان بنانے کا ایک طریقہ تو یہی تھا جسکا ذکر ہو چکا یعنی یہہ کہ چالو شبدوں کے سہارے نئے نئے شبد بنائے جائیں اور صرف مجبوری کی صورت میں ہندی سنسکرت سے اور اردو فارسی عربی سے مدد لے۔

بعض آسان لفظ

آپ کی آگیا سے میں چند لفظوں کو بطور مثال پیش کرنا چاہتا ہوں جو میرے خیال میں آسان اُردو یا سرل ہندی یا ہندوستانی کا اچھا نمونہ ہیں Colour blind کیلئے اردو میں عمی اللون جیسی ترکیب استعمال ہو چکی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے انگریزی اردو ڈکشنری کے ترتیب کے وقت colour blind اور colour blindness کے رگوندھا اور رگوندھیا کے لفظ بنائے ہیں جو رنگ اور اندھا سے رتوندھا کے وزن اور ترکیب پر بنائے گئے ہیں۔ ہم ہندی میں یا اُردو میں رات، رنگ اور اندھا تینوں بولتے ہیں۔ لہذا رتوندھا اور رگوندھا بولنا اور سمجھنا آسان ہے۔ رتوندھا پرانا رگوندھا نیا لفظ ہے اور بہت اچھا ہے۔ پنڈت برجموہن دتا تریہ کیفی نے بھی بہت عمدہ لفظ بنائے ہیں مثلاً OIL ENGINE کے لئے تیلجن (تیل+انجن) EXPLOSIVE کے لئے بھکنڑول (بھبک سے اڑنے والا)۔

PROPAGANDA کے لئے اُردو میں کوئی بھی لفظ نہیں اور یہ انگریزی کے ذریعے لایا ہوا لاطینی بھاشا کا شبد سارے دیس میں چل پڑا۔ ایک مرتبہ COUNTER PROPAGANDA کیلئے میں نے اردو میں جوابی پروپگنڈا کی نئی اصطلاح دیکھی۔ مجھے خیال آیا کہ COUNTER PROPAGANDA کے لئے اگر توڑ پروپگنڈا کہا جائے تو اور بہتر ہوگا۔ اسی وزن اور طریقے پر COUNTERREVOLUTION کے لئے توڑ انقلاب، COUNTER ATTRACTION کے لئے توڑ کشش، COUNTERACT کے لئے توڑ عمل وغیرہ کہہ سکتے ہیں۔ مختلف موقعوں پر میں نے FLORAL TRIBUTE کے لئے پھول چڑھاوا، ANTIDOTE کے لئے ہر توڑ، REVERS اور REVERSAL کے لئے پھلانا اور پچھلاو، CENSUS کے لئے گنتاوا استعمال کیا ہے۔ CENSUS کو اردو میں مردم شماری اور ہندی میں منشیہ گنتنا کہتے ہیں۔ آپ ہندی پریمیوں سے پوچھئے کہ مردم شماری وہ قبول کر سکتے ہیں؟ مردم کا لفظ ہندی تو ہندی اردو میں بھی تنہا استعمال نہیں ہوتا نیز CENSUS میں صرف انسانوں کا شمار نہیں ہوتا بلکہ دھن دولت کی سبھی چیزوں کا استعمال ہوتا ہے۔ لہذا CENSUS کو صرف گنتاو یا گنتاوا کہنا مردم شماری کی مشکل ترکیب سے آسان بھی ہے اور بہتر بھی PENTAGON اور HEXAGON کو ہندی میں پنج بھج षट कोण اور شٹ کون पंचभुज کہنے کی کوشش کروائی جارہی ہے اردو کے فارسی عربی جاننے والے مخمس اور مسدس یا شش گوشہ کی ترکیب چلانا چاہتے ہیں۔ انکی بجائے پانچ کونیا اور چھ کونیا کی ترکیب کتنی آسان ہے اور اسی طرح ہم یکونیا، چوکونیا، ست کونیا، آٹھ کونیا کی ترکیبیں بنا سکتے ہیں۔ غرض تھوڑی سی کوشش سے گریمر، حساب، جغرافیہ، تاریخ اور سلح کار کے سیکڑوں ہزاروں آسان لفظ بنائے جا سکتے ہیں جو

اردو اور ہندی، دونوں زبانوں میں چل سکتے ہیں۔ ایسے ہی شبدوں کو بنانا اور چلانا ہندستانی پرچار سبھا کا سب سے بڑا کرتویہ (فرض) ہونا چاہیئے۔

آسان تلفظ یا سرل اچارن

آسان لفظوں کے بعد زبان کو آسان بنانے کا دوسرا اوپائے آسان تلفظ یا سرل اچارن ہے اور اس اچارن سے مراد عام طور پر استعمال کیا جانے والا اچارن۔ جو لفظ ہندی میں یا اردو میں جسطرح عام طور پر بولا جاتا ہے وہی صحیح ہے۔ جو لفظ پڑھے لکھے لوگ انکے خاندان والے اور مختلف پیشوں اور طبقوں کے نمایندے جس طرح بولتے ہیں وہی صحیح ہے چاہے وہ لفظ عربی کا ہو یا فارسی کا سنسکرت کا ہو یا انگریزی کا ہندوستانی پرچار کے لئے یہ اصول ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہندوستانی پرچار کی حد تک سنسکرت، انگریزی، عربی اور فارسی کے تلفظی یا اچارنی اصولوں سے کوئی واسطہ نہیں رہیگا۔ جو لفظ ہماری مائیں اور بہنیں، بیویاں اور بیٹیاں جس طرح بولتی ہیں اور جس لفظ کا جو تلفظ ہم میں سے اکثر پڑھے لکھے لوگ خرید کرتے ہیں اسی کو غلط ٹھیرانا بڑی بھاری بھول ہے۔ ہر زبان کا خاص اچارن ہوتا ہے اور جو لفظ دوسری زبانوں سے آکر اس میں گھل مل جاتے ہیں انکا تلفظ بدل جاتا ہے۔ یہ تبدیلی بالکل فطری اور لازمی ہے۔ دنیا کی ہر زبان میں ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔ ہم بھی اپنے گھروں میں یا عام بول چال میں غیر زبانوں کے ہر لفظ میں اس طرح بولتے ہیں جیسے سب لوگ بولتے ہیں مگر ہم میں بعض لوگ اپنی قابلیت جتانے کیلئے یا نادانوں کا رعب گانٹھنے کے لئے کہتے ہیں کہ "فلاں لفظ کا صحیح تلفظ یوں نہیں یوں ہے" "یہ تلفظ بگڑ گیا ہے" "یہ شبد اپبھرنش ہے" "گرم چاشے کہنا غلط ہے" "دیوالی صحیح نہیں" "راج نہیں راجیہ بولنا چاہئے" کیونکہ "گرم فارسی لفظ ہے اور اس پر حرکت نہیں"

"DIVALI IS THE CORRUPTION OF DEER-AVALI" "راج اپبھرنش ہے!"

ہم لوگوں کی قابل افسوس اور شرمناک پھوٹ وہیں پر ہوگئی ہے کہ ہم جس زبان کا پرچار کرنا چاہتے ہیں اسی پر غیر زبانوں کے اصول اور قاعدے لاد کر چلتی گاڑی میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ میں جب کبھی کسی کتاب میں "بگاڑ" یا "اپبھرنش" پڑھتا ہوں مجھے دکھ ہوتا ہے اور جب کبھی میں کسی اردو کے حامی کو یہ کہتے ہوئے سنتا ہوں کہ فلاں لفظ کا تلفظ یوں نہیں یوں ہے اور جب کبھی کوئی ہندی پریمی کہتا ہے کہ فلاں شبد کا شدھ اچارن یہ نہیں یہ ہے تو مجھے اور یقین ہوتا ہے کہ ہندی کو ہندی کے نام نہاد پریمیوں سے اور اردو کو اردو کے نام نہاد حامیوں سے جتنا نقصان پہنچ رہا ہے اتنا آپس کے جھگڑوں سے نہیں ہو رہا ہے۔

سنسکرت کی پوجا کرنیوالے لوگ پرچلت ہندی اچارن کو اشدھ ٹھیراتے ہیں اور ہم ساتھ اچارن کو اپبھرنش کے حقارت آمیز لفظ سے تعبیر کرتے ہیں عربی اور فارسی کی قدر کرنے والے اردو میں عربی فارسی لفظوں کے تلفظ میں جو چند تبدیلی قدرتی طور پر ہوتی ہے اسی کو "بگاڑ" سے تعبیر کرکے ہماری توہین کرتے ہیں۔ ہندی اردو کے ان نادان دوستوں کی کوششیں کبھی سپھل نہیں ہوسکتیں مگر ان کے کارن ہندی کی اُنتی یا اردو کی ترقی میں دقتیں پیدا ہورہی ہیں اور ہندوستان کے پھیلنے کی رفتار بہت دھیمی ہے ہندوستانی پرچار کے لئے اس اصول کا پرچار بھی ضروری ہے کہ جو شبد جس پرکار جنتا میں پرچلت ہوچکا ہے وہ ہندوستانی بھاشا کا شبد ہے اسکا جو تلفظ ہم کہتے ہیں وہی شدھ ہے اور ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ یہ شبد کہاں سے آیا اصل میں اس کا کیا تلفظ تھا یا اب بھی دوسرے دیسوں میں کیوں کر بولا اور لکھا جاتا ہے۔ ہندوستانی پرچار کیلئے عام جم لفظوں کا خیال رکھنا اور آسان تلفظ کو صحیح مان لینا لازمی ہے۔

آسان لکھاوٹ

ہندوستانی پرچار کے لئے ملے جلے لفظوں اور آسان اچارن کے علاوہ آسان لکھاوٹیں بھی لازمی ہیں مگر لکھاوٹ کے بارے میں تفصیل سے ذکر کرنیکا یہاں موقع نہیں ہندی اردو لکھاوٹوں کو آسان بنانے کے لئے موجودہ لکھاوٹوں میں سے ہم آواز حرفوں کو یعنی ایک ہی طرح بولے جانے والے حرفوں میں سے ایک رکھ کر دوسرے کو

[illegible] چاہئے۔ مثلاً یہ کہ اردو میں سے ث ح ذ ص ض ط ظ
صورتیں نکال دیئے جائیں کیونکہ ان کے ہم تلفظ س ت ز اور [illegible]
ہی ہندی لکھاوٹ میں سے [illegible] اور [illegible] کو بھی نکال
دینا چاہئے اور جہاں ایک ہی حرف دو مرتبہ آتا ہے یا دو دو حرف
ملا کر لکھے جاتے ہیں انکی اصل شکل برقرار رکھنی چاہئے۔

اردو لکھاوٹ کو آسان بنانے کی منظم کوشش ابتک کسی جماعت نے شروع نہیں کی مہاتما گاندھی کی لیڈری میں راشٹر بھاشا پرچار سمتی نے ہندی لکھاوٹ کو آسان بنانے کی کوشش شروع کی ہے افسوس ہے کہ ہندی سنسار تو بہت بڑی بات ہے خود ہندی ساہتیا سمیلن نے بھی اس لکھاوٹ کو اختیار نہیں کیا اور ان لکھائی اصلاحوں کے اصولوں کو مانتے ہوئے بھی وہ اپنی تقریباً تمام پستکیں اور رسالے پرانی لکھاوٹ میں چھاپ رہا ہے!

آخر میں میں ہندوستانی پرچار سبھا کے منتری کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھے یہ موقع دیا کہ میں اپنے وچاروں کو پرگٹ کرسکوں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اکثر لوگ میرے مخالف ہونگے اور نہ صرف ہندی پریمی بلکہ اردو کے حامی مجھے برا بھلا کہینگے مگر ہندوستان کی ترقی کے معنی ہی یہ ہیں کہ اردو کے کٹر حامیوں اور ہندی کے کٹر پریمیوں کو تھوڑا بہت ناراض کرکے ایک ایسا راستہ اختیار کیا جائے جو انکے برابر برابر چلتا ہو اور آخر میں ان سے جا ملتا ہو۔ جس طرح گنگا اور جمنا کا سنگم پریاگ میں ہوتا ہے ویسے ہی ہندی اور اردو کا سنگم ہندوستانی ہے اور جس طرح گنگا جی کا پاک دھارا پانی مختلف ندیوں سے آتا ہے اسی طرح ہندوستانی کی بھی بھن بھن دھارائیں ہیں۔ ادبی اردو، مشکل اردو، کٹھن ہندی، راجستھانی، پنجابی اردو، دیہاتی بولی اور دکنی۔ بھانت بھانت کی یہ دھارائیں اپنی اپنی جگہ بھی بہت اہم ہیں اور ان کے الگ الگ بہنے میں بھی کوئی خرابی نہیں بشرطیکہ وہ ایک نکتہ پر آملیں اور وہ نکتہ ہے ہندوستانی یعنی آسان اُردو یا سرل ہندی!

(یہ مضمون ہندستانی پرچار سبھا کی اس کانفرنس میں پڑھا گیا تھا جو گذشتہ مارچ مہاتما گاندھی کی صدارت میں واردھا میں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب بھی تشریف فرما تھے جنھوں نے بعد میں ڈاکٹر جعفر حسن صاحب کا پیش کردہ رسالہ "آسان رسم خط" پڑھ کر پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کو ایک خط لکھا تھا۔ یہ خط کیفی صاحب کے نوٹ کے ساتھ ارمئی کی "ہماری زبان" سے نقل کیا جاتا ہے)۔

اُردو املا

ڈاکٹر سید محمود اور برج موہن دتاتریہ کیفی

ہر زبان کی املا میں ہمیشہ اصلاح اور ترقی کی ضرورت محسوس ہوتی رہی ہے اور شاید ہمیشہ رہے۔ ہمارا روئے سخن یہاں اُردو املا کی طرف ہے۔ املا کی دقتیں دو قسم کی ہوا کرتی ہیں۔ ایک داخلی اور دوسری خارجی۔ داخلی دقتوں کی بنیاد عموماً متعلقہ زبان والوں کی قدامت پرستی ہوا کرتی ہے اور خارجی دقتیں وہ ہیں جو باہر سے آئے ہوئے الفاظ پیدا کرتے ہیں۔ اردو بھی انگریزی کی طرح ایسی ہی دقتیں پیش کرتی ہے جبکہ دیوناگری املا میں دوسری قسم کی یعنی داخلی دقتیں پائی جاتی ہیں۔ اس موقع پر ہمیں اُردو املا میں ایک انقلابی تجویز کی نسبت کچھ کہنا ہے۔ یہ ڈاکٹر سید محمود صاحب کے ایک خط کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ وہ خط اس اشاعت میں جا رہا ہے۔

چونکہ یہ معاملہ ہر پہلو سے نہایت اہم ہے اس لئے ہم ڈاکٹر صاحب کے اس خط کو جوں کا توں چھاپ دیتے ہیں اور سردست اپنی قطعی رائے اور تبصرے سے پرہیز کرتے ہیں تاکہ ناظرین اپنی رائے آزادی سے ظاہر کرسکیں اتنا ضرور یاد دلانا ہے کہ املا کی اصلاح کا مسئلہ انجمن ترقی اردو کے ذہن سے دور کبھی نہ تھا۔ کچھ مدت ہوئی کہ انجمن نے اسی اردو املا کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی تھی جس کی سفارشوں کو کامل غور اور بحث کے بعد "ہماری زبان" میں اردو ادیبوں کی رائے کے اظہار کی غرض سے شائع کیا گیا۔ ڈاکٹر محمود صاحب کی اصلاحیں بہت ضروری نوعیت اور انقلابی ہیں اس لئے پورے غور اور بحث کی

مستحق ہیں ۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب موصوف کا خط اس نوٹ کے بعد دیا جاتا ہے ۔

سیوا گرام ۔ واردھا

۱۲ مارچ ۱۹۴۵ء

۔ مکرمی و معظمی جناب کیفی ساحب ۔ تسلیم ارز ہے ۔ میں آپ کو "آسان رسم خت" میں یہ ارزا لکھ رہا ہوں اور اس تجویز کے بارے میں جو ہندوستانی کانفرنس میں کی گئی تھی آپ کی قیمتی رائے چاہتا ہوں ۔ آپ نے ڈاکٹر جافر حسن کا چھوٹا رسالہ اس تجویز کی تائید میں زوروں پڑھا ہوگا ۔ جب چند برس ہوئے ہم نے صوبہ بہار میں تالیم بالغان کا کام شروع کیا تھا اسوقت مجھے محسوس ہوا کہ املا کی شکل کے باعث بہت سے لوگوں نے اردو سیکھنا چھوڑ دیا ۔

میری زاتی رائے تو لیٹن رسم خط کے موافق ہے لیکن ابھی اس میں بہت دیر ہوگی ۔ جبتک ہم کیوں نہ اردو میں آسان رسم خت کو اختیار کریں ؟ لفزوں کے مانا سمجھنے میں کچھ دقت ہوگی لیکن ابارت کے تسلسل سے مانا و متلب سمجھ میں آجائینگے ۔

اگر انجمن ترقی اردو اور دار المسنفین آزم گڈھ اپنی سند دیدیں ۔ تو یہ کام آسان ہوجایگا ۔ بہرحال آپ ہزرات کو اس بات پر غور کرنا ہوگا ۔ برس دو برس کے اندر آم تالیم ہندوستان میں جاری ہوگی ۔ پھر اگر ہم اردو رسم خت کو آسان نہ بنائیں گے تو یہ رسم خت مقابلے میں پیچھے رہ جایگا صرف آٹھ ہرفوں کو چھوڑنا ہوگا (ث ح ذ ص ض ط ظ اور ع) ۔ بہرحال کم از کم اس کے متابق آپ ہزرات "ہماری زبان" میں اپنی تفصیلی رائے [illegible] اور اس کے دونوں پہلو پر پوری تور پر بحث ہو ۔ ٹائپ اور ٹائپ رائٹر کی آسانی تو زرور ہوجائیگی اور اوام اردو رسم خت کو آسانی سے سیکھ سکیں گے ۔

مہربانی کرکے "ہماری زبان" مجھے یہاں زرور بھیجئے اور اور وہ خاص پرچے جنکو میں نے آپ سے مانگا تھا ۔ آج شریمان اگروال نے گاندھی جی کی ترف سے دس نکتے ہندوستانی کے بارے میں شایا کرائے ہیں جناب کی اس بارے میں کیا رائے ہے ؟

۔ جواب کا منتظر رہونگا ۔ مالوم نہیں آپ اس خط کو پڑھ بھی سکیں گے یا نہیں ؟ مزہکا خیز تو مالوم ہوتا ہے لیکن کیا کیا جائے ۔ اوام تک یہ رسم خت کیسے پہنچے ؟

خاکسار سید محمود (محمود)

("ہماری زبان" ا رمئی ۱۹۴۵ء)

اردو اِملا

ڈاکٹر سید محمود کا خط ڈاکٹر جعفر حسن کے نام

آخر میں اس خط کو نقل کرنا بھی مناسب ہوگا جو اردو املا کی مجوزہ آسانی کے بارے میں ڈاکٹر سید محمود صاحب نے ڈاکٹر جعفر حسن صاحب کو لکھا ہے ۔

سیوا گرام ۔ واردھا

۳ مارچ ۱۹۴۵ء

برادرم ڈاکٹر ساحب ۔ اسلام الیکم

کل شب میں مجھے آپکی تجویز "آسان رسم خت" پڑھنے کا موقا ملا ۔ سبحان اللہ ۔ یہ تجویز اور اس سے زیادہ اس پر امل ازبس زروری ہے ۔ میں بھی ایک ارسے سے یہی سوچ رہا تھا مگر اب آپ نے اسکو املی جامہ دیا ہے ۔ زرورت ہے کہ ہم لوگ اس پر خد امل شروع کردیں ۔ اگر انجمن ترقی اردو اور دار المسنفین آزم گڈھ کی سند مل جائے تو یہ کام آسان ہوجایگا ۔ میں اس بارے میں مولوی ابدالحق ساحب اور مولانا سلیمان ندوی سے خت وکتابت کرونگا ۔

لفزوں کے مانے بدل جانے کے اےتراز کے الاوا کوئی دوسرا قوی اےتراز مجھے نہیں ملا ۔ آپ چونکہ ان مالات پر غور و فکر کرتے ہیں ۔ اس لئے ارز ہے کہ اس تجویز کے خلاف جتنی باتیں مل سکیں ان کو جما کیجئے اور جوابات کے ساتھ شایا کردیجئے تاکہ اس تجویز کے خلاف جتنے اےتراز ہیں سب پر غور کیا جاسکے ۔

بقیہ مضمون صفحہ ۔۔ پر

مولانا سیّد احمد بریلوی رحمتہ

(تحریک پاکستان کی ابتدا)

از ——— منظر رضوی

مولانا سید احمد بریلوی مسلمانان ہند کے پہلے قومی رہنما ہیں جنہوں نے ہر فرقہ، قبیلہ اور طبقہ کے مسلمانوں کو ایک قومی شیرازہ میں متحد کرکے ان کے جمہوری حقوق اور سیاسی آزادی کے حقوق، ایک قومی وطن اور قومی ریاست کی تعمیر کے لئے تمام عمر جدو جہد کی ہے۔

سید احمد صاحب ۱۷۸۶ء میں رائے بریلی (صوبہ متحدہ) میں پیدا ہوئے۔ جوان ہوکر تحصیل علم کے لئے وہ شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں دہلی حاضر ہوئے۔ سید صاحب نہایت ذہین اور حساس دل و دماغ کے انسان تھے۔ انکی علمی ترقی کی رفتار بہت تیز تھی مگر ان کا رجحان روحانیت کی طرف تھا اس لئے انھیں طریقت کی تعلیم دی گئی۔ تحصیل علم سے جب وہ فارغ ہوئے تو بڑے بڑے علماء اور اکابرین اسلام نے آپ سے بیعت کی۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید برادر زادہ شاہ عبدالعزیز صاحب اور مولوی عبدالحئی صاحب خویش شاہ صاحب موصوف نے آپ سے بیعت کی اور آپ کے پہلے خلیفہ ہوئے۔

اسوقت سلطنت مغلیہ ختم ہوچکی تھی۔ ملک پر تین بڑی بڑی طاقتیں سکھ، مرہٹے اور ایسٹ انڈیا کمپنی حاوی تھیں۔ ایک طرف تو ان تینوں طاقتوں میں باہمی کشمکش تھی اور دوسری طرف ہندوستانی عوام بالخصوص بنگال، بہار اور یوپی کے کسانوں اور دستکاریوں میں بےچینی اور سرزنش۔ گاؤں میں کسان زمیندار فسادات اور منڈیوں میں انگریز خریدار اور ہندوستانی دستکار اور دوکاندار، انگریز دوکاندار اور ہندوستانی خریدار میں سخت سے سخت تصادم تھا۔ پرانا نظام مٹ رہا تھا لیکن نئے نظام زندگی کی کوئی علامت نظر نہیں آرہی تھی۔ اس سے اہل علم طبقہ میں عام مایوسی اور بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی۔

ان دنوں میں محمد بن عبدالوہاب کی تحریک احیاء و ترقی اسلام سے مسلمانان ہند بھی متاثر ہو رہے تھے جو در اصل مسلمانان عالم کے بین الاقوامی اتحاد اور سامراج دشمن جدو جہد کا پیش رو تھی۔ ہندوستان میں اس تحریک کے رہنما مولانا اسمٰعیل صاحب شہید تھے۔ سیاسی مقصد تو اس تحریک کا مسلمانوں کو متحد کرکے آزادی اور جمہوری حقوق کے لئے جہاد کرنا تھا۔ لیکن ہندوستانی مسلمان عقاید کی موشگافیوں اور جزوی اختلافات کی بنا پر دو جماعتوں میں تقسیم ہوگئے۔ اہل حدیث اور اہل سنت، دونوں جماعتوں کو مولانا سید احمد بریلوی نے متحد کرکے انھیں ایک جہاد پسند سیاسی جماعت میں تبدیل کردیا۔ جمیس او کینلے لکھتا ہے:—

"سید احمد صاحب کی جماعت متعدد مختلف اور متضاد گروہوں سے مرکب تھی جنھیں متحد رکھنے میں وہ مدت العمر ساعی رہے۔ ان میں سے ایک گروہ کے سردار مولوی عبدالحئی اور مولوی کرامت علی جونپوری تھے جو اہل سنت کا طریقہ رکھتے تھے اور دوسرے گروہ کے سردار مولوی اسمٰعیل تھے جو چاروں اماموں کی تقلید سے آزاد تھے اور براہ راست حدیث کو اپنا ماخذ قرار دیتے تھے۔"

(کلکتہ ریویو جلد ۱۸۷۱ء صفحہ ۸۰)

سید صاحب کے خلفاء اور مبلغین کی توجہ خطہ پاکستان پر مرکوز تھی جہاں اس امر کا موقع تھا کہ اسلامی سرزمین کو انگریزوں اور سکھوں کے تسلط سے آزاد کرکے ایک اسلامی ریاست کی بنا ڈالی جا سکے۔

سلطنت مغلیہ کی کمزوری کے بعد ہی تمام صوبہ دار خود سر ہو گئے تھے۔ شمالی پنجاب اور صوبہ سرحد کے جنوبی علاقوں پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی خاندانی قائم ہو گئی تھی۔ سکھ حکمران عام طور سے متعصب اور جور و سختی کے عادی تھے۔ وہ مسلمانوں پر سختیاں کرتے تھے۔ سر لیپل گریفن نے لکھا ہے :۔

"ہزارہ کے گورنر سردار ہری سنگھ نالوہ کے سخت برتاؤ اور مسلمانوں سے نفرت کی وجہ سے وہاں مذہبی جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔"
(حکمرانِ ہند صفحہ ۲۱۰)

ڈاکٹر ہنٹر لکھتا ہے :۔

"سکھوں کے ہندوانہ تعصب نے شمالی ہند کے مسلمانوں کے جوش کو بھڑکا کر آگ کا ایک شعلہ اٹھا دیا تھا" (مسلمانانِ ہند صفحہ ۱۲)

ان حالات میں سید صاحب نے اپنے خلیفہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو تحقیق حالات کے لئے پنجاب بھیجا۔ انھوں نے امرتسر لاہور اور دوسرے مقامات کا دورہ کیا۔ انھوں نے بچشم خود دیکھا کہ بڑی بڑی مسجدیں اصطبل بنادی گئیں ہیں۔ اذان بند تھی۔ قرآن کی بے حرمتی اور شعائر مذہبی کی توہین کی جاتی تھی۔ مسلمان مظلوم و مجبور رعایا کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس وقت سید صاحب نے سکھ حکمران پر جہاد کا فتویٰ دیا۔

جہاد عمل ہی نہیں بلکہ ایک تحریک تھی جو تمام ہندوستان بالخصوص یو۔ پی اور بہار کے اضلاع میں پھیل گئی۔ سید صاحب کے ناظم اور مبلغ ہندوستان کے تمام گاؤں اور شہروں میں تبلیغ کرتے، جہاد کے لئے سپاہی، سامان جنگ اور روپے فراہم کرتے۔ یہ تحریک خود مغربی پاکستان کے گاؤں گاؤں میں پھیل گئی۔ مغربی پاکستان کے تمام فرقے اور قبائل نے اس تحریک کا خیر مقدم کیا اور ہر طرح کی امداد و اعانت کا وعدہ کیا۔

چنانچہ ۱۸۲۶ء میں سید صاحب اپنی ایک جماعت کے ساتھ حیدرآباد سندھ ہو کر افغانستان میں داخل ہوئے اور جب ۱۸۲۶ء میں درۂ خیبر میں سے گزر کر پنجاب پر حملہ آور ہوئے تو سرحدی قبائل اور شمالی پنجاب کے مسلمانوں نے بھی سکھ تسلط کے خلاف علم جہاد بلند کر دیا۔ اپنے ملک کی اس اندرونی حالت اور مسلمانوں کے میلان کو دیکھ کر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سید صاحب کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ وہ دریائے اباسین کے اس کنارے کے ملک کو جس پر سید صاحب کے مجاہدین قبضہ کر چکے تھے مہاراجہ صاحب کی طرف سے انعام تصور کریں اور اپنے قبضہ میں رکھیں لیکن سید صاحب نے جواب دیا کہ ہماری غرض ملک گیری نہیں بلکہ مسلمانوں کی آزادی حاصل کرنی ہے۔ انکی جد و جہد ملک گیری کے لئے نہیں تھی۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ سید صاحب اس سرزمین کو مسلمانوں کا وطن تصور کرتے تھے وہ کسی دوسرے کے ملک پر قبضہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انکا مقصد مسلمانوں کے وطن کو غیروں کے ناجائز اور غاصبانہ قبضہ سے آزاد کرنا تھا۔

مسلسل چھ سال تک جہاد اور فتح کشی کا سلسلہ رہا۔ سید صاحب کے مجاہدین نے تمام سرحدی علاقہ کو پشاور تک سکھوں کے تسلط سے آزاد کرا لیا۔ لیکن عین اسی موقع پر سید صاحب کے مقامی رفقا میں باہمی رقابتیں پیدا ہو گئیں۔ پرانے بین القبائلی رشک و حسد اور مناقشے نئے سرے سے ابھر آئے۔ ارباب بہرام خاں کو اسکا قلق تھا کہ اسکے پرانے رقیب سلطان محمد خاں کو جو پہلے سکھوں کی طرف سے حاکم پشاور تھے معزول کر کے انھیں حاکم مقرر کیوں نہیں کیا گیا۔ دوسری طرف مولوی مظہر علی نے ایک معرکہ میں سلطان محمد خاں کے بھائی سردار یار محمد خاں کو قتل کیا تھا۔ سلطان محمد خاں کو اس امر کا غصہ تھا کہ مولوی مظہر علی کو قاضی کیوں مقرر کیا گیا۔ سلطان محمد خاں نے قاضی صاحب کو دربار میں بلا کر قتل کیا اور خوانین سمہ سے سازش کر کے تحصیلدار عشور کو جنھیں سید صاحب نے مقرر کیا تھا نماز عشاء پڑھتے وقت قتل کرا دیا۔

سرحدی مسلمان اسوقت تک مختلف قبیلوں میں تقسیم تھے سید صاحب کی تبلیغ کے باوجود وہ قبیلے متحد ہو کر ایک قوم بن نہ سکے تھے اس لئے جب سیاسی اقتدار ہاتھ میں آیا تو وہ ایک دوسرے سے لڑ پڑے۔ سید صاحب سلطان محمد خاں کی سرکوبی کر سکتے تھے۔ انکا ذاتی اثر اور سیاسی دبدبہ دونوں اس کام کے لئے کافی تھا۔ لیکن مسئلہ صرف ایک فرد یا ایک قبیلہ کی سرکوبی کرنا ہی نہ تھا۔ برخلاف اسکے انتشار اور پراگندگی کی صورت میں اس قسم کا کوئی اقدام مزید انتشار اور

وزیری کا باعث بن سکتا تھا۔ مسئلہ کی نوعیت بالکل مختلف تھی۔ وہ یہ مسلمانوں کے مختلف قبائل اور فرقوں کو ایک قومی شیرازہ میں متحد کیا جائے جس کے لئے مسلسل سیاسی تبلیغ اور تعلیم و تربیت کی ضرورت تھی۔ خود سید صاحب بریلوی اس ضرورت سے بخوبی واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے آپس میں تیغ آزمائی کرنے والے مفسدہ پرداز اور انتشار انگیز عناصر کو بزور شمشیر مغلوب کرنے کی بجائے اپنی جماعت کے سربرآوردہ افراد کو سیاسی تبلیغ اور تعلیم و تربیت کے کام پر مامور کرنے کا فیصلہ کیا۔ فتح خاں کو (سنہ ۱۸۳۰ء) سردار مقرر کرکے سید احمد صاحب کا لشکر علاقہ سمہ سے دو تین منزل آگے بڑھا ہوگا کہ سکھ فوج نے سمہ پر یورش کی اور اہل سمہ کو قتل کرکے ہر گاؤں کو جلا کر خاک کر دیا۔ سید صاحب کا لشکر آگے بڑھتا گیا یہاں تک کہ بھوکر منک میں سکھوں نے مجاہدین پر حملہ کر دیا۔ مجاہدین نے سید صاحب کی رہنمائی میں سکھوں کا جم کر مقابلہ کیا اور انھیں پے در پے شکستیں دیں یہاں تک کہ بالاکوٹ پر قبضہ کر لیا۔ اسی مقام پر سکھوں کے ساتھ ایک زبردست جنگ ہوئی جس میں سید صاحب ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۶ مئی ۱۸۳۱ء شہید ہوئے۔ آپ کے خلیفہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب بھی وہیں شہید ہوئے۔

سید صاحب کی عمر اس وقت محض ۴۵ سال کی تھی۔ مگر اس تھوڑے سے عرصہ میں انھوں نے حق پرست اور آزادی خواہ مجاہدوں کی ایک بہت بڑی جماعت تیار کر دی تھی جو انکی شہادت کے بعد بھی مسلمانوں کے سیاسی اتحاد، جمہوری حقوق اور قومی آزادی کے حصول اور قومی وطن کی تعمیر (جو آبادی کے تناسب کے اعتبار سے پنجاب، سرحد بلوچستان اور سندھ ہی مقام) کے لئے جد و جہد کرتی رہی۔

جس زمانہ میں حضرت مولانا سید احمد بریلوی سرحد میں مصروف پیکار تھے بنگال میں میر نثار علی عرف ٹیٹو میر کی شخصیت نمایاں ہوئی جو سید احمد صاحب کے معتقدین اور متبعین میں سے ایک سربرآوردہ شخص تھے۔ بنگال کے ہزاروں کسان اور دستکار جو ہندو زمینداروں اور ساہوکاروں کے مظالم سے تنگ آگئے تھے انکے ساتھ ہوگئے۔ یہ مظالم جن صورتوں میں ہوتے تھے ان میں سے ایک کا حال حسب ذیل ہے جسے ایک انگریز مصنف نے قلمبند کیا ہے:۔

"جون ۱۸۳۱ء میں کشن رائے زمیندار پورنہ کے خلاف ایک نازک حالت پیدا کر دی۔ اس نے اپنے ہر مسلمان کاشتکار پر جو وہابی (سید احمد صاحب کی تحریک کا پیرو) کہتا تھا ایک محصول لگا دیا جو وہ اسے ڈاڑھی کا ٹیکس کہہ کر وصول کرتا تھا۔ اپنے موضع میں تو اس نے یہ محصول جبر و سختی سے وصول کر لیا لیکن جب اس کے کارندے قریب کے موضع سرفراز پور میں پہنچے تو وہاں میر نثار علی مع اپنے متبعین کے موجود تھے۔ انھوں نے ان کارندوں کو گرفتار کر لیا۔ جب کشن رائے کو اسکی خبر ملی تو دو تین سو آدمیوں کو جمع کرکے اس نے بھیجا جن کے ساتھ مسلمانوں کا مقابلہ ہوا۔ وہ لوگ لوٹ لئے گئے۔ مکانات اور مسجدیں جلا دی گئیں۔ جب عدالت کی تحقیقات ہوئی تو تھانہ دار نے الٹا مسلمانوں پر الزام عائد کیا۔ آخر میں دونوں طرف کے دعوے خارج کر دئے گئے۔ مگر مسلمانوں کو تھانہ دار پر غصہ تھا اسلئے انھوں نے اسے مار ڈالا۔ دوسری طرف کشن رائے نے مسلمان کاشتکاروں سے بقایا لگان کی وصولی میں بڑی سختیاں کیں"

(کلکتہ ریویو ۱۸۷۰ء جلد ۱۰، صفحہ ۱۰۹)

ان حالات سے مایوس ہو کر میر نثار علی نے اپنی جماعت کے لوگوں کو جمع کیا جن کی تعداد پانچسو کے قریب ہوگئی۔ انھوں نے کشن رائے پر دھاوا بول دیا۔ کشت و خون اتنا ہوا کہ معاملہ پولس کی بس سے باہر ہوگیا۔ فوجیں بلائی گئیں اور مہینوں کے مقابلہ کے بعد میر نثار علی شہید کئے گئے اور انکی جمعیت منتشر کی گئی۔ اس قسم کے بلوے اور فسادات بنگال میں آئے دن ہو رہے تھے جن میں کہیں میر نثار علی اور کہیں مسکین شاہ اور کہیں کسی اور کی شخصیت کام کر رہی تھی۔ لیکن بنگال میں اسوقت کوئی ایسی شخصیت نمایاں نہیں ہوئی جو مسلمانان بنگال کو ایک سیاسی نصب العین کے تحت متحد کر سکتی۔

سید احمد صاحب کی شہادت کے بعد تحریک کا مرکز صادق پور پٹنہ بن گیا جہاں سید صاحب کے خلفاء مولانا ولایت علی اور انکے چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی رہتے تھے۔ پٹنہ سے یہ لوگ تمام ہندوستان خصوصاً سرحد اور بنگال کی سیاسی رہنمائی اور مذہبی پیشوائی کے فرائض انجام

دیتے تھے۔

سید صاحب کی شہادت کے بعد سید صاحب کے رفیقوں کی جماعت جکی تعداد ڈیڑھ سو تھی مقام ستھانہ میں جو دریائے انڈس کے اس پار واقع ہے رہ گئے تھے۔ مجاہدین کی اس جماعت کے خلیفہ مولانا نصیرالدین صاحب تھے جو خود سید صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے ایک تھے یہ جماعت اپنے مرکز پٹنہ سے وابستہ تھی۔ انہی دنوں میں وادی سوات کے جرگوں نے سید اکبر شاہ کو بلا کر اپنا سردار بنا لیا تھا۔ اور اسی طرح یہ مقام بھی مجاہدین کا ایک مرکز بن گیا تھا۔ جن کے زیر اثر سرحد کے بہت سے جرگے تھے۔

مولوی عبدالرحیم صاحب صادق پوری (پٹنہ) نے سید صاحب کی شہادت کے بعد کے حالات کو قلمبند کیا ہے :-

"ہر تعلقدار آزاد بادشاہ تھا یہ لوگ آپس میں تیغ آزمائی کرتے تھے آپس میں لڑتے۔ اس حالت زبوں سے سکھوں کو انھیں ستانے کی جرأت ہوئی اور ان کے آپس میں مینڈھے لڑواتے۔ جب یہ لوگ اپنی قوت آزمائی سے عاجز آجاتے تو حالت اضطراری میں برکات مجاہدین یاد آتیں اور تب اعانت و نصرت کی درخواست کرتے۔" (دارالمنثور صفحہ ۱۳۶)

یہ صحیح ہے کہ سید احمد صاحب کی شہادت کے بعد مجاہدین کی طاقت کافی حد تک منتشر ہو گئی تھی تاہم انکے ہندوستانی خلفاء مسلمانان پاکستان کو متحد کرنے کی غرض سے مسلسل جدوجہد کرتے رہے، جس میں سیاسی تبلیغ مذہبی تعلیم و تربیت اور فوجی اقدام شامل تھے۔ مولوی نصیرالدین کی جماعت ستھانہ اور وادی سوات سے سرحد اور شمالی پنجاب میں اتحاد عمل کا پیغام لے کر گاؤں اور جرگہ جرگہ کا دورہ کرتی۔ مولوی ولایت علی اور مولوی عنائت علی اپنے مرکز پٹنہ سے بنگال مدراس، بہار اور یو۔پی میں سیاسی تبلیغ کرتے۔ یہاں سے روپے، آدمی اور سامان جنگ فراہم کرتے جو سرحدی مجاہدین کے کام آتا۔ چنانچہ ۱۸۴۳ء میں سردار گلاب سنگھ حاکم کشمیر نے ضامن شاہ حاکم بالاکوٹ پر متواتر حملے کئے حالت پریشانی میں سید ضامن علی شاہ نے مولوی ولائت علی سے امداد کی درخواست کی۔ انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی مولوی عنایت علی کو سرحد بھیجدیا۔ انھوں نے وہاں پہونچکر فوج اور میگزین کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا گلاب سنگھ کو پے در پے شکستیں دیں اور کل علاقہ جات واپس لے کر سید ضامن شاہ کے حوالے کر دئیے۔

اس واقعہ کے دو سال بعد سید ضامن شاہ کے بلانے پر مولوی ولائت علی صاحب ۱۸۴۵ء میں پٹنہ سے سرحد تشریف لے گئے وہاں راجہ گلاب سنگھ کے ساتھ کئی سال تک مقابلہ رہا جس کے بعد گلاب سنگھ کو اپنے بہت سے علاقے سے دستبردار ہو کر پیچھے ہٹنا پڑا۔

لیکن اب برطانوی حکمرانوں کی پالیسی تبدیل ہو گئی تھی پہلے انگریز نے سکھوں کو بڑھایا تاکہ وہ سندھیا کا مقابلہ کریں اسی لئے مہاراجہ رنجیت سنگھ ہمیشہ انگریزوں سے ملے رہے اور انکے شکر گزار رہے (میجر باسو) سندھیا کی طاقت کے منتشر ہونے کے بعد سے برطانوی حکمران اس دن کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے کہ وہ رنجیت سنگھ کی دولت اور سلطنت پر قبضہ کر سکیں۔ ۔۔۔۔ اس میں مطلق شک نہیں کہ پنجاب میں تمام فسادات، انتشار اور پراگندگی کا سبب خود انگریز تھے تاکہ اسے کمزور کر کے اپنی سلطنت سے اسکا الحاق کر لیں۔" (میجر باسو)

محمد جعفر صاحب نے سوانح احمدی میں لکھا ہے :- "سرکار انگریزی دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو۔ (صفحہ ۱۳۹) چنانچہ جب سید صاحب نے لفٹننٹ گورنر کو اپنے ارادہ جہاد کی اطلاع دی تو انہوں نے جواب دیا کہ "جب تک انگریزی عملداری میں کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہو ہم ایسی تیاری کے مانع نہیں ہیں۔" (سوانح احمدی مولفہ مولوی محمد جعفر صاحب) اس بارے میں سر سید احمد خاں نے تحریر کیا ہے:

"ہزاروں مسلح مسلمان اور بے شمار سامان جنگ کا ذخیرہ سکھوں پر حملہ کرنے کے واسطے جمع ہو گیا۔ مگر جب صاحب کمشنر اور صاحب مجسٹریٹ کو اسکی اطلاع ہوئی تو انھوں نے گورنمنٹ کو اطلاع دی۔ گورنمنٹ نے صاف لکھا کہ تمکو دست اندازی نہ کرنی چاہئے۔ دہلی کے ایک مہاجن نے جہادیوں کا روپیہ غبن کیا تو ولیم فریزر کمشنر دہلی نے ڈگری دی وصول ہو کر سرحد بھیجی گئی۔"

محمد جعفر صاحب نے لکھا ہے "اس میں شک نہیں کہ اگر حکومت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ہوتی تو ہندوستان سے سید صاحب کو کبھی مدد نہ پہنچتی۔" (سوانح احمدی)

۱۸۴۹ء تک سکھ حکمرانوں کے خلاف نفرت اور بے اطمینانی پھیل چکی تھی اسوقت انگریزوں نے سکھوں پر فوج کشی کی اور سردار گلاب سنگھ سے مصالحت کرکے انہیں کشمیر کا حاکم مقرر کیا۔ لاہور انگریزی چھاؤنی بن گیا۔ اسوقت برطانوی حکومت نے ہندوستانی مجاہدین کو ہندوستان واپس آنے پر مجبور کیا۔ مولوی ولایت علی مع اپنی جماعت کے پٹنہ واپس آگئے ان پر پابندیاں عاید کردی گئیں کہ وہ سرحد نہ جائیں۔ لیکن میعاد مچلکہ کے گزر جانے کے بعد مولوی ولائت علی اور عنائت علی وغیرہ اپنی جائدادیں فروخت کرکے اور خود ہجرت کرکے ستھانہ جا رہے اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ انکے بعد ڈھائی سو کا قافلہ روانہ ہوا اور تب سے ہجرت کا سلسلہ جاری رہا جس میں ۱۸۵۷ء کے واقعات نے اور بھی اضافہ کردیا۔ مگر ۱۸۶۳ء میں جب برطانوی حکومت نے سرحد پر ہم کرنا شروع کردیا تو اس وقت اسے اسکی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہندوستان سے سرحد کے تعلقات بالکل منقطع کردے جائیں۔ چنانچہ ۱۸۶۴ء اور ۱۸۶۵ء کے درمیانی ایام میں ہندوستانی مجاہدین اور انکے اعزا و اقارب پر پانچ مقدمات بغاوت دائر کئے گئے جن میں مولوی عبدالرحیم مؤلف دارالمنثور اور انکے قریبی رشتہ دار مولوی یحییٰ علی اور مولوی احمداللہ (جو مولوی ولائت علی صادق پور پٹنہ کے خاندان سے تھے) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ اس جرم میں ماخوذ ہوئے تھے کہ انھوں نے سرحدی مجاہدین سے جو انکے قریبی عزیز تھے خط و کتابت جاری رکھی اور انھیں مالی امداد بھیجی۔ ان لوگوں کو سزائے موت دی گئی مگر اس اندیشہ سے کہ مسلمانوں میں ہنگامہ ہوگا انھیں حبس دوام (کالے پانی) کی سزا دی گئی۔

(باقی)

ہندوستان اور چین

از ~~~~~~~ آر۔ سی۔ مجمدار۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی

دنیا کے پچھلے سیاسی واقعات نے ہندوستان اور چین کے درمیان ایک گہرا اور نہ مٹنے والا اتحاد قائم کردیا ہے۔ ہندوستان میں لوگ بارہا اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مشرق کی ان دو عظیم الشان قوموں کے درمیان بہت قدیم زمانے سے روحانی تعلقات اور رشتے قائم ہیں۔ ساتھ ہی چین کے لوگ بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ اُن کی اخلاقی، تہذیبی اور روحانی ترقی میں ہندوستان سے بہت کچھ مدد ملی ہے۔ چین کی موجودہ آزادی کی جدوجہد میں ہندوستان اپنی ہمدردی کے جذبات پیش کرچکا ہے اور اگر ہندوستان سے متعلق چینیوں کے طرزِ عمل اور احساسات کا اندازہ لگانا ہو تو سر رادھا کرشنن کے ان الفاظ پر غور کیجئے جو انھوں نے حال ہی میں اپنے سفرِ چین کے بعد ایک عام جلسہ میں فرمائے تھے۔

"ہندوستان سے متعلق چینیوں کی تمام خدمات کا حال جب کسی زمانہ میں شائع ہوگا۔ اس وقت ہر شخص پر یہ بات ظاہر ہوجائے گی کہ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں چین کے لیڈروں اور مدبرین نے کتنی مدد کی ہے"

عہدِ جدید میں دو قوموں کے درمیان اس قدر باہمی خلوص کا پایا جانا حیرت انگیز ہے۔ اس کے اسباب سمجھنے کے لئے نہ صرف دنیا کی موجودہ سیاسی صورتِ حال کا مطالعہ ضروری ہے بلکہ ہندوستان اور چین کے عہدِ قدیم کی تاریخ سے بھی واقفیت لازمی ہے۔ عام لوگوں کو عہدِ قدیم سے لے کر اس وقت تک کے چین اور ہندوستان کے درمیان جو تعلقات قائم رہے ہیں اُن کا علم بہت کم ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ یہاں پر موٹے طور پر اُن تعلقات کی ایک مجمل سی تاریخ پیش کردی جائے۔

چین اور ہندوستان کی سرحدوں کے درمیان کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہے لیکن راستہ پہاڑیوں اور وادیوں کی وجہ سے بے حد دشوار گزار ہے اور وہ راستے ایسے علاقوں سے گزرتے ہیں جہاں وحشی قبائل آباد ہیں۔ مسافرین کے ساتھ ان وحشی قبائل کا رویّہ بہت معاندانہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان اور چین کے درمیان جو سب سے مختصر راستہ ہے وہ آسام اور اوپری برما سے ہوکر گزرتا ہے۔ اسکا استعمال پرانے زمانے میں بہت کم تھا۔ رسل و رسائل اور آمدورفت کا ذریعہ زیادہ تر سمندر تھا۔ یا ان بے حد طول و طویل راستوں سے ہوکر جو وسط ایشیا سے گزرتے تھے۔ خوش قسمتی سے ہمیں اُن طویل راستوں کا اچھی طرح علم ہے جو ہزاروں سال تک ہندوستانی مبلغین اور سوداگروں کے زیرِ استعمال رہے۔ اسلئے کہ اس راستے کے آس پاس یہاں سے وہاں تک انھوں نے اپنے پیچھے ہندوستانی تہذیب و تمدن کی بہت سی نشانیاں چھوڑیں اور اب کھدائی کے بعد ان کا پتہ چل رہا ہے۔ ان نشانیوں کا مطالعہ ہمارے سامنے قدیم ہندوستان کی تبلیغی اور تہذیبی فتوحات کے متعلق سنسنی خیز معلومات کا دروازہ کھول دیتا ہے یہ راستہ افغانستان سے ہوکر اور کوہستان ہندوکش سے گزرتا ہوا بلخ کو جاتا تھا۔ بلخ سے پھر دو راستے نکلتے تھے۔ ایک اتر کی طرف دریائے آکسس اور جزارطس کی وادیوں سے ہوکر گزرتا تھا جہاں عہدِ متوسط کے بخارا اور سمرقند کے شہر آباد تھے۔ یہی راستہ پھر علاقہ تاشقند کو چھوتا ہوا کوہ تیان شان کو پار کرکے ریگستان "تاک لاماکان" کے شمالی سرحد میں جاتا تھا یہ راستہ چین کے شمالی مغربی صوبہ کان سو میں آکر ختم ہوتا ہے۔ اسی راستے سے جنوب ایک راستہ تھا جو بلخ سے مشرق کی طرف جاتا تھا۔ یہ راستہ پامیر کے پہاڑی سلسلہ کو پار کرکے دریائے تارن کی وادی میں گھس جاتا تھا اسکے بعد ریگستان کے جنوبی کنارہ سے گزرتا ہوا چین کی سرحد کے پاس پہلے راستے سے مل جاتا تھا۔ اسکے علاوہ بھی متعدد مختصر راستے تھے جو ہندوستان اور چین کی سرحدوں کو ملاتے تھے۔ انھیں میں سے ایک راستہ کشمیر سے سیدھا گلگت اور یٰسین کی وادیوں سے ہوکر تارم

گھس جاتا تھا۔

ہندوستان اور چین کے درمیان سب سے پہلے تعلقات کے سلسلے میں بہت سے جھوٹے اور خیالی قصے کہانیاں عام ہیں اسلئے حقیقت کا پتہ چلانا بہت مشکل ہے۔ بہرحال یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ دوسری صدی قبل مسیح میں جنوبی مغربی چین سے برما اور آسام کے ذریعے تجارتی مال ہندوستان میں آتا تھا۔ بدھ مبلغین سب سے پہلے ۶۵ء میں خشکی کے راستے سے ہوکر داخل ہوئے۔ یہ مبلغین ہندوستان کے باشندے تھے وہ اپنے ساتھ ایک سفید گھوڑے پر بدھ مذہب کی متعدد کتابیں اور نشانیاں لائے تھے۔ وہ خانقاہ جسے شہنشاہ چین نے ان کے لئے اپنے دارالسلطنت میں بنوائی تھی، اسکا نام "سفید گھوڑے والی خانقاہ" پڑا ان دو مبلغین نے اپنی زندگی کا بقیہ حصہ چین ہی میں گزارا۔ اس دوران میں ان کا مشغل بدھ مذہب کی تبلیغ اور چینی زبان میں بدھ مذہب کی کتابوں کا ترجمہ کرنا تھا۔ انھوں نے بہت جلد اپنے متعدد ساتھی بنالئے اور چین کے امرا نے بہت گرمجوشی سے اُن کا استقبال کیا۔

ان دو مبلغین نے جو مثال پیش کردی اسکی ایک ہزار سال تک دوسرے مبلغین تقلید کرتے رہے۔ مبلغین کی جماعت کی جماعت مذہبی جذبے کے تحت ہندوستان سے چین کی طرف منتقل ہوتی رہی اور اس سلسلے میں انھوں نے نہایت مسرت کے ساتھ وسط ایشیا کے سفر کے ناقابل بیان مصائب اور تکالیف برداشت کئے ہندوستان میں انکی تکالیف اور قربانیوں کا حال تحریری صورت میں موجود نہیں ہے لیکن چین میں ان ہندوستان کے سپوتوں اور نامور شخصیتوں کا کچھ بیان موجود ہے۔ جنھوں نے ہندوستان کے تہذیب و تمدن کی شمع چین میں جاکر روشن کی اور وسط ایشیا کے وسیع و عریض علاقوں میں بھی جہاں جہاں سے وہ ہوکر گزرے تہذیب و تمدن کے لئے راستہ صاف کیا۔

یہاں پر ان میں سے مشہور ترین مبلغین کا نام دینا ممکن نہیں لیکن کچھ خاص مثالیں دلچسپی سے خالی نہ ہوں گی۔

ہم سب سے پہلے کمارجیو نام کے ایک مبلغ کا تذکرہ شروع کرتے ہیں۔ یہ شخص چوتھی صدی عیسوی میں ایک ہندوستانی ریاست کے خاندانی منتری کے گھر میں پیدا ہوا تھا۔ [illegible] باپ اپنے [illegible] ہوگیا تھا اور اس نے پامیر سے ہوکر وسط ایشیا کے [illegible] شمالی علاقے کی سیر و سیاحت کی۔ یہاں وہ راجہ [illegible] ہوا اور شاہی خاندان میں اسکی شادی بھی ہوگئی۔ اسی شادی سے [illegible] ہوئی اس کا نام کمارجیوا پڑا۔ جب وہ نو سال کا ہوا تو [illegible] تعلیم کے لئے اُسے کشمیر لے گئی۔ یہاں اس نے بدھ مت کے [illegible] میں کامل دسترس حاصل کرلی اسکے بعد وہ وسط ایشیا کے [illegible] علمی مرکزوں کی سیر کرتا ہوا کوچا واپس آیا۔ اس کی [illegible] بدھ دنیا میں چاروں طرف پھیل گئی اس نے اپنی زندگی کے آخری تیرہ سال یعنی ۴۰۱ء سے ۴۱۳ء تک چین میں [illegible] نے ایک سو چھ تصانیف کا چینی زبان میں ترجمہ کیا۔ [illegible] اپنی اعلیٰ قابلیت سے اور چینی اور ہندی فلسفے کے عمیق مطالعے کے ذریعے، ہندوستانی اور چینی زبانوں پر مکمل عبور رکھنے کے سبب [illegible] مترجمین کے ترجموں کی بھی اصلاح کی۔ وہ بہت جلد بدھ مذہب کا سب سے ماہر اور قابل مترجم شمار کیا جانے لگا اور چین کے مختلف علاقوں سے طلبا آکر اس کے شاگرد بننے لگے۔ مرتے وقت اس نے اپنے شاگردوں سے جو نصیحت کی وہ اسکے کردار کی نمائندگی کرتی ہے۔ "میری تصانیف پر عمل کرو لیکن خود میری زندگی کو آئیڈیل نہ سمجھو۔ کنول کیچڑ میں سے پیدا ہوتا ہے کنول سے محبت کرو [illegible]"

ایک اور ہندوستانی مبلغ جس کا نام گن ورمن تھا [illegible] میں چین آیا اس نے ملک کے مختلف علاقوں کی سیر کی اور [illegible] میں شہر نانکنگ میں مستقل سکونت اختیار کرلی شہر کے اعلیٰ افسران اس کے بدھ فلسفے سے متعلق اسکے عمیق اور گہرے معلومات سے متاثر تھے۔ ان میں سے ایک افسر نے تو اسکے لئے ایک خانقاہ بھی تعمیر کرائی تھی وہ اس شہر میں زندگی بھر مقیم رہا اس نے متعدد بدھ مذہب کی کتابوں کا چینی زبان میں ترجمہ کیا۔

تیسرا مبلغ گنا ودمن تھا وہ کشمیر کے شاہی خاندان کا ایک فرد تھا۔ اس سے جب خانقاہ کی زندگی ترک کرکے کشمیر کے تخت پر بیٹھنے کی درخواست کی گئی تو اس نے انکار کردیا اس نے تبلیغی مہم کے سلسلے میں لنکا اور جاوا کی سیر کی اس کی شہرت چین بھی پہنچی اور چین سے

شہنشاہ نے کچھ چینی راہبوں کے ذریعے اسے لویانگ آنے کی دعوت دی۔ کاودمن ۶۷ء میں لویانگ پہنچا۔ شہنشاہ چین بہ نفس نفیس اس کا استقبال کرنے کے لئے شہر سے باہر آیا۔ کاودمن نے جاون نام کی ایک خانقاہ میں مستقل سکونت اختیار کی۔ اس خانقاہ کا نام ہندوستان کی ایک خانقاہ کے نام پر رکھا گیا۔

ایک اور بدھ مبلغ جس کا نام "بودھیہ سا" تھا ہندوستان سے چین کے دوران سفر میں کچھ عرصے کے لئے کاشغر میں مقیم رہا۔ بادشاہ کاشغر نے اس سے درخواست کی کہ وہ شاہی محل میں آکر قیام کرے۔ ایک بار جب بادشاہ کسی فوجی مہم کے سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا تو اس نے "بودھیہ سا" کو شہزادے کا سرپرست مقرر کیا۔ کاشغر سے "بودھیہ سا" کچار اور پھر وہاں سے چین گیا۔ چین میں اس نے بدھ مذہب سے متعلق کتابیں چینی زبان میں ترجمہ کیں۔ اس کا سوانح نگار لکھتا ہے کہ "بودھیہ سا" کیرکٹر کا بہت مضبوط تھا۔ اس نے شہنشاہ چین کے بھیجے ہوئے تحائف واپس کر دئے اور کہا کہ بودھ راہب کے لئے ان تحائف کا قبول کرنا زیبا نہیں۔

دھارمک سکشیا نام کے ایک بدھ راہب کا قصہ بہت المناک ہے۔ یہ راہب پہلے کچار گیا اور پھر وہاں سے مغربی چین کے ایک شہر میں گیا۔ اس شہر میں ایک خود مختار بادشاہت قائم تھی۔ وہ اٹھارہ سال تک یعنی ۴۱۴ء و ۴۳۳ء تک وہاں مقیم رہا اور وہیں اس نے کچھ بدھ مذہب کی کتابوں کا بھی ترجمہ کیا۔ اس کے بعد اس نے ہندوستان واپس آنے کی اجازت طلب کی لیکن چین کے اس حکمران نے اجازت دینے سے انکار کیا اس لئے کہ اسے ڈر تھا کہ چین کی اور دوسری بادشاہوں میں نہ چلا جائے جو اس کی حریف تھیں۔ لیکن بہادر راہب نے شاہی حکم کو ٹھکرا دیا اور ۴۳۳ء میں سفر پر روانہ ہو گیا۔ لیکن اس بے رحم حکمران نے ریگستان میں اسے دوران سفر میں قتل کرا دیا۔

پرامارتھا نام کے ایک بہت بڑے ہندوستان کے عالم نے بھی چین کی سیر و سیاحت کی تھی۔ مگدھ کے بادشاہ کے پاس ایک چینی وفد یہ درخواست لے کر آیا کہ چین میں ایک بہت بڑا بدھ عالم بھیجا جائے۔ پرامارتھا کا انتخاب ہوا اور وہ ۵۴۶ء میں سمندری راستے سے چین پہنچا۔ وہ بدھ مذہب کی کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ساتھ لیتا گیا تھا۔ اس نے چین میں پہنچنے کے بعد شہنشاہ کی درخواست پر ان کتابوں کا چینی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس نے تمام عمر چین میں رہ کر کام کیا اور اس دوران میں اس نے ستر مختلف قسم کی تصانیف کا ترجمہ کیا۔

ان کے علاوہ بھی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان لوگوں کے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے ان مبلغین نے کتنی بے غرضی اور بے لوثی اور قربانیوں کے ساتھ گوتم بدھ کے پیغام کو چین میں پہنچایا۔ ان لوگوں کی محنت اور کوششوں کا آخر نتیجہ یہ نکلا کہ وسط ایشیا سے ہو کر ہندوستان سے چین کو جانے والے تمام خشکی کے راستوں پر بدھ مذہب کے بہت سے مرکز قائم ہو گئے۔ دکھنی راستے پر کاشغر، یارقند اور ختن میں مرکز قائم ہوئے اور اتری راستے پر کچار، کراشیر اور ترفان میں قائم ہوئے۔ ان مشہور مقامات کے علاوہ بھی بہت سی جگہوں پر کھدائی کے ذریعہ وسط ایشیا کے ریگستانوں میں بدھ نوآبادیات کا پتہ چلا ہے۔ ان مقامات پر ہندوستانی دیوی دیوتاؤں کے مجسمے، مذہبی کتابیں اور ہندوستان کی زبان اور رسم الخط لکھے ہوئے سرکاری کاغذات دستیاب ہوئے ہیں۔ جہاں تک خود ملک چین کا تعلق ہے یہاں تانگ خاندان کے شاندار دور حکومت میں بدھ مذہب اور ہندوستانی تہذیب بہت ترقی پذیر حالت میں تھی۔ چین میں تانگ خاندان کی حکومت ۶۱۸ء سے لے کر ۹۰۷ء تک قائم رہی۔ اس طویل دوران میں چین اور ہندوستان کے درمیان بہت گہرے اور مضبوط تعلقات قائم تھے۔ چین کے مختلف شہروں میں ہزاروں ہندوستانی آباد تھے ان میں نہ صرف بدھ راہب تھے بلکہ ہندوستانی سوداگر اور عام سیاح بھی شامل تھے۔

ہندوستانی مبلغین کی آمد اور بدھ مذہب اور ہندوستانی تہذیب کی اشاعت نے چینیوں کے دل میں بھی ہندوستان کی سیر و سیاحت کی خواہش پیدا کی۔ کچھ تو مذہبی جذبہ تھا جو انھیں بدھ مذہب کے مقدس مقامات کی طرف کھینچ لایا۔ لیکن بہت سے سیاح ایسے بھی تھے جو بدھ مذہب کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے اور ہندوستان کی بدھ خانقاہوں میں رائج حقیقی رسم و رواج اور دینی طور طریقوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے۔ دارالعلوم نالندہ کی شہرت بھی

بعض سیاحوں کو ہندوستان کھینچ لائی تھی۔

چینی سیاح ہندوستان میں تیسری صدی عیسوی ہی سے آنا شروع ہو گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بیس چینی راہب بہا آسام اور سری گپتا سے ہوکر ہندوستان آئے تھے اور گپت شاہی خاندان کے بانی نے اُن کے لئے ایک خانقاہ بنوائی۔ لیکن سب سے پہلا معروف چینی سیاح جو ہندوستان آیا فاہیان تھا۔ فاہیان اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ ۳۹۹ء اور ۴۱۴ء کے درمیان ہندوستان آیا۔ یہ چینی سیاح ہندوستانی راہبوں کے پُروقار اور قابل عزت رویہ اور طرزعمل اور طرز رہائش سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے چین کے مقابلہ میں ہندوستان کی خانقاہوں کی حالت بہت بہتر پائی۔ ان میں سے ایک سیاح نے ہندوستان ہی میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور خدا سے دعا مانگی کہ اے خدا تو دوسری زندگی میں مجھے ہندوستان ہی میں پیدا کر۔ لیکن فاہیان اس مقصد سے چین لوٹ گیا کہ وہاں کی خانقاہوں میں ہندوستان کی طرح تنظیم اور ڈسپلن کو رواج دے۔ پانچویں صدی عیسوی میں چینی سیاحوں کی کئی جماعتیں ہندوستان آئیں۔ ۵۱۸ء میں خاندان وی کی چینی ملکہ نے بدھ مذہب کی کتابیں حاصل کرنے کیلئے ایک سرکاری وفد ہندوستان بھیجا سوئی خاندان کے مختصر دور حکومت میں بھی شہنشاہ یانگ نے ایک وفد ہندوستان کو روانہ کیا۔ شہنشاہ یانگ ۶۰۵ء سے لے کر ۶۱۶ء تک برسر حکومت رہا۔ تانگ خاندان کے عہد حکومت میں ہندوستان اور چین کے درمیان تعلقات بہت گہرے ہوگئے۔ یہ خاندان ۶۱۸ء کے بعد سے تین صدیوں تک برسر حکومت رہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں سب سے زیادہ تعداد میں سرکاری وفد اور راہب چین سے ہندوستان آئے۔ جن میں سب سے بڑا سیاح ہیون سانگ تھا۔ یہ شخص چودہ سال تک یعنی ۶۳۰ء سے ۶۴۴ء تک ہندوستان میں رہا۔ اس دوران میں اُس نے پورے ملک کی سیر وسیاحت کی اور تمام چشم دید حالات قلمبند کئے۔ شہنشاہ ہرش اور دوسرے ہندی حکمرانوں نے اس کا بڑا خیر مقدم کیا۔ اُسی کی کوششوں سے شہنشاہ ہرش اور چینی شہنشاہ کے درمیان سفیروں کا تبادلہ ہوا۔ ہیون سانگ کے بعد اور بہت سے چینی سفیروں نے ہندوستان کی ریاستوں کی سیر کی۔ ساتویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں بہت سے چینی راہب ہندوستان آئے۔ اُن میں ساٹھ راہبوں کی زندگی کے حالات چینی کتابوں میں موجود ہیں۔ اُن میں سب سے مشہور کا نام آئی چنگ تھا اُس نے ہندوستان کی بودھ خانقاہوں اور مذہبی اداروں کا مفصل بیان قلمبند کیا ہے جو اب تک موجود ہے۔ تانگ خاندان کے زوال کے بعد بھی چینی راہب بڑی تعداد میں ہندوستان آتے رہے۔ بودھ گیا میں چینی زبانوں میں پانچ کتبے درج ہیں جو انھیں کی سیاحت کی یادگار میں قائم کئے گئے تھے۔ ان کتبوں کی تاریخ ۱۰۰۸ء تا ۱۰۳۳ء ہے۔ ۱۰۳۳ء کے بعد ہندوستان اور چین کے طویل اور قدیم تعلقات منقطع ہوجاتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کے بعد کسی بھی ایسے چینی سیاح کا حال نہیں ملتا جو ہندوستان آیا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہندوستان کے بدھ راہبوں نے بھی ۱۰۳۳ء کے بعد چین کی سیاحت ترک کردی۔

ہندوستان اور چین کے درمیان ان گہرے تعلقات نے چینی تمدن کے پورے ارتقاء اور عروج پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ نہ صرف بدھ مذہب، ادبیات اور فلسفہ بلکہ ہندی تہذیب کی اور بھی بہت سی شاخوں کا چین میں مضبوطی سے رواج قائم ہوگیا۔ خاص طور پر ہندوستانی مجسمہ سازی، فن تعمیر، موسیقی اور علم نجوم نے چین کے تہذیب و تمدن پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ اور ان موضوعات سے متعلق چینی تصورات کو یکسر بدل دیا۔ چین کے بلاک پرنٹنگ کے فن کی وجہ سے بودھ مذہب سے متعلق تمام کتابیں چین میں محفوظ ہوگئیں حالانکہ اب وہی کتابیں خود ہندوستان میں بالکل معدوم ہیں۔ نہ صرف چینی ترجمے بلکہ بہت سے ایسے مسودے جو مدتوں پہلے فراموش کئے جاچکے تھے اب چین میں اُن کا پتہ چل گیا ہے۔ چین میں بدھ مذہب سے متعلق تصانیف اور کتابوں کی وقتاً فوقتاً فہرست تیار کی گئی تھی۔ پھر تبت اور چین میں بہت سے ترجمے اور مسودے ابتک محفوظ ہیں۔ انھیں کے ذریعہ آج ہندوستان کو اپنی گذشتہ عظمتوں کا علم و احساس ہوسکا ہے۔

اطلاع سان فرانسسکو نمبر اگست میں شائع ہوگا ایجنٹ حضرات جلد تعداد سے دفتر کو مطلع کریں۔

(منیجر)

برطانیہ اور ہندوستان

از : ــــــــــ پروفیسر ایچ ۔ سی ۔ مکرجی ۔ ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ڈی ۔ ایم ۔ ایل ۔ اے

[زیر نظر مقالہ ہندوستانی عیسائیوں کے مشہور لیڈر پروفیسر مکرجی کے زور فکر کا نتیجہ ہے جسے ہم شکریہ کے ساتھ شائع کرتے ہیں ۔
ایڈیٹر]

اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریز جب پہلی بار ہندوستان آئے تو اُن کا ارادہ سیاسی اقتدار حاصل کرنے کا بالکل نہیں تھا۔ لیکن آگے چل کر انگریزوں نے اس ملک میں معاشی اور سیاسی کنٹرول کی ضرورت محسوس کی اور انھوں نے جان بوجھ کر ایسی پالیسی اختیار کی جس کا مقصد اس قسم کا کنٹرول قائم کرنا تھا۔ برطانیہ نے بہت جلد اس بات کو محسوس کر لیا کہ ہندوستان کی حکمراں ہونے کی حیثیت سے اُس پر بہت اہم ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔

پہلے تو انگریزوں کا دائرۂ عمل صرف یہاں تک محدود تھا کہ ہندوستان میں ہر شخص کے ساتھ یکساں طور پر منصفانہ سلوک روا رکھا جائے، ملک میں امن و امان قائم رہے اور ان خدمات کے بدلے انگریزوں کو مال گزاری ملتی رہے اور تجارت اور کاروبار کے سلسلے میں انھیں تمام مراعات حاصل رہیں اور اس طرح ملک میں اُن کا اقتدار قائم رہے۔ لیکن اس صورت حال سے کچھ ایسی پالیسیوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو نئے حالات کے پیش نظر زیادہ مفید اور معقول تھیں۔ برطانیہ اب ہندوستان کے معاملے میں خود کو ایک پاسبان کی حیثیت دینے لگی جس کا مقصد زیادہ تر ہندوستان ہی کو فائدہ پہنچانا ہو۔ ہمیں اس بات کے تسلیم کر لینے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہئے کہ برطانیہ کو خود اپنے مقرر کردہ معیار تک پہنچنے میں بہت کچھ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں اس کا بھی اعتراف کرنا ہے اگر ہندوستان میں لارڈ لٹن اور لارڈ ارون جیسے لوگ آئے تو لارڈ رپن اور لارڈ منٹو جیسے لوگوں نے بھی قدم رکھا۔

برطانیہ کے طرز عمل میں یہ تبدیلی زیادہ تر اُن دور اندیش مدبرین کی وجہ سے ہوئی جنھوں نے فوراً یہ محسوس کر لیا کہ ہندوستان کے لوگ برطانیہ کی نگرانی اور تربیت میں ایک روز اس قابل ہو جائیں گے کہ بغیر کسی باہری مدد کے ملک کا نظام حکومت چلا سکیں اور اس طور پر کہ خود برطانیہ کے لئے باعث فخر و مسرت ہو۔ اسی مقصد کے پیش نظر اور انھیں روشن دماغ اور محسن مدبرین کے مشورے سے برطانیہ نے ہندوستان میں مغربی تعلیم کو رائج کیا۔ اس تاریخ سے گویا برطانیہ کے طرز عمل میں تبدیلی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ مغربی تعلیم کو رواج دینے کا گویا مطلب یہ تھا کہ برطانیہ نے ہندوستان کو اپنے تمدن اور جمہوری نظام میں ذہنی اتحاد اور دوستی کی دعوت دی۔

مغربی تعلیم رائج کرنے والے انگریز مدبرین میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ایک روز ہندوستان اور برطانیہ دونوں یکساں سطح پر آجائیں گے اور برطانیہ خود اپنے ہاتھوں ہندوستان میں اپنے سیاسی اور معاشی تسلط کو ختم کر کے دوبارہ ایک تاجر کی حیثیت اختیار کرے گی۔ مارکوئیس ہیسٹنگس اس قسم کے مدبرین میں سے تھا۔ وہ اپنی ایک تحریر مورخہ ۱۷ مئی ۱۸۱۸ء میں لکھتا ہے۔

> وہ دن دور نہیں جب کہ انگلستان کچھ ٹھوس پالیسیوں کی بنا پر ہندوستان میں خود اپنے اقتدار و تسلط کی باگ ڈھیلی کرنے کی کوشش کرے گا۔ انگلستان نے یہ اقتدار غیر ارادی طور پر اور رفتہ رفتہ حاصل کیا ہے لیکن انگلستان کی اسمال بالکل اس تسلط کو

ہاتھ سے نہیں جانے دے سکتا۔ وہ وقت انگلستان کے لئے سب سے بڑے فخر و ناز کا باعث ہوگا اور انگلستان یہ سوچ کر خوشی سے پھولا نہ سمائے گا کہ ہندوستان میں برطانیہ نے اپنا اقتدار اپنی عارضی رعایا کو تہذیب و تمدن کی روشنی دکھانے میں استعمال کیا تاکہ ہندوستان کے لوگ انصاف کے راستے پر تنہا اور بغیر کسی کی مدد کے گامزن ہو جائیں۔ اس وقت ہندوستان اپنے محسن کے ساتھ تجارتی تعلقات ضرور قائم رکھے گا اس لئے کہ ان تعلقات سے انگلستان کا مفاد وابستہ ہوگا۔"

اس قسم کے اور بیانات سے جنہیں اس وقت یہاں پر درج نہیں کیا جا سکتا یہ صرف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مدبرین یہ محسوس کرتے تھے کہ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان دوستی اور باہمی تعاون کا دائرہ محض علمی اور ذہنی دنیا تک محدود نہیں رہ سکتا۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ اس باہمی تعاون کا دائرہ سیاسی دنیا تک پھیل کر رہے گا آج یہ سیاسی اتحاد اور تعاون حاصل کیا جا چکا ہے لیکن ہندوستان کے نکتۂ نظر سے یہ کافی اور اطمینان بخش نہیں ہے اس لئے کہ برطانیہ نے ہندوستان کا تعاون ذرا اوپر کے دل سے طلب کیا ہے۔

۱۸۵۷ء کے غدر کا ایک سب سے خراب نتیجہ یہ نکلا کہ برطانوی افسروں اور عام انگریزوں کے دل میں ہندوستانیوں کی طرف سے مستقل طور پر شکوک و شبہات پیدا ہو گئے۔ ماضی میں اس کا اثر یوں ظاہر ہوا کہ ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں اختیارات کا انتقال رک سا گیا۔ ابھی انگریزوں کے دل و دماغ سے غدر کے اثرات دور نہیں ہونے تھے کہ ہندوستانیوں کی طرف سے دہشت انگیزی کا سلسلہ شروع ہو گیا اور برطانیہ کا یہ طرز عمل اور بھی مضبوط ہو گیا۔

ہندوستانیوں کے دل سے یہ بات کبھی نہ بھولے گی کہ سرکاری احکام کے تحت پولیس والوں نے نہ صرف یہ کہ سیاسی رہنماؤں پر بیجا اور احمقانہ قسم کا دباؤ رکھا بلکہ بے شمار ایسے سیاسی کارکنوں اور رہنماؤں کو قطعی ناانصافانہ طور پر سخت پریشان کیا جو انقلاب اور دہشت انگیزی کے قطعی خلاف تھے۔

جان گنتھر کی تصنیف "اندرون ہند" کے مندرجہ ذیل الفاظ سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

[صفحہ ۵۲۲ اور ۵۲۷] "کانگریسی رہنماؤں پر بہت سخت قسم کی نگرانی رکھی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ دلّی کا بھی چپہ چپہ خفیہ پولیس اور افسروں کی کارروائیوں کا اڈہ بنا ہوا ہے۔ میں نے اپنے ایک دوست سے جو مدراس میں رہتا تھا اس کا پتہ دریافت کیا اس نے جواب دیا بس مدراس کافی ہے کوئی بھی خط ہو پولیس والے ہمارے پاس پہنچا دیں گے۔ یہ غور کا مقام ہے کہ میرے اس دوست کا نام بہت عام قسم کا ہے اور مدراس میں چھ لاکھ چھہتر ہزار دو سو تیس آدمی رہتے ہیں۔

کئی کتابیں حکومت کی طرف سے ناجائز قرار دے دی گئی ہیں اور کچھ اشتراکی قسم کا لٹریچر ہے جو قانوناً ہندوستان میں نہیں داخل ہو سکتا کہنے کے لئے تو اخبارات کو آزادی ہے لیکن درحقیقت زیادہ تر اخبارات کی ادارت پر حکومت کا دباؤ ہے۔ اخبار کا بانڈ اگر ضبط ہو جائے تو اس کی اشاعت رک جاتی ہے۔

آرڈیننس کی رو سے ہندوستان میں کسی کو بھی گرفتار کیا جا سکتا ہے اور بغیر مقدمہ کی کارروائی کے اُسے حراست میں رکھا جا سکتا ہے۔ کوئی جرم ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

دلّی میں میری ایک آئی۔سی۔ایس انگریز افسر سے ملاقات ہوئی۔ اُس نے مجھے نہایت پُرخلوص افسوس کے ساتھ کہا: میں چوتیس سال تک ہندوستان میں رہ چکا ہوں اور میری ابتک کسی ایسے ہندوستانی سے ملاقات نہیں ہوئی جس پر مکمل طور پر بھروسہ کیا جا سکے۔ ہندوستانی ہمیشہ دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں:

ہندوستان میں فوجی بھرتی سے متعلق قابل اعتراض پالیسی اختیار کی گئی ہے اور جس کے تحت محض کچھ خاص فوجی طبقوں اور ذاتوں کو بلکہ ہندوستان کے باہر لوگوں مثلاً سرحدی پٹھانوں اور

تجاویں کو بھرتی کیا جاتا ہے۔ اسکی وجہ سے شکوک وشبہات اور باہمی بے اعتمادی اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اگرچہ موجودہ جنگی ضروریات سے مجبور ہوکر اب اس پالیسی کو ترک کردیا گیا ہے۔

اب تک تو برطانوی افسروں کے دل میں ہندوستانیوں کی طرف سے جو شکوک وبے اعتمادی ہے اُس کا تذکرہ کیا گیا ہے اب اُن غیر سرکاری برطانوی باشندوں کا بھی تذکرہ ضروری ہے جن کے دل میں ہندوستانیوں کی طرف سے شدید بے اعتمادی پائی جاتی ہے۔ ہندوستانی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ایک خاص مدت تک کچھ اہم برطانوی تجارتی مفادوں کے خلاف ہندوستان نے بائیکاٹ کا سلسلہ جاری رکھا اور ساتھ ہی ہندوستان کے اندر اور اُس سے باہر کے برطانوی صنعتی اور تجارتی مفاد اور اجارہ داری کی بھی شدید مخالفت کی۔ اس جدوجہد کا سلسلہ ابھی تک بند نہیں ہوا ہے اور نہ ابھی تک برطانیہ اور ہندوستان کے معاشی مفادوں کے درمیان کوئی صلح کی صورت پیدا ہوئی ہے۔ ہندوستانیوں کا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ انکا شارُ کے مفادات کی مخالفت کو برطانیہ کے حکمرانوں نے قطعی نامنصفانہ طور پر ہندوستانیوں کو خود مختاری نہ عطا کرنے کا بہانہ بنالیا ہے۔ ابھی تک ہندوستانیوں کے دل سے مسٹر چرچل کی تقریریں اور لارڈ برنٹ فورڈ کے وہ بیانات بھولے نہیں ہیں جو اُسوقت شائع ہوئے تھے جب پارلیمنٹ میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ زیر بحث تھا۔ لارڈ انچکیپ اور انکا جہازوں کے مالکوں کا گروہ ہندوستان میں سیاسی اصلاحات کا سخت مخالف تھا۔ لارڈ روتھرمیر نے اپنے زیر قابو اخباروں اور رسائل کے ذریعہ ہندوستان میں سیاسی اصلاحات کے خلاف مستقل طور پر اور جم کر پروپگنڈا کیا تھا جس سے ہندوستانیوں کے سیاسی مقصد کے متعلق برطانوی سرمایہ داروں کے ایک اہم سیکشن کے طرزعمل اور رویہ کا پتہ چل گیا تھا۔ اسکے علاوہ بھی بہت سی مثالیں ایسی پیش کی جاسکتی ہیں جنکی وجہ سے ہندوستانیوں کا یہ عقیدہ مضبوط ہوگیا ہے کہ انگلستان کا بااثر اور اہم کاروباری سیکشن ہندوستان میں برطانیہ کے سیاسی تسلط کو قائم رکھنے پر تلا ہوا ہے تاکہ برطانوی سرمایہ داروں کو اس ملک میں بدستور جہازرانی، بینکنگ اور درآمد کی تجارت میں اجارہ داری اور مراعات حاصل ہیں۔

ہندوستانیوں کے دل سے یہ بات کبھی نہیں بھول سکتی کہ جمشید جی ٹاٹا کو جو ہندوستان کے اولین صنعت سازی کے حامی تھے برطانوی

جہازوں پر مال لادنے اور بھیجنے کے سلسلے کے لئے جگہ حاصل کر
میں کتنی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا جب جمشید جی ٹاٹا کو اس بات
خوف پیدا ہوا کہ اُن کی تمام اسکیمیں خاک میں مل جائینگی تو وہ بمب
جاپان گئے اور وہاں ایک جاپانی جہازراں کمپنی سے جسکا نا
"نپن یوان کیشا" تھا معاملہ طے کیا۔

پھر ہندوستانیوں کے ذہن میں اس حقیقت کی تلخ یاد بھی
زندہ رہے گی کہ برٹش انڈیا اسٹیم نیویگیشن کمپنی نے ہندوستانی تاجرو
کی ہندوستان کی ساحلی تجارت میں حصہ لینے کی کوششوں کی سخت
مخالفت کی تھی۔ ہندوستان کے خلاف اکسچینج بینک کی خود غرض
کوششیں بھی ابھی تک ہندوستانیوں کی ذہن میں تازہ ہے۔ انڈ
سنٹرل بینکنگ انکوائری کمیٹی کے میجارٹی رپورٹ کے نویں باب سے
ہندوستان کے خلاف اُس کے خود غرضانہ طرز عمل کا واضح اندازہ
ہے۔ پھر نوٹ آف ڈسنٹ جسے مسٹر منی رجن سرکار نے پیش کیا
اور مسٹر منو مو بیدار کے مائینوریٹی رپورٹ کے تیرھویں باب
بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کے کچھ انتہا پسند لیڈرا
نے یہ دھمکی دی کہ آزاد ہوجانے کے بعد تمام ہندوستان میں برطا
مفادات کو یکسر سے ختم کردیا جائیگا لیکن برطانیہ کے عام غیر
لوگ اس سے اچھی طرح واقف تھے کہ ہندوستان کے زیادہ سنج
اور بااثر لیڈروں کے آل پارٹیز نے اس بات کا عہد کیا تھا
ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ اگر برطانیہ نے اُن کے وعدہ کا اعتبار
کیا تو پھر ہندوستانیوں نے بھی بالکل بجا اور جائز طور پر برطا
کی باتوں کا اعتبار نہ کیا خاص کر جب کہ ہندوستان کے سے
میں برطانیہ کے بااثر مدبرین، افسران اور کاروباری لوگوں کا معا
طرز عمل بالکل واضح تھا۔

سر فرانسس ینگ ہسبینڈ نے اپنی تصنیف "ڈان ان ا
کے صفحہ دو سو سولہ پر ایک عام انگریز کی ذہنی ساخت کی
تصویر کشی کی ہے۔

"ہم انگریزوں کی اصلی خصوصیت حکومت کرنے کی
کی صلاحیت میں مضمر ہے۔ ہمارے اندر حکومت کرنے کا

جو ہر بالکل فطری طور پر موجود رہے۔ ہم اس فن میں ماہر ہیں۔

ان سطور میں جو نفسیات کارفرما ہے اُس کا ہندوستان میں ہمیشہ مضحکہ اڑایا گیا ہے اس لئے کہ خوشامدی ہندوستانیوں نے ان حکمرانی کی صلاحیت رکھنے والے انگریزوں کی ایک بہت عام کمزوری سے خوب فائدہ اُٹھایا ہے اور وہ یہ کہ "حضور ہی ہمارے مائی باپ ہیں" کہہ کر انگریز افسروں کو نہایت آسانی سے قابو میں کرلیا ہے۔ انگریز افسران اتنے زیادہ خوشامد پسند واقع ہوتے ہیں کہ فوراً ان خوشامدانہ الفاظ کے شکار ہوجاتے ہیں۔ غالباً اسی خصوصیت کے تحت کچھ خاص قسم کے برطانوی افسروں اور حکمرانوں کا یہ رویّہ رہا ہے کہ وہ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان پدرانہ رشتے اور تعلقات کا سلسلہ قائم دیکھنا چاہتے ہیں اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ انگریزوں کا رویّہ ہندوستانیوں کے ساتھ ایک مہربان باپ کا سا ہونا چاہئے۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کا رشتہ صرف نوآبادیات ہی کے ساتھ قائم ہوسکتا ہے اس لئے کہ نوآبادیاتی ممالک کی حیثیت ایسی "اولاد قوموں" کی سی ہے جو "بلوغت" پر پہنچنے کے بعد مادر وطن سے علیٰحدگی اختیار کرنے کے باوجود اُس کی مادرانہ سرپرستی تسلیم کرنے کے لئے تیار رہتی ہے۔ لیکن ہندوستان اور انگلستان کے درمیان جو تعلقات قائم ہیں اُن کی نوعیت بالکل علیٰحدہ ہے۔ اسکے علاوہ ہندوستان میں خودمختار حکومت کا مطالبہ پورے ملک کیطرف سے نہیں پیش کیا جا رہا ہے بلکہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے ایک چھوٹے سے طبقے کی طرف سے۔ برطانیہ کے ایک مخصوص حلقے کی رائے میں ہندوستانیوں کا یہ طبقہ اس لئے آزادی کا مطالبہ پیش کررہا ہے تاکہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد یہ طبقہ خوب اچھی طرح ہندوستان کے جاہل اور غیر ترقی یافتہ عوام کا خون چوسے اور اُن کا استحصال کرسکے۔ برطانیہ کی طرف سے یہ خیال بھی پیش کیا جاتا ہے کہ سفیدفام نوآبادیات کو اس لئے خودمختاری عطا کی گئی ہے کہ وہاں اب کنٹرول کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی اور انگلستان کو اُن پر پورا اعتماد ہے کہ وہ اپنی خودمختاری اور اختیارات کو اعلیٰ مقصد کے حصول میں استعمال کریں گے۔ لیکن ایشیائی ممالک میں اس قسم کی خودمختاری کا عطا کرنا نتیجہ ہے سیاسی اور غیر دستوری احتجاج کا نہ کہ دستوری کارروائی کا۔ اس قسم کا خیال رکھنے والے افسران اور حکام کی رائے ہے کہ اگر برطانیہ اسی طرح ہندوستانیوں کے سیاسی ایجی ٹیشن اور دباؤ سے متاثر ہوکر اختیارات اُن کے ہاتھوں میں سونپتی رہی تو ایک روز برطانیہ کے پاس کچھ نہیں رہ جائے گا۔ اس قسم کی صورت حال اُن کے نزدیک بہت افسوس ناک ہوں گی اس لئے کہ برطانیہ نے ماضی و حال میں ہندوستان کے فلاح و بہبود کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ سب خاک میں مل جائیگا۔

بہت کم ایسے انگریز ہیں جو یہ محسوس کرتے ہیں اور خاص کر وہ انگریز تو اور بھی نہیں محسوس کرتے جو ہندوستان میں سرکاری خدمات انجام دے چکے ہیں اور جو اپنے کو ہندوستان کے عوام کا دوست سمجھتے ہیں۔ کہ اس قسم کی سرپرستانہ حکومت میں لازمی طور پر زوال کے تمام اسباب موجود ہوتے ہیں۔ وہ یہ محسوس نہیں کرتے کہ اس قسم کا پنجابی طرز حکومت جس کے تحت وفاداروں کو انعام و اکرام سے مالامال کردیا جاتا ہے اور پبلک کی بے اطمینانی کے اظہار کو بے رحمی سے کچل دیا جاتا ہے لازمی طور پر ایک عارضی طرز حکومت اور ایسے ہندوستانی میں دائمی بنانے کی کوشش قطعی لاحاصل ہے۔

برطانیہ کی طرف سے ہمیشہ اس خواہش اور اس دلیل کا اظہار ہوتا رہا ہے کہ ہندوستانیوں میں ابھی حکومت کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی ہے یہ خیال رکھنے والے لوگ ہمیشہ اپنے اس خیال کے ثبوت کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کردیتے ہیں کہ ہندوستان کے ایک تہائی حصّے پر یعنی ریاستوں میں خود ہندوستانیوں کی حکومت ہے۔ ان ریاستوں میں جو زیادہ ترقی پسند اور روشن خیال ہیں وہ بعض باتوں کے لحاظ سے اس وقت برطانوی ہند سے بھی زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ برطانوی ہند میں بھی امور انتظامیہ ہندوستانیوں ہی کے ذریعے چلائے جاتے ہیں گذشتہ جنگ کے دوران میں جب بیشتر انگریز افسران جنگ کے کاموں میں مصروف ہوگئے تو تمام امور انتظامیہ ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں چلے آئے اور ہندوستانیوں کی انتظامی صلاحیت اور انکے کام کو برطانیہ نے مکمل طور پر تسکین بخش قرار دیا۔ آج بھی ہندوستانی افسروں کا کام اتنا ہی تسکین بخش ہے جن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو سب سے زیادہ ذمہ داری کے عہدوں پر فائز ہیں۔

ہندوستانیوں کی قابلیت اور صلاحیت پر یہ بے اعتمادی اس حقیقت کے پیش نظر اور بھی بے معنی ہے کہ صوبائی خود مختاری کے دوران میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ امن و امان برقرار رکھنے کا کام اور مالیات کا انتظام بھی ہندوستانی بہت حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں۔ بعض انگریز ہندوستانیوں کے اس انتظامی صلاحیت کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہیں کہ اب وہ مخالف دلائل سننے کے لیے بالکل تیار نہیں ہیں۔

انگلستان اور ہندوستان کے درمیان اس دو طرفہ بے اعتمادی کا تذکرہ کرتے ہوئے آئرلینڈ کے مسئلے پر لائڈ جارج کی ایک تقریر کا اقتباس درج کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ لائڈ جارج اس وقت وزیر اعظم تھے۔ زیر بحث تقریر میں انھوں نے آئرلینڈ کے مسئلہ کو حل کرنے میں جو دقتیں اور مشکلیں پیش آئی تھیں ان کا تذکرہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میرے چاروں طرف

"شکوک و شبہات اور بے اعتمادی سے لبریز فضا ہے۔ یہ بے اعتمادی اس قدر عام ہے کہ ہر چیز اور ہر آدمی اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ شکوک و شبہات کے اس دلدل کی وجہ سے ترقی کا راستہ بالکل رکا ہوا تھا۔ آئرلینڈ کی حقیقی دشمن یہی بے اعتمادی تھی۔"

ہندوستان کے ساتھ بھی یہی قصہ ہے۔ انگلستان کو یہ شک ہے کہ ہندوستانیوں کے دل میں بے ایمانی ہے، ہندوستانی خود اپنے اوپر حکومت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، ہندو مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک روا نہیں رکھیں گے، اچھوت ذاتوں کے ساتھ بے انصافی کی جائیگی، ہندوستانی غیر ملکی حملوں سے اپنی حفاظت نہیں کر سکتے۔ یہ تمام شکوک و شبہات جو انگلستان کے دل میں ہندوستان کی طرف سے موجود ہیں درا صل یہی ہندوستان کی اصلی دشمن ہیں۔

برطانیہ اپنا خیال بدلنے میں دیر لگا رہی ہے اور ساتھ ہی ہندوستان میں برطانیہ کے فائدے سے سیاسی اور فرقہ وارانہ اتحاد کے راستے میں مشکلات پیدا کر رہے ہیں۔ ہندوستانی برطانیہ کے طرز عمل کو متذکرہ بالا شکوک اور بے اعتمادی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اس صورت حال نے ہندوستانیوں کے دل میں پست ہمتی اور تھک کر بیٹھ جانے کا احساس پیدا کر دیا ہے۔ بلکہ اب تو لوگوں کے دل میں شک پیدا ہو گیا ہے کہ برطانیہ کی کوئی بھی سیاسی پیش کش درا صل پر خلوص نہیں ہوتی بلکہ محض دکھلانے کے لئے۔

تلک نے ایک بار بنگلور میں ہوم رول کی موافقت میں تقریر کرتے ہوئے اسی کو بہت درشت الفاظ میں پیش کیا ہے۔

"جب قوم کے افراد تعلیم یافتہ ہو جائیں اور خود اپنے معاملات چلانے کی صلاحیت ان کے اندر پیدا ہو جائے تو یہ فطری ہے کہ وہ انتظام حکومت میں دوسروں کا دست نگر بننے کی بجائے خود اپنے مالک بن جائیں لیکن سیاست کی تاریخ میں بہت دلچسپ بات یہ ہے کہ اکیس سال سے متذکرہ بالا قانون کوئی وجود نہیں رکھتا۔ ہم ایسا سوچ تو سکتے ہیں کہ ایک سو سال کی تعلیم کے بعد کسی قوم کے ہاتھوں میں اس کے انتظامی امور ضرور سپرد کر دینے چاہئیں لیکن اس کا عمل میں آنا غیر ممکن ہے۔

لیکن آخر کیوں ہمارے ہاتھوں میں اختیارات نہیں دئے جاتے۔ خیر براہ راست طور پر ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ ابھی ہم میں اسکی صلاحیت نہیں ہے یہ بتایا جاتا ہے کہ انگریز یہاں ہمیں حکومت کرنا سکھلانے آئے ہیں۔ یہ بات مانتا ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ آخر آپ کب تک ہمیں سکھائیں گے (قہقہہ) ایک نسل تک یا دو نسل تک یا تین نسل تک؟ آخر اس کی کوئی انتہا بھی ہونی چاہئے یا ہم اس طرح آپ کے زیر حکومت قیامت تک غلام بنے رہیں (تالیاں) جناب آپ حد مقرر کیجئے۔ آپ ہمیں سکھلانے آئے ہیں۔ اچھا صاحب۔ لیکن جب بچے کو پڑھانے کے لئے کوئی استاد مقرر کیا جاتا ہے تو اس سے یہ دریافت کیا جاتا ہے کہ تم پڑھانے میں کتنا وقت لوگے، دس سال، بیس سال یا پچیس سال۔

یہ قلعی کھل جاتی ہے کہ ہندوستان کی موجودہ صورت حال کی وجہ سے یہ خیال عام ہے کہ مکمل آزادی ہی کے ذریعے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان غلط فہمیوں کا یہ لا متناہی سلسلہ ختم کیا جا سکتا ہے اگرچہ اسکے ساتھ مکمل آزادی کو ہندوستان کے لئے خطرناک بھی سمجھا جاتا ہے۔

مجھے ذاتی طور پر ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، پارسیوں اور اچھوتوں سے گہری ملاقات اور دوستی ہے اور پھر عیسائیوں کا تو پوچھنا ہی کیا۔ اس لئے کہ میں خود عیسائی فرقہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں نے ہندوستان بھر کی متعدد بار سیاحت کی ہے اور میں نے اندازہ لگایا ہے کہ تمام فرقوں میں مکمل آزادی کا مطالبہ کتنا شدید ہو گیا ہے۔

مثال کے طور پر ایک بار میں پنجاب میں ایک متوسط طبقے کے مسلم گھرانے میں مہمان تھا۔ وہ لوگ مسلم لیگ کے موافق تھے۔ گھر کے مالک اور مالکن حج کر آئے تھے۔ جب میں نے گھر کے مالک سے دریافت کیا کہ مکہ میں دنیا کے دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے ملاقات کرنے کے بعد اس نے کیسا محسوس کیا تو اس نے جواب دیا کہ مجھے اس احساس سے بہت تکلیف ہوئی کہ میں دنیا کے دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں مجھ پر ایک غیر مسلم طاقت کی حکومت ہے۔ اُسکے دل میں یہ احساس اس وقت پیدا ہوا جب اُس نے ایران، افغانستان، عراق اور شرق اردن کے مسلمانوں سے ملاقات کی۔ یہ احساس اس حقیقت کے پیش نظر اور بھی تکلیف دہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی آبادی ۹ کروڑ ہے جو دنیا کے کسی بھی مسلم ریاست کی آبادی سے دوگنی سے بھی زیادہ ہے۔ میرے میزبان نے بتایا کہ اس ذلت کو دور کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہندوستان کو مکمل سیاسی آزادی دے دی جائے۔

میں نے اعلیٰ، متوسط اور اچھوت طبقوں کے ہندوؤں سے اور سکھوں سے گفتگو کرنے کے بعد یہ اندازہ لگایا ہے کہ سب کے سب اس ذلت سے نالاں ہیں کہ تیس کروڑ کا فرقہ جو دنیا میں دوسرے نمبر کا سب سے بڑا فرقہ ہے ایک غیر ملکی طاقت کا غلام بنا ہے۔

ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں نے سیاسی صورت حال پر جو تجویزیں اور قراردادیں منظور کی ہیں اُن سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی ہر سیاسی جماعت مکمل آزادی کی خواہاں ہے۔ آج ہندوستان مکمل آزادی سے کسی کم چیز سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ نسلی فخر و امتیاز کا جذبہ اور قومی وقار کا تقاضہ ہے کہ ہندوستان کو مکمل آزادی عطا کی جائے اس سلسلے میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ آزادی ملنے کے بعد بھی ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان دوستی اور اتحاد کا معاہدہ وجود میں آ سکتا ہے، اسی قسم کا معاہدہ بو پرتگال اور برطانیہ کے درمیان ہے۔

ہندوستانیوں کے علاوہ بہت سے فیاض دل اور اعلیٰ خیال کے مالک ایسے با اثر انگریز بھی ہیں جو سر فرانسیس ینگ ہسبینڈ کے مندرجہ ذیل الفاظ کی تائید کریں گے۔ سر فرانسس ینگ ہسبینڈ ایک ایسے ہی خاندان کا فرد ہے جس نے تین پشت تک ہندوستان میں سرکاری خدمات انجام دی ہیں اور مندرجہ ذیل الفاظ گویا انھوں نے خود اپنی قوم کی طرف سے ہندوستانیوں کو مخاطب کرکے کہے ہیں۔

"ہم نے آپ لوگوں پر حکومت کرنا نہیں چاہا ہم آپ پر حکومت کرنے پر خواہ مخواہ مجبور ہو گئے۔ لیکن اب جب کہ آپ کے اندر خود حکومت کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے ہمارے دل میں آپ پر حکومت کرنے کی خواہش بالکل نہیں ہے اور خاصکر جب آپ نہیں چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے تابع رہیں۔ ہم سب کچھ آپ ہی پر چھوڑ دیں گے لیکن ہمیں اپنی طرف سے یہ کہنا ہے کہ ہم اس بات کو ترجیح دیں گے کہ ہم اور آپ ہمیشہ ساتھ رہیں۔ ہم دنیا کے بہت سے حصوں میں اور بے شمار میدانوں میں دوش بدوش ہو کر دشمن کے خلاف جنگ آزما ہو چکے ہیں۔ ہم نے ساتھ ملکر ہندوستان کی مادی اور ذہنی ترقی کے لئے محنت کی ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ ہمارے اور آپ کے ساتھ رہنے سے آپ ہی کا فائدہ ہوا ہے اور ہمیں اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی عذر نہیں کہ ساتھ رہنے میں ہمارا بھی زبردست فائدہ ہوا ہے۔ ہندوستان سے متعلق ہونے کی وجہ سے برطانیہ

کو جو دولت اور ترقی حاصل ہوئی ہے اور اب بھی ہمارا خیال ہے کہ اگر ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان آئندہ تعلقات کا سلسلہ جاری رہا تو یہ بات دونوں کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ پہلا یہ فائدہ ہوگا کہ اس وقت ہمیں جو فائدے حاصل ہیں وہ قائم رہیں گے اور آپکو یہ فائدہ ہوگا کہ اگر آپ پر سمندر سے حملہ ہوا یا کسی بیرونی طاقت نے خشکی کے راستے سے حملہ کیا تو پوری سلطنت برطانیہ آپ کی حفاظت کرے گی۔ اس کے علاوہ آپ کو دنیا میں ہماری خارجی پالیسی کے زیر اثر رہنے کے فائدے حاصل رہیں گے۔ پھر قرض کے سلسلے میں بھی فائدے حاصل رہیں گے۔ لیکن ان چیزوں سے سلطنت برطانیہ سے باہر رہنے کی صورت میں آپ محروم ہو جائیں گے۔ یہ فائدے ہم دونوں کو حاصل ہوں گے اگر ہم ایک ساتھ رہے۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ ہمارے اور آپ کے درمیان تعلقات قائم رہیں۔ لیکن فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہم آپ کی رضامندی کے بغیر آپ کو سلطنت برطانیہ کے حدود میں رکھنا نہیں چاہتے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ چاہے سلطنت برطانیہ کے اندر رہیں یا اُس سے باہر ہم دونوں اچھے ساتھی بن کر رہیں۔

ہم آپ کو اس بات کا یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہمارا ملک ہمیشہ آپ کا دوست بنا رہے گا۔"

ہندوستان کے قوم پرست تعجب کرتے ہیں کہ آخر انگریزوں کو یہ بات کیوں نہیں سجھائی دیتی کہ برطانیہ پر ہندوستان سے معاشی اور سیاسی قطع تعلق کرنا بالکل فرض ہے۔ برطانیہ جب فاشیت اور نازیت کے خلاف جنگ آزما ہے تو پھر ہندوستان کو کیوں نہیں آزادی عطا کر رہی ہے۔ اگر برطانیہ اس وقت ہندوستان سے اعلان کردے کہ خود ہندوستان کے لوگ اپنے ملک کے مستقبل سے متعلق آپس میں کوئی سمجھوتہ اور فیصلہ کرلیں، اگر برطانیہ اس وقت ہندوستان سے متعلق تمام معاملات خود ہندوستانیوں پر چھوڑ دے تو دنیا بھر میں برطانیہ کی پوزیشن ایک عجیب اعلیٰ و ارفع منزل پر پہنچ جائے۔ لیکن برطانیہ اس وقت غلط طور پہ اس بات پر زور دے رہی ہے کہ ہندوستان میں کچھ ایسے مخصوص مفاد ہیں جن سے متعلق اُسکی کچھ اہم ذمہ داریاں ہیں۔ برطانیہ کے اس طرزِ عمل سے ان مخصوص مفادوں کے نمائندوں کی ہمت افزائی ہوتی ہے اور وہ اپنے پوزیشن اور اپنے تھوڑے سے اثرات کو سیاسی مول تول کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ جہاں تک ہندوستانیوں کا تعلق ہے، وہ اس بات کا اعلان کردیں کہ وہ خود اپنی رضامندی سے سلطنت برطانیہ میں شامل رہنا چاہتے ہیں۔

بقیہ مضمون ہندوستانی پرچار صفحہ ۲۲ سے

"اداسات کر براست" پر امل کرکے آپ کی تجویز کی مشق سب سے پہلے آپ ہی پر کر رہا ہوں۔ جو مقالہ آپ نے ہندستانی کانفرنس میں پڑھا تھا اگر شایا ہو تو اسکی ایک کاپی مجھے بھیج دیجیئے۔ شکرگزار ہوں گا اور آپ نے کیا کیا چیزیں لکھی ہیں انکے دیکھنے کا بھی اشتیاق ہے۔ اگر ممکن ہو تو کبھی کبھی خت سے یاد کرلیا کیجئے۔ آپ کی تجویزوں کو امل جاما پہنانے کی کوشش کروں گا۔ رسم خط کے متالق تو میری رائے رومن خت جاری کرنے کی ہے لیکن اس میں ابھی بہت دیر ہے۔ اس لئے ہم کو اردو میں آسان رسم خت کی تجویز پر امل شروع کردینا چاہئے۔ حیدرآباد کے اردو اخبار نویسوں سے اس پر گفتگو کیجئے خاص کر قاضی ابدالغفار سے۔

زیادہ والسلام

خاکسار

سید محمود (محمود)

(جو حضرات "آسان رسم خط" ناتی رسالہ حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ ½ آنے کے ٹکٹ بھیج کر ڈاکٹر جعفر حسن صاحب نجار اہل حیدرآباد دکن سے حاصل کرسکتے ہیں۔ رجسٹری سے ذریعہ رسالہ منگوانا ہو تو ۳ آنے کے ٹکٹ زیادہ بھیجیں گے)

ہندوستان اور تبّت کے تہذیبی تعلقات

انشا :۔ ادارہ

تبّت ہندوستان کی آخری سرحدوں پر واقع ہے اور اس لحاظ سے ہندوستان کا بے حد قریبی ہمسایہ ہے۔ تبت تہذیبی اعتبار سے چین اور ہندوستان دونوں سے متاثر ہوا ہے۔ لیکن جغرافیائی علیحدگی کی وجہ سے وہاں ایسے تمدن کی نشوونما ہوئی ہے۔ جسے چینی یا ہندوستانی نہیں بلکہ خالص تبتی قرار دیا جاسکتا ہے۔ تبت دنیا کا سب سے اونچا ملک ہے اور سمندری سطح سے بارہ ہزار سے لے کر اٹھارہ ہزار فٹ تک اونچا ہے۔ ملک بنجر واقع ہوا ہے۔ تبت کے زیادہ تر لوگوں کی زندگی مویشیوں اور چراگاہوں پر گزرتی ہے۔ صرف ملک کے کچھ محفوظ حصوں میں کچھ کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ تبت کے چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ اتر پورب کی طرف سے چین اور تبت کے درمیان آمدورفت تو آسان ہے . . . . لیکن اس کی بہ نسبت ہندوستان اور تبت کے درمیان آمدورفت آسان نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تبت کی سماجی زندگی پر ہندوستان سے زیادہ چین کا اثر پڑا ہے۔ تبت اور نیپال کو بہت سے پہاڑی درّے ملاتے ہیں جن کے ذریعے عہد قدیم سے تبت اور ہندوستان کے درمیان تجارت کا سلسلہ قائم رہا ہے۔ چنانچہ تبت پر ہندوستان کے تہذیب و تمدن کا کچھ نہ کچھ اثر ہے۔ کم از کم ایک ہزار سے ڈیڑھ ہزار سال کے عرصہ تک تبت اور ہندوستان کے درمیان بہت گہرے تعلقات قائم رہے ہیں۔ تبت نے اپنے مذہبی عقائد ہندوستان ہی سے حاصل کئے۔ اگرچہ اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جغرافیائی اعتبار سے الگ تھلگ ہونے کے باعث تبت میں جب بدھ مذہب نے قدم رکھا تو اس کی نوعیت اور شکل کچھ مختلف ہوگئی اور اس نے ایک ایسا کیریکٹر اختیار کرلیا جسے مخصوص طور پر تبت ہی سے وابستہ کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ تبت کے بودھ مذہب میں بہت سے ایسے عقائد شامل ہیں جو بودھ مذہب کی اشاعت سے پہلے تبت میں موجود تھے۔

تبت اور ہندوستان پہلی مرتبہ ساتویں صدی عیسوی میں ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔ اس سے پہلے کے تبت کی تاریخ کا ہمیں بہت کم علم ہے۔ اس سے پہلے کے تبت کی تاریخ غالباً تحریری شکل میں موجود نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان سے متعارف ہونے سے پہلے تبت میں کوئی رسم الخط رائج نہ تھا۔ چنانچہ آج تبت کا رسم الخط ناگری ہے۔ تبت کے متعلق ایک روایت مشہور ہے کہ وہاں کا پہلا بادشاہ ہندوستان ہی کا باشندہ تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ شخص کوسال یعنی موجودہ یو۔پی کے راجہ پرسن جیت کا پانچواں بیٹا تھا۔ اور گوتم بدھ کے عہد میں زندہ تھا۔ اس بات کا قطعی امکان ہے کہ تبت میں ایک عرصہ تک ہندوستانی نسل کے بادشاہوں کی حکومت رہی ہے۔

بدھ مذہب سے پہلے جو مذہب تبت میں رائج تھا اُسے بون (Bon) کہا جاتا تھا۔ اس مذہب کی بنیاد جادو ٹونے اور ٹوٹکے پر قائم تھی اور اس میں جسمانی طاقت اور ذاتی بہادری کی تعریف و توصیف کا بھی عنصر شامل تھا۔ اس قسم کا مذہب تبت کے لئے بالکل فطری تھا جہاں زندگی گذارنے کے لئے انسان کو قدرت کے خلاف سخت جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اس مذہب کے تحت مختلف درجوں کے پجاریوں کا ایک نظام قائم تھا۔ ان پجاریوں کو لاما کہا کرتے ہیں اور یہ لاما بودھ مذہب کے عہد میں بھی آج تک موجود ہیں۔

بدھ مذہب تبت میں بہت بعد میں پہنچا۔ اس لئے کہ جغرافیائی اعتبار سے علیحدہ ہونے کے باعث بودھ مذہب چین سے پھیلا ہوا تبت میں بہت بعد میں داخل ہوا۔ بودھ مذہب شمالی مغربی ہندوستان سے ہوکر دریائے آکسس کی وادی سے گزرتا ہوا تجارتی راستوں کے ذریعے چین میں پہنچا تھا۔ بہرحال ایسا معلوم

جاتا ہے جیسے تاریخی عہد سے پہلے کچھ بودھ مذہب کے لوگ نیپال سے ہوکر تبت میں داخل ہوئے تھے۔

تبت کا سب سے پہلا بادشاہ جس کا تاریخ میں تذکرہ موجود ہے اس کا نام "سرونگ تسان گام پو" تھا یہ بادشاہ ۶۲۲ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ اس نے اپنے عہد کے ہندی بادشاہ ہرش وردھن کے دربار میں پیغام بر بھجوائے تھے۔ اس نے بودھ مذہب ماننے والی دو شاہزادیوں سے شادی کی تھی۔ اُن میں سے ایک نیپال کی تھی اور دوسری چین کی۔ انھیں دونوں رانیوں سے بادشاہ کا بھی اعتقاد بدل دیا اور وہ بودھ مذہب پر ایمان لے آیا۔ مقام جوکھانگ کی خانقاہ میں ابھی تک بودھ مذہب کا ایک خیالی مجسمہ موجود ہے جسے چین والی رانی اپنے ساتھ لائی تھی۔

بادشاہ سرونگ نے بودھ مذہب کو اپنی سلطنت کا سرکاری مذہب بنا دیا اور بودھ مذہب کے دس احکام کو ملکی قوانین کی حیثیت عطا کی۔ اُس نے مشہور عالم 'تھان می' کو بودھ مذہب کی تعلیمات کا مطالعہ کرنے کے لئے ہندوستان بھیجا۔ تھان می نے سنسکرت سیکھی اور تبت میں پہلی مرتبہ ناگری رسم الخط رائج کیا۔ آج تک تبت کا رسم الخط اور ہندوستان کے بادشاہ ہرش کے زمانہ کا ناگری رسم الخط بالکل ملتا جلتا ہے۔

بادشاہ سرونگ نے "چوگیال" نامی شاہی خاندان کی بنیاد ڈالی اس خاندان نے تبت میں بودھ مذہب کی اشاعت میں زبردست حصہ لیا اس خاندان نے تقریباً دو صدیوں تک حکومت کی۔ اس خاندان کے آخری بادشاہ کا نام "رال پاچین" تھا۔ یہ بادشاہ نویں صدی عیسوی میں برسر حکومت تھا۔ لیکن وہ مارا گیا۔ اسکے قتل کرنے والے بون (BON) مذہب کے ماننے والے تھے ان لوگوں نے بودھ مذہب کے خلاف ایک تحریک قائم کی تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ "چوگیال" نامی شاہی خاندان کے عہد حکومت میں بون (BON) مذہب ماننے والوں کی مخالفت بہت زوروں پر تھی اسکے بعد سو سال تک کا زمانہ عہد تاریک کہا جاتا ہے۔ اس عہد میں شاہی خاندان کی سرپرستی کی وجہ سے بون (BON) مذہب نے کچھ ترقی کی لیکن اس کی ترقی کا یہ زمانہ بہت مختصر تھا بادشاہ 'لنگ درما' کو بودھ پجاریوں نے قتل کر ڈالا یہ بادشاہ بودھ مذہب کا مخالف تھا۔ اسکے قتل کے بعد بودھ مذہب پھر تبت میں ترقی کرنے لگا۔

اسکے بعد ایک ایسا زمانہ آیا جبکہ ہندوستان اور تبت کے درمیان بہت گہرے تعلقات قائم ہوئے۔ تبت کے طالب علم اور علماء ہندوستان میں علم کی پیاس بجھانے آئے اور ہندوستان کے پنڈتوں نے تبت کی سیر کی لیکن جب مشرقی ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تو ہندوستان اور تبت کے تعلقات منقطع ہوگئے۔ چودھویں صدی عیسوی میں کشمیر پر مسلمانوں نے اور تبت کی حکومت نے بیک وقت کشمیر پر حملہ کرنے کے لئے دونوں میں جنگ اور کشمکش ہوئی۔ آخر مسلمانوں نے تبت کو شکست دیدی اور کشمیر میں ایک مسلم خاندان کی حکومت قائم ہوگئی اسکے بعد ہندوستان اور تبت کے درمیان تہذیبی تعلقات ختم ہوگئے اور تبت زیادہ سے زیادہ چینی تہذیب کے زیر اثر آگیا۔ اس وقت ہندوستان سے تبت کے تعلقات بہت کم ہوگئے محض تھوڑے تاجر گرمیوں میں ہمالیہ کی فلک بوس دیوار کو پار کرکے تبت میں چلے جاتے ہیں۔

مذہبی عقائد کے سلسلے میں تبت پر ہندوستان کا بہت گہرا اثر پڑا ہے نتیجہ یہ ہے کہ تبت کا لٹریچر آرٹ اور فن تعمیر بھی ہندوستانی انداز سے متاثر ہوا ہے۔

بودھ مذہب کی وہ مخصوص قسم جو تبت میں قائم ہوئی وہ "لامائیت" کے نام سے مشہور ہے۔ اسلئے کہ اس مذہب کی تخلیق اور نشو و نما میں لاماؤں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ لامائیت میں قدیم بون (BON) مذہب کے عناصر کافی حد تک موجود ہیں۔ مثلاً جادو اور ٹونا ٹوٹکا اس مذہب پر "تانتریت" (TANTRISM.) کا بھی گہرا اثر پڑا ہے آٹھویں صدی عیسوی میں ایک ہندوستانی بودھ عالم جس کا نام "پدم سمبھوم" تھا۔ بادشاہ کے بلانے پر تبت پہونچا وہاں اس نے شاہی احکام کے مطابق بودھ مذہب کی تعلیمات کی اشاعت کی وہ سوات علاقہ کے اُدین نامی مقام میں پیدا ہوا تھا۔ یہ مقام "تانتریت" (Tantrism) کے مذہبی عقائد کا مرکز تھا۔ چنانچہ جب یہ شخص تبت آیا تو تانتریت مذہب کے عقائد بھی اپنے ساتھ لیتا آیا۔ ان عقائد نے قدیم بون مذہب (Bon) سے مل کر تبت کے مخصوص بودھ مذہب میں [illegible] اور [illegible] سے عقاید کو مضبوط کیا اسی وقت مشرقی ہندوستان سے کئی اور پنڈت تبت

پہنچے اور انہوں نے تبت میں مہایان فرقے کو مضبوط بنیادوں پر قائم کیا۔ مخصوص فرقہ دوسری صدی عیسوی میں ناگ ارجن سے قائم ہوا۔ اس تاریک عہد میں جس کے دوران میں بون (BON) مذہب نے عارضی طور پر ترقی کی تھی۔ مشرقی ہندوستان نے تبت کے تعلقات پھر بڑھ گئے۔ تبت کے بادشاہ "چن چو" کے بلانے پر آتیشہ نام کا ایک بدھ عالم جو بہار کی وکرم سیل نامی خانقاہ کا آچاریہ تھا۔ تبت گیا اور ۱۰۴۲ء سے لیکر ۱۰۵۶ء تک یعنی چودہ سال تک وہاں قیام پذیر رہا۔ اس شخص نے تبت میں ایک نئے فرقے کی بنیاد ڈالی۔ اس فرقے کے عقائد مہایان فرقے کے عقائد کی ایک اصلاح شدہ شکل کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس عہد میں بدھ مذہب کی کتابوں کا ترجمہ شروع ہوگیا۔ تبت کے بہت سے علما ہندوستان کی بدھ تعلیم گاہوں میں علم حاصل کرنے آئے۔ اُن میں سے کچھ نے تانتریت (TANTRISM) کا گہرا مطالعہ کیا۔

امتداد زمانہ کے ساتھ قدیم خانقاہی نظام میں بہت سی خرابیاں پیدا ہوگئیں۔ چودھویں صدی میں لامائیت کی اصلاح کی گئی۔ جو اصلاحیں کی گئیں اُن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نئی اصلاحیں قدیم مہایان عقیدوں کے مطابق ہی کی گئیں۔ اس طرح راہبوں کے شادی نہ کرنے کا رواج دوبارہ قائم کیا گیا اور اُن کے لئے زرد رنگ کا لباس ضروری قرار دیا گیا۔ مقررہ وقت پر خانقاہوں کی نشستیں ہونے لگیں، گناہوں کے اعتراف کا طریقہ رائج ہوا اور سال میں ایک بار گوشہ نشینی اختیار کرنے کا رواج قائم ہوا۔

تبت کا تقریباً تمام تر ادب سنسکرت کی اعلیٰ تصانیف کے ترجموں پر مشتمل ہے پدم سمبھو اور اسکے ساتھی ہندوستان سے بہت سی کتابیں تبت لے گئے جو اہل تبت کی نظروں میں اب بھی مقدس کتابوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان تصانیف کی تعداد کوئی سات سو کے قریب ہے۔ اُن میں کوئی دو تین بھر کتابیں بدھ مذہب کے قدیم ترین اعتقادات سے متعلق ہیں۔ اس کے بعد ہنایان فرقہ کے عقائد سے متعلق ہیں اور ساتھ ہی تانتریت عقائد کی کتابیں بھی ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ کتابیں مہایان مذہب سے متعلق ہیں۔ ان ترجموں کے اصلی سنسکرت نسخے چونکہ اب نایاب ہیں اسلئے اُن کی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی ہے اور ان سے تبت کے لامائی مذہب اور ہندوستانی بودھ مذہب دونوں کا مطالعہ بہت آسان ہوجاتا ہے۔

تبت کا مصوری کا سلسلہ مشرقی ہند یعنی بہار اور بنگال کی مصوری سے ملتا ہے۔ یہ تصویریں زیادہ تر مذہبی عقائد کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اُن میں سے بہت سی تصویریں بہت اعلیٰ قسم کی فن کاری کا نمونہ ہیں لیکن تبت کی تصویریں دراصل ہندوستانی اصلی تصویروں کی محض نقل ہیں۔ نقالی میں اصل کی باتوں کو بہت خاص طور سے داخل کیا گیا ہے تاکہ کوئی چیز چھوٹنے نہ پائے۔ تبت کی مصوری میں آگے کوئی ترقی نہیں ہوئی اور نہ اُن میں کسی اوریجنل جذبے کی جھلک ملتی ہے۔ پھر ان تصویروں کی کوئی تاریخ بھی نہیں ملتی ہے یہ تصویریں تین قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جن میں گوتم بودھ کی زندگی کے حالات سے بحث کی جاتی ہے اور جن میں تانتریت کے عقیدوں کی کوئی جھلک نہیں ہوتی۔ ان کا تعلق براہ راست طور پر ہندوستانی روایات سے ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ آتیشا نامی راہب یہ طرز ہندوستان سے تبت لے گیا تھا۔ تصویروں کی دوسری قسم وہ ہے جس میں گوتم بودھ کو زیادہ رمزیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کا مجسمہ تصویر کے بیچ میں دکھایا گیا ہے اور دوسرے عناصر کو اسکے چاروں طرف ان تصویروں کا طرز چینی مصوری سے ماخوذ ہے۔ تصویروں کی تیسری قسم وہ ہے جس میں دھیانی بودھ کو پیش کیا گیا ہے، ساتھ ہی بدھیت تارا اور دھرتی کے خوفناک سرپرستوں کو دکھلایا گیا ہے، بہت سی تصویروں میں ہندوستان کے پنڈتوں کو خدا بنا کر پیش کیا ہے مثلاً پدم سمبھو اور آتیشا کو اور تانتری مذہب کے چوراسی جادوگروں کو اسی طرح پیش کیا گیا ہے۔

تبت کا فن بت تراشی بھی ہندوستان ہی سے ماخوذ ہے۔ تبت کے اس قسم کے زیادہ تر مجسمے تانبے کے ہیں۔ لیکن چونکہ اس میں زیادہ تر محض ہندوستانی مجسموں کی نقل ہیں اس لئے ان کی کوئی جمالیاتی قدر و قیمت نہیں ہے۔ وہاں کے اسٹوپوں میں ہندوستانی فن تعمیر کی واضح جھلک نظر آتی ہے لیکن ان کا اسٹائل مخصوص طور پر تبتی ہے۔ تبت کے اسٹوپوں کی بنیاد اتنی اونچی کردی جاتی ہے کہ بعض اوقات اس کے نیچے ایک مندر سا بن جاتا ہے۔ بلب کی شکل کا گنبد بعض اوقات بہت چھوٹا بنایا جاتا ہے۔ نیچے کا حصہ تو معمولی اینٹ مٹی اور گارے کا ہوتا ہے لیکن سرا تانبے کا ہوتا ہے۔

تیرہویں صدی سے لیکر اسوقت تک ہندوستان اور تبت کے درمیان تعلقات بالکل منقطع رہے صدیوں تک تبت دنیا سے بالکل علیحدہ رہا اور اس سے ایک عجیب لاعلمی اور پر سحر فضا وابستہ رہی لیکن زمانۂ حال کی سماجی اور سیاسی رفتار پھر تبت کو دنیا سے روشناس کرا رہی ہے اور تبت کی تہذیب میں لوگ پھر دلچسپی لینے لگے ہیں۔ غیر ممالک کے لوگ اب تبت میں داخل ہونے لگے ہیں اور تبت کی خانقاہوں کے کتب خانے اب غیر ملکی علماء کی دسترس سے باہر نہیں ہے، چنانچہ ہندوستان اور تبت کے عہد قدیم کے تعلقات اب مسلسل طور پر زیادہ سے زیادہ اجاگر ہوتے جا رہے ہیں۔

برطانیہ پر ہندوستان کا ۱۵۔ ارب روپے کا قرضہ

از :۔۔۔۔ مسٹر منو صوبیدار ممبر سنٹرل اسمبلی

ہندوستان نے کبھی اپنے آپ کو اتحادی ہونے کا اعلان نہیں کیا اور نہ ہی ہندوستانی لیڈروں سے اس سلسلہ میں مشورہ لیا گیا تھا۔ سان فرانسسکو کانفرنس میں ہندوستان کا حقیقی درجہ دنیا بھر کو معلوم ہو گیا ہے۔ پانچ بڑی طاقتیں ہی اس کانفرنس میں سب کچھ تھیں۔

برطانیہ کے اعلان کے مطابق اس وقت ۱۵ ارب روپیہ برطانیہ نے ہندوستان کا دینا ہے۔ اس رقم کو ہر حالت میں واپس کیا جانا چاہئے ہماری تمام تر کوششیں دیگر باتوں سے ہٹ کر اس امر کی طرف مرکوز ہونی چاہئیں۔ صنعتی ترقی یا برطانوی سرمایہ کو ہندوستان لانے وغیرہ کے مسئلے سٹرلنگ قرضہ کی واپسی سے کم اہمیت رکھتے ہیں۔ ان پر توجہ بعد میں کی جا سکتی ہے۔ اگر پانچ یا پچاس کروڑ کا برطانوی سرمایہ ہندوستان آ بھی جائے تو بھی یہ ہمارے ۱۵ ارب قرضہ کی واپسی کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ ہمارے سات ماہرین صنعت یورپ گئے ہوئے ہیں۔ جب وہ ہندوستان کے بڑے اقتصادی مسئلہ کی طرف آنکھیں بند کرکے نہ بیٹھے ہوئے ہوں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آ سکتی ہے کہ وہ کیسے جلد بازی سے کام لیکر برطانیہ کے ساتھ تجارتی فیصلے کر رہے ہیں۔ ان کے سامنے صرف محدود مفاد ہی ہیں۔ برطانیہ ان سے کروڑہا روپے کے آرڈر لکھوا رہا ہے۔ گاندھی جی کے کہنے کا مقصد یہی ہے کہ قرضہ سے گرے ہوئے روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں سے پانچ فیصدی خود حاصل کرنے کی خاطر ہمارے مہربان ۹۵ فیصدی پونجیوں کے حوالے کر رہے ہیں۔ ہر ایک معمولی آدمی کا یہ فتویٰ ہے کہ ہر ایک ملک کے بڑے بڑے صنعتی سرمایہ دار اپنے ملک کے مفاد کو بیچ ڈالتے ہیں۔

اگر ہمارے ۱۵ ارب روپے ہمیں واپس نہ کئے گئے۔ تو قیمتوں کی موجودہ سطح میں کمی نہ ہوگی۔ اس طرح مقررہ تنخواہ والے غریب طبقہ کو سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جنگ کے دوران میں وہ کافی مصیبت جھیل چکے ہیں۔ قیمتیں بڑھتی رہیں گی۔ گورنمنٹ کے کنٹرول ...

گذشتہ ایام میں اربوں بلکہ کھربوں روپے کی چیزیں جن میں زمین کی پیداوار اور کارخانوں کی بنی ہوئی اشیا شامل ہیں گورنمنٹ نے کنٹرول نرخ یا فیصلہ کردہ نرخ پر خریدیں۔ شہری آبادی کبھی بھی اتنے سستے داموں چیزیں نہ خرید سکی تھی۔ گورنمنٹ نے یہ چیزیں خریدیں صرف فوج کے لئے ہیں۔ بلکہ برطانیہ، دیگر اتحادی ممالک۔ مشرقی ممالک کے گروپ اور آزاد شدہ یورپ کے مختلف ملکوں کے شہری باشندوں کے لئے ہندوستان سے سستا مال خریدا گیا ہندوستان سے خوراک، کپڑا، خام اشیا اور تیار شدہ مال نہ صرف باہر روانہ کئے گئے بلکہ دوسرے لوگوں کے لئے بھی دیدیئے گئے۔ ہندوستان کی شہری آبادی قحط اور اشیا کی کمی کے باعث تلملا رہی تھی۔ ہندوستان کی مصیبت میں اضافہ کیا بڑھی ہوئی قیمتوں نے یا بلیک مارکیٹ نے۔

ہندوستان کو بدلے میں چھپے ہوئے نوٹ ملے۔ جن کی پشت پر کوئی سیکیورٹی نہیں، سوائے اس کے کہ اسٹرلنگ قرضہ ہے اور اس اسٹرلنگ کی بین الاقوامی قیمت دن بدن کم ہو رہی ہے۔ ادھر برطانیہ اینڈرسن کہہ رہے ہیں کہ سٹرلنگ قرضہ چونکہ تجارتی قرضہ ہے اس لئے جلد واپس کرنے کی ضرورت نہیں۔ کوشش یہ ہو رہی ہے کہ سٹرلنگ سرے سے ہی واپس نہ کیا جائے اور اگر کرنا پڑے بھی تو سارا نہ دینا پڑے۔ اگر یہ تمام قسم کی جمع شدہ رقم ہے یعنی ہندوستان کی طرف سے برطانیہ کے پاس جمع ہے تو مطالبہ کرنے پر اسے فوراً واپس کر دیا جانا چاہئے اور اگر یہ قرضہ کی شکل میں برطانیہ کے سر پر رقم ہے۔ تو ہندوستان کو سود ملنا چاہئے مگر ان میں سے کوئی بات نہیں کی جا رہی ہے بلکہ یہاں تک کوشش کی گئی ہے کہ ثابت کر دیا جائے کہ ہندوستان نے برطانیہ کو مال دیتے وقت زیادہ قیمت لگائی ہے۔

ایک دوسری چالاکی بھی برتی جا رہی ہے۔ وہ یہ کہ ہندوستان تو برطانیہ کا اتحادی تھا۔ اس لئے رقم واپس کرنے کی ضرورت نہیں حالانکہ

بالکل ثابت نہیں ہوئے۔ بلکہ کنٹرول ہی کی وجہ سے قیمتیں بڑھیں اور بلیک مارکیٹ کا جنم ہوا۔ بہر حالت میں نقصان غریب کو رہتا ہے۔ کیونکہ انہیں خوراک کے لئے کافی رقم ادا کرنی پڑتی ہے اور خوراک پیدا کرنے والے طبقہ کو اپنی پیداوار کی پوری قیمت نہیں ملتی۔ خوراک ان سے وصول کرلی جاتی ہے اور قیمت معقول ادا نہیں کی جاتی۔

اگر عیدوی مشن کے ذریعے بدیشی مال بھیج کر (جس میں گندم بھی شامل ہے) ہندوستان میں قیمتیں کم کرنے کی کوشش کی گئی تو زرعی پیداوار کرنے والے غریب ہندوستانیوں اور کارخانوں کے مزدوروں کو سخت مشکل درپیش ہو گی۔

جنگ کے دوران میں ہندوستان نے امریکہ کو مال بیچ کر جو رقم ڈالر کی صورت میں وہاں جمع کی ہے وہ "ایمپائر ڈالر پول" کے نام پر برطانیہ نے خود لے لی ہے۔ ہندوستانیوں کے تمام ڈالر اور ڈالر سیکیورٹیاں جنگ کے شروع میں ان سے لے لی گئیں۔

ہندوستان کی کئی اور بس ضروری ضروریات مثلاً ادویات۔ کیمیکل اشیاء۔ فوٹو گرافی کا سامان۔ قلمیں۔ مشینری۔ بریکنگ آئل وغیرہ امریکہ سے خریدنی ضروری ہیں۔ مگر گورنمنٹ ہر ممکن طریقہ سے اس خریداری کی حوصلہ شکنی کر رہی ہے۔ اگر اس بات کو یاد رکھا جائے کہ مسٹر پی۔ سی۔ مہندرا کو جو "خرید مشن" کے ہیڈ ہونے کی وجہ سے ہندوستانی تجارت کے بہی خواہ تھے۔ حکومت ہند نے ڈسمس کر دیا۔ تو حکومت کی پالیسی سمجھنے میں دیر نہیں لگتی۔

گذشتہ ۵۔ ارب ۴۱ کروڑ روپے کا خرچ ہندوستان کے کندھوں پر ڈالا گیا تھا۔ دیگر رقمیں اس کے علاوہ تھیں۔ اس بھاری بھرکم رقم کا زیادہ حصہ نہ تو لیجسلیچر میں ووٹ کے ذریعے منظور ہی ہوسکتا ہے اور نہ ہی یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ کس طرح خرچ ہوگا۔ یہ کہنا کہ یہ سب کچھ "معاہدہ" کے مطابق ہو رہا ہے۔ زخم پر نمک چھڑکنے کے برابر ہے۔ کیونکہ معاہدہ کرنے والے کون تھے؟ ولائت میں رہنے والا انگریز ایک طرف اور ہندوستان میں رہنے والے انگریز دوسری طرف۔ معاملے کرنے والے تھے۔ جناب گرگ صاحب جو حکومت ہند کے پاس برطانیہ سے آئے تھے اور دوسرے تھے ریزمن جو گرگ کے سکریٹری اور جانشین بنے امریکہ کو سپلائی دینے کا بار اور برطانیہ نے امریکہ سے جو مدد لی تھی اس کا معاوضہ چکانے کا بار بھی ہندوستان کے کندھوں پر ڈالا گیا "قانون ادھار پٹہ" وغیرہ کے ماتحت تمام فائدے تو برطانیہ نے اٹھائے مگر اس کا معاوضہ دے ہندوستان۔ اس سوال کی تہ تک پہنچنا ضروری ہے۔ تاکہ شبہ دور ہوجائے۔ کیونکہ ادھار پٹہ کے ماتحت جو سرگرمیاں ہوئیں۔ سب پر پردہ ڈالا گیا ہے۔

ہندوستان کی صنعتی ترقی کے لئے جو "شاندار اسکیمیں" تیار کی گئی ہیں۔ ان میں سب سے پہلی جگہ سڑکوں کی تعمیر (ساڑھے چار ارب روپیہ) کو دی گئی ہے۔ ریلوے لائن لمبی کرنے کی تجاویز۔ آبپاشی وسیع کرنے کی تجاویز۔ پوسٹ و ٹیلگراف آفس بڑھانے کی تجاویز۔ ہائیڈرو الیکٹرک سکیم کو ترقی دینے کی تجاویز وغیرہ کے لئے تین چار ارب روپیہ خرچ کرنے کا اندازہ لگایا گیا ہے۔

ہندوستانی نقطۂ نگاہ سے اس قدر روپیہ خرچ کرنا موزوں نہیں۔ مثال کے طور پر سڑکوں کے لئے مجوزہ خرچ محض فضول خرچی ہوگی جبکہ لوگوں کے اور بس ضروری معاملات (مثلاً خوراک۔ صحت۔ کپڑا۔ تعلیم وغیرہ) کو کسی نے ہاتھ لگانے کی کوشش نہیں کی۔

ہندوستان میں لوگ ابھی اس امر سے اچھی طرح آگاہ نہیں کہ دنیا میں اقتصادی تباہ حالی ہوچکی ہے اور چونکہ ہندوستان کی قسمت پرائے ہاتھوں میں ہے۔ ہندوستان کے مال و اسباب اور پیداوار کا زیادہ سے زیادہ اور اندھا دھند استعمال کیا گیا ہے۔ ان مقاصد کے لئے جن کے ساتھ ہندوستان کا کوئی واسطہ نہیں۔ میں مردہ لاش کا پوسٹ مارٹم نہیں کرنا چاہتا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے ساتھ مالی طور پر انصاف کیا جائے اور اخراجات میں سمجھداری سے کام لیا جائے۔ ترقی کی ان اسکیموں کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے جو کرنسی پھیلانے کی ذمہ دار نہیں گی۔

اس بات کی طرف دھیان ہی نہیں دیا جاتا کہ باقی دنیا کے ساتھ ہندوستان میں بھی سرمایہ خرید کر رقم کا کافی سے زیادہ نقصان ہوا ہے جو کہ ایک نسل سے کم عرصہ میں واپس نہیں لایا جا سکتا۔ گورنمنٹ ہند کے ہاتھ جو سونے کی کان لگی ہے۔ وہ پرنٹنگ پریس ہے۔ ہر ہفتہ ۱۲ کروڑ روپئے چلتے ہوئے نوٹوں میں بڑھائے جاتے ہیں اور یہ نئے نوٹ خرچ کئے جا رہے ہیں۔ آسٹریا، جرمنی،

روس، فرانس اور دیگر ممالک میں کرنسی کے پھیلاؤ سے ثابت ہو چکا ہے۔ کہ غریب طبقہ ہی گھاٹے میں رہتا ہے اور تکلیف اٹھاتا ہے۔

سر ولیم ہنٹر جو ۱۸۸۰ء کے قحط تحقیقاتی کمیشن کے صدر تھے کے مطابق ہندوستان میں چار کروڑ باشندوں کو روزانہ پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ یہ بات آج سے ۶۰ سال پہلے کی ہے۔ تب سے لے کر آج تک ہندوستان کی غریبی کے اور بھی اعداد و شمار دئے گئے ہیں۔ جن میں ایک یہ ہے کہ آٹھ لاکھ اشخاص کو بمشکل پیٹ بھر کھانا ملتا ہے۔ تھوڑے دن ہوئے محکمہ زراعت کے سکریٹری نے کہا تھا کہ ہندوستان کی آبادی کے تین چوتھائی حصہ کو پوری خوراک نہیں ملتی۔ جب گندم کا بھاؤ ڈھائی روپے من تھا اور لوگ پیٹ بھر کر نہ کھا سکتے تھے۔ تو بھلا ۱۴ روپے من گندم خرید کر کیا وہ پیٹ بھر کھا سکتے تھے؟ اس جنگ میں ہندوستان کا بہت نقصان ہوا ہے۔ کرنسی کے پھیلاؤ کے نتیجے کے طور پر غریب عوام کو بیماری اور چیزوں کی نایابی کی صورت میں جو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس کی پہلی قسط بھی ہندوستان ادا کر چکا ہے۔

ویول پلان پر اخبارات کی رائیں

۱۴ رجون کو لارڈ ویول وائسرائے ہند نے وہ اسکیم ہندوستانیوں اور ہندوستانی لیڈروں کے سامنے رکھدی جو وہ لندن سے بناکر لائے ہیں اور جسے گاندھی جی ڈیسائی لیاقت فارمولے پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ اس اسکیم کے مطابق شملہ میں ۲۵ رجون کو لیڈروں کی ایک کانفرنس ہوگی جو ان لوگوں کی فہرست پیش کرے گی جو وائسرائے کی مجلس شوریٰ کے ممبر ہونگے۔ نئی مجلس شوریٰ میں تمام عہدے سوائے محکمۂ جنگ کے ہندوستانیوں کے قبضہ میں رہینگے اور وائسرائے مجلس شوریٰ کے سیاسی حاکم اعلیٰ یا صدر ہونگے۔

اس اسکیم پر اس وقت اخبارات اور سیاسی حلقوں میں غور و بحث جاری ہے اور معلوم نہیں کہ ملک کی نمائندہ سیاسی جماعتیں ان کو قبول کرتی ہیں یا نہیں لیکن جہاں تک اخبارات کا تعلق ہے ان کی اکثریت نے ان تجویزوں کو غیر اطمینان بخش قرار دینے کے باوجود یہ رائے دی ہے کہ اگر بحالات موجودہ ان کو قبول کرلیا جائے تو جمود دور ہوسکتا ہے اور ہندوستانی سیاست کی گاڑی کے آگے بڑھنے کے امکانات پیدا ہوسکتے ہیں چند اردو اخبارات کے تبصروں کا خلاصہ درج ذیل ہے :—

'ادارہ'

مرکزی مسلم لیگ کا ترجمان روزآنہ منشور لکھتا ہے :—

موجودہ سیاسی تعطل رفع کرنے کے لئے وائسرائے ہند لارڈ ویول جو منصوبہ منظور کراکے لائے ہیں وہ کل شائع ہوچکا اور اسکی تشریح میں لارڈ ویول اور وزیر ہند مسٹر ایمری کی تقریریں بھی یہ صرف اسوقت تک کا انتظام ہے کہ ہندوستانی پارٹیاں باہمی اتفاق رائے سے مستقبل ہند کے لئے کوئی آئین مرتب کریں۔

یقیناً بہت دیر ہوگئی۔ مسلم لیگ نے قریب قریب ایسی ہی تجویز ۱۹۴۲ء میں پیش کی تھی۔ اگر کانگریس رضامند ہوگئی ہوتی اور حکومت برطانیہ نے ہمت کی ہوتی تو ۱۹۴۲ء میں نہیں ۱۹۴۵ء میں بجائے وائسرائے کی موجودہ وسیع ایگزیکیوٹو کونسل کے ایسی ایگزیکیوٹو کونسل قائم ہوجاتی جیسی اسوقت وائسرائے چاہتے ہیں کہ قائم ہوں۔ مسلم لیگ نے اسی وقت یہ خواہش کی تھی کہ وائسرائے کی وسیع ایگزیکیوٹو کونسل میں اگر کانگریس شریک ہو تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے نمائندوں کی تعداد برابر ہو، نہ شریک ہو تو مسلم لیگ کے نمائندوں کی اکثریت ہو۔ بالآخر ہر پارٹی کو یہ اصول تسلیم کرنا پڑا اور لارڈ ویول بھی اپنی اسکیم میں یہی منظور کراکر لائے ہیں کہ مسلمانوں اور اونچی ذات کے ہندوؤں کی تعداد برابر ہو۔ مسلم لیگ کی تجویز میں اونچی اور نیچی ذات کی کوئی تمیز نہ تھی، ہندو سب ہندو ہیں خواہ وہ نیچی ذات کے ہوں یا اونچی ذات کے۔ ان کے تصورات، مقاصد، میلانات، ہمدردیاں اور دلچسپیاں بالکل ایک ہیں۔ یہ ان کا بالکل نجی معاملہ ہے کہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کا طرز عمل نیچی ذات کے ہندوؤں کے ساتھ اچھا نہیں، یقیناً نیچی ذات کے ہندوؤں کو ہر نیابتی ادارے میں اور ہر اختیار کی جگہ حصہ ملنا چاہئے مگر وہ ملے ہندوؤں کے حصے میں سے۔ ہندوؤں کی مجموعی تعداد اور مسلمان نمایندوں کے درمیان مساوات ہونی چاہئے۔

اس تجویز میں اس کی بڑی کوشش کی گئی ہے کہ وہ اختلافات گفتگو میں یا کسی طرح درمیان نہ آئیں جن پر مستقبل ہند کے آئین کے معاملے میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان اختلاف ہے اور نیز اسکی بھی کہ موجودہ عارضی انتظام کسی عنوان سے مستقبل کے متعلق ہندو مسلم تصورات کے خلاف نہ ہو مستقبل کے معاملے میں حکومت برطانیہ ابھی تک کرپس کی تجاویز کا قائل

بات بجا رہی ہے اور وہ اپنے اس عہد پر قائم ہے کہ وہ خود ہندوستان پر کوئی آئین مسلط نہیں کرے گی یہ مستقبل ہند کا آئین ہندوستانی پارٹیوں کی باہمی اتفاق رائے ہی سے وضع کرنا چاہئے۔

بمبئی کا مسلم لیگی اخبار روزنامہ خلافت اپنی ۱۵ جون کی اشاعت میں ویول پلان پر ہمدردی سے غور کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے اس بات پر خصوصیت سے زور دیتا ہے کہ اس وقت ملک کی سیاسی جماعتیں مرکز اور صوبجات میں حکومتیں قائم کرکے آئندہ انتخابات کے لئے اچھی طرح راستہ صاف کرسکتے ہیں۔

خلافت کے الفاظ ہیں:۔

لارڈ ویول نے آج ہندوستان کے جمود کو ختم کرنے کے لئے ہندوستان کے سامنے جو تجویزیں پیش کی ہیں وہ اگرچہ مایوس کن حد تک بے جان ہیں لیکن اس کے باوجود ہم ان کی شدید مخالفت نہیں کرسکتے۔ کیونکہ اگر انکو قبول کرلیا جائے تو نہ صرف یہ کہ موجودہ جمود ختم ہوسکتا ہے بلکہ مستقبل کیطرف سے بھی ہم کسی قدر پر اُمید ہوسکتے ہیں۔ اس طرح ہم برطانیہ کے زیر سایہ ہی سہی اور وائسرائے کی صدارت ہی میں سہی مگر ملک کی حکومت میں کافی اثر حاصل کرسکتے ہیں۔ نیز مرکز میں اس طرح حاصل ہونے والے اثر سے صوبجات میں بھی کام لے سکتے ہیں کیونکہ ویول پلان کی ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ جن صوبجات میں اس وقت دفعہ ۹۳ جاری ہے وہاں پھر نمایندہ حکومتیں آسکتی ہیں۔

اسوقت حالات ایسے ہیں کہ ہمیں پیچھے دیکھنے کے بجائے آگے دیکھنا چاہئے۔ برطانیہ نے ہندوستان میں ابتک جو کچھ کیا ہے وہ نہایت دردناک اور شرمناک داستان ہماری قومی جماعتوں میں بھی پچھلے دنوں جو اختلافات رہے ہیں وہ بھی نہایت افسوسناک ہیں لیکن آج اگر برطانیہ نیک نیتی یا بین الاقوامی حالات سے متاثر ہوکر ہمارے سامنے کوئی پیشکش کررہاہے اور ہماری قومی جماعتوں کو متحد ہوکر کام کرنے کا موقع مل رہاہے تو ہمیں اس سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہئے۔ ہماری دلی خواہش یہ تھی اور اب بھی ہے کہ ہندو مسلم اور تمام قومی عناصر ملکر برطانیہ سے مکمل گلو خلاصی حاصل کرلیں۔ لیکن چونکہ فی الحال ایسا ہونا ممکن نہیں ہے اسلئے اگر ہم اپنے گلے کے پھندے کو کسی قدر ڈھیلا کرسکتے ہیں تو ہمیں اس میں کوتاہی نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہم اپنے اصل مقصد کو فراموش کردیں۔ اصل مقصد جلد از جلد آزادی کامل کا حصول ہی ہونا چاہئے اور ہمارا طریقۂ کار صرف یہ ہونا چاہئے کہ اولین فرصت میں کسی نہ کسی طرح غلامی کی زنجیروں کو کاٹ کر پھینکدیں۔

جنگ اب قریب الختم ہے۔ دنیا تیزی سے بدل رہی ہے۔ برطانیہ کو اپنی پالیسی بدلنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ ہندوستان میں عام انتخابات کا ہونا اور جلد ہونا یقینی ہے جو ملک کے رجحان کا پیمانہ ہونگے۔ افتراق انگیز طاقتیں ابھرنے لگی ہیں ہندوستان غیر ذمہ دار حاکموں کے ہاتھوں بری طرح تباہ ہوچکا ہے اور آئندہ مزید تباہی کا خطرہ ہے ایسی حالت میں اگر مرکز اور صوبجات میں ہم طاقت حاصل کرلیں تو ہم انتخابات کا انتظام بہتر طریقے سے کرسکتے ہیں اور دوسروں کو برطانوی حاکموں کا آلۂ کار بننے سے روک سکتے ہیں۔ تعمیرات بعد از جنگ کی جو اسکیمیں بن رہی ہیں ان کو غیر ملکی مفاد کے مقابلہ میں ملکی اور عوامی مفاد کے مطابق بنا سکتے ہیں۔ دوسرے ملکوں سے خوشگوار تعلقات قائم کرسکتے ہیں۔ بظاہر محدود حد تک ویول پلان سے ہمیں یہ چیزیں حاصل ہونے کی امید ہے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو اور وائسرائے ہمارے معاملات میں ذرا بھی مفسدانہ مداخلت کرے تو ہم ملک میں پھر جمود پیدا کرکے دنیا کو یہ بتا سکتے ہیں کہ برطانیہ کی نیت خراب ہے وہ ہمیں محض کھلونوں سے بہلانے کی فکر میں ہے اور اسوقت ملک اور بیرون ملک میں ہماری قومی جماعتوں کی پوزیشن اور بھی مضبوط ہوجائے گی۔

مخالفت

بمبئی کا احراری اخبار روزانہ ہلال نو لکھتا ہے کہ

اس اعلان میں نہایت بے لاگ جسارت سے کام لیا گیا ہے یعنی کسی قسم کو لیپ پوت، حیلہ و فریب، یا اگر مگر کے ساتھ بھی حاکمانہ اقتدار کے جزوی انتقال کی بھی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ نہ طویل وعریض دعوے ہیں نہ مستقبل کے لئے پہلے سے زیادہ واضح وعدے ہے نہ ہندوستان کی رائے عامہ کے احترام کی نمائش ہے جو کچھ کہا گیا ہے پوری ڈھٹائی کے ساتھ کہا گیا ہے گویا کہ ضدی بچہ کو ڈانٹ کر خاموش کرنا مقصود ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہ اگر بھوکا ہے تو یہ لے "بچوڑی ہوئی ہڈی کھالے"

چند عہدے موجود ہیں۔ آؤ اور قبول کرلو یہ وہی عہدے ہیں۔ جو پہلے بھی موجود تھے اور آج بھی وہی ہیں نہیں بلکہ حاتم کی سخاوت کو یہ اضافہ کرکے شرما دیا گیا ہے کہ مالیات اور داخلہ کے محکمے بھی تم کو ملیں گے۔

محدود تھا کہ یہ اتنا بڑا ستا ہو رہا ہے کہ اگر تم ناشکرے نہیں تو پکار اٹھو گے

بدیں مژدہ اگر جاں فشانم رواست

التفات کریمانہ اور مراحم خسروانہ کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوجاتا بلکہ کونسل کے انتخاب میں نائب ملک معظم بعض لیڈروں سے مشورہ بھی کرینگے اگرچہ انتخاب کا حق ان کو ہی رہیگا اور اس انتخاب کے بعد بھی آخری فیصلہ ملک معظم کا ہوگا ؎

سر ہمت ذبح میر ان کے زیر پائے ہے

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

بمبئی کا کانگریسی اخبار اس سوال کے بعد کہ کیا ہندوستان ان تجویز کو قبول کریگا؟ لکھتا ہے:—

لارڈ ویول اور جن ہندوستانیوں نے انھیں اس قسم کی تجاویز پیش کرنے کا مشورہ دیا ہے انھیں تو یہی توقع ہے۔ مگر اصل فیصلہ ہندوستانی لیڈروں کی اس کانفرنس میں ہوگا جو ۲۵ رجون کو شملہ میں طلب کی جارہی ہے مگر اس سے بھی پہلے کانفرنس کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ کانگریس کی مجلس عاملہ کا فیصلہ کردے گا ابھی سے یہ کہنا دشوار ہے کہ مجلس عاملہ کا فیصلہ اس باب میں کیا ہوگا۔ چونکہ مجوزہ اسکیم میں ہوم ممبری اور مالیات کا شعبہ بھی ایک ہندوستانی کو پیش کیا جارہا ہے۔ کونسل تقریباً پوری طرح ہندوستانی بنائی جارہی ہے اور وائسرائے یہ اعلان کررہے ہیں کہ اپنے اختیارات خصوصی کا استعمال غیر معقول طریقے سے نہیں کرینگے اس وجہ سے کانگریس کا وہ طبقہ جو پارلیمنٹری پروگرام کا حامی ہے یا شکست خوردہ ذہنیت کا شکار ہے وہ ضرور یہ مشورہ دیگا کہ ان تجاویز کو وہ جیسی بھی ہیں مان لینا چاہئے مگر مجلس عاملہ کو مسئلے کے ان تمام پہلوؤں پر غور کرنا ہوگا جن کا اثر ملک کے مستقبل پر پڑیگا کانگریس کا مقصد ہندوستان کی مکمل آزادی حاصل کرنا ہے وہ گذشتہ پچاس سال سے اسی مقصد کی خاطر جدوجہد میں مصروف ہے اس کے سامنے جو بھی تجاویز پیش ہوں انھیں اسے اسی معیار سے جانچنا ہوگا کہ اس مقصد کے حصول میں ان سے کیا مدد مل سکتی ہے محض پارلیمنٹری پروگرام یا مرکز میں عارضی حکومت بنانا اس کا مقصود یا منتہائے نظر نہیں ہے۔

کانگریس نے اس سے قبل جب کبھی عہدے قبول کئے تو اسی اعلان کے ساتھ قبول کئے تھے کہ وہ اپنی قوت کو اسلئے بڑھانا چاہتی ہے کہ آزادی کی جدوجہد میں اسے اور زیادہ مدد ملے۔ اب بھی جبکہ دنیا ایک نازک دور سے گذر رہی ہے جب ہندوستان کے سامنے بڑے اہم مسائل پیش ہیں، جو بھی فیصلہ کرے اس میں یہی خیال مقدم ہونا چاہیئے کہ جو قدم بھی اٹھایا جائے اس سے ہمارے اصلی مقصد میں کیا مدد ملیگی اگر اس مقصد میں کیا مدد ملتی ہے تو اس کے مطابق قدم اٹھانے میں کانگریس کو تامل نہ ہونا چاہئے لیکن اگر کوئی عہدہ اس کام میں رکاوٹ کا باعث بن سکتا ہے یا اسکے قبول کرنے سے ایسی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا خطرہ ہو جو آگے چل کر مزید خرابیوں کا باعث ہو تو اسے ٹھکرانے میں بھی کانگریس کو تامل نہ کرنا چاہئے۔ ملک کو کانگریس کی مجلس عاملہ سے توقع ہے کہ وہ کسی ایسے فیصلے پر پہونچے گی جو آزادی کے راستے میں ملک کا قدم آگے بڑھا سکے۔

مسلم لیگ کا ترجمان نوائے وقت لاہور ویول اسکیم کو مسٹر جناح کی زبردست کامیابی قرار دیتا ہے اس کی رائے ہے کہ :—

لارڈ ویول نے آج اپنی نشری تقریر میں اپنی اسکیم کا اعلان کردیا۔ وہ تمام قیاس آرائیاں جو ان صفحات میں اس اسکیم کے متعلق کی گئی تھیں درست ثابت ہوئیں۔ ویول اسکیم کی اساس ہی لیاقت ڈیسائی فارمولے وائسرائے کی اسکیم کو ان کے قول کے مطابق برطانیہ کی مختلف پارٹیوں کے لیڈروں کی تائید حاصل ہے اور یہ اسکیم ہندوستان کے مستقبل کے متعلق مستقل آئینی سمجھوتہ پر کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہوگی لارڈ ویول نے یہ وضاحت کرکے مسٹر جناح کے اس مطالبہ کو مان لیا ہے کہ کوئی عارضی انتظام پاکستان کے مسئلہ پر معاندانہ اثر نہیں ڈال سکتا۔

یہ درست ہے کہ ان تجاویز سے ہندوستان کا مطالبہ آزادی پورا نہیں ہوتا۔ مگر ان تجاویز سے ایسی توقع وابستہ کرنا ہی عبث تھا۔ ان کا دائرہ اثر صرف عارضی انتظام حکومت تک محدود ہے اور جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے۔ مسٹر ڈیسائی کے آج کے بیان کے بعد یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ کانگریس ان تجاویز کو قبول کرے۔ مسلم لیگ کی پوزیشن بہت واضح ہے جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے مسلم لیگ کے دونوں مطالبات مان لئے گئے۔ مسٹر جناح کا مطالبہ تھا کہ کوئی عارضی انتظام حکومت مسئلہ پاکستان پر اثر انداز نہ ہو۔ یہ مطالبہ غیر مبہم الفاظ میں مان لیا گیا۔ مسلم لیگ کا دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ مجوزہ مرکزی حکومت میں مسلم لیگ کو کانگریس کے برابر نیابت دی جائے۔ یہ مطالبہ بھی تسلیم کرلیا گیا۔

اس کے علاوہ لیگ ورکنگ کمیٹی اپنی قرارداد پاکستان میں حق خود اختیاری کے ماتحت اقتدار حکومت قبول کرنے کے لئے تیار ہے۔ ویول سکیم میں وہ سب شرائط مان لی گئی ہیں اور یہ مسٹر جناح کے تدبر اور ان کی کامیاب سیاست کی فتح ہے۔

ہمیں امید ہے کہ شملہ کی کانفرنس کامیاب رہے گی۔ ملک کا آئینی تعطل دور ہوگا۔ اور مرکز اور صوبوں میں لیگ اور کانگریس مل کر انتظام حکومت کو سنبھال لیں گی اور اس کے بعد بڑے نصب العین کے لئے متحدہ جدوجہد کی جائے گی۔

دہلی کا روزانہ کانگریسی اردو اخبار تیج لکھتا ہے:—

لارڈ ویول نے ہندوستان کا آئینی مسئلہ حل کرنے کے لئے اپنا پلان پیش کر دیا ہے اس کا فوری تعلق جمود کے عارضی حل سے ہے مگر ملک کے آئینی مستقبل کے مسلسل فیصلے سے بھی اس کا تعلق ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر کسی اور وجہ سے نہیں تو صرف اس وجہ سے وائسرائے کی نئی پیشکش کا سواگت کیا جائیگا کہ اس نے ملک کی رائے عامہ کے مسلمہ لیڈروں کو ایک جگہ جمع ہو کر ایسی تجویزوں پر باہمی صلاح و مشورہ کا موقعہ دیا جو بلا شبہ اپنی تمام خامیوں کے باوجود بہت کچھ ٹھوس اور واضح حیثیت رکھتی ہیں۔ آئینی جمود پتھر بن کر قوم کی گردن میں لٹک رہا ہے۔ ابتک برطانی حکومت مسٹر چرچل اور مسٹر ایمری کی رہنمائی میں ہندوستان کے آئینی جمود کا افسوسناک تماشہ دیکھ رہی تھی لارڈ ویول کے ایما پر اس نے ہندوستان کو جمود کے چکر سے نکالنے کے لئے پیشقدمی کی ہے یہ امر بجائے خود تعریف کے لائق ہے۔ یہ بات اور زیادہ تعریف کے لائق ہے کہ لارڈ ویول نے اپنی اسکیم میں ان میں سے بیشتر باتیں پہلے ہی صاف کر دی ہیں جو کرپس اسکیم کی ناکامیابی کا موجب ثابت ہوئیں۔ کرپس اسکیم بیشتر ہندوستان کے آئینی مستقبل سے تعلق رکھتی تھی۔ ویول پلان میں مستقبل کا سوال کھلا چھوڑ دیا گیا ہے اور وزیر ہند مسٹر ایمری نے پارلیمنٹ میں ہندوستان کے متعلق وائٹ پیپر پر تقریر کرتے ہوئے واضح کر دیا ہے کہ جہاں تک مستقبل کا تعلق ہے کرپس کی پیشکش بدستور قائم ہے [illegible] مستقبل کے سوال پر بحث کرنا اسوقت بے موقعہ ہے۔ ویول اسکیم صرف حال سے تعلق رکھتی ہے۔ کرپس اسکیم کی خامی تھی کہ اس میں حال کا مسئلہ حل کرنے کے لئے بہت مہمل تجویز پیش کی گئی تھی۔ مہمل تجویز کو واضح کرنے کے لئے طویل گفت

وشنید اس بات پر ٹوٹ گئی کہ کانگریس نئی ایگزیکٹو کونسل کو ذمہ دار کیبنٹ کا درجہ دینا چاہتی تھی مگر کرپس ڈیفنس کا محکمہ منتقل کرنے اور وائسرائے کی "ویٹو" ختم کرنے پر رضامند نہ تھے۔ اصولی طور پر لارڈ ویول کی تجویز کرپس کی کی تجویز سے مختلف نہیں کیونکہ اس کے ماتحت بھی ڈیفنس انگریزی ہاتھوں میں رہے گا اور وائسرائے کی "ویٹو" بھی قائم رہیگی لیکن پہلوؤں میں نمایاں فرق ہے۔

روزنامہ زمیندار لاہور لکھتا ہے:—

آج وائسرائے کی دعوت کے جواب میں گاندھی جی اور قائد اعظم کے جو بیانات شائع ہوئے ہیں ان سے اطمینان کی جھلک نظر آتی ہے گاندھی جی اصولی طور پر ویول اسکیم سے متفق ہیں وہ تو اپنے بیان میں یہاں تک تسلیم کر چکے ہیں کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی سے پارٹی ڈیسائی فارمولا منظور کرا لیا گیا تھا اور اسی فارمولے پر ویول سکیم کی بنیاد ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ مجوزہ آئین کو گاندھی جی کی تائید و حمایت حاصل ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ یہ دستور گاندھی جی ہی کے مشورے سے بنایا گیا ہے۔ کیونکہ مسٹر ڈیسائی ان کی اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ گاندھی جی کو اعتراض ہے تو اس بات پر ہے کہ اچھوتوں کو کیوں علیحدہ قوم تسلیم کیا گیا اور مولانا ابوالکلام آزاد صدر کانگریس کو شملہ کانفرنس کے لئے دعوت کیوں نہیں دی گئی؟ لیکن یہ اعتراض اسکیم کی اصولی حیثیت پر اثر انداز نہیں ہو سکتے قائد اعظم کا بیان بھی اطمینان بخش ہے۔ انہوں نے اسکیم کے کسی پہلو پر اصولی یا بنیادی اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ صرف وضاحت کا مطالبہ کیا ہے۔ دونوں لیڈروں کے رویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں ویول سکیم پر متفق ہیں اور یہ اتفاق خلاف توقع نہیں۔ اس اسکیم کے ذریعے سے گو دونوں جماعتوں کے مطالبے پورے نہیں کئے گئے لیکن انہیں نظر انداز بھی نہیں کیا گیا۔

جمعیۃ العلمائے ہند کا ترجمان الانصاری ایک سلسلی تبصرہ میں لکھتا ہے کہ

اگر اس وقت بھی ہندوستانی لیڈر کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے اور یہ جمود یونہی قائم رہا تو یقین جانئے کہ ہندوستانی قضیہ کا حل ایک مدت تک نہ ہو سکیگا اور یہ موقع کھو جانے کے بعد مشکل سے ہاتھ آئیگا۔ لیکن اگر اس موقع سے فائدہ اٹھا کر جو وقتی حل [illegible] اسے منظور کر لیں سلسلہ جدوجہد کو جاری رکھیں [illegible] کی کافی خدمت [illegible] ہونے کے پیچھے پڑنے سے جو نقصان ملک کو اسوقت تک پہنچا ہے اس کی تلافی [illegible] عارضی نظام کامیاب ہو گیا اور اہل ہند نے فراخدلی اور [illegible]

چکبست اور قومی شاعری

انسا: ——— ناظر کاکوروی

جس زمانے میں چکبست نے ہوش سنبھالا لکھنؤ کا میلانِ خاطر کچھ وہ تھا جو اس وقت پایا جاتا ہے۔ تغزل پر ابھی ناسخ کی بڑی گرفت قائم تھی اور جن شعراء نے اس سے چھٹکارا حاصل کیا بھی تو وہ داغ سے متاثر تھے لیکن اس قدیم اختلاف کی وجہ سے جو لکھنؤ اور دہلی کی شاعری میں پایا جاتا ہے انہوں نے اپنی داد کو یہاں سے باہر نہ جانے دیا اور امیر مینائی کو اس کا مقابل سمجھ، صنم خانۂ عشق کی پرستش کرنے لگے، اور حیرت ہے کہ جلال کی طرف ان کی نگاہ نہ گئی جو داغ کی چہچہے والی شاعری میں بھی ایک خاص وزن رکھتا تھا۔ بہرحال چکبست کا ابتدائی زمانہ وہ تھا جب لکھنؤ میں تغزل کا رنگ ملا جلا ناسخی و امیری تھا، یعنی عشق و محبت میں بھی عروض و قافیہ، ابہام و رعایتِ لفظی کا ہوش انہیں باقی تھا اور اسلئے یہاں کی شاعرانہ فضا میں زہرِ عشق اور گلزارِ نسیم دونوں کے جراثیم پائے جاتے تھے۔ غزل کے علاوہ ایک اور چیز بھی تھی جس سے لوگ متاثر بھی تھے اور مرعوب بھی، اور وہ انیس کے مراثی تھے مسدس کی شکل میں، یہ وہ صنفِ شاعری تھی جس میں انیس کا کوئی مدِ مقابل نہ تھا، اور چونکہ اس سے بڑی حد تک لکھنؤ کا فنِ ذوقِ شاعری بھی پنپا چاہتا تھا اسلئے اس کی بڑی قدر تھی یہاں تک کہ محسن کاکوروی نے اپنا مجموعۂ نعت بھی اسی زبان اور لب و لہجہ میں مرتب کیا، اور اگر میرا قیاس غلط نہیں تو شاید چکبست نے بھی سب سے پہلے ۱۸۹۴ء میں جبکہ ان کی عمر ۱۲ سال کی تھی مسدس ہی لکھا جس کا عنوان "صبح جلوہ" ہے اور جس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک انیس سے متاثر تھے۔ ملاحظہ ہو:

جب تک شبِ گنجینۂ ہستی ہوا دور ہنگامِ سحر کون و مکاں ہو گئے کافور
تبدیل ہوئی صورتِ کوہ شبِ دیجور چمکا وہ تجلیِ سحر سے وہ صفتِ طور
بجلی کی طرح چرخ پہ نورِ سحر آیا
آنکھوں کو نہ پھر حسنِ مہ و نجم نظر آیا

رونق پہ دمِ صبح تھا خمخانۂ عالم تھم تھم کے ہوا چلتی تھی سرد کبھی کم کم
پیمانۂ مہتاب تھا لبریزِ سحر دم تھا جامِ صبوحی کے لئے نیرِ اعظم
گردوں پہ شفق کی بھی عجب جلوہ گری تھی
مینائے فلک میں مئے گلرنگ بھری تھی

آپ اگر ان بندوں کو انیس کے کسی مرثیہ میں شامل کر دیں تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی اور کا کلام ہے، بظاہر یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ چکبست کی شاعری کا آغاز ہی اس رنگ سے ہوا ورنہ عام طور پر نوجوان لوگ جب شاعری کرتے ہیں تو اس کی ابتدا غزل سے ہوتی ہے اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ چکبست فطرتاً بہت سوچنے والا دماغ لے کر آئے تھے اور ان کے احساسِ شاعرانہ میں فکرِ فلسفیانہ کا جزو زیادہ شامل تھا، محبت کبھی سے انہوں نے کی ہو یا نہ کی ہو لیکن محض اسکی داستانیں بیٹھنا ان کے حوصلۂ سخن سے فروتر چیز تھی اور اسی سے وہ اپنی غزل میں بھی ایک بار اس حقیقت کے اظہار سے باز نہ رہ سکے کہ ؎

نیا مسلک نیا رنگِ سخن ایجاد کرتے ہیں
عروسِ شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں۔

سو اس میں شک نہیں کہ انہوں نے عام لکھنوی شعراء کے مقابلہ میں نیا مسلک بھی اختیار کیا اور عروسِ شعر کو بھی بڑی حد تک قید سے آزاد کیا یعنی انہوں نے اپنی نظموں کا رُخ بھی کام کی باتوں کی طرف پھیر دیا اور غزلوں میں بھی وہ نقوش چھوڑ گئے جو بالکل مستقبل کی چیز تھی، جب وہ سنِ وقوف کو پہنچے اور سیاسی ماحول نے ان کے قوائے ادبیہ کو متاثر کیا تو پھر ان کی شاعری کا داخلی و خارجی رنگ ایک ہو گیا یعنی جو تقاضائے فطرت تھا وہی ان کی زبان سے نکلنے لگا اور جس چیز کے احساس کرنے ان کا دماغ پیدا ہوا تھا وہی ان کے قلم سے ظاہر ہونے لگا یعنی اگر انہوں نے نظموں میں خاکِ ہند، ادارۂ قوم، نالۂ درد ایسی نظمیں کہنا شروع کیں تو ان کے تفکر میں ایک مفکرانہ پختگی پیدا ہو گئی، اس میں

شک نہیں کہ چکبست غزل گوئی کے لئے پیدا نہ ہوئے تھے، لیکن یہ بھی اُن کی ذہانت اور خوش ذوقی کا کمال تھا کہ جب اس زمین کی طرف توجہ کی تو وہاں بھی آسمان کے تارے توڑ کر دکھا دیئے، آپ اُن کا سارا کلام پڑھ جایئے کسی ایک جگہ بھی کوئی رکیک جذبہ یا لفظ نظر نہ آئیگا اور خصوصیت چکبست کی اس انفرادیت کو ظاہر کرتی ہے جس میں کوئی لکھنوی شاعر اُن کا شریک نہیں، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

قدرداں کیوں مجھے تکلیفِ سخن دیتے ہیں
میں سخنور نہیں، شاعر نہیں، اُستاد نہیں

لیکن یہ اُن کا انکسارِ شاعرانہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ سخنور بھی تھے، شاعر بھی تھے، اُستاد بھی تھے،

لکھنؤ اسکول کے کامیاب شاعر (خان بہادر مرزا جعفر علی خاں) اثر لکھنوی کا صداقت نامہ بھی ملاحظہ ہو :۔

"پنڈت برج نرائن چکبست کی شخصیت تاریخ ادب میں اتنی اہم ہے کہ اس کا صحیح اندازہ ان کی وفات سے اس قدر قریب وقت میں دشوار ہے خصوصاً جبکہ ہندوستان ایک عظیم دورِ انقلاب سے گذر رہا ہے، لیکن شاید یہ ادعا غلط نہ ہو کہ اُردو نے اب تک جتنے معتدد شاعر پیدا کئے اُن کے کلام میں یا تو پیام کا سرے سے پتہ ہی نہ تھا یا پیام کا دائرہ محدود اور رُوئے سخن کسی خاص جماعت کی طرف تھا، مثال کے طور پر غالب و آتش و انیس و حالی و اقبال کو لیجئے، یہ کسی کی منقبت نہیں بلکہ حقیقت ہے۔"

انیس حُبِّ اہلبیت میں سرشار ہیں اور چونکہ اہلبیتِ رسول علیہم السلام مکارمِ اخلاق کا بے مثل نمونہ تھے انیس کی شاعری میں بہترین خصائل و کردار کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ تاہم یہ ماننا پڑیگا کہ ان کے بھی مخاطب صحیح مسلمان اور صرف مسلمان تھے ان میں سے کسی شاعر کا جذبۂ ایثار قومیت کے اس تخیل تک نہیں پہنچا جہاں یہی نہیں کہ اختلافِ مذاہب کو اہمیت نہیں دی جاتی، بلکہ جہاں تک وطنیت کے منافی ہے جرم سمجھا جاتا ہے اور کل افرادِ ملک باہمی رواداری کے ساتھ ملکی مفاد اور اسکی مجموعی ترقی و بہبود کو دوسری ہر شے اور ہر امکان پر ترجیح دیتے ہیں، پھر بھی ان بزرگوں نے جو نمایاں خدمات انجام دیئے اور قوم اور زبان پر جو احسانات کئے اُن کو فراموش کرنا حق ناشناسی ہے کم سے کم ایک طبقہ کو جو میدانِ عمل میں پیچھے رہ گیا تھا خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا۔ اور انیس نے تو اُردو کو اس قابل بنا دیا کہ دنیا بھر کی زبانوں کے مقابلہ میں پیش کی جا سکے۔ یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اگر آتش اور انیس نہ ہوتے تو چکبست کا فروغ مشتبہ تھا کیونکہ چکبست کی شاعری میں اُن کی خداداد صلاحیت، ماحول اور اس کے پیدا کئے ہوئے تخیلات کو جس نے انہیں زبان بخشی جو تاثیر کا طلسم اور سوز و گداز کے ساتھ شیرینی و سلاست و جوش و خروش کا دلکش مجموعہ ہے، وہ لکھنؤ میں تربیت پانے کا فیض اور اپنے بزرگوں کے کلام کا گہرا مطالعہ ہے، یہ امر بھی اصولِ فطرت کے عین مطابق ہے کہ ان لوگوں کے اور چکبست کے رجحانات اور موضوعاتِ شاعری مختلف ہیں ہر شاعر (بشرطیکہ حقیقی شاعر ہے) اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور اسکو متاثر کرتا ہے، نیز عہدِ ماضی سے اکتساب کرتا اور مستقبل کے لئے نقوشِ ہدایت چھوڑ جاتا ہے چکبست بھی دوسروں سے مستفید ہوئے اور آنے والوں کے لئے نئے راستوں کی داغ بیل ڈال گئے۔

عہدِ انیس و آتش کا تقاضا یہی تھا کہ اُن کی شاعری وہ رنگ اختیار کرلے جو اختیار کیا، اُن کے زمانے میں وہ سیاسی اور اقتصادی خلفشار پیدا ہی نہیں ہوا تھا، جس سے چکبست کو دوچار ہونا پڑا وہ قومی اور ملکی مسائل رونما ہی نہ ہوئے تھے جس نے ان بزرگوں کے بعد ہندوستان کو متضاد تحریکوں اور سرگرمیوں کا گہوارہ کشمکش بنا دیا، انہیں اس آزادی اور اس آزادِ خیالی کا تصور ہی نہ تھا جو انسان کے ضمیر سے وابستہ ہے اور قانون یا مذہب کے تابع یا دستِ نگر نہیں بلکہ مذہب کے تقدس و جبروت و قانون استبداد کو بھی اگر اس کے ارتقاء میں سدِ راہ ہوں تو کچلنے اور روندنے کو تیار ہے؛ میں دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ چکبست کا موازنہ کسی دوسرے پیشرو معاصر شاعر سے مقصود نہیں ہے نہ کسی پر نکتہ چینی منظور ہے۔ اس سے قطع نظر میرا عقیدہ ہے کہ صرف چکبست ہی وہ قومی شاعر ہے جس نے کل ہندوستان کے جذبات اور ضروریات کی بلا امتیاز و تفریقِ مذہب ترجمانی کی ہے۔ وہ ہندو ہے اور اسکو ناز ہے کہ ہندو ہے اسلئے کہ ہندو قوم نے بڑے بڑے سورما پیدا کئے، اسی طرح وہ مسلمانوں کو عزت کی نظر سے دیکھتا ہے کیونکہ ان میں قاتل کو جامِ شربت دینے والے اور حق کی راہ میں سب کچھ لٹا دینے والے بھی ہوئے ہیں۔ آپ اس کی ایک نظم بھی پیش نہیں کرسکتے جس سے ظاہر ہو کہ وہ ہندوؤں یا ہندو مذہب کو مسلمانوں یا اسلام سے بہتر سمجھتا ہے، بیشتر نظمیں ایسی ہیں جو سارے ملک ہند کی

ساتھ ان کے ہمسایہ مسلمانوں کا ذکر بالالتزام ہے۔ اس کے نزدیک دونوں ہندوستان کی آنکھوں کے تارے ہیں، اور اپنے اپنے عقاید میں جتنے مضبوط ہیں اتنے ہی زیادہ قابلِ تعریف، مگر اس شرط کے ماتحت کہ ہندوستان کے سچے جاں نثار ہوں، ملک پر سب کچھ قربان کردیں یہ نہیں کہ ملک کو مذہب کی بھینٹ چڑھادیں، وہ مذہبی تعصب کی تنگ نظری سے کوسوں دور رہے۔ مجھے علم ہے کہ مسئلہ پیچیدہ ہے اور موافق و مخالف بحث کے لئے بہت کچھ گنجائش ہے، مگر شاعر دماغ سے زیادہ دل سے کام لیتا ہے اور اسکی فکر نامعلوم یا نیم شعوری دنیا میں بعض رموز و اسرار کو حویت کے پردے سے اپنی طرف کھینچتی اور ساتھ ساتھ لگا لاتی ہے، جو دنیائے شعور میں داخل ہونے اور موزوں الفاظ کے قالب میں ڈھلنے کے بعد الہام کا لقب پاتے ہیں، اگر شاعری الہام اور سچا الہام ہے جس کو دل قبول کرتا ہے، کیونکہ بدقسمتی سے الہام کے بھی صبح کی طرح دو دو بھی پیدا ہوگئے ہیں ایک صادق، ایک کاذب، تو آخر میں شاعر ہی کا بول بالا رہیگا، ایک دن ایسا آئیگا، انسان دماغ کے بجائے دل کی رہنمائی میں ہلاکت و تباہی کے آلات گڑھنے، چالیں سوچنے اور دام پھیلانے کے بدلے محبت کا جادو جگائے گا اور ممکن ہے اپنی کھوئی ہوئی میراث بہشت اسی دنیا میں واپس پائے۔

چکبست کی غزل گوئی بھی خاص مطالعہ کی دعوت دیتی ہے انہوں نے غزلوں میں [illegible] کا عجیب و غریب نمونہ پیش کیا ہے، زبان غزل کی ہے لیکن خیالات حسن و عشق کے افسانوں سے قریب قریب خالی ملکی آزادی، اصلاح رسم و رواج، یکجہتی و اتحاد اور اس قسم کے مضامین سے متعلق ہیں اور لطف یہ ہے کہ لہجہ کہیں بھی خطیبانہ یا موعظانہ نہیں ہونے پایا ہے، اور تاثیر لفظ لفظ پر نثار ہوتی ہے۔

لکھنؤ کے اردو ادب کے استاد پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی کی رائے بھی دیکھئے۔

"عہدِ جدید کے جن شاعروں نے اردو شاعری پر مستقل نقش چھوڑا ہے اور اردو شاعری کے جدید طرز کو مقبولِ عام بنایا ہے ان میں حضرت چکبست لکھنوی کو موضوع کے ساتھ اپنا اسلوب بھی بدلنا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بڑی جماعت ان کے کلام سے کچھ متوحش سی رہی مگر چکبست نے نئے خیالات کو اسی اسلوب سے ادا کیا جس سے [illegible] طبیعتیں مانوس تھیں، یہی سبب تھا کہ ان کا کلام ہر طبقے میں مقبول

ہماری قدیم شاعری میں داخلیت کا غلبہ تھا جدید شاعری میں خارجیت کا پہلو نمایاں ہے، قدیم شاعری میں جو مرتبہ مطالعۂ نفس کا تھا جدید شاعری میں یہی درجہ مشاہدۂ حیات کو حاصل ہے چکبست کے یہاں بھی خارجی عنصر کی زیادتی ہے مگر داخلیت کی آمیزش کے ساتھ مشاہدہ اور مراقبہ کے اسی دلکش امتزاج کا نتیجہ ہے کہ چکبست کا کلام ان لوگوں کو بھی اجنبی نہیں معلوم ہوتا جو شاعری کو قدیم معیار سے جانچتے ہیں۔

ہمارے قدیم شاعروں کا کلام ہم کو ایک دوسرے عالم میں پہنچادیتا ہے جہاں ہم اس دنیا کے شور و شر سے کچھ دیر کے لئے نجات پاجاتے ہیں، لیکن اس دور کے جدید شاعروں کے دل میں یہ سما گئی ہے کہ ہماری شاعری اور ہماری زندگی میں پوری مطابقت ہونا چاہئے اسلئے انہوں نے اپنی شاعری سے روحانیت کا عنصر خارج کرکے اس کی جگہ عقلیت کو دیدی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو بے اطمینانی بے چینی، بدنظمی ہم اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں وہی دورِ جدید کے شاعروں کے یہاں بھی نظر آتی ہے اور ہم کو اس سے نجات پانے اور اپنا دماغی توازن درست کرنے کے لئے کوئی امن اور سکون کی جگہ ان کے یہاں نہیں ملتی۔ چکبست بھی جدید طرز کے شاعر ہیں انہوں نے بھی روحانی محبت کو اپنی شاعری میں بہت کم جگہ دی ہے۔ لیکن وطن کی محبت کے گیت اس جوش اور خلوص سے گائے ہیں کہ ان کے کلام میں ایک روحانی کیفیت پیدا ہوگئی ہے جس سے اس کا اثر بہت بڑھ گیا ہے۔

چکبست نے مختلف موضوعوں پر نظمیں کہی ہیں مگر ان کی بنیاد جس جذبے پر قایم ہے وہ وطن کی محبت اور اہلِ وطن کی بہبودی کی خواہش ہے، چکبست نے اپنی نظموں کے مجموعہ کا نام "صبحِ وطن" رکھا ہے، اس سے بھی اسی بنیادی جذبے کا اظہار ہو رہا ہے۔ چکبست حقیقی وطنیت اور صحیح قومیت کے علمبردار تھے، ہمارے ملک میں جس محدود، تنگ نظر اور متعصب پرور قومیت کا آج کل دور دورہ ہے چکبست کی شاعری گویا اس کا ردِ عمل ہے۔ وہ ہندوستان کو گویا ہندو و مسلمان دونوں کا ملک اور وطن سمجھتے ہیں اور اسکی بہتری اور آزادی کے لئے تمام اہلِ ملک سے یکساں طور پر اپیل کرتے ہیں، انہوں نے اپنی نظموں میں کسی خاص جماعت یا فرقے کو مخصوص طور پر مخاطب نہیں کیا ہے۔ چکبست ہندو تھے اسلئے اگر وہ ہندوؤں کی طرف زیادہ مائل تھے تو کوئی تعجب نہ تھا، مگر انہوں نے تعصب کی ضرورت کے ساتھ ہندوؤں کو مخاطب

کیا تو اسی وقت مسلمانوں سے بھی خصوصی طور پر علیحدہ خطاب کیا ہے مثلاً جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں پر جو تشدد ہو رہے تھے ان کے خلاف اہل ملک کو بھڑکانا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے "فریاد قوم" کے نام سے ایک نظم شائع کرتے ہیں۔ اس نظم میں ایک جگہ ہندوؤں کو خاص طور پر یوں مخاطب کیا ہے ؎

بھنور میں قوم کا بیڑا ہے ہندوؤ ہشیار　　اندھیری رات ہے کالی گھٹا ہے اور منجدھار
اگر پڑے رہے غفلت کی نیند میں سرشار　　تو زیرِ موج فنا ہوگا آبرو کا مزار
مٹے گی قوم یہ بیڑا تمام ڈوبے گا
جہاں میں بھیشم و ارجن کا نام ڈوبے گا

اسکے بعد ہی مسلمانوں سے یوں خطاب کرتے ہیں۔

دکھادو جوہرِ اسلام اے مسلمانو　　وقارِ قوم گیا قوم کے نگہبانو
ستون ملک کے ہو قدر قومیت جانو　　جفا وطن پہ ہے دشمنِ وفا کو پہچانو
نبی کے حلم و مروت کے ورثہ دار ہو تم
عرب کی شانِ حمیت کے یادگار ہو تم

ہر ماحول میں چکبست اپنے وطنیت کے جذبے کو ابھرتا دیکھنا چاہتا تھا اور یہی چکبست کی روح ہے۔ وہ علی الاعلان مرقعہ آداب مجلس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتا تھا۔

لیکن باوجود سماج کی بغاوت کے وہ مشرقیت اور لکھنوی بانکپن کو چھوڑنا اپنے ستھرے ذوق کی توہین تصور کرتا تھا، یہ بالکل صحیح ہے کہ وہ جاگتا تھا تو اپنے عزیز وطن کی فلاح کی خاطر، اور سوتا تھا تو اپنے عزیز وطن کے مستقبل کے سنہرے دودھیلے خوابوں میں۔ غرضکہ چکبست نے تمام عمر وطنیت کی نشر و اشاعت کی اور اپنی شاعری میں وطنی جذبات پیدا کرنے کے لئے اپنی عمر عزیز صرف کر دی۔

یاد رکھنا چاہئے کہ چکبست محض شاعر ہی نہ تھا، بلکہ سرکاری عدالتوں کا ایک کامیاب وکیل بھی، اور اسی مشغلہ زندگی سے اکتا کر جب کبھی وہ کچھ کہتا تھا یہ واقعہ ہے کہ بڑے بڑے مشاق اہل کار بھی نہ کہہ سکتے تھے اور چکبست نے لکھنؤ اسکول میں جو جگہ خالی کی ہے وہ آج تک پُر نہ ہو سکی، گو یہ سچ ہے کہ ان کے وطنی جذبے سے بڑا چکبست پیدا ہوئے اور ہو رہے ہیں۔

بقول فراق گورکھپوری چکبست کا وطنی نغمات خاص المخاص لکنری ہے، لفظوں کی مسکی اور گرانی، سنجیدگی اور شیرینی، سوقیت اور ثقاہت

اُن کی صوری اور معنوی کامحت، محاوروں کی درستی اور زبان کا بر محل استعمال ہیر متر اوفات کا نازک فرق، عروض اور صرفی اور نحوی قواعد کی پابندی اور سب سے بڑھ کر ان کا بانکپن ہم کو مجبور کرتا ہے کہ ہم یہ تسلیم کریں کہ لکھنوی شاعری کی جو خاص خصوصیات ہیں وہ چکبست کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اور کیوں نہ ہو وہ خود اہل زبان تھے اہل زبان اور اہلِ ادب کی حاشیہ نشینی کا شرف حاصل رہ چکا تھا۔ آتش اور انیس ایسے کاملانِ فن صناعوں کے ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا اُن کے اسالیبِ بیان کے دلدادہ تھے اور بحیثیت مجموعی چکبست کا کلام قدیم و جدید شاعری کے محاسن کا اعلیٰ مجموعہ کہا جا سکتا ہے، اُن کی زبان فصیح، بیان دلکش، مضامین بلند اور خیالات عالی ہیں، چکبست کے تمام کلام میں متانت و وقار بقول ذاتی بلند اخلاق موجود ہے، اور کہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو سنجیدگی سے دور ہو جس میں رکاکت اور ابتذال کا شائبہ ہو۔

اور ایک مبصر نے سچ کہا ہے کہ "جو شعراء اردو شاعری کو ارتقائے قوم اور تہذیبِ اخلاق کا آلہ بنانا چاہتے ہیں اُن میں چکبست سب سے آگے ہیں"۔

اصل یہ ہے کہ ہمارا قومی ادب ہمیشہ تلواروں کی تیز دھاروں، تیغوں کے گنگا جمنی سلیپے توپوں، ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کی ہیبت آفرینیوں میں پل کر جوان ہوتا رہا ہے اور قومی ادب اسی جنگی ماحول میں ہمیشہ پروان چڑھا ہے اسی وطنی جذبے کو ابھارنے کے لئے اور انہیں خصوصیات کو اجاگر کرنے کے لئے یونان کو ہومر، عرب کو امرالقیس، انگلستان کو بائرن، امریکہ کو لانگ فیلو اور ہندوستان کو چکبست کی ضرورت تھی چکبست نے وقت کے ساتھ اپنی صحیح عظمت کو سمجھا، ماضی کو پڑھا حال کو برتا، اور مستقبل کے آئینہ میں اپنے ملک کی عظمت کا سنہرا خواب دیکھا اور ہندوستان کے ذرّے ذرّے میں پہنچایا۔ آخر اس شہیدِ ادب نے دنیا کی بے اعتنائیوں سے عاجز آکر ہماری بستیوں سے دور، حدِ نظر سے ماورا چاند اور ستاروں کی ٹھنڈی فضاؤں میں اپنا نشیمن بنایا، آج حاسدِ خورشید کی لافانی لطیف کرنیں قومی ادب کے خرمنوں پر ہر لحظہ پڑ رہی ہیں، وہ حقیقتاً چکبست کے خلوص نیت کا جائز صلہ ہیں اور اسکی وطنیت کی نہ مٹنے والی قابلِ قدر یادگار ہیں جن کو ہم عرصہ تک فراموش نہیں کر سکتے۔ چکبست نے کیٹس اور شیلی کی طرح عمر بہت تھوڑی پائی، لیکن

اس کا کردار کا میابیاں بہت بلند رہا ... وطنی نغمات ہمدردی جذبات اور لافانی احساسات ...

بادشاہ کا خواب (افسانہ)

از: ———— قدوس صہبائی

استبدادنگر کا بادشاہ ظالم الدولہ مستبدجنگ چوگان میں بازی جیت کر محنت سے چور واپس آیا —— لیکن آج کا میدان جیتنے والے صبا رفتار شہوار کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی —— ڈاکٹر، جراح، سرجن سب موجود تھے —— وزراء، امراء، درباری سبھی حاضر تھے —— مگر کس کو اجازت نہ تھی کہ کوئی بات امور مملکت کے متعلق زبان سے نکالے۔ سب کے منہ میں زبانیں تھیں۔ مگر گونگی —— بہری دارالامرا اور ایوانِ خاص میں فضا ایسی بھیانک اور ڈراؤنی تھی کہ گویا کسی غنیم نے دست بدست مقابلے میں خود بادشاہ کو زخمی کردیا ہے —— اس وقت فاتح شہوار کی مرہم پٹی ہورہی تھی —

ایسے حادثہ فاجعہ کی موجودگی میں کس کی مجال تھی کہ دم مارے —— ناگاہ! —— ناگاہ: ... عین اسی ایوان کے زیرِ دیوار ایک دردناک چیخ سنائی دی۔ بادشاہ کی ابروؤں پر بل پڑگیا نظر اٹھائی —— آواز، اب آواز ذرا صاف آرہا تھا۔

"اماں! —— فریاد! —— دہائی ہے!"

ایک بیوہ کی جوان حسین اکلوتی بیٹی کو وزیر داخلہ کے کارندے زبردستی پکڑلے گئے تھے —— بیوہ ماں فریادی بن کر آئی تھی ——

"کیسا شور وشغب ہے —— ؟" بادشاہ نے محافظِ قصر دستے کے فوجی افسر سے پوچھا۔

"جہاں پناہ! پھر کوئی فریادی آیا ہے۔"

حکم ہوا کہ مرد ہو تو زبان کھینچ لی جائے۔ عورت ہو تو گدھے پر سوار کرکے تشہیر کرائی جائے اور زندان بلا میں ڈالدیا جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد اطلاع دیگئی کہ فریادی کو پیادے لے گئے ——

تھوڑی دیر کے بعد ہی بازی جیتنے والے صبا رفتار گھوڑے کی مرہم پٹی ختم ہوگئی اور بادشاہ کمرۂ استراحت میں پہونچکر سوگیا ——

ذرہ ذرہ پر مہر خاموشی لگ چکی تھی —— فضا بالکل پُرسکوت تھی —— بادشاہ کے کمرۂ استراحت میں ہلکی ہلکی نیلگوں روشنی دلکار تاریخی پردوں، برہنہ ونیم عریاں آرٹ کی زندہ تصویروں اور اطلس و دیبا کے فرش پر پڑ رہی تھی اور منعکس ہو ہو کر گوناگوں رنگ پیدا کر رہی تھی ——

حریر کے پردوں میں سے بادشاہ محوِ خواب نظر آرہا تھا —— اب اُس نے داہنی پہلو پر کروٹ بدلی۔ ایسا معلوم ہوا کہ پشت کیطرف ایک دھوئیں کا سا بادل اُٹھا —— بادشاہ نے پھر کروٹ لی وہ مضطرب ہورہا تھا —— دھوئیں نے ایک سیمیں شکل اختیار کرلی لیکن مادی جسم کے بجائے وہ شکل اب بھی دھواں ہی تھی۔

سیمیں شکل حرکت میں آئی اور مستبدجنگ کے سرہانے ٹھیر گئی۔ بادشاہ پھر مضطرب ہوا اب وہ چت سو رہا تھا اسکے نتھنے چڑھے ہوئے تھے اور لب متحرک تھے —— وہ اپنے کانوں سے یہ آواز سن رہا تھا۔

" —— انسان کو جب زمین کی بادشاہت دی گئی تو اُس سے کہا گیا تھا کہ اے خاک کے پتلے تجھے یہ امانت اسلئے سپرد کی جاتی ہے کہ تو خلق خدا کی نگرانی کرسکے اور زمین پر امن قائم رکھ سکے ماحصل یہ ہے کہ جو جس شے کا مستحق ہو اسکو وہ بہم پہونچائے —— بوڑھوں کو آرام کی روزی دے —— جوانوں کو برسرکار رکھے —— بچوں کی خبرگیری اور بیواؤں، یتیموں کی پرورش اور دلدہی کرے —— لیکن او ناعاقبت اندیش خائن! او لالچی! او عیش دوست اور دولت و حکومت کے بندے! او ہوا وہوس کے پجاری! اکیلا تو

سب کچھ ہڑپ کر گیا ـــــ کیا تو بھول گیا کہ

نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا
مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے ـــــ

بادشاہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا ـــــ آنکھیں مل کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ زرنگار میز پر سے بلوریں گلاس اٹھایا اور مقطر عرق کے دو گھونٹ پیکر پھر دراز ہو گیا۔ چند لمحوں میں وہ خراٹے لے رہا تھا۔

وہ ہم رنگ دُھواں غیر مرئی اور غیر مادی ہیولی شکل پھر اُس کے سرہانے آ کر کھڑی ہو گئی ـــــ بادشاہ کے جسم و اعصاب میں پھر تحریک اضطراب دکھائی دینے لگی۔ اور بہت سے پہلو بدلنے کے بعد وہ اپنی تخت پر لیٹ گیا ـــــ اب اُسے خواب میں چوگانی میدان سے وسعت و فراخی میں چند در چند بڑا میدان نظر آیا۔ مگر وہ پرخار دیگزار تھا۔ جس میں بادِ سموم خوفناک آندھیوں کی شکل میں سنسنا رہی تھی۔ بادشاہ نے خواب میں محسوس کیا کہ اُسکا منہ جھلس رہا ہے ـــــ ممکن تھا کہ وہ گھبرا کر اٹھ جا رہے کہ فضا میں ایک تزلزل پیدا ہوا ـــــ دور اُفق پہ گرد اُڑی اور اسکے اندر سے اُسے بیواؤں، یتیموں اور بوڑھیوں کی ایک فوج نظر آئی۔ ہر ایک کی زبان سے ادا ہونیوالے صاف الفاظ جو اُس نے سنے اسکو لرزا دینے والے تھے۔

ـــــ "دکھ درد بھرے، آہوں کے شعلے فریاد بن بن کر زمین سے فلک تک پہونچے پر تو نہ جاگا۔ بے صبرا عیش کے خوگر!

ـــــ "ہم بیوائیں ہیں۔ انقلاب دہر نے ہمارا سہاگ ہم سے چھین لیا ہے۔ ہم بیکس ہیں، لاچار ہیں، مفلس ہیں مجبور ہیں مگر تو ہماری حالت سے بے خبر ہے بے پرواہ ہے۔

ـــــ "ہم یتیم ہیں، لیسیر ہیں۔ ہمارے ماں باپ ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے ہیں بجز مغموار تنہائی نہ کوئی مونس ہے نہ ہمدم ہے۔

ـــــ "اے ظالموں کے ظالم! ہمارے وارثوں نے اس دارِ فانی سے کوچ کرتے وقت ہم سے کہا تھا کہ ہمارے بعد خدا کا خلیفہ تمہاری سرپرستی، تمہاری دلدہی کریگا۔ اس کے خلاف تو نے ہماری سرپرستی و دلدہی کی۔ ہم سے بالکل منہ موڑ لیا ـــــ [illegible] اور

افلاس کا شکار بنایا، تو نے ہمارے متاعِ زندگی کو لوٹ لیا۔ ہماری حالت زار دیکھ۔ نہ تن پر کپڑا ہے، نہ پیٹ کو روٹی، نہ رہنے کو جھونپڑا ہے، نہ سونے کو بستر۔ کیا ہم انسان نہیں ہیں ـــــ؟

ـــــ "او عیش پرست کھلاڑی! جن خزانوں پر تو قابض ہے۔ کیا یہ تیرے کھیل کود، تیری عیاشیوں، تیری زینت و حکومت ہی کے لئے مخصوص ہیں ـــــ؟ کیا ان کے اندر ہمارا کچھ بھی حق نہیں ہے؟ ـــــ مگر سن نظامِ قدرت نے ہمکو اب یہ سمجھا دیا ہے کہ ان خزانوں میں جو کچھ ہے وہ اصل میں ہمارا ہی ہے۔

ـــــ "کاش تو بھی فاقے سے ہو ـــ ایک نوالہ تیرے منہ تک لایا جائے اور وہ بھی تیرے ہی سامنے کسی کتے کو ڈال دیا جائے ـــــ کاش ڈاکوؤں کا ایک خوفناک گروہ تجھے پکڑ کر تیری بیش بہا پوشاک اتارلے اور تیرے تن بدن پر ہماری طرح چیتھڑا نہ رہے۔ کاش تیری ماں، بہن اور بیٹی کی ننگ و ناموس تیری آنکھوں کے سامنے لوٹی جائے ـــــ

ـــــ "تو ہماری زندگی کا رہزن ہے ـــــ؟ تو اوظالم! او جنگل بھیڑیے! وہ دن قریب ہے جب ہماری آہوں کا انقلاب تیری بساطِ استبداد الٹ دیگا ـــــ"

بادشاہ پر ایک بخار کی ہزیانی سی کیفیت طاری ہوئی ـــــ وہ کراہنے لگا لیکن نیند کھلنے سے پہلے اُس نے دیکھا کہ بیوائیں، یتیمیں اور بوڑھیوں کی فوج دھواں بنکر فضا میں گھل مل گئی۔ جب دھواں صاف ہوا تو اس نے دیکھا کہ زخم خوردہ لنگڑاتے تنا ہوا کا ہم شبیہ سینہ پھلائے فضا میں تیرتا ہوا بڑے طمطراق سے گزر گیا۔

چوگان میں بازی جیتنے والے اپنے محبوب مرکب کو ایسا تندرست اور خوش اور شان و شوکت کے عالم میں دیکھ کر راکب کا سینہ بھی فرطِ مسرت سے اُبھر آیا۔ غریب بیواؤں اور یتیموں کا ایک حرف بھی اس کے ذہن و دماغ میں باقی نہ رہا ـــــ انسانوں کے اس لرزہ براندام کر دینے والے منظر کا ہلکا سا پرتو بھی مٹ گیا۔ اب وہ سکون کی گہری نیند سو رہا تھا ـــــ

قلعے سے نصف شب کا گجر بجا ـــــ بادشاہ کے سرہانے جو

دھویں اور غبار کا ایک مجسمہ ایستادہ تھا اس میں حرکت پیدا ہوئی ——— دھواں تحلیل ہوگیا اور چند لمحوں کے اندر پھر سمٹ کر کمرہ کے بالکل وسط میں ہوا کے اندر مجتمع ہونا شروع ہوگیا۔ گردھویں کا رنگ اب بھورا نہ تھا بلکہ غلیظ سیاہ ہوتا چلا جارہا تھا۔ پہلے جو شکل سپید جنگ کے سرہانے موجود تھی اس میں ایک لطافت و نزاکت نظر آرہی تھی اُسے شیریں خوابوں کی دیوی کہا جاسکتا تھا ——— لیکن اب وہ سیاہ دھواں جو ایک قالب اختیار کرچکا تھا غیض و غضب کا ایک دیوتا دکھائی دیتا تھا۔ اُدھر اُس نے منہ کھولا اور اُس میں سے ایک سُرخ شعلہ نمودار ہوا۔ اُدھر بادشاہ نے کروٹ لی اور کراہتے ہوئے پہلو بدل کر صاف چیخا شاید اب وہ پھر خواب دیکھ رہا تھا ———

فلم کے پردۂ سیمیں کی طرح اسکی نگاہوں کے سامنے میدانوں کے ہر ہر چپے سے سیاہ پوش انسانی ڈھانچے نمودار ہونے شروع ہوئے۔ ان ڈھانچوں میں پسلیوں کا رنگ آتشی سُرخ رنگ تھا اور آگ کے ان خطوط سے ہلکے ہلکے شعلے اُٹھ اُٹھ کر فضا کو جہنمی بنا رہے تھے ——— جھرّیوں دار چہروں پر گال کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور بے گوشت دہانوں میں سفید دانت بالکل ایسے دکھائی دیتے تھے جیسے بھوت کے مصنوعی سیاہ چہرے میں خوفناکی بڑھانے کے لئے لگا دیے جاتے ہیں ان لاکھوں بے حس و حرکت انسانی ڈھانچوں میں صرف آنکھیں پوری تیزی سے گردش کر رہی تھیں اور اُنکی روشنی زندہ انسانوں کی روشنیٔ چشم سے کہیں زیادہ تھی ——— یکایک ایک ڈھانچہ ہوا میں بلند ہو کر سب سے کسی قدر بلندی پر قائم ہوگیا اور بادشاہ کو مخاطب کرکے اُسنے کہنا شروع کیا۔

——— "اے آقا! ذرا اپنے ہوا کے گھوڑے کو لگام دے ہماری سُن لے۔ ہماری جوانی، ہمارا شباب ہماری توانائی ——— ہر چیز تیری خیر خواہی میں گزری۔ تیری ملک گیری کے جذبے اور تیرے جاہ و جلال نے، تیری صولت و عظمت اور تیرے دبدبۂ سکندری نے صرف ہماری دلیری اور ہماری شجاعت سے قوت پائی ——— تیرے خزانے ہماری حفاظت اور ہماری ایمانداری سے محفوظ رہے۔ تیرے جاہ و حشم کو بالائے بام پہونچانے والی ہماری ہستیاں ہی تھیں۔ تیرے زمانوں کا منوانے والا ہمارے سوا کون تھا ——— ؟ تیرے درباروں کی شان ہمارے ہی دم سے تھی ———

——— آہ! ہم سب تیری اقلیم کے وہ خدام ہیں جو اپنی جوانیاں تیری خدمت میں گنوا کر بعض ایسی [illegible] کے عالم میں اب یہ سکتے [illegible] ہلکان ہو گئے ——— تُو نے بے شک ہم سے غفلت برتی یا یہ۔ لیکن کیا تو نہیں سوچتا کہ ہماری جوانی گئی ——— بڑھاپا آیا ——— اور ہم اس کسمپرسی کے عالم میں گزارے جائیں سیر دن کام ذکر کے [illegible] دکھ کا ہم مصیبت کیلئے ——— تیری سلطنت ؟

——— محبت، ہماری وفاداری، دلیری، شجاعت، دیانت کا ہمیں کوئی صلہ نہیں ملا ——— اس بات کے معاوضے میں تو نے ہمیں دکھ دیا، رنج والم دیا، بڑھاپا اور بیماری اور افلاس ——— تیرا جوش، تیری حکومت کا ضامن نہیں ہوسکتا۔ اِس عالم ضعیفی میں تو نے اپنے وفاداران ازلی کو دربدر کی ٹھوکریں کھلوائی ہیں، انسانیت کا خون کیا ہے۔ ہمارا قربانیوں کو کتوں کو ڈال دیا ہے ——— لیکن یاد رکھ!

——— تیری رعایا کا دوسرا قدم ظلم و فریاد کے بعد انتقام کا قدم ہوگا ——— ہوشیار ہوجا!"

بادشاہ کو بڈھے کی بکواس سے سخت غصہ آیا۔ اُسکا منہ سُرخ ہوگیا۔ اُس نے سوچا کہ میں اِس خبیث روح کو اگر میرے قبضے میں آجائے تو زندہ جلواؤں گا ——— ناگہاں!

——— فضا میں فاتح شہوار کا ہم شبیہ پھر نمودار ہوا۔ بادلوں کا دل پھٹنے لگا۔ بادشاہ اپنے پلیسے رہوار کی طاؤس چال سے مست ہونے لگا ——— میدان صاف ہوچکا تھا۔ گھوڑے نے بھی ایک پھریری لی، ہوا میں سماگیا ——— اس کے بعد فضائے بسیط پھر اندھیاری ہوگئی ———

سیاہ دھوئیں کی ہیبت ناک مورت کو شدید ارتعاش ہوا۔ اُس کے دونوں ہاتھ سر کے اوپر اُٹھ گئے اور انگلیوں کے ہر پور سے ایک ایک برقی چمک کر چھت میں سماگئی۔ ہر شمس بو شعلہ فشاں تھا اب برق براماں نظر آنے لگا ———

بادشاہ کے خواب کا سلسلہ منقطع نہ ہوا [illegible] میں اُجالا دکھائی دے رہا تھا ——— لیکن یہ روشنی [illegible] تھی کہ وہ اُنکی صحیح کیفیت نہ کہہ سکتا تھا ——— [illegible] بادلوں کی گرج [illegible] ——— بستر پر بادشاہ [illegible] کانپنے لگا ——— [illegible] تھا کہ میدان میں [illegible] کے ذخار و جرار

ہوگیا ہے اُسکا طوفانی سیلاب سارے طول و عرض میں پھیل گیا ہے — اِس سیلاب کے بیچوں بیچ سے دُھویں کا ایک بادل سا اُٹھا اور ہزارہا لال جھنڈے جن میں سے آسمان کے صاف پس منظر میں لہراتے دکھائی دیئے ہر پرچم پر سنہری حرفوں میں "انقلاب زندہ باد" لکھا ہوا ہے — یہ الفاظ پڑھ کر ہی بادشاہ کے سینے میں جھرجھری سی آگئی — "ہتھوڑے اور درانتی" — کا صاف نشان دیکھکر تو وہ کانپنے لگا۔ اُسے یاد آگیا کہ یہی تو شاہیت کی بیخ و بنیاد مٹانے کا نشان ہے — وہ آنکھیں بند کرلینا چاہتا تھا — وہ ہچکچا کر پیچھے ہٹ رہا تھا کہ دریا میں ایک ایسا زبردست دھماکا ہوا جیسے کسی نے سیکڑوں توپیں ایک ساتھ فائر کردیں — وہ اچھل پڑا — اور اسکی آنکھیں کھل گئیں — کمرے کی نیلگوں روشنی میں اُسے ایک خوفناک سکوت معلوم ہوا جسے دفعتاً محل کے نیچے سے "انقلاب زندہ باد" کے نعروں نے شکست کردیا — ڈر کر اُس نے پھر آنکھیں بند کرلیں اور دل میں سوچنے لگا کہ "خدایا کیسا خوفناک خواب دیکھ رہا ہوں" نعروں کا شور برابر آرہا تھا اور بادشاہ یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ محو خواب ہے — اب وہ پھر سچ مچ سوگیا — اور سوتے میں اُس نے دیکھا کہ سیلاب کا پانی حقیقت میں پانی نہیں ہے بلکہ ہزارہا نوجوانوں کا ایک مسلح موجزن سمندر ہے اُن کی آنکھیں بھی روشن ہیں لیکن چہروں سے بھوک، افلاس، غربت اور فاقے کے آثار ظاہر ہیں۔ ہر ایک کی زبان پر "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ ہے —

وہ گھبرا گیا، میدان سے پیٹھ موڑ کر بھاگنا چاہتا تھا لیکن اِس انسانی سمندر کے وسط سے ایک تخت بلند ہوا اس پر ایک نوجوان گریبان چاک، بال پریشان، ہاتھ میں سب سے اونچا جھنڈا لیئے سوار ہوا — بادشاہ نے اِسے پہچان لیا۔ یہ اُسی کسان کا بیٹا تھا جسکی لڑکی کو چھ برس پہلے اُس کے پیادوں نے زبردستی محل کے حرم میں داخل کردیا تھا۔ جسے قتل کے مفروضہ الزام میں پھانسی دی جاچکی تھی۔ اُس کے گھر پر ہل پھروا دیئے گئے تھے اور اُس کے بیوی بچے بے خانماں ہوگئے تھے —

نوجوان کسان زادے نے سرخ علم کو جنبش دی۔ سب نے ہم آہنگ ہوکر کہا "انقلاب زندہ باد" یہی اس انقلابی مجمع کا رہبر تھا — ہاتھ کا اشارہ دیکھتے ہی وہ سب خاموش ہوگئے اور اس نے بادشاہ

کو مخاطب کرکے کہنا شروع کیا۔

"عیش پرست کھلاڑی! زمانے نے ورق لوٹ دیا! تاریخ اپنا سبق دھرا رہی ہے۔ قدرت نے حکومت کا تاج تیرے سر پر رکھکر اپنے بندوں کو تیرے حوالے کیا تھا اور دنیا کے بھرے خزانے تیرے سپرد کئے تھے۔ اپنی امانت کے طور پر۔

"تونے یہ سب کچھ پاکر انسانیت سے منہ موڑا۔ حق کا خون کیا، امانت کے بھرے خزانے خیانت کرکے خالی کردے — کس لئے؟

"کیا فقط اس لئے کہ — ہماری عزت و ناموس کی حفاظت اور ہماری ماں، بہنوں، بیٹیوں کی عصمت کی محافظت کا خیال بالائے طاق رکھدے — ہمارے پیٹ کاٹ کر اپنے عیش اور اپنی محل محل کو آراستہ رکھے —؟

"او محافظ بھیڑیے! تونے ہماری دولت، ہماری روٹی، ہماری زندگی چھین لی۔ او انسانیت کے دشمن ڈاکو! تونے ہماری متاع آبرو کو لوٹ لیا — اور اب سن!

"ہم ہیں نوجوان — ہمارا جوہر ہماری جوانی اور ہماری طاقت ہے۔ شجاعت ہماری خو ہے، ہم نے مشرق و مغرب کے امتزاج سے وہ نئی روح اپنے اندر پیدا کرلی ہے جو تیری بیخ کنی کے لئے آج پیغام قضا بنکر آئی ہے۔ ہم میں اہل علم بھی ہیں اور اہل قلم بھی — لیکن تونے ہمیں ناکارہ بنا رکھا ہے۔ بیروزگاری ہے اور ہم ہیں — غریبی اور فاقہ کشی ہے اور ہم ہیں — اور ہماری ماں، بہنیں، باپ بھائی — ہمارے ضعیف و ناتواں ہمسایے، ہمارے ہم قوم بوڑھے، اپاہج، غریب، مزدور اور کسان سب فاقے کرتے ہیں لیکن تجھے پرواہ نہیں۔ ہم روٹی کی تلاش میں ہر صاحب زر کے دروازے کو کھٹکھٹاتے پھرتے ہیں لیکن تو اور تیرے عافیت کوش حرام خور ہمنوا ہمیں آنکھیں دکھا دکھا کر دھتکار دیتے ہیں۔ یاد رکھ! اس توہین کا ذمہ دار بھی تو ہی ٹھیرے گا۔

"اے ہماری عزت و آبرو کے بدبخت محافظ! بتا تونے انسانیت کے احترام کے لئے کیا کیا؟

"کچھ نہیں — آہ! انسانوں کے شکاری! ان بھرے ہوئے خزانوں کو بیدردی کے ساتھ تونے خالی کیا ہے آج اُسکا

تجھ سے جواب طلب کر رہے ہیں۔ اُسکا حساب مانگتے ہیں۔ بتا تیرا جواب کیا ہے۔؟ تجھے اس کا جواب اور اس کا حساب دینا ہوگا۔

"ہم ہیں نوجوان ——— ! ہمارے جھنڈوں کی طرح ہمارے دل بھی ہم رنگ خون ہیں۔ اب ہم تجھ سے انتقام لینا چاہتے ہیں اور اب ہمارے ہاتھ بھی تیرے حرم کی نازنیناں سبک سر کے حنائی ہاتھوں کیطرح سُرخ ہونے کے لئے بیتاب ہیں۔ مہندی سے نہیں ——— بلکہ ہم رنگِ آتشِ خون سے ———"

فارغ شاہوار کا ہم شبیہ فضا میں نمودار ہوا ——— لیکن اس مرتبہ وہ نہایت خستہ و ماندہ تھا اور لنگ کر رہا تھا۔ بادشاہ کا دل اپنے محبوب کی یہ حالت دیکھ کر ڈوب گیا۔ اُسکی آنکھوں میں سے آنسو نکل پڑے اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ فضائے بسیط میں سے گھوڑے رہوار تک پر لگا کر اُڑ جائے اور اُسکی گردن پر شفقت کا ایک ہاتھ پھیر کر اُس کا منہ چوم لے ——— لیکن یہ اُس سے ممکن نہ ہو سکا۔ حسرت بھری نظروں سے وہ اُسے تک رہا تھا۔ انقلابی کسان زادے کی تقریر کا ہر ہر لفظ مجروح رہوار کی ہمدردی کے طاقتور جذبے نے بھلا دیا تھا ——— شاہوار وسعتِ میدان کو طے کر کے اُفق میں غائب ہونے والا تھا کہ قائدِ انقلاب نے مغموم و متحیر تاجدار کو للکار کر کہا "دیکھ!"

اُس نے نظر اُٹھائی ——— اور!

نوجوان نے ایک چمکدار تیز بھالا سنبھالا۔ وہ چند قدم بڑھا اور شاہوار کے برابر پہنچ کر اُس پر وار کر دیا ——— آناً فاناً میں نیزے کی انی شاہوار کے سینے میں پیوست ہو گئی ——— بادشاہ نے ایک چیخ ماری ——— اُسکی ساری مملکت سے زیادہ عزیز کا خون دیکھکر وہ چکرا گیا۔ کسان زادے کے ہاتھ خون سے رنگین تھے وہ آگے بڑھا اور بادشاہ کے سینے پر اپنے خون آلود ہاتھ سے رنگین چھاپہ لگا دیا۔ دوسرے ہاتھ نے تاج شاہی اُتار کر پاؤں سے روند ڈالا اور پھر "انقلاب زندہ باد" کا فلک شگاف نعرہ آسمان و زمین پر سنائی دینے لگا۔

بادشاہ پسینے میں تر اور خوابِ غفلت سے بیدار ہو گیا۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ آنکھیں ملتے ہوئے اُس نے گیسو دراز مرجانہ کو آواز دیا ——— آج وہی اسکی رفیقِ شب تھی۔ لیکن وہ یہ نہ دیکھ سکا کہ مین اُسی وقت سیاہی مائل دھوئیں کا ایک لکہ ہواداں سے گزر کر باہر جا رہا ہے۔

اُس نے مرجانہ کو دوبارہ زیادہ بلند آواز سے پکارا لیکن مرجانہ کے بجائے عسکری نام غلام خنجر بکف سامنے آیا ——— اور محل کے نیچے سے شور و ہنگامہ کی اصلی چیخ و پکار سنائی دی۔

"آدھی رات کے وقت یہ کیسا غُل غپاڑہ ہو رہا ہے۔ عسکری؟ مرجانہ کہاں ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"محل کو باغی رعایا نے گھیر لیا ہے، جہاں پناہ! اب صرف سلامتی تخت و تاج سے دست برداری میں ہے۔ یا سر یا تاج۔ رعایا کا یہی مطالبہ ہے۔ محافظ فوج باغیوں سے جا ملی ہے۔ مرجانہ دوسرے کمرے کے دریچے سے نیچے چراغاں کا منظر دیکھ رہی ہے" عسکری نے یہ روح فرسا خبر سنائی۔

"پھر؟ ———" گھبرائی ہوئی آواز سے مستبد جنگ تاجدار استبداد نگر نے پوچھا

"کوئی دم میں باغی انقلابی محل میں دھس آئینگے" جواب ملا

"میں کیا کروں ——— ؟" لرزتے ہوئے بادشاہ نے سوال کیا۔

"قیدی کیا کر سکتا ہے ——— ؟" غلام نے جواب دیا

"مگر میں تو ابھی قیدی نہیں ہوں۔ غلام گردش کے خفیہ راستے سے نکل کر بھاگ سکتا ہوں اور جان بچا سکتا ہوں"

پردوں کے پیچھے سے تین نیزہ بردار مرد نکلے "تو قیدی ہے۔ آج ہمارے انتقام کا دن ہے" بادشاہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

تبصرہ :-

عہد حاضر کے بڑے لوگ

کامل چار حصے - مصنفہ محمد مرزا دہلوی - قیمت چار روپئے - ملنے کا پتہ دارالاشاعت سیاسیہ حیدرآباد دکن - حجم چار سو بیس صفحات لکھائی چھپائی عمدہ - ر

زیر نظر تصنیف میں بقول مصنف عہد حاضر کے "بڑے لوگوں" کی زندگی کے مختصر حالات اور کارناموں کا تذکرہ ہے - لیکن یہاں پر بڑے لوگوں سے مراد صرف سیاسی دنیا کے بڑے لوگ ہیں - کتاب کے چار حصے بتدریج مندرجہ ذیل ملکوں کی سیاسی شخصیتوں پر مشتمل ہیں - ہندوستان - چین وایران، عراق وعرب اور مصر و مراکش - لیکن یہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ "عہد حاضر کے بڑے لوگوں" کی فہرست میں جہاں عبدالکریم اور چیتر جند اس غیر اہم شخصیتوں کا آب وتاب کے ساتھ تذکرہ ہے وہاں لینن، استالین، کمال اتاترک اور روزولٹ کے نام یکسر سے غائب ہیں - مخصوص طور پر عہد حاضر کے بڑے لوگوں کی فہرست میں لینن کا نام نہ ہونا سخت حیرت انگیز ہے جبکہ بیسویں صدی کا اہم ترین انسان لینن ہی مانا جاتا ہے اس لئے کہ وہ انسانی تاریخ و تمدن کے ایک نئے دور کا بانی مبانی ہے - یہ تو شخصیتوں کے انتخاب کے لحاظ سے کتاب کے تشنہ اور نامکمل ہونے کا ثبوت ہے، دوسرے سیاسی خطوں اور ملکوں کے انتخاب کے لحاظ سے بھی یہ کتاب اپنے موضوع کے مطالبات بالکل نہیں پورے کرتی ہے - عہد حاضر میں سیاسی اہمیت کے اعتبار سے یورپ یا امریکہ، مشرق بعید مرکزی حیثیت رکھتے ہیں نہ کہ مراکش یا عراق یورپ کا ہر واقعہ پوری دنیا کو متاثر کرتا ہے لیکن عراق کا کوئی بھی واقعہ پوری دنیا کو متاثر نہیں کرتا - یہ ایک بالکل فطری امر ہے - یورپ انسان کی تہذیبی اور تمدنی ترقی و عروج کی سب سے اونچی منزل پر ہونے کے سبب لازمی طور پر ساری دنیا کا رہنما ہے - ٹھیک جس طرح قدیم یونان یا روم کسی زمانہ میں ساری دنیا کا تہذیبی اور تمدنی رہنما تھا

بہرحال زیر نظر تصنیف میں صرف ایشیا یا افریقہ کے ان ملکوں اور نوآبادیات کے بڑے لوگوں کو شامل کیا گیا ہے جو اپنے ملکوں کے خلاف آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہیں - اس اعتبار سے شاید کتاب کا نام اور کچھ ہونا چاہئے تھا - کتاب میں جو شخصیتیں زیر بحث لائی گئی ہیں وہ یہ ہیں -

گاندھی، محمد علی، سی - آر - داس، جناح، چیانگ، ملک شاہ فیصل، ابن سعود، زاغلول، عبدالکریم

زیر نظر تصنیف میں معلومات اور تفصیلات کا وافر ذخیرہ موجود ہے جس سے مصنف کی محنت شاقہ کا پتہ چلتا ہے اس لحاظ سے یہ کتاب اردو کے سیاسی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے -


کفایت شعاری کے دشمن
کشتی لڑنے والا
یہ صحیح ہے کہ کپڑے کوئی کاغذ وغیرہ کی طرح نازک نہیں ہوتے تاہم
یہ ضروری نہیں کہ ان کے ساتھ اس قسم کا سلوک کیا جائے۔
کپڑوں کو احتیاط اور سلیقہ کے ساتھ دھونا چاہیے تاکہ وہ خوبصورت
دکھائی دیں اور عرصہ تک کام بھی دیں۔ کپڑوں کو اچھے صابن سے
اعلیٰ اور بہترین طریقہ پر دھونے کے چند آسان اصول ذیل میں
درج کئے جاتے ہیں :۔
501
۵۰۱ واشنگ سوپ
ٹامکو سیلز ڈپارٹمنٹ
جواہر اسکوائر الہ آباد
دی ٹاٹا آئل ملز کمپنی لیمیٹڈ
کپڑوں کو گرم پانی میں اچھی طرح بھگو دیجئے تاکہ میل پھول جائے۔
۵۰۱ صابن کا کفایت سے استعمال کیجئے اور اسے کپڑوں پر
حسب ضرورت لگائیے تاکہ صابن کی بھی بچت ہو اور کپڑے
بھی محفوظ رہیں —
صاف پانی میں کپڑوں کو اچھی طرح دھو ڈالئے۔ تاکہ صابن
کا اثر دور ہو جائے اور میل کا نام تک باقی نہ رہے
پھر آپ ان صاف کپڑوں پر فخر کریں گے

چند جدید الطبع معرکتہ الآرا کتابیں

نام مصنف	نام کتاب		قیمت
ابراہیم جلیس	زرد چہرے	سبق آموز افسانے۔ سوسائٹی کی کمزوریوں کا خاکہ	۴ عہ ر
اقبال	فلسفہ عجم	ڈاکٹر اقبال نے اپنے ابتدائی دور میں عجمیوں کے فلسفہ پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی اسکا ترجمہ	۳ ر
بجلی جاپوری	فلمی تتلیاں	نامور فلم ایکٹرسوں کے باتصویر حالات	سے ر
سید صدیقی	داستان کربلا	حادثۂ کربلا پر مشاہیر علما، اور ممتاز اہل قلم کے بصیرت افروز مقالات کا مجموعہ	۱۴ عہ ر
سید سلیمان ندوی	سیر افغانستان	تین ہم سفر۔ ڈاکٹر اقبال، سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کا سفرنامہ افغانستان۔	۴ عہ ر
شاہد حسین رزاقی	نازیت	بالشویزم کے متخالف تحریک کا نام جسے دوسرے لفظوں میں ہٹلرزم کہتے ہیں	۱۴ عہ ر
عبدالرحمٰن سعید	قائدین کے خطوط	سیاست حاضرہ پر قائدین کے خطوط مسٹر جناح کے نام	عہ ر
غلام دستگیر رشید	اسلام کے سیاسی تصورات	اسلام کے سیاسی تصورات مشاہیر زعماء کے قلم سے	۲ عہ ر
	حکمت اقبال	حکمت اقبال کے مختلف پہلوؤں پر حکیمانہ تجزیے اور تبصرے	للعہ ر
	فکر اقبال	اقبال کے نظریات فکر و عمل ان کی تصنیفات کی روشنی میں	للعہ ر
فضل حق قریشی	آجکل کے رومان	عورتوں کے قلم سے لکھے ہوئے شاہکار افسانوں کا مجموعہ	۱۲ عمر ر
قیسی رامپوری	خطا	ایک معاشرتی ناول	سے ر
	سزا	سزا کے مختلف پہلوؤں پر ناول کے پیرایہ میں روشنی ڈالی ہے	۴ عہ ر
	ضربیں	معاشرتی افسانوں کا قابل قدر مجموعہ	سے ر
ماہر القادری	ذکر جمیل	کیف و سرور سے معمور ایک نعتیہ مجموعہ کلام	۱۲ عہ ر
مجنوں گورکھپوری	سرنوشت	فلسفیانہ خیالات اور تاثرات ایک مسلسل افسانہ کی صورت میں	عہ ر
مسلم ضیائی	روسی ظرافت	ملک روس کی لطیف ظرافت۔ ہندوستانی نقطۂ نظر سے آپ بمشکل کوئی ظرافت کا پہلو نکلتا ہے	۴ ر
نعیم صدیقی	ذہنی زلزلے	موجودہ نظام کے خلاف ذہنی ہیجانات کی عکاسی افسانوی رنگ میں	۴ عہ ر
صدیقہ بیگم صاحبہ	ہچکیاں	دلچسپ اور سبق آموز افسانے۔ سسکتی ہوئی تہذیب کا خاکہ	سے ر

ملنے کا پتہ:۔ صدیق بک ڈپو۔ لکھنؤ

اُس خط کا اقتباس جو ایئر مارشل سر جان بالڈون نے تیسری ٹیکنیکل ایئر فورس کی آئی۔اے۔ایف سکویڈرنوں کے کمانڈنگ افسروں کو لکھا تھا۔

"آئی۔اے۔ایف اپنی عمر کے گیارہ سال پورے کر چکی ان گیارہ سالوں میں آپ لوگوں نے ایک مضبوط اور زوردار فوج تیّار کر لی ہے۔ آئی۔اے۔ایف نے آر۔اے۔ایف اور یو۔ایس۔اے۔ایف کے دوش بدوش ہوابازی ہوائی جنگ اور بمباری میں جس اتحاد اور قوت کا ثبوت دیا ہے، اُس پر میں اپنے اظہارِ تحسین کو تحریر میں لانا چاہتا ہوں ایک زبردست کام کی تکمیل کرنی ہے ہم ایک ایسے دشمن کا مقابلہ کر رہے ہیں جو، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، نہایت شقی اور بہت اچھی طرح مسلح ہے۔ تاہم مجھے نتیجے کے متعلق کوئی شُبہ نہیں۔ اپنے عمدہ کام کو جاری رکھئے۔ اور فتح کے بعد ہندوستان یقیناً اپنے آئی۔اے۔ایف کے ہوا باز فرزندوں کا نہایت ممنونِ احسان ہوگا۔"







نیلام کرنیوالے کی آواز اسی طرح گونجتی رہتی ہے۔ وہ بڑے کمال کے ساتھ گاہکوں کی فطری کمزوریوں سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ اپنے مال کی خوبیاں بتابتا کر، کبھی اِس طرف اور کبھی اُس طرف بولی بڑھواتا ہے اور قیمت دیکھتے دیکھتے کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ آخر بولی بند ہونے پر خریدار غور کرتا ہے، کہیں میں نے ضرورت سے زیادہ دام تو نہیں لگا دیئے؟ اُس نے کم از کم اُس سے تو زیادہ ہی دیئے جتنے دینا چاہتا تھا!

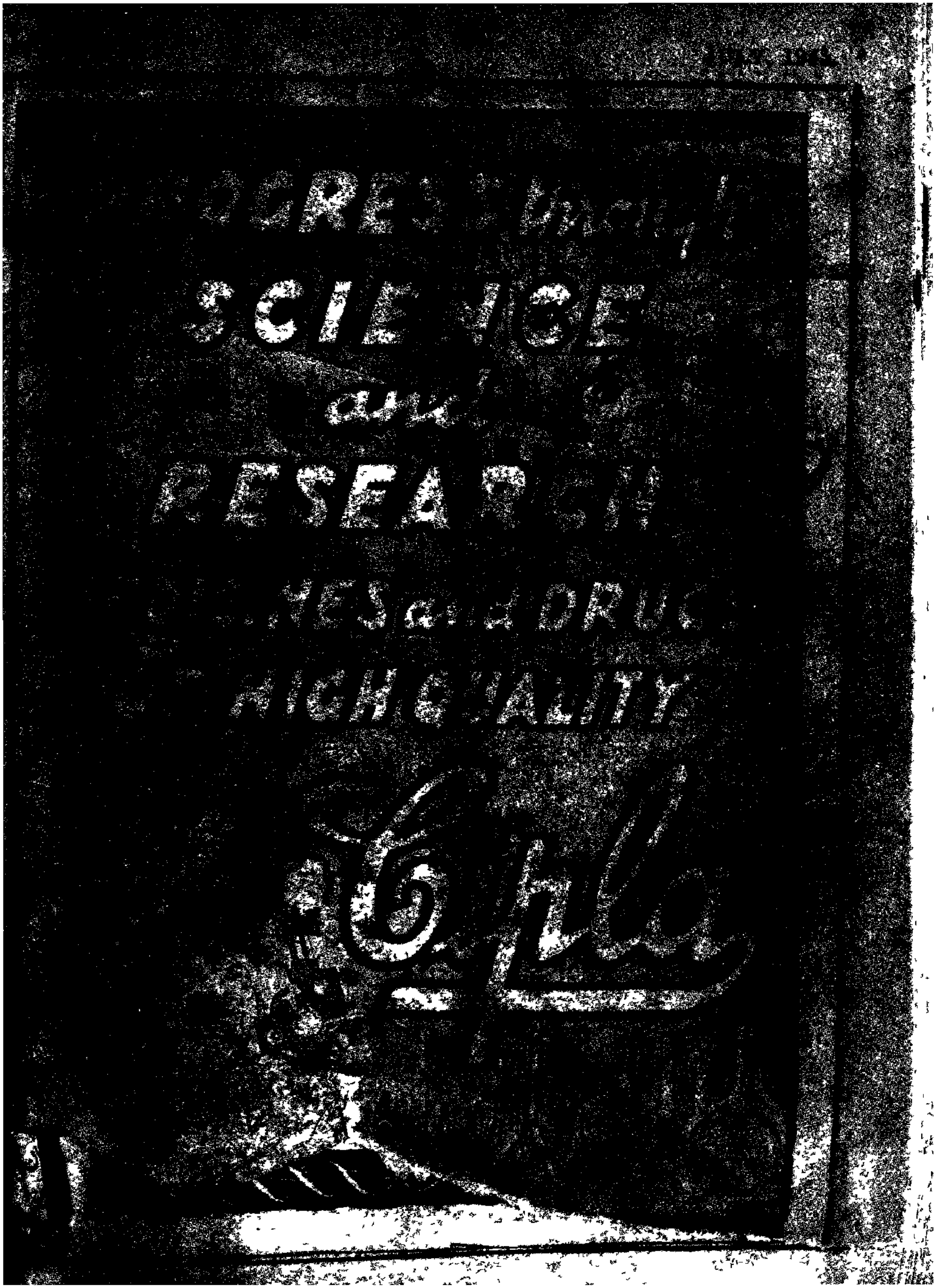
کیا آپ بھی سودا خریدتے وقت اپنے آپ سے یہی سوال کرتے ہیں، شاید آپ کو احساس نہ ہو، مگر واقعہ یہی ہے کہ آجکل آپ جب کبھی کوئی چیز خریدیں تو گویا نیلام ہی کے چکر میں پھنستے ہیں۔ یہ ایک [illegible]

سے ایک بڑھ کر خواہاں ہے۔ بیچنے والے اِس کو خوب سمجھتے ہیں اور نیلامی کی طرح اِس کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ چڑھے ہوئے داموں پر سودا نہ خریدیئے۔ دانشمندی سے کام لے کر اپنی خریداریاں جنگ کے بعد تک ملتوی کر دیجئے اور اب روپیہ بچائیے۔

کل کا فکر آج کیجئے
جتنا بچا سکیں بچا لیجئے۔

مگر اپنی رقم کسی ایسی مد میں لگایئے، جہاں یہ محفوظ رہے اور وقتِ ضرورت آپ کو مل سکے۔

زمین، عمارات، تمام صنعتی اشیاء اور جواہرات مت خریدیئے۔ اِن کی قیمتیں بہت چڑھی ہوئی ہیں اور امکان یہی ہے کہ جلد کم ہو جائیں گی۔ اِس وقت، روپیہ لگانے کی عمدہ مدیں یہ ہیں۔ بیمہ پالیسی، ڈاکخانہ [illegible] بنک [illegible] [illegible] مستقبل کے لئے بچائیے [illegible]


SCIENCE
and
RESEARCH

NAI ZINDAGI

نئی زندگی

ALLAHABAD

18



آپ نے اپنی آدھی بچت سے ایک عمدہ سی زمین خرید لی اور باقی کپڑے، جواہرات اور دوسری متفرق چیزوں پر صرف کی . . . جی ہاں قیمتیں اس وقت چڑھ رہی تھیں اور آپ نے سمجھا تھا کہ آپ انہیں زیادہ قیمتوں پر بیچ کر بڑی آسانی سے نفع کما سکیں گے۔ مگر ہوا یہ کہ قیمتیں اور کم ہو گئیں اور آپ کی بہت سی رقم ڈوب گئی۔ میں نے اُسی وقت آپ کو خبردار کر دیا تھا"

بینک کے منیجر نے سنجیدہ کاروباری آدمی کی حیثیت سے یہی صلاح دی تھی کہ غیر محفوظ سودوں اور سٹہ بازی میں روپیہ نہ لگائیں، کیونکہ قیمتیں چڑھی ہوئی تھیں اور آئندہ گھٹنے والی تھیں۔ ... کی صلاح اِس وقت بھی یہی ہوگی۔ آپ اپنے بینک منیجر سے مشورہ کر کے دیکھیں۔

اِس وقت روپیہ لگانے کی سب سے محفوظ اور بہترین مدیں یہ ہیں۔

- نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹس
- بینک کا بچت کھاتہ
- سرکاری قرضے
- بیمہ پالیسی
- انجمن امدادِ باہمی
- ڈاک خانے کا سیونگز بینک کھاتہ

اپنی رقم زمین، عمارات، خام یا صنعتی اشیا یا جواہرات میں نہ لگائیے۔ مستقبل کے لئے بچائیے اور احتیاط سے لگائیے۔

کل کا فکر آج کیجئے
جتنا بچا سکیں بچا لیجئے

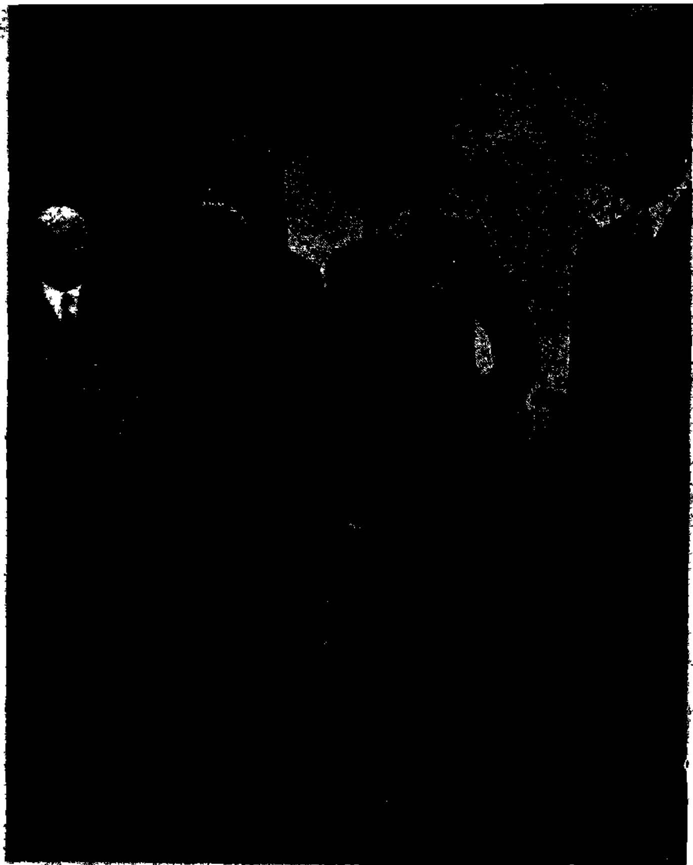
AAA181



شملہ کانفرنس میں
مولانا ابوالکلام آزاد لارڈ ویول
وائسرائے ھند سے مصافحہ کررہے
ھیں -



پنڈت جواھر لال نہرو اور مولانا آزاد گفتگو
فرما رہے ھیں



لارڈ ویول اور مسٹر محمد علي جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ کي ملاقات



مسٹر جناح شملہ کانفرنس میں تشریف لیجارہے ہیں

اُردو زبان کا واحد مکمل سیاسی مجلہ

نئی زندگی الٰہ آباد

بانی:۔ ڈاکٹر سید محمود
سرپرست:۔ ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید

ایڈیٹر:۔ سید انیس الرحمن
جوائنٹ ایڈیٹر:۔ طفیل احمد خاں ایم۔ اے

جلد ۵ | ماہ ستمبر ۱۹۴۵ء | نمبر ۶

فہرست مضامین

۱	فکر و نظر	ایڈیٹر	۲
۲	رفتارِ عالم	طفیل احمد خاں ایم۔ اے	۵
۳	دنیا ۱۹۱۹ء کے بعد سے	شیو سنگھ	۹
۴	مجوزہ نظام عالم	آپا دورائے	۱۹
۵	روداد شملہ کانفرنس		
	وائسرائے کا اعلان	(ادارہ)	۲۵
	مسٹر ایمری سابق وزیر ہند کی تقریر	(ادارہ)	۲۸
	کانفرنس کی ناکامی پر وائسرائے کا بیان	(ادارہ)	۳۱
	" " پر صدر کانگریس مولانا آزاد کا بیان	(ادارہ)	۳۳
	" " پر مسٹر محمد علی جناح کا بیان	(ادارہ)	۳۶
۶	مسلم لیگ کی واحد نمایندگی پر قوم پرست مسلمانوں کے بیان	(ادارہ)	۳۷
۷	شملہ کانفرنس کی ناکامی پر مختلف لیڈروں کا اظہار خیال	(ادارہ)	۳۹
۸	اخبارات کی رائیں	(ادارہ)	۴۲
۹	تبصرہ	ط۔ ا۔ خ	۴۳

سالانہ چندہ: پانچ روپے ششماہی: تین روپے فی پرچہ: آٹھ آنے

سید انیس الرحمن ایڈیٹر و پرنٹر و پبلشر نے اسرار کریمی پریس ... الٰہ آباد میں چھپوا کر دفتر رسالہ نئی زندگی الٰہ آباد سے شائع کیا

فکر و نظر

(اداریہ)

ہندستان اور برطانیہ کا اتحاد ناگزیر ہے

گذشتہ چھ ماہ کے اندر بین الاقوامی سیاسیات نے جو پلٹا کھایا ہے اس کے پیش نظر ہر صحیح الفکر انسان یہ محسوس کرے گا کہ موجودہ صورت حال میں ہندستان کی آزادی اور ہندستان اور برطانیہ کا اتحاد و اشتراک عمل ان دونوں ملکوں کی حیات و بقا کیلئے ازبس ضروری بلکہ ناگزیر ہے

موجودہ جنگ کے خاتمے کے نتیجے کے طور پر بساط عالم پر تین عناصر بڑی شدومد سے ابھر رہے ہیں اور وہ یہ ہیں:-

(۱) امریکہ کا سب سے بڑی طاقت بن جانا۔

(۲) روس کا یورپ اور ایشیا پر چھا جانا۔

(۳) امریکہ اور برطانیہ کی دوستی اور اشتراک عمل۔

اب ہم ان تینوں عناصر کی اہمیت پر سلسلے سے غور کریں گے دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن گیا اس وقت امریکہ سارے کرۂ مشرق کا مالک ہے، اور کنیڈا بھی اس کے اثر سے باہر نہیں امریکہ بحر و پیسفک کا مختار کل ہے اور جاپان کے خاتمہ کے بعد مشرق [illegible] کے اثرات مسلم ہو گئے ہیں، آسٹریلیا بھی امریکہ سے بہت قریب آ [illegible] بھی اس کے اثر سے باہر نہیں اس وقت امریکہ کے پاس بحری [illegible] بحری طاقت موجود ہے۔ اور اب سمندر کی ملکہ برطانیہ نہیں بلکہ امریکہ ہے، امریکہ کی اتھاہ دولت اور اقتصادی قوت ساری دنیا سے زیادہ ہے۔ دنیا کے ۱۱۲ ممالک میں امریکنوں کے صنعتی کارخانے اور کانیں ہیں جن کے مجموعی سرمایہ کا اندازہ ۲۳ کھرب ڈالر (ڈالر تقریباً تین روپے کے برابر) لگایا گیا ہے۔ علاوہ اس کے امریکہ کے پاس اس وقت سب سے بڑی ایئر فورس ہے جس نے اسے ہوا کا بھی بادشاہ بنا دیا ہے۔ برطانیہ کا حاجت مند امریکہ ہی ہے اور برطانیہ تعمیر بعد از جنگ کے لئے سو فیصدی امریکہ کی امداد و اعانت کا محتاج ہے۔

چین پر امریکہ کے اثرات تو مسلم ہی ہیں لیکن اس نے حال میں مشرق قریب اور ہندستان کے دلوں کو بھی مسخر کر لیا ہے۔

ایک اور اہم چیز جس نے امریکہ کو اقوام عالم کا لیڈر بنا دیا ہے، موجودہ جنگ کے فیصلہ کن حربے، امریکہ کے ہوائی قلعے اور ایٹم بم ہی ہیں اور اس فتح کا سہرا بڑی حد تک امریکہ ہی کے سر ہے۔ امریکہ کی ٹیکنیکل قابلیتیں اس وقت ساری دنیا میں ضرب المثل ہیں۔

الغرض امریکہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت تسلیم کیا جاتا ہے دوسرا عنصر روس کا یورپ اور ایشیا کی سب سے بڑی قوت بن جانا ہے، روس کے تحت میں اس وقت سارا یورپ ہے فن لینڈ سے یوگوسلاویہ تک اس کی کٹ پتلی حکومتیں ہیں۔ جرمنی کا تین چوتھائی حصہ براہ راست روس کے قبضہ میں ہے۔ اور جرمنی کے اندر برطانیہ اور امریکہ کا وجود محض روس کی مہربانی اور عنایت پر منحصر ہے۔

عنقریب روس کے لئے بحیرۂ روم کا دروازہ بھی کھل جائے گا (خواہ وہ کسی طرح بھی کھلے) اور سوئز کے معاملات میں بھی روس کا دخل ہونا لازمی ہے شمالی ایران پر روس کا قبضہ ہے اور روسی فوجیں یہاں سے اب تک نہیں ہٹائی گئیں۔

مشرق بعید میں منچوریا سارے کا سارا روس کے قبضے میں آ چکا ہے، اور عنقریب کوریا بھی اسی صف میں شامل ہونے والا ہے۔ چیانگ کائی شیک کی حکومت امریکن طاقت کے بل پر کھڑی ہے اور چیانگ کائی شک

اور چینی کیمونسٹوں کی لڑائی جنگ ہے وہ در اصل روس اور امریکہ کی کشمکش ہے۔
اس طرح روس اس وقت یورپ اور ایشیا دونوں بڑ اعظموں کا واحد سرپرست بن رہا ہے۔ اور اٹلانٹک کے کنارے سے لیکر پیسفک کے کنارے تک روس ہی کا ڈنکا بج رہا ہے۔

تیسرا عنصر، جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے، امریکہ اور برطانیہ کا اتحاد ہے جنگ کے بعد جو دنیا بن رہی ہے، اس میں برطانیہ کو تیسری طاقت کا ہی درجہ دیا جا سکتا ہے۔ برطانیہ بری طرح قرض میں مبتلا ہے۔ بہتیرے مقامات پر جو برطانوی اثر میں تھے، آج یا تو روس کا تغلب ہے یا امریکہ کا، برطانی تجارت برباد ہو گئی ہے۔ اور آئندہ اسے دنیا کے ہر بازار میں امریکہ کا مقابلہ کرنا پڑیگا لیکن یورپ میں امریکہ اور برطانیہ کے مفاد مشترک ہیں اور ان دونوں کی خواہش یہی ہے کہ اپنی تجارت کو فروغ دینے کیلئے بحری راستوں کو اغیار سے پاک رکھا جائے اور ایک طرف کینیڈا اور دوسری طرف آسٹریلیا میں دونوں کے مشترک مفاد اس امر کے متقاضی ہیں کہ یہ دونوں متحد رہیں۔ ان امور کے علاوہ امریکہ اور برطانیہ کا نسلی اتحاد ان کے مشترک جمہوریت پسند نظریے اور سب سے بڑھ کر ان دونوں قوموں کو ملانے والی انگریزی زبان انہیں ایک عرصے تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہونے دیگی۔ جنگ کی بعد کی دنیا میں امریکہ اور برطانیہ کی دوستی اور اتحاد ایک اہم عنصر ہوگا اور کچھ عرصے کے لئے ان کا اتحاد سب سے بڑی بین الاقوامی طاقت ہوگی۔

لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ برطانیہ امریکہ کے ساتھ چھوٹے شریک ہی کی حیثیت سے رہے گا۔

بہر حال ان تینوں طاقتوں کی موجودہ پوزیشن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آئندہ کئی سال تک ان کا میدان عمل ایشیا ہی رہے گا اور اب ان تینوں پہلوانوں کے دنگل ایشیا ہی کے اکھاڑے میں ہوا کریں گے۔
فی الحال ایشیا کی صورت حال یہ ہے:-
(۱) امریکہ مشرق بعید پر اپنا تسلط جمانے کی کوشش کر رہا ہے۔
(۲) برطانیہ، مشرق قریب، ہندستان، برما، ملایا، انڈوچائنا وغیرہ علاقات پر یا تو قابض ہے یا اپنا اثر قائم کرنے کے لئے کوشاں ہے،
(۳) روس ایشیا میں اپنی طاقت بڑھانے میں سرگرم ہے۔
غرضیکہ مستقبل میں ان تینوں طاقتوں کی حکمت عملی انہیں ہی باہم الجھائے رہیگی۔

گرچہ متحدہ اقوام کے اتحاد و یکجہتی کے دعوے سنتے سنتے کان بہرے ہو گئے ہیں، لیکن یہ حقیقت ہم پر اچھی طرح آشکار ہے کہ روس کے بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر امریکہ اور برطانیہ عمل کے گھونٹ پی رہے ہیں ترکی، یونان اور بحیرہ روم سے متعلق روس کی پالیسی امریکہ اور برطانیہ کے مفاد کی سراسر ضد ہے۔

بہر حال امریکہ اور برطانیہ کے سامنے اس وقت سب سے اہم اور واحد پروگرام یہ ہے کہ وہ ایشیا میں اپنے اثرات اس طرح منظم کریں کہ روس کے سارے منصوبے خاک میں مل جائیں اور اس کی واحد صورت یہ ہے کہ ترکی، مشرق قریب، ایران، ہندستان اور چین کو اس طرح منظم اور مضبوط کریں اور انہیں بین الاقوامی طاقت بنا دیں کہ وہ کسی طرح روس کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ ان ممالک کے عوام کی پوری طرح تشفی کی جائے اور انہیں ہر طرح مطمئن کر کے اپنے حلقۂ اثر کا ممبر بنا لیا جائے۔

ایشیائی ممالک میں ہندستان کی پوزیشن سب سے اہم ہے۔ اس خطۂ ارض میں دنیا کی ½ آبادی بستی ہے۔ جغرافیائی حیثیت سے بھی ہندستان کی بری اور بحری پوزیشن مرکزی مسلم ہے۔ گذشتہ جنگ میں ہندستان نہ صرف ہر قسم کا اتنا سامان فراہم کرتا رہا بلکہ اس نے دنیا پر اپنی فوجی صلاحیتوں کا بھی سکہ بٹھا دیا۔ برطانیہ اس وقت ہندستان کا قرض دار ہے۔ ہندستان جنگ کی بربادیوں سے کورا بچ گیا اور ہندستان کے مقابلے میں چین، غیر منظم، کنگال اور جنگ سے چور چور نظر آتا ہے۔

غرضیکہ ایشیائی سیاسیات میں ہندستان اس وقت سب سے بڑی پوزیشن کا مالک ہے۔

لیکن ہندوستان کی دوستی اور اشتراک عمل برطانیہ امریکہ کو اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب ہندستان مطمئن ہو، اس کے عوام کی تشفی کر دی جائے۔ اس کی ضرورتیں پوری کر دی جائیں اور پھر وہ اپنی مرضی سے برطانی اور امریکن گروپ میں رہنا پسند کرے۔

غرضکہ ہمارا اپنا خیال ہے ہندستان کی آزادی اب بالکل ناگزیر ہے، نہ صرف اس لئے کہ ہندستان کو اس کی ضرورت ہے بلکہ اس لئے کہ ہندستان کے حاکموں کو بھی اس کی حاجت ہے برطانیہ کے

ساتھ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے کہ یا تو وہ موجودہ پالیسی پر عمل کر کے ہندستان کو ہر طرح دبا کر، اس کے عوام کو کچل کر، اس سے پورا فائدہ اٹھاتا رہے اور روس کے لئے راستہ صاف کر دے یا پھر ہندستان کو آزاد اور مطمئن کر کے اپنے ساتھ لے لے۔

شاید ہمارے بھائی پاکستان کے حامیوں کو یہ معلوم نہیں کہ اس وقت برطانیہ ایک مضبوط اور متحدہ ہندستان کی امداد کا بے حد محتاج ہے۔ اس سے مطالبہ پاکستان کے منوانے کا سب سے برا اور بے محل موقع ہے۔ اس وقت اگر کانگریس اور مسلم لیگ دونوں مل کر بھی ملک کی تقسیم کا مطالبہ کریں تو بھی شاید برطانیہ اسے ماننے کیلئے تیار نہ ہو لہٰذا ہمارے بھائیوں کو اب کانگریس سے نہیں بلکہ حکومت برطانیہ سے پاکستان کیلئے جنگ کرنا چاہئے۔

رفتار عالم

از ——— طفیل احمد خاں ایم اے

اسپین جرمنی اور جاپان کی شکست کے بعد اسپین ہی دنیا کا واحد ملک رہ گیا جہاں فاشسٹ طرز کی حکومت اور آمریت اب تک قائم ہے۔ یورپ میں جمہوریت اور انقلاب کے تند و تیز طوفان کے خلاف اور دنیا بھر کی رائے عامہ کے سامنے جنرل فرانکو اور ان کے ساتھیوں کا بید کی طرح کانپنا اور لرزنا ایک فطری امر ہے۔ چنانچہ گذشتہ جولائی میں جنرل فرانکو نے تنکے کا سہارا لینے کے لئے یہ اعلان کیا کہ اسپین میں پھر شاہی حکومت کا دوبارہ قیام عمل میں آئے گا۔ جو موجودہ طرز حکومت کی بنیادوں کا تحفظ کرے گی۔ فرانکو کے بعد یہ شاہی حکومت موجودہ حکومت کی جانشین ہوگی۔ اور شاہی حکومت کے قیام کے ضمن میں جلد ایک قانون پاس کیا جائے گا۔ یہ ظاہر ہے کہ جنرل فرانکو نے اپنی پیچھے غیر مقبول حکومت کے لئے حمایت اور ہمدردی حاصل کرنے کے لئے یہ چال چلی تھی اور گویا کہ [illegible] کوئی حیلہ ڈھونڈ کر تھامنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا تھا مگر واقعات نے اس بدقسمتی کو [illegible] اسپین کے تخت کا ایک ہی دعویدار [illegible] ڈون جوان نے بھی فرانکو کے اعلان کے طرف [illegible] لوزان کے مقام پر بیان دیتے ہوئے شاہی تخت پر بیٹھنے سے انکار کر دیا اور [illegible] فرانکو محض اپنی پوزیشن بچانے کے لئے یہ کر رہا ہے۔

اسی دوران میں پوٹسڈم کانفرنس ختم ہوئی اور اس کے فیصلوں کا اعلان ہوا [illegible] ان میں ایک یہ بھی تھا کہ اسپین کو مجلس اقوام متحدہ کا رکن نہ بنایا جائے تاوقتیکہ [illegible] اور اس نے اگست کے پہلے ہفتہ میں [illegible] یہ اعلان کیا کہ ہم نے مجلس اقوام متحدہ میں شامل ہونے کی خواہش کا اظہار [illegible] اور [illegible] مجلس اقوام متحدہ میں کوئی [illegible] حیثیت قبول نہیں کریں گے۔ اس [illegible] جب [illegible] اگست کی رات کو [illegible] حکومت کے خلاف [illegible] ایک تو انگلستان [illegible] برطانیہ، فرانس، امریکہ اور روس کی کانفرنس سے

تنجیر کا علاقہ جو [illegible] میں فرانس کی شکست سے فائدہ اٹھا کر جنرل فرانکو نے ہتھیا کر مراکش کے اسپینی علاقہ میں شامل کر لیا تھا۔ اس کانفرنس میں روس نے بھی شرکت کا خیال ظاہر کیا۔ اس کی اس خواہش کو دوسری طاقتوں نے قبول کر لیا جس کا رد عمل یہ ہوا کہ اسپین نے یہ احتجاج کیا کہ ایک ایسی طاقت کی شرکت اس کانفرنس میں غیر ضروری ہے جس کا اس علاقے سے کوئی تعلق نہیں لیکن دراصل جن بنیادی دشمنی کے سبب یہ احتجاج کیا گیا تھا وہ تو فرانکو کی [illegible] پوشیدہ ہے اور نہ [illegible] اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ تانجیر کے علاقے کو متحدہ بین الاقوامی کنٹرول میں رکھا جائے اور اس کے لئے باقاعدہ پلان تیار کیا جائے۔

برطانوی انتخابات کے بعد پروفیسر لاسکی صدر مجلس عاملہ لیبر پارٹی کا یہ اعلان فرانکو کے لئے سخت پریشانی کا [illegible] اسپین کو فرانکو کی آمریت سے نجات دلانا [illegible] ساتھ ہی پروفیسر لاسکی نے حکومت فرانس کو [illegible] کہ فرانس فرانکو کی حکومت سے تجارتی اور سیاسی تعلقات منقطع کر لے جس سے فرانکو کی حکومت کو تقویت پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اتنے میں میکسیکو سے ایک عارضی اسپینی جمہوری حکومت کے قیام کی خبر آئی جو سابق جمہوری اسپین کے [illegible] کی کوششوں سے وجود میں آئی۔ اس حکومت میں اسپین کی تمام جمہوری جماعتوں اور تجارتی مجلسوں کے ممبر شامل ہیں۔ اس حکومت کا دستور اسپین کی سابق جمہوری حکومت کا دستور ہے اور اس کے پیش نظر فرانکو کی آمرانہ حکومت کو جلد از جلد ختم کرنے کا مقصد ہے۔

یہ تو فرانکو کی حکومت کے سامنے بین الاقوامی خطرات ہیں [illegible] خود اسپین کے اندر جو سیاسی صورت حال ہے [illegible] صورت یہ ہے کہ فرانکو کی اصل طاقت اور [illegible] فوجی لیڈروں اور اسپین کی فاشسٹ جماعت [illegible] کے ہاتھ میں [illegible] ہی تھا اور اشتراک عمل [illegible] لیڈروں کا فرانکو کے لئے کوئی [illegible] نہیں ہے [illegible] عناصر کے علاوہ اسپین کی سیاست میں ایک تیسرا عنصر

بھی ہے جو کنزرویٹو جماعت کے رکنوں پر مشتمل ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ موخر الذکر اور فاشسٹ جماعت میں اختلافات کی خلیج حائل ہے۔ چنانچہ حال ہی میں فرانکو نے سینیٹر آرتاجو کو اس لئے وزیر خارجہ مقرر کیا تھا تاکہ کنزرویٹو جماعت موجودہ حکومت کے قریب آجائے اور فاشسٹ جماعت سے اس کے اختلافات دور ہوں۔ لیکن اب کنزرویٹو جماعت اور فوجی لیڈروں میں فاشسٹ جماعت کے خلاف اشتراک عمل کے پیدا ہونے کی امید ہے۔ جس روز یہ ہوا اسی روز فرانکو اور اس کے ساتھیوں کا خاتمہ ہے۔ لیکن فوجی لیڈران اس خوف سے فیصلہ کن اور کھلم کھلا کنزرویٹو جماعت کا ساتھ دینے سے ہچکچا رہے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ فرانکو کے زوال کا منطقی نتیجہ موجودہ حکومت کا مکمل زوال اور سابق طرز کی جمہوریت کا قیام ثابت ہو۔ اس عالم تذبذب کی وجہ سے ساری دنیا فرانکو کے زوال کی منتظر ہے لیکن فرانکو بدستور اسپین میں ڈٹا ہوا ہے اور اس وقت تک ڈٹا رہے گا جب تک وہ فوجی لیڈروں کی مکمل حمایت اسے حاصل ہے جن کی مدد سے وہ عوامی بغاوت کو کچل سکتا ہے۔

برطانیہ کے وزیر خارجہ ارنسٹ بیون کے اس بیان کا تذکرہ ضروری ہے جس میں بین الاقوامی معاملات پر برطانیہ کے موجودہ اور آئندہ طرز عمل کی تشریح کی گئی ہے۔ بات یہ تھی کہ فرانکو یہ سوچ رہا تھا کہ برطانیہ براہ راست اور عملی طور پر اسپین کے معاملات میں دخل دے گی لیکن ارنسٹ بیون نے یہ اعلان کیا کہ جہاں تک اسپین کے طرز حکومت کا سوال ہے یہ اسپین کے عوام کا اپنا نجی معاملہ ہے وہ جس طرح چاہیں طے کریں۔ اگر اسپین کے عوام موجودہ حکومت کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے تو حکومت برطانیہ کی حمایت اور ہمدردی ان کے ساتھ ہوگی لیکن حکومت برطانیہ کوئی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتی جس سے اسپین میں خانہ جنگی پیدا ہو جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اعلان صاف طور پر فرانکو اور اس کی موجودہ آمریت کے خلاف ہے لیکن چونکہ عملی مداخلت سے برطانیہ نے احتراز کا اعلان کیا ہے اس لئے اسپین کے سرکاری حلقوں میں اس بیان کا خیر مقدم کیا گیا اور اس سے دو قسم کا رد عمل پیدا ہوا ہے۔ ایک طرف تو فاشسٹ حلقوں میں یہ خیال ہوا ہے کہ اب بین الاقوامی صورت حال موافق ہے اس لئے کسی قسم کی دستوری تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے اور دوسری طرف کنزرویٹو حلقوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہمیں اسپین کو دنیا کی موجودہ صورت حال کے موافق بنانے کا یہ آخری موقع ہاتھ آیا ہے اسے ہاتھ سے نہ دینا چاہئے۔ اسپین کی داخلی سیاست کے اس پس منظر میں اسپین کے وزیر خارجہ ڈان البرٹو مارٹن ارتاجو، عمر انتالیس سال کا ۲۳ اگست والا اعلان جات اس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ اسپین میں ہوا کس رخ بہہ رہی ہے۔ وزیر خارجہ کا بیان یہ ہے۔

"اسپین کی حکومت زیادہ سے زیادہ سیاسی آزادی اور عوامی نمائندگی کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ ہماری حکومت کا رجحان جمہوری خواہشات کے مطابق ہے۔

ہمیں برطانیہ سے امید ہے کہ وہ اسپین کے اس حق کو تسلیم کرے گا کہ اسپین کو اندرونی خواہشات اور حکومت کے اچانک زوال سے دامن بچاتے ہوئے دستوری لحاظ سے ترقی کرنے اور ارتقائی منازل کو جلد یا بدیر طے کرنے کا اختیار ہے۔" اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ اسپین کی داخلی سیاست کی بساط پر فرانکو اور اس کے انتہا پسند ساتھیوں کو پیچھے ہٹنا پڑ رہا ہے۔

اسپین کے اندر یہ ہو رہا ہے اور اسپین کے باہر جلاوطن جمہوری لیڈروں نے ابھی سے ایک جمہوری حکومت قائم کر لی ہے جس کا سردار چونسٹھ سال کے بڈھے ہیرال کو چنا گیا ہے۔ یہ شخص بائیں بازو کا جمہوریت پسند ہے اور اسپین کی سابق جمہوری حکومت کا رکن رہ چکا ہے۔

لیکن وہ اب تک جمہوریت پسندوں کے باہمی جھگڑوں سے ہمیشہ الگ تھلگ رہا۔

غرض اب فرانکو کی حکومت کے بقیہ روز و شب انگلیوں پر شمار کئے جا سکتے ہیں۔

اٹھاؤ آندھیاں کمزور ہے بنیاد کاشانہ

چین اور روس

ہر شخص جو مشرق بعید کی ... سے روس چین کے تا... مطمئن اور مسرور ہے۔ کچھ ہی دنوں پہلے یہ خبر گرم تھی کہ چین میں خانہ جنگی کا خطرہ ہے اور یہ تشویش اس صورت حال سے پیدا ہوئی تھی کہ چین کے کمیونسٹ سربراہوں میں اشتعال ہو رہا ہے کیونکہ کمانڈر نے فوجوں کو یہ حکم دیا کہ وہ جاپانی فوجوں کے ہتھیار ڈالنے کو تسلیم کریں جاپانی اسلحہ جات پر قبضہ کر لیں۔ اس کے خلاف چیانگ کائی شیک نے کمیونسٹ کمانڈر کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنی فوجوں کو موجودہ پوزیشن اور مقام سے نہ ہٹائے۔ کمیونسٹ کمانڈر جنرل چو تہ نے اپنے جواب میں یہ بتایا کہ کبھی تو آپ بڑھنے کا حکم دیتے ہیں اور کبھی پیچھے رہنے کا آپ کے احکام میں یہ تضاد کیوں ہے؟ اسی بنا پر جنرل چو تہ نے چیانگ کا حکم تسلیم کرنے

...نکار کر دیا۔ چیانگ نے فوراً جنرل ہوتے کے نام مذمت شائع کی۔ حالات نے نازک شکل اختیار کر لی۔ اس کے بعد چینی کمیونسٹ رہنما ماؤ سی تنگ کو جنرل چیانگ نے صورت حال پر غور و خوض کرنے کے لیے چنگ کنگ بلایا۔

۱۰ اگست کو ماسکو ریڈیو سے یہ خبر آئی کہ چیانگ اور اسٹالن کے درمیان پیغامات کا تبادلہ ہوا ہے۔ دونوں نے اپنے پیغام میں اس بات پر زور دیا کہ زمانۂ جنگ کی طرح زمانۂ امن میں بھی روس اور چین کے درمیان اشتراک اور تعاون کا رہنا بیحد ضروری ہے۔ اس خبر سے کچھ امید پیدا ہوئی۔ ایک طرف تو یہ خبر آئی اور دوسری طرف یہ خبر گرم تھی کہ مشرق بعید میں صورت حال خطرات سے خالی نہیں ہے اور خانہ جنگی ہو کر رہے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ خانہ جنگی بین الاقوامی جنگ کی صورت اختیار کر لے۔

جمعہ ۲۴ اگست کو ٹی وی سونگ وزیر اعظم چین اور اسٹالن کے درمیان جو پچھلے چند دنوں سے گفت و شنید ہو رہی تھی وہ بار آور ثابت ہوئی اور ایک تیس سالہ چینی و روسی معاہدہ چین اور روس کے درمیان عالم وجود میں آیا۔

اس معاہدہ کی رو سے روس نے یہ اقرار کیا کہ اب روس صرف ...ک کی حکومت کو تمام فوجی یا غیر فوجی امداد دے گا جو چین کے اندر کسی ...حکومت کر۔

اس معاہدہ کے خاص خاص نکات مندرجۂ ذیل ہیں:۔

...مستقبل میں جاپان کی جارحانہ کارروائی کو روکنے کے لئے چین اور ...پورے پورے طور پر ایک دوسرے کی مدد کریں گے (۲) سویت ...صرف چین کی مرکزی حکومت کو امداد مہیا کرے گا (۳) چینی مشرقی ...ریلوے لائنوں کو ملا کر ایک ریلوے لائن بنا دیا جائے گا جو تیس ...چین اور روس کی مخلوط ملکیت میں رہے گی اور تیس سال کے بعد پھر چین کی ملکیت ہو جائے گی (۴) ڈیرن کا بندرگاہ ایک آزاد اور ...بندرگاہ رہے گا (۵) پورٹ آرتھر تیس سال تک متحدہ طور پر ...روس کی بحری فوج کا مرکز رہے گا۔ اس بندرگاہ کے تحفظ کے ...ات سویت روس کے ہاتھوں میں رہیں گے (۶) جاپانیوں کے ہتھیار ...لینے کے بعد تین ماہ بعد روس پورا منچوریا چین کے حوالے کر دے گا۔ ...ان تک سنکیانگ کے علاقہ کا تعلق ہے سویت یونین اس بات کا ...علان کرتا ہے کہ وہ چین کے خانہ جنگی معاملات میں قطعی کوئی دخل نہ دے گا

(۷) خارجی منگولیا میں چین سے علیحدگی برقرار رکھنے کے مسئلے پر عام ووٹ لینے کے بعد اگر فیصلہ علیحدگی کے حق میں ہوا تو چین خارجی منگولیا کی خود مختاری کو تسلیم کرے گا۔

معاہدہ کے متعلق ڈاکٹر سونگ وزیر اعظم چین نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ معاہدہ اس بات کی ضمانت ہے کہ مشرق بعید میں مدت مدید تک امن و امان قائم رہے گا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس معاہدے سے چین کا خانگی اتحاد مضبوط ترین بنیادوں پر قائم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد وزیر اعظم سویت یونین مولوٹوف نے اپنی تقریر میں وعدہ کیا کہ ہم چین کی مرکزی حکومت کو پوری پوری اخلاقی اور مادی امداد فراہم کریں گے۔

روس میں اس معاہدے پر زبردست جوش و خروش اور مسرت کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اور یہ خیال کیا جا رہا ہے کہ اس سے پہلے براعظم ایشیا میں باہمی خلوص کے ترقی کرنے کی امید ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس معاہدے سے ممالک مشرق بعید کے واقعات و حالات متاثر ہوتے رہیں گے۔ مشرقی ایشیا کے آئندہ نقشے کی شکل و صورت متعین کرنے کے کام میں اب سویت روس اور چین کا گویا مساوی حصہ اور اہمیت ہو گئی۔ اس معاہدہ سے روس کی پوزیشن میں بھی کوئی کمی نہیں واقع ہوتی بلکہ اس کی اہمیت اور طاقت کے لحاظ سے مشرق بعید میں اس کی جو حیثیت ہونی چاہئے وہ برقرار رہتی ہے۔ پورٹ آرتھر اور خارجی منگولیا سے متعلق جو نکات ہیں ان سے مشرق بعید میں سویت روس کے جائز حقوق کا پورا پورا تحفظ ہوتا ہے۔

امریکہ میں اس معاہدہ کا ردعمل کچھ متضاد سا ہے۔ ناظر امور خارجہ برنس نے اپنے بیان میں کہا کہ یہ امداد باہمی کی ایک ایسی عملی مثال ہے جو اقوام متحدہ ... سال قوموں کے لئے امن و جنگ دونوں زمانوں میں شمع راہ کا کام ... سکتی ہے لیکن امریکہ کے ان لوگوں کو اس روسی چینی معاہدہ نے بڑی ... چونکا دیا ہے۔ امریکہ کو چین کا سرپرست سمجھتے تھے اور چین کے ہر ... سوراج امریکہ ہی کو قرار دیتے تھے۔

لیکن یہ بالکل ظاہر ہے کہ اس روسی چینی معاہدہ کا سب سے زیادہ تعلق ہم ایشیائی باشندوں سے ہے۔ اس معاہدہ کو بلاشبہ ایشیا کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت کی تشریح کے لئے اس معاہدے کے کچھ اہم نکات کے مضمرات کا سمجھنا ضروری ہے۔

معاہدے کے آرٹیکل ۲ کی رو سے جنگ کے بعد چین اور روس ایک دوسرے کی معاشی امداد کریں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس سے روس کی بہ نسبت چین کو زیادہ فائدہ ہوگا، اس لئے کہ روس چین کی بہ نسبت بہر لحاظ سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے لیکن سب سے اہم بات یہ ہوگی کہ اس طرح چین کو امریکہ کی امداد کی ضرورت نہ رہے گی۔ چین کو مدتوں سے اس بات کا تلخ تجربہ ہے کہ سامراجی ملکوں کی معاشی مدد در اصل مدد نہیں ہوتی۔ بلکہ استحصال ہوتا ہے۔

سوویت یونین نے چین کے ساتھ اس معاہدہ کو ایسا رویہ اختیار کیا ہے کہ چین اپنی آئندہ معاشی ترقی حاصل کرنے کے لئے اب جاپان، برطانیہ، امریکہ اور دوسری سامراجی طاقتوں کا دست نگر ہونے کی بجائے روس سے مدد حاصل کر سکے گا۔ اس طرح اب اس اتحاد شرق کا حصول ممکن ہے جس کا مدتوں سے انتظار تھا اور جس کے بغیر کمزور اور بے یار و مددگار مشرق مغرب کی سامری طاقتوں کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھا۔

پھر اب روس چونکہ ساری امداد چین کی مرکزی طاقت کو دیا کریگا اس لئے اب چین میں خانہ جنگی کا خطرہ بھی نہیں باقی رہا۔ اس سے چین کے خانگی اتحاد کی بنیادیں اور بھی مضبوط ہو گئی ہیں۔ یہ اتحاد چین کے تمام بڑے بڑے سپوتوں اور بہی خواہوں کا خواب رہ چکا ہے مثلاً " سن یات سین، چیانگ کائی شک اور چین کے کمیونسٹ لیڈر جنرل چو تے اور ماؤ تسی تنگ

مگر یہ اتحاد ۱۹۴۱ء سے پہلے قائم ہو گیا ہوتا تو جاپان چین کو اس قدر پریشان نہ کر سکتا تھا۔ اس قسم کا اندرونی اتحاد فرانسیسی، بیرمن، برطانوی اور زار کے عہد کے روسی مظالم اور استحصال کا خاتمہ کر سکتا تھا اور ساتھ ہی ان مراعات اور بیرونِ ملکی حقوق کو بھی ختم کر سکتا تھا جو چین میں سامراجی ممالک کے باشندوں کو قانوناً حاصل تھے۔ اب جبکہ چین متحد ہو گیا ہے یہ مظالم اس پر دہرائے نہیں جا سکتے۔ چین میں اتحاد قائم ہو جانے کے بعد اب برطانیہ بھی ہانگ کانگ کے معاملہ میں زیادہ صحیح رویہ اختیار کرے گی۔ بحر الکاہل اب مکمل طور پر امریکہ کے قبضہ و قدرت میں نہیں رہے گا۔ پھر اس اتحاد سے سیام، برما، انام، انڈونیشیا اور جزائر شرق کی سیاست پر بھی خوشگوار اثر پڑے گا۔

پالوڈشا ۔۔۔ ڈیرین اور ۔۔۔ معاہدات ہیں ان برطانیہ اور امریکہ کا یہ پروپیگنڈا پاش پاش ہو گیا ۔۔۔ روس سامراجی

یہ جل رہا ہے، ساتھ ہی اس کے دشمنوں کا خواب ۔۔۔ اس بات کی ۔۔۔ امریکہ کے منافع

دنیا ۱۹۱۹ء کے بعد سے

از :- شیو سنگھ

۱۹۱۸ء کے نومبر میں جرمنی کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد فاتحین نے دنیا کو معاہدۂ ورسائی کے ذریعہ آپس میں تقسیم کر لیا۔ فرانس کو الیسس لورین کا علاقہ اور شام کا انتداب ملا۔ برطانیہ نے جرمنی کی افریقی نوآبادیات عراق اور فلسطین کا انتداب اور عرب کے خاص خاص علاقے ہتھیا لئے۔ جرمنی سے نوآبادیات، لوہا اور کوئلہ، جنگی بیڑہ اور تجارتی جہاز چھین لئے گئے اور اس پر ناقابل ادا ہرجانہ اور مزید معاشی اور فوجی پابندیاں عائد کی گئیں۔ ہرجانہ کی ناقابل ادائیگی کو اتحادیوں نے جرمنی پر کنٹرول قائم رکھنے کا اچھا خاصا بہانہ بنا لیا۔ یورپ کی سرحدوں کی از سر نو تقسیم کی گئی۔ جس اصول پر یہ تقسیم عمل میں لائی گئی، اس کے پیش نظر دو مقاصد تھے:-

(۱) جرمنی کی معاشی طاقت کو کچلنا (مثلاً جرمنی اور آسٹریا کے اتحاد کو روکا گیا) (۲) اور اشتراکی روس کے خلاف ایسی ریاستوں کی ایک سلسلہ وار دیوار کھڑی کرنا جو سرمایہ دار اتحادیوں کے قابو میں ہوں، آسٹریا، ہنگری، زیکوسلاوکیہ، یوگوسلاویہ، فن لینڈ، لیٹویا، لتھوانیا، اسٹونیا، پولینڈ۔

آسٹریا کو چھوڑ کر یہ تمام ریاستیں اس میں کوئی شک نہیں کہ غلام قوموں کی آزادی کی جدوجہد سے وجود میں آئی تھیں لیکن ان کی حالت اس قدر پتلی تھی کہ سرمایہ دار طاقتوں کی ملی معاشی اور فوجی امداد اور رحم و کرم کے بغیر ان کا جینا بھی محال تھا۔ پھر چونکہ ان ریاستوں کا معاشی نظام ذاتی ملکیت اور طبقاتی اختلافات پر قائم تھا اس لئے خود ان ریاستوں کے اندر خانہ جنگی اور مظالم کا راج تھا اور ایک طبقہ یا ایک قوم دوسرے طبقہ یا قوم پر ہولناک مظالم ڈھاتی تھی۔ پولینڈ میں خالص پولی قوم دراصل اقلیت میں تھی لیکن یہ قوم پولینڈ کی زبردستی شامل کی ہوئی بائیلو رسی، لتھوانی، یوکرینی اور یہودی قوموں اور فرقوں پر ظلم ڈھاتی تھی۔ یوگوسلاویہ میں کروٹ قوم [illegible] تھی۔ [illegible] سربیا کے باشندے [illegible] فلسطین میں [illegible]

اور عرب دست و گریباں کر دیئے گئے۔ ۱۹۲۱ء میں واشنگٹن کانفرنس کے "معاہدہ" کی رو سے برطانیہ، جاپان اور امریکہ نے آپس میں گویا چین کا معاشی حصہ بخرہ کر لیا۔ اس معاہدہ کے وجود میں آنے سے مشرق بعید میں برطانیہ کے حریف زیادہ طاقتور ہو گئے اور انیسویں صدی سے برطانیہ اور جاپان کی جو خطرناک دوستی قائم تھی اس کی بنیاد متزلزل ہو گئی۔

جمعیۃ الاقوام بلند بانگ دعووں کے ساتھ کمزور قوموں کو ظلم و جور سے بچانے اور تخفیف اسلحہ کو عملی صورت دینے کے لئے وجود میں لائی گئی لیکن دراصل جمعیۃ الاقوام یورپ میں فرانس اور انگلستان کے اقتدار کو قائم رکھنے کا ذریعہ بن گئی اور تمام سعی و کوشش کے باوجود قوموں کے اسلحہ جات میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔

یہ تھا وہ نظام عالم جو ۱۹۱۸ء کے نومبر میں دنیا کی ہولناک سامراجی جنگ کے ختم ہونے کے بعد تعمیر کیا گیا اور جس کی تہ میں دوسری عالمگیر جنگ کے جراثیم کلبلا رہے تھے۔

یہ نظام عالم کیوں بیس سال کے بعد ۱۹۳۹ء میں آخر ٹوٹ کر رہا۔ اس کے اسباب کو ہم دو گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) سرمایہ دارانہ نظام کے داخلی تضاد کا سیاسی اظہار جو طاقتوں کی باہمی رقابت کی صورت میں نمودار ہوا۔

(۲) ۱۹۲۹-۳۲ء کا عالمگیر معاشی بحران۔

(۱) سامراجی مقابلہ بازی اور رقابت:-

فتح کے باوجود ۱۹۱۴-۱۹ء کی عالمگیر سامراجی جنگ کے نتائج برطانیہ کے حق میں دراصل بہت خطرناک ثابت ہوئے۔ امریکہ اور جاپان معاشی، صنعتی اور تجارتی لحاظ سے برطانیہ سے کئی ہاتھ آگے بڑھ گئے اور ان تمام میدانوں میں برطانیہ کو پیچھے ہی ہٹنا پڑا۔ برطانیہ نے یورپ میں روس اور فرانس کے خوف سے جرمنی کو اپنی کھوئی ہوئی طاقت دوبارہ حاصل کرنے میں مدد دی اور امریکہ کے خلاف جاپان کو آگے بڑھایا لیکن آخر

میں وہی جرمنی اور جاپان اس کے سب سے زبردست حریف ثابت ہوئے امریکہ نے برطانیہ کے پاؤں اکھاڑ دیئے اور لندن کے عالمگیر مالیاتی اقتدار کو خاک میں ملا دیا۔ برطانیہ اور اس کے ساتھ تمام اتحادی طاقتیں امریکہ کی قرضدار بن گئیں اس طرح مالیاتی لحاظ سے امریکہ دنیا کی سب سے زبردست طاقت بن گیا۔ برطانیہ سے یورپ کے بازار چھن گئے۔ جاپان اور امریکہ نے مقابلہ بازی کے ذریعہ خود سلطنت برطانیہ اور ایشیا۔ نیز جنوبی امریکہ کے بازاروں سے برطانیہ کو محروم کرنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف خود سلطنت برطانیہ کے حدود کے اندر یہ ہوا کہ نو آبادیات جنگ کی پیدا کردہ صنعتی ترقی کے سبب معاشی اور سیاسی لحاظ سے خود مختار ہوتی چلی گئیں اور ہندوستان میں نوزائیدہ صنعتی ترقی کے خلاف برطانوی سرمایہ داروں کی ریشہ دوانیوں کے ردِ عمل کے طور پر بورژوا قومیت اور آزادی کی تحریک مضبوط ہوتی چلی گئی۔

جرمنی کی بدحالی تیزی سے اشتراکی انقلاب کی تحریک کو فروغ دے رہی تھی۔ جنگی ہرجانہ کا تمام تر بار جرمن مزدوروں کے سر تھا اور وہ عام اقتصادی بحران کے ردِ عمل کے طور پر انقلاب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ بات فرانس انگلستان اور امریکہ کے سرمایہ داروں کے لئے خطرے کا باعث تھی مخصوص طور پر جبکہ اشتراکی روس جرمنی سے اتنا قریب تھا۔ پھر جرمنی کی معاشی بدحالی پورے سرمایہ دارانہ نظام کے لئے نقصان کا باعث تھی۔ جرمنی کو معاشی اعتبار سے آگے بڑھانے میں انگلستان اور امریکہ کے سرمایہ داروں کا فائدہ تھا۔ جرمنی کی کمزوری سے فرانس بے لگام ہو رہا تھا۔ بات یورپ میں برطانیہ کے اقتدار کے لئے نقصان رساں بھی اور اسکی مدت دراز کی توازن کی پالیسی "کے بھی خلاف۔ ان باتوں کے پیش نظر برطانیہ کے سرمایہ دار حکمراں طبقے نے سرعت کے ساتھ جرمنی کی ہر لحاظ سے مدد کرنی شروع کی۔

جرمنی اور جاپان کی حمایت کر کے برطانیہ نے اپنے خلاف دو ایسے زبردست سامراجی حریف پیدا کر لئے جو اپنے نئے سرمایہ دارانہ عروج کے سبب ٹیکنیکل لحاظ سے بھی اس سے آگے بڑھ گئے۔

(۲) ۱۹۲۹-۳۲ء کا معاشی بحران

اس عالمگیر معاشی بحران کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے تو وہ مندرجہ ذیل ثابت ہوں گے۔ صنعتی ملکوں میں مزدوروں کے زیادہ سے زیادہ استحصال کے سبب اور مشین میں ترقی و صنعتی نظام میں روز افزوں مرکزیت کے باعث سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں تیزی کے ساتھ عظیم سرمائے جمع ہونے لگے۔ اس سرمایہ کو لگانے اور مزید منافع اُٹھانے کے لئے مزید بازاروں کی ضرورت تھی لیکن ہر حکومت نے اپنی نو آبادیات کو خود اپنے مال کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ گویا دنیا کے رائج ریاستی نظام نے اُس سرمایہ کے پھیلنے اور مزید منافع اُٹھانے کے راستے مسدود کر دیئے تھے۔ اس طرح گویا معاشی طاقتوں اور دنیا کے رائج ریاستی نظام میں شدید تصادم پیدا ہو رہا تھا۔ آخر میں انھیں معاشی طاقتوں نے رائج ریاستی نظام اور اُس کی محافظ جمعیۃ الاقوام کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ یعنی ۱۹۳۹ء میں عالمگیر سامراجی جنگ چھڑ گئی۔ جرمنی اور اٹلی جب گزشتہ جنگ کے اثرات سے بچ نکلے اور ان ملکوں میں صنعت ترقی کرنے لگی تو سرمایہ دارانہ نظام کے اس داخلی تصادم اور عالمگیر مقابلے بازی میں دو چند اضافہ ہو گیا۔

چنانچہ انسانی تاریخ کا ہولناک ترین معاشی بحران آخر ۱۹۲۹-۳۲ء میں نمودار ہو کر رہا۔ صنعتی پیداوار، تجارت اور بین الاقوامی سکہ کا نظام کھو گیا اور دنیا کے کروڑوں مزدور بیکار ہو گئے۔ برطانیہ میں مزدوروں کے معیار زندگی کو سرمایہ دارانہ حکومت نے اور بھی گھٹا دیا۔ صورت حال کو سنبھالنے کے لئے "قومی حکومت" نام کی ایک مخلوط حکومت وجود میں آئی۔ برطانیہ نے فوری طور پر آزاد بین الاقوامی تجارت کو خیرباد کہہ دیا۔ اور برطانیہ اور دنیا کی ہر صنعتی طاقت نے محصولات کے ذریعہ اپنے حریف سے تجارتی اور معاشی جنگ چھیڑ دی۔ امریکہ کی کوششوں کے باوجود آزاد مقابلہ بازی دنیا بھر میں ختم ہو گئی۔ ساتھ ہی برطانیہ میں سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام پر حکومت کا کنٹرول بڑھتا گیا۔

عالمگیر معاشی بحران نے دنیا کی طاقتوں کے درمیان معاشی اور تجارتی جنگ کو بے حد شدید کر دیا اور اس طرح عالمگیر جنگ کے لئے زمین ہموار ہونے لگی۔ اس لئے کہ اب مقابلہ میں شریک طاقتوں کے سامنے صرف ایک راستہ تھا اور وہ یہ کہ جنگ کے ذریعہ دنیا کے بازاروں کی از سر نو تقسیم کی جائے۔ جاپان ۱۹۳۱ء میں چین پر حملہ کرتا ہے اور جنوری ۱۹۳۳ء میں ہٹلر برسر اقتدار ہوتا ہے

اسی معاشی بحران سے فائدہ اُٹھا کر جاپان نے ۱۹۳۱ء میں منچوریا پر حملہ کر دیا اور منچوریا اور شمالی چین نیز شنگھائی کے کچھ حصّوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس طرح گویا ۱۹۲۲ء کا معاہدہ واشنگٹن بے معنی ہو کر رہ گیا۔ جاپان کا یہ قدم جمعیۃ الاقوام کے خلاف بھی گویا ایک چیلنج تھا۔ امریکہ کی کوششوں کے باوجود برطانیہ کے وزیر خارجہ سر جان سائمن نے جاپان کے خلاف قدم اُٹھانے سے صاف انکار کر دیا۔ برطانیہ نے جاپان کی فتح منچوریا کا خیر مقدم کیا اس لئے کہ وہ امریکہ سے خائف تھا۔ پھر سرمایہ دار جاپان کا چین کے سر پر سوار رہنا جہاں سامراجی معاشی تسلط کے خلاف مزدوروں اور کسانوں کی انقلابی تحریک بہت مضبوط ہو رہی تھی دنیا بھر کی سرمایہ دار طاقتوں کے نکتۂ نظر سے مفید تھا۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ منچوریا پر جاپان کا قبضہ دنیا کی سب سے بڑی مزدوروں کی طاقت یعنی سوویت روس کے خلاف گویا ایک مضبوط دیوار کا کام دے رہا تھا۔ اس طرح جاپان کا چین پر حملہ جو بیک وقت جمعیۃ الاقوام پر بھی ایک ضرب کاری تھا (اس لئے کہ چین اور جاپان دونوں جمعیۃ الاقوام کے ممبر تھے) کامیاب ہوتا ہے اور اس کے خلاف دنیا کی سامراجی طاقتیں کوئی آواز نہیں اُٹھاتیں۔ اسی درمیان میں ہٹلر بھی معاہدۂ ورسائی کے خلاف جرمن عوام کے غم و غصّہ سے فائدہ اُٹھا کر فاشزم کی بنیادیں مضبوط کر رہا تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء میں ۱۹۱۹ء کے قائم کردہ نظام عالم کا کوئی حصّہ اگر بچ رہا تھا تو وہ صرف یورپ کی سرحدیں تھیں اور نو آبادیات اور انتداب کا پرانا نظام۔ جمعیۃ الاقوام ایک سرد اور بے جان لاش ہو کر رہ گئی تھی اور ۱۹۱۹ء کے نظام عالم کا جو بچا کھچا حصّہ تھا اُس کو ختم کرنے کے لئے اب صرف جنگ اور خونریزی کی دیر تھی۔

بین الاقوامی سیاسیات کے اس منظر سے ہٹ کر اب ہم اُس منظر کی طرف آتے ہیں جس کا تعلق سوویٹ روس سے تھا۔ ۱۹۱۷ء کے نومبر انقلاب کے بعد روس میں سیاسی طاقت مزدوروں کے ہاتھ میں آجاتی ہے اور اشتراکی انقلاب پورے پورے طور پر کامیاب ہوتا ہے لیکن روس کے علاوہ اور تمام ملکوں میں انقلاب دب جاتا ہے۔ یورپ کے مغربی ملکوں کے اشتراکی سوشل ڈیموکرائٹ دیہائی میں اسٹوٹ گارٹ کی قرارداد کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے اپنے وہاں کی سامراجی حکومتوں کا ساتھ دے دیتے ہیں۔ مشرق کی طرف چین میں انقلابی طاقتیں ضرور زور پکڑتی ہیں لیکن بہت بعد میں یعنی ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء کے درمیانی عرصہ میں۔ ہندوستان کی قومی تحریک (خلافت اور سوراج) غلط اور کمزور طریقۂ کار (TACTICS) کے سبب برطانوی سامراج کے سامنے سر جھکا دیتی ہے۔ اگرچہ بحیثیت مجموعی اُس کا زور بڑھتا ہی جاتا ہے۔ ہنگری کی نوزائیدہ اشتراکی حکومت ۱۹۱۹ء میں مختصر سے عرصۂ حیات کے بعد سرمایہ دار طاقتوں سے جد و جہد میں ناکام رہتی ہے اور وہاں دوبارہ پرانا نظام قائم ہو جاتا ہے، بلغاریہ کا انقلاب خون کے دھاروں میں بہہ کر ختم ہو جاتا ہے۔ ۲۴-۱۹۱۹ء میں جرمنی میں اور ۳۴-۱۹۲۷ء میں آسٹریا میں سوشل ڈیموکرائٹ جماعتوں کے سرمایہ دار طبقے سے سازباز اور غلطیوں کے سبب اور ساتھ ہی نوزائیدہ کمیونسٹ پارٹیوں کی ناتجربہ کاری اور کمزوری کے باعث انقلاب ناکام رہتا ہے۔ اٹلی میں ۱۹۲۲ء میں ہی سرمایہ داری اور سامراج کی سب سے بھیانک شکل یعنی فاشزم قائم ہو جاتا ہے۔ اس طرح روس ہی ایک ایسا ملک تھا جہاں اشتراکی نظام قائم تھا لیکن اس کے چاروں طرف طاقتور سرمایہ دار ممالک ہر گھڑی اُسے ہڑپ کر جانے اور نوزائیدہ اشتراکی نظام کو ختم کر دینے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ ایسی صورت حال میں روس کے سامنے اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا کہ عالمگیر اشتراکی انقلاب تک کسی طرح دنیا کے واحد اشتراکی نظام کو خطروں سے بچانے کے لئے سامراجی ممالک کے باہمی نفاق سے فائدہ اُٹھا کر اُن کو کسی وقت روس کے خلاف باہم متحد نہ ہونے دے۔ روس کا خارجی طرز عمل اب تک اسی راستے پر گامزن ہے۔

۱۹۳۵ء تک روس کا پنجسالہ پروگرام پورے پورے طور پر کامیاب ثابت ہوا اور "اشتراکیت ایک ملک میں" والی پالیسی بھی صحیح ثابت ہو چکی تھی۔ ۱۹۳۵ء میں روس میں نئے دستور حکومت کے نفاذ میں آنے سے مزدوروں کی جمہوریت پورے پورے طور پر قائم ہو چکی ہے۔

"اشتراکی روس" کے خلاف سامراجی طاقتوں کو باہم متحد نہ ہونے دو ـــــ اس پالیسی پر عمل کرتے ہوئے ۱۹۳۳ء تک روس برطانیہ اور فرانس کے خلاف جرمنی اور اطالیہ اور دوسرے شکست خوردہ ملکوں " مثلاً آسٹریا اور ہنگری اور ترکی کی حمایت کرتا ہے لیکن ۱۹۳۳ء میں ہٹلر کے برسراقتدار آنے اور جرمنی میں پورے طور پر فاشزم کے قیام کے بعد روس کے خارجی طرز عمل میں ایک زبردست انقلاب رونما ہوتا ہے۔ وہ پالیسی کیا تھی؟ یورپ کے عوام اور جمہوری حکومتوں کے ساتھ مل کر جنگ اور فاشزم کے خلاف ایک وسیع بین الاقوامی محاذ قائم کیا جائے۔ چنانچہ فرانس میں ۶ فروری ۱۹۳۴ء کو تمام جمہوریت پسند جماعتوں کے اتفاق و اتحاد سے فاشسٹ گروہ کو شکست ہوتی ہے اور وہ فرانس کی حکومت پر قابض ہونے میں ناکامیاب رہتے ہیں۔ جولائی ۱۹۳۴ء میں فرانس کے مزدوروں کی دونوں جماعتوں کو ملا کر "اتحاد عمل" وجود میں لایا جاتا ہے جس کا مقصد ہوتا ہے مزدوروں کی تنخواہ میں کمی کرنے کی مخالفت کرنا اور فاشسٹ گروہوں کو ٹوٹنے اور بکھر جانے پر مجبور کرنا۔ اس کے بعد ریڈیکل اور بائیں بازو سے یعنی کسانوں اور نچلے درجے کے متوسط طبقوں سے مل کر فاشزم کے خلاف محاذ کو اور وسیع کر دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۶ء میں سوشلسٹ ریڈیکل حکومت وجود میں آتی ہے جسے پاپولر فرنٹ میں شامل جماعتوں کی پوری حمایت حاصل ہوتی ہے۔

چین میں چیانگ کائی شیک کے جور و ظلم اور دشمنی کے باوجود اشتراکی عناصر ترقی کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جاپان کے خلاف اُن کی تحریک کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ چیانگ اپنا طرز عمل بدلنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور چین میں بورژوا جمہوریت پسند جماعت اور اشتراکی جماعت مل کر جاپان کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرتی ہیں۔

اسپین میں بھی فاشزم کے خلاف اتحاد رونما ہوتا ہے۔ اسپین کے علاقہ آسٹریاز میں ۱۹۳۴ء میں کانوں کے مزدور سرمایہ داروں کی حیرت انگیز مدافعت کرتے ہیں جس سے اتحاد کا رجحان بڑھنے لگتا ہے۔ فاشزم کے خلاف متحدہ محاذ قائم ہوتا ہے اور ۱۹۳۶ء میں ریپبلکن حکومت برسراقتدار ہوتی ہے۔ فرانکو کی بغاوت کے سلسلے میں اسپین کے عوام کا اتحاد اور بھی بڑھ گیا جس کا اظہار یہ ہوا کہ وہاں سوشلسٹ ریپبلکن حکومت اور آخر میں ایک واقعی عوامی حکومت قائم ہو گئی۔

اس منظر سے ہٹ کر جب ہم پھر اوالد کر منظر کی طرف جاتے ہیں تو سرمایہ دار طاقتوں کی دنیا میں ہمیں تین باتیں نظر آتی ہیں۔ (۱) معاہدہ ورسائی کے ذریعہ جو نظام عالم قائم ہوا تھا وہ ختم ہو چکا تھا (۲) فاشسٹ طاقتیں یعنی جرمنی، اٹلی اور جاپان نہایت تیز رفتاری کے ساتھ عالمگیر جنگ کی طرف قدم بڑھا رہے تھے تاکہ برطانیہ فرانس اور امریکہ کو شکست دیکر دنیا کے ملکوں اور بازاروں پر قبضہ کر لیں۔ اٹلی حبشہ کی طرف متوجہ تھا۔ جاپان چین کی طرف اور جرمنی یورپ کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ (۳) فاشسٹوں کے ارادوں کو دیکھ کر سرمایہ دار طاقتوں میں اب بھی نئی نئی گروہ بندیاں وجود میں آ رہی تھیں۔ وہ پرانی طاقتیں جن کا مفاد حالات موجودہ سے وابستہ تھا تبدیلی کی مخالف ہونے کے سبب ایک حد تک امن کے موافق تھیں۔ لیکن انھیں ملکوں کے رجعت پرست سرمایہ دار طبقے اس لئے جنگ کے موافق تھے کہ فاشسٹ طاقتوں کو سوویت روس سے دست و گریباں کر دیا جائے۔ چنانچہ اسی خواہش کے تحت سرمایہ دار ملکوں کے رجعت پرست حکمراں طبقوں نے فاشسٹ طاقتوں کو خوش کرنے والی پالیسی اختیار کی اس پالیسی کی تحت سیاسیات عالم میں جو واقعات رونما ہوتے اُن کی محض فہرست ذیل میں پیش کی جاتی ہے:۔

۱۹۳۵ء۔ اٹلی حبشہ پر حملہ کرتا ہے۔ جرمنی میں دوبارہ جبریہ فوجی بھرتی شروع ہوتی ہے۔ سر سامویل ہور اور لاوال میں حبشہ کی باہمی تقسیم کے لئے معاہدہ ہوتا ہے۔ جرمنی رائن لینڈ پر قبضہ کر لیتا ہے اور وہاں قلعہ بندی شروع کر دیتا ہے۔ انگلستان اور جرمنی کے درمیان بحری معاہدہ وجود میں آتا ہے۔ ورسائی کا معاہدہ ختم ہوتا ہے۔ جاپان شمالی چین کے

علاقوں پر بھی قبضہ کرلیتا ہے جن میں پیکنگ اور تانسین بھی شامل تھے، روس فرانس اور زیکوسلوویکیہ سے باہمی فوجی امداد کا معاہدہ کرتا ہے۔

۱۹۳۶ء۔ اٹلی ہٹلر کی گروہ بندی میں شامل ہوجاتا ہے۔ اٹلی، جرمنی اور جاپان کے درمیان کمیونسٹ تحریک کے خلاف معاہدہ وجود میں آتا ہے۔ فرانس اور اسپین میں عوامی حکومتیں قائم ہوتی ہیں۔ سنہ ۱۹۳۶-۳۹ء میں اٹلی اور جرمنی اسپین کی جنگ آزادی و جمہوریت کے خلاف فرانکو کی مدد شروع کرتے ہیں۔

۱۹۳۷-۳۹ء۔ جاپان مرکزی اور جنوبی چین پر حملہ کرتا ہے اور نانکنگ اور ہانکو پر قبضہ کرلیتا ہے اور ہانگ کانگ سے قریب والے جزائر کانٹن اور ہینان بھی لے لیتا ہے۔

۱۹۳۸ء۔ (مارچ) ہٹلر آسٹریا پر قبضہ کرلیتا ہے (ستمبر)۔ چیمبرلین اور ہٹلر میں میونخ میں ملاقات ہوتی ہے۔ ہٹلر زیکوسلوویکیہ کو تباہ کرنا شروع کرتا ہے۔

۱۹۳۹ء۔ (مارچ) ہٹلر پورے زیکوسلاویکیہ پر قبضہ کرلیتا ہے میمل کو ہڑپ کرجاتا ہے۔ ڈینزگ اور پولینڈ کو دھمکی دیتا ہے۔ اپریل میں مسولینی، البانیہ پر قابض ہوجاتا ہے۔ اگست میں روس اور جرمنی کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف حملہ نہ کرنے کا معاہدہ ہوتا ہے۔ پہلی ستمبر کو بوقت چار بجے صبح ہٹلر کی فوجیں پولینڈ پر حملہ آور ہوتی ہیں۔

———— ٭ ————

فاشسٹ طاقتوں کا عروج برطانیہ کے سامراجی مفاد کے لئے خطرناک تھا۔ اسپین میں فاشسٹ حکومت کا قیام جرالٹر کے لئے اور مغربی بحیرۂ روم میں برطانوی اقتدار کے لئے خطرناک تھا۔ زیکوسلاویکیہ کی تباہی نے ہٹلر کے لئے مرکزی اور مشرقی یورپ بلقان و بحیرۂ روم کا دروازہ کھول دیا تھا۔ چین میں جاپان نے شنگھائی اور ہانکو میں برطانوی اقتدار کو سخت صدمہ پہنچایا تھا اور ہانگ کانگ کو چاروں طرف سے محصور کرلیا تھا۔ لیکن برطانیہ کے حکمراں طبقے نے چیمبرلین کی رہنمائی میں فاشسٹ طاقتوں کے خلاف قدم اٹھانے سے انکار کیا، جمعیتہ الاقوام کو جبر و استبداد کے خلاف کارروائی کرنے سے روکا، دوسرے ملکوں سے برطانوی عہدنامے توڑ ڈالے اور روس سے اتحاد قائم کرکے اجتماعی نظام تحفظ کو مضبوط کرنے سے انکار کردیا۔

کیوں اس لئے کہ برطانیہ کے حکمراں طبقوں کو قومی مفاد کی بہ نسبت اپنا طبقاتی مفاد کہیں اہم نظر آیا۔ اسپین اور فرانس میں جمہوری طاقتوں کا عروج دیکھ کر ان کے دل میں یہ خوف پیدا ہوا کہ یہ طاقتیں برسر اقتدار آکر روس سے اتحاد کرلیں گی۔ اسپین میں جمہوری عناصر کو طاقت کے زور سے دبا دیا گیا اور برطانیہ اور امریکہ نے دخل دینے سے صاف انکار کردیا۔ اس طرح گویا اسپین اور فرانس میں فاشزم کے خلاف جو عوامی اتحاد وجود میں آیا تھا اُسے تباہ کردیا گیا۔ اور فاشزم کے لئے راستہ صاف ہوگیا۔ برطانیہ اور امریکہ کے حکمراں حریف ہونے کے سبب کوئی متحدہ محاذ نہیں قائم کرسکتے تھے۔ دونوں ملکوں کے حکمراں یہ چاہتے تھے کہ جس طرح ممکن ہو جرمنی کے رُخ کو روس کی طرف پھیر دیا جائے۔ زیکوسلاویکیہ اس پالیسی کی بدترین مثال ہے۔

جب ہٹلر نے زیکوسلاویکیہ پر قبضہ کرنے کے بعد کارپیتھو یوکرین ہنگری کے حوالے کردیا اور پولینڈ سے متعلق اپنے مطالبات پیش کئے تو آخر کار برطانیہ اور فرانس کی آنکھیں کھلیں اور انھیں پہلی بار معلوم ہوا کہ ہٹلر کا ارادہ مشرق کی طرف نہیں ہے بلکہ مغرب کی طرف۔ اس لئے کہ موخرالذکر زیادہ آسان تھا برطانیہ نے پولینڈ کو تحفظ کی گارنٹی عطا کی اور روس سے گفت و شنید شروع کردی۔ برطانیہ یہ چاہتی تھی کہ روس پولینڈ اور رومانیہ کو گارنٹی عطا کرے لیکن خود روس کو کوئی گارنٹی نہ دی جائے۔ برطانیہ روس سے ایسا معاہدہ چاہتی تھی جس کی رو سے برطانیہ کے قدم تو مضبوط ہوجائیں لیکن روس کو تقویت نہ پہنچے۔ بات یہ تھی کہ برطانیہ اور فرانس کے دل میں امید تھی کہ جرمنی شاید روس پر حملہ آور ہو۔ چنانچہ برطانیہ نے روس کی سرحدوں پر واقع ملکوں کو گارنٹی دینے سے انکار کردیا۔ پولینڈ کے رجعت پرست حکمراں طبقے نے بھی روس سے مدد لینے سے صاف انکار کردیا۔ جب روس نے دیکھا کہ برطانیہ اور فرانس کے جمہوریت پسند

طبقے اتنے طاقتور اور منظم نہیں ہیں کہ وہ اپنے اپنے ملکوں کو روس سے دوستی کرنے پر مجبور کریں اور روس نے یہ بھی دیکھا کہ اگر اسوقت جرمنی سے جنگ چھڑ جاتی ہے تو بہت آسانی سے ہمارے خلاف جرمنی فرانس اور برطانیہ کا متحدہ محاذ قائم ہوجائے گا۔ چنانچہ روس نے برطانیہ کے رجعت پرست حکمراں طبقوں کے ہاتھوں میں کھلونا بننے سے انکار کرکے صرف فوری جنگ سے بچنے کے لئے جرمنی سے ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ کرلیا۔ نتیجتاً پولینڈ پر جرمنی حملہ کرتا ہے اور اس طرح دنیا کی دوسری عالمگیر چھڑ جاتی ہے۔ برطانیہ اور فرانس کے حکمراں طبقے بھی بحالت مجبوری اپنی خواہش کے خلاف جرمنی سے جنگ کا اعلان کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ پولینڈ کو پہلے ہی گارنٹی دے چکے تھے۔

برطانیہ اور فرانس کی حکومتیں پولینڈ کی فوجی امداد نہ کرسکیں پولینڈ کی رجعت پرست حکومت جس کے ریاستی حدود بے ایمانی سے قائم کئے گئے تھے فاشزم کے پہلے ہی حملے کی تاب نہ لاسکی۔ پولینڈ کی ذلیل شکست کے بعد روس کی مغربی سرحد کو لازمی طور پر خطرات لاحق ہوئے۔ چنانچہ روس کی فوجوں نے اُس وقت جبکہ پولینڈ کی حکومت کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا تھا بائلو رشا اور یوکرین کے علاقوں پر بڑھ کر قبضہ کرلیا اور اُسے مدتوں کی پورلی غلامی سے آزاد کرنے فاشزم کے پنجوں سے بھی محفوظ کرلیا۔

پولینڈ کی شکست کے بعد اگر برطانیہ اور فرانس چاہتے تو روس کے ساتھ مل کر بالٹک کی ریاستوں کو متحدہ گارنٹی عطا کرسکتے تھے اور اس طرح دنیا کو آگ اور خون کی ہولی کھیلنے سے روک لیتے۔ مگر برطانیہ اور فرانس نے اپنی ناعاقبت اندیشانہ پالیسی کے تحت اس جنگ کو عالمگیر جنگ ہوجانے سے نہ روکا اور مسلسل طور پر روس سے اپنی دشمنی کا اظہار کرتے رہے۔

پولینڈ کے زوال کے بعد بالٹک کی ساحلی ریاستوں نے لتھوانیا، اسٹونیا۔ اور لٹویا ستمبر اور اکتوبر ۱۹۳۹ء میں اپنے تحفظ کے لئے روس سے باہمی فوجی امداد کا معاہدہ کرلیا جس کے تحت اُن کی مکمل آزادی کو تسلیم کیا گیا۔ روس نے فن لینڈ سے بھی اس قسم کا معاہدہ کرنا چاہا اس لئے کہ فن لینڈ

ان بحری راستوں پر حاوی تھا جو بحیرہ بالٹک سے ہوتے ہوئے روس کو جاتے تھے اور لینن گراڈ بالکل فوجی زد میں آجاتا تھا۔ فن لینڈ نے برطانیہ اور روس کے بہکانے سے روس کے ساتھ معاہدہ کرنے سے انکار کر دیا اور روس کی سرحد پر فوجیں جمع کرنی شروع کر دیں۔ برطانیہ اور فرانس کے ناعاقبت اندیش حکمراں اب بھی یہ امید کر رہے تھے کہ جنگ کے شعلوں کو روس کی طرف پھیر دیا جائے اور خود بچ نکل جائے۔

برطانیہ اور فرانس نے فن لینڈ کے فوجی اقدام کا خیر مقدم کیا اور برطانیہ سے باقاعدہ فوجی امداد جانے لگی لیکن سُرخ فوج کے آہنی حملوں نے مینرہیم لائن کو توڑ دیا اور فن لینڈ اور روس کے درمیان مارچ ۱۹۴۰ء میں صلح ہوگئی جس کے مطابق روس نے اپنی سرحدیں حاصل کرنے کے بعد فن لینڈ کو مکمل آزادی دے دی۔

تین ماہ کے اندر اندر جرمنی نے پورے مغربی یورپ کو فتح کرلیا۔ ہر جگہ اُسے غداروں سے مدد ملی خاص کر فرانس میں۔ فرانس کی شکست محض فوجی کمزوری کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ وہاں کے حکمراں طبقے کی نالائقی اور غداری کا بھی۔ فرانس کے حکمراں جرمنی سے زیادہ خود اپنے ملک کے انقلاب پسندوں سے خوف زدہ تھے۔ جنرل ویگاں نے جرمنی کے خلاف ایک عوامی جنگ چھیڑنے کی بجائے فرانسیسی افواج کو خود ملکی انقلاب پسندوں کو کچلنے میں لگا دیا اور وشی حکومت نے مزدور تحریک کے کارکنوں کو جیل میں ٹھونس دیا۔

برطانیہ میں چیمبرلین کو زوال نصیب ہوا۔ چرچل کا برطانیہ کے رجعت پسندوں کے اُس گروہ سے تعلق تھا جو ہٹلر کے خلاف آخر دم تک لڑنے کا قائل تھا۔ ڈنکرک کے واقعہ اور ہٹلر کے ہوائی حملوں نے برطانیہ میں عوامی مقاومت کی ایک زبردست تحریک کو جنم دیا اور ساتھ ہی برطانوی عوام کو اس بات کا عملی ثبوت ملا کہ اعلیٰ طبقے کے مفاد اُن کی مقاومت کی راہ میں بہت بڑی حد تک حائل ہیں۔

ہٹلر مغرب کی طرف اپنے قدم مضبوط کرکے اب مشرق

کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے رومانیہ اور بلغاریہ کو وہاں کے حکمراں طبقوں کی مدد اور اعانت سے ہڑپ کر لیا۔ ہٹلر نے ۱۹۴۱ء کے موسم بہار میں بلقان پر حملہ کیا۔ اٹلی، زوال فرانس کے موقع پر جون ۱۹۴۰ء میں ہی جنگ میں شریک ہو گیا تھا۔ اب اس نے اکتوبر ۱۹۴۰ء میں یونان پر حملہ کر دیا۔ اب یورپ میں کچھ نئے عناصر اور نئی طاقتیں ابھر رہی تھیں، یوگوسلاویہ کے عوام نے غدار پال سے بغاوت کر کے روس سے معاہدہ کر لیا۔ یہ معاہدہ ایک ایسی قوم کا معاہدہ تھا جو فاسزم کے خلاف سوویت روس کے ساتھ اتحاد کرنا چاہتی تھی۔ یوگوسلاویہ کی عوامی تحریک نے یونان کے عوام کی بھی ہمت افزائی کی اور وہ صحیح معنوں میں نازی حملوں کے خلاف صف آرا ہونے لگے۔

یوگوسلاویہ اور یونان کی حکومتوں کے فرار اختیار کرنے کے بعد اِن ملکوں کے عوام نے مقاومت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور دونوں ملکوں میں خفیہ گوریلا تحریکوں نے باقاعدہ قومی عوامی فوج کی صورت اختیار کر لی۔ اسی طرح مغربی یورپ کے مفتوح ممالک میں بھی فاشزم کے خلاف خفیہ مسلح تحریکیں شروع ہو گئیں۔

بلقان پر ہٹلر کا قبضہ ہو جانے کے بعد روس کے لئے اور بھی خطرات پیدا ہو گئے۔ سوویت روس نے اپنی سرحدوں کی حفاظت کرنے اور خطرے میں مبتلا قوموں کی مدد کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ جون ۱۹۴۰ء میں رومانیہ سے معاہدہ کر کے روس نے اپنا قدیمی صوبہ بیسیریبیا واپس لے لیا۔ روس نے بلغاریہ کو جنوبی ڈوبروجا کا علاقہ حاصل کرنے میں مدد کی پیش کش کی اور باہمی امداد کا معاہدہ بھی کرنا چاہا لیکن بلغاریہ انکار کر کے جرمنی اور اٹلی سے جا ملا۔

روس کی اس پالیسی نے یہ بات واضح کر دی کہ جرمنی سے اس کے معاہدہ کی نوعیت فوجی نہیں تھی۔ جرمنی نے یہ محسوس کیا کہ وہ واحد طاقت جو جرمنی کی صحیح معنوں میں مدافعت کر سکتی ہے ایک بالکل خود مختارانہ پالیسی پر عمل کر رہی ہے۔ ۲۲ر جون ۱۹۴۱ء کو نازی فوجیں روس پر حملہ شروع کر دیتی ہیں۔

ہٹلر کو تین باتوں کے اوپر اپنی فتحیابی کا یقین تھا۔ اول تو وہ یہ امید کر رہا تھا کہ روس کے خلاف برطانیہ اور امریکہ جنگ میں شامل ہو جائیں گے۔ ہیس اسی لئے لندن بھیجا گیا تھا۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ روس کا نیا معاشی اور سماجی نظام ناپائدار ہے۔ حملہ ہوتے ہی بکھر جائے گا۔ اور سوویت وفاق میں شامل، دیگر ریاستیں اور قومیں بغاوت پر آمادہ ہو جائیں گی۔ عام بے چینی اور بدامنی پھیلے گی اور سوویت مدافعت ختم ہو جائے گی، تیسرے وہ یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ سرخ فوج اور سرخ بحری بیڑہ کمزور ہے۔ چنانچہ روس جرمنی کے حملوں کی تاب نہیں لا سکتا۔ ہٹلر کے یہ تینوں خیالات کامل طور پر غلط ثابت ہوئے۔

حملہ ہونے کے بیس روز بعد یعنی ۱۲ر جولائی ۱۹۴۱ء کو ماسکو میں انگلستان اور روس کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے دونوں ملکوں نے جرمنی کے خلاف جنگ میں ایک دوسرے کی مدد کرنے اور جرمنی کی شکست کے بعد علیحدہ طور پر معاہدہ نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ روس کے خارجی طرزِ عمل کی یہ ایک زبردست کامیابی تھی۔ جب سے فاشزم کا عروج شروع ہوا اسی وقت سے روس نے اپنی یہ پالیسی مقرر کی کہ دنیا کی تمام جمہوری حکومتیں اور وہاں کے عوام روس کے ساتھ مل کر فاشسٹ طاقتوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کریں تاکہ سرمایہ داری اور سامراج کی سب سے خطرناک شکل فاشزم کو ختم کر دیا جائے جس کے بعد سرمایہ دارانہ اور سامراجی نظام کو اتنا شدید صدمہ پہنچے گا کہ اس کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی اور دنیا کے عوام اشتراکی انقلاب کی طرف تیزی کے ساتھ قدم اٹھانے لگیں گے۔ امریکہ میں رجعتی علیحدگی پسندوں کو انتخاب میں روزولٹ کی کامیابی کے بعد شکست دی جا چکی تھی اور انگلستان میں ٹوریوں کا وہ گروہ جو جرمنی کے ساتھ مل کر روس کا اشتراکی نظام تباہ کر دینا چاہتا تھا اب سیاسی اختیارات سے محروم ہو چکا تھا، انگلستان اور امریکہ کے عوام، مزدور اور کسانوں نے فاشزم کے خلاف جنگ کی پوری حمایت کا عہد کر لیا تھا، ساتھ ہی یورپ میں مسلح عوامی تحریکیں سرعت رفتار کے ساتھ ترقی کر رہی تھیں۔ چین میں کمیونسٹوں اور چیانگ کے اتحاد کے سبب جاپانیا [illegible]

کی رفتار مدھم ہو چکی تھی۔ گویا پوری دنیا کے عوام فاشزم کے خلاف متحد اور منظم ہو چکے تھے۔ ہندوستان کی سب سے بڑی عوامی جماعت کانگریس بھی فاشزم کے خلاف جنگ کا اعلان کر چکی تھی لیکن حکومت برطانیہ نے کانگریس پر حملہ کر کے اور اختیارات دینے سے انکار کر کے ہندوستانی عوام کو جنگ میں عملی شرکت سے روک دیا گویا ۱۹۴۱ء میں روس پر جرمنی کے حملے کے بعد دنیا کی سیاسی صورت حال میں ایک زبردست کامیتی (QUALITATIVE) انقلاب رونما ہو گیا۔

اب اگر ہم ۱۹۱۹ء کے بعد سے سیاسیات عالم پر ایک نگاہ واپس ڈالیں تو ہم اس پورے زمانے کو پانچ مختلف دوروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۳ء۔ اس دور میں دنیا کا سرمایہ دارانہ نظام ۱۹۱۴ء کی عالمگیر جنگ کے سبب متزلزل ہو جاتا ہے۔ یورپ ہندوستان اور نوآبادیاتی ممالک کے عوام اشتراکی یا قومی انقلاب کی طرف قدم بڑھاتے ہیں لیکن روس کے علاوہ ہر جگہ کی قومی یا اشتراکی تحریک تشدد اور طاقت کے استعمال سے دبا دی جاتی ہے لیکن روس کے انقلاب کو دنیا کی سامراجی طاقتیں دبانے میں ناکام رہتی ہیں۔

(۲) ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۹ء۔ یہ دور سرمایہ دارانہ نظام کے عارضی استقلال کا ہے جس میں عارضی طور پر دنیا میں خوشحالی پیدا ہوتی ہے اور دنیا میں ظاہری طور پر امن کی بنیادیں مضبوط نظر آتی ہیں۔ جمعیت الاقوام بھی اسی عہد میں سب سے کامیاب و کامران نظر آتی ہے۔

(۳) ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۹ء تک ۱۹۲۹ء میں عالمگیر معاشی بحران آتا ہے سرمایہ داری خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ دنیا کی تمام سرمایہ دار اور سامراجی طاقتیں اپنے اپنے مفاد کی حفاظت کیلئے جنگی تیاریاں شروع کر دیتی ہیں۔ جمعیت الاقوام کا زوال ہوتا ہے اس لئے کہ جمعیت الاقوام نہ تو کمزور قوموں کو سامراجی طاقتوں کے زد سے بچا سکی اور نہ تخفیف اسلحہ کو عملی صورت دے سکی۔ آخر کار ۱۹۳۹ء میں سامراجی طاقتیں آپس میں گتھم گتھا ہو جاتی ہیں۔

(۴) ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۱ء۔ سامراجی طاقتوں کو آپس میں گتھم گتھا پا کر ساری دنیا کے عوام جنگ کی مخالفت کرتے ہیں۔

(۵) ۱۹۴۱ء کے بعد سے روس پر حملہ کے بعد ساری دنیا کے عوام فاشزم کے خلاف منظم ہو کر جنگ میں ساتھ دینے پر تیار ہو جاتے ہیں اور ساتھ ہی ساری دنیا کا سامراجی اور سرمایہ دارانہ نظام کا اوپری سیاسی ڈھانچہ بھی متزلزل ہو جاتا ہے۔ یورپ میں فاشزم کی شکست کے ساتھ ہی شخصی اور سرمایہ دارانہ حکومتوں کے تختے الٹ جاتے ہیں اور یورپ کے عوام واضح طور پر اشتراکی انقلاب کی طرف قدم بڑھانے لگتے ہیں۔ یورپ کی سیاست سے بطانیہ اور امریکہ کے رجعت پسندوں کے قدم اکھڑ جاتے ہیں اور ان کی ریشہ دوانیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہیں۔

۱۹۴۱ء کے نصف آخر بعد جو واقعات ہوئے وہ سیاسیات کے اسی رجحان کو گویا آگے بڑھاتے گئے جو روس پر جرمنی کے حملے کے بعد رونما ہو چکے تھے۔ یہاں پر ۱۹۴۱ء کے نصف آخر بعد جو اہم واقعات ہوئے ان کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کر دینا مناسب ہے۔

۱۴ اگست ۱۹۴۱ء کو بحر اوقیانوس میں چرچل اور روزولٹ کے درمیان جنگی جہاز پر ملاقات ہوتی ہے اور ایک متحدہ اعلان "اٹلانٹک" شائع ہوتا ہے جس میں جرمنی اور اطالیہ کے خلاف جنگ کے مقاصد کی تشریح ہوتی ہے۔

۲۵ اگست ۱۹۴۱ء۔ برطانوی اور روسی فوجیں ایران میں داخل ہوتی ہیں۔

۱۸ نومبر ۱۹۴۱ء۔ برطانوی فوجیں لیبیا میں اطالوی محاذ جنگ پر جارحانہ حملہ شروع کر دیتی ہے۔

۷ دسمبر ۱۹۴۱ء۔ جاپان پرل ہاربر پر حملہ کرتا ہے۔

۸ دسمبر ۱۹۴۱ء امریکہ جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیتا ہے۔

* اسی شمارے میں اعلان اٹلانٹک کا ایک مختصر سا خاکہ درج ہے۔

۱۱ دسمبر ۱۹۴۱ء۔ جرمنی اور اٹلی ریاستہائے متحدہ امریکہ کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہیں۔

۱۳ دسمبر ۱۹۴۱ء۔ ہنگری اور بلغاریہ امریکہ پر اعلان جنگ کرتے ہیں۔

۱۔ جنوری ۱۹۴۲ء۔ دنیا کی چھبیس قومیں واشنگٹن میں ایک معاہدہ پر دستخط کرتی ہیں جن کی رو سے وہ جرمنی، اٹلی اور جاپان کے خلاف متحدہ طور پر جنگ جاری رکھنے اور علیحدہ طور پر صلح نہ کرنے کا عہد کرتی ہیں۔

۱۵ فروری ۱۹۴۲ء۔ سنگاپور پر جاپانیوں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔

۲۶ فروری ۱۹۴۲ء۔ برطانیہ اور روس کے درمیان لندن میں ایک ۲۰ سالہ معاہدہ وجود میں آتا ہے جس کی رو سے دونوں حکومتیں دوران جنگ میں اور جنگ کے بعد پورے تعاون اور اشتراک عمل کرنے کا عہد کرتی ہیں۔

۱۲ اگست ۱۹۴۲ء۔ ماسکو میں چرچل اور استالن کی ملاقات۔

۳۱ اگست ۱۹۴۲ء۔ جرمنی کی فوجیں اسٹیلن گراڈ سے صرف پندرہ میل کے فاصلے پر رہ جاتی ہیں۔

۳ نومبر ۱۹۴۲ء۔ مصر میں جرمن اور اطالوی فوجیں پیچھے ہٹنا شروع کرتی ہیں۔

۸ نومبر ۱۹۴۲ء۔ اتحادی فوجیں جنرل آئی زن ہوور کے زیر کمان شمالی افریقہ میں داخل ہوتی ہیں۔

۱۵، ۱۶ نومبر ۱۹۴۲ء۔ جزائر سولومن کی زبردست فضائی و بحری فتح۔

۲ فروری ۱۹۴۳ء۔ اسٹیلن گراڈ کی جنگ روسیوں کی فتح پر ختم ہوتی ہے۔ جرمن فوجیں پیچھے ہٹنا شروع کرتی ہیں۔

۲۲ مئی ۱۹۴۳ء۔ اسٹیلن تھرڈ انٹرنیشنل کو ختم کر دیتا ہے۔

۹ جولائی ۱۹۴۳ء۔ اتحادی فوجیں جزیرہ سسلی میں اتر جاتی ہیں۔

۲۵ جولائی ۱۹۴۳ء۔ مسولینی کے خلاف بغاوت ہوتی ہے۔ اس سے اختیارات چھین لئے جاتے ہیں، بدولیو اٹلی کا وزیر اعظم بن جاتا ہے۔

۳۰ اگست ۱۹۴۳ء۔ اعلان ماسکو[۱] جس میں اور باتوں کے علاوہ دنیا میں ایک بین الاقوامی تنظیم کے قیام کے متعلق بھی خواہش کا اظہار کیا جاتا ہے۔

۱۳ اکتوبر ۱۹۴۳ء۔ اٹلی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔

۱۔ دسمبر ۱۹۴۳ء۔ طہران کانفرنس[۲] جس میں چرچل استالن اور روزویلٹ جنگ کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھنے کا پروگرام بناتے ہیں اور جنگ کے بعد دنیا میں ایک پائدار امن کی تعمیر و تنظیم کے قیام کے لئے ایک دوسرے سے تعاون کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ طہران کانفرنس بقول ارل براؤڈر طہران کانفرنس نے گویا اگست ۱۹۳۸ء کے میونخ کانفرنس کو رد کر دیا۔

۱۵ اگست ۱۹۴۴ء۔ اتحادی فوجیں ساحل فرانس پر اترتی ہیں۔ مغربی محاذ جنگ، جس کا عرصہ سے انتظار تھا آخرکار کھل جاتا ہے۔

۲۷ اگست ۱۹۴۴ء۔ جنوبی مغربی فرانس میں جرمنوں کی مدافعت ختم ہو جاتی ہے۔

۸ ستمبر ۱۹۴۴ء۔ روسی فوجیں بلغاریہ میں داخل ہوتی ہیں۔

۷ اکتوبر ۱۹۴۴ء۔ روسی فوجیں ہنگری پر حملہ کرتی ہیں۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۴۴ء۔ برطانوی فوجیں ایتھنز، پیرائیس اور کورفیو پر قابض ہو جاتی ہے۔

ستمبر، اکتوبر ۱۹۴۴ء ڈمبرٹن اوکس کانفرنس[۳] جس میں دنیا کی بین الاقوامی تنظیم کا خاکہ تیار کیا جاتا ہے۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۴۴ء۔ روسی فوجیں زیکوسلاوکیہ میں داخل ہوتی ہیں۔

۲۳ اکتوبر ۱۹۴۴ء۔ "اقوام متحدہ" باقاعدہ طور پر دی گال کی حکومت کو فرانس کی جائز حکومت کی حیثیت سے تسلیم کر لیتے ہیں۔

۱۷ جنوری ۱۹۴۵ء۔ وارسا کو سرخ فوج آزاد کراتی ہے۔

۲۸ جنوری ۱۹۴۵ء۔ لتھوانیا کو مکمل طور پر جرمنوں سے خالی کرا دیا جاتا ہے۔

۱۱ فروری ۱۹۴۵ء۔ کریمیا یا یالٹا[۴] کانفرنس ختم ہوتی ہے جس میں یورپ کے معاملات کو طے کرنے اور جرمنی پر آخری جارحانہ کارروائی کے لئے پروگرام بنانے کے علاوہ دنیا کی آیندہ بین الاقوامی مجلس امن کو بھی زیر بحث لایا جاتا ہے۔ اور ڈمبرٹن اوکس کانفرنس میں مجلس تحفظ میں ووٹ دینے کا مسئلہ چھیڑے

ع۱ طہران کانفرنس کو [illegible] پر دیکھیے۔ ع۲ صفحہ [illegible] پر دیکھیے۔
ع۳ صفحہ ۲۴ [illegible] پر دیکھیے۔

نہیں پایا تھا اُسے طے کیا جاتا ہے۔

۱۹ فروری ۱۹۴۵ء امریکی فوجیں آئی وو جیما میں اُتر آتی ہیں۔

۲۳ فروری ۱۹۴۵ء۔ ترکی جرمنی اور جاپان کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔

۵ اپریل ۱۹۴۵ء۔ ماسکو سے روس اور جاپان کے پنجسالہ معاہدہ کے ختم ہونے کا اعلان۔

۱۳ اپریل ۱۹۴۵ء۔ روزویلٹ کی افسوسناک موت۔

۲۵ اپریل ۱۹۴۵ء۔ سان فرانسسکو کانفرنس شروع ہوتی ہے۔

۲۸ اپریل ۱۹۴۵ء مسولینی کو گولی مار دی جاتی ہے۔

۱ مئی ۱۹۴۵ء۔ ہٹلر مر جاتا ہے۔

۲ مئی ۱۹۴۵ء۔ روسی فوجیں برلن کو فتح کر لیتی ہیں۔

۳ مئی ۱۹۴۵ء۔ اتحادی فوجیں رنگون اور برما میں داخل ہوتی ہیں۔

۲۸ جون ۱۹۴۵ء۔ سان فرانسسکو کانفرنس ختم ہوتی ہے۔

۱۹۴۵ء۔ پوٹس ڈیم کانفرنس جس میں جاپان، یورپ اور جرمنی کے مسائل طے کئے جاتے ہیں۔

۱۹۴۵ء۔ برطانیہ کے پارلیمانی انتخابات کا اعلان۔ مسٹر چرچل کو شکست ہوتی ہے۔ کلیمنٹ ایٹلی نیا وزیر اعظم ہوتا ہے۔

۱۹۴۵ء۔ جاپان کو اتحادی طاقتوں کی طرف سے الٹی میٹم دیا جاتا ہے۔

۱۹۴۵ء۔ ہیروشیما کے شہر پر پہلا ایٹومک بم گرایا جاتا ہے۔

۹ اگست ۱۹۴۵ء: روس کا جاپان کے خلاف اعلان جنگ۔

۱۱ اگست ۱۹۴۵ء۔ جاپان اس شرط پر ہتھیار ڈالنے پر راضی ہوتا ہے کہ جاپانی شہنشاہ کا سیاسی اقتدار برقرار رکھا جائے۔

دنیا کی مجوزہ بین الملی تنظیم پر ایک نظر

از ۔ ایس ۔ اے ۔ آپادورائے ۔

جنگ ختم ہو رہی ہے اور ہر شخص کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہے
آیا یہ آخری جنگ ہے یا اس کے بعد کوئی اور جنگ چھڑے گی ۔ اور اس
سوال کا پیدا ہونا غلط بھی نہیں ۔ اس لئے کہ جنگ کے دوران میں جس قدر
انی اور مالی نقصان ہوتا ہے وہ ناقابل بیان ہے ۔ اس کے علاوہ جنگ
کے بعد کچھ ایسے مسائل آکھڑے ہوتے ہیں کہ ان کا حل کرنا بے حد
ت طلب ہوتا ہے ۔ جنگ کے بعد آیندہ جنگ کو روکنے کی خواہش کا
ظہار یوں ہوتا ہے کہ لوگ بین الاقوامی امن و تحفظ کو برقرار رکھنے
کے لئے اجتماعی نظام قائم کرتے ہیں ۔

گزشتہ جنگ (۱۹۱۴ء) اور موجودہ جنگ میں ایک فرق ضرور ہے ۔
گزشتہ جنگ میں مدبرین نے دنیا کے امن و تحفظ کو قائم رکھنے کے مسئلہ پر جنگ
کے ختم ہونے کے بعد غور و خوض کیا تھا ۔ لیکن اس دفعہ ایک خاکہ پہلے ہی
تیار کر لیا گیا ہے اور وہ ڈمبرٹن اوکس کی تجویزیں ہیں جیسے ۹ ، اکتوبر ۱۹۴۴ء کو
شائع کیا گیا ہے اور جس کی بنیاد پر سان فرانسسکو کانفرنس میں جو
۲۵ ، اپریل ۱۹۴۵ء شروع ہوئی بین الاقوامی تنظیم کا ڈھانچہ تیار کیا جائے گا*
ضرورت ہے کہ ہم اس پلان پر ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۳۹ء تک
کے عالمگیر تجربات کی روشنی میں غور و خوض کریں اور اس کی بنیادی
خصوصیات کا تجزیہ کریں اور اگر ممکن ہو تو کچھ ضروری تبدیلیوں پر بھی
غور کریں ۔

. . .

جمعیتہ الاقوام نے امن و تحفظ کو قائم رکھنے کے تین طریقے بتائے تھے ۔
(۱) پہلا طریقہ تو یہ کہ جنگ کے کچھ بنیادی اسباب اور وجوہات کا قلع قمع
کرنا ۔ مثلاً فتوحات اور ملک گیری کے ارادوں ، اسلحہ جات اور خفیہ معاہدوں
پر نظر رکھنا اور ان کی روک تھام کرنا ۔ چنانچہ جمعیتہ الاقوام میں جو حکومتیں
شامل تھیں انھوں نے اس بات کا عہد کیا تھا کہ وہ جمعیتہ الاقوام میں
شامل تمام حکومتوں کے ملکی حدود اور سیاسی آزادی کا پاس و لحاظ کریں گی ۔
اس کے بعد جمعیتہ الاقوام نے تخفیف اسلحہ کو عمل میں لانے کے لئے ایک
قابل عمل پلان تیار کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا تھا ۔ ساتھ ہی جمعیتہ الاقوام کے
سکریٹریٹ میں حکومتوں کے درمیان وجود میں آنے والے معاہدوں کے
رجسٹریشن کا انتظام بھی کیا گیا ۔ (۲) امن کو قائم رکھنے کا دوسرا طریقہ
جمعیتہ الاقوام نے یہ پیش کیا کہ اگر قوموں کے درمیان کوئی ایسا جھگڑا
اٹھ کھڑا ہو جس سے جنگ کے چھڑنے کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو پہلے تو جمعیتہ
اس جھگڑے کی جانچ پڑتال کرے اور اس جانچ پڑتال کے دوران میں جھگڑے
میں شریک قومیں تشدد اور طاقت کے استعمال سے خود کو باز رکھیں ۔
(۳) تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اگر واقعی جنگ چھڑ گئی تو جمعیتہ الاقوام کی طرف
سے کچھ خاص پابندیاں عائد کی جائیں ۔ مثلاً معاشی بائیکاٹ بلکہ جمعیتہ الاقوام
میں شامل ریاستیں فوجی کارروائی بھی شروع کر دیں ۔ اس طور پر
امن شکن قوم مجبور ہو کر جنگ سے باز آجائے گی اور جنگ جلد از جلد
ختم ہو جائے گی ۔

یہاں ہمیں اس سے بحث نہیں کہ یہ تمام طریقے کیوں ناکامیاب
ثابت ہوئے لیکن دو باتوں سے متعلق یہاں کچھ کہنا
ضروری ہے ۔ اور وہ ہے تخفیف اسلحہ اور امن شکن قوموں پر پابندیاں
کا عاید کرنا ۔ جمعیتہ الاقوام نے تخفیف اسلحہ کے سلسلے میں جتنی کوششیں کیں
وہ سب ناکامیاب ثابت ہوئیں ۔ اس لئے کہ شرط یہ رکھی گئی تھی کہ
تخفیف اسلحہ کی حد ہر قوم کے لئے اتنی رکھی جائے کہ ملکی تحفظ خطرے
میں نہ پڑے ۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایک ایسے اجتماعی نظام کی عدم
موجودگی میں جس پر تمام قومیں اپنے اپنے ملکی تحفظ کے لئے بھروسہ
کر سکیں یہ شرط پوری نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ تخفیف اسلحہ کی تجویز ناکامیاب

---

* یہ مقالہ سان فرانسسکو کانفرنس سے پہلے لکھا گیا ۔

ثابت ہوئی۔ جہاں تک امن شکن قوموں کے خلاف پابندیاں اور قیود عائد کرنے کا سوال ہے تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ امن شکن طاقت کو ہم اُسی وقت جور و ظلم سے روک سکتے ہیں جب اُسے اِس بات کا یقین ہو کہ اگر ہم جنگ چھیڑتے ہیں تو ہمارے خلاف پورے اور لابدی طور پر پابندیاں عائد کی جائیں گی۔ لیکن ۱۹۱۹ء اور ۱۹۳۹ء کے درمیانی واقعات بتلاتے ہیں کہ امن شکن طاقتوں کو اس بات کا کامل یقین تھا کہ ہم ہزار دوسری قوموں پر ظلم ڈھائیں ہمارے خلاف جمعیتہ الاقوام کوئی قدم نہیں اُٹھا سکتی۔ اُن کا یہ یقین ۱۹۳۱ء کے بعد اور بھی واثق ہو گیا جب جمعیتہ الاقوام نے جاپان کے خلاف قدم اُٹھانے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ یہ بات اظہر من الشمس تھی کہ جاپان نے منچوریا پر حملہ کر کے خود کو ظلم و جور کا بانی ثابت کر دیا تھا۔

بہرحال ڈمبرٹن اوکس کی تجویزیں بعض باتوں کے لحاظ سے جمعیتہ الاقوام کے دستورِ اساسی سے بہتر قرار دی جا سکتی ہیں۔ ڈمبرٹن اوکس کی تجویزوں میں اس حقیقت کا کھلم کھلا اعتراف کیا گیا ہے کہ دنیا میں امن و امان قائم رکھنے کی اولین ذمہ داری اُن قوموں پر عائد ہوتی ہے جن کے قبضہ میں دنیا کے بیشتر فوجی ذرائع اور معاشی طاقت ہے۔ لیکن جمعیتہ الاقوام کے دستور میں اِس بات کی وضاحت نہیں کی گئی تھی۔

ڈمبرٹن اوکس کی تجویزوں کی بنیادی باتیں یہ ہیں کہ ہر امن پسند ریاست اقوام "متحدہ" کی رکن بن سکتی ہے۔ "اقوام متحدہ" چھ مجلسوں پر مشتمل ہوگی۔ (۱) عام اسمبلی۔ جس میں بین الاقوامی تنظیم کے تمام ممبران شامل ہوں گے اور ہر ریاست کو صرف ایک ووٹ دینے کا حق حاصل ہوگا۔ (۲) مجلس تحفظ جس میں گیارہ ریاستیں ہوں گی۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ، برطانیہ، سوویت یونین، چین اور آگے چل کر فرانس دائمی ممبر ہوں گے۔ اور بقیہ چھ ممبروں کو دو دو سال کے لئے اسمبلی چنے گی۔ (۳) بین الاقوامی عدالت۔ (۴) سکریٹریٹ۔ (۵) اقتصادی اور سماجی مجلس جس میں اٹھارہ ممبر ہوں گے۔ اِن ممبروں کو اسمبلی تین تین سال کے لئے چنے گی۔ (۶) فوجی اسٹاف کمیٹی جس میں مجلس تحفظ کے دائمی ممبروں کے چیف آف اسٹاف شامل ہوں گے یا اُن کے بھیجے ہوئے نمائندے۔ اگر ضرورت ہوئی تو دیگر ریاستوں کے نمائندے بھی فوجی اسٹاف کمیٹی میں شامل ہو سکیں گے۔

اِس نئی بین الاقوامی تنظیم کا سب سے اہم حصہ مجلس تحفظ ہے اور مجلس تحفظ میں بھی سب سے اہم حصہ وہ ہے جو دائمی ممبروں پر مشتمل ہے۔ ڈمبرٹن اوکس کی تجویزوں میں یہ صاف صاف درج ہے کہ دنیا کے امن و تحفظ کو برقرار رکھنے کی اولین ذمہ داری مجلس تحفظ کو عطا کی جائے۔ بین الاقوامی تنظیم میں شامل تمام ریاستیں مجلس تحفظ کے احکام اور فیصلوں کو تسلیم کرنے اور اُن کو عملی جامہ پہنانے پر مجبور رہوں گی۔ مجلس تحفظ کو ہر اُس جھگڑے اور ہر اُس صورت حال کی تحقیق تفتیش کرنے کا اختیار ہوگا جس سے جنگ یا بین الاقوامی مناقشوں کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ مجلس تحفظ ریاستوں سے درخواست کرے گی کہ وہ اپنے جھگڑے پُرامن اور صلح آمیز طریقے سے طے کر لیں۔ مثلاً باہمی گفت و شنید کے ذریعے یا کسی تیسرے شخص ریاست یا جماعت کی وساطت سے۔ یا فیصلے کے اختیارات کسی تیسرے شخص جماعت یا ریاست کے ہاتھوں میں سونپ دیئے جائیں۔ یا بین المللی قوانین کی رو سے بین الاقوامی عدالت فیصلہ کرے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مجلس تحفظ بین الاقوامی جھگڑوں میں شامل ریاستوں کو اپنے باہمی اختلافات دور کرنے کے پُرامن طریقے بتائے گی۔ مجلس تحفظ اس بات کا تعین کرے گی کہ کوئی مخصوص صورت حال دنیا کے امن کے لئے خطرناک تو نہیں ہے۔ مجلس تحفظ امن کو قائم رکھنے کے لئے تمام ضروری کارروائی کر سکتی ہے۔ مجلس تحفظ اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کے لئے سیاسی اور معاشی اقدامات لے سکتی اور امن کو قائم رکھنے کے واسطے بری، بحری اور ہوائی فوجوں کو کام میں لا سکتی ہے۔ لیکن فوجی کارروائی اُسی وقت کی جا سکتی ہے جب پُرامن طریقے ناکامیاب یا ناکامیاب ثابت ہوں۔ مجلس تحفظ کی رائے کے بغیر نہ تو کسی ریاست کو بین الاقوامی تنظیم کا ممبر بنایا جا سکتا ہے نہ خارج کیا جا سکتا ہے اور نہ اُسے رکنیت کے حقوق سے محروم کیا جا سکتا ہے۔ بین الاقوامی امن و تحفظ سے متعلق کوئی خاص معاملہ اگر مجلس تحفظ کے زیر غور ہے تو عام اسمبلی اُس پر خود اپنی ایما سے خود مختارانہ رائے نہیں دے سکتی۔ اگر کوئی ایسا معاملہ ہے جس پر فوری قدم اُٹھانا ضروری ہے تو عام اسمبلی بحث مباحثہ کے بعد یا اُس سے پہلے اُس معاملے کو مجلس تحفظ کے سامنے پیش کرے گی۔

مجلس تحفظ کے تمام اہم فیصلوں میں پانچوں دائمی ممبروں کی



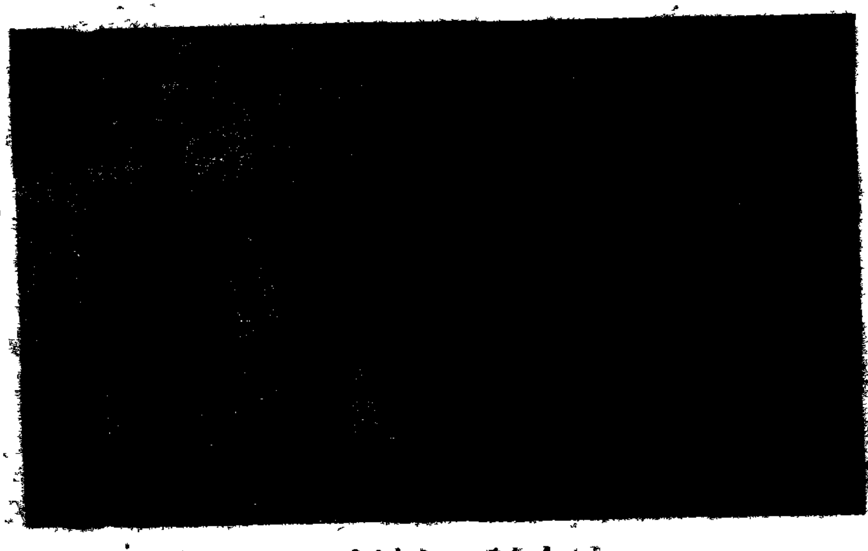
مہاتما گاندھی شملہ میں



شملہ سے لیڈروں کا الوداع



مسٹر جناح ' تارا سنگھ ، خضر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب کی ملاقات



مسلم لڑکی رضاکار شملہ میں

مقدر رائے کا موافق ہونا ضروری ہے۔ علاوہ بریں اسٹاف کمیٹی مجلس تحفظ کے تمام دائمی ممبروں کے چیف آف اسٹاف پر مشتمل ہوگی۔

کیا اس اسکیم کو اطمینان بخش قرار دیا جا سکتا ہے؟ اور کیا یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتی ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ابتدا ہی سے شریک رہنے اور سوویت یونین کا دنیا کی ایک زبردست طاقت کی حیثیت سے تسلیم کر لئے جانے کا مطلب ہے کہ یہ تنظیم گذشتہ جمعیتہ الاقوام کی بہ نسبت کہیں زیادہ مضبوط ہے۔ اور امن شکن طاقتوں کے ظلم و جور کا واقعی قلع قمع کیا جا سکتا ہے۔

یہ اسکیم جمعیتہ الاقوام کے دستور اساسی کی بہ نسبت اس معنی میں زیادہ حقیقت پسندی کی حامل ہے کہ اس کے تحت دنیا کے امن و تحفظ کو برقرار رکھنے کی ذمہ داری انھیں حکومتوں کے سپرد کی گئی ہے جو واقعی طاقتور ہیں۔ جمعیتہ الاقوام میں یہ ذمہ داری تمام ممبر ریاستوں میں تقسیم کر دی گئی تھی چنانچہ اس کا پورا کرنا غیر ممکن ہو گیا۔ مجلس تحفظ ایک چھوٹی سی مجلس ہے اور اُسی کے ہاتھوں میں امن تحفظ کو قائم رکھنے کی اوّلیں ذمہ داری دی گئی ہے۔

مجلس تحفظ کی اس طور پر تشکیل و تنظیم کی گئی ہے کہ اُس کے کام کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا اور وہ اس طرح کہ ممبر ریاست کا نمائندہ مستقل طور پر بین الاقوامی تنظیم کے ہیڈ کوارٹر میں موجود رہے گا۔ مجلس تحفظ کے فیصلوں کو طاقت بخشنے کے لیے ایسی نشستوں کا بھی انتظام کیا گیا ہے جو وقتاً فوقتاً ہوتی رہیں۔ ایسی نشستوں میں مجلس تحفظ میں شامل ہر ریاست اگر چاہے تو اپنی حکومت کا ایک نمائندہ بھیج سکتی ہے۔ اس اصول کی جتنی زیادہ پابندی کی جائے گی اتنا ہی اچھا ہوگا۔

پھر اس اسکیم میں یہ بات بھی واضح کر دی گئی ہے کہ امن شکن طاقت کے خلاف استعمال کرنے کے لئے مجلس تحفظ کن ذرائع سے اور کس وقت فوجی امداد حاصل کر سکتی ہے۔ باقاعدہ معاہدوں اور دراصل ناموں کے ذریعہ پہلے ہی سے طے پا چکا ہوگا کہ کون ریاست کتنی اور کس قسم کی فوجی یا غیر فوجی امداد مجلس تحفظ کو دے گی۔ یہ بات ظاہر ہے کہ موجودہ اسکیم کے تحت امن شکن طاقتوں کے خلاف جمعیتہ الاقوام کی بہ نسبت کہیں زیادہ آسانی فوری اور نتیجہ خیز طور پر طاقت کا استعمال ہو سکے گا۔ ہو سکتا ہے کوئی یہ کہے کہ عین موقع پر کوئی ریاست فوجی امداد دینے سے انکار کر دے تو ایسی حالت میں بین ...

تنظیم ناکامیاب رہتی ہے لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ کسی بین الاقوامی تنظیم کے لیے اس سے آگے جانا بھی تو غیر ممکن ہے۔ اس لئے کہ بین الاقوامی تنظیم کوئی سرپرست حکومت تو ہے نہیں کہ اس کے پاس اپنی پولیس اور اپنی فوج ہو۔ بین الاقوامی تنظیم میں جو ریاستیں شامل ہوں گی وہ ہرگز اس طور پر اپنی خود مختاری معرض خطر میں دیکھنا نہ پسند کریں گی۔

ووٹ دینے کا طریقہ

موجودہ پلان میں جو اصل خرابی ہے وہ ووٹ دینے کے طریقے میں ہے۔ ووٹ دینے کا طریقہ ایسا رکھا گیا ہے کہ چھوٹی چھوٹی قومیں اور وہ بڑی بڑی قومیں جو صنعتی اور فوجی اعتبار سے ابھی کمزور ہیں اور شکست خوردہ ملک یہ خیال کریں گے کہ بین الاقوامی تنظیم کے اثر اور طاقت کو دنیا کی طاقت ور فاتح قومیں نہ صرف بین الملی امن و تحفظ کو برقرار رکھنے بلکہ اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے بھی استعمال کریں گی۔ دنیا ہمیشہ ایک ہی مقام پر نہیں ٹھہری رہ سکتی لیکن وہ طاقتیں جن کے لئے موجودہ سیاسی توازن مفید ہے وہ ہمیشہ ہر قسم کی تبدیلی کی مخالفت کریں گی۔ اور تبدیلی چاہنے والی طاقتوں کو بزور بازو دبانے کی کوشش کریں گی۔ یہ یقیناً بے انصافی کے مرادف ہوگا۔ وہ لڑائی جو انصاف کے لئے لڑی جائے اُس امن سے بدرجہا بہتر ہے جس میں بے انصافی ہو۔

ڈمبرٹن اوکس کانفرنس میں ووٹ کا مسئلہ پھر کسی دوسرے موقعہ پر اٹھا رکھا گیا اس لئے کہ اس پر برطانیہ، روس اور امریکہ کے درمیان اہم اختلاف تھا۔ سوال یہ تھا کہ اگر کسی ریاست پر دباؤ ڈالنا ہو یا اُس کے خلاف فوجی کارروائی کرنی ہو تو کیا اُس کے لئے مجلس تحفظ کے تمام دائمی ممبروں کی متفقہ رضامندی ضروری ہے؟ کہا جاتا ہے کہ روس کا تو یہ بھی خیال تھا کہ کسی بھی دائمی ممبر کے متعلق مجلس تحفظ میں کوئی بھی سوال نہ اُٹھایا جائے جب تک خود وہ دائمی ممبر اس پر رضامند نہ ہو۔ ووٹ دینے کا جو طریقہ یالٹا میں طے پایا ہے وہ فاتح قوموں کی طرف سے اور بھی شکوک پیدا کرتا ہے۔

وہ طریقہ یہ ہے:۔

(۱) مجلس تحفظ کے ہر رکن کو صرف ایک ووٹ دینے کا حق حاصل ہوگا۔

(۲) مجلس تحفظ کے کام کرنے کے قاعدے اور ضابطے کیا ہوں گے ان معاملات پر سات ممبروں کا ... فیصلہ کے لئے ضروری سمجھی جائیگی۔

(۳) اس کے ... معاملات ہوں گے وہ سات ممبروں کی

اکثریت سے طے پائیں گے لیکن فرق یہ ہوگا کہ اس سات کی اکثریت میں پانچوں دائمی ممبروں کی موجودگی ضروری ہوگی۔ لیکن باب آٹھ سکشن "الف" اور باب آٹھ کے سکشن "ج" کے پہلے پارا کے دوسرے جملے کی رو سے اُس ریاست کو ووٹ دینے کا حق نہ حاصل ہوگا جو خود جھگڑے میں شامل ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر اُس معاملے میں جس میں امن شکن ریاست کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جا رہی ہے جھگڑے میں شامل ریاستوں کو ووٹ دینے کا حق نہ حاصل ہوگا چاہے وہ مجلس تحفظ کی دائمی رکن ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن فوجی کارروائی والے معاملوں میں یا ایسے معاملوں میں جس میں معاشی دباؤ ڈالنے کا سوال زیر بحث ہے مجلس تحفظ کے سات ممبروں کی اکثریت ضروری سمجھی جائے گی اور ساتھ ہی اُس اکثریت میں دائمی ممبروں کی موجودگی بھی لازمی ہوگی یعنی دائمی ممبروں میں سے اگر کسی نے خلاف ووٹ دیا تو فیصلہ رد ہو جائے گا۔

دو باتوں کی بنا پر اس تجویز کو صحیح سمجھا گیا ہے۔

ایک تو یہ کہ اس تجویز کی حیثیت ایک قسم کے سمجھوتے کی سی ہے۔ اگر روس کی پہلی تجویز مان لی جاتی تو اُس کی رو سے مجلس تحفظ کوئی ایسا سوال نہیں اُٹھا سکتی تھی جو کسی دائمی ممبر کی خواہش کے خلاف ہوتی۔ لیکن موجودہ تجویز کے تحت میں مجلس تحفظ کسی دائمی ممبر کی خواہش کے خلاف بھی ہر سوال اُٹھا سکتی ہے۔ مثلاً اگر برطانیہ نہ بھی چاہے تو بھی مجلس تحفظ فلسطین کے مسئلہ کو زیر بحث لا سکتی ہے۔

(۲) پھر دوسری بات یہ ہے کہ اگر اس کے علاوہ کوئی راستہ اختیار کیا جاتا تو وہ بہت زیادہ غیر عملی اور کتابی قسم کا ہو جاتا۔ کسی خاص مسئلہ پر اگر دنیا کی ان پانچ بڑی بڑی طاقتوں کا اتحاد ٹوٹ جاتا ہے تو بین الاقوامی تنظیم میں بھی بہرحال اختلاف پڑ جائے گا۔ اور اس میں شامل ریاستیں اپنی اپنی خواہش کے مطابق کسی نہ کسی طرف ہو جائیں گی۔ اس وقت سب سے ضروری یہ ہے کہ "اقوام متحدہ" کے اتحاد کو برقرار رکھا جائے اور اُسی اتحاد کی بنیاد پر پائیدار امن کی عمارت کھڑی کی جائے۔

لیکن بہت سی ایسی اہم باتیں ہیں جن کی بنا پر ووٹ دینے کے مجوزہ قاعدہ کو بدلنا ضروری ہے۔

(۱) چونکہ امن شکن ریاست کے خلاف اُس وقت تک کوئی جارحانہ کارروائی نہیں کی جا سکتی جب تک دنیا کی ان پانچوں بڑی بڑی طاقتوں کے

اتفاق رائے نہ ہو اس لئے مجلس تحفظ کسی معاملے پر بحث کرنے یا فیصلے دینے میں ہر قدم پر رکاوٹ اور دقت محسوس کرے گی۔

پھر ووٹ کا یہ طریقہ بڑی بڑی طاقتوں کو ہر معاملے میں بالکل بے لگام کر دیتا ہے۔ اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ اگر کوئی ریاست ان بڑی بڑی طاقتوں میں کسی کی دوست ہے تو وہ اس دوستی اور گہرے تعلقات کی بنا پر اپنے معاملہ میں اس بڑی طاقت کی رو سے مجلس تحفظ کا فیصلہ رد کرا سکتی ہے۔ یہ انصاف نہیں ہوا بلکہ اسے کہتے ہیں موقع محل دیکھ کر کوئی راستہ اختیار کر لینا چاہے وہ منصفانہ ہو یا غیر منصفانہ پھر موقع محل کی مناسبت سے کون سا راستہ صحیح ہے اس کا تعین بھی بڑی بڑی طاقتوں ہی کے اختیار میں ہوگا بلکہ جو سب سے بڑی طاقت ہے اس کے ہاتھوں میں۔

ووٹ دینے کے مجوزہ طریقہ کی حمایت میں یہ کہا جاتا ہے کہ اگر مجلس تحفظ کسی بڑی طاقت کی خواہش اور ووٹ کے خلاف اُس پر فوجی اور اور معاشی دباؤ ڈالتی ہے تو ان پانچوں بڑی بڑی طاقتوں میں آپس میں پھوٹ پڑ جاتی ہے اور بین الاقوامی تنظیم ناکامیاب ثابت ہوتی ہے اس طرح دنیا کے امن و امان کا مقصد پورا نہیں ہوتا اس لئے کسی بڑی طاقت پر اس کی خواہش اور ووٹ کے خلاف کارروائی کرنا ہی غلط ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ رائے عامہ اس دلیل کو تسلیم نہیں کر سکتی۔ اور رائے عامہ کی حمایت کے بغیر کوئی بین الاقوامی تنظیم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مجوزہ ووٹ دینے کا جو طریقہ ہے اُس میں حد سے زیادہ واقعیت پسندی سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن اس سے یہ شک قوی ہوتا ہے کہ یہ بڑی بڑی طاقتیں جس اصول پر کمزور قوموں سے عمل کرانا چاہتی ہیں خود اُس کے خلاف جاتی ہیں۔ اس لئے کہ ووٹ دینے کا جو طریقہ طے پایا ہے اُس کی رو سے اگر کوئی بڑی طاقت کسی جھگڑے میں شامل ہے تو دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں سب سے نازک موقع پر بین الاقوامی نظام کے حلقے سے باہر نکل آتی ہیں۔ بقول لارڈ ونسٹر اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے پریفکٹ صاحبان چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو تو قاعدوں پر عمل کرنے کیلئے مجبور کریں اور خود اُن قاعدوں کی گرفت سے نکل بھاگیں۔

...اس کے علاوہ یہ اسکیم جس بنیاد پر کھڑی کی گئی ہے اس کا تقاضہ ہے کہ
...یا کی بڑی بڑی طاقتوں کے درمیان مقصد کا اتحاد مسلسل طور پر قائم
...ہے۔ جہاں مقصد میں اختلاف پیدا ہوا اور بین الاقوامی تنظیم ختم ہوئی۔
...ڈمبرٹن اوکس کی تجویزوں کے ذریعہ انسانی تاریخ میں جو
...ہم تجربہ ہو رہا ہے اُس کے لحاظ سے اُس کی بنیاد کو دیکھا جائے
...وہ بہت کمزور نظر آتی ہے۔

عہد نپولین کی جنگوں کے ختم ہونے کے بعد روس، آسٹریا، پرشا
...بید جرمنی) اور برطانیہ میں جو مقصد کا اتفاق واتحاد قائم ہوا تو کنسرٹ
...یورپ (Concert of Europe) کی بنیاد پڑی۔
...س یہ مقصد کا اتحاد صرف سات سال تک قائم رہا اور اس کا نتیجہ
...ظاہر ہوا کہ کنسرٹ آف یورپ کا شیرازہ بکھر گیا۔ اسی طرح آج روس
...برطانیہ کے درمیان نظریہ اور اصول کا اختلاف موجود ہے چین
...طانیہ اور امریکہ کے معاشی مفاد ایک دوسرے سے ٹکر کھاتے ہیں۔
...آبادیات کے سلسلہ میں فرانس کا جو رویہ ہے امریکہ اُس سے متفق
...ں۔ اس قدر ناپائدار بنیاد پر اتنی عظیم عمارت تعمیر کرنے سے بہتر ہے
...برطانیہ اور امریکہ کے اس خیال کو عملی جامہ پہنایا جائے کہ جب بڑی
...قتوں میں سے کوئی طاقت کسی بین الاقوامی جھگڑے میں شامل ہو تو
...ں جھگڑے میں اُس مخصوص طاقت کا ووٹ نہ شمار کیا جائے۔
...مبرٹن اوکس کانفرنس میں برطانیہ اور امریکہ نے اسی بات پر زور
...تھا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ کئی بڑی بڑی طاقتیں ایسی ہیں جو اس پر
...رضامند نہیں ہو سکتیں تو اُس کا جواب یہ ہے کہ اتنی ناپائدار بنیاد پر
...بین الاقوامی تنظیم قائم کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ یکسر سے
...قائم ہی نہ کی جائے۔

مجلس تحفظ کی تشکیل وتنظیم

مجلس تحفظ کو زیادہ صحیح اصول پر قائم کرنے کے لئے اس کی
...تشکیل وتنظیم میں کچھ رد و بدل کی ضرورت ہے۔ مجلس تحفظ کی جو
...موجودہ ترکیب ہے اُسے دیکھ کر واقعی یہ سمجھنا مشکل ہے کہ آخر
...کن اصول کے تحت اُسے یہ شکل دی گئی ہے۔ اگر آبادی کے
...لحاظ سے دیکھا جائے تو برطانیہ اور فرانس کو مجلس تحفظ میں بالکل جگہ

نہیں ملنی چاہئے تھی۔ لیکن ہندوستان کو اس میں ہونے کا پورا حق تھا۔ جہاں تک دولت اور اقتصادی ذرائع کا سوال ہے فرانس کو رکنیت نہیں ملنی چاہئے تھی لیکن ہندوستان کو ملنی چاہئے تھی۔ اگر لڑنے کی صلاحیت اور طاقت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو موجودہ جنگ میں جن قوموں کی جنگی صلاحیت کمزور ثابت ہو چکی ہے انھیں مجلس تحفظ کا رکن بننے کا حق نہیں حاصل تھا مثلاً چین اور فرانس حقیقت تو یہ ہے کہ مجلس تحفظ میں فرانس اور چین کا شامل کیا جانا گویا اس بات کا ثبوت ہے کہ محض موقع محل دیکھ کر مجلس تحفظ کی ترکیب تشکیل کی گئی ہے اور کسی منصفانہ اصول کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔ فرانس کو اس لئے شامل کیا گیا ہے تاکہ اگر جرمنی پھر سر اٹھائے تو اُس کے خلاف دیوار قائم کی جا سکے۔ چین کو اس لئے مجلس تحفظ کی رکنیت دی گئی تاکہ امریکہ اُسے جاپان کے خلاف استعمال کر سکے۔

رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے چین سے ہندوستان کا موازنہ غلط نہیں۔ حکومت و انتظام امن و امان کے اور جنگی صلاحیت کے نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو ہندوستان کا ریکارڈ چین سے بہتر رہا ہے۔ قدرتی ذرائع سلسلہ رسل و رسائل و آمد و رفت کی ترقی اور موجودہ صنعتوں کے اعتبار سے ہندوستان چین سے آگے ہے۔ ممکن ہے ہندوستان کو اس لئے دائمی رکنیت نہیں دی گئی کہ آزاد نہیں ہونے کی وجہ سے اُس کا ووٹ گویا برطانیہ کا محکوم ووٹ ہوتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ حالات کے اندر ہندوستان کو مجلس تحفظ کی رکنیت کی پرواہ نہیں ہے لیکن جب ہندوستان آزاد ہو جائے گا تو محض اُس کو اس بنا پر رکنیت کا نہ دیا جانا غلط ہوگا کہ وہ اُس وقت ایک بڑی طاقت کی حیثیت میں نہیں تھا جب بین الاقوامی تنظیم قائم کی گئی تھی۔ دائمی ممبروں کی فہرست میں آئندہ خاص خاص عرصے کے بعد رد و بدل کرتے رہنا قطعی ضروری ہوگا۔

نہ صرف یہ کہ مجلس تحفظ کی زیادہ اصولی بنیادوں پر تشکیل کرنے کی ضرورت ہے بلکہ مجلس تحفظ کو اُن خاص خاص حفاظتی علاقوں سے ملحق و متحد کرنے کی ضرورت ہے جن کا تذکرہ ڈمبرٹن اوکس کی تجویزوں میں آیا ہے لیکن ڈمبرٹن اوکس کی تجویزوں میں ان حفاظتی علاقوں کی بین الاقوامی تنظیم سے گہرے طور پر متحد و ملحق نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ

یہ ہے کہ ابھی تک خاص خاص حفاظتی علاقوں کی تقسیم و تشکیل ہی عمل میں نہیں آئی ہے۔ لیکن اگر حفاظتی علاقوں کو واقعی ضروری سمجھا جاتا ہے تو اس کو مرکزی بین الاقوامی تنظیم سے ملحق کر دینا یقیناً بہتر ہوگا۔ اگر یہ اسکیم باقاعدہ طور پر منظور کر لی جائے تو اس سے کم سے کم یہ ہوگا کہ حفاظتی علاقوں کی جلد تقسیم کر دی جائے گی۔ ہندوستان چونکہ بحر ہند کے علاقہ میں بہت اہم جگہ پر واقع ہے اس لئے ہندوستان کو اس قسم کی اسکیم سے فطری طور پر گہرا لگاؤ ہے۔

مشرق وسطی اور مشرق بعید میں ہندوستان کے جائے وقوع کی اہمیت اور قدر و قیمت موجودہ جنگ میں ثابت ہو چکی ہے۔ غرضکہ ہر لحاظ سے ــــ جنگی صلاحیت، اقتصادی ذرائع، انسانی طاقت، جائے وقوع ــــ ہر لحاظ سے دیکھا جائے تو مجلس تحفظ میں سوویت یونین، ریاستہائے متحدہ امریکہ اور برطانیہ کے علاوہ مغربی یورپ، علاقہ بحیرۂ روم، مشرق وسطی، علاقہ بحر ہند، علاقہ بحر اوقیانوس اور لاطینی امریکہ کی ایک ایک نمائندہ ریاست کو شامل کرنا بھی ضروری تھا۔

دیگر ضروری ردّ و بدل

ڈمبرٹن اوکس کی تفصیلات میں بھی تین مزید تبدیلیاں مفید ثابت ہوں گی:-

(۱) باب ۲ کے پہلے نکتے میں: مجوزہ بین الاقوامی تنظیم کی بنیاد تمام امن پسند ریاستوں کی کامل خود مختاری اور برابری پر رکھی گئی ہے لیکن دراصل اس کی قطعی کوئی ضرورت نہ تھی بلکہ اس کا ہٹا نا ضروری ہے۔ ڈمبرٹن اوکس کی تجویزوں کے پیش نظر جس قسم کی بین الاقوامی تنظیم ہے اس کے ہوتے ہوئے ریاستوں کی مکمل خود مختاری بے معنی چیز ہے اس قسم کی تنظیم کا مطلب ہی یہی ہے کہ آخر میں ریاستیں ایک بین الاقوامی تنظیم کے فیصلے کو ماننے پر مجبور کر دی جائیں گی ــــ ایسی بین الاقوامی تنظیم جس میں ہر ممبر ریاست کی کچھ آواز تو ہوگی لیکن فیصلے کے تمام تر اختیارات اس کے ہاتھوں میں نہ ہوں گے۔ پھر تمام ریاستوں کے مساوی حیثیت کے مالک ہونے کا تذکرہ بھی بے معنی ہے تمام حکومتیں نہ تو کبھی مساوی حیثیت کی مالک رہی ہیں اور نہ آئندہ ہوں گی۔ اس کے علاوہ جس بین الاقوامی تنظیم کا خاکہ ان تجویزوں میں کھینچا گیا ہے وہ خود بھی مساوات کے اصول پر نہیں قائم ہے۔ اوپر جس قدر ردّ و بدل کا تذکرہ کیا گیا ہے اگر وہ سب کر دیا گیا تو بھی حقیقی برابری نہیں قائم ہو سکتی ہے۔

(۲) ڈمبرٹن اوکس کی تجویزوں میں ایک نکتے کا اور اضافہ کر دینا ضروری ہے جس کی نوعیت وہی ہے جو جمعیتہ الاقوام کے دستور کی انیسویں نکتے کی ہے۔ یعنی جمعیتہ الاقوام کے دستور اساسی میں یہ بات درج تھی کہ اسمبلی وقتاً فوقتاً جمعیتہ الاقوام کے ممبروں کو ایسے معاہدوں پر دوبارہ غور و خوض کرنے کی رائے دے گی جو ناقابل عمل ہو چکے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جمعیتہ الاقوام میں یہ نکتہ زیادہ عمل میں نہیں آیا لیکن یہ اس قابل ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔

(۳) تیسری بات کا تعلق اس نئی بین الاقوامی تنظیم کے نام سے ہے۔ عارضی طور پر یہ نام نامناسب نہ ہوگا۔ خاص طور پر اس لئے کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ جو قومیں فتح حاصل کرنے کے لئے متحدہ طور پر جنگ آزما ہیں وہ امن و امان کی تعمیر میں بھی تعاون اور اشتراک عمل سے کام لیں گے لیکن جو نام دائمی طور پر چنا جائے اس سے موجودہ جنگ کی یاد نہیں تازہ ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ شکست خوردہ اور مفتوح قوموں کو یہ احساس ہونے لگے گا کہ یہ موجودہ بین الملی تنظیم انتقام کے جذبے کے تحت قائم کی گئی تھی۔

شملہ کانفرنس

وائسرائے ہند کا اعلان

ہز ایکسی لینسی وائسرائے لارڈ ویول نے ۱۴ جون کی شام کو نئی دہلی سے اپنی نشریاتی تقریر میں ہندوستان کے متعلق اپنی تجاویز کا اعلان کیا جن کا شدید بے چینی سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ انھوں نے کہا:- مجھے ملک معظم کی حکومت کی طرف سے اس بات کا اختیار ملا ہے کہ میں ہندوستانی لیڈروں کے روبرو ان تجاویز کو پیش کروں جن کا منشا یہ ہے کہ موجودہ سیاسی صورت حالات کو بہتر بنایا جائے اور ہندوستان کو مکمل خود اختیاری کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے آگے بڑھنے کا موقع دیا جائے۔ ان تجاویز کی تشریح اسی وقت مسٹر ایمری وزیر ہند نے پارلیمنٹ میں کی ہے۔ اس نشریہ سے میرا مقصد یہ ہے کہ میں آپ کے سامنے ان تجاویز کو رکھوں اور ان کے مقاصد کی تشریح کروں اور بتاؤں کہ میں انھیں کس طریقہ پر عملی صورت میں لانا چاہتا ہوں۔ یہ دستوری معاہدہ حاصل کرنے یا ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی ہے ملک معظم کی حکومت کو امید تھی کہ ہندوستانی جماعتوں کے لیڈر آپس میں مل کر فرقہ وارانہ مسئلہ حل کریں گے جو ہماری راہ میں ایک خاص رکاوٹ ہے لیکن افسوس یہ امید نہ پوری ہو سکی۔

اس اثنا میں ہندوستان کو بہت سے مواقع حاصل ہو گئے ہیں اور بہت سے ایسے بڑے مسئلے پیدا ہو گئے ہیں جن کا حل ضروری ہے اس لئے ملک معظم کی پوری حمایت کے ساتھ میں مرکزی اور صوبائی دونوں جگہ کے سیاسی لیڈروں کی ایک کانفرنس بلا رہا ہوں تاکہ ایسی نئی اگزیکیٹو کونسل کا قیام عمل میں آسکے جس میں منظم سیاسی رائے عامہ کی زیادہ نمائندگی ہو نئی مجوزہ کونسل میں خاص خاص فرقوں کی نمائندگی ہو گی۔ اور اس میں اونچی ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد مساوی ہو گی۔ اگر کونسل کی تشکیل عمل میں آگئی تو یہ موجودہ آئین کے تحت کام کرے گی۔ یہ کونسل خالصتاً ہندوستانی کونسل ہو گی۔ اور اس میں وائسرائے اور کمانڈر انچیف کے علاوہ سب ممبر ہندوستانی ہونگے۔ کمانڈر انچیف کی پوزیشن ممبر جنگ جیسی ہو گی۔ یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ معاملات خارجہ سے متعلق محکمہ جو اب تک وائسرائے کے ہاتھ میں تھا...... کسی ہندوستانی ممبر کو جہاں تک اس کا برطانوی ہند سے تعلق ہے سپرد کر دیا جائے گا۔

برطانوی ہائی کمشنر

ملک معظم کی حکومت کی ایک اور تجویز ہے اور وہ یہ کہ دوسری نو آبادیوں کی طرح ہندوستان میں بھی ایک برطانوی ہائی کمشنر مقرر کیا جائیگا جو ہندوستان میں برطانیہ عظمیٰ کے تجارتی اور دوسرے اسی قسم کے مفادات کی نگرانی کرے گا۔ آپ محسوس کریں گے کہ اس قسم کی ایگزیکیٹو کونسل کے معنی یہ ہیں کہ حکومت خود اختیاری کی طرف ایک واضح قدم اٹھایا گیا ہے۔ یہ ایک خالص ہندوستانی کونسل ہو گی اور پہلی بار مالیات اور داخلی معاملات کے ممبر ہندوستانی ہونگے ہندوستان کے معاملات خارجہ بھی کسی ہندوستانی ممبر ہی کو سپرد کئے جائیں گے مزید برآں ممبران کا انتخاب سیاسی لیڈروں کے مشورے سے خود گورنر جنرل کریگے اور ان کی نامزدگی بادشاہ سلامت کی منظوری سے ہو گی۔

کونسل موجودہ آئین کے تحت کام کرے گی اس لئے اس بات کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا کہ گورنر جنرل اپنے آئینی اختیارات کو استعمال نہ کریں گے البتہ ان کا استعمال حقیقتاً غیر مناسب نہیں ہو گا۔

• میں اس امر کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ حکومت کے اس عارضی انتظام سے آخری آئینی سمجھوتہ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

نئی ایگزیکیٹو کونسل کے کام

نئی ایگزیکیٹو کونسل کے حسب ذیل کام ہوں گے۔

اول۔ جب تک جاپان کو قطعی طور پر شکست نہ دیدی جائے اس کے خلاف جنگ کو پوری طاقت سے چلایا جائے گا۔

دوم۔ برطانوی ہند میں مابعد جنگ ترقیات کے جو گوناگوں کام اسکے سامنے ہوں گے انھیں اپنی پوری قوت کے ساتھ اس وقت تک پورا کرے گی جب تک کہ کوئی مستقل آئین پر اتفاق ہو اور وہ نافذ العمل ہو جائے۔

سوم۔ جب حکومت کے ممبر ممکن سمجھیں گے ان ذرائع پر غور کریں گے جن کے ذریعہ اس قسم کا سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔ یہ تیسرا کام بہت اہم ہے۔

میں صاف طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ تو میں کبھی ایک مستقل حل سے غافل رہا اور نہ ملک معظم کی حکومت، موجودہ تجاویز کا مقصد یہی ہے کہ ایک مستقل سمجھوتہ کی راہ کو آسان کر دیا جائے۔

نئی کونسل کو ایک اچھے ڈھنگ سے قائم کرنے کے لئے میں نے حسب ذیل حضرات کو وائسرائے محل میں مدعو کیا ہے جو مجھے اس سلسلے میں مشورہ دیں گے۔

صوبائی وزرائے اعظم یا ان صوبوں کے سابق وزرائے اعظم جہاں اسوقت دفعہ ۹۳ کے تحت حکومتیں قائم ہیں۔

لیڈر کانگرس پارٹی اور مرکزی اسمبلی میں ڈپٹی لیڈر مسلم لیگ پارٹی کونسل آف اسٹیٹ میں کانگریس اور مسلم لیگ پارٹیوں کے لیڈر۔ اسمبلی میں نیشنلسٹ پارٹی اور یوروپین گروپ پارٹی کے لیڈر بھی مدعو کئے جائینگے۔ مسٹر گاندھی اور مسٹر جناح چونکہ خاص سیاسی جماعتوں کے مسلمہ لیڈر ہیں اس لئے انھیں بھی مدعو کیا جائیگا۔ راؤبہادر این شیوراج اچھوتوں کے اور ماسٹر تارا سنگھ سکھوں کی نمائندگی کریں گے۔

آج ان حضرات کو دعوت نامے بھیج دئے گئے ہیں، تجویز کیا گیا ہے کہ یہ کانفرنس آئندہ ۲۵ جون کو شملہ میں منعقد ہوگی۔ جہاں دہلی کے مقابلہ میں ہم ٹھنڈ میں رہیں گے۔

مجھے بھروسہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس دعوت نامے بھیجے گئے ہیں وہ اس کانفرنس میں شریک ہوں گے۔ ہندوستان کے مستقبل کے آخری سمجھوتہ کی طرف قدم بڑھانے کی اس نئی کوشش میں مجھ پر اور ان پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اگر یہ کانفرنس کامیاب ہوگئی تو مجھے امید ہے کہ ہم مرکز میں ایک نئی اگزیکٹیو کونسل بنانے میں رضامند ہو سکیں گے۔

مجھے یہ بھی امید ہے کہ صوبوں میں دوبارہ وزارتیں بن سکیں گی اور وہ صوبوں کے اس نظم و نسق کو جواب دفعہ ۹۳ کے تحت چل رہا ہے۔ پھر سے سنبھال سکیں گی یہ وزارتیں مخلوط وزارتیں ہوں گی۔

لیکن اگر بدقسمتی سے یہ کانفرنس ناکام ہوگئی تو پھر جس طرح اب کام چل رہا ہے ہم اسی طرح اس وقت تک چلاتے رہیں گے۔ جب تک کہ مختلف جماعتیں متحد نہ ہو جائیں اگر نئے سرے انتظامات پر اتفاق نہ ہوگا تو موجودہ اگزیکٹیو کونسل جس نے ہندوستان کا بہت کچھ کام کیا ہے برابر قائم رہے گی۔ لیکن مجھے پوری امید ہے کہ اگر پارٹی لیڈر میرے ساتھ اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ نیک ارادہ سے کام کرنے کے لئے جمع ہوئے تو یہ کانفرنس ضرور کامیاب ہو جائے گی۔

میں ان کو یقین دلا سکتا ہوں کہ اس تجویز کو سلطنت متحدہ کے تمام ذمہ دار لیڈروں اور پوری برطانوی قوم کی خواہشات موجود ہیں جو ہندوستان کو ان کے مقصد کی اصول میں امداد کرنا چاہتے ہیں میں یقین کرتا ہوں کہ یہ اس مقصد کی حصول کی طرف قدم اٹھانے سے زیادہ یوں کہئے کہ ایک دوڑ ہے ایک صحیح راستہ کی طرف دوڑ۔

مجھے یہ چیز صاف کر دینی چاہئے کہ ان تجاویز کا اثر محض برطانی ہند پر پڑے گا اور ان سے نمائندہ تاج کے والیان ریاست کے تعلقات میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہوگی۔

ملک معظم کی حکومت کی منظوری اور اپنی کونسل سے مشورے کانگرس ورکنگ کمیٹی کے ایسے ممبران کی فوری رہائی کے احکام جاری کر دئے گئے ہیں جو ابھی تک نظر بند ہیں اور ان اشخاص کے انتظامی فیصلے کو جو ۱۹۴۲ء کے ہنگاموں کے سلسلہ میں نظر بند ہیں نئی مرکزی حکومت (بشرطیکہ وہ قائم ہوگی) اور صوبجاتی حکومتوں پر چھوڑتا ہوں۔

نئے عام انتخابات کا مسئلہ

مرکزی اور صوبجاتی اسمبلیوں کے نئے انتخابات کے مناسب وقت کے مسئلہ پر بھی کانفرنس میں بحث ہوگی۔

آخر میں اُس سے خوشدلی اور باہمی اعتماد کی فضا پیدا کرنے کے سلسلہ میں امداد کرنے کے لئے کہتا ہوں۔ کیونکہ اگر ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں تو یہ چیز بہت ضروری ہے اس عظیم الشان ملک اور ان کروڑوں باشندوں کی قسمت کا انحصار جو اس میں بستے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ کے اس نازک موقعہ پر برطانی اور ہندوستانی لیڈروں کے عمل اور خیالات کی عقلمندی اور سوجھ بوجھ پر ہے۔

ہندوستان کی فوجی شہرت دنیا میں اسقدر کبھی نہیں ہوئی جسقدر کہ آج ہو رہی ہے، اس ملک کے ان سپوتوں کے کارناموں کو جو ہر حصے سے شامل ہوئے بین الاقوامی کانفرنس کے اندر اس ملک کے نمائندوں نے اپنے تدبر، سیاسی طرز عمل کی بدولت کافی شہرت حاصل کر لی ہے۔ ہندوستان کی خواہشات اور خوشحالی کی جانب ترقی کی بابت اسقدر عالمگیر طریقہ پر کبھی ہمدردی پیدا نہیں ہوئی ہے جیسی کہ آج ہے۔ اگر ہم ان کو عقلمندی کے ساتھ کام میں لائیں

تو یہ میرے لئے باعث فخر ہے مگر یہ آسان کام نہیں ہے اور نہ ہی جلد بازی سے کام چلے گا ابھی بہت کام کرنا ہے اور ہماری راہ میں بہت سی دشواریاں اور خطرات ہیں۔ ہر پہلو سے ہم کو بعض بعض باتوں سے درگزر کرنا پڑے گا بعد ازاں کرنا ہوگا۔

مجھے ہندوستان کے مستقبل پر بھروسہ ہے اور جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں اسکی عظمت کے بڑھانے میں دریغ نہ کروں گا۔ میں آپ سب سے تعاون اور نیک خواہشات کا متمنی ہوں۔

لارڈ ویول کی تجاویز ایک نظر میں

(۱) نئی ایگزیکٹو کونسل کے تمام ممبر سوائے وائسرائے اور کمانڈر انچیف کے ہندوستانی ہوں گے اور ہوم ممبر اور فنانس ممبر بھی ہندوستانی ہوگا۔

(۲) ہندوؤں اور مسلمانوں کی نمائندگی مساوی ہوگی۔

(۳) گورنر جنرل کے اختیارات برقرار رہیں گے مگر معقولیت سے استعمال کئے جائیں گے۔

(۴) مستقل دستوری مفاہمت کے لئے راستہ کھلا رہے گا۔

(۵) نئی کونسل کو جاپان کے خلاف جنگ لڑنی پڑے گی۔

(۶) یہ کونسل اس وقت تک حکومت کرتی رہے گی جب تک کہ نئے دستور کے مطابق سمجھوتہ نہ ہو جائے۔

(۷) آئندہ کے لئے سمجھوتہ اسی حکومت کے ماتحت ہوگا۔

(۸) اس کونسل کے انتخاب کا مشورہ لیڈروں کی ایک کانفرنس وائسرائے کو دے گی۔ یہ کانفرنس ۲۵ ؍جون کو شملہ میں منعقد ہوگی۔

(۹) کانفرنس کے شرکا کی تعداد ۲۱ ہوگی۔ جن میں سے ۹ کانگریسی ۸ لیگی ایک ہندو نیشنلسٹ، ایک سکھ، ایک یوروپین، ایک یونینسٹ ایک اچھوت ایک زمیندار شامل ہوگا۔

(۱۰) کانفرنس کی کامیابی کے بعد صوبوں میں وزارتیں قائم ہو جائیں گی۔ یہ وزارتیں مخلوط ہونی چاہئیں۔

(۱۱) کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر ۱۵ ؍جون کی صبح کو رہا کر دئے جائینگے۔

(۱۲) باقی نظربندوں کے متعلق نئی مجوزہ ایگزیکٹو کونسل فیصلہ کرے گی۔

کانفرنس میں اس پر بھی بحث ہوگی کہ آئندہ انتخابات کب ہوں۔

مسٹر ایمری سابق وزیرِ ہند کی تقریر

۱۸ جون کو سابق وزیرِ ہند مسٹر ایمری نے دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مارچ ۱۹۴۲ء کی پیشکش بدستور قائم ہے اس پیشکش کی بنیاد ان دو بڑے اصولوں پر رکھی گئی ہے اوّل یہ کہ ہندوستان کو برٹش کامن ویلتھ میں ایک آزاد شریک کی حیثیت سے یا اس سے باہر رہ کر آزادی حاصل کرنے کے بارے میں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے کوئی حدود قائم نہیں کی گئی۔

دوم یہ کہ یہ چیز صرف ایک ایسے دستور کے تحت حاصل کی جاسکتی ہے جسے خود ہندوستانیوں نے بنایا ہو اور جسے ملک کی تمام بڑی جماعتوں کی منظوری حاصل ہو۔ وزیرِ اعظم کے الفاظ میں یہ اصول بغیر کسی قطع و برید کے اپنی اسی حالت میں قائم ہوں۔ ان میں کوئی شخص کسی قسم کا اضافہ نہیں کرسکتا اور کوئی شخص اس میں سے کچھ نکال نہیں سکتا۔

یہ نہ صرف ہمارے وفادارانہ مقصد کا اقرار ہے بلکہ ہندوستان کی صورتِ حال کے ناگزیر حقائق کا اقرار ہے۔

ہم ہندوستان کی حکومت کو اپنا کنٹرول صرف ایسی ہندوستانی حکومت یا حکومتوں کے حوالے کرسکتے ہیں جو اسکی اہلیت رکھتی ہوں۔

ہم ہندوستان کو خانہ جنگی یا طوائف الملوکی کے حوالے نہیں کرسکتے ہندوستان کے باشندوں کی جانب سے جو ذمہ داری ہم پر عاید ہوتی ہے وہ اور خود دنیا میں امن کے قیام کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم ایسا نہ کریں۔ برخلاف اس کے ہم ہندوستان پر کوئی ایسا دستور بھی عائد نہیں کرسکتے۔ جو وہاں سے ہمارے اختیارات اٹھ جانے کے فوراً ہی بعد ٹوٹ جائے۔

مسٹر ایمری نے کہا کہ ابھی تک اس سلسلہ میں کوئی کامیابی نصیب نہیں ہوسکی۔ اور ہندوستان میں جمود بدستور باقی ہے۔ ہندوستانی لیڈروں کی کسی مشترکہ تجویز پر متفق ہونے میں ناکامی ہے ہمیں غیر مناسب طور پر بے صبری کا اظہار کرنا چاہئے۔

مسائل متنازعہ بہت اہم ہیں اور ان معاملات کے حل کرنے کے طریقوں میں اختلافات کی بنیاد انتہائی مخلصانہ مگر مضبوط عقائد ہیں۔

مسٹر ایمری نے کہا کہ ہندوستانی مسئلہ کا صحیح حل قریب ہے اور ملک معظم کی حکومت اس مقصد کے حصول کے لئے ہمہ وقت اور ہر قسم کی امداد کرنے کو تیار ہے۔ لیکن اس اثنار میں ہندوستان ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتا۔ جاپان کے خلاف جنگی مساعی کے علاوہ تعمیرِ جدید کا زبردست کام بھی ہندوستان کے سامنے ہے جو اگرچہ سست رفتار سیاسی سمجھوتوں کا انتظار نہیں کرسکتا۔ لیکن اس کے علاوہ ہندوستان کے ہر طبقہ اور فرقہ کے اتحاد کا مکمل تعاون نہایت ضروری ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ہندوستان کے سیاسی میدان میں کوئی حقیقی ترقی نہیں کی جاسکتی اور جب تک کہ ملک کی منظم سیاسی جماعتوں کو وہاں کی حکومت کو زیادہ موثر اور قریبی اشتراکِ عمل حاصل نہیں ہوتا۔

موجودہ نازک صورتِ حال کے پیش نظر یہ صرف ایک عارضی بنیاد پر ممکن ہوسکتا ہے اور یہ آخری دستوری تصفیہ پر کسی طرح اثرانداز ہونا چاہئے ہمارا جو تخیل ہمیشہ سے اس بارے میں رہا ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ایک ایسی متحدہ حکومت قائم کی جائے جس میں ریاستیں بھی اپنا پورا پورا حق ادا کرسکیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم نے اس امر کا اعلان بھی ظاہر کردیا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک متحدہ ہندوستانی حکومت کے قیام کے بارے میں کوئی سمجھوتہ ہو ہی نہ سکے۔

اسلئے کوئی بھی عارضی اقدام ایسا نہ ہونا چاہئے جسکا ہندوستان کے مستقبل کے دستور پر کوئی اثر پڑتا ہو یا جس سے متحدہ ہندوستان یا منقسم ہندوستان یا ریاستوں کے مستقبل کے بارے میں انکی آزادی پر کسی طرح اثرانداز ہوتا ہو۔

اسکا یہ مطلب ہے کہ یہ اقدام موجودہ دستور ہی کے تحت ہونا چاہئے کیونکہ اس دستور میں کسی بھی تبدیلی سے ایک یا دوسرے نقطۂ نظر کو ترجیح

ضمون پہونچنے کا اندیشہ ہے۔ اسلئے ہمارا پارلیمانی نظریہ کے مطابق
رکٹو کونسل کو اسمبلی کے ذریعے ذمہ دار قرار دئے جاتے ہیں۔ سوال ہی
دا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس سے مسلمانوں میں فوراً یہ خیال پیدا ہوگا کہ مرکز میں
ب ایسی متحدہ حکومت قائم کیجارہی ہے جسمیں ہندوؤں کی اکثریت ہوگی۔
رنہ ہی گورنر جنرل کے موجودہ اختیارات خصوصی کے سلب کئے جانے
وئی سوال پیدا ہوتا ہے جنکے ذریعے وہ اپنی کونسل کے فیصلے کو مسترد
ا ہے۔ اگروہ بدفاع ہند کی حفاظت امن اور امان و مفاد کے لئے مفر
۔ اور نہ ہی گورنر جنرل کی وزیر ہند اور پارلیمنٹ کی ذمہ داری ختم کیجا سکتی
ہے۔ یہ اختیارات ہمیشہ اور عام طور پر استعمال کرنے کے لئے نہیں ہوتے
محفوظ کے طور پر ہوتے ہیں۔

اس لئے جب تک کوئی ایسا دستور اساسی مرتب نہیں ہوجاتا جسکے
ت متنازعہ فیہ مسائل کا تصفیہ کیا جا سکے یہ طاقت اقلیتوں کے لئے
ی تمام معاملات میں ایک ضروری تحفظ کا کام دیگی۔ جن کے ذریعے ان کو
ئی فوری نقصان پہونچتا ہو یا مستقبل میں دستور کی ترقی پر کوئی اثر پڑتا
یہ طاقت بہرحال ایک ایسی طاقت ہے جسے صرف ہندوستانیوں کے
ادکی حفاظت کے لئے استعمال کیا جائے گا۔

اور موجودہ دستوری حالات کے مطابق یہی ذمہ داریاں وائسرائے
ہندوستانی ریاستوں کی طرف سے عائد ہوتی ہیں تاکہ ان وعدوں کو
کیا جاسکے جو ان ریاستوں سے کئے ہوئے ہیں۔

ہندوستان میں برطانوی ہائی کمشنر کا تقرر

مسٹر ایمری نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ وائسرائے
پوزیشن کے اس پہلو پر زور دینے کے لئے اور عملی سہولتوں کے حصول
لئے ان تجاویز کے سلسلہ میں ملک معظم کی حکومت نے ہندوستان میں
۔ برطانوی ہائی کمشنر کے تقرر کا فیصلہ کرلیا ہے جو ہندوستان میں برطانیہ
بعض خاص مفادات کی نمائندگی کریگا۔

موجودہ حالات کے تحت اس امر کا بہت امکان ہے کہ وائسرائے کو
نسل میں بعض خاص موقعوں پر ایسے پریشان کن معاملات کا سامنا کرنا
ے جس میں اسے جہاں چند خاص برطانوی مفادات کی نمائندگی کرنے
ے گی وہاں اسے ہندوستانی حکومت کے رکن اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے
ہندوستانی مفاد کی حفاظت بھی کرنا ہوگی۔ اسلئے برطانوی ہائی
کمشنر اس معاملے میں بالکل آزاد ہوگا اور دیگر نوآبادیات کیطرح ہندوستان
سے بھی مکمل مساوات کی بناپر بے لاگ طور پر گفت و شنید کرسکے گا۔

مسٹر ایمری نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ انھوں نے تمام
متعلقہ صورت حالات کا اچھی طرح تجزیہ کرلیا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا
ہے کہ صرف اسی طریقہ پر عمل پیرا ہوکر کسی قسم کی کامیابی حاصل کی جاسکتی
ہے۔ مسٹر ایمری نے گذشتہ پانچ سالوں میں وائسرائے کی کونسل کی بدلی
ہوئی تشکیل کا ذکر کیا اور وائسرائے کی کونسل کے موجودہ ممبروں کو خراج
تحسین ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ وہ ہندوستانی ہیں جنھوں نے ہندوستان
کی پبلک زندگی میں عملی طور پر ممتاز حصہ لیا ہے۔ انھوں نے وائسرائے
کی دعوتِ اشتراک پر لبیک کہا کیونکہ محب وطن ہونے کے ساتھ ساتھ وہ
عملی انسان بھی تھے اور ان کو اس امر کا یقین تھا کہ وہ ذمہ داری قبول
کرنے کے بعد ملک کی اس سے زیادہ خدمت کرسکیں گے۔ جتنی ذمہ داری
سے بچنے کے بعد۔ انھوں نے ہندوستان کی بہت اچھی طرح خدمت کی
ہے اور ان کی اس خدمت کی قدر و قیمت کا ایک نہ ایک دن اچھی طرح
اندازہ کیا جائیگا۔ لیکن بدقسمتی سے یہ تسلیم کرنا پڑے گا اور سب سے
پہلے وائسرائے کی کونسل کے موجودہ ممبر اس کو تسلیم کریں گے کہ ان کی
پوزیشن اس وجہ سے کمزور ہوگئی ہے کہ انھیں ملک کی بڑی اور منظم
سیاسی جماعتوں کی حمایت حاصل نہیں اور نہ تو اسمبلی میں اور نہ ہی پریس
میں ان کے ساتھ کسی قسم کے تعاون نیک خواہشات یا ہمدردی کا اظہار
کیا جاتا ہے۔ حالانکہ تعمیر جدید کے ضروری اور فوری کام کی تکمیل کے لئے
ان عناصر کا ہونا بہت ضروری ہے اور اس کام کے لئے اس سے زیادہ
بہتر کیا ہوسکتا ہے کہ ان سیاسی جماعتوں کے لیڈران سیاسی تعصبات کو
بالائے طاق رکھ کر جس نے ان کو اب تک ایک دوسرے سے جدا کیا ہوا
تھا ایک ایسی نئی اگزکٹو کونسل کے قیام میں مدد کریں جو ہندوستانی
سیاسی زندگی سے تعلق رکھنے والے لیڈروں پر مشتمل ہو خواہ یہ لیڈر
صوبجاتی ہوں یا ملکی۔

اگر ملک معظم کی حکومت کی یہ پیشکش منظور کرلی گئی تو تمام عہدے
با استثنائے وزارت جنگ جو کمانڈران چیف کے تحت ہے ہندوستانیوں
کے حوالے کردئے جائینگے جسنئے عہدے ہندوستانیوں کو دے جائینگے۔

ان میں نہ صرف محکمہ مالیات اور وزارت داخلہ جیسے اہم محکمے شامل ہونگے بلکہ خارجیہ معاملات کا وہ محکمہ بھی شامل ہوگا جو اب تک صرف وائسرائے سے متعلق تھا اور اس کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان کے مستند نمائندے غیر ممالک میں بھیجے جائیں گے اور اس سے ہندوستان کی بین الاقوامی پوزیشن لازماً بہت بڑھ جائے گی۔ اُس نے موجودہ اگزکٹو کونسل بغیر کسی باقاعدہ دستوری مرحلے کے طے کئے۔ عملی طور پر ہندوستان کے سیاسی خیالات کی سیاسی نمائندگی کرنی ہوگی۔

مسٹر ایمری نے کہا کہ وائسرائے اپنی کونسل کا انتخاب کرتے وقت ہندوستان کے بڑے بڑے فرقوں کی نمایندگی کا خاص خیال رکھیں گے۔ جس میں اونچی ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو مساوی نشستیں دی جائینگی۔ اس کے علاوہ وہ اچھوتوں اور سکھوں اور دیگر مفادات کو بھی نمایندگی دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لیکن لازمی شرط دو بڑے فرقوں کو برابر کی نمایندگی دینا ہے اور کسی سمجھوتہ کے حصول کے لئے یہ لازمی ہے۔

ہر نوع اگر مرکز میں کونسل کے قیام کی تجاویز کو منظور کر لیا گیا تو ہمیں اُمید ہے کہ اُن صوبوں میں وزارتوں کا قیام عمل میں آجائیگا۔ جہاں دفعہ ۹۳ کا اطلاق ہے۔ اس قسم کے سوالات کہ مرکز میں یا صوبوں میں نئے انتخابات کم ہوں یقیناً اس کانفرنس میں زیر بحث لائے جائیں گے جو وائسرائے نے طلب کی ہے

کانفرنس کی تشکیل کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے مسٹر ایمری نے کہا اب یہ تجاویز ہیں جو وائسرائے ملک معظم کی حکومت کی جانب سے ہندوستان کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ یہ سب تجاویز صرف لارڈ ویول کی پہل کا نتیجہ ہیں اور ان کی ہندوستان کے ساتھ گہری ہمدردی اور اسکے شاندار مستقبل میں انکے یقین کا نتیجہ ہیں انکی حقیقی اور قطعی تشکیل انکے اور مرحوم کولیشن وزارت کی دونوں بڑی پارٹیوں کے درمیان صلاح و مشورہ کے بعد عمل میں لائی گئی ہے اسلئے یہ اس ملک کے باشندوں کی طرف سے ہندوستان کے باشندوں کو ایک متفقہ پیش کش ہے۔ مسٹر ایمری نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں پوری امید ہے کہ ہماری تجاویز کو قبول کر لیا جائیگا۔ جب تک کہ ہندوستانیوں میں آخری دستور کے متعلق کوئی سمجھوتہ نہیں ہوجاتا ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتے ہیں ہمیں یقین ہے اور امید ہے کہ اگر ہماری تجاویز کو قبول کر لیا گیا تو ہندوستان کی ضرورت کے بہت سے ضروری اور عملی مسئلوں کو حل کرنے میں ہندوستانی مدبروں کا تعاون سمجھوتہ کو قریب سے قریب تر لے آئیگا بہرصورت ہماری تجویز کے قبول کرنے سے ہندوستان کو اپنے مستقبل کی تعمیر کا شاندار موقع ملے گا اور وہ اقوام عالم میں اپنی صحیح جگہ لے سکیگا ہم ہندوستان

کانفرنس کی ناکامی پر وائسرائے کا بیان

"گزشتہ ۲۹ رجون کے بعد جبکہ ہم نے کانفرنس ملتوی کی تھی۔ جو واقعات رونما ہوئے مجھے ان کی تفصیل بیان کر دینی چاہئے۔ جیساکہ آپ جانتے ہیں۔ ارادہ یہ تھا کہ کانفرنس کو اگزیکٹو کونسل کی ساخت اور ممبران کی تعداد کے بارے میں سمجھوتہ کرلینا چاہئے اور اسکے بعد مختلف جماعتوں کو اپنے ناموں کی فہرست پیش کر دینی چاہئے۔ ان فہرستوں میں اگر میں ضرورت سمجھتا تو اپنے نام بھی شامل کر دیتا اور کوشش کرتا کہ کونسل میں ایسے نام آجاتے جو ملک معظم کی حکومت مجھے اور کانفرنس کو منظور ہوتے۔ میرا ارادہ بھی یہ یہی تھا کہ میں انتخاب پر لیڈروں سے تبادلہ خیالات کروں اور پھر ان ناموں کو کانفرنس کے روبرو پیش کروں۔

"بدقسمتی سے کانفرنس کونسل کی ساخت اور ممبران کی تعداد کے بارے میں متفق نہ ہوئی اور ۲۹ رجون کو کانفرنس کی تائید سے میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ پہلے سے کسی فارمولے کو بنیاد نہ بناکر کوئی حل معلوم کرنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ میں نے مختلف جماعتوں سے ناموں کی فہرست پیش کرنے کے لئے دریافت کیا اور کہا کہ میں ایسا حل تلاش کرنے کی حتی الامکان کوشش کروں گا۔ جو سب لیڈروں اور کانفرنس کو منظور ہو۔

"یوروپین گروپ جس نے فہرست پیش نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور مسلم لیگ کے علاوہ تمام دوسری جماعتوں کی طرف سے مجھے فہرستیں وصول ہوئیں میں اس بات کا عزم کئے ہوئے تھا کہ جب تک میں کامیاب خاتمہ کے لئے ہر ممکن کوشش نہ کروں کانفرنس کو ناکام نہ ہونا چاہئے۔ چنانچہ میں نے ناموں کا انتخاب کیا۔ جس میں مسلم لیگ کے نام بھی شامل تھے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں اگر ان ناموں کو منظور کر لیا جاتا تو ملک معظم کی حکومت کو انھیں منظور کرنے میں کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ میں نے جو نام پیش کئے ان میں ایک طرف توازن قائم رہتا اور دوسری طرف اگزیکٹو کونسل میں قابل آدمی پہنچ جاتے۔ یہی حکومت تمام جماعتوں کے لئے مناسب رہتی۔ البتہ میں نے محسوس کیا کہ کسی جماعت کے کل مطالبات کو تسلیم کرلینا ممکن نہیں ہے جب میں نے اپنا حل مسٹر جناح کے روبرو رکھا تو انھوں نے کہا کہ مسلم لیگ اسے منظور نہیں کر سکتی۔ مسٹر جناح اپنے فیصلہ پر اس طرح اڑے رہے کہ میں نے محسوس کیا کہ گفت و شنید کا جاری رکھنا بے سود ہے ایسی حالت میں میں نے مسٹر جناح کو وہ نام نہیں دکھائے جو میں نے منتخب کئے تھے اور میں نے دوسرے لیڈروں کو بھی ان ناموں کو دکھانے میں کوئی فائدہ نہ دیکھا۔

ایسی حالت میں کانفرنس ناکام ہوگئی۔ اس ناکامی کا جتنا رنج مجھے ہے کسی دوسرے کو نہیں ہوگا۔ میں اس امر کی وضاحت کر دینا ہوں کہ اسکا الزام مجھ پر ہے۔ اگر یہ کامیاب ہو جاتی تو اسکا سہرا میرے سر پر رہتا۔ اسلئے ناکامی کی صورت میں بھی اسکی ذمہ داری کسی جماعت پر نہیں ڈال سکتا۔ پارٹی لیڈروں سے میری درخواست ہے کہ وہ میرے اس نظریہ کو تسلیم کرینگے اور اس بات کی پوری کوشش کریں گے کہ ایک دوسرے کو الزامات نہ دئے جائیں کیونکہ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مختلف جماعتوں اور طبقوں میں سمجھوتہ کی کوشش کا نتیجہ فرقہ وارانہ جذبات کو مشتعل کرنے کی صورت میں ظاہر نہ ہونا چاہئے۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات پورے طریقہ پر ضبط نفس سے کام لیں گے۔

اب مجھے اس بات پر غور کرنا ہے کہ آئندہ کیا قدم اٹھایا جائے میں آپ کو یہ بتادینا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنے نشریہ میں جن تین کاموں کے متعلق ذکر کیا تھا ان میں سے پہلے دو کاموں کا نتیجہ خواہ کچھ ہو۔ لیکن اسوقت موجودہ حکومت جاپان کے خلاف کامیابی کے ساتھ جنگ کو جاری رکھے گی نظام حکومت کو چلائے گی اور مابعد جنگ اصلاحات کی تیاریاں کرے گی۔ یہ میرا فرض ہوگا کہ میں یہ دیکھوں کہ پوری قوت کے ساتھ ان کاموں کی تکمیل جاری رہے۔ میں ان کاموں میں کسی قسم کی رکاوٹ کی اجازت نہیں دے سکتا۔

اس کانفرنس کی ناکامی کے بعد مجھے یہ دیکھنے کے لئے کچھ وقت درکار ہوگا کہ میں ہندوستان کی کس طرح امداد کر سکتا ہوں۔ آپ لوگ ایک دوسرے پر طعن و تشنیع کرنے سے احتراز کر کے امداد کر سکتے ہیں جاپان کے خلاف جنگ جاری رہے گی اور ملک میں امن و قانون بھی برقرار رہے گا اور جب تک میں یہ دیکھوں کہ میرا راستہ اس سے زیادہ صاف ہوگیا ہے جتنا کہ اب ہے یہ مشکل بلکہ شاید ناممکن ہوگا کہ کوئی اور قدم اٹھایا جائے۔ کوئی ایسی حکومت نہیں چل سکتی جسکے روزانہ ٹوٹنے اور بدلنے کا امکان ہو مجھے اپنی حکومت کو اسطرح مضبوط رکھنا ہے کہ روزانہ کے معاملات پر آسانی سے ہو سکیں۔ میرے لئے یہ ناممکن ہوگا کہ میں مسلسل یا وقتاً فوقتاً اس قسم کے مباحث میں پڑوں مستقبل قریب میں ملک معظم کی حکومت جو بھی فیصلہ کرے گی بہرحال اس میں کچھ نہ کچھ وقت لگے گا۔ آپ لوگوں کی طرف سے جو امداد مجھے ملی اور جس صبر و سکون کا اظہار آپ نے کیا اس کے لئے میں آپ کا مشکور ہوں۔ اس رکاوٹ سے آپ کو ناامید نہیں ہو جانا چاہئے ہم اپنی مشکلات پر قابو پالیں گے۔ ہندوستان کے شاندار مستقبل پر کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

شاعر ہی شاعر

محبوب الشعرا کی اشاعت نے بچہ بچہ کو گھر بیٹھے شاعر بنا دیا۔ دو تین مرتبہ کتاب کا غور سے مطالعہ کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے بعد ہر معمولی سے معمولی قابلیت کا آدمی شعر کہنے لگتا ہے۔ چند مہینوں کی مشق کے بعد اس مبتدی کی شوخ قلم سے وہ پھول برستے ہیں جنکی مہک سے ایک عالم معطر ہو جاتا ہے خوبی یہ کہ محبوب الشعرا مبتدی و منتہی دونوں کے لئے یکساں مفید ہے۔

عام مقبولیت کے باعث اس کا تیسرا اڈیشن شائع ہو رہا ہے

قیمت مجلد معہ گردپوش ایک روپیہ آٹھ آنہ

خاموش کو گویا اور گویا کو فصیح مقرر بنانے والی کتاب

فلسفۂ تقریر

شاعری پر بڑی بڑی جامع کتب تصنیف ہوئیں لیکن نثر پر آجتک ایسی کوئی طبعزاد کتاب نہیں لکھی گئی۔ ادبی دنیا میں یہی کمی محسوس کرتے ہوئے مولوی سید نظیر حسن صاحب تمنا دہلوی نے یہ کتاب بڑی عرق ریزی و جانفشانی سے ان حضرات کیلئے تیار کی ہے جو اسٹیج پر آکر تقریر کرنے کیلئے بیقرار رہتے ہیں۔ باوجود قابلیت کے نہیں جانتے اپنا نفس مدعا کس طرح بیان کریں کہ سامعین پر اسکا خاطرخواہ اثر ہو۔ یہ کتاب ان حسرت نصیب مضمون نگاروں کیلئے بیحد مفید ہے جنکے مضامین ہمیشہ غیر مطبوعہ واپس کر دئے جاتے ہیں۔ فلسفۂ تقریر ان بچوں کیلئے خردہ کامیابی ہے جو مقامی ڈبیٹس میں حصہ لیتے ہیں لیکن ہمیشہ ناکام و مایوس واپس ہوتے ہیں انعام حاصل کرنیکا شرف کبھی نصیب نہیں ہوتا۔

ان خوبیوں کے مدنظر باوجود کمیابی ... کے ہوتے انہیں مطرحام پر لانیکا بندوبست کر لیا ہے اب بلاتاخیر حضرات کو چاہئے کہ آرڈر بک کرا کے مکمل اشاعت کا انتظار کریں۔

قیمت مجلد معہ گردپوش ایک روپیہ چار آنے

ملنے کا پتہ: منیجر سخا پبلشنگ ہاؤس مقبل منزل پنجہ اسٹریٹ کشمیری گیٹ دہلی

کانفرنس کی ناکامی کی ذمہ داری کس پر ہے؟

صدر کانگریس مولانا آزاد کا بیان

صدر کانگریس مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا کہ سیاسی جمود کو ختم کرنے کے لئے لارڈ ویول نے جو کوششیں کیں وہ انھیں سراہتے ہیں۔ کانفرنس کی ناکامی کی ذمہ داری کو اپنے اوپر لے کر وائسرائے نے اپنی دلیری کا ثبوت دیا ہے لیکن حقیقتاً کانفرنس کی ناکامی کی ذمہ داری وائسرائے پر نہیں بلکہ دوسروں پر ہے

مولانا صاحب نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میرے دماغ میں اس بات کا پورے طور پر احساس ہے کہ موجودہ انتظامات محض عارضی اور ہنگامی نوعیت کے ہیں اور ان کو مستقبل کے بارے میں ایک مستقل انتظام کی بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن اس احساس کے باوجود میں بالکل واضح طور پر اور پرزور الفاظ میں یہ بات دہراتا ہوں کہ کانگریس کسی ایسے انتظام کو خواہ اس کی نوعیت کیسی ہی عارضی اور وقتی کیوں نہ ہو۔ ہرگز قبول نہیں کر سکتی جو اس کی قومی حیثیت کے لئے مضرت رساں ہو یا جو قومیت کے نشوونما کو نقصان پہونچا سکتا ہو یا جو کانگریس کو بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ایک فرقہ وارانہ جماعت بنادے۔

صدر کانگریس نے وائسرائے کے سامنے جو نظریہ پیش کیا تھا اسکا لب لباب بتایا۔ کانگریس کی قومی حیثیت پر زور دینے کے بعد مولانا صاحب نے کہا کہ میں اس اعلان کو خاص اہمیت دیتا ہوں کہ اس عارضی تجویز کا مقصد ہندوستان کی آزادی کی منزل کی جانب پہلا قدم ہوگا اور اس سے اس مقصد کے حصول میں سہولت ہوگی۔ انھوں نے وائسرائے کو یہ امر بھی صاف طور پر بتادیا تھا کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی موجودہ جمود کو حل کرنے کے لئے ہر معقول طریقہ پر تعاون کرنے کو تیار ہے اور اسی نظریہ کے تحت ناسازگار حالات کے باوجود کانگریسی کانفرنس میں شمولیت کے لئے شملہ پہنچے ہیں۔ لیکن کانگریس ورکنگ کمیٹی جو بھی فیصلے کرے گی آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے اس کی منظوری لازمی ہے یہ امر کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی پر ابھی تک پابندی عائد ہے اور لاتعداد کانگریسی ابھی تک نظربندوں کے کیمپوں میں یا جیلوں میں بند ہیں ہمارے راستے میں سخت مشکلات پیدا کر رہا ہے۔

صدر کانگریس نے ان مختلف مسائل کو بتایا جن کے متعلق انھوں نے وائسرائے سے وضاحت چاہی تھی۔ انھوں نے کہا: میں کہہ سکتا ہوں وائسرائے کی طرف سے مجھے جو جوابات موصول ہوئے وہ تسلی بخش تھے۔ وہ مسائل جن پر صدر کانگریس نے وائسرائے سے مزید روشنی ڈالنے کا مطالبہ کیا یہ تھے:۔

(الف) مجوزہ معاملات خارجہ سے متعلق محکمہ کا دائرہ عمل

(ب) ہندوستانی فوج کو ایک قومی فوج بنانے اور قومی فوج اور قومی حکومت اور عوام میں دوستی پیدا کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش عمل میں لانی چاہئے۔ موجودہ رکاوٹوں کو جو ان میں حائل ہیں قطعی طور پر ختم کرنا ہوگا۔

(ج) جنوب مشرقی ایشیا میں موجودہ جنگ کے خاتمہ کے بعد اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ہندوستانی حکومت ایسی حمایت نہیں کرے گی جس کا مقصد جنوب مشرقی ایشیا کے کسی ملک پر مستعمرانہ کنٹرول جاری رکھنا ہو اور نہ ہی وہ ان ممالک میں سے کسی بھی ملک کی آزادی کو سلب کرنے کے لئے اپنے وسائل کو استعمال کرنے کی اجازت دے گی۔

(د) جہاں تک ہندوستانی ریاستوں کا تعلق ہے عارضی انتظام حکومت کے دوران میں نمائندہ تاج کے اختیارات کو تسلیم کیا جائیگا لیکن یہ بات صاف ظاہر ہے کہ قومی حکومت کو تجارتی اور مزدوروں سے متعلق بہت سے ایسے مسائل پر غور کرنا ہوگا جن کا تعلق ریاستوں سے ہوگا۔ ریاستی عوام والیان ریاست اور قومی حکومت کے درمیان جو خلیج حائل ہوگی اسے دور کیا جائیگا تاکہ جہاں تک مشترکہ مسائل کا تعلق ہے۔ باہمی گفت و شنید اور مشوروں میں آسانیاں پیدا ہو سکیں۔

جنوب مشرقی ایشیا کے متعلق اپنے نظریات کی تشریح کرتے ہوئے صدر

گریس نے بتایا کہ جہاں تک موجودہ صورت حال کا تعلق ہے اگر نیا انتظام میاب ثابت ہوا تو جاپان کے خلاف جنگ صرف برطانیہ کی جنگ نہیں ہوگی ہ وہ ہندوستان کی جنگ ہو جائے گی۔ جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کو زاد کرنے کے بارے میں دو مختلف رائیں نہیں ہو سکتیں۔ ہندوستان کی ی حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ جاپان کے خلاف اس وقت تک مسلسل نگ جاری رکھے جب تک کہ تمام ممالک آزاد نہ ہو جائیں اگر ارادہ یہ ہے کہ ان ممالک کی موجودہ حالت ہی کو برقرار رکھا جائے گا تو ہندوستان ی نئی حکومت اس میں کوئی حصہ نہیں لے گی۔ وہ اس معاملہ میں اپنی یک پائی بھی خرچ نہ کرے گی اور نہ ہی کسی ایک ہندوستانی سپاہی بھی اس بات کی اجازت دے گی کہ وہ اس میں حصہ لے۔

مساوات کا ذکر

اونچی ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مساوات کے صول کا ذکر کرتے ہوئے جو نئی تجاویز کی بنیاد ہے۔ مولانا صاحب نے ہا کہ انھوں نے وائسرائے پر زور دیا کہ نئی حکومت کے دستور میں س چیز مختلف جماعتوں کے سیاسی عقائد ہونا چاہئیں۔ مذہبی نہیں۔

بہر حال اس مسئلہ کو وہیں چھوڑ دیا گیا۔ کانگریس حکومت میں چند زائد سلمانوں کچھ کم ہندوؤں کے لئے جانے کو غیر ضروری اہمیت دینا نہیں چاہتی تھی میں نے یہ تمام کفالت خود کانفرنس میں اٹھائے ور میں پورے وثوق کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ ان کے جواب وائسرائے نے مجھے دئے وہ تسلی بخش تھے۔

ان بنیادی مسائل کے تصفیہ کے بعد کانفرنس نے ایگزیکٹو کونسل ی ساخت اور ممبروں کی تعداد کے بارے میں غور کیا۔ بعد میں کانفرنس اسے ملتوی کر دی گئی تاکہ مختلف جماعتیں غیر رسمی اور ذاتی ملاقاتوں کے تیجہ کے طور پر کسی تصفیہ پر پہنچ سکیں۔

مولانا صاحب نے کہا کہ یہ آپ حضرات کو معلوم ہی ہے کہ اس گفت وشنید کا نتیجہ کچھ نہ نکل سکا۔ اس گفت وشنید کے دوران میں مسٹر جناح نے کہا کہ اس ایگزیکٹو کونسل میں مسلمان ممبروں کی نامزدگی کا حق صرف مسلم لیگ کا ہونا چاہئے۔

[illegible] کی پیشکش کو قبول کرنے سے اسی بنا پر انکار کر دیا کہ یہ اس کی قومی حیثیت کے منافی ہوگی۔

آپ کو یہ چیز نہ بھولنی چاہئے کہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے یہ چیز ہمارے لئے صرف نشستوں کی تعداد کا سوال نہیں۔ بلکہ اس کا اثر ہمارے بنیادی اصولوں پر پڑتا ہے ہم مسلم لیگ سے تعاون پر آمادہ تھے۔ لیکن مسٹر جناح کا رویہ غیر مصالحانہ تھا۔

مولانا صاحب نے کہا کہ وائسرائے نے مختلف جماعتوں سے فہرستیں پیش کرنے کے لئے کہا۔ تاکہ اس سے وہ پارٹی لیڈروں سے مشورہ کرکے بعد میں ناموں کا انتخاب کر سکیں۔ لیکن مسٹر جناح نے نام پیش کرنے سے انکار کر دیا۔ ۱۲ر جولائی کو وائسرائے نے مجھ سے ملاقات کے دوران میں کہا کہ جہاں تک مسلمان نشستوں کا تعلق ہے انھوں نے ایک فہرست تیار کرنے کی کوشش کی تھی اور مسٹر جناح کی رضامندی ظاہر کی تھی۔ لیکن وائسرائے اپنی انتہائی کوششوں کے باوجود بھی مسٹر جناح کو رضامند نہ کر سکے اور مسٹر جناح برابر اس مطالبہ پر اڑے رہے کہ مسلمانوں کی نامزدگی صرف مسلم لیگ ہی کر سکتی ہے۔ وائسرائے نے مسٹر جناح کے اس مطالبہ کو ماننے سے انکار کر دیا اور محسوس کیا کہ بحالات موجودہ ان تجاویز پر مزید غور و فکر بیکار ہے۔

مولانا آزاد نے کہا کہ "موجودہ صورت حال سے دو مسئلے پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ کانفرنس کی ناکامی کا سبب مسلم لیگ کا رویہ تھا۔ دوسرا مسئلہ جو مسٹر جناح کے انکار سے پیدا ہوگیا ہے یہ ہے کہ اب آگے بڑھنے یا نہ بڑھنے کا فیصلہ کرنا لارڈ ویول کے ہاتھ میں ہے۔ حالات موجودہ لارڈ ویول نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں میں نے جو کچھ کانفرنس میں کہا ہے وہ میں بتا دینا ضروری خیال کرتا ہوں برطانوی حکومت یہاں کے فرقہ وارانہ مسائل کی ذمہ داری سے سبکدوش قرار نہیں دی جا سکتی جب تک ہندوستان میں تیسرا فریق موجود ہے یہ مشکلات شطرنج کے پیادوں کی طرح موجود رہے گی۔ اسی طرح سرگرم عمل بھی رہے گی آج ہو یا کل انھیں منصفانہ یا مساویانہ طریق پر ایک مضبوط رویہ اختیار کرنا ہی پڑیگا۔ مولانا صاحب نے کہا کہ مجھے کانگریس کے رویہ پر کسی قسم کی پشیمانی نہیں میں نے جو کچھ کیا ہے اس کے علاوہ کانفرنس کے بارے میں اور بہت سی باتیں ہیں میں وائسرائے سے اپنی خط و کتابت کی اجازت طلب کر رہا ہوں چونکہ ملک کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرنا بہت ضروری ہے۔

مولانا آزاد سے سوال کیا گیا کہ وائسرائے اور وزیر ہند کی تقاریر میں مختلف جماعتوں کے سمجھوتہ پر زور دیا گیا تھا ایسی صورت میں حکومت چلانے کی ذمہ داری کیسے عائد کی جاسکتی ہے۔ مولانا صاحب نے جواب دیا کہ یہ صحیح ہے ہم نے دعوت نامہ کو تمام حالات سے باخبر ہوتے ہوئے قبول کیا تھا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی خاص جماعت کو ملک کی ترقی کی راہیں مسدود کردینے کے کلی اختیارات دیدئے جائیں۔ مکمل اتفاق ناممکن ہے اسلئے یہ دیکھنا چاہئے کہ کوئی جماعت غیر معقول رویہ اختیار نہ کرے۔

ایک اور سوال کے جواب میں مولانا آزاد نے کہا کہ مسلم لیگ کا حق واحد نمائندگی لغو ہے۔ کسی مسلم اکثریت کے صوبے میں لیگی وزارت بنگال کو چھوڑ کر سرحد میں کانگریسی وزارت، پنجاب میں یونینسٹ وزارت ہے۔ سندھ میں سر غلام حسین کانگریسی ممبروں کے رحم وکرم پر ہیں اور یہی صورت حال آسام میں ہے اسلئے یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ مسلم لیگ تمام مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جسکا مسلم لیگ سے کوئی تعلق نہیں۔

۔۔۔۔ سے

لیاقت والے اور کسی پارٹی کا ہاتھ نہیں مسٹر جناح نے اپنے بیان میں ویول پلان کو دام فریب قرار دیا انھوں نے ارڈ ویول، کانگریس۔ مہاتما گاندھی اگرو زیر پنجاب ملک خضر حیات اور ان تمام عنصروں پر لگایا کانفرنس سے تعلق رکھتے ہیں سازباز کر۔۔ کا الزام لگایا ہے۔ مسٹر جناح کی لیڈرشپ مخالفت مزاحمت اور منافرت پر قائم ہے انھیں خوف ہے کہ دوسری پارٹیوں سے کسی بھی بنیاد پر مفاہمت انکی لیڈرشپ کے لئے پیغام موت ثابت ہوگی۔ سب دوسری پارٹیوں کو مشترکہ طور پر قصوروار ثابت کرنے کی کوشش کر کے مسٹر جناح نے خود یہ واضح کر دیا ہے کہ شملہ میں بنا بنایا کھیل بگاڑنے کی ذمہ داری اگر کسی ایک فریق کے ذمہ ہے تو

پریس کانفرنس میں مسٹر جناح کا ۱۴ جولائی سنہ ۱۹۴۵ء کا بیان

"ویول پلان کی مکمل جانچ پڑتال کے بعد ہم نے یہ محسوس کیا کہ یہ ایک قسم کا جال تھا جس میں ہم لوگوں کو پھنسانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ایک طرف گاندھی کی اور ہندوؤں کی کانگریس تھی جو ہندوستان کی وحدت کے اصول پر عمل کرتی ہوئی پورے ہندوستان پر آزاد ہندو راج کے لئے کوشاں ہے اور دوسری طرف لارڈ ویول اور حکومت کے پٹھو خضر تھے جنھوں نے حال ہی میں ہندوستان کی جغرافیائی وحدت کا نظریہ پیش کیا ہے۔ ان دونوں نے مل کر ہمارے خلاف متحدہ محاذ قائم کیا تھا۔ موخرالذکر پنجاب کے مسلمانوں میں پھوٹ اور تفرقہ پیدا کرنے کی انتھک کوشش کر رہے ہیں۔ ہمیں دھوکہ بازی سے اس پلان کو قبول کرنے پر آمادہ کیا جا رہا تھا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر ہم لارڈ ویول کے اس پلان کو تسلیم کر لیتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ہم اپنی موت کے پروانہ پر خود اپنے ہاتھ سے دستخط کر رہے ہیں۔

"ویول کی مجوزہ مجلس منتظمہ میں ہماری حیثیت گھٹ کر ایک تہائی اقلیت کی ہو جاتی۔ تمام دوسری اقلیتوں۔ اچھوت، سکھ اور عیسائی اور کانگریس کے مقصد میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اقلیتیں بھی اپنے حقوق اور مطالبوں کو پورا کرانے کے لئے کوشاں ہیں اور اُن کی بھی شکایتیں ہیں لیکن وہ اتحاد ہند کے اصول پر کانگریس کے ہمنوا ہیں۔ پھر وہ اخلاقی اور تہذیبی اعتبار سے بھی ہندو سوسائٹی سے گہرے طور پر ملحق و متحد ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تمام اقلیتوں کیساتھ پورا پورا انصاف کیا جائے اور وہ جہاں کہیں بھی ہوں اُن کے حقوق کا پورا پورا تحفظ کیا جائے۔

"لیکن جب مجلس منتظمہ کے عمل کرنے اور معاملات پر فیصلے صادر کرنے کا وقت آئے گا تو ان اقلیتوں کا ووٹ یقینی طور پر ہمارے خلاف جائے گا۔ ایسی حالت میں ہمارے لئے وائسرائے کے ویٹو کے علاوہ اور کوئی تحفظ کا ذریعہ نہ ہوگا۔ لیکن ہر اس شخص کو جو دستوری معاملوں سے واقفیت رکھتا ہے یہ معلوم ہے کہ وائسرائے اکثریت کے خلاف اپنا یہ ویٹو تنظیمی اور قانونی مسائل پر اور پالیسیوں اور اصولوں کی تشکیل میں ہر گھڑی اور بات بات پر استعمال نہیں کر سکتا۔

"لیکن سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو فرقہ وارانہ تقسیم کی بنیاد پر جو پانچ نشستیں دی گئی ہیں ان میں بھی مسلم لیگ کو یہ اختیار نہیں کہ پانچوں نشستوں کے لئے مسلم لیگ ہی اپنے نمائندے منتخب کرے۔ مسلمانوں کی دو نشستوں کے لئے کانگریس اور خضر دعویدار بن بیٹھے۔

"کانگریس اور خضر کا یہ طرزِ عمل مسلم لیگ کی حیثیت اور اس کے کیرکٹر پر ایک ضرب کاری تھا۔ یہاں تک کہ آخر میں ہمیں پلان کو قبول کرنے سے انکار کر دینا پڑا اس لئے کہ لارڈ ویول نے اس بات پر زور دیا کہ مسلمانوں کی ایک نشست خضر کے منتخب نمائندے کو دی جائے۔"

شملہ کانفرنس اور مسلم لیگ کی واحد نمایندگی

قوم پرست مسلمانوں کے بیانات

(۱)

یوپی کے سابق وزیر مسٹر قدوائی کا بیان

۱۵ر جولائی کو مسٹر رفیع احمد قدوائی نے نمائندہ ایسوسی ایٹڈ پریس سے یک ملاقات کے دوران میں ویول پلان کی ناکامی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:۔

کانفرنس کی ناکامی سے ان لوگوں کو بڑی مایوسی ہوئی ہے۔ جنھوں نے ویول پلان سے یہ اندازہ لگایا تھا کہ ہندستان کے متعلق برطانیہ کے طرز عمل میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر کانگریس لیڈروں کو یقین ہوتا کہ کانفرنس کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار صرف مسٹر جناح پر ہے تو وہ اس کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے رضامند نہ ہوتے۔ مجھے خوشی ہے کہ کانفرنس کے کانگریسی ممبروں نے مسٹر جناح کے اس مطالبہ کو تسلیم نہیں کیا کہ تمام مسلمان ممبروں کو نامزد کرنے کا حق صرف مسلم لیگ کو ہے۔ مجالس آئین ساز کے لیگی ممبروں کے جو اعداد وشمار نواب زادہ لیاقت علی خاں نے شائع کرائے ہیں ان کے بعد بھی مسلم لیگ یہ کہنے کا حق نہیں رکھتی کہ مسلمانوں کی صرف وہی نمائندہ جماعت ہے اور پھر یہ اعداد و شمار بھی صحیح نہیں ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ لیگ کو مجالس آئین ساز کے نصف مسلمان ممبروں کا بھی اعتماد حاصل ہے۔ مسٹر جناح نے اپنے بیان میں اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ مسلم لیگ ۹۹ فیصدی مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ اپنے اس بیان کی حمایت میں انھوں نے ضمنی انتخابات کے نتائج کا ذکر کیا ہے۔ مختلف صوبوں سے ان کے اس بیان کی تردید ہو چکی ہے۔ ہمارے صوبہ تک میں ان کے اس دعویٰ کی بنیاد نہیں ہے۔ عام انتخابات کے بعد صوبہ کے مسلم حلقوں میں سات ضمنی انتخابات ہوئے ایک حلقہ میں کانگریس کا امیدوار بلا مقابلہ کامیاب ہو گیا اس لئے کہ لیگ سب کمیٹی نے رپورٹ کی تھی کہ لیگی امیدوار کی کامیابی کی کوئی امید نہیں ایک امیدوار کو کانگریس کے امیدوار کے مقابلہ میں زبردست اکثریت سے شکست ہوئی۔ تیسرے حلقہ میں ایک انڈیپنڈنٹ امیدوار جسے کانگریس کی حمایت حاصل تھی اس لئے منتخب ہو گیا کہ لیگی امیدوار کو کسی قسم کی حمایت حاصل ہونے کی امید نہ تھی اس نے اپنا نام واپس لے لیا۔ باقی چار حلقوں سے لیگ کے امیدوار اکثریت کے ساتھ کامیاب ہو گئے لیکن ہر حلقہ میں کانگریسی امیدواروں کو چالیس فی صدی ووٹ حاصل ہوئے۔

(۲)

مسٹر ظہیر الدین پریزیڈنٹ آل انڈیا مومن کانفرنس کا بیان

۱۶ر جولائی کو مسٹر محمد ظہیر الدین پریزیڈنٹ آل انڈیا مومن کانفرنس نے ایک بیان میں مسلم لیگ کے اس دعویٰ کی جس میں وہ تمام مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ کرتی ہے پر زور تردید کی ہے۔ بیان میں کہا گیا ہے کہ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ کسی بھی سیاسی جماعت کی جانب سے غیر لیگی مسلمانوں کے مطالبات کو نظر انداز کرنا انتہائی غیر منصفانہ عمل ہوگا مسلم لیگ صرف اعلیٰ طبقہ کے افراد زمینداروں اور متمول اور دولت مند طبقہ کے افراد کی نمایندگی کرتی ہے اور مفلوک الحال غریب انسانوں کو بھی زندہ رہنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا خود لیگیوں کو ہم نے مسٹر جناح کو مسلمانوں کا واحد نمائندہ تسلیم کرنے اور ان کے واحد ڈکٹیٹر ماننے سے بارہا انکار کیا ہے میں پھر اپنی پوری قوت سے اس عزم کا اظہار کرتا ہوں کہ ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہونگے اور مسلم لیگ کی قیادت کبھی قبول نہ کریں گے اور نہ ہی اس کی علٰحدگی پسند اور تفرقہ انداز پالیسی کے سامنے سر تسلیم خم کریں گے۔ برطانوی حکومت کو اس میدان میں قدم نہ اُتارنا چاہئے جس میں مسٹر جناح نے اپنے لئے علٰحدگی اور تنہائی کا قلعہ تعمیر کیا ہے۔ لارڈ ویول کو اپنی تجاویز کے ساتھ آگے بڑھنا چاہئے۔ ان تمام افراد یا جماعتوں کو راستے سے دور کر دینا چاہئے جو اس مشترکہ مقصد

کی راہ میں حائل ہونا چاہے جو برطانوی حکومت اور قوم پرست ہندوستانیوں نے اپنے سامنے رکھا ہے مسٹر ظہیر الدین نے کہا کہ مومن انصاریوں کی جو ہندوستانی مسلمانوں میں سب سے بڑا فرقہ ہیں اپنی الگ جماعت ہے جو مسلم لیگ سے آزاد ہیں انھوں نے مسٹر جناح کی رہنمایانہ حیثیت کی ہمیشہ مذمت کی ہے مسلم لیگ وقتاً فوقتاً مومن فرقہ میں انتشار اور تفرقہ پیدا کرنے کے لئے بعض افراد کو آگے بڑھاتی رہی ہے لیکن ہم نے اس فرقہ کے متعلق ان کے دعوی کی نمائندگی کی ہمیشہ مذمت کی ہے۔

مومن کانفرنس ہمیشہ ایسی ہندوستانی یونین کے قیام کی حمایت کرتی آئی ہے ' جو آزاد اور خود مختار ریاستوں پر مشتمل ہو اور جن کے دائرہ اختیار میں صرف ایسے معاملات ہوں جو ملک کے مشترکہ مفاد کے لئے ضروری ہوں اور ہم نے ہندوستان میں مختلف علیحدہ ریاستوں یا مقابل فیڈریشنوں کے قیام کی مخالفت کی ہے کانگریس نے بےلوث طریقہ پر مرکز میں مجوزہ عارضی دستور کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا ہے اس سے مکمل طور پر اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ کانگریس ایک ایسی قومی جماعت ہے جو ہندوستان کے تمام مفادات کو مدنظر رکھتی ہے۔

(۲)

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کا بیان

۴ر جولائی کو مولانا حسین احمد مدنی صدر جمعیۃ العلما نے اخبارات کو بیان دیتے ہوئے "قوم پرور" مسلمانوں کی جانب سے صدر کانگریس مولانا ابو الکلام آزاد کی لیڈری پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ ملک کی ہر ترقی یافتہ طاقت کے ساتھ اپنے مشترکہ مقصد مکمل آزادی کے حصول کے لئے جس میں برطانوی دولت مشترکہ سے علیحدگی کا حق حاصل ہو اشتراک عمل کرنے کے لئے تیار ہیں۔

انھوں نے کہا کہ میں شملہ میں صدر کانگریس کی دعوت پر اور ان کی ورکنگ کمیٹی کے روبرو اس تجویز کی وضاحت کرنے کے لئے آیا ہوں۔ جو قوم پرور مسلم جماعتوں کے اس جلسہ میں پاس کی گئی ہے۔ جس کا اجلاس ۲۸ر جون کو میری زیر صدارت دہلی میں ہوا تھا۔ اس کانفرنس کا مقصد تمام قوم پرور مسلمانوں جماعتوں کے دیول تجاویز پر نظریات کی وضاحت کرنا تھا جس پر آج کل شملے میں بحث ہو رہی ہے نیشنلسٹ مسلمان اس تجویز کو اس حد تک لبیک کہنے کے لئے تیار ہیں جہاں تک اس سے ہندوستان کی آزادی کے حصول کی طرف قدم اٹھتا ہے۔ اس لئے ہم اس پلان کو اس جدو جہد اور قربانیوں کی روشنی میں دیکھیں گے جو پچھلے ۲۵ سال سے ان کی تاریخ بن گئی ہے اس لئے یہ چیز صاف ہے کہ شملہ کانفرنس کے نتیجے کا زیادہ تر انحصار لارڈ ویول کے طریقہ عمل و نیت پر ہے مگر میں ساتھ ہی ساتھ قوم پرور مسلمانوں کی طرف سے صدر کانگریس مولانا ابو الکلام آزاد کی لیڈری پر اظہار اعتماد کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ وہ ملک کی ہر ترقی یافتہ طاقت کے ساتھ اپنے مشترکہ مقصد ایسی آزادی کے حصول کے اشتراک عمل کرنے کو تیار رہیں جس میں برطانوی دول مشترکہ سے علیحدگی کا حق ملے۔

شملہ کانفرنس کی ناکامی پر مختلف لیڈروں کا اظہار خیال

راجگوپال آچاریہ

شائستگی کے بجائے صاف بیانی

مسٹر آچاریہ نے کہا کہ میں شائستگی کی خاطر صاف بیانی کو قربان نہیں کر سکتا، ایک سپاہی کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنی کوششوں کو ناکام کہہ دے لیکن انتظامی صیغہ کا آدمی یہ کبھی نہ کہے گا، بہرحال لارڈ ویول ہوں یا مسٹر ایمری یا ملک معظم کی حکومت، کوئی بھی ذمہ دار ٹھیرا جائے، کانفرنس برباد ہو گئی، لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ کانفرنس کوئی غیر منظم اور بے ترتیب مجمع نہ تھا بلکہ ان کے افعال میں پوری متانت اور ہم آہنگی تھی۔ بے شک افراد کے اثرات اور عقیدوں نے اپنا کام کیا، لیکن حکومت کو اس کی عادت نہیں کہ اپنے کارندوں کو اہم معاملات میں محدود اختیارات سے زیادہ کچھ دے دے، لہذا اس کا ہر وقت یقین کیا جا سکتا ہے کہ اگر لارڈ ویول نے سب الزامات اپنے سر لے لئے تو حکام بالا کے اشارے پر لئے۔

بے شک یہ تمہارا (یعنی وائسرائے کا) قصور ہے کہ تم ان کو (یعنی مسٹر جناح کو) قائل نہ کر سکے، یہ قصور اس شخص کا نہیں ہے جو اپنے عقاید کے مطابق بات کرتا ہے اور اس پر مطمئن ہے۔ لیکن اگر تم ناکام رہے تو یہ قصور تمہارا ہے کہ تم اس پر حجت قائم نہ کر سکے۔ اس اعتبار سے لارڈ ویول نے سارا الزام اپنے سر لیا۔

مسٹر جناح کا دعویٰ زبانی رد کرنا کافی نہیں

مسٹر جناح کا دعویٰ تھا کہ برطانیہ کی منظوری کے لئے صرف لیگ ہی اس کی مجاز ہے کہ مسلمان نمائندوں کو نامزد کر کے انکی سفارش کرے۔

مسٹر جناح کے اس دعویٰ کو لارڈ ویول نے نہ شروع میں قبول کیا، نہ دوران گفتگو میں اور نہ آخر میں۔ جب ان کی آخری ملاقات ہوئی اور مسٹر جناح نے پھر اپنے دعوے کے مطابق مطالبہ کیا، اسکو پاکستان یا دوسرے کسی مسئلہ کے ساتھ مخلوط نہ کیجئے۔ تو لارڈ ویول نے پھر اسکو مناسب و مفید نہیں سمجھا کہ معاملہ کو آگے بڑھایا جائے۔

مسٹر جناح کے دعویٰ سے لارڈ ویول بھی متاثر نہیں ہوئے۔ حالانکہ ان کی حکومت کی روائتی عادت یہ ہے کہ اگر یہ مسٹر جناح کو نیچے گرانا بھی چاہتے ہیں تو نرمی اور آہستگی سے اور اگر کبھی ان کو ملامت کی ضرورت ہوتی ہے تو لب و لہجہ میں احتیاط برتی جاتی ہے۔

جب مسٹر جناح کے مطالبہ کو قابل قبول اور ناقابل اعتراض نہیں سمجھا گیا تو پھر وائسرائے نے اس کو کیوں ضروری نہیں سمجھا کہ اس معاملہ کی اور چھان بین کریں۔ یہ معاملہ اس لئے اہم تھا کہ یہ لارڈ ویول کی تجویز تھی جو ملک کے سامنے رکھی گئی، یہ اس سرزمین میں کسی شورش کا نتیجہ نہ تھی بلکہ خود لارڈ ویول کی دلی آرزو کے مطابق رکھی گئی تھی اور ملک معظم کی حکومت نے اس کو قبول کر لیا تھا۔ اگر ان کو یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ مسٹر جناح کا مطالبہ غلط ہے اور انھوں نے صاف صاف بغیر کسی سے مشورہ کئے ہوئے ان سے کہہ بھی دیا تھا تو پھر ان کا یہ اختیار بھی باقی تھا کہ مسٹر جناح کے انکار کے باوجود تجویز کو آگے بڑھا کر عملی جامہ پہنائے۔

وائسرائے کی خوشامد

آدمی کو اپنے علم و یقین کے مطابق عمل کی جرأت ہونی چاہئے اگر تم میں تمھارے علم و یقین نے جرأت نہیں پیدا کی تو اس سے بہتر یہ ہے کہ کوئی اصول ہی نہ رکھا جائے۔ اگر مسٹر جناح کے مطالبہ کو رد کر دیا گیا تو اس سے سوائے اس کے کہ کرسی نشین سیاست دان عملی طمانیت حاصل کریں۔ اور کوئی بھی فائدہ نہیں ہوا جب تک اس کو مناسب عملی جامہ نہ پہنایا جائے، موجودہ ایگزیکیٹو کونسل کو تو آپ نے نئی کونسل کی تشکیل طلب کر کے خود بخود معطل کر دیا اور اسی لئے آپ نے یہ کانفرنس بلائی، اگر آپ کہتے ہیں کہ مسٹر جناح ضد پر اڑے ہوئے ہیں تو گویا آپ نے مسٹر جناح کو حکومت ہند پر بھی حق استرداد

دیدیا اور ان کے دعویٰ کو قبول کر لیا۔

مسٹر جناح کے دعویٰ کو اس حد تک تسلیم کر لیا گیا کہ اس کی خاطر تمام ترقی کی راہ بھی مسدود کر دی۔ اس چیز کو سمجھ لینا چاہیئے کہ غلط دعویٰ کو زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا میرے خیال میں جس طرح لارڈ ویول کی کوشش کو بیکار کر دیا گیا یا ملتوی کر دیا گیا، یہ بحیثیت مجموعی ہندوستان کے حق میں بہت ہی نامنصفانہ بات ہوئی۔

کانفرنس ناکام رہی نہ کہ ویول تجویز

مسٹر راجگوپال آچاریہ نے لارڈ ویول کے اس فقرے سے کہ کانفرنس ناکام ہو گئی ایک لطیف فرق پیدا کیا کہ انھوں نے یہ نہیں کہا ہے کہ ان کی تجویز ناکام ہو گئی۔ اس مسئلہ کو بالآخر پھر حل کیا جائے گا جبکہ برطانیہ میں نئی حکومت بن جائے گی جس چیز کے متعلق یہ تسلیم کر لیا گیا کہ وہ ناقابل قبول مطالبہ ہے تو اس کو برداشت نہیں کیا جا سکتا اور مجھے امید ہے کہ حکومت برطانیہ جس نے جرمنی اور اٹلی کو شکست دیدی اور عنقریب جاپان کو بھی شکست دیدے گی وہ مسٹر جناح کے ہاتھ شکست کھا لینے کا اعتراف نہیں کرے گی۔

مسٹر جناح کی بلند صفات

مسٹر جناح مکمل آئین و ضوابط پسند آدمی ہیں انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی قانون شکنی نہیں کی وہ کبھی ایسے کام کے پاس بھی نہیں جائیں گے جو غلط ہو وہ لاطائل مسائل سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت ان کی ذہنیت میں کوئی لچک نہیں رہی وہ ہر چیز کو دوسری روشنی میں دیکھنے لگے ہیں۔ مجھے اس کا افسوس ہے لیکن ان سے معاملہ فہمی ناممکن نہیں ہے۔

دو باتیں ہو سکتی ہیں

موجودہ مشکلات سے نکلنے کی مسٹر آچاریہ نے دو صورتیں بتائیں پہلی یہ ہے کہ لیگ کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یہ فقرہ موجودہ طرز جدال میں ا ہو گیا ہے۔ اگر معاملہ فرقہ وارانہ ہو گیا ہے تو اس پر بھرپور وار کیا جانا چاہیئے اس معاملہ کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اس میں اصرار ناممکن ہے۔ اس وقت مذہب اور مقدس نوشتوں کا معاملہ نہیں ہے اس وقت سوال آدمیوں کا ہے۔ ہندوستان کے مسئلہ کا ہے۔ صوبوں سے جن کی مجالس واضعان قانون کو بڑے پیمانہ پر عام رائے کے ذریعہ منتخب کیا گیا تھا یہ استصواب کیا جا سکتا ہے کہ وہ مرکز میں کس کس کو چاہتے ہیں۔ ایک ایسا صوبہ جیسے سندھ ہے جس کی پوری آمدنی مدراس کی آبکاری کی آمدنی کے بھی برابر نہیں اسکو بھی نمائندوں کے انتخاب کا ایسا ہی حق ہوگا جیسے بڑے صوبوں کو۔ ایسی ایگزیکٹو کونسل معیاری کونسل ہوگی جس میں قابلیت بھی ہوگی۔ اثر بھی اور جمہوری طاقت بھی۔ لیکن مسٹر جناح کی طرف سے اس پر اعتراضات ہونگے موجودہ اسمبلیوں کا انتخاب ۱۹۳۷ء میں ہوا تھا جب کہ لیگ اتنی مضبوط نہ تھی۔ جیسی آج ہے اور نہ اس وقت پیرپور رپورٹ شائع ہوئی تھی۔ مسٹر آچاریہ نے کہا اس لئے ضروری ہے کہ نئے انتخابات ہوں۔

دوسرا بدل

دوسرا بدل یہ ہے کہ عارضی حکومت اپنے ۱۹۴۲ء کے اعلان کو عملی جامہ پہنائے جس کے مطابق ایسا درجہ نو آبادی مل جاتا ہے جس میں حق علیحدگی بھی تسلیم کیا گیا ہے اور جو تمام اہل فکر کے نزدیک اچھا ہے۔ گو ان لوگوں کے نزدیک اچھا نہ ہو جو صرف شور مچایا کرتے ہیں۔

معظم کی حکومت نے ناگوار حد تک اسکی تکرار کی ہے کہ وہ پیشکش اب بھی موجود ہے اور حکومت اس پر عملدرآمد کے لئے تیار بھی ہے لیکن چونکہ سب لوگوں کو رضامند نہیں کیا جا سکا، بہتر بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان صوبوں کو دستور اساسی بنانے کی مہم پر لگ جانے کی اجازت ملنی چاہیئے جو وفاق ہند میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ مسٹر جناح کو یہ ثابت کرنے کا پورا موقعہ ملیگا کہ نو کروڑ مسلمان لیگ کے ساتھ ہیں اور وہ صوبے جو وفاق میں شامل ہونے پر تیار نہ ہوں ان کو بھی اسکا موقع دیا جائے کہ خاموشی کے ساتھ وہ بھی اپنا دستور اساسی مرتب کریں۔

انتخابات کے وقت رائے دہندوں کے سامنے یہی مسئلہ ہوگا کہ وہ ایک مرکزی وفاق کے تحت رہنا چاہتے ہیں یا نہیں۔

(ا۔پ)

ڈاکٹر بنرجی

ڈاکٹر بنرجی لیڈر قوم پرست پارٹی مرکزی اسمبلی نے وائسرائے کی کوششوں کی تعریف و توصیف کی۔ وائسرائے نے جس مکمل اتحاد کا اعلان کیا ہے وہ دنیا کے کسی حصہ میں نہیں ہو سکتا۔ کسی

ملک میں کامل اتحاد نہیں چاہتے۔ وائسرائے نے جس طریقہ سے اس کو حاصل کرنا چاہا وہی طریقہ غلط تھا۔ کسی ایک پارٹی کو اتنی قوت نہ دینی چاہئے کہ وہ ملک کی ترقی کے لئے حارج ہو جائے اور اس کو روک دے۔ مکمل اتحاد کے حصول میں جب وائسرائے کو ناکامی ہوئی ہے تو اب وائسرائے کو لازم ہے کہ وہ ایسی کوشش کریں کہ اس مکمل اتحاد کا زیادہ سے زیادہ حصہ حاصل ہو جائے۔ یعنی اگر کل نہیں تو اس کا جزو اعظم ہی حاصل ہو۔

ملک خضر حیات خاں ٹوانہ

ملک خضر حیات خاں ٹوانہ وزیر اعظم پنجاب نے کہا
میں اس مسئلہ میں مولانا ابو الکلام آزاد کا ہم خیال ہوں کہ کانفرنس کی ناکامی کی ذمہ داری وائسرائے پر عائد نہیں کی جا سکتی۔ وائسرائے نے بڑی بڑی پارٹیوں میں باہمی اتحاد و اتفاق اور ار طلب کیا تھا لیکن ویسا اتحاد رونما نہ ہو سکا۔ وائسرائے نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ مستقبل کے مسائل مثلاً پاکستان مجوزہ انتظام سے متاثر نہ ہوں گے اور اس اعلان کو مسٹر جناح نے قبول کیا تھا۔

مسٹر جناح کا یہ دعویٰ کہ مسلمانوں کی نمائندگی صرف مسلم لیگ ہی کر سکتی ہے اس لئے صحیح نہیں کہ کسی ایک پارٹی کو اس امر کی اجازت نہ دینی چاہئے کہ وہ دوسرے خیالات والی جمعیت کو خارج کر دے ورنہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مسلم لیگ کو نامزدگی کا واحد اختیار ہے اور مسلمانوں کے دیگر طبقوں کو رائے دینے کا کوئی حق ہی نہیں۔

ماسٹر تارا سنگھ

ماسٹر تارا سنگھ اکالی لیڈر نے کہا کہ اختلافات دور کرنے کے لئے ثالثی کے طریقہ پر عمل درآمد کرنا چاہئے۔ مسئلہ پاکستان سے سکھوں کا براہ راست دائم تعلق ہے۔ اگر پاکستان کے اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو ایک سکھ حکومت کا قیام بھی لازمی ہے اگر مسٹر جناح اسکو ماننے کے لئے تیار ہیں تو ہم ان کو پاکستان دینے پر راضی ہیں۔

مسٹر بیون

لیبر پارٹی کے لیڈر مسٹر بیون نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ انتہا پسند حلقوں میں شملہ مذاکرات کے ٹوٹ جانے سے سخت مایوسی پھیل گئی ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ لارڈ ویول نے کانفرنس کی ناکامی کی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے اس سے یہ مراد ہے کہ وہ عنقریب یہ مذاکرات دوبارہ جاری کریں گے اور آئندہ یہ کوشش کامیاب بھی ہوگی۔ لیکن ہمارے لئے یہ ممکن نہیں کہ ہم غیر معین عرصہ تک ہندو اکثریت کے مطالبات نامنظور کرتے جائیں۔

سر اسٹیفورڈ کرپس

سر اسٹیفورڈ کرپس نے ایک انٹرویو میں شملہ کانفرنس کی ناکامی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لارڈ ویول سے اظہار ہمدردی کیا ہے مسلم لیگ کا یہ مطالبہ ہے کہ مسلمانان ہند کی وہ ہی نمائندہ جماعت ہے اس مطالبے کا محرک وہ خطرہ ہے جو انھیں ہندو اقتدار سے لاحق ہے مسلمانوں کو یہ خطرہ ہے کہ وہ اس طرح ایک مستقل اقلیت بن کر رہ جائیں گے کیونکہ پاکستان کے سوال پر ابھی تک کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا اس لئے مسلم لیگ مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ ہونے کا دعویٰ کرنے پر مجبور ہے کیونکہ وائسرائے اور حکومت برطانیہ کی طرف سے یہ یقین دلایا جا چکا تھا کہ کسی بڑی قوم کی مخالفت اور مزاحمت کی صورت میں نئی ایگزیکٹو کے لئے کوئی اسکیم نہیں ٹھونسی جائے گی۔ اسلئے وائسرائے کے لئے کوئی نئی حکومت قائم کرنا ناممکن تھا۔ ایک چیز کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ آئندہ ہمیں کوئی ایسی پوزیشن اختیار نہیں کرنا چاہئے جس میں ہندوستان کی ترقی ناممکن ہو۔

سر اسٹیفورڈ نے مزید کہا کہ انتخابات کے بعد برطانوی حکومت کی ۱۹۴۲ء کی تجاویز کے مطابق ایک مجلس آئین ساز قائم کی جانی چاہئے۔ یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ ہم ایک مستقل مصالحت کیلئے تدابیر اختیار کریں۔ جن میں پاکستان کے مسئلے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوگی۔ جہاں یہ چیز حکا... نہیں کہ کسی حیثیت کو ہندوستان کی حکومت خود اختیاری کے سلسلے میں ...

مزاحم ہونے دیا جائے۔ وہاں یہ بھی صحیح کارنہ ہوگا کہ مسلم اکثریت والے صوبوں کو کسی ایسے انتظام حکومت ... جا ... جس پر انھیں خیالی ... ہے

اخبارات کی رائیں

شملہ کانفرنس کا ناکام خاتمہ

شملہ کانفرنس کی ناکامی پر اردو پریس کے ردعمل کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ لیگی اخبارات شملہ کانفرنس اور ویول پلان کی ناکامی کی ذمہ داری کانگریس اور حکومت پر ڈالتے ہیں برخلاف اس کے کانگریسی اور غیر لیگی اردو اخبارات کانفرنس کی ناکامی کا ذمہ دار اصل مسلم لیگ کو ٹھہراتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ان کو لارڈ ویول سے بھی یہ شکایت ہے کہ انہوں نے مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے ویول اسکیم پر عمل کرنا قبول نہ کیا۔

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ویول پلان پر لیگی اخبارات کی رائے مطبوعہ نئی زندگی جولائی نمبر ۱۹۴۵ء بہت موافقانہ تھی اور ساتھ ہی اس سے عارضی حکومت کے جلد از جلد قیام کی خواہش کا پتہ چلتا تھا لیکن اب وہی اخبارات کانفرنس کی ناکامیابی کو لیگ کی فتح قرار دیتے ہیں ——— ادارہ

مسلم لیگ کا اخبار منشور دہلی ۱۸ جولائی کی اشاعت میں کانفرنس کی ناکامی کا ذمہ دار اور لارڈ ویول اور حکومت برطانیہ کو قرار دیتا ہے۔

لارڈ ویول نے بظاہر بڑی فراخ دلی سے اس کا اعتراف کیا کہ ناکامی کے ذمہ دار وہ خود ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس ناکامی کے ذمہ دار لارڈ ویول ہی ہیں اور وہ برطانوی گورنمنٹ ہے جس نے یہ تجاویز منظور کیں۔

ویول پیشکش کو مسلمانوں کے لئے ناقابل قبول ٹھہراتے ہوئے منشور لکھتا ہے:—

اگر پانچوں مسلمان بھی مسلم لیگ کے نمائندے ہوتے تو پانچ ہندو اچھوت سکھ اور دیسی عیسائی فکر و سیاسی، ثقافتی، معاشرتی تصورات کے اعتبار سے ہندوؤں کے قریب ہیں مسلمانوں کے مقابلے میں اکثریت ہوتے لارڈ ویول نے کمال یہ کیا کہ مسٹر جناح کو جو فہرست دکھائی اس میں چار نمائندے مسلم لیگ کو دئے گئے تھے اور ایک یونینسٹ پارٹی کو۔ گویا وائسرائے کی انگزیکٹو کونسل کے ارکان کی کل تعداد اگر ۱۴ ہونے والی تھی تو مسلم لیگ کے نمائندے اور واقعی مسلمانوں کے نمائندے ایک تہائی سے بھی کم ہوتے۔ مسٹر جناح کو لارڈ ویول نے جان بوجھ کر ایسی حالت میں مبتلا کیا کہ وہ اسی طرح ویول تجاویز کو قبول کرنے سے انکار کریں جس طرح کہ انھوں نے کیا۔

خلافت :— مرکزی خلافت کمیٹی کا اخبار کانفرنس کی ناکامی کا ذمہ دار کانگریس اور حکومت دونوں کو قرار دیتا ہے۔ لکھتا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ مسلم لیگ اور قائد اعظم نے جو کچھ کیا ہے وہ مسلمانوں کے مفاد کے عین مطابق تھا۔ پوری قوم اس سے متفق ہے اور جرأت و استقلال کے اس مظاہرہ پر قائد اعظم اور مجلس عاملہ پر مسلمانوں کا اعتماد اور بڑھ گیا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے لیڈروں کے اس طریق کار سے مسلمان بدل ہو جائیں گے وہ احمقوں کی جنت میں بستے ہیں اور محض شیخ چلی ہیں۔

کانگریس نے ویول اسکیم کے سلسلہ میں جو کچھ کیا ہے کیا کوئی ایماندار اور باانصاف آدمی اس کا اصول پرستی جمہوریت نوازی یا سچ سے ذرا سا بھی تعلق ثابت کر سکتا ہے۔

خیر یہ تو جو کچھ بھی ہوا برا ہونے کے باوجود اچھا ہوا کیونکہ دنیا کو کانگریس کی خود غرضی اور حکومت کی کنبہ پروری معلوم ہو گئی جس نے پنجاب کے ٹوڈیوں اور ان کے قبلہ گاہ گلینسی کی خاطر مسلم لیگ کے ویول اسکیم کی طرف بڑھنے کا راستہ بند کر دیا۔

مسلم لیگ نے حکومت سے نئے انتخابات کا بھی مطالبہ کیا ہے یہ مطالبہ بالکل درست ہے اور حکومت کا فرض ہے کہ وہ اسکو پورا کرے اگر انتخابات ہوئے تو اسوقت بھی مسلمانوں کو اپنی یک جہتی و اتحاد کا ثبوت دینا پڑے گا۔

نوائے وقت :— لاہور کا ترقی پسند مسلم لیگی اخبار نوائے وقت کانفرنس کی ناکامی کی ذمہ داری کانگریس پر ڈالتا ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ شملہ کانفرنس کامیاب نہیں ہوئی۔ مگر جہاں تک مسلم لیگ کے رویہ اور اس رویہ کے اثرات کا تعلق ہے۔ ہمارا نظریہ

سے او نچا ہے۔ لیگ نے ان پندرہ دنوں میں اپنے کسی معمولی اصول سے بھی دستکش ہونا گوارا نہیں کیا۔ لیگ نے عہدوں اور عارضی اقتدار کے لئے گراوٹ نہیں دکھائی۔ پورے پندرہ دن لیگ کے خلاف پروپیگنڈا کی ایک ایسی مہم جاری رہی۔ جو شدت اور بددیانتی میں اپنی مثال نہیں رکھتی۔ مگر لیگ کے رہنماؤں کے پائے ثبات میں ایک لمحہ کے لئے بھی لغزش پیدا نہیں ہوئی۔ مسٹر جناح نے اپنا یہ قول سچ ثابت کردکھایا کہ دنیا کی کوئی طاقت انھیں اس پر مجبور نہیں کرسکتی کہ وہ کوئی ایسا سمجھوتہ کریں۔ جس سے مسلمانوں کے مفاد کو نقصان کا احتمال ہو اور انھوں نے یہ بھی سچ ثابت کردکھایا کہ لیگ کو نظر انداز کرکے کوئی اسکیم اس ملک میں نافذ نہیں کی جاسکتی اب کانگریسی لیڈر اس پر پشیمان ہو رہے ہیں کہ ہم نے حکومت کی اتنی خوشامد کی اور اس کی خاطر اپنے سبھی اصول چھوڑ دئے لیکن اس کے باوجود ہماری بات نہ مانی گئی اگر وہ حکومت کی خوشامد کی بجائے مسلمانوں سے منصفانہ تصفیہ کی کوشش کرتے تو انھیں اپنے اصول بھی نہ چھوڑنے پڑتے اور ناکامی بھی نہ نصیب ہوتی۔

انقلاب لاہور:۔ جو پنجاب کی اتحادی پارٹی کا غیر سرکاری آرگن ہے اور جو پہلے سر سکندر حیات خاں کا حامی تھا مسلم لیگ کی پالیسی کو درست قرار دیتا ہے۔ اسکی رائے ہے۔

ہمیں شملہ کانفرنس کی ناکامی پر دلی افسوس ہے۔ اس کانفرنس میں مسلم لیگ نے جو پوزیشن اختیار کی وہ بالکل درست تھی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے جداگانہ حقوق کا تعین اور ان کو تسلیم کرانے کی جدوجہد کا سہرا صرف مسلم لیگ کے سر ہے۔

کانگرس آغاز سے ہندوؤں کے اقتدار کی علمبردار ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی سب سے بڑی نمایندہ جماعت ہے لیکن وہ دیدہ و دانستہ ان حقائق سے اعراض کر رہے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ مسلمان ہندوؤں پر قطعاً اعتماد نہیں کرتے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو ہندوؤں کے علاوہ مسلمانوں کا بھی نمائندہ بتلاتے ہیں اور حکومت انگریزی سے خوشامدانہ استدعائیں کر رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو جن کی نمائندہ مسلم لیگ ہے۔ بالکل نظر انداز کردے اور کانگرس ہی کو سب اختیارات سونپ دے۔

سرفراز:۔ شیعہ پولیٹکل کانفرنس کا آرگن مسلم لیگ کے واحد نمایندگی کے دعویٰ کی تردید کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

لارڈ ویول اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ صوبۂ سرحد کے مسلمان اور ان کی نمایندہ صوبائی حکومت کے ارکان مسلم لیگ میں شامل نہیں ہیں شیعوں کی سی اہم مسلم اقلیت مسلم لیگ کے باہر ہے اور متعدد مسلم نیشنلسٹ ادارے مسلم لیگ کی نمایندگی کی تردید کر رہے ہیں تو وہ صرف چند لیگی لیڈروں کی خاطر سے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کیوں کر مان سکتے ہیں۔

مسلم لیگ کو شملہ جاکر یہ بخوبی معلوم ہوگیا کہ ملک میں اسکی صحیح پوزیشن کیا ہے اور ان حالات میں کیا یہ امید کی جائے کہ مسلم لیگ کے تاریخ حکومت برطانیہ سے اپنے دعویٰ یکتائی کو منوانے کی سعی لاحاصل کرنے کے بدلے اپنے اولین فرصت کے لمحات میں اس تلخ حقیقت پر غور وخوض کرے گی کہ آخر وہ کیا وجوہ و اسباب ہیں جن کی بناء پر ملک کے کل مسلمان اُس کے ساتھ نہیں ہیں اور اُسے اپنی پالیسی اور طرز عمل میں کون سی تبدیلی کرنا چاہئے جس کے بعد اس کا دعویٰ نمایندگی واقعاً مستحق احترام قرار پاسکے؟

ہند۔ کلکتہ:۔ کلکتہ کا قوم پرست اخبار ہند کانفرنس کی ناکامی کا ذمہ دار مسٹر جناح کو قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ۔

سارے ملک کی نگاہیں شملہ پر لگی ہوئی تھیں، اور امید تھی کہ مسٹر جناح اپنے ملک و مذہب کے بیکس، مفلس، محتاج کروڑوں انسانوں پر رحم کھائیں گے۔ مگر انھیں نہ تو بیواؤں کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں، اور نہ لاکھوں آدمیوں کی بھوک اور کپڑے کی تنگی سے چیخ و پکار۔ عورتوں کو ستر چھپانے اور مردوں کو کفن بھی نہیں ملتا ہے،

ان ہی واقعات کو سامنے رکھ کر کانگریس اور مسلم لیگ کو حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہئے تھی تاکہ اپنے بھائیوں کی اس آڑے وقت میں خدمت کرسکیں، مگر قائداعظم چنگھاڑ اُٹھتا ہے اور انا ربکم الاعلیٰ تم کیسے کچھ کرسکتے ہو؟ میں تمھارا رب اکبر ہوں، میری اطاعت کرو، کان کھول کے سُن لو کہ میں اپنی زندگی میں ہندوستان کو سفید آقا کے جوتوں کے نیچے سے اُٹھنے نہ دونگا۔

تیج۔ دہلی۔ دہلی کا کانگرسی اخبار تیج لکھتا ہے:۔

گویا کانفرنس کے خاتمہ کی جو افسوسناک تصویر ہے اسے بنانے میں

تبصرے

فیصلۂ ہندوستان

چار سو پچاس صفحوں کے حجم کی یہ کتاب ایک انگریز جرنلسٹ بیورلی نکلسن کی انگریزی تصنیف ورڈکٹ آن انڈیا (VERDICT ON INDIA) کا ترجمہ ہے جسے عبدالقدوس ہاشمی صاحب نے کیا ہے۔ قیمت پانچ روپے کلدار، پانچ روپے بارہ آنے سکۂ عثمانیہ ملنے کا پتہ ادارۂ اشاعت اردو حیدرآباد (دکن)

کتاب کا اردو نام "فیصلۂ ہندوستان" اصل۔ یعنی (VERDICT ON INDIA) کا صحیح ترجمہ نہیں معلوم ہوتا۔ کسی اور موزوں اور خوشگوار نام کی ضرورت تھی۔

بیورلی نکلسن ایک انگریز جرنلسٹ ۱۹۴۳ء میں "الائیڈ نیوز پیپرس" کے نامہ نگار کی حیثیت سے ہندوستان آیا اور یہاں بیمار پڑ گیا اور طویل عرصے تک بیمار رہا۔ مرض کے دوران میں اس نے ہندوستان کی سماجی، معاشی اور سیاسی زندگی کے کچھ خاص پہلوؤں کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی، جو کچھ دماغ میں آیا اسے ایک کتاب کی صورت میں پیش کردیا۔ زیر نظر تصنیف اسی کا ترجمہ ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ مرض کے دوران میں آدمی کے دماغ میں جھلاہٹ اور چڑچڑاپن نارمل سے زیادہ ہوتا ہے اور بعض اوقات تو تیز بخار کی کیفیت میں ہر شے پیلی پیلی اور خزاں آلود نظر آتی ہے آنکھیں تک JAUNDICED یعنی یرقان زدہ ہوجاتی ہیں۔ چنانچہ بیورلی کی یرقان زدہ آنکھوں میں ہندوستان کی ہر شے کا رنگ بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ بنیادی طور پر اس کے تاثرات (IMPRESSIONS) اور ردِ عمل کو صحیح اور جائز تسلیم کر لینے پر بھی اس حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہے کہ پوری تصنیف پر اس کی ذاتی اور قومی عصبیت اور جھلاہٹ کا گہرا رنگ چڑھا ہے جو اس کے لب و لہجہ اور طرزِ تخاطب میں بھی نمایاں ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مثال کے طور پر اس کے اس خیال کے صحیح ہوتے ہوئے بھی کہ "ہندو مذہب ایک معجون مرکب بن گیا ہے۔ اس میں ادنیٰ شہوانی جذبات کو مشتعل کر لیا گیا ہے" یہ کہنا کہاں تک صحیح مانا جا سکتا ہے کہ ٹیگور کی شاعرانہ حیثیت ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس W.B. YEATS کی رہینِ منت تھی۔ حالانکہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کئی درجن ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس نہایت آسانی کے ساتھ ٹیگور کے کوٹ کی اوپر کی جیب میں آسکتے تھے۔ بعض اوقات تو اس کا تجزیہ بے حد سطحی اور مضحکہ خیز سا معلوم ہونے لگتا ہے اور پڑھنے والے کو واضح طور پر یہ احساس ہوجاتا ہے کہ یہاں پر حاکم قوم کا ایک خود پرست اور خود بیں فرد اپنے محکوموں پر حقارت کی نظر ڈال رہا ہے۔ "ہم نے ہندوستان کو آزادی کی دولت بخشی۔ کیونکہ ملٹن، لاک، مل، برائٹ اور گلیڈ اسٹون کے اعلیٰ خیالات ہی کی بدولت سب سے پہلے ہندوستانیوں کے دماغ روشن ہوئے"۔ بیورلی نکلسن کی یہ بکواس سراسر مہمل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جرنلزم نام ہی ہے سطحیت کا چنانچہ اس بیچارے نیم جاہل انگریز جرنلسٹ سے تاریخی حالات کے گہرے سائنٹفک تجزیے کی امید کرنا ہی غلط ہے۔

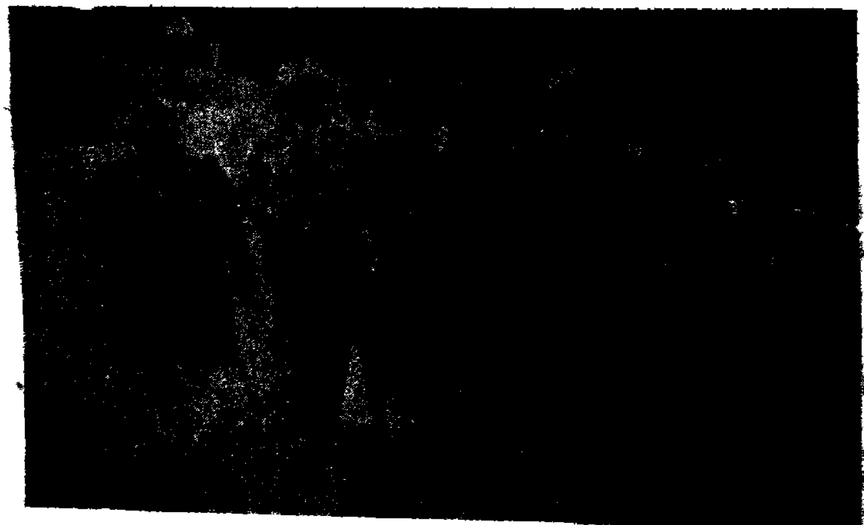
اب اس بیچارے کو کون سمجھائے کہ صنعتی سرمایہ داری اور سامراجیت کے اس عہد میں اگر ہندوستان میں انگریزوں کے پاک قدم نہ بھی آتے تو بھی ہندوستان اس عہد اور اس کی سماجی اور معاشی طاقتوں سے دوچار ہونے کے بعد خیالات اور فکر کے ان دھاروں کی طرف آتا ہی بلکہ اس حالت میں وہ آزادی کا زیادہ پرستار اور آزادی کا زیادہ قدردان ہوتا اس لئے کہ آزادی اور جدید صنعت کا اتحاد اسے خوشحالی، سکون و آرام، تہذیبی اور تمدنی دولت سے مالا مال کر دیتا۔ پھر جس ملک کی تاریخی روایات چاند بی بی، شیر شاہ اور رانا پرتاپ، کی حب الوطنی اور بہادری کے کارناموں پر مشتمل ہوں اسے آزادی اور حب الوطنی کا سبق سیکھنے کے لئے دنیا کی کسی بھی قوم کا رہینِ منت ہونے کی ضرورت نہیں چہ جائیکہ ایک ایسی قوم جو سات سمندر پار رہتی ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کتاب کے جس باب میں جاہل ہندوستانی عوام کے صدیوں کے توہمات اور مذہبی عقائد کا تذکرہ ہے وہاں صداقت کا عنصر موجود ہے لیکن یہاں پر بھی لب و لہجہ میں غیر ملکی عصبیت کی واضح جھلک پائی جاتی ہے۔

ان تمام حقائق کے باوجود کتاب کا مطالعہ ہم ہندوستانیوں کیلئے



مسٹر جناح ' تارا سنگھ ' خضر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب کی ملاقات



مسلم لیگی رہنما شملہ میں

کفایت شعاری کے دشمن



فضول خرچ

اس خوشحال زمانہ میں جبکہ ہر چیز افراط تھی، آپ اپنے کپڑوں کو دھونے کے لئے ضرورت سے زیادہ صابن کی جگہ جھاگ استعمال کرتے تھے تو کوئی حرج نہ تھا - لیکن اس زمانہ میں جبکہ قدم قدم پر کفایت کی تاکید ہورہی ہے کپڑے دھونے کے اچھے صابن کے استعمال میں احتیاط کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی خانگی ضروریات کی دوسری چیزوں کے استعمال میں - اگر آپ کپڑوں کو نہایت صاف اور پھر بھی کفایت کے ساتھ دھونا چاہیں تو ان زریں اصولوں کی پابندی کیجئے —



کپڑوں کو گرم پانی میں اچھی طرح بھگو دیجئے تاکہ میل پھول جائے -



۵۰۱ صابن کا کفایت سے استعمال کیجئے اور اپنے کپڑوں پر حسب ضرورت لگائیے تاکہ صابن کی بھی بچت ہو اور کپڑے بھی محفوظ رہیں -



کپڑوں کو صاف پانی میں اچھی طرح دھو ڈالئے تاکہ صابن کا اثر دور ہو جائے اور ان میں کہیں میل کا نام بھی باقی نہ رہے اور پھر آپ ان ستھرے کپڑوں پر فخر کر سکیں گے -

501

۵۰۱ واشنگ سوپ

ٹامکو سیلز ڈیولپمنٹ

[illegible] اسکوائر الہ آباد -

دلچسپ اور معلومات افزا ہے تاکہ ہمیں یہ اندازہ ہو کہ ہمارے حاکم دشمن ہمارے متعلق غلط یا صحیح کیا سوچتے ہیں۔

ترجمہ عمدہ اور دلچسپ ہے۔

نوٹ:۔ جو حضرات اس کتاب کے جواب میں کسی تصنیف کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ بین الاقوامی شہرت کے انگریزی ادیب بیورلی نکلس کی کتاب (INDIA'S ANSWER TO THE WEST.) کا مطالعہ فرمائیں۔ پھر ایک مشہور انگریزی خاتون کی تصنیف VERDICT ON VERDICT کا تذکرہ بھی لازمی ہے جو خاص طور پر بیورلی نکلس کے جواب میں لکھی گئی ہے۔

سالنامہ ادبِ لطیف ۴۵ء

۔ سالنامہ ادب لطیف جس میں مارچ و اپریل دونوں نمبر شائع ہیں۔ حجم ۱۷۲ صفحات۔ کاغذ اور لکھائی چھپائی عمدہ۔ زیر نظر شمارے میں چھ مقالے بارہ نظمیں اور چودہ افسانے شامل ہیں۔ لکھنے والوں کی فہرست میں اردو کے تقریباً تمام اولین صف کے ادیب و شاعر موجود ہیں چنانچہ زیر نظر شمارہ ان تمام صفات اور خصوصیات سے مزین ہے جو "ادب لطیف" کی شگفتہ روایات میں داخل ہیں اعلیٰ معیار کا تخلیقی ادب ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر فراہم کرنے اور اسے عوام تک پہنچانے اور اسے مقبول عام کرکے قارئین کے ادبی اور فنی ذوق کو رچنے اور بلند کرنے میں ادب لطیف نے جو حصہ لیا ہے وہ اردو کی ادبی تاریخ میں مستقل اور نمایاں جگہ پانے کا مستحق ہے۔ مقالات کے سلسلے میں نئے نرادے کے دوسرے ایڈیشن کا دیباچہ مصنفہ کرشن چندر بہت اہم ہے افسانہ نگاروں کی فہرست میں اختر اورینوی کرشن چندر اور عصمت کے نام رسالہ کو اہمیت دینے کے لئے کافی ہیں۔ نظموں کے صفحات پر ن۔م راشد ایک عرصہ کے بعد نظر آئے ہیں اور میراجی تو لابدی طور پر موجود ہیں۔ سلام مچھلی شہری کی تازہ ترین مطبوعہ نظم جو غالباً وہی ہے جو اس نمبر میں شامل ہے) دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ لاشعوریت اور ابہام کا جو رجحان ان کے اندر پیدا ہو چلا تھا اس سے اب وہ کنارہ کشی اختیار کر رہے ہیں جو صحت مندی کی نشانی ہے۔

اردو کے ہر پبلک اور ذاتی کتب خانے میں ادب لطیف کے اس نمبر کا موجود ہونا قطعی ضروری ہے ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ ادب لطیف لاہور۔

ساقی

ساقی دہلی افسانہ نمبر بابت جولائی ۱۹۴۵ء قیمت سوا روپئے۔ کل ملاکر چھتیس افسانے ہیں۔ افسانہ نگاروں کی فہرست میں دیوندر ستیارتھی، بلونت اشک اور ظفر قریشی کے علاوہ اور کوئی معروف افسانہ نگار نہیں ہے۔ دو پرانی افسانہ نگار خواتین حجاب امتیاز علی اور طاہرہ دیوی شیرازی کے افسانے پڑھ کر دو دو افسانہ نگاری کے ایک گئے گذرے دور کی یاد تازہ ہو جاتی ہے میراجی کے "باتیں" میں ان کے بے تکلف اسٹائل کے علاوہ اور کوئی دلچسپ بات نظر نہیں آئی۔ بلکہ بعض مقامات پر تو وہ BORE کرنے لگتے ہیں۔ جھلکیاں میں حسن عسکری بدستور انگریزی کے ام۔ اے کلاس میں کوئی ہوم ٹاسک سناتے ہوئے نظر آتے ہیں جس میں کوئی درجن بھر فرانسیسی اور انگریزی آدمیوں کے نام گنوا کر پڑھے اردو قارئین کو دھمکانے کی کوشش کارفرما ہوتی ہے۔ بہرحال بحیثیت مجموعی تمام افسانے دلچسپ ضرور ہیں اور فن اور موضوع دونوں کے اعتبار سے افسانہ نگاری کے تازہ رجحانات کی نمائندگی کرتے ہیں۔

پریم۔ جولائی ۴۵ء:۔

پریم اردو کا ایک تازہ ادبی رسالہ ہے جو جموں کشمیر سے حال ہی میں نکلنا شروع ہوا ہے۔ قیمت فی پرچہ آٹھ آنہ۔ چندہ سالانہ پانچ روپئے۔ سرورق کاغذ اور لکھائی چھپائی عمدہ ہے زیر نظر شمارہ کا حجم اٹھائیس صفحات ہے ادب قدیم اور ادب جدید سے متعلق شروع میں دو پرلطف مضامین ہیں۔ اول الذکر اثر لکھنوی صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہے جس میں ایک پامال اور فرسودہ موضوع پر پھر انھیں پرانے (OUT-OF DATE) خیالات کا اعادہ کیا گیا ہے جن پر ادیبوں اور قارئین کی نئی نسل ذرا برابر بھی کان نہیں دھرتی۔ ایک مقالہ میں کشمیر کے موجودہ ادیبوں اور شاعروں کی ایک طویل فہرست پیش کی گئی ہے بقیہ مضامین اور افسانے دلچسپ ہیں اور عام قارئین ان کا مطالعہ کرنے کے بعد لطف اور فائدہ اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بحیثیت مجموعی رسالہ غنیمت ہے۔ اور کشمیر جیسے مقام سے ایک ادبی رسالے کی پیدائش یقیناً لائق خیر مقدم ہے۔ ملنے کا پتہ دفتر پریم جموں۔

ہندوستان کے فلمی مورخ سہراب مودی معطلہ وڑکا ایک اور شہ پارہ پیش کرتے ہیں

منروا مووی ٹون کا تازہ بلند پایہ کارنامہ

ایک دن کا سلطان

ہندوستان کے اس شہنشاہ کی کہانی جو صرف ۲۴ گھنٹے کیلئے دہلی کے تخت پر بیٹھا تھا

ڈائرکٹر: سہراب مودی کہانی و مکالمے: آغا جانی کاشمیری گانے: ولی صاحب

اداکار: آہو چشم مہتاب۔ واسطی۔ صادق علی۔ غلام محمد۔ شاہ تارن۔ پرتیما دیوی۔ غوری۔ غلام حسین۔ آے شاہ اور دوسرے سینکڑوں اور ہزاروں اداکار

پکار۔ سکندر اور پرتھوی ولبھ کے ٹکر کی تاریخی تصویر

منروا اسٹوڈیو میں تکمیل کے آخری مراحل طے کر رہی ہے

WORLD RIGHTS CONTROLLED BY:—

INDIA CINE PICTURES LTD. BOMBAY 7.

۱۹۲۵ء کی سنسنی خیز کتاب ورڈکٹ آن انڈیا مصنفہ بیورلی نکلسن کا اردو ترجمہ

فیصلہ ہندوستان

مترجمہ علامہ عبدالقدوس ہاشمی

اس کتاب کے شائع ہوتے ہی ہندوستانی اخبارات نے لعن طعن غم و غصہ کا اظہار کیا اور کانگرسی افراد نے حکومت ہند سے اسکو ضبط کرنے کی خواہش کی۔ فی الحقیقت اس میں ہندوستانی معاشرت، سیاست، تہذیب و تمدن کی عریاں تصویر پیش کی گئی ہے اس کتاب کا خلاصہ یہ ہے۔ ہندوستانی اخلاق و تمدن پر ضرب کاری ہندوستانی رہنماؤں پر عمل جراحی۔ ہندوستانی تہذیب و معاشرت پر سخت حملہ۔ ہندوستانی سیاست و صحافت پر محققانہ تبصرہ مسئلہ پاکستان پر معرکہ آرا بحث۔ ہندوستانی رگ حمیت پر نشتر زنی۔ ہندوستان کی مشہور و معروف سیاسی و غیر سیاسی شخصیتوں سے ملاقات

یہ کتاب ہم ہندوستانیوں کے لئے باعث عبرت ہے ضخامت 450 صفحات مجلد رنگین گرد پوش قیمت **پانچ روپیہ**

ہماری ہر دلعزیز مطبوعات

کتاب	روپیہ - آنہ
روح اقبال ۔ یوسف حسین	5-12
مقام اقبال ۔ اشفاق حسین	3-14
آثار اقبال ۔ دستگیر رشید	3-12
فکر اقبال ۔ رشید ایم اے	4-0
حکمت اقبال ۔ رشید ایم اے	4-0
فلسفہ عجم ۔ علامہ اقبال	3-2
نگارشات محمد علی ۔ جعفری	3-12
افادات محمد علی ۔ جعفری	3-12
مقالات محمد علی ۔ دو حصے مکمل	7-8
مکالمات ابوالکلام ۔ عقیل	3-12
یقین و عمل ۔ عبدالقدوس ہاشمی	2-8
قصص و مسائل ۔ عبدالماجد دریابادی	1-12
کاروان علم ۔ فیض صدیقی	3-0
اسلامی تہذیب کیا ہے؟	2-8
ٹیگور اور انکی شاعری ۔ مخدوم	1-8
داستان اردو ۔ نصیر حسین خیال	1-12
آنیت ۔ شاہد رزاق	2-12
داستان کربلا ۔ سعید صدیقی	2-14
تنقیدی جائزے ۔ احتشام حسین	3-12
تنقیدی حاشیے ۔ مجنوں گورکھپوری	3-12
ترقی پسند ادب ۔ عزیز احمد	2-14
میخانۂ ریاض ۔ تسنیم چتائی	3-4
بچوں کی نفسیات ۔ شبیر محمد اختر	1-12
نفسیات زندگی ۔ "	1-12
تقدیریں ۔ منظور بخاری	1-0
اسرار ۔ علی اختر	2-12
محسوسات ماہر ۔ ماہر القادری	2-12
نغمات ماہر ۔ "	3-0
ذکر جمیل ۔ "	1-12
سراب ۔ مجنوں گورکھپوری	3-4
صید زبوں ۔ "	2-0
سرنوشت ۔ "	2-0
دعوے ۔ فضل حق قریشی	2-12
آجکل کے افسانے ۔ "	3-0
ضیغم ۔ سعیدہ مظہر	1-8
جلوۂ رنگیں ۔ نصیر الدین	3-0
تعبیریں ۔ ابن شعر قیوری	2-14
نگینے ۔ مظفر حسین شمیم	2-12
کروٹیں ۔ قدوس صہبائی	2-12
زلزلے ۔ "	2-12
گرداب ۔ احمد ندیم قاسمی	3-4
سیلاب ۔ "	3-8
انگڑائیاں ۔ "	3-4
دھوپ ۔ قیسی رامپوری	3-4
سزا "	2-4
خطا "	3-0
غبار "	2-4
رنگین سپنے ۔ کوثر چاندپوری	2-12
مسکراہٹیں "	2-12
کردار ۔ ماہر القادری	2-4
زندگی کی ٹھوکریں ۔ جعفری	3-4
زندگی کے نئے زاویے ۔ جعفری	3-0
افسانے ڈرامے ۔ منٹو	2-12
لہریں ۔ شفیق الرحمن	2-14

چوہدری اقبال سلیم گاہندری مہتمم ادارۂ اشاعت اردو عابد روڈ حیدرآباد (دکن)

میری دکھ بھری داستان

کسی ایک بیماری کا علاج جب ڈاکٹر لوگ نہیں کر سکتے تو اسکا علاج قرار دیتے ہیں کہ پاگل خانے میں [illegible] تنگ آ کر جنگلوں میں رہنے والے [illegible]
لگے کہ شاید ایسے ہیں کہ ایک دفعہ تو موت بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔ [illegible] میری کہانی سنئے کم عمری کی بات ہے [illegible]
پکڑ طرح طرح کی بیماریوں میں پھنس کر رہ گیا جسم کھوکھلا ہو کر [illegible] آنکھیں اندر کو دھنس گئیں۔ دل دھڑکنا [illegible]
دوائیوں پر صحت کے لئے دھن برباد کر کے تنگی سے مایوس ہو بیٹھا۔ میری خوش قسمتی کہ مجھے [illegible] وہاں ایک عرس تھا میں بھی وہاں چلا گیا وہاں ہر سال [illegible] فقیر
زیارت کو آتے ہیں [illegible] شام کو سیر کرتا ہوا ایک پہاڑی کے کنارے [illegible] میں نے وہاں اچانک جو دیکھا تو ایک درویش فقیر پہاڑی سے میری طرف تکتے ہوئے
مکانی سے چہرہ پر جلال تھا جیسے [illegible] پوچھا [illegible] پھر [illegible]
کہا کہ انہوں نے سبز رنگ کی ایک بوٹی کھانے کو دی [illegible] اس خدا رسیدہ [illegible] کہ [illegible] میرا جسم [illegible]
اس معجزہ کو دیکھ کر میں نے فقیر کے پاؤں پکڑ لئے اور میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے انہوں نے ہمدردی سے پوچھا بیٹا شام کے وقت جنگل میں کیا اور رونا کیسا ہے؟
میں نے تمام حکیموں ڈاکٹروں کی [illegible] اس فقیر نے مجھے [illegible] اپنے مقام رہائش پر جہاں وہ اترے ہوئے تھے لے گئے اور کہا کہ [illegible] لوگوں کی
بھلائی کو [illegible] کا بھلا ہو سکتا ہے میں نے ہاتھ جوڑ کے [illegible] اس پر فقیر نے دو نسخے لکھ دیئے اور کہا کہ اب جاؤ بیٹا [illegible] دیکھیں کا [illegible] تاثیر!
[illegible] فقیر کی [illegible] میرے اندر جوش پیدا ہو گیا [illegible] فقیر کے کہنے کے مطابق دونوں دوائیاں تیار کر کے استعمال کرنی شروع کیں
[illegible] آپ یقین کریں کہ پانچ چھ دن کے بعد ہی میری کایا پلٹ ہو گئی سب تکلیفیں دور ہو کر بجلی کی طرح طاقت اور جوش پیدا ہو گیا
[illegible] مرشد چند دن تک [illegible] گیارہ سال ہو چکے ہیں آج تک کسی دوا
کی ضرورت نہیں پڑی۔ خدا کی مہربانی سے [illegible] تندرست [illegible] میرے گھر میں ہیں۔ [illegible]
کا اثر خالی جاتا نہیں دیکھا۔ [illegible] مرشد کے ہاتھ سے کئے ہوئے وعدے اور دنیا کی بھلائی کے لئے اس دوائی کا [illegible] کرتا ہوں۔ اس لئے ہر قسم کی [illegible]
[illegible] سے پیدا ہونے والے تمام امراض [illegible] کی طرح [illegible] طاقت اور جوش پیدا ہوتا ہے۔ دوائی میں کسی قسم کی [illegible] نہیں ہے [illegible]
[illegible] استعمال کر سکتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ اس دوائی کے بعد [illegible]
تندرستی [illegible] صرف چار روپے [illegible]
[illegible] ہے۔

ضروری گذارش } [illegible] جو شخص [illegible] کو بے یقینی کی نگاہ سے دیکھتا ہے [illegible] کو سمجھتا ہے [illegible] یعنی ایمان کو جان کر قیمت واپس [illegible] آپ کا ایمان بھی ہے
[illegible] اس فقیر کے پیغام کی خبر گھر گھر پہنچا دیں۔

شرطیہ علاج اور وعدہ } [illegible] اور مسلمان کو ایمان کی قسم ہے کہ [illegible] دوائی کے استعمال سے حسب وعدہ فائدہ نہ ہو تو [illegible] کر
قیمت واپس منگائیں۔ [illegible] کسی کا پیسہ رکھنا گناہ سمجھتا ہوں۔

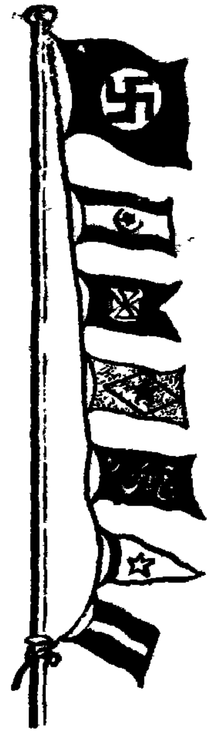
پتہ:- صوفی ایم اے خان - پوسٹ بکس نمبر 261 N.G.A. لاہور

سندھیا اسٹیم نیویگیشن کمپنی لمیٹڈ

ہندوستان میں تجارتی جہازرانی کے پیشرو

ایجنٹ

نروتم مرارجی اینڈ کمپنی



مال اور مسافروں کی سروس

مال اور مسافروں کی بکنگ اور روانگی کی تاریخوں کے لئے
براہ کرم سندھیا ہاؤس سے خط وکتابت کیجئے
کونکن کراچی اور ساحلی سروس کے لئے

ملحق کمپنیاں

- دی بنگال اسٹیم نیویگیشن کمپنی لمیٹڈ
- دی انڈین کاریئرز اور ٹرانسپورٹ کمپنی لمیٹڈ
- دی رتناگر اسٹیم نیویگیشن لمیٹڈ
- دی حج لائن لمیٹڈ
- دی بمبئی اسٹیم نیویگیشن کمپنی لمیٹڈ
- دی ایسٹرن اسٹیم نیویگیشن کمپنی لمیٹڈ

ہندوستان اور سیلون کی تمام
اہم بندرگاہوں پر برانچ آفس
ایجنسیاں موجود ہیں

سندھیا ہاؤس۔ بلارڈ اسٹیٹ بمبئی



وینا

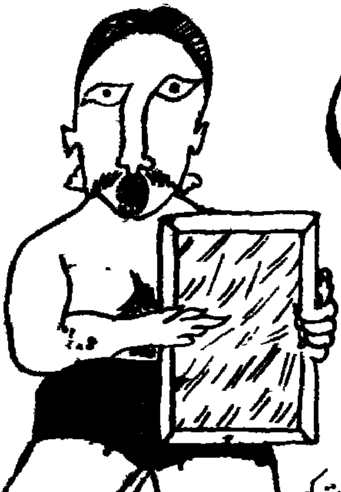
مظہر
آرٹ پروڈکشنز
کی
مُسلم کاسٹیوم پکچر
پہلی نظر

پروڈیوسر و ڈائرکٹر: **مظہر خاں**

اداکاران:- وینا، موتی لال، منوّر سلطانہ، نیمو، ببّو، مالک رام
بدھوا ڈوانی، نفیس بیگم، پروین، بملا اور ـــــ بابو راؤ پنڈھارکر

موسیقی: انل بسواس
کہانی مکالمے گانے: ڈاکٹر صفدر آہ

مظہر آرٹ پروڈکشنز۔ گیم کراس روڈ۔ دادر بمبئی



آئینۂ سکندری

عرف

ترکال درشی شیشہ

کہتے ہیں کہ سکندر بادشاہ کے پاس ایک آلہ تھا جس سے وہ دنیا کے سب آنے والے واقعات کو دیکھ لیا کرتا تھا۔ لیکن اب نہ وہ سکندر ہے۔ نہ وہ آلہ۔ اب اس دور جدید میں چشم مشتاق ایک ایسی چیز کو دیکھ رہی ہے جس کا نام ترکال درشی شیشہ ہے جس کی بدولت ساحر لوگ بے جان ہڈیوں کے پنجر میں روح پھونک کر اس سے بات چیت کر لیتے تھے۔ ہم نے اس عجیب و غریب نئے اصول جدت پر حیرت انگیز عمل کا آلہ ایجاد کیا ہے جس کی مدد سے آپ ہر قسم کے طلسمی سوالات جواب بڑی آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں۔ مثلاً گم شدہ کا پتہ چلانا اس دنیا اور دوسری دنیا کے عجائبات دیکھنا۔ تقدیر روزگار اور حیات و ممات کے متعلق سوالات پوچھنا۔ کیا ہمارا بیمار اچھا ہو جائے گا۔ اور میری آئندہ زندگی کیسے بسر ہو گی۔ مجھے کس قسم کی عورت ملے گی۔ دفینہ معلوم کرنا۔ پردیس گئے ہوئے کا پتہ لگانا۔ کیا تلاش روزگار کے لئے مجھے پردیس جانا پڑے گا۔ فلاں آدمی کیسا ہے۔ مجھے اس پر اعتبار کرنا چاہیئے۔ میری تقدیر میں کیا لکھا ہے۔ مجھے مقدمہ میں کامیابی ہو گی۔ میرے خواب کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ میرا آج دن کیسے گذرے گا۔ وغیرہ وغیرہ اس قسم کے سینکڑوں سوالوں کے جواب اس طلسمی شیشے سے دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ نیز ماضی، حال و مستقبل کے حالات۔ کسی مشکل کے حل ہونے یا نہ ہونے کا انکشاف۔ ارزانی و قحط کے آثار قبل از شروع سال معلوم ہو سکتے ہیں۔ درویش، شہیدوں۔ بلکہ تمام عزیزوں اور دوستوں کی روحوں سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ جو کہ مر چکے ہیں۔ بھوت پریت آسیب و جن بھی اگر گھر میں موجود ہوں تو وہ دفع کئے جا سکتے ہیں۔ افلاس و پریشانی دفع ہونے کی تدبیریں بھی ملیں گی۔ حب و بغض، مشکل کاموں میں کامیابی ہو سکتی ہے۔

جس عورت یا مرد کو کبھی نہ دیکھا ہو وہ اس آئینہ میں جلوہ گر ہو گا۔ ہر شخص کے سربستہ راز خفیہ اسرار پوچھو۔ بزرگان سلف سے باتیں کر لو۔

ہر قسم کے مرض کی تشخیص و نسخہ لکھا لو۔ غرض جو کچھ وغیرہ وغیرہ جو چاہو دریافت کر لو۔ اصلی ترکال درشی شیشہ سوائے ہمارے کارخانہ کے اندر بھر میں کسی اور جگہ سے آپ کو نہ مل سکے گا۔ ایک کا خریدا ہوا عمر بھر کام دے گا۔

ترکال درشی آئینہ واقعی پیسے کام کی چیز ہے۔ نوٹ :۔ اس شیشہ سے عورت مرد دونوں یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ باوجود ان تمام خوبیوں کے قیمت ترکال درشی آئینہ فی عدد صرف تین روپئے (۳ؔ)

منیجر موہنی بھنڈار رجسٹرڈ۔ (N.G.A.) دہلی

دی مغل لائن لمیٹڈ

حج سروس ۔ کراچی تا جدّہ

گورنمنٹ آف انڈیا کے اعلان کے مطابق جو کہ ۲۶ر جولائی یا اس کے بعد انگریزی و ہندوستانی زبان کے مخصوص اخباروں میں شائع ہو چکا ہے

حاجیوں کے جہاز کی روانگی از کراچی تا جدّہ

شرح ٹکٹ درجہ اوّل :۔ کرایہ آمدورفت از کراچی تا جدّہ مع طعام ۹۰۰ روپے

اس میں مندرجہ ذیل رقمیں شامل نہیں ہیں۔

۱۔ جدّہ میں صفائی کے انتظام کی فیس۔

۲۔ ساحلی کشتیوں کا کرایہ۔

۳۔ کامراں میں کپڑوں اور مال و اسباب کی جراثیم سوز صفائی کی فیس۔

ڈک :۔ کرایہ آمدورفت از کراچی تا جدّہ مع طعام ۲۵۰ روپے

اس میں مندرجہ ذیل رقمیں شامل نہیں ہیں۔

۱۔ جدّہ میں صفائی کے انتظام کی فیس

۲۔ ساحلی کشتیوں کا کرایہ

۳۔ کامراں میں کپڑوں اور مال و اسباب کی جراثیم سوز صفائی کی فیس

مزید معلومات کے لئے حج بکنگ آفیسر کامن ویلتھ ریلیشنس ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا نئی دہلی سے خط و کتابت کیجئے

کراچی ایجنٹ :۔

گرھامس ٹریڈنگ کمپنی (انڈیا) لمیٹڈ

میکلوڈ روڈ کراچی

ٹرنر مارسین اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶ بنک اسٹریٹ

بمبئی


اپنے ملک کی مدد کیجئے
اِس طریقے سے۔
ہر چیز کو جو آپ کے پاس ہو یا آپ استعمال کرتے ہوں زیادہ سے زیادہ عرصے چلایئے۔ اِن دنوں کفایت شعاری نہ صرف فیشن میں داخل ہے بلکہ یہ آپ کا قومی فرض بھی ہے۔ جب تک آپ اشیا کی موجودہ مانگ کو گھٹانے میں مدد نہ کریں، غریبوں کی شدید مشکلات دُور نہیں ہوسکتیں۔
کفایت شعاری سے آپ کو ذاتی طور پر بھی فائدہ ہوگا۔ جس قدر کم خرچ کریں گے اتنی ہی بچت ہوگی۔ جو روپے آپ خرچ نہ کریں وہ جمع ہوتے اور بڑی تیزی سے بڑھتے رہیں گے۔
کفایت شعاری سے قلتوں کو دفع کیجئے
۱ نلوں کی ٹونٹیاں کھلی یا رِستی ہوئی نہ چھوڑیئے۔ پانی کا زائد محصول کیوں دیا جائے؟
۲ بجلی کا خرچ گھٹایئے استعمال میں نہ ہوں تو روشنی اور پنکھے بند رکھئے۔
۳ غیر ضروری سفر کی بجائے گھر میں رہ کر روپیہ بچایئے۔
۴ مہنگے تحفے مت دیجئے۔
۵ عہد کیجئے کہ سال بھر تک نئے کپڑے نہ بنائیں گے۔
۶ چینی کی جگہ دھات کے برتن استعمال کیجئے۔
ضرورت کے بغیر کچھ نہ خریدیئے
حکومت ہند کے محکمۂ انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ نے شائع کیا

NAI ZINDAGI

نئی زندگی

ALLAHABAD

18



"مجھ سے سُنیئے۔ اِس سال میں ۵۵ برس کا ہو کر ملازمت سے سبکدوش ہو گیا۔ آپ میرے حال پر افسوس نہ کریں۔ مجھے کوئی فکر نہیں . . . میں نے اِتنا روپیہ جمع کر لیا تھا کہ ملازمت کے بعد فراغت سے بسر کر سکوں۔ آپ پوچھیں گے کس طرح؟ سیدھی سادی بات ہے۔ میں نے نوجوانی ہی میں بچت کی عادت ڈال لی تھی۔ اُس وقت مجھے کوئی بڑی تنخواہ نہیں ملتی تھی مگر میں ہر مہینے کچھ نہ کچھ بچا کر محفوظ مد میں لگاتا رہتا تھا۔"

ہر شخص ہزار یا پانچ ہزار روپے پس انداز نہیں کر سکتا۔ بہت سے لوگ جنہیں چند روپوں سے زیادہ کی بچت نہیں ہوتی، سرے سے روپیہ بچانا ہی بیکار سمجھتے ہیں۔ اُن کا خیال غلط ہے۔ معقول رقمیں جمع کرنے کا سادہ سا اصول یہی ہے کہ تنخواہ کتنی ہی تھوڑی کیوں نہ ہو، ہر مہینے کچھ نہ کچھ بچایا ضرور جائے۔ یہی معمولی بچت رفتہ رفتہ اتنی معقول اور کارآمد رقم بن جائے گی کہ آپ کو خود حیرت ہوگی . . . . باقاعدگی سے بچانے کا گُر سیکھئے۔

کل کا فکر آج کیجئے
جتنا بچا سکیں بچا لیجئے

مگر اپنی رقم کسی ایسی مد میں لگائیں جہاں یہ محفوظ رہے اور وقتِ ضرورت آپ کو مل سکے۔
نیشنل سیونگز سرٹیفیکیٹس، سرکاری قرضوں، ڈاکخانے کے سیونگز بینک کھاتے، بیمہ پالیسی، انجمن امداد باہمی اور بینک کے بچت کھاتے میں آپ بہت چھوٹی رقمیں بھی لگا سکتے ہیں۔ ان میں آپ کی رقم محفوظ رہے گی اور بڑھتی بھی رہے گی۔ خام یا صنعتی اشیا، جواہرات، زمین یا عمارات خرید کر اپنی بچت کو خطرے میں نہ ڈالئے۔ امکان یہی ہے کہ ان کی قیمت گھٹ جائے گی آئندہ کیلئے بچایئے اور احتیاط سے لگایئے۔

گورنمنٹ آف انڈیا کے محکمۂ فائنینس نے شائع کیا

اُردو زبان کا واحد کلچرل و سیاسی رسالہ

نئی زندگی الٰہ آباد

بانی:- ڈاکٹر سید محمود
سرپرست:- ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید
ایڈیٹر:- سید انیس الرحمٰن
جوائنٹ ایڈیٹر:- طفیل احمد خاں ایم اے

جلد ۵ | ماہ اکتوبر ۱۹۴۵ء | نمبر ۷

فہرست مضامین

۱	فکر و نظر	ایڈیٹر	
۲	رفتارِ عالم	طفیل احمد خاں۔ ایم۔ اے	۹
۳	عہدِ متوسط کے ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیبی خدمات	مسٹر ایس۔ کے بنرجی	۱۵
۴	دنیا انقلاب کے دروازے پر	تقی امروہوی	۱۹
۵	ابتدائی سماجی نظام	اینگلز	۲۳
۶	جنگ کے بعد دنیا کی تعلیمی ضروریات کیا ہونگی۔	امریکی صحافت نگار	۲۷
۷	جرمنوں کو کس طرح امن پسند بنایا جا سکتا ہے؟	امریکی ماہر تعلیم	۳۰
۸	اخبارات کی رائیں	ادارہ	۴۱
۹	ادبی تنقید	فراق گورکھپوری	۴۶
۱۰	سہارے (افسانہ)	صدیقہ بیگم	۴۹
۱۱	تبصرہ	ط۔ ا۔ خ	۵۳
			۱۴-۵۷

سالانہ چندہ:- پانچ روپے | ششماہی:- تین روپئے | فی پرچہ:- آٹھ آنے

مسٹر سید انیس الرحمٰن ایڈیٹر و پبلشر نے اسرار کریمی پریس جانسین گنج الٰہ آباد میں چھپوا کر دفتر رسالہ "نئی زندگی" الٰہ آباد سے شائع کیا

فکر و نظر

(جواہر لعل نہرو)

برطانیہ برطانیہ اب اپنا بوریا بستر باندھ رہی ہے۔ ہندوستان کے مسلمان یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ اس تیسری پارٹی (یعنی برطانیہ) کے نکل جانے کے بعد اُنھیں آپس کے اختلافات دور کرنے ہی ہوں گے۔ اس جنگ کے بعد برطانیہ اب دنیا کی ایک دوسرے درجہ کی طاقت ہو کر رہ گئی ہے اب ایک وسیع و عریض سلطنت کے ڈھانچے کو برقرار رکھنا اُس کی بس سے باہر ہے اور ہندوستان کو قبضے میں رکھنا تو اُس کے لئے اور بھی دشوار ہوگا۔"

انتخابات "مجھے انتخابات سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ اسی سبب سے آپ الیکشن بورڈوں میں میرا نام نہ پاتے ہوں گے۔ انتخابات میں فتح یابی سے آزادی کچھ قریب نہیں آجائے گی۔ پھر بھی انتخابات سے کم سے کم یہ فائدہ ہوگا کہ ہم بین الاقوامی دنیا کی رائے اور خیال کو متاثر کر سکیں گے اور اپنے موافق بنا سکیں گے۔"

"بے شمار دقتوں اور رکاوٹوں کے باوجود کانگریس نے انتخابات میں مقابلہ کرنے کی ٹھان لی ہے اور پوری طاقت کے ساتھ لوگوں کا فرض ہے کہ وہ کانگریس کے نمائندوں کی مخالفت نہ کریں۔ جہاں تک ہریجن سیٹوں کا تعلق ہے لوگوں سے امید ہے کہ کانگریس کے ٹکٹ پر جو ہریجن نمائندہ کھڑا ہوگا اُس کو ڈاکٹر امبیدکر کے کھڑے کئے ہوئے نمائندے پر ترجیح دی جائے گی۔ مسلمان نشستوں کے لئے کانگریس اور مسلم لیگ میں زبردست مقابلہ ہوگا۔ لیکن کانگریس کے کارکنوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ انتخابات کے سلسلہ میں کسی قسم کی غلط روی سے کام نہ لیں۔ کسی کو مجبور نہ کریں اور نہ مخالفین کی زبردستی والی چال کے سامنے دبیں۔ اگر وہ برطانوی سامراج کو چیلنج کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو "چھوٹ بھیا" لوگوں کا مقابلہ کرنے میں انھیں کوئی دقت نہ ہوگی لیکن وہ انتخابات کے دوران میں کبھی بھی کوئی ایسی حرکت نہ کریں جو کانگریس کے وقار اور شان سے گری ہوئی ہو۔"

پاکستان "مجھے پاکستان پسند نہیں اور میں یقیناً دوسروں کو بھی پاکستان کی مخالفت کرنے پر آمادہ کروں گا۔ اسی طرح جو لوگ پاکستان کے موافق ہیں وہ بھی اپنے خیال کی اشاعت کا حق رکھتے ہیں۔

"امید ہے کہ مسلمان بھائی اس مسئلے پر اچھی طرح غور کریں گے اب ہندوستان کی آزادی کے دن قریب آگئے ہیں۔ ہمارے آپس کے جھگڑوں کو طے کرنے کے لئے تیسری پارٹی نہیں رہے گی۔ اب ہندو اور مسلمانوں کو اپنے جھگڑے خود ہی طے کرنے ہوں گے۔ ان حالات میں کسی کے لیے موقع پر کوئی ایسی حرکت کرنا جس سے اشتعال پیدا ہو سراسر غلط ہے اور اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

"اگر پاکستان کو منظور بھی کر لیا گیا تو اس سے ان صوبوں کے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہ ہوگا جہاں وہ اقلیت میں ہیں۔ ہاں ایک صورت البتہ ہے، وہ یہ کہ آبادی کا تبادلہ ہو جائے۔ لیکن یہاں پر بھی اس بات کی امید کرنا کہ انگریز یہ سب کچھ کریں گے غلط امید وابستہ کرنا ہے بلکہ اُلٹا وہ تو یہاں سے اب بوریا بستر باندھ کر بھاگنے کی تیاری کر رہے ہیں۔"

ہندوستانی قومی فوج "ہندوستان کی قومی فوج میں جو شامل ہیں وہ بہادر اور ہمت ور لوگ ہیں انھوں نے اپنے عمل سے اس الزام کی تردید کر دی کہ ہندوستان میں

کچھ علاقے ایسے ہی یہاں کے لوگ غیر ملکی طاقت کے خلاف اپنا قومی تحفظ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ہندوستان میں لوگوں کو ترقی کے بہت کم مواقع دیئے جاتے ہیں۔ برما اور ملایا کے واقعات نے اس نظریئے کو غلط ثابت کر دیا کہ دنیا میں کچھ قومیں فطری طور پر فوجی صلاحیتوں سے محروم ہوتی ہیں اور کچھ قومیں ان سے متصف ہوتی ہیں۔ دوسری بات یہ ثابت ہو گئی ہے کہ ہندوستان کے لوگ بھی اتنے ہی اچھے ٹیکنیکل ماہرین بن سکتے ہیں جس قدر کہ غیر ملکوں کے لوگ اب یہ سوچکر افسوس ہو رہا ہے کہ ایسے بہادر اور کار آمد لوگوں کے خلاف کورٹ مارشل ہونے جا رہا ہے۔ کانگریس نے اُن کے قانونی بچاؤ کے لئے ایک کمیٹی بنائی ہے جس میں ملک کے مشہور وکلا اور بیرسٹر ہیں لیکن ملک کا مطالبہ تو بہر حال یہ ہے کہ ان لوگوں کے خلاف قطعی کوئی قدم نہ اُٹھایا جائے۔ صحیح بات تو یہ ہوگی کہ انھیں رہا کر دیا جائے۔ اس لئے کہ قانونی نکتہ نگاہ سے دیکھا جائے تو در اصل ان کی حیثیت جنگی قیدیوں کی سی ہے اسلئے کہ انھوں نے گویا ایک آزاد ملک یعنی "آزاد ہند" کی طرف سے برطانوی فوجوں کے خلاف جنگ کی تھی۔ اگر اس ہندوستانی قومی فوج کے سپاہیوں اور افسروں کو سزا دی گئی تو اس سے ہندوستانی عوام میں زبردست کھلبلی پیدا ہوگی اور برطانیہ کے خلاف مدت دراز تک غم و غصہ باقی رہیگا۔

"اس ہندوستانی قومی فوج میں ہندوؤں سے زیادہ سکھوں اور مسلمانوں کی تعداد ہے۔ انھوں نے اپنے فرقہ وارانہ اختلافات دور کر رکھے ہیں اور وہ اس بات پر فخر کرتے ہیں۔ ہندوستان کی کئی فرقہ وارانہ جماعتوں نے اُن کی مدد کرنی چاہی لیکن اُن لوگوں نے کانگریس کو ترجیح دی اور کہا کہ ہماری خواہش یہ ہے کہ ہندوستان کی قومی جماعت ہماری حمایت میں آواز بلند کرے۔"

مسلمان اور مسلم لیگ

"ماضی میں کانگریس نے ممکن ہے غلطیاں کی ہوں لیکن کانگریس پر یہ جرم نہیں عاید کیا جا سکتا کہ اس نے ہندوستانی قوم کے اس حصّے یا اُس حصّے تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی۔ کانگریس نے قوم کے کسی حصّے کو بھی نہیں چھوڑا ہے۔ اُس نے ملک کی ہر جماعت کو اپنے ساتھ لانے کی کوشش کی ہے۔

"ہم نے گذشتہ سالوں میں مسلم لیگ سے سمجھوتہ کرنے کی زیادہ کوشش کی۔ اب ہم اس رائے پر پہنچے ہیں کہ مسلم لیگ کے لیڈروں سے قطع تعلق کر لینا ملک کے بہترین مفاد کا تقاضا ہے۔

"ہم مسلمانوں کے اندر اعتماد حاصل کریں گے۔ ہم پورے پورے طور پر اس بات کی کوشش کریں گے کہ اُن کے مطالبات پورے ہوں۔ ہم ان کو مکمل طور پر کانگریس میں لے آئینگے۔ لیکن ہم دوبارہ مسلم لیگ کے لیڈروں کے پاس جانا نہیں چاہتے۔"

دشمن قوم افسر شاہی

"آج کل گذشتہ جنگ کے مجرموں کے بارے میں بہت کچھ کہا جا رہا ہے لیکن وہ دن دور نہیں جب ہم اپنی قوم کے دشمنوں کی فہرست تیار کریں گے ــــ یعنی وہ مجرمین جنھوں نے ہمارے دیش بھگتوں کی اسپرٹ کو کچلنے کی کوشش کی، جنھوں نے اُن پر گولیاں چلائیں اور جنھوں نے رشوتیں قبول کیں۔ ہم انھیں کبھی نہیں بھول سکتے۔

"وائسرائے کی مجلس عاملہ کے ممبروں نے عوام کے مفاد کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا اور ہولناک خود غرضی سے کام لیا

"گذشتہ تین سال کے اندر حکومت کے کارندوں نے عوام کا خون چوس لیا۔ قحط بنگال کی ذمہ داری سراسر حکومت پر عائد ہوتی ہے حکومت نے بے قصور اور معصوم دیہاتیوں پر مظالم ڈھائے اُن پر اجتماعی جرمانے عائد کئے جن کا ادا کرنا اُن کی بس سے باہر تھا۔ اُس نے جنگ کے لئے چندے اکٹھے کئے اور اپنے افسروں میں رشوت بازی کو جان بوجھ کر فروغ دیا۔"

بین الاقوامی دنیا

"آج دنیا میں ہر جگہ کشمکش اور بے چینی کی فضا قائم ہے۔ یہاں تک کہ کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ بارہ ماہ کے بعد یورپ کی سیاسی صورت حال کیا ہوگی۔ فلسطین میں بے چینی اور کھلبلی ہے اور یورپ کے بہت سے حصّوں میں قحط لوگوں کا انتظار کر رہا ہے۔ مشرق بعید میں عوام سامراجی طاقتوں کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ غرض ہر ملک میں بڑے بڑے مسائل ابھی تک حل نہیں کئے جا سکے ہیں۔ ہندوستان کا بھی یہی حال ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ اس وقت جتنی قومی طاقتیں ہیں انھیں مجتمع کر لیا جائے۔ ممکن ہے بہت جلد ہندوستان کو بھی برطانیہ کے خلاف جدوجہد چھیڑنی پڑے۔ برطانیہ

اب دنیا کی اوّل درجے کی طاقت نہیں رہی اور نہ سلطنت کو قائم رکھنے کی اتنی زیادہ طاقت ہی اُس کے اندر رہے بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ اتحادیوں نے جنگ جیت لی ہے اسی لئے برطانیہ ہندوستان کے ساتھ جس قسم کا چاہے برتاؤ کر سکتی ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ حکومت برطانیہ کے اندر ہرگز ہرگز اتنا دم خم نہیں کہ وہ ایسا کر سکے۔ آئندہ چند سالوں میں برطانیہ کا ہندوستان سے بھاگ کھڑا ہونا یقینی ہے۔

نئی زندگی کا معرکتہ الآرا سالنامہ نمبر

جو صرف مسئلہ پاکستان پر مشتمل ہوگا

جنوری سنہ ۱۹۴۶ء میں شائع ہو جائیگا

۲۵۰ صفحات کا یہ عظیم الشان سالانہ نمبر مطالبۂ پاکستان سے متعلق ایک کتاب ہوگی جس میں شروع سے آخر تک اس مسئلے کی پوری تاریخ اور اسکے مختلف پہلوؤں پر ہندوستان کے چوٹی کے مفکرین۔ جید علماء اور سیاسی رہنماؤں کے مضامین ہوں گے جو مسئلہ پاکستان کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے۔ علاوہ اسکے ادارے کی فراہم کی ہوئی اس مسئلے سے متعلق ہر قسم کی مفید معلومات، اعداد و شمار اور متعدد نقشے اور تصویروں کا ایک بیش بہا خزانہ ہوگا جو اس نمبر میں شامل کیا جائے گا :-

غرضیکہ

نہایت احتیاط کیساتھ یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ نئی زندگی کا یہ "پاکستان نمبر" اس مسئلے پر آخری لفظ اور آخری فقرہ ہوگا جو ابتک زبان اُردو میں یکجا طور پر کہیں نظر سے نہیں گذرا

حجم ۲۵۰ صفحات — سائز حسب دستور — قیمت سالنامہ عکم

محصولڈاک ۴۰ر

ناظرین سے

عرض ہے کہ کاغذ کی راشننگ کے زمانے میں ہم مانگ سے زیادہ کاپیاں شائع نہیں کرسکتے۔ اسلئے جب تک آپ عہ دو روپیہ دفتر میں جمع کرکے اپنی کاپی محفوظ نہ کرائیں اور ہمیں مانگ کی صحیح تعداد نہ معلوم ہوجائے ہم زیادہ کاپیاں چھاپنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے، اور سپلائی کی ذمہ داری نہیں لے سکتے سالانہ خریداروں کو یہ نمبر مفت نذر کیا جائیگا لہذا پانچ روپے سالانہ چندہ بھیجکر مستقل خریدار بن جائیے

مشتہرین سے

عرض ہے کہ اشتہار کے صفحات محدود ہونگے اسلئے فوراً اپنا اشتہار بک کرالیں نرخ پورے صفحے کا نوّے روپیہ اور نصف صفحے کا پچاس روپئے ہونگے۔ (ٹائیٹل کے صفحات کے نرخ اس کے علاوہ ہیں) نرخ میں کمی کی گنجائش نہیں، اس لئے خط و کتابت میں وقت ضائع نہ فرمائیں

مینیجر رسالہ نئی زندگی۔ سریش چندر باسو روڈ۔ الٰہ آباد یو۔پی

رفتار عالم

از ——— طفیل احمد خاں ایم۔ اے

برطانیہ کی خارجی پالیسی اور ہندوستان کے نکتہ نگاہ

یورپ سے دیکھا جائے تو برطانیہ میں مزدور جماعت کی
رجعت پسندی کی شکست فاش نے ابتک ہمارے لئے کوئی
نہیں پیدا کی مخصوص طور پر یورپ کے معاملات کا جہاں تک
ہے برطانیہ کے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ اس سے
الیسی بڑھ گئی ہے۔

مسٹر بیون نئے برطانوی وزیر خارجہ نے حال ہی میں برطانیہ
آئندہ خارجی طرز عمل کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس میں بلقان کے
ل کا بھی تذکرہ آیا ہے۔ بلقان کے متعلق مسٹر بیون نے جس
ل کا خاکہ تیار کیا ہے وہ چرچل کے خارجی طرز عمل سے بہت
لف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انگلستان میں اشتراکیت کا رجحان روز
ترقی کرتا جا رہا ہے اور موجودہ مزدور حکومت کچھ اشتراکی اصول
میں بھی لانے کا اعلان کر چکی ہے لیکن کس قدر حیرت کی بات
کہ برطانیہ امریکہ کے ساتھ اب بھی بلقانی ممالک کے مقابلہ میں
کی مخالفت پر آمادہ ہے۔ مثال کے طور پر بلغاریہ، رومانیہ
یونان کے مسائل پر روس کی مخالفت میں برطانیہ اور امریکہ کا
ہ طرز عمل پیش کیا جا سکتا ہے۔ یونان میں سوویت روس کا جو
ل ہے وہ بلغاریہ اور رومانیہ میں برطانیہ اور امریکہ کے طرز عمل
بالکل مختلف ہے۔ مسٹر بیون نے جنوبی مشرقی یورپ کی بیاسو
موجودہ حکومت پر سخت الفاظ میں حملہ کیا ہے اس کے برخلاف
ان حکومتوں کی تائید اور حمایت کر رہا ہے۔

یہ شاید بتانے کی ضرورت نہیں کہ برطانوی اور امریکی طرز عمل
اس اس حقیقت پر قائم ہے کہ یورپ میں جرمنی کے زوال
فسزم کی موت کے بعد جو سیاسی اور سماجی طاقتیں حرکت د
میں آ گئی ہیں ان کے منطقی نتیجے کے طور پر بائیں بازو والی جماعتوں کا
زور بہت بڑھ گیا ہے۔ اور بلغاریہ، رومانیہ اور ہنگری وغیرہ ممالک
میں حکومت کی مشینری ان کے زیر اثر ہے۔

۱۸ اگست کو امریکہ نے حکومت بلغاریہ کو ایک تحریر بھیجی جس میں
وہاں کی موجودہ حکومت کے کردار پر اعتراض اور تنقید کی گئی تھی
اور دوسرے حکومت بلغاریہ کے مجوزہ طریقۂ انتخاب پر بھی اعتراض
تھا۔ امریکی حکومت کی تحریر پہنچنے کے بعد بلغاریہ کے کچھ رجعت پسند
وزراء نے حکومت کو یہ الٹی میٹم دیا کہ آئندہ انتخابات کا طریقہ اگر نہیں
بدلا گیا تو ہم مستعفی ہو جائیں گے۔ بلغاریہ کے وزیر اعظم جارجیو نے
اعلان کیا کہ ان وزراء کے مستعفی ہو جانے کے باوجود طریقۂ انتخاب
نہیں بدلا جا سکتا۔ اس کے فوراً ہی بعد امریکہ کی یہ دھمکی آئی کہ جب تک
بلغاریہ میں "زیادہ جمہوری" حکومت نہیں قائم ہوتی اس وقت تک
امریکہ اس سے سیاسی اور سفارتی تعلق نہیں قائم کر سکتا۔

برطانیہ نے بھی اپنے بلغاروی نمائندے مسٹر ہاؤسٹن بوسول
کے ذریعہ یہ اطلاع کی موجودہ طریقۂ انتخاب کے ذریعہ بلغاریہ میں
جو حکومت بنے گی اسے ہم جمہوری نہیں تسلیم کریں گے۔

ان حالات سے مجبور ہو کر حکومت بلغاریہ نے اتحادی کنٹرول
کمیشن کی سفارش پر انتخابات کے منسوخ ہونے کا اعلان کر دیا۔

رومانیہ کے معاملے میں بھی اسی طرح امریکہ اور برطانیہ
روس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ روس رومانیہ کی موجودہ بائیں بازو
والی حکومت کی حمایت کر رہا ہے جس کا صدر اعظم گروزا ہے۔
روس نے شاہ میخائیل کی اس اپیل کو رد کر دیا ہے جس کا
مطلب تھا موجودہ حکومت کو بدلنا۔

یہ ظاہر ہے کہ یورپ سے برطانیہ کا آخری اثر تک مٹ رہا
ہے لیکن وہ یورپ کی سیاسیات میں اپنا اثر قائم رکھنے کے لیے جان توڑ
کوشش کر رہی ہے۔

پانچوں طاقتوں کے وزرائے خارجہ کی جو کانفرنس لندن میں ہوئی ہے اور جس کے ذمہ دنیا اور یورپ کا آئندہ سیاسی اور سرحدی نقشہ کا تعمیر کرنا تھا اس میں بھی برطانیہ امریکہ اور روس کے یہ باہمی منافقتے واضح طور پر سامنے آ گئے ہیں۔

جو مسائل اس کانفرنس کے سامنے آئے وہ یہ تھے۔ ٹرائسٹ کا مسئلہ، اٹلی کی نوآبادیات کے ساتھ کیسا رویہ اختیار کیا جائے اور بلقانی حکومتوں کا معاملہ کس طرح طے ہو۔

ٹرائسٹ پر یوگوسلاویہ اتنی ہی تندہی کے ساتھ دعویٰ کر رہا ہے جس قدر کہ اٹلی۔ یوگوسلاویہ کو روس کی حمایت اور تائید حاصل ہے۔ اور برطانیہ اور امریکہ اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔

ٹرائسٹ کے متعلق یہ فیصلہ ہوا کہ اسے بین الاقوامی کنٹرول اور انتظام میں رکھا جائے

اٹلی کے متعلق یہ فیصلہ ہوا کہ اسے تمام نوآبادیات اور مقبوضات سے محروم کر دیا جائے۔ یہ نوآبادیات اور مقبوضات بین الاقوامی امانت داری کے تحت رکھے جائیں گے۔ اس امانت داری کی شکل و صورت اقوام متحدہ کے سان فرانسسکو کانفرنس میں پہلے ہی طے پا چکی ہے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ اٹلی کو خود اپنے مقبوضات میں سے کسی کی امانت داری نہیں دی جائے گی۔ اگر یہی اصول برطانوی نوآبادیات کے سلسلے میں برتا جاتا تو کتنی عمدہ بات ہوتی یعنی برطانوی مقبوضات اور نوآبادیات کو اس بات کا حق دے دیا جاتا کہ وہ خود اس بات کا فیصلہ کریں کہ وہ کس کی امانت داری میں رہنا چاہتے ہیں۔

مشرق بعید

جاپان کی شکست کے بعد مشرق بعید کے ممالک گویا اب سامراجی پنجے سے آزاد کر لئے گئے لیکن اب سوال یہ ہے کہ ان کا مستقبل کیا ہے منچوریا اور چین کے وہ علاقے جو جاپان کے قبضے میں تھے روسی چینی معاہدہ کے بعد واقعی آزاد اور خود مختار علاقے کہے جا سکتے ہیں لیکن کیا سیام، برما، ہانگ کانگ، انڈوچین اور انام کے متعلق کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ جاپان کی شکست کے بعد آزاد ہو گئے ہیں؟ یہ ظاہر ہے کہ موجودہ صورت حال میں تو مغربی غلامی ہے آزاد اور خود مختار ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آ[تی]

جاپان کی شکست کے فوراً ہی بعد جنرل دی گال نے انڈوچین پر فرانسیسی قبضہ کے دوبارہ بحال ہونے کا اعلان کر دیا۔ اور فوراً ہز مجسٹی جارج ششم کی طرف سے اس بات کا یقین دلایا گیا کہ فرانس کی اس کی کھوئی ہوئی سلطنت لوٹا دی جائے گی۔

۲۴ اگست کو جنرل دی گال نے فرنچ اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ انڈوچین میں ایک نیا دستور نافذ کیا جائے گا۔ [اس] دستور کی شکل و صورت یہ ہوگی۔ ایک صدر جو فرانسیسی باشندہ ہوگا اس کے ساتھ ایک پارلیمنٹ بھی ہوگا۔

جنرل دی گال نے انڈوچین میں ایک نئے اقتصادی نظام رائج کرنے کا بھی اعلان کیا جو حکومت کے کنٹرول میں ہوگا اس دستور کی تشکیل اور اس کی نوعیت پر بحث کرتے ہوئے جنرل دی گال نے بتایا کہ آئندہ انڈوچین کی حکومت میں مقامی اور فرانسیسی دو عناصر کی شمولیت ہوگی اور پارلیمنٹ میں ان مختلف ریاستوں کی نمائندگی جن پر فرنچ انڈوچین کا وفاق مشتمل ہوگا۔

فرانسیسی کابینہ نے حال ہی میں نوآبادیات کے لئے جو سیاسی دستور مرتب کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے پیش نظر خود مختار ڈومینین کے وجود میں لانے کا مقصد نہیں بلکہ جمہوری طرز کے ایک واحد فرنچ یونین کو لانے کا مقصد ہے۔ [یہ] کہ اس یونین میں ایک خاص حد تک غیر مرکزیت کا اصول ضرور قائم رکھا جائے گا۔ نوآبادیات کے ساتھ صرف اتنی رعایت برتی گئی ہے کہ فرانسیسی پارلیمنٹ میں خاص فرانس کے نمائندے اب چھ سو گھٹا کر اب پانچ سو کر دئے گئے ہیں۔ اور اس طرح جو نشستیں خالی ہوئیں وہ نوآبادیات نمائندوں کو دے گئے ہیں۔

فرانس ایک نئے انقلاب کے دروازے پر

چرچل کے بعد اب دی گال کی باری آئی

کچھ ہی دنوں پہلے فرانس کے متعلق یہ خوشگوار خبر موصول ہ[وئی]

س کے کمیونسٹ [illegible] کے "عوامی محاذ" کو دوبارہ وجود میں
نے کی کوشش کر رہے ہیں اور وہ یوں کہ انھوں نے فرانس
تمام بائیں بازو والی ترقی پسند جماعتوں کو دی گال کے طریقہ انتخاب
ے متعلق اصلاحات کے خلاف متحد اور منظم ہونے کی دعوت
ی ہے دی گال جن طریقوں اور اصولوں کے مطابق فرانس کے
ندہ انتخابات لڑنا چاہتا ہے ان کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خود اس کی
ید اور حمایت کرنے والی نام نہاد سوشلسٹوں اور کیتھلک گروں
ایک ایسی جماعت برسر اقتدار ہو جائیگی جس کے بل بوتے پر
فرانس کے دستور حکومت میں من مانی تبدیلی کر سکے گا۔ اس کے
اوہ یہ بھی خطرہ ہے کہ اگر انتخاب انھیں اصولوں کے مطابق
ئے تو ترقی پسند مزدوروں کے مقابلہ میں قدامت پسند
ی طبقے زیادہ اہمیت اختیار کر لیں گے۔

موجودہ صورت حال یوں پیدا ہوئی کہ بائیں بازو والی
اعتوں کے متحدہ محاذ جی۔ بی۔ ٹی۔ کے جنرل سکریٹری دی
ل کے پاس انتخاب کے مسئلہ پر گفت و شنید کے لئے پہنچا۔
ن جنرل دی گال نے اس وفد سے ملاقات کرنے سے انکار
دیا جس سے تمام بائیں بازو والی جماعتوں میں جنرل دی گال
ے اس ناروا اور شریفانہ طرز عمل پر اشتعال پیدا ہوا۔ اس کے
راہی بعد فرانس کے ٹریڈ یونین کونسل، سوشلسٹ کمیونسٹ اور
یڈیکل جماعتوں کے نمائندوں کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اس
ٹنگ میں کمیونسٹوں نے یہ تجویز پیش کی کہ متذکرہ بالا تمام
ماعتیں باہم متحد اور متفق ہو کر اکتوبر کے انتخابات کے لئے تیار
وجائیں اور نشستوں کے لئے مخلوط طور پر نمائندہ کے نام
یش کریں۔

اگر اس تجویز پر عمل کیا گیا تو یقین ہے کہ اس سے دی گال
ں موجودہ حکومت کے تمام پلان بالکل تباہ و برباد ہو جائیں گے
صرف یہ بلکہ خود دی گال کی موجودہ حیثیت ختم ہو جائیگی اور اگر ایسا
وا یعنی دی گال کی موجودہ سامراج پسند حکومت ختم ہو گئی تو یہ بات
ن ملکوں اور نوآبادیات کے لئے باعث خیر مقدم ہوگی جو
اس کے سنئے سامراجی اداکاروں کا شکار بنی ہوئی ہیں۔

اس لئے کہ موجودہ حکومت کے زوال کے بعد جو حکومت آئے گی وہ ایسے ترقی پسند سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں پر مشتمل ہوگی جو فرانس کو دوبارہ ایک سامراجی طاقت بنانا نہیں چاہتے۔ شام اور لبنان' اور فرنچ انڈوچین اور دیگر فرانسیسی مقبوضات کے عوام کے لئے یہ واقعہ ایک نئی زندگی اور ایک نئی روشنی کا پیغام لائے گا۔

انتخاب اور دستور حکومت کے معاملہ پر آج کل فرانس میں جو خانگی بے چینی اور کشمکش رونما ہو رہی ہے وہ اس لئے حیرت انگیز نہیں ہے کہ یہ کشمکش دراصل منطقی نتیجہ ہے ان واقعات کا اور ان سیاسی، و سماجی طاقتوں کا جو یورپ میں فاشزم کی تباہی کی وجہ سے وجود میں آئی ہیں۔

آئندہ دستور حکومت کے مسئلہ پر ایک تو دی گال اور دوسری طرف قومی مجلس مشورت کے درمیان شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ حال ہی میں مجلس مشورت نے دستوری تبدیلیوں سے متعلق جنرل دی گال کی تجویزوں کو دو سو دس مخالفانہ ووٹ سے رد کر دیا۔ جنرل دی گال کی حمایت میں صرف انیس ووٹ آئے۔ جنرل دی گال کی ان دستوری تجویزوں میں جنھیں مشورت مجلس مشورت نے رد کر دیا ہے ۱۸۷۵ء کے دستور حکومت کو محض تھوڑی سی تبدیلیوں کے بعد برقرار رکھنے کا پروگرام تھا اور ساتھ ہی دو ایوانوں کو بھی قائم رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن مجلس مشورت کی اکثریت ایک ہی ایوان کی حمایت میں ہے۔

مجلس مشورت نے جنرل دی گال کی تجویزوں کو رد کر دینے کے بعد اس اصول کی حمایت میں رائے پاس کی کہ حکومت پر دستور ساز اسمبلی کی طرف سے ذمہ داری عاید ہونی چاہئے اور فرانس کے آئندہ دستور حکومت کا یقین کرنے کے لئے دستور ساز اسمبلی کا وجود میں آنا ضروری ہے۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسی وزرا یہ اعلان کرنے پر مجبور ہوئے کہ دوسری اکتوبر کو عام انتخابات ہوں گے اور ساتھ ہی اس مسئلہ پر کہ فرانس میں آئندہ ایک ایوان ہوگا یا دو عوام کی رائے

لی جائے گی۔

یہ بالکل یقینی ہے کہ آئندہ انتخابات میں بائیں بازو والی جماعتوں کی فتح ہوگی اور اگر ایسا ہوا تو فرانس بہت جلد ایک اشتراکی ملک ہو جائیگا۔ اور ساتھ ہی اس بات کی بھی امید ہے بلکہ یقین ہے کہ فرانس کی نوآبادیات اور مقبوضات آزاد ہو جائیں گے۔

وزرائے خارجہ کی کانفرنس

وزرائے خارجہ کی لندن کانفرنس

نے دنیا کے سامنے کم سے کم ایک چیز قطعی واضح کر دی اور وہ یہ کہ یورپ پر سوویت روس کا اثر و اقتدار نہ قائم ہو اور برطانیہ کا دوبارہ تسلط قائم ہو جاتے۔ لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تاریخ کا یہ فیصلہ صادر ہو چکا ہے کہ یورپ کے سیاسی معاملات میں برطانیہ کا اثر و اقتدار گئے گذرے ماضی کی چیز ہو کر رہ جائے۔ برطانیہ اس بات کے لئے بھی تیار نہیں ہے کہ روس کا اثر بحیرۂ روم کے شمالی ساحل سے نیچے کی طرف رخ کرے۔ دراصل اسی سوال کا تعلق بہت حد تک اس بات سے ہے کہ برطانوی سامراج کی رگ حیات کو کس طور پر محفوظ و مامون رکھا جائے۔ مشرقی مقبوضات سے سوئز کے راستے کا کس طرح تحفظ کیا جائے۔ یہ ہیں وہ خطرات جو فاشزم کی شکست کے بعد برطانوی سامراج کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور جو روز بروز بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔

لندن کانفرنس میں جو بھی معاملہ سامنے آیا اس میں برطانیہ اور روس کے باہمی اختلافات بہت نمایاں ہو کر سامنے آ گئے اور جزائر ڈوڈی کانیز کے متعلق روس کا مطالبہ، اٹلی کی نوآبادیات کا مستقبل۔ ٹریسٹے کا جھگڑا، اور ہنگری، بلغاریہ اور رومانیہ کی حکومتوں کا برطانیہ اور امریکہ میں غیر جمہوری تسلیم کیا جانا ۔۔۔ ان تمام معاملات میں، برطانیہ اور روس کے درمیان شدید اختلافات کی صورت قائم رہی۔

دوسری بات یہ نظر آئی کہ ہر اختلافی معاملے سوویت روس کے مقابلہ میں برطانیہ کی کمزوری کھلی ثابت ہو گئی یورپ کے معاملات میں دوبارہ اپنا اثر و اقتدار قائم کرنے کے لئے برطانیہ کے اس طرح ہاتھ پاؤں مارنے کا منظر بہت دلچسپ بھی تھا اور رحم ناک بھی۔ لیکن تاریخ کی خارجی حقیقت اور اس کی بے رحم رفتار مدبرین کی خواہشات کی کچھ زیادہ پرواہ نہیں کرتی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے برطانیہ کے مدبرین دنیا کے پچھلے چھ سالوں کے واقعات و حالات کو جنھوں نے انسانی نظام کو ہلا دیا ہے قطعی فراموش کر دینا چاہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ بحیرۂ روم میں روس کی دلچسپی کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر رہے ہیں۔ کوئی ان مدبرین سے یہ دریافت کرے کہ آخر ۱۹۳۹ء کے سیاسی نقشے کو یورپ میں دوبارہ کس طرح بحال کیا جا سکتا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ اس وقت جبکہ یورپ کے ہر ملک میں نیم اشتراکی حکومتیں قائم ہو رہی ہیں اور عوامی طاقتیں جس قوت رفتار سے آگے بڑھ رہی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یورپ میں انتخابات کے بعد ہر ملک میں اشتراکیت قائم ہو کر رہے گی۔ ایسی صورت حال میں روس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ایسی پالیسی اختیار کرے کہ یوگوسلادیہ، یونان اور اٹلی وغیرہ ممالک کا بھی امریکہ اور برطانیہ کے سامراجی پنجوں سے تحفظ ہو سکے۔ چنانچہ اٹلی کے گذشتہ مقبوضات اور نوآبادیات کے سلسلے میں روس کا جو رویہ رہا ہے وہ اسی مقصد سے متعین تھا۔ روس کا یہ رویہ برطانیہ اور برطانوی سامراج کے حق میں بے حد خطرناک ہے اس لئے کہ بحیرۂ روم اور مشرق قریب میں سوویت اثرات کے ترقی کرنے کے معنی یہ ہیں کہ برطانیہ کا اقتدار ان علاقوں سے ختم ہو جاتا، ظاہر ہے کہ شمالی افریقہ بحیرۂ روم اور بحیرۂ احمر میں سوویت اثرات کے ترقی کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ان مشرق قریب کے اسلامی ممالک کی قومی اور سامراج دشمن تحریکیں بہت زور پکڑ لیں گی شام، فلسطین، مصر، سوڈان وغیرہ ممالک سے فرانس اور برطانیہ کو زبردستی ہٹنا پڑیگا اس وقت مشرق قریب کی محکوم مسلم قومیں برطانیہ فرانس اور امریکہ کے سامراجی ہتھکنڈوں کا شکار بنی ہوئی ہیں (امریکہ اس لئے کہ صدر ٹرومین ان دنوں پورے طور پر اس کوشش میں مصروف ہیں کہ فلسطین یہودیوں کا ملک بن جائے تاکہ وہ مشرق بعید میں امریکہ کے تیل سے متعلق مفادوں کی حفاظت کریں) سوویت اثرات کے ترقی کرنے کے بعد یہ ہوگا کہ پولینڈ اور بلقان کی طرح شام

فلسطین، مصر کی عوامی تحریکیں بھی تیزی سے آگے بڑھیں گی اور برطانیہ اور فرانس کی مدد سے ان کی سامراجی غلامی کا قلع قمع ہو کر رہے گا۔

انڈوچین

اب یہ حقیقت بالکل واضح ہو کر ساری دنیا کے سامنے آگئی ہے کہ اس جنگ کے بعد دنیا کے ہر ملک کی عوامی تحریک اتنی زیادہ طاقتور ہوگئی ہے کہ حاکم قوموں کے لئے ان کا دبانا مشکل ہی نہیں غیر ممکن ہو رہا ہے۔ چنانچہ پچھلے دنوں پنڈت جواہر لال نہرو نے بجا طور پر یہ فرمایا کہ اس جنگ کے نتیجہ کے طور پر برطانیہ ایک دوسرے درجہ کی طاقت ہو کر رہ گئی ہے اور اب اس کے لئے اپنے سامراجی نظام کا سنبھالنا مشکل ثابت ہو رہا ہے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ محکوم ملکوں کی آزادی کی تحریک کو دبانا اب برطانیہ یا کسی بھی یورپی سامراج کے بس سے باہر ہے۔ انڈوچین اور جاوا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جاپانی قبضے کے دوران میں کمیونسٹوں اور قوم پرستوں نے جاپانی سامراج کے خلاف خفیہ گوریلا تحریکیں قائم کیں۔ چنانچہ اب جبکہ گوریلا جاپانی غلامی کا خاتمہ ہو چکا ہے تو وہاں کی قوم کے رہنما بالکل بجا طور پر فرانس کی سامراجی حکومت کے دوبارہ قیام کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ان کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ انھوں نے اس لئے جاپان سے جنگ نہیں کی کہ فرانس کی غلامی دوبارہ قائم ہو جائے۔ جاوا میں ڈچ سامراج کے خلاف بھی قوم پرستوں کی یہی پالیسی ہے۔ چنانچہ انڈوچین کے کمیونسٹوں اور قوم پسندوں نے آپس میں اتحاد کر کے ایک حکومت بنائی اور اس بات کا عہد کیا کہ وہ فرانس کی غلامی کو دوبارہ بحال نہ ہونے دیں گے۔ برطانیہ نے یہ دیکھا کہ فرانس اتنا کمزور ہو چکا ہے کہ وہ تنہا انڈوچین پر دوبارہ قبضہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس نے عملی طور پر فرانس کی مدد شروع کی۔ سیگاؤں (دارالسلطنت انڈوچین) پر پہلے فرانسیسی فوجوں نے دھوکہ دے کر قبضہ کر لیا پھر برطانوی فوجوں نے اس کا محاصرہ کر لیا۔ چنانچہ آج سیگاؤں میں خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ عارضی حکومت کے لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور برطانوی فوجیں قومی تحریک کا سر کچلنے پر مصر ہیں۔ اس سلسلے میں ایک طرف تو جاپانی فوجوں سے انھیں مدد مل رہی ہے اور دوسری طرف برطانوی افسران ہندوستانی فوجوں کو بھی استعمال کر رہے ہیں۔ ہندوستان کو جاوا اور انڈوچین کی قومی تحریکوں سے زبردست ہمدردی ہے ایسی حالت میں ہندوستانی سپاہیوں کا انڈوچین کی قومی تحریکوں کے خلاف استعمال کیا جانا سراسر بے انصافی اور ہندوستانی عوام کی خواہشات اور جذبات کی صریح خلاف ورزی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ وہ قومی اور عوامی تحریکیں جو نہ صرف انڈوچین اور جاوا بلکہ جنوبی مشرقی ایشیا کے ہر ملک میں آگ اور طوفان کی طرح پھیل رہی ہے اور زور پکڑ رہی ہیں ان کو دبانا برطانیہ کے بس سے باہر ہے یقین ہے کہ آخر میں برطانیہ کی شکست ہو کر رہے گی۔

فلسطین

پورے چھ سال کے بعد فلسطین آج پھر ساری دنیا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے اور عربوں کا جذبۂ آزادی ایک بار پھر برطانوی سامراج سے کھلم کھلا متصادم ہونے والا ہے لیکن ۱۹۳۶ء کے مقابلے میں آج بڑا فرق یہ ہے کہ آج اس سامراج کی بنیادیں کھوکھلی ہوگئی ہیں اور جنگ کے بعد اس کے اندر اتنی سکت باقی نہیں رہی ہے کہ ایشیائی قوموں کی جدوجہد اور تحریک آزادی کو کچل سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے برطانوی سامراج کا رجعت پرست بے ڈول ڈھانچہ ٹوٹ کر رہے گا۔

۱۹۳۹ء کے برطانوی قرطاس ابیض کے نکات کے مطابق اب یہودیوں کا فلسطین میں داخلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جانا چاہئے۔ اس لئے کہ قرطاس ابیض میں جو کوٹا منظور کیا گیا تھا وہ پورا ہو چکا ہے۔ لیکن برطانیہ میں لیبر حکومت کے برسر اقتدار آجانے سے یہ سوال پیدا ہو گیا ہے کہ برطانیہ فلسطین کے متعلق کیا رویہ اختیار کرتی ہے۔ چرچل کی حکومت تو اپنے سامراجی ارادوں کے تحت چونکہ مشرق قریب میں فرانس روس اور امریکہ کے اثرات کو روکنے کیلئے عرب حکومتوں میں اتحاد و اتفاق قائم کرنا چاہتی تھی اس لئے وہ عارضی طور پر یہودیوں کے خلاف اور عربوں کے موافق تھی۔ لیکن لیبر حکومت یہودیوں کے خلاف شاید اس حد تک نہ جائے اس لئے معاملہ کچھ گول سا ہے۔ ایک طرف فلسطینی عرب اس بات پر

پکڑ چکے ہیں کہ اب اگر ایک بھی یہودی فلسطین میں داخل ہوا تو ہم مسلح بغاوت کریں گے۔ انجمن اتحاد عرب پورے طور پر فلسطین کے عربوں کی حمایت کر رہی ہے۔ دوسری طرف یہودی اپنی عالمگیر تنظیم کے تحت فلسطین میں داخلے کی اجازت کا پرزور مطالبہ کر رہے ہیں۔ برطانوی کابینہ نے ایک سب کمیٹی فلسطین کے معاملہ کی جانچ پڑتال کے لئے مقرر کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کمیٹی اپنی رپورٹ پورے کابینہ کے سامنے پیش کر چکی ہے جس میں اس بات کی سفارش کی گئی ہے کہ یہودیوں کا کچھ نہ کچھ داخلہ ضرور ہونا چاہئے غالباً ۱۵۰۰ ماہانہ کی تعداد میں اگرچہ اس تعداد میں نہیں جو یہودیوں کا مطالبہ ہے۔ اتنے میں صدر ٹرومین کا خط وزیراعظم ایٹلی کے نام پہنچا کہ ایک لاکھ یہودیوں کو فلسطین میں داخلے کے سرٹیفکٹ دئے جائیں بعد میں صدر ٹرومین نے ان یہودیوں کے بھی فلسطین میں داخلے کی اجازت طلب کی جو نازی جور وظلم کے تحت جرمنی سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ امریکہ کا سرمایہ دار طبقہ جس کی ٹرومین نمائندگی کرتا ہے سرمایہ پرست یہودیوں سے فطری ہمدردی رکھتا ہے پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ امریکہ مشرق قریب میں اپنے تیل کے مفاد کا تحفظ کر دینا چاہتا ہے حال ہی میں امریکہ اور حبشہ کے درمیان ایک راضی نامہ وجود میں آیا ہے جس کے ذریعہ امریکہ کو تیل کے ٹھیکے مل گئے ہیں۔ امریکہ اب ان مفادوں کے تحفظ کے لئے یہودیوں کو آلہ کار بنانا چاہتا ہے ایک مضبوط اور علٰحدہ یہودی حکومت مشرق قریب میں امریکہ کا ایجنٹ ہوگی اور اس کے مفاد کی حفاظت کرے گی۔

عربوں اور یہودیوں نے مسلح جدوجہد کے لئے فوجیں او اسلحہ جات بھی اکٹھا کر لئے ہیں۔ اب انتظار ہے صرف برطانیہ کی پالیسی کے اعلان کا۔ حالات اب اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں بغاوت کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آتا۔ برطانوی فوجیں سرعت کے ساتھ فلسطین میں منتقل کی جا رہی ہیں۔ اگر بغاوت شروع ہوگئی تو فلسطین کا معاملہ تمام عرب ممالک کا معاملہ بن جائے گا اور وہ فلسطینی عربوں کی کھلم کھلا اور عملی امداد کریں گے پھر یہ بغاوت پورے ایشیا کی محکوم اور غلام قوموں کی آزادی کی جدوجہد اور تحریک کا ایک حصہ بن جائیگی اور معاملہ بے حد خطرناک بین الاقوامی حیثیت اختیار کر لے گا۔ انڈوچین اور ہندوستان کی تحریک آزادی فلسطین کی تحریک آزادی سے جا ملے گی۔ اور جنوبی ایشیا کی تمام قومیں ایک ساتھ ہم آواز اور ہم عمل ہوکر اپنی مدتوں کی غلامی کا قلع قمع کرنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوں گی۔

چنانچہ برطانیہ کے مدبرین پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ سنہ ۱۹۳۶ء اور موجودہ صورت حال کے درمیان جو فرق ہے اسے واضح طور پر محسوس کریں اور فلسطینی عربوں کے ساتھ مدت دراز سے جو دھوکہ بازی اور ظلم کیا جا رہا ہے اس سے باز آجائیں۔ ورنہ چیمبرلین آنجہانی کی طرح انسانی تاریخ میں ان کی عقل اور تدبیر بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے داغ رہ جائے گا۔

عہدِ متوسط کے ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیبی خدمات

از:- مسٹر ایس۔ کے بنرجی۔ ایم۔ اے۔ ال ٹی۔ پی۔ ایچ ڈی، ڈی لٹ (لندن)

اگرچہ ہندوستان میں مسلمان سب سے پہلے عرب سے آئے لیکن عام طور پر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ مسلمان حقیقی معنوں میں ہندوستان کی زندگی میں اُس وقت داخل ہوئے جب محمود غزنوی نے سنہ ۱۰۰۰ء میں ہندوستان پر حملہ شروع کیا۔ محمود غزنوی کے بعد مسلمانوں نے ہندوستان میں مستقل سکونت اختیار کرنا شروع کر دیا۔ مسلمان پنجاب پر سنہ ۱۰۳۰ء سے اور دلّی پر سنہ ۱۲۰۶ء سے کامل طور پر قابض ہو گئے۔ مورخوں کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اگرچہ مسلمان اتنی مدّت دراز تک ہندوستان میں مقیم رہے اور مدتوں تک اُن کا بول بالا رہا لیکن ایران، توران، قسطنطنیہ اور شمالی افریقہ کی طرح وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہاں کی سماجی اور سیاسی زندگی پر حاوی نہ ہو سکے۔ اورنگ زیب کی موت کے بعد مسلمانوں کا اثر زوال پذیر ہو گیا اور اٹھارہویں صدی میں مسلمان سلطنتوں اور ریاستوں کا ایک بڑا حصّہ مرہٹوں، بندیلوں، جاٹوں اور سکھوں کے قبضے میں چلا گیا۔

یہاں پر ہمارا مقصد ہندوستان کی مسلمان ریاستوں کے عروج و زوال کا نقشہ کھینچنا نہیں ہے بلکہ صرف اس بات کی تحقیق و تفتیش کرنی ہے کہ عہدِ متوسط کے ہندوستانی سماج کی تشکیل و تعمیر میں مسلمانوں نے کتنا حصّہ لیا۔

سب سے پہلی بات تو مسلمانوں کے آنے کے بعد یہ ہوئی کہ ہندوستان کی علیحدگی اور دنیا سے الگ تھلگ رہنے کا سلسلہ ختم ہو گیا اور ہندوستان کے دوسرے ملکوں اور قوموں سے تعلقات قائم ہوئے۔ لوگ بعض اوقات تاریخ کا یہ سبق بھول جاتے ہیں کہ کوئی بھی قوم دنیا سے کامل طور پر الگ الگ رہ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ سماجی اور معاشی اعتبار سے دنیا کی تمام قومیں باہمی رشتوں اور تعلقات کے دھاگے میں منسلک ہیں۔

مسلمانوں نے ہندوستان کو دنیا کے دوسرے ملکوں اور قوموں سے متعارف کرایا اس سے کچھ فائدے بھی ہوئے اور نقصانات بھی دنیا کو معلوم ہو گیا کہ ہندوستان میں لاتعداد اور بے شمار مادّی ذرائع اور دولت موجود ہیں اور ملتان، لاہور، کابل اور قندھار تجارتی مرکز بن گئے جن شہروں کے ذریعہ مغربی ایشیا، یورپ اور افریقہ کے مال کا ہندوستان کے مال سے تبادلہ ہونے لگا۔ اس تبادلہ اور تجارت سے ہندوستان کو بہت بڑے پیمانہ پر منافع ہونے لگا اس لئے کہ ہندوستان کی بنی ہوئی اشیاء دوسرے ملکوں میں بڑی بڑی قیمتوں پر فروخت ہوتی تھیں اور ہندوستان کے صنعت گروں کے پاس سے مال و دولت کا ذخیرہ جمع ہونے لگا۔

غزنی کے مسلمان بادشاہوں اور غوری حکمرانوں کی فتوحات سے یہ فائدہ ہوا کہ شمالی ہند کے ایک بہت بڑے خطّے میں صوبائی اتحاد قائم ہوا یعنی مختلف اور متعدد صوبے ایک ہی سیاسی نظام کے تحت آ گئے۔ ہرش وردھن کے انتقال (سنہ ۶۴۷ء) کے بعد ہندوستان بے شمار چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔ اسی طرح ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کی وجہ سے ملک میں بہت خطرناک قسم کی کمزوری پیدا ہو گئی اس لئے کہ اس سے نہ صرف یہ ہوا کہ ہندوستان میں بے شمار ریاستیں وجود میں آ گئیں بلکہ بے شمار سیاسی اور مذہبی اختلافات بھی پیدا ہو گئے۔ غوریوں کی آنے کے بعد شمالی ہندوستان میں دوبارہ ایک ہی سلطنت قائم ہو گئی اور اس طرح سیاسی اتحاد کے ذریعے زندگی کے دوسرے میدانوں میں بھی اتحاد اور طاقت پیدا ہوئی۔ اگرچہ شمالی مغربی گوشہ سے ہندوستان پر حملوں کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا لیکن اب یہ ہونے لگا کہ حملہ آوروں کو عام طور سے شکست ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر تیرھویں اور چودھویں صدیوں میں حملہ آور مغلوں کو یہاں سے بھگا دیا گیا اور ہندوستان نے اپنی قسمت خود اپنے ہاتھوں میں لے لی۔

مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے سے اور بھی نتائج پیدا ہوئے مثال کے طور پر ہندوستان کے مختلف صوبوں کے لوگ زبان اور تہذیب کے اعتبار سے قریب ہونے لگے۔ شروع شروع میں تو مسلمان فاتحین ترکی زبان کا استعمال کرتے تھے لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد فارسی نے عدالتی زبان کی حیثیت اختیار کر لی، اردو ملک کی مشترکہ زبان بنی۔ اردو زبان کے عروج اور ارتقاء میں ملک کی اور کئی بولی چال کی زبانوں نے مدد کی۔ تہذیبی معاملات میں بھی یہی ہوا کہ شروع شروع میں ترکی تہذیب حاوی رہی اور ہندوستان کے مختلف صوبوں کے لوگوں نے اُسے اپنانے کی کوشش کی۔

غرض یہ بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام سے شمالی ہندوستان کی مختلف قوموں کے درمیان زبان اور تہذیب کے اعتبار سے اتحاد و یگانگت وجود میں آئی اور آگے چل کر پورے ہندوستان کی قومیں لسانی اور تہذیبی لحاظ سے متحد ہونے لگیں۔

مسلمانوں میں عام طور پر یہ قاعدہ تھا کہ وہ غیر مذہبوں کی بہ نسبت خود آپس میں ایک دوسرے سے زیادہ اچھا سلوک اور برتاؤ کرتے تھے مسلمانوں میں ادنیٰ ترین فرد یہاں تک کہ غلام میں حکومت کی اعلیٰ ترین منزل پر پہنچ سکتا تھا۔ لیکن ادھر ہندوؤں کا یہ حال تھا کہ وہ بے شمار ذاتوں پر منقسم تھے۔ ایک ایک ذات بھی متعدد اور چھوٹی چھوٹی ذاتوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ہندوؤں میں شودروں، اچھوتوں اور برہمنوں وغیرہ کے درمیان بہت زیادہ اور باریک فرق کیا جا سکتا۔ اعلیٰ تعلیم، اعلیٰ سیاسی تربیت اور آرام و آسائش جمالیاتی اکتساب برہمنوں تک محدود تھے اور شودروں اور نیچوں کی وہاں تک رسائی نہ تھی۔ چنانچہ مسلمانوں کے نظریۂ اخوت نے ان لاکھوں کروڑوں شودروں اور اچھوتوں کے لئے امید کی روشنی دکھلائی۔ مسجد میں امیر و غریب، جاہل و عالم، اچھے اور بُرے سب شانہ بشانہ کھڑے ہو کر خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ زندگی کے اور بھی پہلوؤں میں اس مساوات اور برابری کی جھلک نمایاں ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے اچھوت اور شودر ہندومت سے علیحدگی اختیار کر کے حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور لطف یہ تھا کہ یہی اچھوت اور شودر ہندو قوم میں زیادہ باعمل اور جسمانی لحاظ سے زیادہ کارآمد تھے۔ یہ نومسلم باہر سے آنے والے مسلمان کی بہ نسبت زیادہ پُرجوش اور پریشان کن ثابت ہوئے جس سے نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے اسلام قبول کر لینے سے ہندو سماج کو نقصان اور صدمہ پہنچا۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ پارسیوں کی طرح تمام ہندوؤں نے کیوں نہیں اسلام قبول کر لیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ عروج اسلام کے زمانے میں پارسی مذہب حد سے زیادہ زوال پذیر ہو گیا تھا۔ چنانچہ اسلام کے سامنے اس کی کچھ نہ چل سکی اور اس طرح اسلام ایران کے پہلوؤں کے لئے ایک نیا مرکز امید بن گیا۔ اس کے برخلاف ہندو مذہب اتنا بے جان اور بے روح نہیں ہوا تھا کہ اس کے ماننے والے اپنی روحانی تسکین و تشفی کے لئے دوسرے مذہب کو اختیار کرنے کی ضرورت محسوس کرتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوؤں میں بار بار اس قسم کے مصلحین پیدا ہوتے رہے تھے جنھوں نے ہندو مذہب کو خرابیوں سے پاک کر کے اسے عوام تک پہنچنے کے قابل بنایا۔

تمام ہندوستانیوں کے اسلام نہ قبول کرنے کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ مغربی ایشیا کے حملہ آور مسلمان مادی عیش و آرام کے بھوکے تھے۔ انھوں نے ہندوستان میں آکر بے حد و حساب مظالم ڈھائے اور لوٹ اور غارت گری میں حصہ لیا۔ انھوں نے مندروں کو مسمار کیا اور جن گاؤں اور قصبوں سے گزرے وہاں کے باشندوں کو تہ تیغ کیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ گاؤں اور بستیوں کے وہ لوگ جو قتل عام سے بچ رہے وہ اسلام کے نظریۂ اخوت کے باوجود مسلمانوں سے بھڑکتے رہے۔ اس کے بعد سے اسلام کو ہندوؤں کے اُن تعصبات اور غلط خیالیوں سے جو انھوں نے مسلمانوں کے برتاؤ کے سبب اپنے ذہن میں قائم کر لی تھیں بہت شدید نقصان پہنچتا رہا۔ ہندوؤں کی اکثریت نے اسلام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اس کے بعد سے اسلام ہندوستان کی آبادی کے ایک مخصوص حصے تک محدود ہو کر رہ گیا۔

فکر و خیال کی دنیا میں یہ ہوا کہ اسلام کے نظریۂ وحدت نے ہندوؤں میں ایک ردِّ عمل پیدا کیا۔ ہندوؤں کے بعض مصلحین نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے مذہب اور سماج میں بڑی بڑی تبدیلیاں

لہ مقالہ نگار کا یہ خیال بہت حد تک غلط خیالی پر مبنی ہے۔ ایڈیٹر

پیدا کیں۔ مسلمانوں کے عقائد و اثرات سے مجبور ہوکر ہندو مذہب میں اس قسم کی اصلاحیں کی جائیں اور مختلف طریقوں سے یہ اصلاحیں جاری بھی کی گئیں۔ اُن میں سے ایک اصلاح تو یہ کی گئی کہ مسلمانوں کے خدا کو تسلیم کرلیا گیا اور ہندو مذہب کے اصولوں میں "اللہ" کو جگہ دی گئی۔ تیرھویں صدی میں ایک کتاب "اللہ اوپنشد" کے عنوان سے تصنیف کی گئی۔ دوسری اصلاح ہندو مذہب میں یہ کی گئی کہ ہندوؤں کے اعتقادات اور اصولوں کو زیادہ مقبول عام کیا گیا اور اس کے دینی طریقوں اور منتروں کے دروازہ تمام طبقوں کے لئے کھول دئے گئے۔ گرو نانک کا قائم کردہ سکھ مذہب، کبیر کا کبیر پنتھی مسلک اور کرشن اور رام کے ماننے والوں کی وشنویت جسے چیتن نے پیش کیا۔ ان نئے تمام مذہبوں نے انسانی مساوات پر زور دیا اور ساتھ ہی اپنے اپنے پیروؤں کو ایک ہی برادری میں منسلک کردیا۔ یہ مذہبی اصلاحیں دراصل اسلام کے براہ راست اثر کا نتیجہ تھیں۔

ویدانت مذہب مسلمانوں کے صوفی طبقہ میں بہت مقبول ہوا۔ یہ صوفی طبقہ مسلمانوں کے سب سے کم علمی اور جذباتی قسم کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ ان نئے قائم شدہ مذہبوں نے خدا پر اتنی توجہ صرف کردی تھی کہ انسان کی عظمت اور قیمت نظر انداز ہوگئی تھی۔ ویدانت مذہب نے مدت دراز تک انسانی روح کے پاک اور معتبر ہونے کا نظریہ پیش کیا تھا، چنانچہ ویدانت نے ایک طرف اگر خدا اور اس کی اعلیٰ ترین ہونے کا نظریہ پیش کیا تو دوسری طرف اُس نے اس بات پر بھی زور دیا کہ روح انسانی عظیم المرتبت لافانی ہے اور اس کا رجحان اصلی لازمی طور پر "خیر" کی طرف مائل ہے۔ چونکہ مسلمان صوفی بھی اس قسم کے نظریوں کی اشاعت کر رہے تھے اس لئے یہ امید پیدا ہوئی کہ ہندوستان میں ویدانت اور صوفیت کو باہم منسلک اور متحد کرکے مذہبی اور اس کے ساتھ ساتھ سیاسی مسائل حل کئے جاسکتے ہیں۔ جہانگیر نے غیر شعوری طور پر اور دارا نے شعوری طور پر اس مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہندو عوام بے شمار خداؤں کی پرستش کے کچھ اس طرح عادی ہوگئے تھے اور مسلمان اسلام کے اتنے معتقد تھے کہ دونوں قوموں کے افراد ویدانت اور صوفیت کے، مفاہمت اور اتحاد کے مخالف بن گئے۔ چنانچہ مذہب پرست اورنگ زیب کے تخت نشین ہونے اور شاہ محمد کی موت کے بعد اتحاد کا یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ اس کے بعد سے یہ دونوں فرقے برابر ایک دوسرے سے علیحدہ ہی ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ آج یہ اختلاف پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ بڑھ گیا ہے۔

لسانی اعتبار سے بھی ایشیا کی مختلف قوموں کو یکجا کرنے کا واقعہ پیدا ہوا۔ دہلی میں ترکستان، ایران، افغانستان، خوارزم، کردستان، ایشیائے کوچک، شمالی افریقہ، زنجبار، اسپین، یورپی ترکی اور یورپ کے دوسرے ممالک اور ہندوستان کے دور دراز صوبوں کے مہاجرین بھرے رہتے تھے۔ مسلمان حکمران چونکہ غیر ملک سے آئے تھے اس لئے ملک کے تمام صوبوں کے ساتھ یکساں برتاؤ روا رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ ملک کی کسی ایک زبان کو دوسری تمام زبانوں پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔ سوائے اس زبان کے جو دہلی اور آگرہ کے اطراف و جوانب میں ترقی کر رہی تھی اور یہ زبان اردو تھی۔ چنانچہ بہت جلد اردو ہندوستان کے مختلف حصوں سے آنے والے مہاجرین کی مشترکہ زبان بن گئی۔ اردو کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان سپاہیوں اور ہندوستانیوں کے درمیان روزمرہ کے امور کی انجام دہی میں آسانی پیدا ہو، اس سبب سے ابتدا میں اردو زبان میں وہ الفاظ زیادہ تھے جو صوبہ دہلی اور آگرہ کے باشندوں میں رائج تھے ان الفاظ کا جس زبان سے تعلق تھا اسے "ہندی" کہا جاتا تھا اور گنگا کے دوآب میں رائج زبان سے یہ بالکل ملتی جلتی تھی۔ لیکن جب تہذیب یافتہ اور پڑھے لکھے مسلمانوں نے اردو میں زیادہ دلچسپی لینی شروع کی۔ تو انھوں نے بہت جلد اُسے فارسی آمیز بنادیا اور نہ صرف یہ کہ ایران کے زیادہ عام الفاظ و اصطلاحات کا استعمال شروع کردیا بلکہ اُس طرز کی شاعری اور محاوروں کو بھی رائج کرلیا جو مغربی ایشیا میں عام تھے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ہندی اور اردو کے اختلافات اس قدر نمایاں ہوتے چلے گئے کہ آج وہ ایک دوسرے سے بہت دور ہوگئے ہیں اور ہندوستان کے دو طاقتور فرقوں کی اُنھیں علیحدہ علیحدہ طور پر پشت پناہی حاصل ہے۔ چنانچہ آج ملک کے بہی خواہوں کے سامنے ایک سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ کیوں کر ان دو زبانوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لایا جائے اور انھیں واحد زبان بنایا جائے۔

عہد متوسط کے مسلمانوں میں اقلیت میں ہونے کے باوجود اپنی برتری کو قائم اور برقرار رکھا اس لئے کہ ان مسلمان حکمرانوں کی ہندو رعایا بے شمار علیحدہ علیحدہ جماعتوں اور گروہوں میں منقسم تھی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مسلمان اپنے نظریۂ حیات میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں کرنے پر مجبور ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے انھوں نے ملک کی زبان اختیار کرلی، ہندوؤں کے کچھ رسوم و رواج کو اپنایا۔ اسکی مثال یہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے اپنے یوم پیدائش کے جشن میں تلا دان یا تلادان کا رواج اختیار کیا اور ساتھ ہی ہولی اور رکشا بندھن کی رسم بھی اپنے یہاں رائج کی۔ مسلمان حکمرانوں نے ہندو طرز تعمیر کی کچھ خصوصیات بھی اختیار کیں۔ مثلاً مہا پدم، پنج یا تورتن، عمارت کے اندر اور باہر کی دیوار کے نقش و نگار، مقبروں کو مسرت انگیز تفریح گاہ کی شکل دینا وغیرہ۔ اسلام کا کٹر نظریہ مصوری کی اجازت نہیں دیتا لیکن ہندوں کے وہاں یہ فن رائج تھا۔ مغل بادشاہوں نے مصوروں کے بڑے بڑے اعلیٰ نظریئے قائم کئے جن پر بابر سے لے کر شاہجہاں کے عہد تک عمل ہوتے رہے۔ لیکن اورنگ زیب نے انھیں ختم کردیا اس لئے کہ اس کے نزدیک فن لطیفہ اسلام کی اسپرٹ کے خلاف تھا۔

مسلمان حکمرانوں نے ملک میں بہت سے ایسے رسوم و رواج کو برقرار رکھا جو شرع میں داخل نہ تھے۔ مسلمانوں کے عہد میں بے شمار مندر تعمیر کرائے گئے پھر ہندوؤں کے زیادہ تر تیلے مسلمان افسروں ہی کے انتظام اور تحفظ میں ہوتے تھے۔ اس طرح بت شکن مسلمانوں میں آہستہ آہستہ زیادہ رواداری آرہی تھی۔ متھرا اور برندابن کی موجودہ حیثیت کی بنیاد مغل عہد میں ہی ڈالی گئی تھی۔ درآنحالیکہ محمود غزنوی اور اس کے سپاہیوں نے ان دونوں مقامات کو تباہ و برباد کردیا تھا جس کے بعد یہ شہر ویران ہوگئے تھے۔ اگر شاہجہاں کے بعد اورنگ زیب سے کم متعصب اور زیادہ ہوشمند حکمران تخت نشین ہوتا تو ممکن تھا کہ مسلمانوں کے اثرات زیادہ پائدار اور مضبوط ثابت ہوتے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں قومی رجحانات پائے جاتے تھے۔ اسلامی حکومت کے بعض تنظیمی ادارے براہ راست طور پر خود اسی ملک کے تھے، مثلاً محصولات آراضی کا نظام، قوانین واحکام کا شعبہ وغیرہ۔ کوتوال، پٹواری، چودھری زمیندار یہ تمام ادارے اسلامی حکومت میں برقرار رکھے گئے بالکل اسی طرح جیسے وہ ہندو عہد میں رائج تھے۔ عربی زبان کے علاوہ مسلمان حکمرانوں نے ترکی، فارسی، اردو اور ہندی کی بھی سرپرستی اختیار کی پھر ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے ہمیشہ سلطان قسطنطنیہ یا شریف مکہ کی بھی تابعداری نہیں قبول کی بلکہ خود ہی ہندوستان کے مسلمانوں کے امام بنے رہے۔ جب خود مسلمان حکمرانوں کا یہ طرز عمل تھا تو ہندوستان کے مسلمان بھی اپنے وطنی بھائیوں میں ہندوؤں کی طرف جھکے۔ اگر دارا یا اورنگ زیب نہ پیدا ہوتے تو مذہبی اختلافات کے باوجود ہندوستان صدیوں پہلے اپنے سماجی اور سیاسی مسائل حل کرلیتا۔ دارا نے دونوں فرقوں کے اتحاد کی تبلیغ کرکے اور اس اتحاد کو عملی صورت دینے کے لئے جلدبازی کرکے اور اورنگ زیب نے عربی قسم کے اسلام کو رائج کرنے اور مسلمانوں کو ہندوؤں سے مکمل طور پر علیحدہ کرنے کی کوشش کرکے ہندوستان میں قومیت کے عروج کو ناقابل بیان نقصان پہونچایا۔ دارا کا طرزِ عمل درست تھا لیکن وہ اورنگ زیب کی طرح قابل اور صلاحیت والا نہ تھا، اورنگ زیب کے اندر صلاحیت موجود تھی مگر وہ زیادہ فکرد ہوش اور دور اندیش نہ تھا اس زمانہ میں ہندوستان کو نہ دارا جیسے آدرش پسند آدمی کی ضرورت تھی اور نہ اورنگ زیب جیسے بے حد و حساب طور پر مذہب کو خالص بنانے کا خیال رکھنے والے آدمی کی۔ اس عہد میں ضرورت تھی، ایک بڑی حد تک بے عمل حکمران کی جو حالات کو فطری رفتار پر چھوڑ دیتا تاکہ دونوں فرقے آہستہ آہستہ ایک دوسرے کی قدر و قیمت سمجھنے لگتے اور مستقبل کے اتحاد کے لئے زمین فراہم کرتے۔

آخر میں یہ کہنا ضروری ہے کہ اسلام نے نہ صرف یہ کہ غیر مسلموں کو اپنے سیاسی اور سماجی نقائص اور خرابیوں کو دور کرنے کی طرف متوجہ کیا بلکہ اسلام کے آنے سے ہندوستان میں ایک نئے لیکن زیادہ جاندار اور زرخیز کلچر کا اضافہ ہوا جس سے آگے چل کر ہندو اور مسلمان دونوں فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

دنیا انقلاب کے دروازے پر

از ——— سید محمد تقی امروہوی

انگلستان

دنیا کے تمام ممالک میں ایک انگلستان ہی کو خصوصیت حاصل ہے کہ وہ نئی دنیا کے ساتھ پرانی دنیا کی یادگاروں کو بھی باقی رکھنے پر اصرار کرتا ہے۔ دنیا کے تمام دوسرے ملک رجعت پرستی سے ضرور متاثر ہیں۔ اس لئے کہ بہرحال سرمایہ داری اب رجعت پسندی کی ایک بنیاد بن گئی ہے۔ لیکن انگلستان اور دوسرے ممالک کے درمیان ایک فرق بالکل واضح طور پر معلوم ہوتا ہے یہ فرق ہے جدت اور رجعت پرستی کا درمیان اتحاد پیدا کرنے کی کوشش جو کہ انگلستان کے لئے مخصوص ہے اور دوسرے ممالک میں یہ چیز نہیں پائی جاتی۔

انگلستان نے انیسویں اور خصوصاً بیسویں صدی میں سخت کوشش کی کہ وہ سرمایہ دارانہ جدتوں کے ساتھ ہی اپنے ماضی کے یادگاروں کو باقی رکھے۔ اتنا ہی نہیں یہ بھی اس ملک کی خصوصیت ہے کہ اس نے ساری دنیا کی رجعت و قدامت کو باقی رکھنے کا ٹھیکہ لے رکھا تھا انگلستان کی طرح یہ برداشت نہ کر سکتا تھا کہ دنیا معاشی سیاسی یا تاریخی مطالبات اور تقاضوں سے مجبور ہو کر آگے بڑھے بلکہ اس کی خواہش تھی کسطرح وہ تمام تاریخ کو ایک مرکز پر روک دینے پر قدرت حاصل کر لیتا۔ یہ ایک نقطہ ہے۔ لہٰذا آبادیاتی طرز حکومت اور بین الاقوامی ساہوکاروں کی ٹھیکہ داری ——— بلا شبہ انگلستانی دماغ نے اس میں بہت کامیابی حاصل کی اور کافی مدت تک وہ تاریخ کی زمام روکے کھڑا رہا یا یوں کہہ لیجئے کہ اسکی خوش قسمتی سے تاریخ نے وہ رُخ اختیار کیا کہ وہ اس پارٹ کو کامیابی کیساتھ انجام دینے پر قادر ہو سکا اور جب تاریخی مانگیں کوئی خاص رُخ اپنا لیتی ہیں تو پھر کوئی بھی طاقت آگے بڑھنے سے روک سکتی۔

تاریخی تقاضے

حالات نے تبدیلی اختیار کی اور آخر انگلستان کو بھی اپنے قیام سے ہٹنا پڑا۔ گذشتہ نصف صدی میں یہ تبدیلی بڑی حد تک معاشرتی لیکن کم سیاسی و معاشی رہی لیکن پچھلی جنگ اور اس کے بعد موجودہ جنگ نے تاریخ کی تیز رفتاری پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ اب انگلستان کو اپنے سابقہ معیاروں میں مجبوراً تبدیلی کرنا پڑے گی اور اسے پرانی دنیا کو چھوڑ کر لازماً نئے حالات سے سازگار ہونا پڑے گا ورنہ وہ بھی اس طرح تباہ ہو جائیگی۔ جس طرح دنیا کی دوسری شہنشاہیتیں اور باعظمت حکومتیں برباد ہو گئیں۔

جنگ شروع ہوتے ہی انگریزی سرکار نے اپنے بوسیدہ معاشی نظام میں جو سیاسی حیثیت سے دقیانوسی طرز کی پارلیمانی بنیاد پر کھڑا تھا ایک دور رس اور بنیادی تبدیلی کی۔ یہ تبدیلی تھی۔ ذاتی ملکیت کے تقدس سے انکار ——— آج تک انگلستان والے ذاتی ملکیت کے ادارہ کو حد درجہ مقدس سمجھتے تھے اور ان کے خیال میں ——— ذرائع پیداوار کی ذاتی ملکیت۔ کوئی فطری اور طبعی حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن جنگ کے زمانے میں انھیں اپنے تصورات کو تبدیل کرنا پڑا اور یہ سمجھنا پڑا کہ ذاتی ملکیت کا ادارہ ہرگز کوئی تقدس نہیں رکھتا اور اگر حکومت چاہے تو نہایت آسانی سے اُسے توڑا بھی جا سکتا ہے۔

انگلستان پر بمباری

۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۱ء کے موسم سرما میں جرمن طیاروں نے انگلستان پر خوفناک اور بے پناہ بمباری کی۔ یہ بمباری اتنی شدید تھی کہ اسکی مثال اس وقت تک کے جنگی رکارڈ سے نہیں پیش کی جا سکتی اس نے جان اور ذہنیت سے اثرات ڈالے اہل انگلستان کی نفسیاتی حالت پر ایک زبردست اثر ڈالا۔ یہ اثر تھا اپنے ماضی اور حال سے بے اطمینانی اور نئی دنیا کے حالات سے تطابق پیدا کرنیکی کوشش۔ اس سے قبل ایک اوسط درجہ کا انگریز سمجھتا تھا کہ برطانی شہنشاہیت سے ادارہ کا

مرکزی نقطہ ہونے کی وجہ سے انگلستان مصیبتوں اور آفات سے نازل ہونے سے محفوظ رہے گا۔ اور گو جنگ ایک خطرناک اور قابل نفرت چیز ہے مگر انگلستان پر اس کا اثر صرف معاشی ہی پڑ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ نیز اس تھوڑی سی معاشی تکلیف کے بعد جب جنگ ختم ہوتی ہے تو انگلستان کا وقار پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جاتا ہے اس طرز فکر کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ انگلستان کی عوام کی اکثریت کو اپنے پارلیمانی نظام کی بہتری اور خوبی کا یقین ہو گیا۔ اور وہ سمجھنے لگے کہ ان کی پارلیمانیت ہی ان کے عیش و آرام راحت و اطمینان کا باعث ہے لہذا یہ سب سے بہتر اور سب سے پسندیدہ تر نظام ہے۔ لیکن جرمن طیاروں کی خوفناک بمباری انگلستان کے نونہالوں کی تباہی اور برطانیہ کے قابل قدر آثار قدیمہ کی بربادی نے انگریزی دماغ میں انقلاب برپا کر دیا۔ اب اسے جنگ کو قریب سے سمجھنے کا موقع ملا۔ اب اسے اندازہ ہوا کہ وہ جس دنیا میں رہتا ہے وہ کسی بنیادی خرابی کی وجہ سے ان مصیبتوں کی آماجگاہ ہے کن مصیبتوں کا جس کا سرسری اندازہ کچھ اسے بھی ہوا۔

ذاتی ملکیت کا تقدس

پانچ سو سالہ پارلیمانی نظام اور دو سو سالہ برطانی شہنشاہیت

کا خوش آیند تقرر اب اتنا قابل عزت نہ رہا جتنا اب سے پہلے تھا۔ اب فرنگی کے دماغ کو سوچنے اور سمجھنے کی نئی بنیاد ملی تھی۔ اس نے سوچنا شروع کیا۔ وہ سمجھا کہ سرمایہ داری میں کچھ خامیاں بھی ہیں۔ جن کا دور کرنا ناگزیر ہے۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو اب سے ۲۰ سال بعد اس پر یا اس کے بچوں پر بھی ایسی ہی خوفناک بمباری ہو جائے جیسے اب ہو چکی ہے۔ ادھر جنگ کو کامیاب لائنوں پر لڑنے کیلئے اسے پہلے سے زیادہ انقلابی کام کرنے پڑ گئے۔ آج سے پہلے تو وہ صرف نام کی تبدیلیاں کرنے پر قانع ہو گیا تھا لیکن اس جنگ میں فرانس کے تباہ ہونے کے بعد اسے یہ محسوس ہوا کہ اب مزید تبدیلیاں کرنی ضروری ہیں ورنہ اس کی حکومت تباہی و بربادی سے دوچار ہو جائے گی۔ یہی وہ اندازہ تھا جس نے جنگ کے زمانہ میں ذاتی ملکیت کے مقدس اور پرانا ادارہ کی بنیادیں ہلا دیں۔ اور ایک قسم کے ڈکٹیٹر شپ کا انگلستان میں خاتمہ کر دیا جس نے ساری بڑی بڑی صنعتوں اور کاروبار کا خاتمہ کر کے جنگی ضروریات کا کام لے کر اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اس طرح ریاستی اشتراکیت قائم ہو گئی۔ یہ وہی ریاستی اشتراکیت ہے جو تجارت میں انفرادی آزادی کے اصول کی ٹھیک ٹھیک مخالف ہے۔ انگلستان جو انفرادی آزادی کے اصول کا دنیا میں سب سے بڑا نقیب تھا۔ حالات سے مجبور ہو کر وہ اسی نظام کو ماننے کے لئے مجبور ہو گیا۔ اب جنگ ختم ہو رہی ہے لبرل پارٹی پھر پرانے طرز پر لوٹنے کیلئے بیتاب تھی۔ ٹوری بھی یہی خواہش رکھتے تھے گر وہ کھل کر اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن لیبر کو ظاہر ہے کہ وہ اب جنگ کے شاندار تجربات کو بھلا کر پرانے انفرادی۔ آزادی والے نظام کی طرف لوٹنے کے سخت مخالف ہیں اور یہ ہے بھی بالکل فطری۔ اگر ریاستی اشتراکیت جنگ کے زمانہ میں انگلستان کو تباہیوں سے بچا سکتی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اس کے سوالات کو بھی حل کر سکتی ہے اور اس لئے اس کے لوٹنے پر ریاستی اشتراکیت کو خیرباد کہہ دینا پرلے درجہ کی حماقت ہو گی۔

یورپ کے انقلابی مطالبات

۳۱ اگست ۱۹۳۹ء کا یورپ

یعنی وہ یورپ جو اس جنگ سے ٹھیک ایک دن پہلے تھا آج کے یورپ سے کس قدر مختلف ہے۔ اس کا اظہار بے سود ہے۔ آج یورپ کے تمام ملکوں میں زندگی کی نئی تعریف کی جا رہی ہے سماج کی پرانی ساخت ٹوٹ پھوٹ چکی ہے اور ایک زندہ متحرک اور شاندار تمدن ابھر رہا ہے۔ یہ انقلاب صرف سیاسی نہیں ہے۔ یہ ذہنی روحانی ادبی، اخلاقی اور علمی ہے۔ آج کے یورپ میں پرانی اقدار ختم ہو چکی ہیں۔ نسل پرستی کا نظریہ سسکیاں لیکر دم توڑ چکا ہے۔ ذاتی جائداد کا تباہ کن اصول ختم کیا جا رہا ہے۔ آقائی اور عبودیت کے امتیازات اٹھائے جا چکے ہیں۔ عوامی ادب و لٹریچر کا زمانہ ہے۔ علم و تفکر کی حد بندیاں توڑی جا چکی ہیں بہر حال زندگی اور زندگی کے تمام مظاہر متاثر ہو رہے ہیں۔ جنگ کے زمانے میں انسان نے بہت سے تجربے کئے۔ ان تجربوں سے آج فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ پچھلے پانچ سال تک انسان نے انسان کو ہلاک کرنے کے

نئے نئے طریقے ایجاد کئے گئے۔ مزدوروں نے ۲۴ گھنٹے میں ۱۲-۱۴-۱۶ اور بعض حالات میں ۱۴-۱۶-۱۸ گھنٹے کام کیا تھا۔ لیکن ان تمام مساعی کا مقصد انسان کو ہلاک کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ آج اسی تیزی اور سرعت کے ساتھ جس کا اظہار جنگ کے زمانہ میں ہوا تھا اس کی بنیادیں استوار کی جارہی ہیں۔ اور اس نئے تجربہ میں غیر متوقع طور پر شاندار کامیابی حاصل ہے صرف ایک روس ہی میں ــــ اور غالباً صرف روس ہی میں ــــ اس سال فصل اس قدر شاندار رہے گی کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ حالانکہ یہ اسی روس کا ذکر ہے جسے نازی ہالی کمان ایک بار نہیں کئی بار تباہ کر چکا تھا اور وہی یوکرائن جو ۳½ سال تک برابر ایک بھیانک جنگ کا میدان بنا رہا۔ آج پھر اس قدر زرخیز بنایا جا چکا ہے کہ جولو مغربی روس کے دوسرے علاقے تباہ شدہ پولینڈ کے آدھے اخراجات برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ ممکن ہے روس کی بابت یہ کہا جائے کہ وہاں اشتراکیت ہے اور اس لئے ملک کی ساری پیداوار عام سماج کو سامنے رکھ کر کی جاتی ہے۔ اور اس وجہ سے وہ سرمایہ پرست ملکوں کی پیداوار سے کہیں زیادہ ہوتی ہے یقیناً یہ صحیح ہے لیکن یہ بات یاد رہے کہ روس میں کام کی سرعت جنگ سے پہلے اتنی نہ تھی جتنی آج ہے اور دوسرے یہ کہ روس کے علاوہ دوسرے ملکوں میں یہ تیز روی پائی جاتی ہے۔ تناسب کی رو سے کمی وبیشی تو ہے۔ مگر سرعت ہر ملک میں نمایاں ہے۔ جنگ ہی کے تجربے سے ایک احساس بھی عام ہے کہ ملک کی تجارت و مالیات کو منصوبہ بندی کے اصول پر چلایا جائے چنانچہ یورپ کے تمام ملک اسی اصول پر عمل پیرا ہیں۔

امریکہ میں تبدیلیاں

دنیا کے تمام سرمایہ دار ملکوں کی رہنمائی کا شرف امریکہ کو ہی حاصل ہے۔ انیسویں صدی میں عموماً اور بیسویں صدی شروع رہنے میں عموماً یہ فرض برطانیہ سرانجام دیتا رہا۔ مگر پچھلی جنگ کے بعد سے اس خدمت کی سرانجام دہی امریکہ نے شروع کر دی لیکن جنگ کے شروع ہونے تک برطانیہ اور امریکہ متحدہ طور پر اس مشن کو ساری دنیا تک پہنچاتے رہے۔ مگر جنگ میں حالات بدل گئی۔ برطانیہ مجبور کن تاریخی طاقتوں کے فعل اور ردعمل کی وجہ سے پیچھے ہٹ گیا اور امریکہ نے دنیا کی سرمایہ پرست قیادت کا بوجھ خود اٹھا لیا۔ یہ نتیجہ تو تھا عمومی تاریخی طاقتوں کا۔ لیکن اس کا آلۂ کار آنجہانی مسٹر روزولٹ تھے جنہوں نے اپنی ذہانت سے یہ معلوم کر لیا کہ اس وقت امریکہ کیا رول انجام دیگا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس احساس کے پیش نظر وہ پالیسیاں اختیار کیں جنہوں نے آج ریاستہائے متحدہ کو وہ درجہ دلا دیا جو وہ ایک مدت سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جنگ کے پیدا کردہ تقاضوں کے پیش نظر ساری دنیا کی ملکوں میں عوامی رجحان نے ترقی کی ہے۔ اور انسان بڑی تیزی کے ساتھ اشتراکیت کی طرف جا رہا ہے لیکن اس کے بالکل برعکس امریکہ اور صرف امریکہ میں تاریخ کا عمل اس کے خلاف ہوا ہے۔ امریکہ میں جنگی حالات نے مخالف سمتوں سے اثرات ڈالے۔ جن کے نتیجہ میں امریکہ کی قومی سرمایہ داری بین الاقوامی اجارہ داری میں بدل گئی۔ یوں بظاہر جدائی پسندی کے حامیوں کی شکست اور بین الاقوامیت کے حامیوں کی معیت جو روزولٹ اور ڈیوی کے انتخابات صدارت کے نتیجہ میں ایک طے شدہ حقیقت بن گئی۔ امریکہ میں ترقی پسندی کی جمعیت سمجھی جاتی ہے۔ لیکن حقیقتاً ایسا ہے نہیں۔ جدائی پسندوں کی ہار۔ رجعت پسندی کی ہار تو ہے لیکن یہ رجعت پسندی کیا ہے۔ یہ رجعت پسندی ہے قومی سرمایہ داری جو پرانے اصول کے ماتحت وہ اپنے مقام پر کھڑے رہنے پر مصر تھی اور آگے بڑھنے کے لئے تیار نہ تھی۔ چنانچہ اسی وجہ سے اسے رجعت پسندی کہا گیا جب کہ دوسرے نظریہ کے مالی یعنی بین الاقوامیت پسند ترقی پرست تھے۔ یعنی یہ کہ وہ امریکن سرمایہ داری کو ساری دنیا پر ساری دنیا پر مسلط کر دینے کے حامی تھے۔ ظاہر ہے اس صورت میں گو رجعت پسندی کو ہار تو ہوئی مگر جس ترقی پسندی کو وہ حقیقی ترقی پسندی نہ تھی بلکہ محض اضافی ترقی پسندی تھی لیکن وہ امریکی سرمایہ دار کے احساس کمتری کو احساس برتری میں بدلنے والی ترقی پسندی تھی۔ یہ ترقی پسندی جیت گئی مگر ساری دنیا کیلئے یہ ایک مستقل خطرہ بن گئی۔ امریکہ میں اس نئی صورتوں کے نمودار ہونے کا کیا نتیجہ ہوگا۔ یہ ایک دلچسپ موضوع ہے جس پر ہمارے انقلابی مدبروں کو ضرور غور کرنا چاہئے یہ بات ظاہر ہے کہ جب حقیقی مجبوری نظریات بین الاقوامی شکل اختیار کریں گے اور ایک ایسی بین الاقوامی جماعت بنے گی۔ خواہ غیر محسوس طور پر ہی کیوں نہ اس جو ساری دنیا میں اقتصادی جمہوریت یا عوامیت کا اقتدار قائم کرنے کی کوشش کرے گی تو اس کے جواب میں بین الاقوامی سرمایہ داری

آئے گی۔ جو اس رجحان کو ناکام بنانے کی کوشش کرے گی۔ اس وقت تک۔ یہی صورت حال ہے۔ امریکہ بین الاقوامی سرمایہ داری کے نقیب کی حیثیت سے میدان میں آچکا ہے۔ ادھر روس عوامیت پسند رجحان کے بین الاقوامی احساس کا قائد ہے۔ چنانچہ سان فرانسسکو کانفرنس میں جو کہ ایک بین الاقوامی ادارہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی یہی جنگ غیر محسوس طور پر لڑی گئی مگر چونکہ تاریخ ابھی تک اس مرحلہ پر نہیں پہنچی۔ جہاں سارے رجحانات واضح ہو جائیں لیکن اس لئے عارضی طور پر آپس میں اتحاد کر لیا گیا لیکن یہ حالت زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رہ سکتی۔ اسی کشمکش میں برطانیہ بالکل غلط رول سرانجام دے رہا تھا۔ اس لئے کہ ابھی تک اس نے امریکہ کی سرمایہ داری قیادت کی زندہ حقیقت کو پوری طرح محسوس نہیں کیا اور وہ متوقع ہے کہ جنگ کے بعد پھر پرانی حالت لوٹ آئے گی لیکن یہ اس کی بھول ہے۔ جنگ نے جن حقائق کو جنم دیا ہے وہ اتنی آسانی کے ساتھ نہیں مر سکتے۔ اور اس لئے جب برطانیہ جنگ کے بعد اپنی صحیح پوزیشن کو محسوس کرے گا تو اپنی سابقہ پالیسی کی غلطی محسوس کر کے لازماً بہت پچھتائے گا۔ بہرحال آج کا امریکہ پرانے امریکہ سے کہیں مختلف ہے۔ اب تک اس کا مشن قومی جمہوریت تھا لیکن اب بین الاقوامی اجارہ داری ہے۔ لیکن تاریخ کا یہ اسٹیج محض عبوری ہے اور ابھی تک ایک تاریخی عنصر نے اپنا عمل پورا نہیں کیا۔ یہ عنصر جاپان کی جنگ ہے۔ جو جلد کسی نتیجہ پر پہنچکر یا غیر متوقع طور پر طویل ہو کر کسی اہم تاریخی حقیقت کو وجود میں نہیں لائے گی۔

مشرقی ممالک انقلاب کے دروازہ پر

مشرق میں انقلابی حرکت کافی محسوس اور تیز ہے۔ اس لئے کہ مشرقی ملک ناقابل برداشت حد تک پس ماندہ ہے۔ اس لئے تاریخ نے اپنی تیز رفتاری کے دوران میں انھیں ترقی کی طرف بڑی تیزی کے ساتھ ڈھکیلا۔ مشرق وسطی۔ ہندوستان اور مشرق بعید کے تمام ملک جنگ کے اثرات و محرکات سے ہل گئے ہیں۔ پرانی سماج دم توڑ کر گرگئی اور نئے سماج کی بنیادیں پڑنے لگیں۔ خود ہندوستان بھی ترقی کی دوڑ میں پیچھے نہیں رہا۔ برطانوی سامراج کو مشرقی بھنگے یعنی جاپان کے شدید خطرہ نے ہندوستان کو اپنے قدموں پر کھڑا کرنے کے لئے مجبور کر دیا۔

توقع یہ تھی کہ یہ صورت حال محض عارضی ثابت ہوگی لیکن کچھ ہی دنوں میں یہ خیال غلط نکلا۔ ادھر تو جاپان اپنے مقام پر اڑ گیا اور مشرقی بھنگے خلاف توقع طور پر جم کر لڑتے اور لڑ رہے ہیں۔ اس لئے ضرورت پڑی کہ جوابی کوششیں تیز تر کر دی جائیں۔ مگر ان مساعی کا اثر کافی دور رس تھا۔ ہندوستانی سماج کی پرانی بنیادیں ہل گئیں اور سوسائٹی میں نئے طبقات اُبھر آئے ادھر بین الاقوامی میدان میں تجارتی مقابلہ سخت ہو گیا۔ پھر مشرق کی عمومی بیداری اور ہندوستانی عوام کی خصوصی انقلاب بندی نے برطانیہ کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی نوآبادیاتی پالیسی کو بدلے۔ اور ہندوستان کو آزاد کر کے ہندوستانی عوام کی ہمدردیاں اپنے ساتھ کر لے اور پھر ایک دوست کی طرح ہندوستان کو اس کی صنعتی ترقی میں امداد دینے کا کام سرانجام دے۔ اس طرح برطانیہ کے جمہوریت پرستانہ وعادی بھی اپنے مقام پر برقرار رہیں گے۔ اور اس کی تجارت کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ لیکن غالباً ہندوستان کا مسئلہ تو نسبتاً آسانی کے ساتھ حل ہو جائے گا۔ مگر سوال ان ملکوں کا ہے جو جاپان کی غلامی سے آزاد ہوں گے اور جن میں حرکت اور زندگی کے نئے آثار موجود ہوں گے۔ دیکھنا ہے ان سے امریکہ اور برطانیہ کس طرح نپٹتے ہیں اور آیا اس سلسلہ میں ان کے مفاد ٹکراتے ہیں یا نہیں۔ نیز روس ان آزاد ملکوں میں سے کتنے ممالک کو اپنے حلقۂ اثر میں لینا پسند کرے گا۔ بہرحال جنگ کی وجہ سے ایک عظیم انقلابی رو جاگ اٹھی ہے۔ جو نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں نمایاں ہے اور جس کے اثرات بہت دور رس بہت دیرپا اور مفید ہوں گے۔

ابتدائی سماجی نظام

از ــــــــــــــ اینگلز

جنٹائل طرز کا سماجی نظام دورِ وحشت کے پچھلے عہد میں پیدا ہوا اور دورِ وحشت[1] کے آخری عہد میں ترقی کرتا رہا اور جہاں تک ہماری تحقیق و تفتیش و معلومات کا تعلق ہے دورِ بربریت کے شروع زمانہ میں اپنی انتہائی منزلِ عروج پر پہنچا ہے۔

یہاں پر امریکہ کے قدیم باشندوں کا طرزِ رہائش مثال کی طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس عہد میں جنٹائل طرز کے سماجی نظام کی شکل و صورت مکمل ہو چکی تھی۔ یہ قبیلہ متعدد جینزوں[2] میں تقسیم ہو چکا تھا۔ عام طور سے ہر قبیلہ جینوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ جب آبادی میں اضافہ ہوا تو ہر ابتدائی جین متعدد چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں تقسیم ہو گیا اور ایک بڑا جین اپنے تحت تمام چھوٹی چھوٹی جماعتوں یا جینیوں کے ساتھ مل کر ایک برادری[2] کہلانے لگا ہر قبیلہ مختلف اور متعدد قبیلوں میں تقسیم ہو گیا۔ اور ہر تقسیم شدہ قبیلے میں اسی پرانے طرز پر متعدد جین ہونے لگے۔ زیادہ تر قبیلوں میں ایسا ہی ہوتا تھا۔ بعض اوقات کئی ایسے قبیلے جن کی آپس میں رشتہ داری ہوتی تھی۔ ایک ہی وفاق میں شامل ہو جاتے تھے۔ یہ قدیم سادہ نظام اُن سماجی حالات کے بالکل مطابق اور موزوں تھا جن کے بطن سے یہ پیدا ہوا تھا۔ مختلف قبیلوں کے اس اجتماعی نظام کی اہمیت یہی ہے کہ معصر سماجی حالات کے بالکل مطابق تھا۔ اور سماج میں پیدا ہونیوالے تمام جھگڑوں اور مناقشات کو سلجھانے اور حل کرنے کی اس میں صلاحیت موجود تھی۔ اس عہد میں ایک قبیلہ کے مفاد جب کسی دوسرے قبیلے کے مفاد سے ٹکراتے تھے تو فیصلہ جنگ کے ذریعہ ہوتا تھا۔ اس جنگ میں ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کو چاہے ملیت و نابود کر دے مگر ماتحت بنا کر کبھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ چاہے اسے عربی لیا جائے یا خرابی مگر جنٹائل عہد کی سماجی تنظیم کی خصوصیت یہ تھی کہ نہ تو کوئی حاکم تھا نہ محکوم۔ قبیلہ کے اندرونی نظام میں اب تک "حقوق" اور "فرائض" میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا تھا۔ امریکہ کے قدیم باشندوں میں یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ پبلک امور میں یا کفارہ ادا کرنے کی یا خون کا بدلہ خون سے لینے کی رسموں میں حصہ لینا حقوق میں داخل ہے یا فرائض میں۔ یہ سوال ان کے لئے اتنا ہی مہمل ہے جیسے کوئی یہ پوچھے کہ سونا، کھانا یا شکار کھیلنا فرائض میں داخل ہے یا حقوق میں۔ اس طرح قبیلے یا جین کو مختلف طبقوں میں تقسیم کرنا بھی غیر ممکن تھا۔

یہاں پر ہم اس سماجی تنظیم کی معاشی بنیادوں کی تحقیق و تفتیش کی طرف متوجہ ہوئے ہیں جن کے بطن سے ان کی پیدائش ہوئی تھی۔

اس زمانہ میں آبادی بہت کم تھی۔ آبادی صرف اس مقام پر گھنی ہوئی تھی جہاں قبیلہ مستقل طور پر قیام کرتا تھا۔ اس مقام کے چاروں طرف دور دور تک شکارگاہ ہوتی تھی اور اس کے چاروں طرف جنگلات کا سلسلہ جو کسی خاص قبیلے کے قبضہ میں نہیں ہوتا تھا۔ جنگلات کا یہ سلسلہ اس مخصوص قبیلے کی جائے قیام کو تمام دوسرے قبیلوں کی جائے قیام سے علیحدہ کرتا تھا۔ تقسیم محنت کی نوعیت بالکل قدیمی تھی یعنی تقسیم محنت صرف مردوں اور عورتوں میں تھی۔ تمام مرد کچھ اور کام انجام دیتے تھے اور تمام عورتیں کچھ اور۔ مردوں کا کام جنگ کرنا، مچھلی مارنا اور جانوروں کا شکار کرنے کھانے پینے کے سامان فراہم کرنا تھا۔ اور شکار اور جنگ اور فراہمی غذا کے لئے ضروری آلات اور ہتھیار مہیا کرنا۔ عورتیں گھر کے کام کرتی تھیں، کھانا پکاتی تھیں، لباس تیار کرتی تھیں، کپڑے بنتی اور سیتی تھیں۔ مرد اپنی دنیا کے مالک تھے اور

---

[1] مورگن کی تحقیقات کو تسلیم کرتے ہوئے اینگلز نے بھی انسانی نسل کی ابتدائی تاریخ کو دورِ وحشت، دورِ بربریت اور دورِ تمدن میں تقسیم کیا ہے۔

[2] برادری ترجمہ ہے PHRATRY کا جین (GEN) قبیلہ کی سب چھوٹی وحدت کو کہتے ہیں۔

اور عورتیں اپنی دنیا کی۔ مرد جنگلوں کے مالک تھے اور عورتیں اپنے گھر کی۔ مرد اور عورت کی ملکیت میں اپنے اپنے استعمال کے اوزار و آلات ہوتے تھے مرد کی ملکیت میں شکار کرنے، مچھلی مارنے کے آلات ہوتے تھے اور عورت کی ملکیت میں گھریلو کام انجام دینے کے آلات۔ کئی خاندانوں[1] بلکہ اکثر خاندانوں میں جائے رہایش مشترکہ ہوتی تھی۔

جو چیزیں مشترکہ محنت سے بنائی جاتی تھیں اور مشترکہ طور پر استعمال میں آتی تھیں۔ انھیں مشترکہ ملکیت قرار دیا جاتا تھا۔ مثلاً مکان، باغ اور لانبی کشتیاں یہی ایک سماجی نظام تھا، جس میں مالک خود اپنی محنت سے اپنی ملکیت پیدا کرتا تھا۔ آج تمدن یافتہ سماج میں خاتون دان حضرات اور ماہرین اقتصاد اسی چیز کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں حالانکہ موجودہ سماج میں مالک خود اپنی محنت سے اپنی ملکیت نہیں پیدا کرتا بلکہ دوسروں کی محنت سے۔ سرمایہ دارانہ ملکیت کو قانونی طور پر جائز ثابت کرنے کیلئے آخری حربہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں اس چیز کا وجود بھی نہیں۔

لیکن دنیا کے ہر خطے میں سماجی تنظیم اسی منزل پر نہیں تھی۔ ایشیا میں انسان کو ایسے جانور ملے جن کو پالا جا سکتا تھا۔ اور پال کر ان کی نسل بڑھائی جا سکتی تھی۔ جنگلی بھینسیں لوگ شکار کرتے تھے۔ اور پالتو بھینس ہر سال بچہ دیتی تھیں اور اس سے دودھ بھی حاصل ہوتا تھا کئی سبب سے ترقی یافتہ قبیلوں نے پہلے تو مویشی پالنا شروع کیا اور بعد میں وہ شکار چھوڑ کر صرف دیکھ بھال کرنے لگے اور ان کی نسل میں اضافہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور یہی ان کا خاص پیشہ ہو گیا۔ مویشی پالنے والے قبیلوں نے دوسرے وحشی قبیلوں سے جن کی تعداد بہت زیادہ تھی خود کو علیحدہ کر دیا۔ اس طرح گویا انسانی تاریخ میں پہلی بار ایک ایسی تقسیم محنت کا رواج جس کی نوعیت سماجی تھی نہ کہ طبعی۔ اس سے پہلے مرد عورت کے درمیان جو تقسیم محنت کا وجود تھا۔ اس کی نوعیت ظاہر ہے۔ کہ محض طبعی تھی۔ مویشی پالنے والے قبیلوں نے وحشیوں کی بہ نسبت زندگی کی ضروریات میں بھی اضافہ کیا اور ساتھ ہی زندگی کی ضروریات کی کیفیت بھی بدل دی۔ وحشیوں کے مقابلہ میں ان کو بہت سے فوائد حاصل تھے۔ مثلاً انہیں دودھ اور دودھ کی بنی ہوئی اور بھی غذائیں حاصل۔ گوشت انھیں زیادہ مہیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے پاس جانوروں کی کھال، اون، بکرے کے بال اور بنے ہوئے کپڑے بھی مہیا تھے۔ یہ اشیا وحشیوں کو نہیں میسر تھیں۔

جیسے جیسے خام مال زیادہ مقدار میں حاصل ہونے لگا ویسے ہی اشیار کی مقدار اور تعداد بھی بڑھتی گئی۔ اس طرح انسانی تاریخ میں پہلی بار باقاعدہ طور پر اشیار کا تبادلہ شروع ہوا۔ اس سے پہلے اشیار کا تبادلہ کبھی کبھی ہوتا تھا۔ آلات اور ہتھیاروں کے بنانے میں کوئی زیادہ ماہر تھا۔ اور کوئی کم اس سے یہ ہوا کہ عارضی طور پر تقسیم محنت کا طریقہ استعمال میں آیا۔ چنانچہ کھدائی کے ذریعہ مقامات پر پتھر کے اوزار اور آلات بنانے کے کارگاہوں (WORK SHOPS) کا پتہ لگا ہے یہ کارگاہیں پہلے "عہد سنگ" کی یادگاریں اور ان کی نوعیت میں قطعی کسی اختلاف یا شک کی گنجایش نہیں ہے۔ ماہرین فن ان کارگاہوں میں پوری قوم کے لئے محنت کرتے تھے نہ کہ اپنے ذاتی منافع کے لئے۔ ہندوستان کے ایسے فرقوں میں جو اب تک جنسائل طرز کے نظام میں زندگی بسر کر رہے ہیں ابھی تک یہ رواج قائم ہے کہ خاص خاص ماہرین فن پورے فرقے کے لئے محنت کرتے ہیں۔ اس عہد میں تبادلۂ اشیار اگر ممکن تھا تو قبیلہ کے اندر ہی اس کے باہر نہیں اور وہ بھی مستقل طور پر نہیں بلکہ شاید کبھی کبھی ایسا ہو جاتا تھا۔ لیکن جب مویشی پالنے والے قبیلے وجود میں آئے اور وحشی قبائل سے وہ علیحدہ ہو گئے تو وہ تمام حالات پیدا ہو گئے جن کی وجہ سے مختلف قبیلوں کے درمیان اشیار کا تبادلہ وجود میں آیا اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے ایک باقاعدہ اور باضابطہ سماجی ادارے میں تبدیل ہو گیا۔ شروع شروع میں جینٹوں کے سرداروں کے ذریعہ قبیلے آپس میں اشیار کا تبادلہ کرتے تھے۔ لیکن جب مویشیوں کا گلہ پورے قبیلہ کے قبضہ سے نکل کر ذاتی قبضہ میں آ گیا۔ تو افراد کے درمیان اشیار کا تبادلہ زیادہ ہونے لگا اور آخر میں تبادلہ کی یہی ایک صورت رہ گئی۔ مویشی پالنے والے قبیلے اپنے ہمسایہ قبیلوں سے سب سے زیادہ تبادلہ مویشیوں ہی کا کرتے تھے۔ مویشیوں کے ذریعہ تمام دوسری اشیار کی قدر و قیمت کا اندازہ ہونے لگا۔ اور مویشی ہی کو تمام دوسرے اشیار کے تبادلہ کا ذریعہ

---

[1] امریکہ کے شمالی مغربی ساحل پر خاص طور سے خاندانوں کا وجود ہے۔ بنکروفٹ کی تصنیف بطور حوالہ پیش کی جا سکتی ہے۔ کوئین چارلوٹ کے جزائر میں "ہیدا" قبیلہ کے لوگوں میں ایسے خاندان پائے جاتے ہیں جن میں سات سات سو افراد ایک ہی مکان میں رہتے ہیں۔ نوٹ کا پورا پورا قبیلہ ایک ہی مکان میں رہتا تھا۔

ذریعہ بھی تصور ہو گیا۔ اس طرح مویشی سے گویا روپیہ کا کام لیا جانے لگا۔ اور سماجی ارتقاء کے اس عہد میں مویشی نے باقاعدہ طور پر روپیہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس طرح گویا تبادلۂ اشیاء کے ابتدائی دور میں ہی ایک ایسی مشکل یا شدید ضرورت محسوس ہونے لگی جو روپیہ کا کام دے سکے اور نہایت تیز رفتاری کیساتھ اسکی ضرورت بڑھتی گئی۔

گھاس پات پودے اور درختوں کا کام سے کم اس دور کے وسط میں یقیناً ان مویشی پالنے والے قبیلوں کو معلوم ہو گیا ہوگا۔ ایشیا کے وحشیوں کو غالباً ابھی ان چیزوں کا علم نہیں ہوا تھا۔ اسی قسم کی کاشتکاری سے باقاعدہ زراعت کا فن پیدا ہوا سطح مرتفع توران کے طویل اور سرد جاڑوں میں مویشیوں کا پالنا بغیر چارے اور گھاس پات کے غیر ممکن تھا۔ چنانچہ اس بات کی اشد ضرورت محسوس ہوئی کہ گھاس اور غلہ کی کاشت کی جائے۔

بحیرۂ اسود کے شمال کے میدانوں میں بھی اسی طرح گھاس اور غلہ کی کاشت ہونے لگی۔ لیکن جب مویشیوں کیلئے غلہ کی کاشت شروع ہو گئی تو آدمی نے بھی غلہ کھانا شروع کیا لیکن ابھی تک باکاشت زمین پورے قبیلہ کی ملکیت تھی۔ پہلے باکاشت زمین کی تقسیم قبیلہ کے مختلف جینوں میں ہوئی اس کے بعد گھرانوں میں اور سب سے آخر میں افراد میں ہونے لگی۔ زمین جن لوگوں کو دی جاتی تھی انھیں محض اقبضہ[1] کے حقوق حاصل تھے

اس کے علاوہ انھیں زمین پر اور کوئی حق حاصل نہ تھا۔

اس عہد کی صنعتی ترقیوں کا جہاں تک تعلق ہے دو چیزیں خاص طور پر اہم ہیں۔ پہلی چیز تو چرخے کی ایجاد ہے اور دوسرے دھات کا پگھلانا اور اس کو مخصوص شکل دینا۔ تانبا اور رانگا اور اس کی ملاوٹ یہ تین دھاتیں اس زمانے میں اہم ترین دھاتیں شمار کیجاتی تھیں۔ تانبے اور رانگے کی ملاوٹ سے ضروری استعمال کے آلات اور ہتھیار تیار ہوتے تھے۔ اگرچہ ان دھاتوں کے استعمال میں آنیکے بعد بھی پتھر کے آلات کا استعمال متروک نہیں ہوا بلکہ جاری رہا۔ صرف لوہا ہی مکمل طور پر پتھر کی جگہ لے سکتا تھا لیکن لوہا بنانے کی ترکیب ابھی معلوم نہیں ہوئی تھی۔ زیورات اور دیگر آرائش کیلئے سونے اور چاندی کا استعمال کچھ شروع ہو گیا تھا۔ اس زمانے تک تانبے کے مقابلے میں اور تانبے اور رانگے کی ملاوٹ کے مقابلہ میں سونے اور چاندی کے زیادہ حسین ہونے کا احساس بھی یقیناً ہوگا۔

مویشی غلہ اور گھریلو صنعتی ان تمام چیزوں کی پیداوار زیادہ ہونے لگی۔ اس سے یہ ہوا کہ انسان اب اپنی ضروریات سے زیادہ پیدا کرنے لگا ایک اور نتیجہ یہ نکلا کہ خاندان گھرانہ جین کا ہر ممبر روزانہ جتنا کام کرتا تھا اس میں بھی اضافہ ہو گیا۔

چنانچہ اب اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اور محنت کرنے والے لائے جائیں۔ جنگ کے ذریعہ یہ ضرورت پوری ہو گئی۔ دشمن کے پکڑے جانے والے آدمیوں کو غلام بنایا جانے لگا۔ جب زیادہ محنت سے زیادہ پیداوار ہونے لگی اور دولت میں اضافہ ہوا تو پہلی بار ایک بڑے پیمانے پر ایسی تقسیم محنت کا رواج قائم ہوا جس کی نوعیت سماجی تھی نہ کہ محض طبیعی یعنی بغیر کسی جنسی یا جسمانی اختلاف کے ایک ہی طرح کے مرد یا عورتیں مخصوص کام کرنے لگیں اور وہ قاعدہ اٹھ گیا کہ سماج کے تمام مرد یا تمام عورتیں ہر کام انجام دے رہی ہیں۔ اس تقسیم محنت سے اس زمانے کے تاریخی حالات کے تحت رسم غلامی کا پیدا ہونا قطعی لابدی تھا۔ اس اولین بڑے پیمانہ کی تقسیم محنت سے تاریخ انسانی میں پہلی بار سماج دو طبقوں میں تقسیم ہو گیا ایک طرف تو مالکوں کا طبقہ تھا اور دوسری طرف غلاموں کا۔ ایک طرف استحصال کرنے والے اور دوسری طرف استحصال کئے جانے والے۔

ہمیں ابتک اس کا قطعی علم نہیں کہ مویشیوں کا گلہ قبیلے یا جینز کی اجتماعی ملکیت سے نکل کر کس طرح الگ الگ خاندان کے سرداروں کی ملکیت میں چلا آیا۔ لیکن یقیناً زیادہ تر ایسا اسی عہد میں ہوا ہوگا۔ مویشیوں کے خاندان کی ملکیت میں آجانے کے بعد اور دولت کی اور بھی قسموں کے وجود میں آنے پر خاندان کے نظام میں ایک زبردست انقلاب رونما ہوا۔ زندگی کی ضروریات مہیا کرنا ہمیشہ سے مرد کے ذمہ تھا۔ مرد ان ضروریات کے مہیا کرنے سے آلات پیدا کرتا تھا اور یہ آلات اُس کی ملکیت میں تھے۔ مویشیوں کا گلہ زندگی کی ان ضروریات کے مہیا کرنے کا گویا ایک نیا ذریعہ تھا۔ جانوروں کو پہلے پھانسنا اور بعد میں ان کو پالنا ان کی دیکھ بھال کرنا مرد ہی کے ذمہ تھا۔ چنانچہ مویشیوں کا گلہ گویا مردوں ہی کی ملکیت تھا۔ لازمی طور پر مویشیوں سے تبادلہ میں جو غلام اور اشیاء وہ پاتے تھے وہ بھی گویا ان کی ملکیت میں تھیں۔ زندگی کی ضروریات مہیا کرنے کے سلسلہ میں جو فاضل اور زائد پیداوار ہوتی تھی

[1] فلسفۂ قانون کی رو سے قبضہ اور ملکیت میں فرق ہے۔ قبضہ کا مسئلہ پورے علم قانون کا سب سے مشکل اور لاینحل مسئلہ ہے۔ یہاں پر اتنا جان لینا کافی ہے کہ قبضہ کے معنی ملکیت کے نہیں ہیں۔ مؤخر الذکر کا درجہ زیادہ بلند ہے۔ (مترجم)

وہ بھی مردوں کے حصّے میں ہوتی تھی۔ عورت کا ان اشیاء میں صرف حصّہ ہوتا تھا لیکن ان چیزوں کی ملکیت میں اس کا کوئی حصّہ نہ تھا۔ وحشت میں آ یہ تھا کہ مرد کے بہادر جنگجو اور شکاری ہونیکے باوجود اس کا درجہ عورت کے بعد ہوتا تھا۔ اور عورت ہی گھرانے کی مالک تھی۔ لیکن مویشی پالنے کے عہد میں مرد گلہ بانی کے گلّوں کی دیکھ بھال کرتا تھا اور پرانے زمانے کے مرد کی طرح جنگجو تھا۔ پھر بھی اس نے خاندان میں اوّلین حیثیت اور درجۂ اختیار کرلیا۔ اور عورت کو دوئم درجہ اختیار کرنے پر مجبور کردیا۔ عورت اس تبدیلی کے خلاف آواز بھی نہ اٹھا سکتی تھی۔ اس لئے کہ خاندان میں تقسیم محنت کی وجہ سے عورت اور مرد کے درمیان جائداد اور ملکیت کی تقسیم منظم اصولوں پر ہونے لگی تھی۔ یہ تقسیم محنت بالکل اسی طرح قائم تھی پھر بھی اس کی وجہ سے عورت اور مرد کے خانگی تعلقات بالکل الٹ گئے۔ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ خاندان سے باہر تقسیم محنت کا طریقہ بدل گیا تھا۔ جس خاص بات کی وجہ سے پہلے عورت کو خاندان میں اوّل درجہ حاصل تھا اب اسی خاص بات کی وجہ سے مرد کو اوّل درجہ حاصل ہوگیا۔ وہ بات یہ تھی کہ عورت کی تمام تر محنت و مشقت صرف گھر کے کاموں تک محدود ہوگئی زندگی کی ضروریات مہیا کرتا تھا۔ یہ کام بہت اہم تھا۔ اس کے مقابلے میں عورت گھر کے کام دیکھتی تھی جو نسبتاً کم اہم تھا۔ مرد کا کام سب سے ضروری تھا۔ اور عورت کا کام غیر اہم اور فضول سا تھا۔ یہ بات بالکل ظاہر ہوگئی کہ عورت کو موجودہ غلامی سے مکمل نجات دلانا اور اُسے مرد کا ہمسر بنانے کیلئے اس وقت تک غیر ممکن ہے جب تک عورتوں کو گھریلو کاموں کی حدود سے باہر نکال کر سوسائٹی کے دولت پیدا کرنے کے کام میں حصّہ لینے کی اجازت نہیں دیجاتی۔ عورت کا مکمل طور پر آزاد ہوجانا اسی وقت ممکن ہے جب وہ ایک بڑے پیمانہ پر سماجی حیثیت سے (پرائیویٹ حیثیت سے نہیں) دولت کے پیدا کرنے میں حصّہ لینے لگے اور گھریلو کاموں میں وہ محض برائے نام توجہ صرف کرے۔ یہ بات کسی عہد میں بھی ممکن نہیں تھی بلکہ صرف موجودہ عہد میں ممکن ہوئی ہے۔ اس لئے کہ عہد جدید میں بڑی بڑی صنعتوں کا وجود ہے۔ یہ بڑی بڑی صنعتیں نہ صرف یہ کہ ایک بہت بڑے پیمانہ پر عورتوں کو اپنے یہاں کام کرنے کی اجازت دیتی ہیں۔ بلکہ باقاعدہ طور پر مزدور عورتوں کا مطالبہ کرتی ہیں۔ صنعت کی ترقی کا ایک اور نتیجہ یہ نکلا کہ پرائیویٹ اور گھریلو محنت کا زمانہ رفتہ رفتہ ختم ہوگیا اور گھریلو کام دن بدن بلکہ صنعت میں بدلنے لگے۔

جنگ کے بعد دُنیا کی تعلیمی ضروریات کیا ہونگی؟

از ——— از امریکی ماہر تعلیم

دنیا کے ان ملکوں میں جو دشمن کے پنجے سے آزاد کرائے گئے ہیں۔ حکومت کا سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ نئے سرے سے اسکول کھولے جائیں اور تعلیم کی از سرِ نو تنظیم کی جائے۔ ان اسکولوں کے کھلنے کا محض یہ مقصد نہیں ہوگا کہ عام طور پر جو تعلیم و تربیت دی جاتی ہے وہ دی جائے۔ بلکہ ان اسکولوں کو بچوں اور نوجوانوں کے لئے ایک نئی جسمانی اور ذہنی زندگی کی تنظیم کا مرکز بنانے کی ضرورت ہوگی۔ جنگ کی ہولناکیوں کے سبب بچے اور نوجوان کم خوراکی، یا بد خوراکی کے سبب متعدد امراض اور جسمانی خرابیوں کے شکار ہوگئے ہیں۔ چنانچہ تعلیم کو دوبارہ بحال کرنے کا مطلب یہ ہے کہ حکومتوں کو بالکل نئے اور پیچیدہ حالات کے تحت ایک تعلیمی منقلب اور نئے انداز سے تعلیم کے مسئلوں کو ہاتھ لگانا ہے۔

اس وقت در اصل بجانت بجانت کے تعلیمی پلان بنانے سے کہیں زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم کے مقاصد کو واضح اور صاف طور پر سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ موجودہ نظام تعلیم میں کہیں انفرادیت اور ذاتی خود مختاری اور کہیں حکومت کا جو بہت زیادہ دخل ہے وہ ختم ہو جائے گا۔

آج دنیا بھر میں ایک جدید نظام کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ اس نئے نظام تعلیم کے بنانے میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ہر فرد کو ذہنی ترقی کے یکساں مواقع فراہم کئے جائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ نظام تعلیم کی ایک بہت پرانی روایت ہمیشہ کے لئے ختم کر دی جائے اور وہ روایت یہ ہے اب تک تعلیم دو قسم کی رہی ہے، ایک تو عوام کے لئے اور ایک خواص کے لئے۔ نئے نظام تعلیم میں اس فرق کا نیست و نابود ہو جانا قطعی ضروری ہے۔ تعلیمی تنظیم کے ہر پہلو میں برابری اور مساوات کے اصول کو راہ دینا لازمی ہے۔ یعنی تعلیم گاہوں کی عمارت اور سامان درجوں کا سائز، اساتذہ کی صلاحیت اور تنخواہ، ان تمام معاملات میں مساوات کو راہ دئے بغیر مندرجہ بالا مقاصد پورے نہیں ہو سکتے۔ اس کے ساتھ ساتھ تعلیم کو قطعی مفت بنانا یعنی تعلیم گاہوں کی فیس اٹھا دینا اور وظیفوں کا انتظام کرنا بھی بیحد ضروری ہے لیکن مساوات صرف یہیں پر آکر ختم نہیں ہونی چاہئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر طبقے کے طالبعلموں کے لئے یکساں حالات اور مواقع پیدا کرنا تاکہ وہ اپنی تعلیم سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔ مثلاً طالبعلموں کی صحت اور تندرستی کا پورا پورا خیال رکھنا اور ہر طالب علم کو اس کے رجحان کے مطابق تعلیم و تربیت دینا۔

تعلیمی اصلاحات کی بنیاد اس نظریے پر ہونی چاہئے کہ در اصل انسان کی پوری زندگی علم و تعلیم حاصل کرنے میں صرف ہوتی ہے اس لئے تعلیم کی ابتدا چھوٹے بچوں کے اسکول سے ہونی چاہئے اور زندگی بھر اس کا سلسلہ برقرار رکھا جائے۔ اس کے لئے مختلف تعلیمی طریقوں کا استعمال ضروری ہوگا، مثلاً کوئی اگر پورا وقت تعلیم میں صرف کرنا چاہتا ہے اس کے لئے علیحدہ انتظام کرنا ہوگا کوئی شخص اپنی ملازمت یا روزگار کی وجہ سے اپنے وقت کو تھوڑا سا ہی حصہ تعلیمی مشاغل میں لگانا چاہتا ہے تو اس کے لئے بھی علیحدہ انتظام کی ضرورت ہوگی۔ پھر باقاعدہ اور باضابطہ تعلیم کے علاوہ ایک اور قسم کی تعلیم ہوتی ہے جسے کسی مخصوص جامد نظام یا طریقہ کے مطابق نہیں چلایا جاتا۔ غرض جنگ کے بعد ہر نوع کا تعلیمی طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔

اب بہت چھوٹے چھوٹے بچوں کے اسکول کی اہمیت اور اس کی گنجائش کو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے
تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے کچھ

ممکن ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے اسکولوں کا مقصد ہے کہ بچوں کو اپنی زندگی کو مناسب اور متوازن طریقے سے شروع کرنے کے لئے بہترین حالات فراہم کرنا۔ اس کے علاوہ نرسری اسکولوں سے یہ بھی فائدہ ہوتا ہے کہ بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش و پرداخت کے معاملے میں خود والدین کی تربیت ہو جاتی ہے اور انھیں اعلیٰ اور قیمتی اصول معلوم ہو جاتے ہیں۔

باقاعدہ اسکولی زندگی کو دو واضح حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک تو ابتدائی حصّہ جو گیارہ یا بارہ سال تک رہتا ہے۔ اس کے بعد دوسرا حصّہ وہ جو گیارہ یا بارہ سال کے بعد شروع ہو کر اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک طالبعلم کو اسکولوں کی لازمی حاضری سے بری نہ کر دیا جائے۔

وہ لوگ جو پورا وقت تعلیم میں نہیں صرف کر سکتے اُن کے لئے ایسے اسکولوں کی ضرورت ہوگی جن میں وہ اپنی آسانی کے اعتبار سے تھوڑا سا وقت دے سکیں لیکن اُن اسکولوں میں اُنھیں لازمی طور پر داخل ہونا پڑے گا۔ جنگ کے بعد جو تعلیمی نظام جاری ہوگا اُس میں بالغوں کی تعلیم کی اہمیت کو پورے پورے طور پر سمجھنے کی ضرورت ہوگی۔

تعلیمی مواقع کی یکساں فراہمی کا محض یہ مطلب نہیں کہ ملک میں بہت سارے اسکول قائم کر دئے جائیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ صحیح صحیح طور پر یہ پتہ چلایا جائے کہ کس طالبعلم کا رجحان طبیعی کس طرف ہے اور اس کے اندر کس نوع کی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ یہاں تک کہ عمر کے بے حد ابتدائی دور میں بھی اس کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے اور اُسی کے مطابق طالبعلموں کی درجاتی تقسیم عمل میں لائی جانی چاہئے۔ یہ مسئلہ اُس وقت اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ طالبعلموں کی ذاتی صلاحیتوں کے مطابق کس طرح نصاب تعلیم بنایا جائے اور کس طرح مختلف صلاحیتوں کا لحاظ کرتے ہوئے مختلف قسم کی تعلیم گاہیں وجود میں لائی جائیں۔ چونکہ عام طور پر یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ گیارہ یا بارہ سال کی ابتدائی عمر میں لڑکوں اور لڑکیوں کے تعلیمی مقصد و منزل کا تعین کرنا بیحد مشکل ہوتا ہے اس لئے کہ ابتدائی درجوں کے نصاب کا تمام طالبعلموں کے لئے جہاں تک ہو سکے یکساں رہنا ضروری ہے۔ پھر چونکہ تمام طالبعلموں کو آگے چل کر یکساں طور پر ترقی کے حقوق اور مواقع ملنے ہیں اس لئے ان کی ابتدائی تعلیم کا ایک ہی نصاب کا پابند ہونا ضروری ہے۔

تعلیمی مواقع کے یکساں بنانے میں ایک اور مشکل پیدا ہوتی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد جو ابتدائی دور ہوتا ہے وہ اب تک ثانوی تعلیم سے بہت زیادہ وابستہ رہا ہے اور ثانوی تعلیم میں جو نصاب رہا ہے اس کا مقصد طالبعلم کو یا تو پیشہ ورانہ یا دفتری ملازمتوں کے لائق بنانا رہا ہے یا ثانوی تعلیم اعلیٰ تعلیم کے لئے گویا سیڑھی کا کام دیتی رہی ہے۔ ثانوی تعلیم کا مفہوم اب یہ بن گیا ہے کہ اس کے ذریعے فرد اپنی مالی اور سماجی حیثیت حاصل کرتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب غیر ادبی یا عملی قسم کے تعلیمی نصاب کو لوگ گھٹیا اور کمتر درجے کا سمجھنے لگے ہیں۔

بدلتے ہوئے صنعتی اور تجارتی پیشوں کی وجہ سے یہ مسئلہ اور بھی مشکل ہو گیا ہے۔ بہت سے صنعتی اور تجارتی پیشوں میں مہارت حاصل کرنے کے لئے اب کم سے کم تین ماہ لگتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ پیشہ ورانہ تعلیم ان اسکولوں میں دی جائے، جہاں طلباء پورا وقت دیتے ہیں یا اُن اسکولوں میں جہاں وہ اپنا تھوڑا وقت دیتے ہیں، یا اس ذمہ داری کو نباہنے میں وہ لوگ بھی ہاتھ بٹائیں جو پیشہ ورانہ ملازمتیں مہیا کرنے کے ذمہ دار ہیں، جنگ کے زمانے میں جنگی صنعتوں کی ٹریننگ مختصر عرصے میں اور خوب جم کر دی جاتی رہی ہے اس سے جو تجربہ حاصل ہوا ہے اس سے اس مسئلہ کو حل کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

اب سوال رہ گیا اساتذہ کی ٹریننگ کا یہ مسئلہ تعلیمی مواقع کو یکساں طور پر فراہم کرنے کے مسئلے کے بعد سب سے مشکل مسئلہ ہے۔ اب تک ٹیچنگ کو پیشے کی حیثیت حاصل رہی ہے اسلئے اس میں تعلیم و تربیت دینے کے طریقوں اور مہارت پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ لیکن اب وہ آہستہ آہستہ ایک ایسے پیشے کی حیثیت اختیار کر رہی ہے جس میں ایک وسیع عام تعلیم کے علاوہ جدید نظام تعلیم کے مطالبات کو پورا کرنے کے لئے مخصوص تیاریوں کی ضرورت ہوتی ہے اگر اساتذہ کی ٹریننگ کا مطلب محض یہ ہوتا کہ انھیں کچھ خاص قسم کی معلومات دیدی جائیں اور بس تب تو یہ مسئلہ بہت آسان ہو

لیکن جدید قسم کے اساتذہ کو اب کچھ اور ہی تیاریوں کی ضرورت پڑتی ہے سب سے پہلے تو انھیں ایسے اعلیٰ معیار سے تعلیمی پس منظر کو سمجھنا ہے جس کے لئے اور جس کے ذریعے طالبعلموں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ انھیں اچھی طرح سمجھنا ہے کہ طالبعلم کی ذہنی اور جسمانی خصوصیات اور صلاحیتوں کے درمیان کیا رشتہ ہوتا ہے اور وہ کس طرح ترقی کر سکتی ہیں۔

ایک اور مشکل تر سوال یہ ہے کہ کہاں اور کس طرح ٹیچروں کو ٹریننگ دی جائے۔ ایک بات تو صاف ہے وہ یہ کہ ٹیچروں کی ذاتی استعداد یونیورسٹی کے معیار پر ہونی چاہئے۔ لیکن اس کا تعین بعد کے تجربات سے ہوگا کہ آیا ٹیچروں کی تعلیم و تربیت یونیورسٹیوں میں ہونی چاہئے جہاں انھیں عام کورس وہی پڑھایا جائے گا جو دوسرے طلباء کو پڑھایا جاتا ہے اور خاص پیشہ ورانہ کورس کے لئے ایک خاص شعبہ رہے گا یا اُن کی تعلیم و تربیت یونیورسٹی سے ملحق مگر علیحدہ اداروں میں ہوگی جہاں عام اور پیشہ ورانہ تعلیم کو ہم آہنگ کر دیا جائے گا۔ ایک تیسری صورت یہ بھی ہے کہ ٹیچروں کی تعلیم و تربیت قطعی طور پر علیحدہ اور آزاد تعلیمی اداروں میں انجام دی جائے۔

اب وقت آگیا ہے کہ مذہبی تعلیم کی صحیح صحیح تعریف کی جائے اور اس بات کا تصور کیا جائے کہ ہم مذہبی تعلیم سے کیا مراد لیتے ہیں آج کل مذہبی تعلیم کا مفہوم ہے۔ فرقہ وارانہ اور خاص خاص مذہبوں سے متعلق معلومات اور تعلیم ظاہر ہے کہ یہ مفہوم نقصان رساں ہے۔ فاشسٹ ملکوں میں اس قسم کی مذہبی تعلیم بہت رائج تھی، برخلاف اس کے اُن ملکوں میں جنھوں نے فاشسٹوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا وہاں تعلیم مذہبی نہیں بلکہ دنیاوی اساس پر قائم ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مذہبی تعلیم کو نصاب تعلیم میں کوئی جگہ نہ دی جائے۔ بلکہ ضرورت ہے کہ مذہبی تعلیم کے مقاصد اور طریقوں کو بدلا جائے اور اصل زور عقائد کے اختلاف پر نہ دیا جائے بلکہ انسانی اخوت پر اور اُن آدرشوں پر جو تمام مذاہب میں مشترک حیثیت رکھتے ہیں۔ فرقہ وارانہ قسم کے عقائد اور اصولوں کی تعلیم محض مذہبی عبادت گاہوں اور گھروں تک محدود رکھی جائے تو بہتر ہے۔

نئے نظام تعلیم کے ذریعہ ایک اور چیز کے اضافے کی ضرورت ہے۔ ڈیڑھ صدی تک تعلیم قومی اور ملکی سیاست کا کھلونا بنی رہی ہے اور اس کے ذریعے حب الوطنی اور ملکی وفاداری کے آدرش کو طالبعلموں کے ذہن میں بٹھایا جاتا رہا ہے۔ اس سے براہ راست یا غیر براہ راست طور پر ہمسایہ ملکوں یا ہمسایہ قوموں کے خلاف نفرت کا جذبہ ترقی کرتا رہا ہے لیکن اب بہت سے ماہرین تعلیم بین الاقوامیت کے احساس کو فروغ دینے کے لئے تعلیم کی تعمیر اور ترقی چاہتے ہیں اُن کا مقصد طالبعلم کو عالمگیر شہری بنانا ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ تعلیم کے ذریعے طالبعلموں کے ذہن سے یہ بات نکال دی جائے کہ بین الاقوامی سیاسیات میں قومی سیاست کے پیش نظر رویہ اختیار کرنا ضروری ہے اُن کے نزدیک تعلیم کے ذریعے بین الاقوامی سمجھ بوجھ، انصاف رواداری اور باہمی عزت و وقار کے جذبوں کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان چیزوں کی ابتدا، گھر سے ہونی چاہئے اور طالبعلم کے ذہن میں دنیا بھر کے تہذیبی طور سے متحد اور ہم آہنگ ہونے کا احساس پیدا کرنے کے لئے قومی نصاب تعلیم میں کسی نئے مضمون کے اضافے کی قطعی ضرورت نہیں ہے اس لئے بھی کہ قومی نصاب تعلیم میں ابھی سے مضامین کی کافی بھرمار ہے۔ اس لئے بھی یہ غیر ضروری ہوگا کہ تعلیم کا کوئی بھی ایسا مضمون نہیں ہے جو تمام زمانوں، تمام عقائد اور تمام نسلوں کی متحدہ دماغی کاوشوں سے نہ نکلا ہو۔ جس طرح مصوری اور موسیقی کی تعلیم کے ذریعے دنیا کے تہذیبی انحصار باہمی کا احساس کرایا جاتا ہے اُسی طرح دوسرے تمام مضامین کے ذریعہ بھی کرایا جا سکتا ہے۔

دراصل بین الاقوامی علمی تعاون کی ابتدا اسکولوں سے ہو سکتی ہے۔ یہ تعاون محض علم و ادب کے شائقین کے ہاتھوں میں نہیں چھوڑی جا سکتی۔ معمولی نصابی کتابوں سے بھی بین الاقوامی تعاون اور اشتراک عمل کا مقصد نہیں حل ہو سکتا۔ یہ تجویز اتحادیوں کے وزراء تعلیم کی کانفرنس میں رد کی جا چکی ہے۔ تمام قوموں کے لئے مشترکہ نصاب قائم کرنے اور ٹکسٹ کی کتابوں کی تیاری یا بین الاقوامی تعلیمی ایجنسی قائم کرنے کی بجائے ضرورت اس بات کی ہے کہ طالبعلموں کی اسپرٹ میں انقلاب پیدا کیا جائے اور ان کے اندر زمانہ امن کے امور و فرائض کی انجام دہی کے لئے بھی وہی جذبۂ قربانی پیدا کیا جائے جو جنگ کے زمانہ میں اُن کے اندر پیدا کرایا جاتا ہے۔

جرمنوں کو کس طرح امن پسند بنایا جاسکتا ہے؟

از ــــــ (ایک امریکن صحافت نگاری کے نقطۂ نظر سے)

تاریخ کا ابتدائی مطالعہ بھی ہمیں یہ بتاتا ہے کہ گذشتہ دو ہزار سال کے عرصہ میں جرمن قوم سے زیادہ کسی قوم نے دنیا کے امن و سکون کو برباد نہیں کیا ہے۔ گذشتہ پچھتر سال کے اندر تین مرتبہ اور گذشتہ پچیس سال کے اندر دو مرتبہ جرمنوں نے دنیا کو فتح کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہر مرتبہ دنیا نے جو علاج پیش کیا۔ جرمن قوم کو روکنے کیلئے جو تدابیر کیں وہ لاحاصل ثابت ہوئیں اور جرمن قوم پھر جنگ پر آمادہ ہوگئی۔

لیکن اس بار امید پیدا ہو رہی ہے کہ علاج شاید کارگر ثابت ہو۔

یہ کتنا غلط ہے کہ جرمنوں کی ہوس ملک گیری نتیجہ تھی محض نازیت کا یا ہٹلر اور اس کے پیچھے چلنے والے بے عقل عوام کا۔ جرمنوں نے قیصر ولیم، فریڈرک اعظم اور عہد قدیم کے ہنوں کے سردار اٹیلا کے زمانہ میں بھی وہی کیا جو نازیت کے عہد میں۔ ہاں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ نازیت کے عہد میں جرمنوں کی وحشت اور بیرحمی سب سے زیادہ تھی۔

قوم کے کردار اور اس کے سرشت کو سمجھنے کے لئے اُس کے افراد کے کردار اور سرشت کو سمجھنے کی ضرورت پڑتی ہے

پیتھولوجیکل قسم کے افراد ہمیشہ پورے سماج پر چھا جاتے ہیں اور ان کے ملنے والے بھی بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ سماج کا احساس انفرادیت بھی سماج کے لیڈروں کو متاثر کرتا ہے وہ انفرادی طور پر چاہے پیتھولوجیکل ہوں یا نہ ہوں اس میں بہرحال کوئی شک نہیں کہ جرمن قوم کے لیڈر اور جرمن قوم دونوں قطعی طور پر پیتھولوجیکل واقع ہوئے ہیں۔

یہاں پر تفصیلات کی گنجائش نہیں۔ لیکن اتنا جان لینا ضروری ہے کہ جرمن بچوں کو جو صرف بارہ سال یا اس سے کم عمر کے ہیں انھیں ہٹلر کی پرستش کے علاوہ اور کچھ نہیں بتایا گیا ہے۔ ان بچوں کے والدین اس وقت پیدا ہوئے تھے جب پوری جرمن قوم جنگ عظیم

۱۹۱۴ء ــ ۱۹۱۸ء میں شکست کھانے کے بعد یہ محسوس کر رہی تھی کہ ان کے ساتھ ناانصافانہ سلوک کیا جا رہا ہے اور اُن کی شکست کا اصلی سبب اندرونی سازش ہے۔

ذیل میں ہم دو اہم باتیں درج کرتے ہیں۔ جن کا تعلق جرمنوں کی موجودہ ذہنی بیماری کی تشخیص سے ہے۔ لیکن اس سے پہلے اس کا سمجھنا ضروری ہے کہ بچپن کی خصوصیات کس طرح آگے چل کر انسان کے کردار مرتب کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر بچے کو پیار نہ کیا جائے تو آگے چل کر دوسروں سے شفقت اور محبت کے تعلقات قائم کرنے کی صلاحیت اور عادت سے محروم ہو جائے گا، وہ خود اپنی نفرت پر پردہ نہ ڈال سکے گا۔ خود کو دوسروں سے برتر اور ناقابل شکست سمجھنے لگے گا۔ جب دوسرے اس کی مخالفت شروع کر دیں گے تو اس کا مقابلہ کرنے سے خود کو عاجز پائے گا۔ اس قسم کا آدمی اپنے [illegible] کا دوسروں کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔

بالکل یہی حال جرمن قوم کا ہے خود اپنے کو شاندار اور [illegible] سمجھنا، قتل و غارت کے جذبات رکھنا، ضمیر کی آواز کی طرف نہ دھرنا، یہ خصوصیات مل کر جرمن قوم کے ذہن میں یہ احساس [illegible] ہیں کہ "دوسرے ہمارے ساتھ کیوں ایسا برتاؤ کریں گے؟" کے بعد اس احساس کا ردعمل خون محض انتقام کے خوف میں [illegible] ہے۔ اس دماغی رجحان کا دوسرا نام ہے اپنے کرتوت کے نتائج سے بچنے کی کوشش کرنا یا ان کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کرنا۔

اگر ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جرمنوں کی تہذیب کی یہ بنیاد ہے اور موجودہ نسل کے ذہن میں نازیت کے اصول کوٹ کوٹ کر بھر دئے گئے ہیں تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کا کیا علاج ہے یہاں پر ہمارے سامنے دو صورتیں ہیں۔ (۱) ایک تو وہ جو [illegible]

یہ عمل میں لائی جا سکتی ہے (۲) دوسری وہ جن کا تعلق ایک طویل پروگرام سے ہے۔

فوری صورت تو یہ ہے کہ اُن تمام جرمنوں کو جن پر کسی طرح سے بھی موجودہ جنگ کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ پوری پوری سزا دی جائے لیکن ہم سائنسداں ہونے کی حیثیت سے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ سزا دینے سے پہلے ان لوگوں کے ذہن اور کردار کا اچھی طرح مطالعہ کر لیا جائے اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ جنگ کے قیدیوں کا دماغی مطالعہ کیا جائے۔ تاکہ ان کے نکتۂ خیال کا تعین ہو سکے۔ یعنی کس طرح موجودہ خیالات اُن کے ذہن میں بھرے گئے اور کس طرح اُنہیں بدلا جا سکتا ہے؟

نفسیاتی علاج کے نکتۂ نظر سے ضروری ہے ہمیں ایک طویل عرصے تک کے لئے ایک ایسے پروگرام کی ضرورت ہے جس کو عمل میں لا کر جرمن قوم کے کردار کو بدلا جا سکے۔ اس کام کے لئے محض تعلیمی نظام کافی نہیں اس لئے کہ انسان کے کردار اور سرشت کی تعمیر تو زندگی کے ابتدائی مہینوں اور سالوں سے شروع ہو جاتی ہے۔ وہ کلچر جس کا احساس والدین اور اولاد کی باہمی محبت اور شفقت پر نہیں قائم ہے۔ وہ ہمیشہ اذیت پسند اور خود پرست قسم کے افراد پیدا کرتا ہے۔ جرمن قوم کے ساتھ یہی مرض لاحق ہے۔

اس کا یہ مطلب ہے کہ جرمنی کی آئندہ نسلوں کے لئے مدتوں تک ایک خاص قسم کے تعلیمی نظام کی ضرورت ہوگی۔ ماہرین نفسیات کی کانفرنس منعقدہ نیویارک میں اسی خیال کا اظہار کیا گیا کہ جرمن عوام کی کثیر تعداد کو خود جرمنی کے ماہرین تعلیم کی تعلیمات کے ذریعہ دوبارہ تعلیم دی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد یہ نئے تعلیم یافتہ جرمن اپنی تعلیمی کوششوں کا سلسلہ آئندہ نسلوں میں جاری رکھ سکیں گے۔ دنیا بھر میں تعلیم کا یہی اصول رائج ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ یہ طریقہ اور بھی کارگر ثابت ہوا ہے۔ جن کی ابتدائی پرورش و پرداخت محبت اور شفقت کی فضا میں نہیں ہوئی ہے نہ ان کے ساتھ رواداری برتی گئی ہے۔ نہ اُن کے کارناموں کی تعریف کی گئی ہے۔ اور نہ جنہیں دوسروں کے ساتھ خود اسی قسم کا برتاؤ کرنے کا موقع دیا گیا ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بدقسمتی سے اتحادیوں کو اس وقت تک جرمنی میں طاقت ور فوجیں رکھنے کی ضرورت ہوگی۔ جب تک خود جرمن عوام ایک ایسے خاندان اور ایک ایسے سماجی نظام کی تشکیل نہ کرلیں جس کے تحت وہ خود اپنے ملک میں پُر امن زندگی گذار سکیں اور یہی اصل مسئلہ ہمارے سامنے ہے۔ اس لئے کہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ وہ لوگ جو خود اپنے ملک میں کافی تحفظ اور آرام پاتے ہیں وہ ساری دنیا پر اقتدار حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

جرمنوں کو کس طرح انسانی خصوصیات سے متصف کیا جا سکتا ہے اور اس کے لئے بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔ اس کا کوئی واضح حل موجود نہیں ہے۔ خود ماہرین نفسیات کے پاس تمام حل موجود نہیں ہیں لیکن وہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ یہ حل کہاں سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ صرف صبر اور تحقیق و تلاش کی ضرورت ہے۔ اس میں وقت صرف ہوگا لیکن ہمارے مسائل ضرور حل ہو جائیں گے

آخر میں یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ ماہرین نفسیات کی رائے انسان کی ذہنی صحت اور تندرستی جس سے اچھی خصلتیں پیدا ہوتی ہیں کا انحصار کچھ خارجی باتوں پر ہے۔ مثلاً غذا، جائے رہائش، امراض سے تحفظ کے طریقے، اور انسانی زندگی اور آزادی کو جن چیزوں سے خطرات لاحق ہیں ان کو روکنے کے قاعدے اور طریقے ظاہر ہے کہ ان چیزوں کے بغیر انسانی زندگی غیر ممکن ہے اور اگر زندگی ہو بھی سکتی ہے تو وہ اتنی غیر محفوظ ہوگی کہ فرد کا مکمل طور پر اپنے زندگی کے امور انجام دینا غیر ممکن ہو جائے گا۔ اگر زندگی کی یہ ضروریات مکمل طور پر پوری ہوتی رہیں تو افراد کے باہمی تعلقات کے ذریعہ دماغی صحت مندی اور تندرست سماج کا قیام ممکن ہے جرمنوں کو اسی کی ضرورت ہے۔ زندگی کے ابتدائی دنوں میں ان چیزوں کا حصول اور بھی اہم ہے۔ چنانچہ ابھی سے کوشش شروع کر دینا ضروری ہے۔

ماہرین نفسیات کی کانفرنس منعقدہ نیویارک کے فیصلوں کو مختصر طور پر یہاں درج کیا جاتا ہے

(۱) جرمن قوم میں ایک ایسے احساس خودداری کا برقرار رکھنا ضروری ہے جو واقعیت پر مبنی ہو تاکہ اُن کی اساس پر ایک نئے سماج اور سیاسی نظام اور اداروں کی تشکیل کی جا سکے۔

(۲) جرمن کردار کی از سرِ نو تعمیر کا کام خود جرمن قوم کے افراد انجام دیں نہ کہ فاتحین۔ جرمنوں کو محض نظریاتی اعتبار سے

جمہوریت کا حامی بنانے کی کوشش کرنا موزوں نہیں ہے۔ صحیح بات یہ ہوگی کہ جرمنوں کو ایک ایسی قوم بنایا جاوے جو خود اپنی خواہش سے اور خود اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق جمہوری اقتدار کی تخلیق کر سکے۔

(۴) جرمنی کی فوجی تربیت کی پوری سسٹم اور اس کے ساتھ تمام فوجی ادارے بھی منسوخ کر دیے جائیں۔

(۵) پورے جرمن تعلیمی نظام کو اس طرح از سر نو تشکیل کیا جائے کہ غیر مرکزیت رواج پائے اور حکومت کے بنائے ہوئے "نظام مراتب" کا خاتمہ ہو جائے۔ پورے نظام تعلیم کا مقصد یہ ہو کہ جرمنوں میں آزاد خیال پیدا ہو، سماجی تعمیر میں ہاتھ بٹانے کا جذبہ اور ان کے لئے احساس عزت پیدا ہو اور بجائے دوسروں کی خواہش سے نفرت پیدا ہو۔ اس کے ساتھ ہی نظام تعلیم کے ذریعہ ان کے اندر عالمگیر اتحاد اور تعاون کا احساس پیدا کرایا جائے۔ بالغوں کی تعلیم کے مرکز قائم ہوں۔ اور ان میں ایسے پروگرام پر عمل کیا جائے جن کو اتحادیوں کے تعلیمی افسروں کی حمایت اور تائید حاصل ہو۔

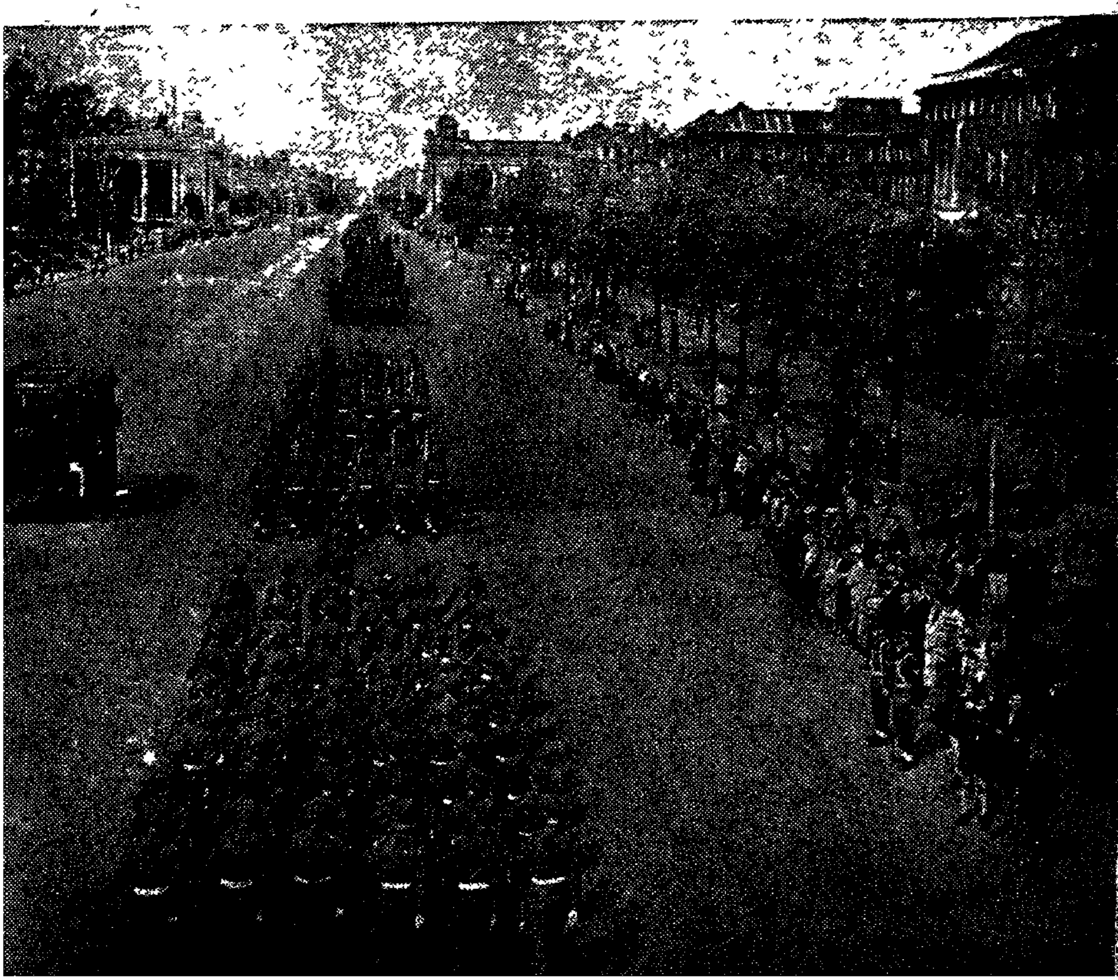


اسٹالن، ٹرومین اور ایٹلی—پوٹسڈیم کانفرنس سے پیچھے پہلے ایڈمیرل لیھی (ریاست ہائے متحدہ امریکہ
مسٹر ای - بیون (وزیر خارجہ) برطانیہ مسٹر جے برنس اور موسیو مولو تاف
کھڑے ہیں -



ٹرومین اپنے اولین سفر برطانیہ کے
دوران میں ہز مجسٹی جارج ششم سے
ہاتھ ملا رہے ہیں ۔

برلن کی سڑکوں پر فاتح برطانوی
فوجیں مارچ کررہی ہیں ۔



پوٹسڈیم کانفرنس کے موقع پر چرچ
نے استالن کی دعوت کی تھی
استالن چرچل کی قیام گاہ پر دعو
کھانے جارہے ہیں۔
اس تصویر میں انھیں برطانو
گارد کی سلامی کو قبول کرتے ہو
دکھایا گیا ہے۔





دنیا کے تین عظیم ترین لیڈروں کی کانفرنس ۔ استالن، ٹرومین اور ایٹلی



جنرل جوزف استلول - امریکی جنرل -



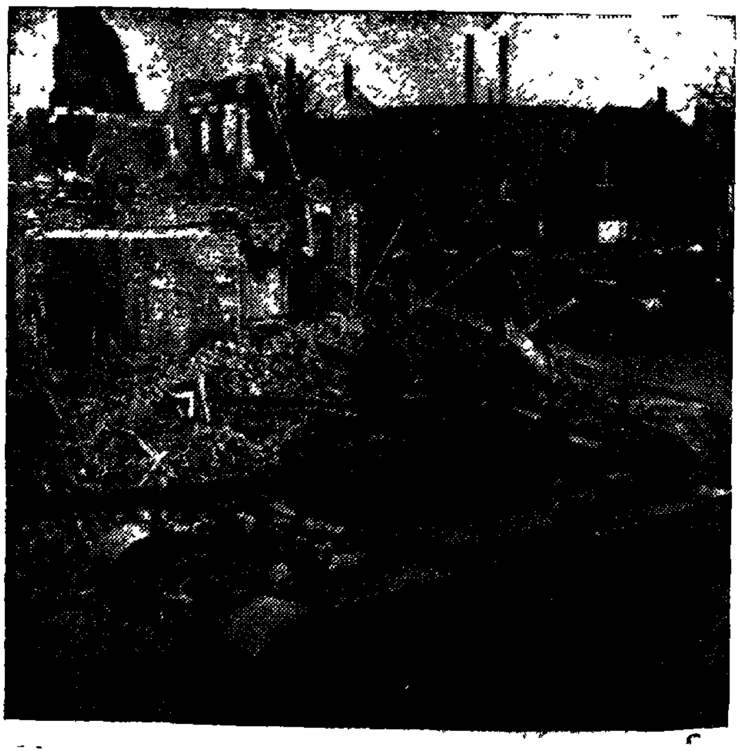
برطانوی بحری افسر کننگھم برلن میں فریڈرک اعظم کے شکستہ مجسمہ کے ٹکڑے جمع کرہے ہیں -



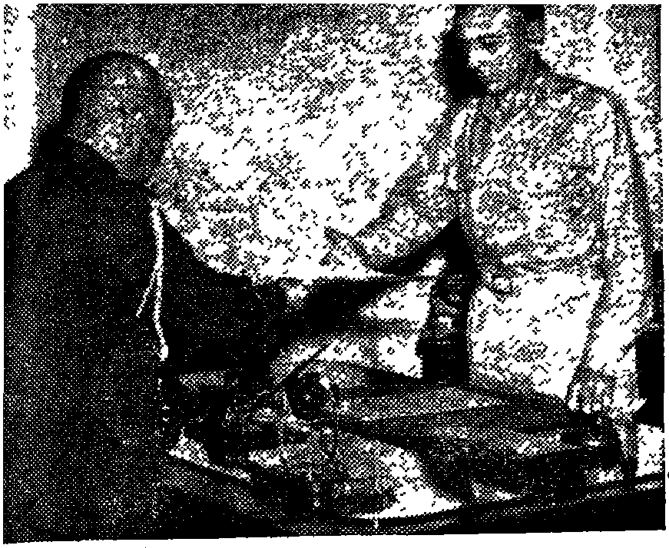


جنوبي چين کے شہر لوچو میں امریکہ اور
چين کے قومي جهنڈے ایک ساتھ لہرا رہے
ہیں - اس شہر کو ۲۶ جون ۱۹۴۵ع کو
جاپانیوں کے ہاتھ سے آزاد کیا گیا تھا

١



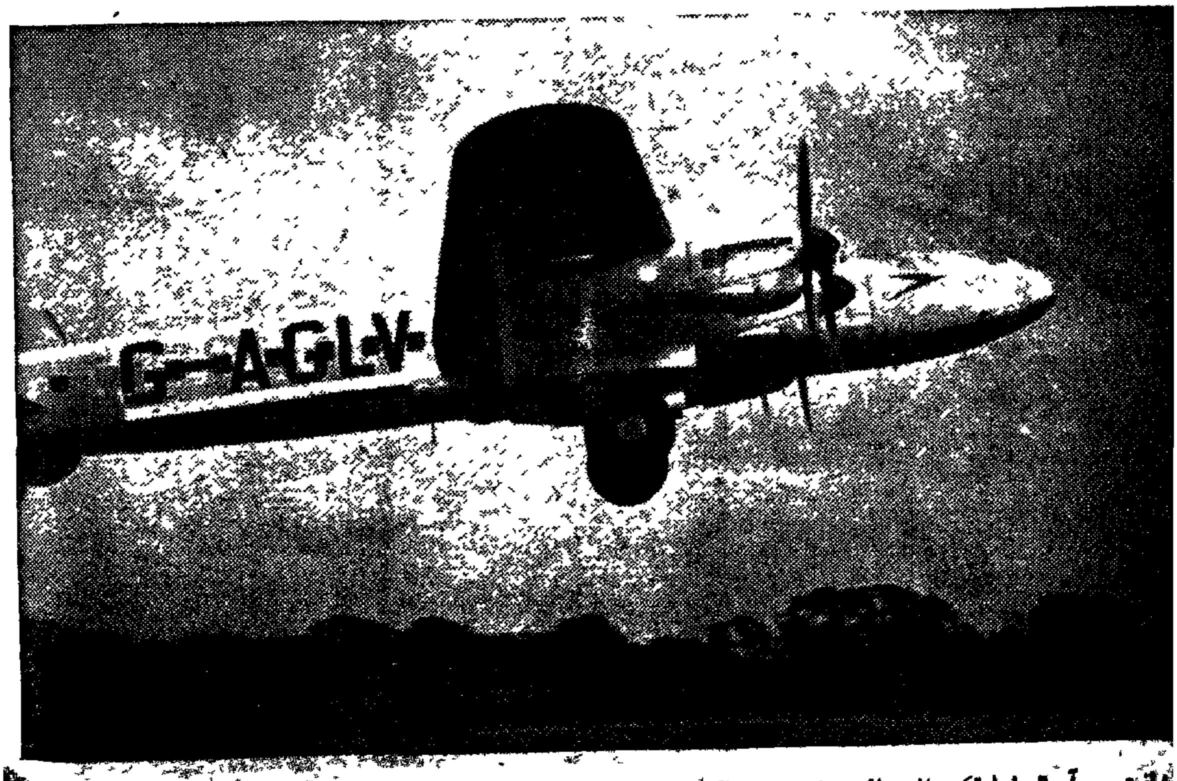
د،کرمت دم تیدک - درطاہ کا سب
تیر روبار ا ر بہاري تحدلے جس
ے د مدي د حملہ کرے میں مدد
پہنچائي -



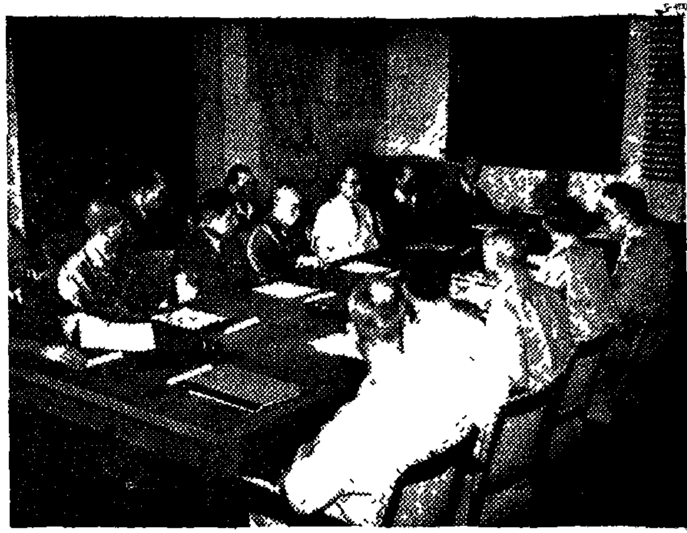
جاپاني جنرل توراشيرو، امريکي جنرل رچرڈ کے نوردللينڈ کے سامنے شکست
تسليم کر رها هے



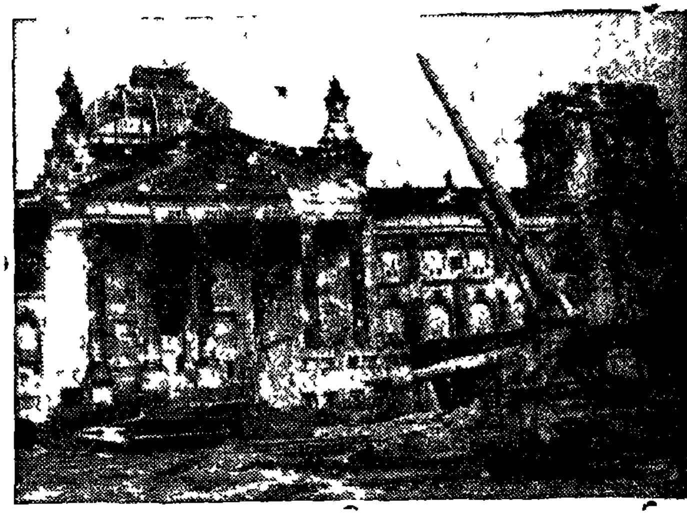
برطانيه کي نئي وزارت کے لارڈ
پريسيڈينٹ آف دي کانسل
هربرٹ ماريسن



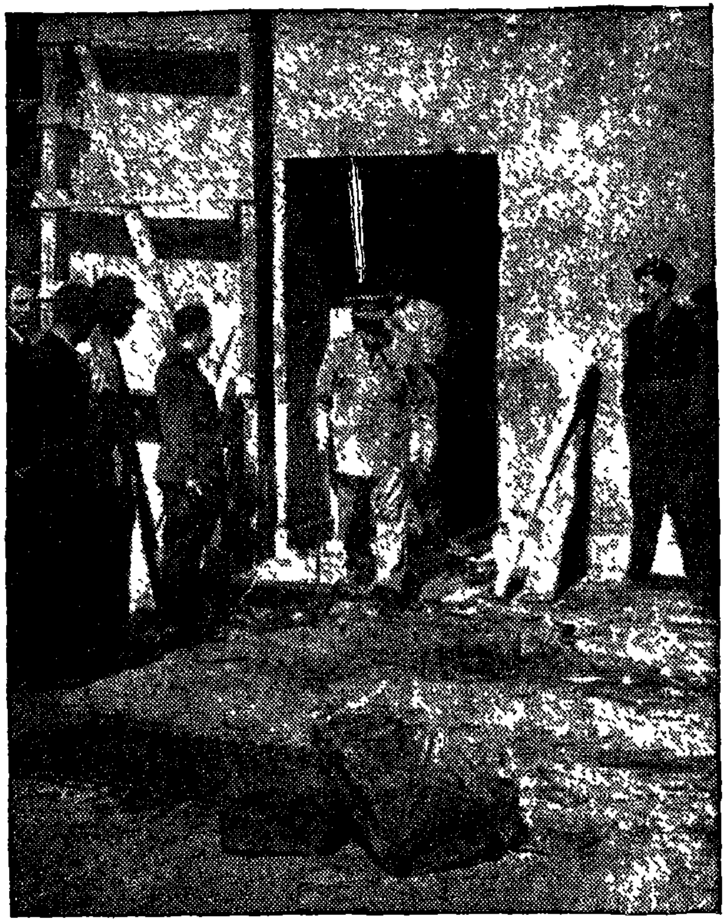
برطانيه سے آسٹريليا تک کا هوائي راسته دنيا کا طويل ترين راسته هے ليکن اسے هوائي جهاز کے ذريعه صرف ۰
گهنٹوں ميں طے کيا جاتا هے - برطانيه کا ايک هوائي جهاز جو اس راستے کو بارها طے کر چکا هے



جاپان کے لیڈران معاہدۂ شکست پر دستخط ثبت کر رہے ہیں -



یہ ہے برلن - مفتوح برلن جس کی عمارتیں سرنگوں ہیں -



چرچل اپنی صاحبزادی کے ساتھ مفتوح برلن میں -



پرل هاربر جشن آزادي منارهی هے - کون
پرل هاربر؟ وهي جس پر دسمبر ۱۹۴۱ع
میں جاپان نے غدرانه حمله کرکے امریکه کے
خلاف جنگ کي ابتدا کي تهي -



برطانیہ کی وہ فلم اسٹار جس نے مسم
گان وتھ دی ونڈ میں لاوامی دار
ادا کیا ھے -

اخبارات کی رائیں

نئے انتخابات کا اعلان

اگست کے آخری ہفتے میں دہلی سے دو اہم سرکاری اعلانات ہوئے۔ ایک یہ کہ حکومت ہند نے جلد از جلد نئے انتخابات کرانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ دوسرے یہ کہ لارڈ ویول نئی حکومت سے مشورہ کرنے یا ہدایات لینے کے لئے لندن جا رہے ہیں۔ ان اعلانات کے مطابق ضروری کارروائی فوراً شروع کر دی گئی ہے۔ صوبجاتی اسمبلیوں کو برخاست کر دیا گیا ہے۔ رائے دہندوں کی فہرستیں زیر مرمت ہیں اور لارڈ ویول لندن پہنچ چکے ہیں۔

ان اعلانات کا اردو اخبارات میں جو ردعمل نظر آتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے مسلم لیگی اخبارات نئے انتخابات کے اعلان پر بہت خوش ہیں اور وہ اس اعلان کو مسلم لیگ اور مسٹر جناح کی شاندار کامیابی خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ شملہ کانفرنس کے دنوں میں اور اس کے بعد بھی جناح صاحب اور لیگ کا مطالبہ یہی رہا ہے کہ اب عارضی حکومت کے قیام کے سوال کو قطعی نظر انداز کر کے نئے انتخابات کرائے جائیں اور ان میں اگر مسلم لیگ کو نمایاں کامیابی ہو تو اس کے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد پر سمجھوتہ کر لیا جائے یہ اعلان اس مطالبہ کے عین مطابق ہے۔

کانگریسی اور نیم کانگریسی اردو اخبارات نے بھی نئے انتخاب کے اعلان کو خوش آمدید تو کہا ہے لیکن وہ فوری انتخابات سے خوش نہیں ہیں کیونکہ کانگریس پر ابھی تک پابندیاں ہیں۔ بعض لیڈر اب بھی نظر بند ہیں۔ کانگریس کا دفتری نظام پراگندہ ہے اور رائے دہندوں کی موجودہ فہرستیں بھی ان کے نزدیک نامکمل ہیں۔ اس آخری اعتراض کی ہمنوائی اب مسلم لیگی حلقوں نے بھی شروع کر دی ہے جس کا آغاز نواب افتخار حسین خاں صاحب صدر پنجاب مسلم لیگ نے کیا ہے۔

لارڈ ویول کے سفر سے اخبارات نے کوئی بڑی توقع وابستہ کرنے میں احتیاط سے کام لیا ہے۔ شاید اس کا سبب لندن کے سیاسی حلقوں کے وہ بیانات ہیں جن میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ لارڈ ویول کا یہ سفر سیاسی نہیں بلکہ اقتصادی ہے اور جب تک ہندوستان کی ذمہ دار جماعتیں متحد نہ ہوں حکومت برطانیہ کوئی نیا قدم نہیں اٹھائے گی۔

یہاں یہ بات بھی بیان کر دینے کے قابل ہے کہ کانگریسی حلقے انتخابات سے پہلے صوبجات میں ذمہ دار حکومتوں کے قیام کے خواہش مند تھے۔ لیکن اسمبلیوں کے خاتمے کے اعلانات نے اس خواہش کو سرد کر دیا ہے۔ اس پر کانگریسی اخبارات مایوس ہیں مگر مسلم لیگی اخبارات خوش ہیں۔ بعض اخبارات نے اس کو مسٹر جناح کی فتح عظیم قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ان کی وہ پیشین گوئی پوری ہوئی جو انھوں نے ۱۹۳۹ء میں یوم نجات کے دن کی تھی یعنی کانگریسی وزارتیں اپنی پرانی صورت میں پھر کبھی واپس نہ آسکیں گی۔

اب ہم اردو اخبارات کی راؤں کا خلاصہ ہدیۂ قارئین کرتے ہیں ——— ادارہ

خلافت کا اظہارِ مسرت

روزنامہ خلافت بمبئی اپنی ۲۳ اگست کی اشاعت میں لکھتا ہے

آج دہلی سے دو اہم اعلان ہوئے ہیں ایک یہ کہ حکومت بہت جلد مرکزی اور صوبجاتی مجالس قانون ساز کے انتخابات کرائے گی اور دوسرے یہ کہ حکومت برطانیہ کی دعوت پر وائسرائے نے پھر لندن کا سفر قبول کر لیا ہے جہاں تک پہلے اعلان کا تعلق ہے ہم اس سے متفق ہی نہیں بلکہ اس

سے مسرور ہیں۔ کیونکہ ہماری قومی جماعت مسلم لیگ انتخابات کا مطالبہ کر چکی ہے اور ہندوستان کے مسئلے کے مستقل حل کو ان کے نتیجہ پر منحصر بھی قرار دے چکی ہے۔ دراصل نئے انتخابات ہی ملک کی بڑی جماعتوں کی طاقت کو ثابت کر سکیں گے اور انہیں کی روشنی میں جماعتوں کے مطالبات اور دعوؤں کی حقیقت ظاہر ہو سکے گی، یہ انتخابات ہمارے نزدیک بمنزلہ نمایندہ اسمبلی کے ہوں گے اور اگر ملک کی اہم سیاسی جماعتوں میں کوئی سمجھوتہ ہو گیا تو منتخب ممبروں ہی سے نمایندہ اسمبلی یا اسمبلیوں کی تشکیل بھی ہو سکے گی۔ یعنی اگر کانگریس ہندوؤں کی اکثریت کی نمایندہ ثابت ہو وہ ہندو صوبوں کے لئے دستور حکومت مرتب کرلے اور اسی طرح مسلم لیگ اگر مسلمانوں کی اکثریت کی نمایندہ ہو تو اس کے ٹکٹ پر آئے ہوئے لوگ مسلم اکثریت کے صوبوں کے لئے دستور حکومت بنالیں۔

مسلم لیگ نے ایک مطالبہ کیا تھا جسے کانگریس کی مخالفت یا کم از کم بے تعلقی کے باوجود حکومت نے منظور کرلیا۔ اب یہ ذمہ داری مسلمانوں پر آپڑی ہے کہ وہ مسلم لیگ کے نمایندوں کو ووٹ دیکر ان کو کامیاب بنائیں اور دنیا کو بتادیں کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی نمایندہ جماعت ہے ہمیں یقین ہے کہ مسلمان اپنی بیداری۔ فرض شناسی قومی حمیت اور اسلامی غیرت کا ثبوت دیں گے اور صرف مسلم لیگ کے امیدواروں کو ووٹ دیں گے۔

لارڈ ویول کے سفر پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ اخبار لکھتا ہے کہ مسلمانوں کو عارضی حکومت اس حالت میں قابل قبول ہوگی جبکہ اس میں مسلم لیگ کو مساوی نمایندگی ملے اس کے علاوہ کوئی قدم اٹھایا گیا تو اس سے فائدہ کے بجائے نقصان پہنچے گا۔

آخر میں خلافت لکھتا ہے۔

گذشتہ اعلانات کے علاوہ نئی برطانوی حکومت کے قیام کے بعد بھی ذمہ داران برطانیہ نے جو اعلانات کئے ہیں ان میں بھی واضح طور پر یہ کہا گیا ہے کہ ہندوستان میں ہر سیاسی تبدیلی نمایندہ جماعتوں اور لیڈروں کے سمجھوتے سے ہونی چاہئے۔ نئے وزیر ہند نے بھی یہی کہا ہے تازہ شاہی تقریر میں بھی یہی ذکر ہے کیا ہم امید رکھیں کہ ان وعدوں کا پاس کیا جائے گا اور ہندوستان کے مسئلہ کو ایک جماعت کے حسب منشا پر نہیں بلکہ جمہوری بنیادوں پر طے کرنے کی جدوجہد کی جائے گی۔

"حکومت کا دانشمندانہ رویہ"

روزنامہ انقلاب بمبئی

کے سرخی کے ماتحت لکھتا ہے۔

شملہ کانفرنس میں قائد اعظم محمد علی جناح نے وائسرائے سے مطالبہ کیا تھا کہ مجالس قانون ساز کے انتخابات جلد از جلد کرائے جائیں مگر مصالح کے ماتحت کانگریس نے اس مطالبے کی تائید نہیں کی وہ یہ چاہتی تھی کہ نئے انتخابات سے پہلے مرکز میں اور صوبوں میں "قومی حکومت" قائم ہو جائے، جس میں ظاہر ہے اس کی اکثریت ہوگی اور پھر مرکز میں اور صوبوں میں انتخابات کرائے جائیں تاکہ اس عرصہ میں کانگریس اپنا اثر جو زائل کر چکی ہے اسے پھر بحال کرلے۔

ہندو پریس نے، اور کانگریسی رہنماؤں نے اس زور شور سے قائد اعظم کی مخالفت کی کہ یہ جائز مطالبہ اس شور بے ہنگام میں دب کر رہ گیا اور اندیشہ پیدا ہونے لگا تھا کہیں حکومت اس پاو ہو سے متاثر ہو کر مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے اور کانگریس کو قومی حکومت بنانے کا موقع دیکر انتخابات کے اہم ترین مسئلہ کو التوا میں نہ ڈال دے لیکن ہمیں مسرت ہے کہ یہ اندیشہ غلط ثابت ہوا اور حکومت نے ایک پریس نوٹ میں اس کا اعلان کیا ہے کہ مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز کے انتخابات جلد از جلد عمل میں لائے جائیں گے۔ اسمبلی کا اجلاس جنوری میں منعقد نہیں ہوگا، اور مارچ میں جو بجٹ سیشن منعقد ہوتا ہے وہ نئی اسمبلی کے نئے ممبروں کی موجودگی میں منعقد ہوگا۔

لارڈ ویول کے سفر پر تبصرہ کرتے ہوئے انقلاب نے ملک کی آزادی کی ضرورت پر زور دیا ہے مگر ایک بات بھی کہی ہے وہ بات بالفاظ معاصر یہ ہے:-

وہ بات یہ ہے کہ مسلمان آقاؤں کی تبدیلی پر رضامند نہیں کئے جا سکتے، وہ ہندوؤں کی غلامی منظور نہیں کر سکتے، کوئی ایسا دستور نہ ہندوستان میں نافذ کیا جا سکتا ہے جو مسلمانوں کی غلامی پر مبنی ہو یا جس کی بنیاد اساس اقوام مستقلہ کے حق خود ارادیت کے خلاف ہو۔

آزادی کی جنگ

مرکزی مسلم لیگ کا اخبار منشور لکھتا ہے مسٹر جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ نے شملے میں جو روش اختیار کی وہ اس قوم وقت کی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق تھی کہ اس کی تائید میں اس طرح اسباب پیدا

ہوئے گویا منشائے قدرت یہی تھا یہی ہے۔ جب یورپ کی جنگ ختم ہو چکی ہے جاپان کی جنگ آخری مراحل پر ہے اور دنیا کے اہل اختیار اور اہل الرائے نئے نظام کی تعمیر کے نقشوں پر غور کر رہے ہیں، اس کا کیا موقع ہے کہ ہندوستان میں تدارک جنگ کے لئے عارضی حکومت قائم ہو، وقت آگیا کہ ہندوستان کی کامل آزادی اور کامل طور پر آزاد حکومت کی نوعیت اور صورت کے متعلق آخری اور قطعی فیصلہ کیا جائے۔

ہندوستان کی مجالس واضعان قانون کے انتخابات ہوئے اتنا طویل زمانہ گزر چکا ہے کہ وہ اب کسی نوعیت سے ہندوستانی رائے عامہ کی نمایندہ نہیں رہی ہیں۔ جمہوری ضروریات ہی کے لئے کانگریس کو چاہئے تھا کہ وہ فوری انتخابات کے مطالبے میں مسلم لیگ کی تائید کرتی۔ مگر کانگریس کے لیڈروں نے قطعی سکوت اختیار کیا۔ وہ اسی پر اصرار کرتے رہے کہ مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے لارڈ ویول ہندوستان میں عارضی حکومت قائم کر دیں۔

دیکھنے کے بعد کہ کانگریسی لیڈر اپنی شکست کی شرمندگی کو مٹانے کیلئے التوائے انتخابات کا مطالبہ کر رہے ہیں اور عارضی حکومتوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ منشور لکھتا ہے:۔

ہندوستان کے آئینی مستقبل کی تعمیر میں جو زیادہ دیر تک نہیں ٹالی جاسکتی۔ نئی مجالس واضعان قانون کا بڑا دخل ہوگا۔ اگر ان میں مسلم لیگ کے سو فیصدی نمایندے نہ ہوئے تو پھر ان میں آئین ہر گز مسلمانوں کی مرضی کے مطابق نہیں بن سکے گا۔ لہذا موجودہ انتخابات پاکستان کے حصول میں ایک اہم مرحلہ سمجھ کر مسلمانوں کے لئے آزادی کی جنگ ہے۔

حکومتِ برطانیہ کو دھمکی

پنجاب کا مشہور اردو اخبار انقلاب جو پہلے اتحادی پارٹی کا آرگن تھا اور سر سکندر و خضر حیات کی پالیسی کی تائید کیا کرتا تھا اب یہ لیگی ہو گیا ہے۔ اپنی ۲۸ اگست کی اشاعت میں نئے انتخابات کے اعلان پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے اس خطرہ کا اظہار کیا ہے کہ نئے انتخابات کے بعد کہیں صوبجاتی اسمبلیوں کی نمایندگی کے ساتھ دستور ساز اسمبلی کا انعقاد نہ کر دیا جائے جیسا کہ کرپس کی تجویزوں میں تھی۔ اخبار یہ دیکھنے کے بعد کہ مسلمان نمایندے مرکزی اسمبلی سے جداگانہ طور پر دستور ساز اسمبلی کے لئے آئیں حکومت برطانیہ کو یوں دھمکی دیتا ہے:۔

اگر انگریزی حکومت نے کوئی ایسی حرکت گوارا کی تو ہم اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے کہ مسلمان اپنی پوری قوت سے اس کی مخالفت کریں گے۔ اور کسی قربانی میں بھی متوقف نہیں ہوں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ بعض ناگوار واقعات کی وجہ سے مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہوئے جو اب تک موجود ہیں لیکن ان چند افراد کے سوا جو ابتداء سے کانگریس کے حامی چلے آتے ہیں ایک بھی مسلمان پبلک میں کھڑا ہو کر پاکستان کے خلاف ایک حرف نہیں کہہ سکتا خواہ وہ کسی پارٹی سے تعلق رکھتا ہو۔ اور ہر فریق کے نزدیک پاکستان ملت اسلامیہ کا طے شدہ نصب العین ہے۔

کانگریس یا مہاسبھا یا حکومتِ انگلشیہ باہم ساز باز سے اس کے خلاف کسی چیز کو کامیاب بنانے کے وہم میں مبتلا ہیں تو یہ وہم جتنی جلدی دماغوں سے نکل جائے اتنا ہی اچھا ہوگا ہم چیلنج دینے کے عادی نہیں ہیں لیکن یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے اور کوئی قوت فرزندان توحید کو پاکستان کی راہ جہاد و نجات سے ہٹا نہیں سکتی۔

کانگریس کی جمہوریت کشی

کلکتہ کا لیگی اخبار عصر جدید نئے انتخابات کے اعلان پر تبصرہ کرتے ہوئے مسلم لیگ کی پالیسی کی تعریف کرتا ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد کے اس بیان پر کہ کانگریس کی مہلت ملنی چاہئے بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

نئے انتخابات سے مجالس قانون ساز کے دقیانوسی اور "جاگرٹ" ردی عنصروں کو چھانٹے بغیر صوبوں کی خود مختاریاں بروئے کار آ نہیں سکتی ہیں۔ اس لئے مسلمان سختی سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ مرکز اور صوبہ کی مجالس قانون ساز کا انتخاب کر لیا جائے، تاکہ صوبوں کی جو خود مختاریاں پرانی مجالس قانون ساز کی ردی اور ناکارہ عناصر کے سبب سے معطل ہیں وہ فوراً کام کرنے لگیں، اور برطانی ملوکیت سے سیاسی ترقی کے متعلق گفتگو کرنے میں سہولت ہو، لیکن ہندو ذہنیت کے نمایندہ جناب آزاد اس کے سخت مخالف ہیں، وہ کہتے ہیں کہ صوبوں کی خود مختاریوں کو پرانی مجالس قانون ساز کے ردی عنصروں کے ذریعہ بروئے کار لانا چاہئے، اور برطانی ملوکیت سے بھی وہی لوگ گفتگو کریں جن کو موجودہ رائے عامہ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ہند۔

ذہنیت اصحاب کے نمائندہ ابوالکلام کی اس غیر برکتی اور اس غیر جمہوری حرکت کی جتنی ملامت کی جائے کم ہے۔

خود فریبی و ابلہ فریبی

پنجاب کی اتحادی پارٹی کا آرگن اور خضر حیات خاں کا آلۂ قوس شہباز لکھتا ہے کہ اس وقت کانگریس اور لیگ کے اتحاد سے زیادہ ضرورت ہے کہ ملک کے مختلف مفادوں اور طبقوں میں ہم آہنگی کس طرح پیدا کی جائے۔ معاصر موصوف نے یہ نہیں بتایا کہ یہ آہنگی کس طرح پیدا کی جائے ممکن ہے کہ یہ بات لکھتے وقت اس کے مدیر کے دماغ میں اتحادی پارٹی کا نقشہ موجود ہو جس کے اگر عمل سے نہیں تو زبان و قلم سے صوبہ پنجاب کے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے درمیان "زمینداروں کو خوش حال بنانے کے لئے" ایک ہم آہنگی پیدا کر دی ہے بہر حال اس معاصر کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں کے سوال پر غور کرتے وقت ہمیں اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ بیس لاکھ مربع میل کے اس وسیع و عریض برِ اعظم میں بسنے والے افراد کے سیاسی و معاشی تقاضے ہر لحاظ سے ایک جیسے نہیں ہو سکتے اس لئے ہمارے اصول اور عمل کا دائرہ اتنا وسیع ہونا چاہئے کہ اس میں مختلف مفادوں کی سمائی ہو سکے۔ لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس وقت مسلم لیگ کے نام سے مسلمانوں نے جس سیاست کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے اس میں سب سے بڑی ضرب اسی چیز پر لگائی جا رہی ہے جس نے اختلافات کی خلیجوں سے کم تر کرنے کی بجائے انہیں اور زیادہ مستقل اور وسیع بنانا شروع کر دیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے کانگریس کی کرسی صدارت سے مسلمانوں کے حق خود اختیاری کے مسئلہ پر جو بیان دیا ہے، اس پر اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو باہمی اشتراک و تعاون کی بہت سی شکلیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اس طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ اسی طرح پنجاب میں یونینسٹ پارٹی نے لیگ سے بے تعلق ہونے کے بعد جو عمل اختیار کر رکھا ہے، وہ اتنا روادارانہ اور فراخدلانہ ہے کہ اُسے کسی صورت سے بھی لیگ کو نقصان پہنچانے والا نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن کس قدر حیرت و افسوس کی بات ہے۔ کہ ان کے اس عمل سے فائدہ اٹھانے اور حالات کو سازگار کرنے کی طرف مائل ہونے کی بجائے خواہ مخواہ اختلافات کی چنگاریوں کو بھڑکانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔

قومیت پرست متحد ہوں

دہلی کا اخبار انصاری جو جمعیۃ العلماء اور مسلم قوم پرستوں کا مؤید ہے مسلم لیگ کے خلاف محاذ بنانے کا مشورہ دیتا ہے۔ اس کا الفاظ یہ ہے۔

یہ بات بالکل ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ آئندہ والے انتخابات صرف یہی نہیں کہ مجالس مقننہ کیلئے مدت معینہ کے واسطے چند ارکین کو منتخب کرنے کے لئے کئے جا رہے ہیں بلکہ ان کی اہمیت دور رس اور دیرپا ہے۔ ان انتخابات کے نتیجہ ہی پر ہندوستان کی آئندہ سیاسی تشکیل کا دارومدار ہونے والا ہے اس لئے یہ انتخابات محض شخصیتوں یا عام پسند نعروں کے سہارے پر نہیں لڑے جائیں گے بلکہ اصولوں کی بنا پر انہیں لڑا جائے گا۔ اس بات کا فیصلہ ہوگا کہ ہندوستان اپنی قسمت کس طرح بنانا چاہتا ہے۔ آیا وہ اپنے اجنبی آقاؤں کی سیاست کے ماتحت تقسیم کرو اور حکومت کئے جاؤ کی پالیسی کا آلۂ کار بن کر جینا چاہتا ہے یا متحد رہ کر آزادی حاصل کرنے کا متمنی ہے۔ تمام صوبائی اور مرکزی حلقہ ہائے انتخاب کے رائے دہندگان کو اپنا ووٹ اس اصول کی حمایت یا مخالفت میں ڈالنا ہے۔ اور یہی بات ان انتخابات کو پچھلے تمام انتخابات سے زیادہ اہم اور قابل توجہ بنا دیتی ہے آئندہ انتخابات کو متحدہ یا منقسم ہندوستان کی بنیاد پر لڑے جانے کا مشورہ دینے کے بعد انصاری رقمطراز ہے :-

مسلم لیگ کو موجودہ چند در چند پروپیگنڈہ اور کام کی جو آزادی حاصل رہی ہے اور اسے جو ذرائع و وسائل میسر ہیں۔ ان کی بنا پر لیگ بہت کچھ آگے بڑھی ہوئی ہے اور اس سلسلہ میں قوم پرور جماعتیں اتنی آگے نہیں ہیں لیکن ہم امید رکھتے ہیں کہ اگر ان جماعتوں میں صحیح طور پر اشتراک عمل ہو جائے اور اب بھی کام کرنے کا کوئی بہتر طریقہ ہو سکے تو ہائے انتخاب کو صحیح راستے پر چلنے کے لئے آمادہ کئے جا سکتے ہیں اور ایسے انتخابات کامیابی کے ساتھ لڑے جا سکتے ہیں۔ جن میں اصولوں پر بحث ہو اور جن کے نتائج عوام الناس کی صحیح آئینہ دار بن سکیں۔ ہم اس سلسلہ میں انتظار کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کی وہ جماعتیں جو لیگ کے نقطۂ نگاہ سے اتفاق نہیں رکھتیں کیا طریق کار اختیار کرتی ہیں۔

فرقہ پرستوں کو نظر انداز کرو

کانگریسی اخبار تیج (دہلی) نے انتخابات کے اعلان کی مخالفت

دو نہیں کی۔ مگر وہ کہتا ہے کہ انتخابات سے پہلے صوبجات اور مرکز میں قومی حکومتیں بن جانی چاہئیں اور برطانیہ کو فرقہ پرست جماعتوں کو نظر انداز کر دینا چاہئے۔

ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ قوم پرست ہندوستان یہ گوارا نہیں کرے گا کہ برطانیہ کے سامراجی سنسار ریاستی راجہ نوابوں کے شخصی مفاد اور اقلیتوں کے غرضی تشکیک کی آڑ میں آزاد ہندوستان کے آئین کی ترتیب پر پابندی لگا دی جائیں۔ صدر کانگرس کے بیان سے ظاہر ہے کہ کانگرس جو آزادی کا مطالبہ کرتی ہے ہندوستان کے داخلی مسئلوں کی پیچیدگیوں اور اقلیتوں کے جذبات کا خود ہی کافی احساس رکھتی ہے اور وہ مکمل قومی آزادی کے دائرے میں قوم کے تمام اجزا کو مطمئن کرنے کو تیار ہے۔ خوش قسمتی سے شملہ کا تجربہ لارڈ ویول کے سامنے ہے اور مسٹر اٹیلی و لارڈ پتھک لارنس کو اور لیبر گورنمنٹ کے دوسرے ممبروں کو ذاتی واقفیت کی بنا پر بتا سکیں گے کہ ہندوستانی مسئلے کے قومی حل کے متعلق کانگرس کا نظریہ رواداری اور مصالحت کی اسپرٹ سے کتنا بھرپور ہے۔ اگر اس نظریہ کے باوجود ہندوستان کے فرقہ پرست اور رجعت پسند عنصروں کی تمام ضد کو اہمیت دی گئی تو قوم پرست مسلمان یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ لیبر گورنمنٹ ہندوستان کے قومی جذبات سے کنزرویٹو گورنمنٹ کی طرح کھیلنا چاہتی ہے۔

لاہور کا اخبار ویر بھارت لکھتا ہے :۔

اب کہ لارڈ ویول کی دوبارہ لندن میں طلب کئے جانے کی خبر کے ساتھ ہی ساتھ مرکزی اسمبلی اور صوبجاتی اسمبلیوں کے عام انتخابات کرائے جانے کا اعلان بھی ہو گیا ہے۔ صدر کانگرس مولانا آزاد نے وائسرائے سے بجا طور پر شکایت کی ہے کہ اس وقت تک کانگرس پر سے تمام پابندیاں ہٹا کیوں نہیں لی گئیں اور تمام کانگرسی قیدیوں کو رہا کیوں نہیں کر دیا گیا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ملک کی دوسری پارٹیاں شملہ کانفرنس ختم ہونے کے بعد ہی سے انتخابی دنگل کے لئے لنگوٹے کس رہی ہیں۔ اور اپنا اپنا پروگرام بنانے اور فنڈ جمع کرنے میں سرگرمی سے معروف ہیں۔ شملہ کانفرنس میں کانگرس نے جو رویہ اختیار کیا اس سے لارڈ ویول کو بھی اس کی نیک نیتی اور صلح جوئی کا یقین ہو گیا تھا۔ یہ یقین ہو چکنے کے بعد انصاف اور معقولیت کا تقاضا یہ تھا کہ اس کانفرنس کے خاتمے سے پہلے ہی تمام کانگرسی قیدیوں کو رہا اور تمام کانگرسی جماعتوں کو ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد کر دیا جاتا۔ مگر عام انتخابات کا فیصلہ ہو جانے پر تو ایسا کر دینا اشد ضروری تھا۔

اس سلسلہ میں لاہور کے اخبار ملاپ کی منطق قطعی مختلف ہے وہ لکھتا ہے کہ :۔

امپریلسٹ انگریز جو برطانیہ میں بیٹھے ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہنے کا خواب دیکھتے رہتے ہیں اور وہ بیوروکریسی جس کا فائدہ اسی میں ہے کہ ہندوستان غلام رہے۔ کوشش کرینگے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل پہلے طریقہ سے ہو دوسرے طریقے سے نہیں اس لئے وہ جتن کرینگے کہ مسلم لیگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں مسلمان صوبائی اسمبلیوں کے لئے منتخب ہوں۔ تو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کانگرس یا وطن پرست مسلمانوں کے ٹکٹ پر نہیں۔ اسی طرح غالباً وہ یہی جتن کرینگے کہ ہندوؤں کی تمام سیٹوں پر ہندو سبھا کا قبضہ ہو لیکن ہندو عوام میں چونکہ جاگرتی زیادہ ہے چونکہ ان کے دلوں میں حریت پسندی زیادہ ہے اور چونکہ حکومت کی کوشش کے باوجود کانگرس کو کچلا نہیں جا سکا اس لئے وہ جتن کریں گے کہ ہندو سیٹوں پر صرف کانگرس ہی قائم ہو اور سکھ سیٹوں پر کوئی ایسی فرقہ وارانہ جماعت

ادبی تنقید

اکبر الٰہ آبادی

از :— فراق گورکھپوری

اردو شاعری کی تاریخ میں شروع ہی سے طنزیات، مزاحیات، اور ظرافت کی چاشنی رہی ہے اردو علمار کی زبان نہ تھی بلکہ ٹکسال اور بازار کی زبان تھی اور عام زندگی میں چٹکیاں، چھیڑ چھاڑ، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کا کافی عنصر رہتا ہے۔ اردو کے اساتذہ شروع میں مدحیہ قصائد اور غزلوں کے علاوہ اپنے اوپر فرض سمجھتے تھے کہ ہجویں بھی لکھیں۔ سوداؔ، انشاؔ، رنگینؔ اور کئی دیگر شعرار شاعری میں پھاگ کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انشار اور جرأت نے تو غزلوں تک میں ظرافت کا چٹخارہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا۔ ریختی اور واسوخت بھی اس مقصد کے لئے وقف کر دیئے گئے۔ جب انگریزی حکومت قائم ہوگئی تو ملک ہنسنا بھول گیا اور قہقہوں کی جگہ اس سنجیدگی اور قوم و وطن کے اس غم نے لے لی۔ جو حالی کی شاعری میں ہمیں نظر آتا ہے اب اردو شاعری میں اگر ظرافت آ بھی سکتی تھی تو وہ رنگ رلیوں کے روپ میں نہیں۔

اس نئی ظرافت کے پیغمبر اکبر ہیں۔ ان کی ظرافت انھیں کے ساتھ ختم ہوگئی۔ چند خصوصیات اس ظرافت کی ہمیں اولین نظر میں چونکا دیتی ہیں۔ پرانے ہجویہ شاعری یا واسوختوں میں شاعر اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتا تھا، ذاتی انتقام لیتا تھا اور انتہائی دل آزاری اس کا مقصد ہوتی تھی۔ اکبر کی ظرافت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ خود بھی ہنستے ہیں اور حریف کو بھی ہنسا دیتے ہیں کسی فرد یا طبقے کی دل آزاری نہیں کرتے۔ ذاتیات سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہوتا جب تک کہ کوئی فرد واحد سماجی نقطۂ نظر سے کسی اہمیت کا حامل نہ ہو۔ ان کا نشانہ قومی زندگی پر پڑتا ہے اور خلوص و دیانت کے ساتھ اگر [illegible] [illegible]

مضحکہ خیز بات قوم میں پاتے ہیں تو اس کا مذاق اس طرح اڑاتے ہیں کہ بیک وقت طبیعتوں میں گدگدی اور فرحت پیدا ہو جاتی ہے اور قوم اپنی غلطی یا غلط خیالی کا جائزہ لینے پر بھی مجبور ہو جائے۔ تلخی یا کڑوا پن۔ درشتگی اور خشونت ان کے لہجہ میں کبھی نہیں آنے پاتی۔ ان کا تیز سے تیز نشتر بغیر گدگدائے ہوئے نہیں رہتا۔

اکبر نے ظرافت کی ایک نئی ٹکنیک (Technique) نکالی انھوں نے اپنی شاعری کے لئے نئے ملائم یا اشارے ایجاد کئے اور پرانے ملائم اور اشاروں کو نیا رنگ دے دیا۔ مثلاً سید، مسٹر، مس، پنڈت جی، شیخ، مولانا، صاحب، نیٹو (NATIVE) ڈاروِن انجن، لالہ زبجن، کالج، کلب، کمیٹی اور چندہ، اونٹ اور گائے، پائپ، لاٹ صاحب وغیرہ وغیرہ ان میں ہر لفظ ہندوستانی آبادی اور ہندوستانی زندگی کے مختلف طبقوں اور پہلوؤں کا مفہوم رکھتا ہے اور آلۂ کار جو اپنی ظرافت کے لئے اکبر نے استعمال کیا وہ ان انگریزی الفاظ کا استعمال ہے جو ان دنوں ہندوستانی بول چال میں آ گئے تھے۔ اس طرح ان کی ظرافت میں واقعیت کی چاشنی آ جاتی ہے اور اس میں معیار اور نوک پیدا ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی اکبر کسی ہندوستانی لفظ کا قافیہ انگریزی لفظ سے پیدا کر لیتے ہیں اور اس طرح ان کے کئی مطلع اچانک طور پر چمک جاتے ہیں جیسے:—

شیخ کو کورس ون کو فارورڈ ورک کرتے ہیں
مدیم الفرصتی سے ان کی الفت ترک کرتے ہیں

ہم قافیہ ہندوستانی [illegible] اسی [illegible] سے بہا اتفاق
[illegible] ہی [illegible] اگر [illegible] کے پٹارہ سے نکال
[illegible] کی یاد دلاتی ہے۔

حالی اقبال اور [illegible] کی طرح اکبر کی شاعری بھی محض دل لگی کا سامان نہ تھی، وہ ہنستے ہنسانے کے بہانے ہمارے دلوں کا چور نکال لیتے ہیں اور ہماری دکھتی ہوئی رگوں کو چھیڑ دیتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ ظرافت مفکرانہ ہنسی ہے اور یہی مفکرانہ ہنسی ہمیں اکبر کی گدگدی اور قہقہوں میں ملتی ہے۔ اقبال نے کہا تھا۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

لیکن اکبر کا دل اس خیال سے مسوس اُٹھتا ہے کہ:۔

حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی
تو کام آئیں گی چلمن کی تیلیاں کب تک

یا

تم میں باقی نہیں اب خالد جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظ شیراز کا رنگ

مسلمانوں سے سب کچھ چھن چکا تھا اور اب کیا رہ گیا تھا کہ ہم یہ کہیں کہ 'سارا جہاں ہمارا' اسلئے اکبر نے فقط ایک مصرعہ کہہ کر جس حقیقت کی طرف اقبال نے اشارہ کیا تھا اس کا دوسرا پہلو دکھا کر ہمیں یہ کہہ کر چونکا دیا۔

کچھ بھی نہیں ہمارا وہم و گماں ہمارا

غدر کے بعد پورا ہندوستان لیکن خاص کر مسلمان غلامانہ ذہنیت کا شکار ہوگئے تھے۔ ہر مغربی چیز پہ اُن کا دل لوٹ پوٹ ہوجاتا تھا۔ مغربی زندگی کی اندھی تقلید کرنا چاہتے تھے اپنی تہذیب اور کلچر کے قدردان بے خبر ہو چلے تھے۔ قومی بہبود و فلاح کے لئے جو کمیٹیاں اور جلسے قائم ہوتے تھے ان میں بھی صرف زبانی جمع خرچ ہوتا تھا۔ علیگڑھ تحریک اور مسلم لیگ کی تحریک بھی کئی غلط خیالیوں اور ناخوش اندیشیوں کا شکار تھی۔ شبلی نے اپنی نظم و نثر کے ذریعہ سے براہ راست ان حماقتوں اور اخلاقی کمزوریوں کا پردہ فاش کیا اور اکبر نے یہی کام اپنی ظرافت سے لیا۔ اکبر کے دل میں ہندو مسلمانوں کی متحدہ قومیت کا خیال جتنا زبردست و شاندار تھا اس کی مثال ان کے کسی مشہور ہمعصر میں نہیں ملی اور شاید اردو شاعری میں آج تک اس کی مثال پیدا نہیں ہوئی۔ اکبر کو اس کا احساس تھا کہ ایک ہزار برس کے ساتھ اور رفاقت نے ہندو مسلمانوں کی ایک متحدہ زندگی اور متحدہ کلچر پیدا کردیا ہے اور ان کی نظمیں اور قطعات بہت حساس طریقے سے ان کے اس نظریہ کو پیش کرتے ہیں۔

یہ خیال قریب قریب عام طور پر پھیلا ہوا ہے لیکن شاید حال میں اسکی کچھ اصلاح ہو چلی ہے کہ اکبر وقت کے مطالبوں کو نہیں سمجھتے تھے۔ ترقی کے خلاف تھے، تبدیلی اور اصلاح تک کے خلاف تھے، دقیانوسی خیالات کے آدمی تھے، مردہ پرست قدامت پرست اور رجعت پسند تھے لیکن دراصل ایسا نہیں ہے۔ اکبر جہاں فیشن پرستوں کا مذاق اڑاتے ہیں وہاں شیخ اور مُلّا کو بھی نہیں چھوڑتے وہ کالج اور علیگڑھ اور سید کی چٹکیاں لیتے ہیں لیکن ان کے کاموں کے مفید پہلوؤں کو نظرانداز نہیں کرتے۔ پردے کی زبردست حمایت کرتے ہیں لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اس زمانہ میں بہت سے ایسے لوگ بھی پردے کے خلاف ہوگئے تھے جو عورتوں کو تتلیاں اور انگریز عورتوں کی نقال بنا کر منظر عام پر لانا چاہتے تھے۔ اکبر کے کلام اور ان کی زندگی میں جو روشن خیالی، رواداری، مصلحت شناسی، اور تقاضائے وقت کا احساس ہمیں ملتا ہے اسے نظرانداز کرنا غلطی ہوگی اور یوں تو زمانہ اس تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے کہ کل کا مصلح قوم اور ترقی پسند بلکہ کل کا مجتہد اور انقلاب پسند تک آج قدامت پرست و رجعت پسند معلوم ہوتا ہے۔

اکبر کے بیان میں ایسی تازگی و شگفتگی ہے، ان کی چھیڑ چھاڑ کی شاعری میں چابکدستی ہے۔ مصرعوں اور ترکیبوں میں وہ چستی ہے انداز بیان میں وہ فطری صنعت اور اس کے ساتھ ہی ایک ایسا اچانک پن ہے، ان کے اشعار سانچے میں اسطرح ڈھلے ہوئے ہیں اور قومی زندگی کے پہلوؤں کا اسطرح احاطہ کرلیتے ہیں کہ اُن کا کلام ہماری ہجویہ شاعری یا طنزیہ شاعری کا کلاسک (CLASSIC) بن جاتا ہے۔ اکبر کا شمار دنیا کے بڑے ہجوگو شعرا (SATIRIST) میں کیا جا سکتا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی غیر جانبدارانہ تنقید حیات اور سماجی

زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ان کے دسترس سے باہر تھے۔ بڑے سے بڑے شعرا مثلاً چکبست و اقبال نے ان کے انداز میں طبع آزمائی کی لیکن عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ اگر ہماری قومی زندگی کی سچی اور نہایت تیکھی مصوری بولتے ہوئے مصرعوں کے ذریعہ سے ان کے کلام میں نہ ہوتی تو ہر طبقہ کے لاکھوں آدمیوں کی زبان پر ان کے سینکڑوں مصرعے نہ چڑھ جاتے۔ اکبر کے کلام کا ہندی ایڈیشن بھی کئی ہزار کی تعداد میں ملک کے اندر رائج ہو گیا ہے۔ اس سے ان کے قبول عام ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

اکبر کی شاعری کُل کی کُل ظرافت و مزاح کی شاعری نہیں ہے۔ ان کی غزلیں متوسطین متغزلوں کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں اور ان کی پختگی رچاؤ اور تغزل کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اکبر کی ظرافت میں قومی غلطیوں اور بے راہروی کا ہی احساس نہیں بلکہ غم، درد، اداسی، قومی بے بسی اور قومی بدنصیبی کا احساس بھی چھپا ہوا ہے۔ لیکن ان کی ظرافت کا انداز ہمیں ان سب باتوں کا احساس کراتے ہوئے جو مجموعی اثر ہم پر ڈالتا ہے وہ دل شکن اور حوصلہ شکن نہیں ہوتا۔ ہم اپنی غلطیوں سے آگاہ ہو جاتے ہیں اور امید کا دامن ہمارے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ اکبر نے ہمیں اپنے اوپر ہنسنا سکھایا اور یہ ہنسی قومی زندگی کے لئے اصلاح کی بہت سے امکانات اپنے اندر رکھتی ہے۔ آج کا زمانہ ہندوستان کے لئے اکبر کا زمانہ نہیں ہے اور اگرچہ لفظ بہ لفظ آج کا ہندوستان اکبر کے کہے پر نہیں چل رہا ہے لیکن ان کی غلطیوں کی اصلاح کی طرف مائل ہو چکا ہے جس کی طرف اکبر کی آواز نے پہلے پہل اسے مائل کیا تھا۔

سہارے

از ــــــــــــ صدیقہ بیگم

شریف گومتی کنارے یکہ ہانکتا ٹنک ٹنک کرتا چلا جا رہا تھا۔
…ح سے یہ وقت آگیا دن بھر کی تھکن اس کے دماغ پر چھائی
…ی تھی۔ ٹنک ٹنک کی ہلکی ہلکی آوازیں اس کی زبان سے نکل کر فضا
…ں بہہ رہی تھیں۔ ندی کی ہلکی پھلکی لہریں سینہ پھلائے چلی جا رہی
…ھیں۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ بھی اداس ہیں پھر انھیں کسی
…سی طرح اپنی منزل مقصود پر پہنچنا ہے۔ یہ لہریں بھی اس کو اپنی ہی
…رح معلوم ہو رہی تھیں۔۔۔۔ مجبور۔ بے بس، جیسے ان کا بھی کوئی
…اکم ہے، ان پر بھی کوئی جبر کرتا ہے۔ کتنی مجبور ہیں یہ لہریں۔ پھولی
…ھولی شفق کا عکس پانی پر پڑ رہا تھا جس سے ندی کا حسن دوبالا
…و رہا تھا۔ لیکن وہ لہریں۔ انھیں کیا دلچسپی اس حسن سے، فطرت
…ے ان حسین مناظر سے وہ تو اپنی منزل ہی پر پہنچ کر دم لیں گی۔ پر اس
…قت یہ کتنی خاموشی سے بہہ رہی ہیں۔ آہستہ آہستہ جیسے کوئی
…وئی کے گالوں پر چلتا ہو۔ شریف نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔
…ہ اس منظر کو دیکھے گا، اپنی اداسی، اپنی پریشانی، اپنی دماغی الجھن
…گومتی کی ان لہروں کے سپرد کر دے گا۔ لے جاؤ بہا دو ان کو سمندر
…ے اس بے پایاں حصہ میں جس کی سطح پر ہم نیچے رہتے ہیں تاکہ
…ہ ان کو ختم کر دیں اور وہ پھر لوٹ کر نہ آسکیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا
…یسے واقعی اس کی اداسی ختم ہو رہی ہے اس کے سینہ میں خوشی
…ل رہی ہے مسکراہٹیں ابھر رہی ہیں وہ یکہ کے ڈنڈے پر سر
…ک کر شفق کی سرخیوں میں کھو گیا۔ نہ جانے کتنی دیر کن کن خیالات
…ں ڈوبا رہا۔ شفق کی حسین جوانیوں کی آغوش اگرچہ اس کے
…ے وا نہیں تو کیا۔ گومتی کی حسین فطرت کی لطیف باہیں تو اس کو
…عوت نظارہ دے رہی ہیں۔ یکایک ایک آواز نے اسے چونکا
…یا۔ "تانگے والے ذرا چوک تک چلو گے" شریف چونک پڑا وہ
…سہانا خواب دیکھ رہا تھا جیسے کسی نے سوتے سے اٹھا دیا ہو۔

"نہیں سرکار اب گھوڑا باندھنے کا وقت ہے" اور پھر شریف نے شعوری طور پر ٹنک ٹنک کی اور چل دیا۔ وہی پہیوں کی گڑگڑاہٹ وہی ٹنک ٹنک وہی تاریک ماضی کی ہولناک اور پریشان کن یادیں۔ شریف نے زور زور سے گھوڑے کو دوڑایا۔ یکہ اس تیزی سے جا رہا تھا جیسے کوئی تعاقب کر رہا ہو۔ وہی تاریک ماضی کی ہولناک اور پریشان کن یادیں۔ اس کا ماضی کتنا تاریک تھا، جہاں روشنی کی کسی کرن تک کا گذر نہ تھا۔ اس کی زندگی موت سے بد تر تھی۔ تب پھر وہ کیوں جی رہا تھا۔ مستقبل کی آس میں۔ وہ ماضی سے ناامید ہو گیا تو کیا مستقبل تو اپنا ہے۔ وہ اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ دن بھر اپنی نئی نویلی دلھن سے الگ رہتا ہے۔ اپنے بہن بھائیوں کی دلچسپ باتیں نہیں سن سکتا۔ سورج کی تمازت برداشت کرتا ہے، برسات کی مسلسل جھڑی میں یکہ لئے پھرتا ہے تو کیا اس لئے کہ وہ حال کی طرح اس کو ناامید کر دے۔ شریف اپنی کشتی مستقبل کے سہارے کھے رہا تھا۔ حالانکہ اس کی کشتی بھنور میں پھنسی ہوئی تھی اور اس سے پہلے بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کر چکی تھی جن کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اگر اس کو اس بھنور سے نکلنے کی امید نہ ہوتی تو شاید وہ چپو چھوڑ دیتا، پر اس کو یقین تھا کہ آنے والے دنوں میں ہر چیز اس کی اپنی ہوگی، بکا ہوا شیرا پھر اس کو مل جائیگا۔ اس نے غلطی کی جو شیرا کو بیچ دیا۔ اس کے چھوٹے بہن بھائی اس پر جان چھڑکتے تھے اس کو چمکارتے تھے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کو گھاس کھلایا کرتے تھے۔ کتنا روئے تھے سب کے سب جس روز وہ شیرا کو تھان سے کھول کر لے جا رہا تھا۔ خالی کھونٹے کو دیکھ کر ہفتوں سب روئے تھے منی تو کئی دن باہر نہیں نکلی گھر میں پڑی رویا کی۔ ان سب کو شیرا سے کتنی محبت تھی بالکل ایسی ہی جیسے گھر والوں میں ہوتی ہے

وہ بھی گھر ہی کا ایک فرد تھا۔ جب کوئی کھانے کی چیز آتی تو شیرا کا حصہ الگ لگتا۔ "آخر اس میں بھی تو جان ہے" اس کی ماں کس پیار سے کہا کرتی تھی۔ اور سب بچے دوڑ پڑتے "لاؤ اماں شیرا کو میں اپنے ہات سے دونگا۔ اور شیرا ابھی کتنا ہی کھائے ہوئے کیوں نہ ہوتا پھر بھی اس تحفہ کو قبول کرنے میں تامل نہ کرتا جھٹ بھاڑ سا منہ پھیلا دیتا۔ جب شریف اس کو بیچ کر آیا تو تھوڑی دیر تک تو کوئی بھی اس سے نہ بولا۔ ہر ایک روٹھا رہا۔ وہ خود بھی رنجیدہ تھا۔ ایسا جی چاہ رہا تھا کہ خوب دھاڑیں مار مار کر روئے۔ پھر اس نے خود ہی کہا "اماں جب میں نے شیرا کو وہاں تھان پر باندھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے"۔ یہ سنتے ہی بچے اس کے گرد آکر کھڑے ہوئے۔

"تو بھیا تم نے چمکارا کیوں نہیں"۔

"کیوں بھیا اس نے رسّی تو نہیں توڑی"۔

"توڑی ضرور ہو گی۔ اُچھلا کودا ہوگا" منی نے رونی صورت بنا کر کہا۔

"بھیّا بڑے بُرے ہیں"۔ منے نے مُنہ پھلا کر کہا۔

"ہاں دیکھ تو سہی ہمارے شیرا کو بیچ دیا۔ ان کا کیا گیا"

منی بولی۔

"ان کا کیا جاتا۔ ان کو تو روپیہ مل گئے" منے نے چڑھاتے ہوئے کہا۔

صرف اس کی ماں اور بڑی بہن خاموش تھیں لیکن ان کی صورت سے بھی ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سب سے زیادہ وہی پریشان ہیں۔ اپنی چھوٹی بہن کی افسردہ صورت دیکھ کر تو وہ پاگل سا ہو گیا تھا۔ اس کے بیاہ کی وجہ سے تو اُسے یہ سب کرنا پڑا۔ اگر گھوڑا نہ بیچتا تو بیاہ کیسے ہوتا۔ پھر اس کے اپنے بیاہ کا بھی تو سوال تھا۔ سماس سسر نے کتنے دن سے پریشان کر رکھا تھا۔ وہ گھبرا گیا گھوڑا آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ گذری باتیں ایک ایک کر کے اس کے ذہن میں گھسنے لگیں۔ معاً ... اس نے گردن جھٹکی ... یہ اس کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتیں۔ اس نے گھوڑے کو پھر تیزی سے دوڑا لیا۔ پھر وہی ٹپ ٹپ — وہی پہیوں کی گڑگڑاہٹ، وہی ماضی کی ہولناک اور پریشان کن یادیں۔ پھر ان کو بھلانے کے لئے اس نے

جیب سے روپئے نکالے۔ آج کی آمدنی دس روپیہ چھ آنے۔ ان میں کل ڈیڑھ روپیہ اس کے سارے دن کی محنت ڈیڑھ روپیہ میں کہیں گذر ہوتی ہے — اور اس مہنگی میں کون سی چیز سستی ہے — چلو اس کنٹرول سے یہ تو ہوا کہ کچھ سستا ملنے لگا — نہیں تو یہ بنئے — یہ حرامی تو ہنگا... ہیں۔ کئی بار اس نے بابوجی سے دو روپیہ روز کرنے کو کہا — آخر اٹھنی بڑھا دینے میں ہرج ہی کیا ہے ہر جگہ تو ملازموں کو ... بھتہ" دیا جا رہا ہے۔ مگر وہ کہاں مانتے ہیں۔ اُلٹا روز اسی پر بگڑتے ہیں۔ اب آج ہی دس روپیہ چھ آنے لایا ہوں — یہ کہیں گے کہ شاباش آج لائے ہو۔ لو چار پیسے تمباکو کے — روز یہی کہتے ہیں کیا تجھے دیں کیسا گھوڑے کو کھلائیں — اپنے گھوڑا ذرا سا تھوڑا ہی کھاتا ہے جیسے کھلانا پڑے تو معلوم ... — جیسے اس کے یہاں کبھی گھوڑا بندھا ہی نہیں وہ خود ... ہی نہیں جانتا — اس کو بابوجی پر غصہ آیا" اور وہ دانت پیس ... رہ گیا۔ جب اس نے نوکری کی تھی تو سوچا تھا کہ روپیہ خرچ ... اور اٹھنی بچائے گا اور اس طرح وہ جلدی سے شیرا کو خرید لے ... لیکن آج تک وہ ایک روپیہ بھی پس انداز نہ کرسکا۔ آخر اتنے ... کنبے کا خرچ کیسے چلے۔ وہ اکیلا کمانے والا اور لڑائی ہے کہ ختم ... ہونے کا نام ہی نہیں لیتی جیسے بھی گذر ہوتی ہے وہی جانتا ہے ... بابوجی کا بنگلہ آچکا تھا اس نے منیم جی کے پاس جا کر دس روپیہ چھ آنے گن دئے۔ اتنے میں بابوجی بھی تیوری چڑھی توند ہلاتے آگئے۔ "کیوں بے شریف آج کیا لایا" انھوں نے نوٹوں کی ... گھورتے ہوئے کہا۔

"سرکار دس روپیہ چھ آنے"۔ اُس نے تیزی سے فخریہ انداز میں کہا۔ جیسے آج اس نے کمال ہی تو کر دیا۔ لیکن پھر بابوجی کی صورت دیکھ کر پژمردہ ہو گیا۔

"کل دس روپیہ چھ آنے۔ ارے آج تو اتوار کا دن تھا ... خیر منیم جی دیدو ایک روپیہ اٹھنی کاٹ لینا کل ملے گی"۔ انھوں نے کہا اور چل دئے۔

• شریف چاہتا تھا کہ آج کسی طرح دو روپیہ مل جاتے اور ...

دو روپیہ زیادہ ملا ہی تھا وہ چاہتا تو تھی اسی میں سے معاف
دیتا اور ان کو پتہ بھی نہ چلتا ——— پر ایمانداری کا زمانہ نہیں ———
شریف کی امید پر پانی پھر گیا وہ روپیہ لے کر ایک طرف کو چل دیا۔
وہ پھر انھیں خیالات میں کھو گیا جنھوں نے اس کی زندگی کا شیرازہ
بکھیر دیا ہے۔ اس نے ان کو بھولنے کے لئے ربو کے متعلق سوچنا
شروع کیا۔ اسے ایسی کوئی دیر تو نہیں ہوئی۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا،
تھوڑی بہت روشنی تھی، چراغ جلتے تک وہ ضرور گھر پہنچ جائے گا۔
ربو دروازہ پر بیٹھی راہ تک رہی ہوگی۔ وہ اس کو دیکھ کر کیسا مسکراتی
ہے۔ اس نے اپنے جسم میں ایک عجیب سی کیفیت محسوس کی اور اپنی
رفتار تیز کی۔ اس نے زور زور گانا شروع کیا۔ "تو کون سی بدلی میں
میرے چاند ہے آجا" اور اس مصرع کو دیر تک الاپتا رہا۔ اُس کی
آواز میں جوش تھا، خوشی تھی گویا وہ چاند جو ابھی بدلی میں چھپا ہوا ہے
وہ اس کے اس طرح گانے سے نکل ہی تو آئے گا جیسے اندھیرا
ہوتے ہوتے اجالا ہونے لگے۔

شریف گھر پہنچا تو ربو دروازے بیٹھی اس کا انتظار کر رہی
تھی۔ شریف کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اُس نے اپنے
چاروں طرف غور سے دیکھا۔ منی قریب ہی کھڑی تھی۔ "منی جا
تجھے ماں بلا رہی ہے" "کہیں بھی تو نہیں" منی نے فوراً جواب دیا۔
ذرا سی لونڈیا مگر زبان کیسی کترنی سی چلتی ہے۔ میں کہتی ہوں میں نے
ابھی سنا ہے جا کے دیکھ تو۔ منی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی
اندر چلی گئی۔ اتنے میں شریف بالکل قریب آگیا۔ "آج تو بڑے مزے میں"۔

"کیا مزے ہیں ———" وہ ٹھنک کر بولی

"منی کو اندر کیوں بھیج دیا"

"ویسے ہی تم سے مطلب" وہ جھینپ سی گئی جیسے چوری پکڑی گئی۔
اور یہ قمیص میں بٹن تو لگا۔ اتنی بڑی ہو گئی پر کچھ تمیز نہیں —
گلے کے نیچے سب کھلا ہوا ہے"

کھلا رہنے دو۔ بیاہیوں کے ایسا ہی ہوتا ہے۔ کوئی کنواری
تھوڑا ہی ہوں" ——— پھر اس کو خیال آیا کہ اس نے غلط جواب دیا
اور ربو ہی اپنی مدافعت دوسری طرح کی۔ "بٹن تو لا کر دیتے نہیں
دل بھر ہی کہتے رہتے ہیں یہ کھلا ہے وہ کھلا ہے۔ تمھیں بُرا لگے

تو تم بھی آنکھیں بند کر لو" ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہ وہ ٹھنکا رہا
سب کچھ کہہ رہی تھی مگر صورت صاف بتا رہی تھی کہ اسے ذرہ برابر
بٹن نہ ہونے کا رنج نہیں۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا "تم بھی اماں
کی طرح ہر وقت لگائے رہتے ہو۔ وہ بھی میری مصیبت کئے
رہتی ہیں۔ اب گلا کھلا ہے اب دوپٹہ سینہ پر نہیں، اب پائجامہ
اوپر کو کھسک گیا۔ جوان لڑکی کسی چیز کا ہوش نہیں" وہ یہ کہتی جا رہی
تھی اور مڑ مڑ کر دیکھتی جاتی تھی۔ اس نے شریف کا ہاتھ پکڑ لیا اور
آہستہ آہستہ کہنے لگی "سچ سچ تمھارے مکان میں یہ بڑی خراب
بات ہے کہ کوئی بات کرنے کی جگہ نہیں۔"

"بات تو کرے جا رہی ہے اور اوپر سے کہتی ہے کہ بات
کرنے کو جگہ نہیں"

"اس سے کیا ہوتا ہے ڈر تو لگا رہتا ہے، کہیں کوئی آنہ جائے"
یکایک منی آگئی۔

"بھیا ہم نے ایک روپیہ جمع کیا ہے۔ اپنے شبرا کے لئے
کتنے میں شبرا واپس مل جائے گا۔ شریف کو دھکا سا لگا۔ وہ اپنے
دکھوں کو بھولنا چاہتا تھا اور اس وقت بھول بھی گیا تھا مگر ان
بچوں نے پھر یاد دلا دیا۔ اس نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔ کہاں
سے جمع کیا"۔

"وہی ——— باجی کی سلائی کا"

"بھیا ——— کو مت دینا" منی نے فوراً کہا "ہم بھائی کے
پاس جمع کریں گے۔ یہ سب خرچ کر ڈالتے ہیں ہمارے سالگرہ کے
تین روپیہ انھوں نے ہضم کر لئے۔

"ہم ہی نے تو ہر چیز کھائے ———" شریف نے جواب دیا۔
"اچھا تو پھر ہم نہیں کھائیں گے اپنے حصہ کا شبرا کے لئے جمع کریں گے۔
ماں بچوں کی معصوم باتیں سن رہی تھی۔ اس نے کہا "وہ بیچارہ
کیا کرے جو کچھ ملتا ہے سب تمھارے ہی کھٹے تو لگتا ہے غریب
کے پاس اتنا بھی نہیں بچا کہ سر ڈھکنے کے لئے ٹوپی ہی خرید لے
اب کیا آتا شبرا، گیا سو گیا ———" ماں کا یہ فیصلہ کن جواب سن کر
بچے ناامید ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے رو ہی تو دیں گے۔
لیکن فوراً ہی شریف نے کہا "نہیں آئے گا کیسے نہیں۔ شبرا

میں خود لاؤں گا۔"

شریف پھر اُداس ہو گیا۔ کیا اُس کی یہ پریشانیاں کبھی ختم نہ ہوں گی۔ چند روز سے اس کی یہ کیفیت تھی کہ جب کہیں اڈے پر بھی تنہا ہوتا اور پریشانیوں کا ہجوم اس کو گھیر لیتا تو وہ رتو کے خیال سے اپنے کو بہلایا کرتا تھا۔ وہ اپنی تمام پریشانیوں اس کے خیال میں تحلیل کر دیتا تھا گویا کائنات کے تمام رنج رتو کے وجود سے الگ ہیں ـــ لیکن اس وقت رتو اس کے سامنے کھڑی تھی پھر بھی وہ آزردہ تھا۔ رتو بھی رنج والم کی پیکر بنی تھی ـــ اتنے میں ماں اٹھی اور اس نے اس خاموشی کو توڑا۔ "بیٹا مُنہ ہات تو دھو لے کھانا تیار ہے"۔ یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔ شریف کی نظر رتو کے کھلے سینے پر پڑی۔ پھر اس نے دیکھا کہ وہ رو رہی ہے اس نے رتو کو پھر چھیڑنا چاہا۔ "ارے ڈوپٹہ تو ڈال لیا کر دیکھتی نہیں قمیص کھلی ہے" اس مرتبہ رتو نے جواب دئے بغیر ڈوپٹہ کو سرکا کر اوڑھ لیا اور دوسری طرف مُنہ کر کے آنسو پونچھنے لگی۔ شریف پریشان ہو گیا اس نے ہات پکڑ کر زبردستی چارپائی پر بٹھا لیا "آؤ باتیں کریں۔ اس وقت کوئی نہیں ہے"۔

اگلے روز شریف حسب معمول امین الدولہ پارک کے سامنے یکہ لئے کھڑا تھا۔ دو گھنٹے گذر گئے کھڑے کھڑے بوہنی تک نہیں ہوئی۔ نہ جانے کیسا منحوس دن ہے۔ وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا اتنے میں ایک لڑکی اس کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آئی۔ شریف نے فوراً یکہ بڑھایا "مس صاحب یکہ چاہیے"۔ فوراً ہی ایک تانگہ وہ ادھر سے آ گیا اس نے للکارا "ابے مس صاحب کہیں یکہ میں جائیں گی۔ آئیے مس صاحب" اس نے گدی جھاڑتے ہوئے کہا۔ "تانگہ حاضر ہے ـــ کالج جائیں گی" شریف کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کوئی کالج کی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ بھلا کالج کی لڑکی اور یکہ میں بیٹھے ـــ لیکن اس لڑکی نے فوراً کہا۔ "تانگہ نہیں چاہیے ـــ یکہ میں جانا ہے" شریف کا دل بلیوں اچھل پڑا۔ کتنے دن بعد آج ایک لڑکی اس کے یکہ پر بیٹھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ اس کی گدی کتنی گندی ہے۔ اور سواریوں کے کہنے پر تو وہ ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا کہ حضور ابھی تو بدلی ہے ـــ لیکن اس وقت جھاڑتے ہوئے اس نے کہا "بیٹھئے مس صاحب! پر افسوس ہے کہ گدی بڑی گندی ہو رہی ہے۔

"کوئی حرج نہیں ـــ خاصی صاف تو ہے"۔ وہ جواب دیتے ہوئے بیٹھ گئی۔ ایک تھیلا اس کے ہات میں تھا کھدر کی ساری پہنے ہوئے تھی۔ شریف کچھ ایسا گھبرایا کہ اس نے کرایہ تک نہیں طے کیا اور چل پڑا۔

"کہئے مس صاحب کالج لے چلوں ـــ"

"نہیں بنارسی باغ"

"تو آپ کالج میں نہیں پڑھتیں ـــ اس سے خاموش نہیں رہا گیا۔

نہیں ـــ میں نے پچھلے سال پڑھنا چھوڑ دیا۔ اب مزدوروں اور کسانوں کی پارٹی میں کام کرتی ہوں"

"مزدوروں اور کسانوں کی پارٹی میں۔ شریف نے دل ہی دل میں سوچا۔ اس نے پہلے بھی اس کا ذکر سنا ہے۔ ان کے لال جھنڈے والے جلوس بھی دیکھے ہیں۔ ایک مرتبہ جب ان پر پولیس نے لاٹھی چارج کی تھی۔

"وہی لال جھنڈے والی پارٹی نا" اس نے پوچھا۔

"ہاں ـــ وہی"۔

"تو اس میں آپ جلوس نکالتی ہیں۔ بہت سے آدمی ہوں گے آپ کی پارٹی میں"۔

"ہاں بہت سے آدمی ہیں۔ آجکل ہم لوگ ہندو مسلمانوں کے میل جول کے سلسلہ میں کام کر رہے ہیں۔ "جنتا" کو بتا رہے ہیں ـــ 'جنتا' سمجھتے ہو نا"۔

"جی ہاں ـــ جی ہاں ـــ لوگوں کو" شریف نے تیزی سے جواب دیا "ہاں تو ہم لوگوں کو بتاتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کو ایک ہونے سے کیا فائدہ ہوگا"۔

"کیا فائدہ ہوگا اس نے فوراً پوچھا"۔

"دیکھو بھائی تم نے سنا ہوگا کہ گاندھی جی اور جناح صاحب بات چیت کر رہے ہیں۔ ہندو مسلمانوں کی صلح کے لئے اگر وہ صلح کر لیتے ہیں تو پھر جانتے ہو کیا ہوگا ـــ ہندوستان آزاد ـــ (باقی)

تبصرے

اسلامی نظام مصنفہ حکیم محمد اسحٰق۔ سندھ صفوی۔ حجم ایک سو چار صفحات قیمت عہ/ ملنے کا پتہ۔ دارالاشاعت نشاۃ ثانیہ جدید ستے پلی۔ حیدر آباد دکن۔

مغرب اور مشرق کے اس اتحاد اور تصادم کے دور میں تجدیدیت یعنی (Revivalism) کے میلانات کا پیدا ہونا بالکل ایک فطری امر ہے۔ اس تجدیدیت کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے یہ معنی ہونگے موجودہ حالات اور تقاضوں کے مطابق عہد قدیم کے نظریوں اور فلسفوں کے نئے معنی و مفہوم پیش کرنا۔ چنانچہ اس عہد میں ہندوستان کے مسلمانوں میں کچھ ایسے سیاسی مفکرین کا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو اس انقلابی عہد کے سماجی اور معاشی تحریکوں اور عوامی تقاضوں کے مطابق اسلام کے نئے معنی و مفہوم پیش کر رہا ہے۔ چونکہ دنیا کی ساری مذہبی کتابوں (Scriptures) کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ اس کے خیال و الفاظ میں عمومیت ہوتی ہے اس لئے ایسا کرنا بھی آسان ہے۔ زیر نظر تصنیف اسی رجحان کا ایک نمونہ ہے اور بس۔

اس قسم کی کتابوں کا خارجی اور غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا جائے تو پڑھنے والا مصنف کے عقائد اور نظریوں سے اتنا متاثر نہیں ہوتا جتنا اس بات سے کہ یہ عہد اتنا انقلاب آفریں ہے، اشتراکیت کے تقاضے اتنے شدید ہیں، عوام پرانے خیال اور سماجی نظاموں کو کچھ اس طرح نیست و نابود کرنے پر تلے ہیں کہ مذہب پرست بھی اپنے نظریوں اور فلسفوں کے معنی و مفہوم کو بدلنے پر مجبور ہیں۔

پوری کتاب میں استدلال اور منطق کم اور پہلے بنائے اور پہلے سے فرض کردہ عقائد کا ہجوم زیادہ ہے۔ پہلے عقیدے اور یقین کا اظہار کر دیا گیا ہے۔ اور بعد میں اس کو صحیح ثابت کرنے کے لئے منطق سے مدد لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ اس تصنیف کو کسی حالت سے بھی سائنٹفک نہیں قرار دیا جا سکتا۔ سائنٹفک انداز کا تقاضا یہ ہے کہ منطق اور استدلال کے بطن سے نظریے پیدا ہوں نہ کہ پہلے ہی کسی نظریے کا اعلان کر دیا جائے اور اُسے ثابت کرنے کے لئے بعد میں منطق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جائے۔

پریشان جلوے مرتبہ حیات ترین، حجم دو سو چالیس صفحات دیدہ زیب گردپوش۔ قیمت دو روپے بارہ آنے ملنے کا پتہ عباسیہ اکاڈمی بغداد الجدید، ریاست بہاولپور۔

ریاست بہاولپور کے جواں سال و جواں فکر افسانہ نگاروں اور شاعروں کے بارہ افسانوں اور انیس نظموں کا مجموعہ۔ شروع میں سر عبدالقادر صاحب کا تعارف شامل ہے۔ اور آخر میں محمود خمسی صاحب نے مجموعے میں شامل تمام ادیبوں اور شاعروں کی خبر لی ہے

افسانہ نگاروں میں احمد ندیم قاسمی اور شفیق الرحمان کے نام کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ باقی تمام افسانے بھی حالیہ ادبی و فکری رجحانات کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ان کا موضوع وہی ہے جو عموماً اردو ادب کے موجودہ دور میں ہوتا ہے۔ بھوک، سرمایہ داری، سامراج، مزدور۔ جنسی خواہش۔ تکنیک وہی ہے جو پریم چند کے بعد اردو میں رائج ہوئی۔ یعنی بعض میں خارجی سماجی تجزیہ اور بعض میں داخلی اور نفسیاتی تجزیہ۔

نظموں میں غزل رومانی، نظم، تحت الشعوری آزاد نظم سبھی قسم کی نظمیں موجود ہیں۔ جو ماضی و حال و مستقبل کے میلانات و رجحانات پیش کرتی ہیں۔

کسی دیسی ریاست میں اتنے اچھے اور ترقی پسند بلکہ انقلاب پسند ادیبوں کی موجودگی یقیناً قابل ستایش ہے۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ عہد متوسط کے جاگیرداری فیوڈل نظام کی یہ یادگار یعنی ہندوستان کی ریاستیں اب اپنی زندگی کے آخری دن گذار رہی ہیں۔ اس لئے کہ خود انھیں کے بطن سے انقلاب و ترقی کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں ہم مرتب صاحب کو اس لحاظ سے قابل ستایش و مبارکباد سمجھتے ہیں۔

اسلام اور سود مصنفہ جناب ڈاکٹر انور اقبال قریشی۔ ایم۔ اے ایم۔ ایس۔ سی (اقتصادیات) لنڈن۔ پی۔ ایچ ڈی۔ (ڈبلن) حجم دوسوچالیس صفحات۔ قیمت تین روپئے۔ ملنے کا پتہ۔ ادارہ معاشیات فاطمہ منزل، حمایت نگر حیدرآباد۔ دکن۔

کتاب کے متعلق مصنف کے الفاظ یہ ہیں:۔ "اس مقالے کے شروع میں میں نے ابتدائی زمانے سے آج تک سود کے جو مختلف نظریے پیش کئے گئے ہیں اُن کا تذکرہ کیا ہے۔ اور ساتھ ساتھ ہر نظریئے کے نقائص واضح کرنے کی کوشش کی ہے، دوسرے باب میں اسلام کا نظریہ سود پیش کرتے ہوئے میں نے یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ اسلامی نظریہ اس موضوع سے متعلق دوسرے تمام معلومہ اور موجودہ نظریوں سے بہتر ہے۔"

شروع میں مولانا احسن گیلانی صدر شعبۂ دینیات حیدرآباد یونیورسٹی کا مقدمہ شامل ہے۔

ترسول مصنفہ جناب نورالحسن صاحب بی۔ اے (علیگ)۔ بی۔ ٹی۔ ڈپ۔ ایڈ۔ (گلاسکو) حجم ۲۳۶ صفحات قیمت سکہ عثمانیہ مجلد عہ انگریزی عہ ملنے کا پتہ حیدرآباد بک ڈپو محاذی اسٹیٹ بینک حیدرآباد دکن۔

آٹھ افسانوں کا مجموعہ۔ آٹھوں افسانے دلچسپ، مفید اور کارآمد ہیں۔ ٹکنیک کے لحاظ سے یہ افسانے حالیہ رجحانات کی نمایندگی نہیں کرتے لیکن یہ کیا کم ہے کہ مصنف نے اسی سلسلہ میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے محض اپنے خلوص کے زور پہ افسانوں کو اتنا دلچسپ بنا دیا ہے۔ موضوعات عام زندگی سے ماخوذ ہیں۔ جن میں عشق و محبت، حیات و موت، مفلسی و دولت، رنج وغم سبھی شامل ہیں۔ اس وقت جب کہ اردو ادب میں افسانوی ادب کی تخلیق تجارتی اعتبار سے اور سیاسی و سماجی پروپگنڈا کے لحاظ سے بھی اس قدر مفید ہے اور اس کی مقدار روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ زیر بحث تصنیف یقیناً نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔

سوویت یونین کی قومیں مصنفہ ادھیکاری، مترجمہ احمد حسین۔ حجم اسٹھ صفحات۔ قیمت ۴ار ملنے کا پتہ۔ قومی دارالاشاعت بمبئی نمبر ۴۔

جنگ ختم ہو چکی ہے اور اس وقت جو خیال ہمارے ذہن میں سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ کس طرح بین الاقوامی امن و امان قائم کیا جا سکے اور قائم رکھا جائے۔ اسی سوال کو یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ قوموں کے آپس کے اختلافات اور اسباب نزاع کا کس طرح قلع قمع کیا جائے۔ یہ سوال بین الاقوامی تنظیم کا بنیادی سوال ہے۔ زیر بحث کتاب کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قومی منافرت اور دشمنی کے اس عہد میں دنیا کا ۱/۶ حصہ ایسا ہے جہاں کی بسنے والی تمام قوموں کے آپس کے اختلافات اور منافرت ختم ہو گئی ہے اور وہاں کی تمام قومیں زبان تہذیب، اور تاریخی اعتبار سے مختلف ہوتے ہوئے بھی تعاون اور اشتراک عمل کی پُر امن آغوش میں ترقی کے منازل طے کر رہی ہیں۔ گذشتہ جنگ میں اُن کے باہمی اتحاد کی حیرت انگیز مثال نے ساری دُنیا کو بحر حیرت میں غرق کر دیا جو دنیا کے ۱/۶ حصے یعنی سوویت یونین کے علاقے میں یہ بین الاقوامی امن وسکون کیوں قائم ہے اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں کے عوام مزدوروں اور کسانوں نے ایک طرف تو اپنے اپنے ملک میں سرمایہ داری، زمینداری اور ذاتی ملکیت کا خاتمہ کر دیا اور دوسرے وہاں کی مزدور اور کسان حکومت نے تمام مختلف قوموں کو اپنی اپنی خواہش کے مطابق یونین میں شامل رہنے یا اُس سے علیحدہ ہو جانے کا اختیار دیدیا۔ یہ وہ بنیادی اسباب تھے جن کی بنا پر آج وہاں بین الاقوامی جنگوں اور اختلافات کا خاتمہ ہو گیا ہے۔

زیر بحث تصنیف زار شاہی زمانے کے سامراجی نظام اور موجودہ اشتراکی نظام کا موازنہ و مقابلہ کرتی ہوئی موجودہ صورت حال کی مکمل تفسیر وتشریح پیش کرتی ہے۔ ترجمہ بہت شستہ، صاف اور سلیس ہے۔ ط۔ ا۔ خ


پروڈیوسر
جاگرتی پکچرس کی
ڈائریکٹر
مسٹر بھگوان
MAGRITI PICTURES
رہبرانہ پیشکش؟
نغمۂ صحرا
موسیقی
سی رامچندر
احسن رضوی
دانا پوری
(۱) نغمۂ صحرا ثابت کر رہا ہے کہ استاد ازلی کی صحرائی مخلوق کی حسین و پاک دلچسپیوں میں حیات کا ملہ پنہاں ہے
(۲) نغمۂ صحرا ثابت کر رہا ہے کہ مشقت و جانفشانی کے پردوں میں حقیقی عیش و عشرت کے خزانے مستور ہیں
(۳) نغمۂ صحرا ثابت کر رہا ہے کہ قوت کا حسین سنگھار بھی قربانی میں ہے جہاں حسن کی شعلہ باریاں بھی
مہر و ماہ بن جانے پر مجبور ہیں
تمثیل نگار
خورشید جونیئر۔ کویتا دیوی
شانتا پٹیل اور حسین چہرے
اداکار
ماسٹر وٹھل۔ مسٹر بھگوان۔ امرناتھ۔
وسنت، بھگوانداس
نے حصہ لیا ہے
دیکھئے
شیریں نغمے — مسحور کن رقص — بصارت نواز مناظر — دلکش اداکاری
کے ساتھ ہی ادب، آرٹ، موسیقی اور زندگی کے ٹھوس حقائق سے لبریز یہ فلم بہت جلد آپ کے شہر کے حسین سینما
کی زینت بن رہی ہے جسے دیکھنے کے بعد آپ ایک نئی دنیا آباد کرنے پر مجبور ہوں گے
تفصیلات کے لئے
جاگرتی پکچر بمبئی نمبر ۱۴ سے کیجئے
بمبئی

اقبال اکیڈمی کی تازہ ترین اور مقبول ترین تصانیف

تعلیم کا مسئلہ: عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے مایۂ ناز پروفیسر ڈاکٹر محمد رضی الدین صاحب صدیقی ایم۔ اے، پی، ایچ ڈی نے پوری وضاحت کے ساتھ ہماری تعلیمی ضروریات پر بحث کی ہے اور مستقبل کے لئے ایک نظامِ تعلیم کا مشورہ دیا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف اساتذہ اور طلبہ کو مفید ثابت ہوگا بلکہ ہر لکھے پڑھے کے خیالات میں انقلابِ عظیم پیدا کرے گا۔ قیمت عہ

ھندوستانی مسلمان: انگریزوں نے جب مسلمانوں سے حکومت لی تو یہاں کیا کیا نئے قوانین جاری کئے اور کس طرح مسلمانوں کی تعلیمی، سیاسی اور اخلاقی حالت کو کمزور کیا۔ اگر آپ اسکی تفصیل دیکھنا چاہیں تو ولیم ہنٹر آئی سی ایس کی کتاب کا مطالعہ کیجئے اور جو پہلی مرتبہ اردو میں ترجمہ ہو کر چھپی ہے قیمت ۱۲/عہ

کالا پانی: سید احمد بریلویؒ کی جماعتِ مجاہدین کے ایک سرگرم رکن مولوی محمد جعفری تھانیسری کی آپ بیتی۔ وہ کس طرح گرفتار ہوئے۔ کالے پانی میں ان کی عمر کس طرح گزری اور انگریزوں نے وہابیت کا ہوّا کس طرح بھیانک شکل میں ہندوستانیوں کو دکھایا اور مسلمانوں کو کچلنے کے لئے کیا طور طریقے استعمال کئے اس کی پوری تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ کیجئے۔ قیمت ایک روپیہ۔

تقویۃ الایمان: حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی مشہور کتاب تقویۃ الایمان کا ایک نہایت خوبصورت، بہترین اور صحیح ترین ایڈیشن پہلی بار پورے اہتمام کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ جن لوگوں کے پاس اس کتاب کا کوئی ایڈیشن موجود ہے اُن کو بھی یہ نادر نسخہ حاصل کرنا چاہئے۔ اس کتاب کے شروع میں مولانا کے ذاتی حالات اور آخر میں ان کا ایک غیر مطبوعہ مقالہ "یک روزہ" بھی شامل ہے۔ ان تمام خصوصیات نے اس کتاب کو لاثانی بنا دیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

سیرت سیدہ فاطمہ: جناب سیدہ فاطمۃ الزہراء بنت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک سیرت اور پاک زندگی کے حالات، مردوں، عورتوں، بہنوں اور بچوں سب کے لئے سبق آموز ہیں۔ یہ کتاب اتنی مفید اور بلند پایہ ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ قیمت دو روپے بارہ آنہ

کتب سماوی پر ایک نظر: تورات و انجیل کی تاریخ حیات اور اُن کی تعلیمات کا قرآن پاک کی تاریخ اور ان کی تعلیمات سے موازنہ۔ اردو زبان میں یہ پہلی تحقیقی تصنیف ہے جو یورپ کے اصول تحقیق پر لکھی گئی ہے۔ قرآن پاک کے ہر ماننے والے کو اس کتاب کا مطالعہ لازمی ہے۔ قیمت دو روپے بارہ آنے۔

مندرجہ بالا کتب کے علاوہ ہمارے پاس علامہ اقبال کی جملہ تصانیف موجود ہیں اور علامہ کے متعلق جو کتب ادھر اُدھر شائع ہوئی ہیں وہ اکثر و بیشتر موجود ہیں
اگر آپ اسلامی اور سیاسی لٹریچر کا مطالعہ کرنا چاہیں تو ہماری خدمات سے فائدہ اٹھائیں

منیجر اقبال اکیڈمی 54 (الف) سرکلر روڈ بیرون موچی گیٹ لاہور

میری دُکھ بھری داستان

کسی ایک بیماری کا علاج جب ڈاکٹر لوگ نہیں کرسکتے تو اسکولا علاج قرار دیتے ہیں۔ مگر پرانے زمانے میں سنیاسی تنگ و تاریک جنگلوں میں رہنے والے بزرگوں کی اندر رفوزدہ گدڑی کی طاقت کہتے تھے ایک کرشمے ایسے ہیں کہ ایک دفعہ تو مردہ بھی اُٹھایا جاسکتا ہے۔ گو زمانہ بدل چکا ہے لیکن پھر بھی ہندوستان کا نام روشن کرنیوالے سنیاسی موجود ہیں۔ اب میری کہانی سنئے کم عمری کی بُری صحبت کا شکار ہوکر طرح طرح کی بیماریوں میں پھنسکر بیحد کمزور ہوگیا۔ جسم کھوکھلا۔ چہرہ زرد پڑگیا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئیں۔ دل دھڑکنا۔ سر چکرانا وغیرہ سے تنگ آکر مایوس ہوگیا۔ مشہور مشہور ڈاکٹروں اور اشتہاری دوائیوں پر صحت کے لئے دھن برباد کرکے زندگی سے مایوس ہو بیٹھا۔ میری خوش قسمتی کہ مجھے سرینگر جانا پڑا۔ انہی دنوں میں وہاں ایک عرس تھا میں بھی وہاں چلا گیا۔ وہاں ہر سال ہزاروں فقیر زیارت کو آتے ہیں۔ ایک دن شام کو سیر کرتا ہوا ایک پہاڑی کے کنارے جانکلا۔ سردی بڑھ گئی۔ میں نے واپس آنا چاہا جو دیکھا تو ایک درویش فقیر پہاڑی سے میری طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے چہرے پر جلال تھا۔ جب میرے نزدیک آگئے تو مجھے سردی سے کانپتا دیکھ کر پوچھا۔ بیٹا کیا سردی زیادہ لگتی ہے پہلے تو میں ڈرا۔ پھر حوصلہ کرکے دھیمی آواز میں کہا جی ہاں۔ سمجھ گئے کہا کہ انہوں نے سبز رنگ کی ایک بوٹی کھانے کو دی۔ پیارے ناظرین! اس خدائے واحد لاشریک کو حاضر و ناظر جان کر سچ کہتا ہوں کہ ایک منٹ نہ گزرا تھا کہ میرا جسم آگ کی طرح گرم ہوگیا۔ اس معجزہ کو دیکھکر میں نے فقیر کے پاؤں پکڑلئے اور میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ انہوں نے ہمدردی سے پوچھا۔ بیٹا! شام کے وقت جنگل میں اکیلا اور رونے کا سبب؟ میں نے تمام دکھ بھری کہانی سچ سچ کہدی۔ اس فقیر نے مجھے حوصلہ دیا اور مجھ کو اپنے مقام رہائش پر جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے لیگئے اور کہا کہ اگر تم سچے دل سے عہد کرو کہ اسکے بعد لوگوں کی بھلائی کروگے تب تمہارا بھلا ہوسکتا ہے میں نے ہاتھ جوڑکے سچے دل سے اقرار کیا۔ اس پر پیر فقیر نے دو نسخے لکھ دئے اور کہا کہ اب جاؤ بیٹا اور بے فکر ہوکر جیسے دکھیوں کا بھلا کرو۔ ناظرین! یقین کریں کہ مجھ کو اس فقیر کی اچانک ملاقات سے اس قدر حوصلہ ہوا کہ خود بخود میرے اندر جوش پیدا ہوگیا میں نے واپس آکر فقیر کے کہنے کے مطابق دونوں دوائیاں تیار کرکے استعمال کرنی شروع کردیں جسطرح میرا یقین تھا۔ اسکی پہلی خوراک نے اپنا کرشمہ دکھانا شروع کردیا۔ آپ یقین کریں کہ پانچ چھ دن کے بعد ہی میری کایا پلٹ ہوگئی۔ سب تکلیفیں دور ہوکر بجلی کی طرح طاقت اور جوش پیدا ہوگیا اور میں اپنے آپ کو قابل فخر محسوس کرنے لگا۔ بحکم مرشد پندرہ دن تک دوائی جاری رکھی۔ دودھ مکھن گھی خوب ہضم ہونے لگا۔ زیادہ کھانا معمول ہے۔ گیارہ سال ہوچکے ہیں آجتک کسی دوا کی ضرورت نہیں پڑی۔ خدا کی مہربانی سے تین تندرست اور خوبصورت فرزند میرے گھر میں ہیں۔ سیکڑوں کی مرادیں پوری ہوچکیں۔ سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکل سکتا ہے لیکن اس دوائی کا اثر خالی جاتا نہیں دیکھا۔ اسی دن سے مرشد کے ہاتھ کے کئے ہوئے وعدے اور دنیا کی بھلائی کے لئے اس دوائی کا شہرہ گھر گھر کررہا ہوں۔ اس لئے ہر قسم کی کمزوری۔ پیشاب میں شکر آنا۔ کمزوری سے پیدا ہونے والے تمام امراض بجلی کی طرح دور ہوکر سچی طاقت اور جوش پیدا ہوتا ہے۔ دوائی میں کسی قسم کی مضر صحت یا نقصان والی چیز نہیں ہے۔ ہر موسم میں کھانے کے لائق ہے۔ کیا جوان، کیا بوڑھے سب فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ تندرست بھی استعمال کرسکتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ اس دوائی کے بعد عمر بھر کسی دوائی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ **قیمت** ہر دو ادویات رائے پندرہ یوم جو کہ صحت کے لئے کافی ہے صرف چار روپئے آٹھ آنے (۴/۸) چونکہ مجھ کو اس کایا پلٹ دوائی نے موت کے منہ سے بچایا ہے اس لئے اپنا ایمان سمجھ کر اسکی اشاعت کررہا ہوں اور قیمت صرف خرچہ اور لاگت کے برابر رکھی گئی ہے۔

ضروری گذارش } شکی مزاج اصحاب میری دوا نہ طلب کریں۔ جو شخص ہر چیز کو بے یقینی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ موقع پر ہیرے کو پتھر سمجھ کر کھو بیٹھتا ہے۔ جسکو اس دوا سے فائدہ نہ ہو وہ ایمان کو جان کر قیمت واپس منگوائے اور ساتھ ہی آپ کا ایمان بھی ہے اگر دوا تحریر سے بڑھ کر نکلے تو اس فقیر کے پیغام کی خبر گھر گھر پہنچادیں۔

شرطیہ علاج اور وعدہ } ہندو کو دھرم کی اور مسلمان کو ایمان کی قسم ہے کہ اگر میری دوائی کے استعمال سے حسب وعدہ فائدہ نہ ہو تو حلفی تحریر بھیج کر قیمت واپس منگالیں۔ عدم صحت میں کسی کا پیسہ رکھنا گناہ سمجھتا ہوں۔

پتہ :- صوفی ایم۔ اے خان۔ پوسٹ بکس نمبر 261 N.G.A لاہور



آئینہ سکندری
عرف
ترکال درشی شیشہ

کہتے ہیں کہ سکندر بادشاہ کے پاس ایک آلہ تھا جس سے وہ دنیا کے سب آنے والے واقعات کو دیکھا کرتا تھا۔ لیکن اب نہ وہ سکندر رہے۔ نہ وہ آلہ۔ اب اس دور جدید میں چشم مشتاق ایک ایسی چیز کو دیکھ رہی ہے جس کا نام ترکال درشی شیشہ ہے جس کی بدولت لوگ بے جان ہڈیوں کے پنجر میں روح پھونک کر اس سے بات چیت کر لیتے تھے۔ ہم نے اس عجیب و غریب نئے اصول جدت پر حیرت انگیز کمال کا پیدا کیا ہے جس کی مدد سے آپ ہر قسم کے طلسمی سوالات جواب بڑی آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں۔ مثلاً گم شدہ کا پتہ چلانا اس دنیا اور دوسری دنیا کے عجائبات تقدیر بروز گار۔ اور حیات و ممات کے متعلق سوالات پوچھنا۔ کیا ہمارا بیمار اچھا ہو جائے گا۔ اور میری آئندہ زندگی کیسے بسر ہوگی۔ مجھے کس قسم ت ملے گی۔ دفینہ معلوم کرنا۔ پردیس گئے ہوئے کا پتہ لگانا کیا تلاش روزگار کے لئے مجھے پردیس جانا پڑے گا۔ فلاں آدمی کیسا ہے۔ اس پر اعتبار کرنا چاہئے۔ میری تقدیر میں کیا لکھا ہے۔ مجھے مقدمہ میں کامیابی ہوگی۔ میرے خواب کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ میرا آج دن گذرے گا۔ وغیرہ وغیرہ اس قسم کے سینکڑوں سوالوں کے جواب اس طلسمی شیشے سے دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ نیز ماضی، حال و مستقبل کے حالات۔ کسی مشکل کے حل ہونے یا نہ ہونے کا انکشاف۔ ارزانی و قحط کے آثار قبل از شروع سال معلوم ہو سکتے ہیں۔ مردہ لوگوں بلکہ تمام عزیزوں اور دوستوں کی روحوں سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ جو کہ مر چکے ہیں۔ بھوت پریت آسیب و جن بھی اگر گھر میں موجود ہوں تو وہ دفع کئے جا سکتے ہیں۔ افلاس و پریشانی دفع ہونے کی تدبیریں بھی ملیں گی۔ حب و بغض مشکل کاموں میں کامیابی ہو سکتی ہے۔

جس عورت یا مرد کو کبھی نہ دیکھا ہو وہ اس آئینہ میں جلوہ گر ہوگا۔ ہر شخص کے سربستہ راز خفیہ پوچھو۔ بزرگان سلف سے باتیں کر لو۔

ہر قسم کے مرض کی تشخیص و نسخہ لکھنا بھی ممکن ہوگا وغیرہ وغیرہ جو چاہو دریافت کر لو۔ اصلی ترکال درشی شیشہ سوائے ہمارے کارخانہ یا بھر میں کسی اور جگہ سے آپ کو نہ مل سکے گا۔ ایک کا خریدا ہوا عمر بھر کام دے گا۔

ترکال درشی آئینہ واقعی بڑے کام کی چیز ہے۔ نوٹ:۔ اس شیشہ سے عورت مرد دونوں یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ باوجود بہت محنت ترکال درشی آئینہ فی عدد صرف تین روپئے (۳ر)

مینجر موہنی بھنڈار رجسٹرڈ۔ (N.G.A.) دہلی

دی مغل لائن لمیٹڈ

حج سروس - کراچی تا جدہ

گورنمنٹ آف انڈیا کے اعلان کے مطابق جو کہ ۲۶ جولائی یا اس کے بعد انگریزی و ہندوستانی زبان کے مخصوص

اخباروں میں شائع ہو چکا ہے

حاجیوں کے جہاز کی روانگی از کراچی تا جدہ

شرح ٹکٹ درجہ اوّل: - کرایہ آمد و رفت از کراچی تا جدہ مع طعام ۹۰۰ روپے

اس میں مندرجہ ذیل رقمیں شامل نہیں ہیں۔

۱۔ جدہ میں صفائی کے انتظام کی فیس۔

۲۔ ساحلی کشتیوں کا کرایہ۔

۳۔ کامراں میں کپڑوں اور مال و اسباب کی جراثیم سوز صفائی کی فیس۔

ڈک: - کرایہ آمد و رفت از کراچی تا جدہ مع طعام ۲۵۰ روپے

اس میں مندرجہ ذیل رقمیں شامل نہیں ہیں۔

۱۔ جدہ میں صفائی کے انتظام کی فیس

۲۔ ساحلی کشتیوں کا کرایہ

۳۔ کامراں میں کپڑوں اور مال و اسباب کی جراثیم سوز صفائی کی فیس

مزید معلومات کے لئے حج بکنگ آفیسر کامن ویلتھ ریلیشنس ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا نئی دہلی سے خط و کتابت کیجئے

کراچی ایجنٹ: -

گرھامس ٹریڈنگ کمپنی (انڈیا) لمیٹڈ

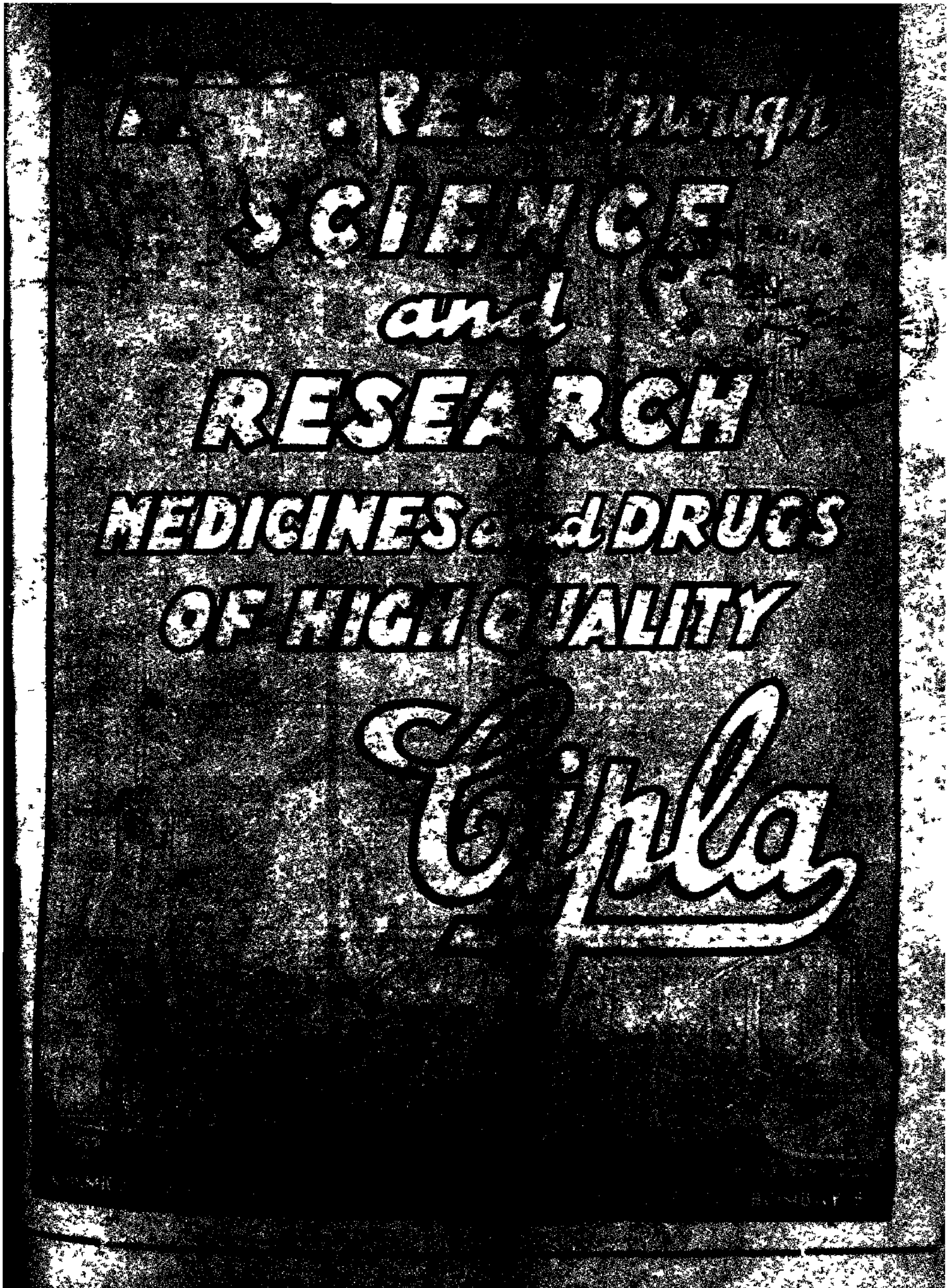
میکلوڈ روڈ کراچی

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶ بنک اسٹریٹ

بمبئی


اپنے اور اپنے ملک کے
مستقبل کی خاطر
ایثار کیجئے
آپ فضول خرچی سے جب کبھی اور جس قدر بھی پرہیز کریں گے اسیقدر قیمتیں کم ہونگی جس میں سب کا بھلا ہے، اور غریبوں کیلئے زیادہ سامان مہیا ہوسکے گا۔ آجکل کفایت شعاری اور سادگی پسندی ہی کی قدر اور وقعت ہے۔ یہ حُبِ وطن کا ثبوت ہے۔ پرانی مرمت کی ہوئی یا پیوندلگی ہوئی چیزیں استعمال کرنا اپنی شان کے خلاف نہ سمجھئے۔
پرانی قمیضوں کو درست کر لیجئے۔
پھٹے ہوئے کفوں کو الٹ دیجئے۔
جب تک قیمتیں چڑھی ہوئی ہیں جائیداد مت خریدئیے۔
پھولوں کی جگہ ترکاریاں اگائیے۔
پرانے برتنوں کی مرمت کروا کر کام میں لائیے۔
پرانے بلیڈ تیز کر کے ان سے
بنائیے
فالتو کمرے
کرائے پر اٹھا کر بچت کیجئے۔
کفایت شعاری سے قلتوں کو دفع کیجئے
اشد ضرورت کے بغیر کچھ نہ خریدئیے
حکومت ہند کے محکمہ انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ نے شائع کیا


SCIENCE
and
RESEARCH
MEDICINES and DRUGS
OF HIGH QUALITY
Cipla

NAI ZINDAGI

نئی زندگی

ALLAHABAD


کفایت شعاری کے دشمن

اردو زبان کا واحد مکمل سیاسی رسالہ

نئی زندگی

بانی:- ڈاکٹر سید محمود
سرپرست:- ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید
ایڈیٹر:- سید انیس الدین
جوائنٹ ایڈیٹر:- طفیل احمد خاں ایم اے

جلد ۵ | ماہ نومبر سنہ ۱۹۴۵ء | نمبر

فہرست مضامین

۱	فکر و نظر (پاکستان کی اقتصادیات)	ایڈیٹر	۳
۲	رفتار عالم	طفیل احمد خاں ایم-اے	۷
۳	فرقہ وارانہ اتحاد کے لئے تہذیبی بنیاد	ڈاکٹر سید محمود	۱۷
۴	ہندوستان اور اسلام	اے-ام-حبیب اللہ	۲۱
۵	نئے ہندوستان کی خارجی پالیسی کیا ہوگی	پرنسپل بھتیجا ایم-اے آئی-ای-ایس	۲۶
۶	گاندھی جی اور مزاح	ڈاکٹر امیا چکرورتی ایم-اے ڈی فل (آکسفورڈ)	۳۱
۷	ہندوستان میں فضائی نقل و حرکت کا مستقبل	مسٹر کے-کے-رائے ایم ایس سی آئی آر اے ای ایس	۳۸
۸	ہندوستان کا تعلیمی نظام اور ترقی کے امکانات	مسٹر سارجنٹ کی اسکیم	۴۰
۹	منصوبہ بندی اور مسئلہ آبادیات	ایل-ایچ-ورما	۴۴
۱۰	اخبارات کی رائیں	ادارہ	۴۷
۱۱	تبصرہ	ط-ا-خ	۵۱
۱۲	اشتہارات	... ...	...

سالانہ چندہ پانچ روپئے | ششماہی:- تین روپئے | فی پرچہ:- آٹھ آنے

مسٹر سید انیس الدین احمد رضوی پرنٹر و پبلشر نے اسرار کریمی پریس حسین گنج الہ آباد میں چھپوا کر دفتر رسالہ نئی زندگی الہ آباد سے شائع کیا

فکر و نظر

پاکستان کی اقتصادیات

ان دنوں ہمارے ملک میں تحریک پاکستان کا بڑا چرچا ہے اور پریس اور پلیٹ فارم سے بڑے شد و مد سے اسکا پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے اور جیوں جیوں الیکشن قریب آتا جاتا ہے اسکی رفتار تیز ہوتی جا رہی ہے لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جنھوں نے اس کے ہر ایک پہلو پر علمی اور عملی حیثیت سے غور کیا ہو اور اس کے بعد اپنی رائے قائم کی ہو۔ اور یہی سبب ہے کہ لاہور ریزولیوشن پاس کرنے کے ۶ سال بعد بھی آج تک اس کی کوئی تعریف نہ کی گئی، اور کوئی یہ نہیں بتلا سکتا کہ پاکستان ہے کیا؟ تحریک پاکستان کے تمام پہلوؤں پر اس مختصر مضمون میں روشنی ڈالنا محال ہے لہذا ہم یہاں پاکستان کے سب سے اہم پہلو یعنی اسکی اقتصادی حالت پر ایک مختصر سی بحث کریں گے۔

پاکستانی صوبوں کی مالی بدحالی

مطالبہ پاکستان کی سب سے بڑی کمزوری شمالی و مغربی صوبوں کی مالی بدحالی ہے۔ پاکستان میں شامل ہونے والے چار صوبوں یعنی پنجاب سندھ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں موخر الذکر تین صوبے تو ایسے ہیں جو اپنی صوبائی حکومت کے اخراجات بھی برداشت نہیں کر سکتے اور انھیں اپنا کاروبار حکومت چلانے کے لئے مرکزی حکومت کا دست نگر رہنا پڑتا ہے۔ صوبہ سندھ کو حکومت ہند سے ایک کروڑ پانچ لاکھ سالانہ کی امداد ملتی ہے اور صوبۂ سرحد کو ایک کروڑ روپیہ سالانہ۔ سندھ جیسے عظیم الشان صوبے کا اتنے عرصے تک بمبئی کے ساتھ ملحق رہنے کا سبب اس کی مالی کمزوری کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس طرح صوبہ سرحد کو اصلاحات دئے جانے کے خلاف بھی یہی دلیل پیش کی جاتی تھی کہ وہ دوسرے صوبوں کی طرح ایک گورنری صوبے کے اخراجات کا بار برداشت نہ کر سکے گا۔ پھر بلوچستان کو دیکھئے تو اس کی حالت اور بھی بدتر ہے۔ بلوچستان کے متعلق اگر یہ کہا جائے تو بالکل مبالغہ نہ ہوگا کہ اس کے تمام تر اخراجات مرکزی حکومت ہی کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

غرضیکہ پاکستان کے چار صوبوں میں تین کی یہ حالت ہے اب باقی رہ جاتا ہے پنجاب جسکی آمدنی تقریباً گیارہ کروڑ روپیہ سالانہ ہے لیکن یہ رقم محض صوبے کی حکومت کے اخراجات کی کفالت مشکل سے کرتی ہے۔ پنجاب کی مالی حالت کا اس امر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حکومت پنجاب مشکل سے بیس پچیس لاکھ روپئے کی رقم سالانہ تعلیم پر خرچ کر پاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ پنجاب اپنے صوبے کا خرچ چلانے کے علاوہ کسی دوسرے پڑوسی صوبے کی کسی طرح اعانت نہیں کر سکتا۔

"پاکستان" کے اخراجات

لیکن سوال یہ ہے کہ علٰحدگی کے بعد ان سندھ بلوچستان اور صوبہ سرحد کے دیوالیہ صوبوں کا خسارہ کون پورا کریگا۔ اگر اتر پچھم کے چاروں مسلم صوبوں کی مجموعی آمدنی کا تخمینہ کیا جائے تو وہ کسی طرح ۱۶-۱۷ کروڑ سے نہیں بڑھتی اور ظاہر ہے کہ جب یہ رقم ان چار صوبوں کی حکومت چلانے ہی کے لئے کافی نہیں تو ہندوستان سے علٰحدگی کے بعد یا "پاکستان" کی مرکزی حکومت کے اخراجات کہاں سے آئیں گے۔

"پاکستان" کے مصنفین اس سوال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اس وقت ان چار مسلم صوبوں سے حکومت ہند کو مرکزی صیغوں سے جو چنگی نمک انکم ٹیکس وغیرہ کی ۲۳-۲۴ کروڑ روپیہ سالانہ کی آمدنی ہے وہی پاکستان کے اخراجات کے لئے استعمال کی جائے گی لیکن

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کسی نہ کسی شکل میں ہندوستان کے ساتھ رہے گا یا ہندوستان سے باہر رہے گا اور پاکستان اپنی مدافعت (DEFENCE) کا انتظام ہندوستان سے مشترک ہو کر رکھیگا یا علیحدہ ہو کر۔ اگر پاکستان کوئی اپنی الگ فوج نہ رکھیگا اور وہ ہندوستان سے مل کر ہی اپنی دفاع کا نظم کریگا تو پھر پاکستان کو فوجی محافظت کے لئے اپنا کوٹا "مرکز" کو دینا ہی پڑے گا جو ہرگز اس سے کم نہ ہوگا جو یہ صوبے موجودہ صورت حال میں مرکز کو دے رہے ہیں۔ کیونکہ "آزاد ہندوستان" کی اس وقت سے کہیں زیادہ فوجی طاقت رکھنی پڑے گی۔

اب اس مسئلے کے دوسرے پہلو کو ملاحظہ فرمائیے۔ اگر فرض کیجئے کہ "پاکستان" ہندوستان سے کسی طرح کا کوئی تعلق نہ رکھیگا اور وہ افغانستان یا ایران کی طرح خود مختار اور آزاد ہوگا تو پھر اسے اپنی مدافعت کا پورا انتظام خود ہی کرنا پڑے گا۔ آزاد ہونے کے بعد پاکستان پر سب سے پہلے شمالی و مغربی سرحد کی محافظت کا بار پڑیگا۔ اس کے زمانہ میں حکومت ہند اس محاذ پر تقریباً ۶۰ ہزار فوجیں رکھتی ہے اور ۳۰ - ۳۵ کروڑ سالانہ کی رقم صرف کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر پاکستان نے ۶۰ ہزار فوج بھی رکھی تو اتنی کثیر رقم غریب پاکستان کہاں سے لائے گا؟ ہندوستان کے شمالی و مغربی کونے پر تین طاقتوں کی سرحدیں ملتی ہیں۔ چین افغانستان اور روس۔ روس جیسی عظیم الشان طاقت کا خطرہ پاکستان کو کبھی چین سے بیٹھنے نہ دیگا اور یہ خطرہ ایک بھوت کی طرح ہمیشہ پاکستان کے سر پر سوار رہیگا۔

یہ تو ہوا اُتر پچھمی سرحد کا حال اب ذرا پاکستان کی اُتر پوربی سرحد پر بھی غور کریجئے جو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان میں قائم ہوگی۔ اور حد فاصل ہوگی۔ یہ سرحد شملے کے اتر سے شروع ہوکر انبالہ۔ بھاولپور اسٹیٹ اور سندھ کے صوبے کو پار کرتی ہوئی کچھ کی کھاڑی سے جائے گی اور اس کا طول ۱۴ سو میل کے قریب ہوگا یعنی یہ محاذ اتنا ہی بڑا ہوگا جتنا بڑا محاذ جرمنی نے روس کے خلاف قائم کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب ہندو اور مسلمان ایک ملک میں پڑوسی کی حیثیت سے نہیں رہ سکتے تو پھر دو ہندو و مسلم پڑوسی سلطنتیں بغیر لڑے جھگڑے کس طرح چین سے بیٹھ سکتی ہیں۔ پھر جنگ کے اسباب

بھی موجود ہوں گے۔ یعنی ہندوستان میں چار کروڑ مسلمانوں اور پاکستان میں ڈیڑھ کروڑ ہندوؤں کی موجودگی جو ففتھ کالم کا کام کریں گے۔

یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ آزاد ہندوستان پاکستان کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقتور ہوگا۔ ہمالیہ سے لیکر راس کماری تک اور برودان سے لیکر انبالہ تک ۳۲ کروڑ نفوس کی ایک قوم ہوگی جس کے ہاتھ میں ملک کے تمام معدنی وسائل، زرخیز علاقے اور انبوہ دولت ہوگی اور بیس پچیس لاکھ کی فوج ایک بڑا بحری بیڑہ اور ہوائی فوج رکھنا اسکے لئے کچھ مشکل نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ پاکستان ایک لاکھ کی فوج بھی نہ رکھ سکے گا اور ہوائی فوج اور بحری بیڑے کا تو ذکر ہی کیا۔

پاکستان کو جدید آلات حرب کا بھی ایک بہت بڑا ذخیرہ رکھنا ہوگا۔ جس کے بغیر کسی جدید مسلح قوم کا دو دن بھی مقابلہ مشکل ہوگا۔ کیونکہ موجودہ جنگ سپاہیوں کی جنگ نہیں بلکہ آلات حرب اور مشینوں کی جنگ ہے غرضیکہ پاکستان کو کھربوں روپئے کے ٹینک مشین گن مسلح موٹر کاریں ہوائی جہاز اور قیمتی آتشگیر مادے خریدنا پڑیگا۔ پاکستان اور ہندوستان کی سرحدیں فرانس اور جرمنی کی طرح کھلی ہوئی بھی ہوگی جس کے راستے میں کوئی قدرتی رکاوٹ مثلاً پہاڑ، دریا سمندر وغیرہ نہیں اسلئے شاید پاکستان کو ایک "میجنو لائن" بھی بنانی پڑے۔

بہرحال ظاہر ہے کہ پاکستان کے موجود وسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے اربوں روپئے سالانہ کے اخراجات کا بار برداشت کرنا نہ صرف محال بلکہ قطعاً ناممکن ہے۔

صنعت و حرفت کی ترقی کے امکانات

دنیا میں حکومتوں کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ انڈسٹری ہے اور دنیا کی تمام مہذب قومیں انڈسٹری ہی پر ٹیکس عائد کرتی ہیں اور انکی ۷۵ فیصدی آمدنی کا ذریعہ یہی ہوتا ہے جو ممالک صنعتی نہیں اور صرف زراعتی ہیں اور جن کا دار و مدار صرف کاشتکاری پر ہے انکا دنیا میں کوئی مستقبل نہیں ایسے ممالک نہ تو اپنے اخراجات ہی پورا کرسکتے ہیں اور نہ ترقی کے میدان میں آگے بڑھ سکتے ہیں۔ شمال و مغرب کے مسلم صوبے تمامتر زراعتی صوبے ہیں اور صنعت و حرفت کے فقدان کے سبب ان میں مزید ٹیکس لگانے کی کوئی گنجائش نہیں، ہندوستان اور خاصکر پنجاب دفعہ

کے کسانوں کی ایسی حالت نہیں کہ ان پر کسی طرح کا زراعتی لگان (AGRICULTURAL INCOME TAX) لگایا جاسکے۔ بلکہ ایک قومی حکومت کا تو یہ فرض ہوگا ہے کہ وہ اپنے کسانوں کا بار زیادہ سے زیادہ کم کرے اور انکے ٹیکس میں اضافے کی بجائے تخفیف کرے

اسوقت "پاکستانی" صوبوں میں انڈسٹری کی جو حالت ہے وہ ظاہر ہی ہے۔ ہندوستان کے تمام بڑے بڑے کل کارخانے پاکستانی حدود سے باہر ہیں۔ سندھ بلوچستان صوبہ سرحد اور کشمیر کا تو ذکر ہی نہیں پنجاب میں بھی سوائے چند اونی اور ہوزری کے کارخانوں کے کوئی بڑا کارخانہ موجود نہیں۔ زندگی کی تمام اہم ضروریات مثلاً کپڑا، جوٹ، شکر، سیمنٹ اور سب سے بڑھ کر لوہے کے تمام کارخانے پاکستان سے باہر ہیں۔

نہ صرف یہ کہ پاکستان میں فی الحال انڈسٹری موجود نہیں بلکہ آئندہ بھی اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کیونکہ انڈسٹری کے لئے سب سے ضروری چیز کوئلہ اور لوہا ہے جس کا پاکستان میں قطعاً فقدان ہے۔ صنعت کی ترقی کے لئے دوسری اہم شے "بازار" MARKET ہے اور بدقسمتی سے پاکستان کے پاس یہ بھی موجود نہیں۔ "کوئلہ اور لوہا" اور "بازار" کی موجودہ حالت دول عالم کی باہمی کشمش دنیا میں کیا حیثیت ہے یہ اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دنیا کی سیاسیات انہی دو اشیاء کے گرد چکر کھا رہی ہے۔ جرمنی اور برطانیہ کی گذشتہ جنگ اس کچے مال اور نو آبادیات ہی کے لئے تھی۔ غرضیکہ پاکستان کے پاس نہ خام اشیاء RAW MATERIAL ہیں اور نہ بازار۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ دنیا میں ایسی قومیں بھی ترقی یافتہ ہیں جن کے ملک میں نہ خام اشیاء ہے اور نہ بازار۔ لیکن اگر ان کے پاس اپنے ملک میں یہ چیزیں حاصل نہیں تو ان کے قبضے میں ایسی نو آبادیات ہیں جن سے وہ کچا مال لیتے ہیں اور پھر تیار شدہ اشیاء انکے ہاتھ فروخت کردیتے ہیں۔ جیسے برطانیہ اور ہندوستان کی مثال لیکن پاکستان کے پاس کون سی نو آبادی ہے — خود پاکستانی صوبوں کا بازار اتنا محدود ہے کہ کوئی انڈسٹری پھل پھول نہیں سکتی۔ صوبہ سندھ، بلوچستان اور سرحد کے عوام کی غربت ضرب المثل ہے۔ لہذا لازمی طور پر انکی قوت خرید بالکل ہی محدود ہے

لے دے کے صرف ایک پنجاب کا صوبہ رہ جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ ایک صوبے کے بازار پر کوئی انڈسٹری نہیں چل سکتی اور انڈسٹری کا تو یہ اصول ہے کہ جس قدر بڑی مقدار میں پیداوار PRODUCTION ہوگی اسی قدر مال سستا اور عمدہ ہوگا اور منافع زیادہ ہوگا۔

زراعتی قوم بنام صنعتی قوم

اس اعتراض سے لاجواب ہوکر کہ پاکستان میں صنعتی ترقی کے امکانات بالکل نہیں مصنفین پاکستان یہ فرماتے ہیں کہ پاکستان میں انڈسٹری نہیں تو کیا مضائقہ ہے انڈسٹری نہ ہونے کے سبب یقینی بدیس سے درآمد بڑھے گی اور اس طرح ہماری چنگی کی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔ لیکن انھوں نے یہ نہ سوچا کہ درآمد IMPORT بڑھنے سے پاکستان کی آمدنی میں ٥ - ١٠ کروڑ کا اضافہ ہوسکتا ہے۔ لیکن اس پانچ کروڑ کی چنگی حاصل کرنے کے لئے سو کروڑ کا مال بھی خریدنا پڑیگا۔ سبحان اللہ کیا دانشمندی ہے کہ پانچ روپئے حاصل کرنے کے لئے گرہ سے سو روپئے دئے جائیں۔

اس سلسلے میں مصنفین پاکستان اسکیم نے ایک عجیب و غریب منطق پیش کی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہندو قوم ایک "صنعتی قوم" ہے اور مسلمان قوم "زراعتی قوم" ہے اور مسلمانوں کے مفاد زراعتی ہیں اور ہندوؤں کے مفاد صنعتی۔ شمالی و مغربی صوبوں کے مسلمان کچا مال پیدا کرتے ہیں اور ہندو انھیں باہر کے ملکوں سے کوئی مقابلہ نہ ہونے کے سبب سستے داموں میں خریدتے ہیں اور اس کچے مال سے سامان تیار کرکے انہی مسلمانوں کے ہاتھ گراں مال بھی بیچتے ہیں اور اسی طرح مسلمان دوہرے خسارے میں رہتے ہیں۔ چونکہ باہر کے مال پر حکومت ہند نے ہندوؤں کے اثر میں آکر بہت زیادہ چنگی عائد کردی ہے اس لئے مسلمانوں کو ناچار ہندوستانی ملوں کا کپڑا خریدنا ہی پڑتا ہے۔ اسلئے مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ ہوجانا چاہئے۔ کیونکہ دونوں کے مفاد جداگانہ ہیں۔ یہ ہے انکی منطق۔

لیکن کوئی ان عقلمندوں سے پوچھے کہ یو۔ پی۔ بہار آسام اڑیسہ بنگال سی۔ پی مدراس بمبئی وغیرہ کے ٢٥ - ٣٠ کروڑ ہندو عوام کے مفاد "زراعتی" ہیں یا "صنعتی"۔ اگر صنعتی مفاد

ہوسکتے ہیں تو بیرلا، ڈالمیا، اور سنگھانیہ کے یا زیادہ سے زیادہ دو یا چار فی صدی ہندوؤں کے لیکن ۹۵ فی صدی ہندو کسانوں کے مفاد تو مسلمانوں ہی کی طرح زراعتی ہیں۔ اگر یہ ہندو ۴ کروڑ پاکستانیوں کا استحصال EXPLOITATION کرتے ہیں تو ۲۵ کروڑ غریب ہندو کسانوں کو بھی لوٹتے ہیں اور ان سے بھی کم داموں پر کچا مال خریدکر اور اسی سے مال تیار کرکے انہی غریب ہندو کسانوں کے ہاتھ زیادہ داموں بیچتے ہیں۔

پاکستان کی دائمی اقتصادی غلامی

الغرض اقتصادی اعتبار سے پاکستان کے لئے کبھی یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوسکے گا آج صدیوں سے افغانستان اور ایران آزاد تو ہے لیکن اقتصادی کمزوری کے سبب ہندوستان سے بھی بدتر ہے اور ان ممالک کا کوئی مستقبل نہیں دنیا میں زراعتی ممالک کا جو مصرف رہ گیا ہے۔ یعنی بڑے بڑے صنعتی ممالک کی نوآبادی بنکر رہنا انھیں کچا مال سپلائی کرنا اور انکا "بازار" بنکر پھر انکا مال خرید لینا وہی مصرف پاکستان سے بھی لیا جائیگا۔ یہ حقیقت اب ایک مسلہ کی حیثیت اختیار کرچکی ہے کہ زراعتی ممالک کہیں آزاد نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ کچا مال بیچنے کے لئے انھیں صنعتی ممالک کا محتاج رہنا پڑتا ہے اور چونکہ کچا مال کی بکری کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ جس ملک کے ہاتھ یہ بیچا جائے اس کا تیار شدہ مال بھی خریدا جائے لہذا یہ چکر چلتا ہی رہتا ہے اور نہ ملک میں کچا مال ہی رہتا ہے اور نہ کوئی صنعت ہی جاری ہوسکتی ہے۔ ایک محض زراعتی ملک کے لئے آزادی بھی ایک بیکار شے ہے اسوقت اتنا بڑا عظیم الشان چین تو آزاد ہے لیکن اسکی سیاسی اور اقتصادی پالیسی پر امریکہ کا قبضہ ہے اور وہ اسکی مٹھی میں ہے اسی طرح جنوبی امریکہ جنوبی افریقہ کناڈا اور آسٹریلیا کا بھی یہی حال ہے جو زراعتی ممالک کا۔ غرضیکہ اقتصادی حیثیت سے پاکستان یا تو ہندوستان کا غلام ہوگا یا کسی دوسرے ملک کا اور چونکہ اقتصادی حیثیت سے غلام ہوگا اسلئے لازمی طور پر سیاسی حیثیت سے بھی غلام ہوگا۔

رفتار عالم

از:——— طفیل احمد خاں ایم۔ اے

مفتوح جاپان

جنرل میک آرتھر کی آہنی گرفت جاپان پر مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جارہی ہے

اس طرف جنرل میک آرتھر نے جاپانی فاشزم کی بیخ کنی کے لئے جو اقدام اٹھائے ہیں وہ چاہے سویت روس کے نکتۂ نظر سے ناکافی ہوں اور اُن سے جنگی مجرمین اور جاپانی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی طاقت جڑ سے اکھڑنے کی امید نہ ہو، لیکن اُن سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ میک آرتھر نے جاپان کی سیاسی زندگی کی ہر ہر تفصیل کو براہ راست طور پر اپنے قبضہ وقدرت میں لے رکھا ہے۔ مثلاً جنرل میک آرتھر نے نئے احکام جاری کرکے جاپان کے تمام پرانے پولیس افسروں کو برخواست کردیا اور ہوم منسٹر ای واو یاماز کی کو وزارت سے اکھاڑ پھینکا۔ جاپان کا شہنشاہ جس کی حیثیت جاپانی عوام کی نگاہوں میں خدا کے برابر تھی اس کے تقدس اور افضلیت کا پردہ چاک کرکے اس پر بحث ومباحثہ کا دروازہ ہر جاپانی کے لئے کھول دیا گیا ہے ان احکامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاگیرداروں اور بڑے بڑے سرمایہ داروں کی وزارت مستعفی ہونے پر مجبور ہوگئی۔ اور بائرن شی دہرا کو حکومت کے نظم ونسق کی باگ سنبھالنی پڑی ایک شاہی حکم نامے کے ذریعہ جسے جنرل میک آرتھر کی ہدایت اور حمایت حاصل تھی بائرن شدہرا کو وزیر اعظم بنایا گیا۔ لیکن عام طور پر اس خوف کا اظہار کیا جارہا ہے کہ جاپان کی یہ نئی وزارت بھی کہیں چندروزہ نہ ثابت ہو اس لئے کہ اس میں بعض ان ترقی پسند سیاسی جماعتوں کے نمائندے نہیں ہیں جو جاپانی عسکریت اور فاشیت کی تباہی کے بعد از سر نو وجود میں آرہی ہیں اور جن کی آواز پر مدتوں کے پسے ہوئے اور دبائے ہوئے جاپانی عوام لبیک کہہ رہے ہیں۔ مثال کے طور پر سوشلسٹ پارٹی لیکن ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آخر یہ کس قسم کی سوشلسٹ پارٹی ہے کہ اُس نے جاپان کی نئی کمزور کمیونسٹ پارٹی کے اس مطالبہ کو ٹھکرادیا کہ تمام جماعتوں کے ساتھ اتحاد قائم کرکے ایک ایسا طاقتور محاذ بنایا جائے جس کے ذریعے جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور عسکریت پسندوں کی کچھ نہ چل سکے اور عوام کے تعاون اور مدد سے صحیح معنوں میں جمہوریت قائم کی جائے۔ بہرحال اس وقت جاپان کی سوشلسٹ پارٹی ملک کی دو سب سے بڑی جماعتوں میں سے ایک بنتی نظر آرہی ہے۔

نئی وزارت نے تشکیل پانے کے بعد یہ اعلان کیا کہ وہ میک آرتھر کے ساتھ مکمل تعاون اور اشتراک عمل کو راہ دے گی۔ اور اُس کی مخصوص توجہ جاپانی عوام کے لئے غذائی سہولتیں مہیا کرنے اور مکانات کا مسئلہ کرنے میں صرف کرے گی اور ملک کو جمہوریت کی طرف لے جانے کی کوشش کرے گی۔

جنرل میک آرتھر نے فیوڈل عہد کے نظام اور خیالات سے جاپان کو نجات دلانے کے لئے ایک اور اہم قدم اٹھایا ہے۔ وہ یہ کہ اُس نے باقاعدہ احکام کے ذریعہ جاپان کے شنٹو (SHIN TOISM) مذہب کی سرکاری اور ریاستی حیثیت کو منسوخ کردیا۔ اس سے پہلے شنٹوئیت کو جاپانی حکومت کی مخصوص سرپرستی اور امداد حاصل تھی اور اسی مذہب کے زیر اثر عوام میں میکاڈو کے خدا ہونے کا اعتقاد بٹھایا گیا تھا۔ اسی سے آباؤ اجداد کی پرستش کی مذہبی رسم جاپان میں جاری تھی چنانچہ یہ طرز عمل شنٹوئیت کی افیون کے اثر کو عوام کے دل ودماغ سے دور کرنے کے لئے اختیار کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ان پست اور غلامانہ ذہنیت کو صدیوں کے توہمات اور مذہبی عقیدوں کی گرفت سے نکالنے کیلئے بھی۔ اب شنٹوئیت کی حیثیت محض انفرادی رہ گئی یعنی اب اس کا تعلق محض افراد سے رہ گیا، اجتماع یا حکومت سے نہیں۔

یہ تو جاپانی عوام کے دل ودماغ کو چونکانے اور بیدار کرنے کیلئے اقدامات کئے گئے ہیں اس کے ساتھ ہی جاپانی صنعت مخصوص طور پر کیمیائی

مشتوں پر بھی ضرب کاری لگائی گئی ہے۔ کیمیائی صنعت جنگی تیاریوں کی گویا ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے اور اُسی کو جنرل میک آرتھر نے مکمل طور پر امریکی نگرانی میں لے لیا ہے۔ نئے احکامات اور انتظامات کے تحت جاپانی کی کیمیائی صنعت کی ہر تفصیل اب امریکی افسروں کی سخت قسم کی نگرانی میں انجام پائے گی اور تمام کیمیائی ذخیروں کی اُن کے پاس باقاعدہ رپورٹ پہنچے گی۔

یہ سب اقدامات جاپان کی عسکری طاقت کو ختم کرنے کے لئے یقیناً ضروری تھے لیکن یہ بالکل ظاہر ہے کہ محض جاپان کی عسکری قوت کے اوپری ڈھانچے کو منہدم کردینا اور اس کی اصل سماجی اور طبقاتی جڑوں کو ویسے کا ویسا ہی چھوڑ دینا قطعاً ناکافی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جاپانی عسکریت کی اصل بنیاد کی بیخ کنی کیجائے اور اس کے لئے جاپان کے جنگ پرستوں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی معاشی اور سیاسی طاقت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کردیا جائے۔ سویت حکومت نے حال ہی میں اس سلسلے میں جو صدائے احتجاج بلند کی ہے وہ اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ سوویت حکومت کو امریکہ سے یہ شکایت ہے کہ وہ جاپانی فاشستوں کا (یعنی وہاں کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں) کا اچھی طرح استیصال نہیں کر رہی ہے۔ اسی خیال کے تحت مالوتوف نے وزرائے خارجہ کی کانفرنس میں جو آخر ناکام ثابت ہوئی برطانیہ اور فرانس کی "جاپان کے معاملے میں روس کو نکال باہر کرو" والی پالیسی کی سختی سے مخالفت کی۔ حال ہی میں سوویت حکومت نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ جاپان کی تنظیم حکومت کی دیکھ بھال کے لئے ایک مرکزی کنٹرول کونسل وجود میں لائی جائے جس میں روس، برطانیہ اور امریکہ کے نمائندے شامل ہوں اس مطالبے نے برطانیہ کو کم لیکن امریکہ کو سخت برانگیختہ کیا اسلئے کہ یہ کونسل گویا جنرل میک آرتھر کے سر پر سوار ہوتی۔ سوویت حکومت نے یہ بھی مطالبہ پیش کیا کہ مشرق بعید کی اتحادی کمیشن (جس میں امریکہ کے اصرار پر ہندوستان کی بھی شرکت ضروری سمجھی گئی) کی نشست سے پہلے ہی مرکزی کنٹرول کونسل کا وجود میں آجانا اشد ضروری ہے۔ لیکن بہت کم امید ہے کہ امریکہ اور برطانیہ سوویت روس کے اس مطالبے کو تسلیم کریں گے۔ مشرق بعید کی کمیشن کی نشستیں بھی شروع ہوگئی ہیں لیکن اب تک مرکزی کنٹرول کونسل کے قیام کے متعلق کوئی فیصلہ

نہیں آیا ہے۔

مفتوح جرمنی

جرمنی میں عسکریت اور فاشسٹ رجحانات کی بیخ کنی کے لئے جو اقدامات کئے گئے ہیں وہ اور بھی زیادہ موثر ہیں اور اُن سے وہاں کی سیاسی زندگی کی بالکل کایا پلٹ ہوجانے کی اُمید ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ وقت جرمن قوم کی تاریخ میں سب سے انقلابی اور فیصلہ کن وقت ہے اس دور سے اُبھرنے کے بعد جرمن قوم شاید بالکل ایک دوسری قوم ہوگی جس کا سیاسی اور سماجی نظام اور مطمح نظر بالکل نئے میلانات کو لے کر آگے بڑھے گا۔

۲۶ ستمبر کو اتحادی کنٹرول کمیشن کی طرف سے ایک اعلان شائع ہوا جس کے عمل میں آنے کے بعد جرمنی کی عسکریت مکمل طور پر نیست و نابود ہوجائے گی۔ اس کے خاص خاص نکات یہ ہیں:۔

جرمن قوم وہ تمام اخراجات ادا کرے جو جرمنی میں اتحادی افواج اور افسروں کے قیام کے سلسلے میں ہورہے ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں جرمن ریاست کے جو حدود تھے اُن کے اندر اور باہر کے علاقوں سے جرمنوں کے گروہ کے گروہ نکالے جارہے ہیں، موجودہ ماتحت جرمن حکومت اُن جرمنوں کا انتظام اور کنٹرول اپنے ہاتھوں میں لے لے۔ جرمنی کی تمام فوجی تنظیموں کو مکمل طور پر اور ہمیشہ کے لئے منسوخ اور ختم کردیا جائے اور اگر کوئی جماعت فوجی حیثیت اختیار کرنے کی کوشش کرے تو اُسے قانوناً ممنوع قرار دیا جائے۔ جرمنی کی موجودہ ماتحت حکومت کے ذمہ دار ارکان کو یہ صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ نازی لیڈروں پر مقدمات جو چلائے جارہے ہیں اُن کے سلسلے میں تمام ضروری اطلاعات اور کاغذات مہیا کریں اور ہٹلر کے دوران حکومت میں جن لوگوں پر سیاسی اور نسلی اختلافات کی وجہ سے مظالم ہوئے ہیں اُن کے حقوق ملکیت کے متعلق اتحادیوں کے احکام کو عمل میں لائیں۔ جنگی سامان بنانا اور حاصل کرنا اور ہوائی جہاز رکھنا دونوں قطعاً ممنوع قرار دیا جاتا ہے۔ جرمنوں کو چاہئے کہ وہ اپنا تمام سونا، چاندی، پلیٹنیم اور غیر ملکوں سے حاصل کئے ہوئے نوٹ اور سونا اتحادیوں کے حوالے کردیں۔

جنوبی مشرقی ایشیا

یہ سوال بہت اہم ہے کہ وہ ممالک جو جنگ کے ختم ہونے کے بعد جاپان

قبضے سے نکالے گئے ہیں اُن کی قومی تحریکیں جاپانیوں کی قائم کی ہوئی ہیں اور وہ آج جاپانیوں کی مدد سے یورپ کی سامراجی طاقتوں سے لڑ رہی ہیں یا وہ قومی تحریکیں جاپانی عہد حکومت میں خود جاپانیوں کے ہی خلاف قائم کی گئیں تھیں اور آج وہ جاپانی سامراج کے نقش قدم پر چلنے والی یوروپین طاقتوں کے خلاف جنگ آزما ہیں اسوقت برطانیہ کی "اشتراکی حکومت" انام، انڈوچین اور انڈونیشیا پر یورپ کی شہنشاہیت کو دوبارہ مسلط کرنے کا کارخیر انجام دے رہی ہے برطانوی پریس اور پروپگنڈا پوری طاقت سے یہ ثابت کرنے کی سعی لاحاصل میں مصروف ہے کہ ان ملکوں کی قومی تحریکیں جاپانیوں کی چلائی ہوئی ہیں۔ یہاں تک کہ وزیراعظم ایٹلی صاحب بھی دار العوام میں تقریر کرتے ہوئے اس کوشش سے باز نہیں آئے۔ ظاہر ہے کہ اس پروپگنڈے کی بنیاد سراسر جھوٹ پر مبنی ہے اور برطانوی پریس کے خرافات پر بہت کم لوگ کان دھرتے ہیں۔ مخصوص طور پر ہم ہندوستانیوں کو چرچل، ایمری اور لنلتھگو جیسے معقول حضرات کے دوران تاجداری میں اس نوع کی پروپگنڈا بازی کا وافر تجربہ ہو چکا ہے جبکہ کانگریس اور گاندھی جی کو بین الاقوامی دنیا میں فاشسٹ ثابت کر کے ہندوستان کی قومی جماعت کو کچلنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر برطانوی پروپگنڈا کی دروغ گوئی ساری دنیا پر روشن اور واضح ہو کر رہی۔ کانگریس کو جو ہندوستان کے عوام کی نمائندہ ہے کچلنا تو خیر برطانوی سامراج کے بس سے باہر تھا بعد میں خود امریکہ میں جس ذلت آمیز طور پر برطانیہ کی پروپگنڈا مشینری کی "دروغ ایجادی" کا پول کھلا کر رہا وہ آج سب پر ظاہر ہے۔ آج دنیا کا کوئی بھی صحیح الدماغ انسان برما، سیام، ملایا، انام، انڈوچین اور انڈونیشیا کی قومی تحریکوں کو جاپان کی پروردہ اور پرداختہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس لئے کہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے، اس وقت جو خبریں موصول ہو رہی ہیں اُن سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ خود اتحادی فوجی افسران جاپانی فوجوں کو۔ انڈونیشیا اور انڈوچین کے قوم پسندوں کے خلاف استعمال کر رہے ہیں اور اُن علاقوں میں جہاں اتحادی فوجوں نے ابھی قبضہ نہیں کیا ہے وہاں جاپانی سول گورنمنٹ کو اتحادیوں نے برقرار رکھا ہے، پھر جاپانی فوجوں اور قوم پسندوں کے درمیان فوجی تصادم کی خبریں بھی آ رہی ہیں۔ ان باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہاں کی قومی تحریکیں [illegible] اس وقت ڈچ، فرانسیسی اور برطانوی

سامراج کی حکومت کا چڑھا ہوا نشہ اتار رہی ہیں جاپانی عہد حکومت میں خود جاپانی سامراج کے خلاف قائم کی گئیں تھیں اسباب وہی قومی تحریکیں بالکل واجب طور پر اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کی جان توڑ کوشش میں مصروف ہیں۔ فرانس اور ہالینڈ کی کرم خوردہ حریص استعماری حکومتوں میں اتنا دم خم تو ہے نہیں کہ وہ ان ملکوں کی قومی تحریکوں سے براہ راست ٹکر لے سکیں، چنانچہ وہ اپنے بڑے بھائی یعنی برطانوی سامراج سے آس لگائے بیٹھی ہیں کہ وہ آکر ہٹلر کے سامنے دُم دبا کر بھاگ جانے والے ان ملکوں اور اُن کے بے شرم حکمرانوں کی عزت اور وقار کو جنوبی مشرقی ایشیا میں دوبارہ بحال کر دیگا۔ ان گئے گزرے اور احمق یوروپین مدبرین کو یہ معلوم نہیں کہ تاریخ اپنا فیصلہ صادر کر چکی ہے اور فرانسیسی، ڈچ سامراج کی تو ایسی، تیسی خود برطانوی سامراج کی چولیں ڈھیلی نظر آ رہی ہیں اور پورے یوروپین سامراج کا فرسودہ، ظالمانہ، انسانیت کش اور بوسیدہ نظام ایشیا کی مسلح عوامی طاقتوں کی آہنی ضربوں سے عنقریب ٹوٹ کر بکھر جانے والا ہے یوروپین سامراج کی سب سے بھیانک شکل یعنی فاشزم کو خود یورپ کی عوامی طاقتیں ٹھکانے لگا چکی ہیں۔ جب بزرگان دین ہی اُٹھ گئے تو پھر ان کے کمزور معتقدوں سے نپٹنا کون سا مشکل کام ہے۔

ساری دنیا کی رائے عامہ آج جنوبی مشرقی ایشیا کی تحریک آزادی کی حمایت میں ہے۔ آسٹریلیا کی بندرگاہوں کے مزدور، نیوزی لینڈ کے مزدور، لنکا کے ٹریڈ یونین یہاں تک کہ خود برطانیہ کے مزدور، انڈونیشیا اور انڈوچین کی آزادی کی حمایت میں برطانوی، ڈچ اور فرانسیسی زبردستیوں پر ملامت بھیج چکے ہیں۔ ہندوستان کے ہر سیاسی حلقہ میں اس بات کی مذمت کی جا چکی ہے کہ ہندوستانی سپاہیوں کو انڈوچین اور انڈونیشیا کی تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے کیوں استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ خود برطانوی انڈیپنڈنٹ لیبر پارٹی کا سکریٹری فینر براکوے جنوبی مشرقی ایشیا کی تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے ہندوستانی فوجوں کے استعمال کی مذمت کر چکا ہے۔ کہاں گئے وہ اصول جن کا اس قدر تزک و احتشام کے ساتھ سان فرانسسکو کانفرنس میں اعلان کیا گیا تھا اور جن کو عمل میں لانے کا برطانیہ، فرانس اور روس نے بیڑہ اُٹھایا تھا؟

ڈچ حکومت کی احمقانہ قسم کے مسلسل انکار نے جاوا کی قومی تحریک کو کمزور کرنے کی بجائے اسے اور مضبوط کر دیا ہے جس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ جاوا کی موجودہ قومی جمہوری حکومت کے صدر ڈاکٹر سوئیکارنو اور نائب صدر ڈاکٹر محمد حتیٰ اپنی حکومت کو بین الاقوامی دنیا میں تسلیم کرانے کی زبردست کوشش کر رہے ہیں۔ حال ہی میں ڈاکٹر سوئیکارنو کے کابینہ نے ریاستہائے متحدہ امریکہ سے اس بات کی اپیل کی ہے کہ مشرق بعید کی مجلس مشورت میں جاوا کی قومی حکومت کے نمائندے بھی شامل کئے جائیں۔ ساتھ ہی ڈاکٹر حتیٰ نے جو چھ مطالبات برطانوی جنرل کرسٹی سن کے سامنے پیش کئے ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ ”مجلس اقوام متحدہ“ کی ایک کمیٹی بنائی جائے جو جاوا کی قومی حکومت کو اگر قانونی طور پر نہیں تو اس کے حقیقی وجود (DE FACTO) کو تسلیم کرے۔ بقیہ پانچ مطالبوں کا خلاصہ یہ ہے کہ جاوا میں مقیم ڈچ فوجیں قطعی طور پر ہٹالی جائیں اور مزید ڈچ فوجیں نہ اُتاری جائیں۔ انگریزی فوجیں جاوا اور ڈچ حکومتوں کے درمیان بیجا مداخلت سے کام نہ لیں اور صرف جس کام سے آئی ہیں (یعنی جاپانی فوجوں سے ہتھیار ڈلوانا) اسے پورا کر کے چلی جائیں۔ ایک اور قرارداد میں اس بات کا مطالبہ کیا گیا ہے کہ جاوا کی قومی حکومت کو ”مجلس اقوام متحدہ“ کی رکنیت عطا کی جائے اور اسکے نمایندوں کو مجلس اقوام متحدہ کی پہلی پریپریٹری کانفرنس میں بلایا جائے جس کی نشستیں ۲۲ راکتوبر سے شروع ہو گئی ہیں۔ جاوا کی قومی حکومت نے ڈچ حکومت سے مکمل آزادی کی بنیاد پر گفت وشنید کی خواہش بھی ظاہر کی اور درجۂ نوآبادیات کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ جاوا کے قوم پسندوں کی صلح جوئی کا اس سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے معاملے کو کسی بین الاقوامی مجلس کے سپرد کرنے کے لئے اور اس کے فیصلہ کو ماننے کے لئے تیار ہیں، انھوں نے اس بات کی خواہش ظاہر کی ہے کہ اس معاملے کو طے کرنے میں امریکہ اور روس اگر حصہ لیں تو وہ اس کا خیر مقدم کریں گے برطانوی اور ڈچ حکومتوں نے بین الاقوامی رائے عامہ کو جاوا کے قوم پسندوں کے خلاف بھڑکانے کے لئے یہ بھی مشہور کر دیا تھا کہ وہ نسلی منافرت کی بنا پر تمام اہل یورپ کے خلاف تحریک چلا رہے ہیں اور اسی لئے جاوا میں مقیم امن پسند ڈچ باشندوں پر مظالم ڈھا رہے ہیں، وہ جاپانی فاشسٹوں کی طرح نسلی منافرت اور اسی قسم کے دیگر فاشسٹ نظریوں اور اصولوں پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس سامراجی چال اور غلط بیانی کے جواب میں ڈاکٹر محمد حتیٰ نے فوراً یہ اعلان کیا کہ انڈونیشیا کی قومی تحریک نسلی تعصب یا منافرت کی بنیاد پر نہیں قائم ہے بلکہ ٹھوس نظریاتی (IDEOLOGICAL) بنیاد پر اور اس کا مقصد محض قومی آزادی ہے۔ آزاد انڈونیشیا کی حکومت ڈچ باشندوں کے ساتھ مکمل رواداری کا برتاؤ کر رہی ہے۔

انڈونیشیا میں آزادی کی جنگ جس ڈھرے اور جن اصولوں پر لڑی جا رہی ہے اُس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تحریک کے رہنما بہت بیدار مغز اور ہوشیار اور ہوشمند لوگ ہیں اور اُن کا طریقۂ کار موقع کی مناسبت سے بہت موزوں اور صحیح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہمدردوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور اُن کی قومی تحریک اندرونی لحاظ سے بھی ناقابل شکست ہو گئی ہے۔ انڈونیشیا کے سابق گورنر جنرل کا ڈچ حکومت سے اختلاف رائے کی بنا پر مستعفی ہو جانا بہت اہمیت رکھتا ہے اور ہالینڈ کے مشہور و معروف پبلک شخصیتوں کا موجودہ ڈچ پالیسی سے ساتھ اختلاف رائے کا اظہار کرنا بھی کم معنی خیز نہیں ہے۔ یہ خبر بھی موصول ہوئی ہے کہ ہندوستانی فوجوں میں اس بنا پر عام بےچینی پیدا ہو رہی ہے کہ انھیں انڈوچین اور انڈونیشیا میں کیوں قوم پرستوں کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے۔ غالباً اسی صورت حال سے خوف کھا کر حکومت ہند نے ملک معظم کی حکومت کے اس مطالبہ کو رد کر دیا ہے کہ ہندوستانی فوجیں جاوا بھیجی جائیں۔

ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈچ حکومت جو کسی قیمت پر ڈاکٹر سوئیکارنو اور محمد حتیٰ سے گفت وشنید کے لئے تیار نہیں تھی وہ اب حالات پر قابو نہ پا کر انھیں قومی رہنماؤں سے اندنوں گفت وشنید میں مصروف ہے۔ اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوگا، اسکا ابھی انتظار ہے۔ ممکن ہے ہالینڈ کا یہ مصالحانہ رویہ دو مزید واقعات کا نتیجہ ہو۔ ایک تو یہ کہ کئی سوویٹ سرکاری اخبارات میں جنوبی مشرقی ایشیا کے حالات پر سخت قسم کی نکتہ چینی کی جا رہی ہے، اور اس مخصوص علاقے کی حالیہ صورت حال سے بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا ہے اور دوسرے اس سے بھی زیادہ اہم [illegible] کا وہ اعلان ہے جسکا تعلق امریکہ کے [illegible] سے ہے۔ اسکے خاص

خاص تحفظات نہ ہیں۔ امریکہ مقبوضات نہیں چاہتا اور نہ وہ کسی قوم کے خلاف ظلم و تشدد کا برتاؤ کرنا پسند کرتا ہے۔ امریکہ یہ چاہتا ہے کہ اگر کسی ملک میں علاقائی تبدیلی کی جائے تو اس مخصوص علاقے کے باشندوں کی رضامندی سے۔ وہ قومیں جن کے اندر خود مختاری کی صلاحیت آگئی ہے انھیں طرز حکومت کے انتخاب کا پورا حق عطا کیا جائے۔ امریکہ گذشتہ دشمن ممالک میں اتحادیوں کے ساتھ مل کر جمہوریت قائم کرنا چاہتا ہے وہ حکومت جو کسی ملک میں غیر ملکی طاقتوں کے دباؤ سے قائم کی جائے گی امریکہ اس کی مخالفت کرے گا یہ نکتہ انڈوچین اور انڈونیشیا کے لئے اہم ہے۔

بہرحال اس وقت قومی اور بین الاقوامی دونوں حالات انڈونیشیا اور انڈوچین کے لئے سازگار ہیں اور یقین ہے کہ یہ دونوں ملک آزادی لے کر چھوڑیں گے اور برطانیہ کی موجودہ پالیسی جس کے تحت وہ ان نوآبادیات کو دوبارہ فرانس اور ہالینڈ کے حوالے کرنا چاہتی ہے ناکام ہوکر رہے گی۔

برطانیہ کیوں یہ طرز عمل اختیار کر رہی ہے اس کا خاص سبب یورپ کی سیاسیات سے تعلق رکھتا ہے۔ یورپ سے برطانیہ کے قدم اکھڑ چکے ہیں جس کا آخری ثبوت ہمیں گذشتہ وزرائے خارجہ کی کانفرنس منعقدہ لندن کی ناکامیابی سے مل چکا ہے۔ اب برطانیہ کے سامنے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ فرانس اور ہالینڈ کے ساتھ مل کر سوویت اثرات کے خلاف مغربی یورپ میں ایک محاذ قائم کرے۔ فرانس کی موجودہ "دی گال" حکومت یوں بھی سوویت روس سے خفا ہے کہ وزرائے خارجہ کی کانفرنس میں مولوتاف نے بلقان کے معاملات طے کرنے میں چین کے ساتھ ساتھ فرانس کی مداخلت کی بھی مخالفت کی تھی۔ انڈوچین کے معاملہ میں برطانیہ اور فرانس کے درمیان جو سول گورنمنٹ راضی نامہ ہے اس کا اس کے علاوہ اور کوئی بھی مقصد نہیں تھا کہ "تم ہمارے ساتھ سوویت حکومت کے خلاف یورپ میں محاذ قائم کرو ہم اس کے بدلے میں انڈوچین میں تمھیں پٹنے نہ دیں گے" اس راضی نامہ سے "ہور لاوال پیکٹ" کی سی مہک آتی ہے جو ہور اور لاوال کے درمیان ابی سینیا پر اٹلی کے حملے کے وقت وجود میں آیا تھا اور جس میں اسی قسم کے گھناؤنے مول تول سے کام لیا گیا تھا۔ اس نئے راضی نامے کے تحت برطانیہ باقاعدہ اور باضابطہ طور پر گولہ اور بارود سے فرانسیسیوں کی مدد کر رہا ہے۔

گو واقعات سے ثابت ہے کہ یورپ سے برطانیہ کے قدم کچھ اس طرح اکھڑے ہیں کہ 'جمنے نہ دینے' رہی سہی امید بھی اب جاتی رہی۔ فرانس کے گذشتہ انتخابات میں کمیونسٹوں کو سب سے زیادہ ووٹ ملے اور اب وہ عنقریب سوشلسٹوں کے ساتھ مل کر جو فرانس میں انتخابات میں کامیابی کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر ہے ایک ایسی حکومت قائم کرنے والے ہیں جو نوآبادیات کے ساتھ یکسر اپنا رویہ بدل دے گی۔ انڈوچین کی قومی تحریک کے لئے جو مسلح ہے اور ٹھوس بنیادوں پر قائم ہے اور دن بدن زور پکڑتی جا رہی ہے یقیناً فرانس کی یہ صورت حال بے حد موافق ہے اور اس سے بہت کچھ امید وابستہ کی جا سکتی ہے۔ غرض انڈوچین انڈونیشیا میں آزادی کا حصول یقینی ہے۔ اُن کی آزادی ہندوستان کی آزادی کی تحریک کو بھی تقویت پہنچائے گی اور اس سے دور رس نتائج پیدا ہوں گے۔

فلسطین، سامراج کا سب سے ستایا ہوا ملک

موجودہ جنگ کے ختم ہوتے ہی دو مسائل بڑی تیزی سے ہماری توجہ اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ ایک طرف تو محکوم ملکوں کی آزادی کی تحریکیں تیزی کے ساتھ ابھریں اور اپنے اپنے سامراج سے دست و گریباں ہوگئیں۔ دوسری طرف خود فاتح سامراجی ملکوں میں مزدوروں نے اسٹرائک پر اسٹرائک کرنا شروع کردیا۔ اس وقت روس ہی ایسا ملک ہے جہاں سے اس قسم کی خبریں نہیں آرہی ہیں کہ آج فلاں مزدوروں نے اسٹرائک کی اور آج فلاں بندرگاہ کے مزدوروں نے کام کرنے سے انکار کردیا۔ ورنہ امریکہ، برطانیہ، آسٹریلیا، ہر جگہ کے مزدور اپنے مالکوں سے اپنے حقوق منوانے کے لئے دست و گریباں نظر آتے ہیں لیکن یہاں پر ہم محکوم ملکوں کی آزادی کی تحریکوں کا تذکرہ کر رہے تھے انھیں میں سے ایک فلسطین بھی ہے جس پر سامراج نے شاید سب سے زیادہ مظالم ڈھائے ہیں۔

ظاہر ہے کہ فلسطین کی مشکلات کی ابتدا تو اُسی وقت سے ہوئی جب برطانیہ نے عربوں سے کئے ہوئے وعدوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنی سامراجی پالیسی کے تحت فلسطین میں یہودیوں کے بسنے

"قومی وطن" بنانا شروع کیا لیکن موجودہ مسائل کا تعلق براہ راست طور پر ۱۹۳۹ء کے "قرطاس ابیض" سے ہے جس سے فلسطین میں برطانیہ کی پالیسی کے ایک نئے عہد کا آغاز ہوتا ہے۔ لیکن قرطاس ابیض کے تاریخی پس منظر سے واقفیت حاصل کرنا بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ اس وقت جب ۱۹۱۴ء کی عالمگیر جنگ جاری تھی برطانیہ نے نومبر ۱۹۱۷ء کے اعلان بالفور کے ذریعہ یہودی وطن قائم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ برطانیہ کا یہ فیصلہ عرب قومی تحریک کے لیڈروں سے کئے ہوئے وعدوں کے بالکل برخلاف تھا۔ بعد میں اس اعلان بالفور کو فلسطین کے انتدابی معاہدے کا ایک جزو بنا لیا گیا اور جمعیتہ الاقوام نے ۲۴ جولائی ۱۹۲۲ء کو اس معاہدے کو باقاعدہ طور پر تسلیم کر لیا ظاہر ہے کہ جمعیتہ الاقوام اس کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتی تھی جبکہ وہ دو مقاصد کے تحت قائم کی گئی تھی، نوزائیدہ سوویت حکومت کو کچلنا اور مفتوح ممالک سے چھینے ہوئے علاقوں پر سامراجی تسلط کو برقرار رکھنا۔ پروفیسر شومین کے الفاظ میں انتدابی نظام کا مقصد یہ تھا کہ سامراج کے دو بنیادی مسائل کسی طرح حل ہوں ایک تو یہ کہ ہر سامراجی ریاست کے اپنے خودغرضانہ مقاصد کا تحفظ ہو سکے اور دوسرے سامراجی ریاستوں کے آپس کے مناقشات جہاں تک ہو سکیں اُبھرنے نہ پائیں۔

اس کے بعد عربوں کی خواہش کے بالکل خلاف یہودیوں کو فلسطین میں بسایا جانے لگا۔ ۱۹۱۹ء میں اُن کی تعداد ۵۸,۰۰۰ تھی اور اُن کے مقابلے میں عربوں کی آبادی ۶,۴۲,۰۰۰ تھی لیکن ۱۹۴۰ء میں یہودی کی تعداد بڑھ کر پوری آبادی کا ۱/۳ حصہ ہو گئی۔ اسی کیساتھ ساتھ عربوں کی مخالفت بھی روزافزوں ہوتی گئی اور قومی تحریک زور پکڑتی گئی۔ سنہ ۱۹۲۰ء سے کر ۱۹۳۷ء تک کے درمیانی عرصے میں متعدد بلوے بھی ہوئے جن میں ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء کے بلوے سب سے خطرناک تھے۔ عربوں کی تحریک آزادی کو برطانیہ نے گولیوں کی بوچھار سے دبا دیا۔ اس کے بعد ایک شاہی کمیشن بھیجی گئی جس میں پروفیسر کوپلینڈ بھی شامل تھے (یہ پروفیسر صاحب آکسفورڈ یونیورسٹی میں تاریخ نوآبادیات کے استاد ہیں اور آپ کی خاصیت یہ ہے کہ وہ ہر ملک کو چاہے وہ کتنا ہی چھوٹا ہو زبردستی ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی تجویزیں سوچتے رہتے ہیں چنانچہ آپ نے ہندوستان کے دستوری مسائل پر جو کئی ہو ضخیموں کی کتاب تصنیف فرمائی ہے اس میں بھی آپ نے ہندوستان کو چار حصوں میں ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی پروفیسرانہ اور قابلانہ تجویز پیش کی ہے) فلسطین رائل کمیشن نے جو رپورٹ پیش کی وہ ایک حد تک عربوں کے موافق اور یہودیوں کے خلاف پڑتی تھی۔ اسی رپورٹ کے ساتھ فلسطین کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے جو تجویز پیش کی گئی اس میں فلسطین جیسے ملک کو تین حصوں تقسیم کرنے کا ماہرانہ پروگرام تھا۔ ایک علاقہ یہودیوں کو دیدیا جاتا، دوسرا عربوں کو اور تیسرا حصہ جس میں یورشلم شامل تھا برطانیہ کے لئے۔ برطانیہ کے علاقے کو سمندر سے ملانے کے لئے ایک کوری ڈور کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ برطانیہ کے زیادہ عقل و ہوش رکھنے والے مدبرین نے اس تجویز کی حماقت کو واضح طور پر محسوس کیا اور اسے عمل میں نہ لایا جا سکا۔ اس کے بعد فروری ۱۹۳۹ء میں حکومت برطانیہ نے لندن میں عرب اور یہودی لیڈروں کی ایک کانفرنس طلب کی لیکن کانفرنس ناکام ثابت ہوئی اس لئے کہ عربوں اور یہودیوں کے درمیان گفت و شنید کی کوئی مشترکہ بنیاد نہیں تھی عربوں نے تو یہودی نمائندوں کے ساتھ ایک ہی کمرے میں بیٹھنے سے بھی انکار کر دیا۔ جیسا کہ ہمیشہ ایسے وقت پر ہوتا ہے کہ محکوم ملک کی دو جماعتیں جب متحد نہیں ہوتیں تو حکومت برطانیہ خود اپنا فیصلہ زبردستی اُن کے سر پر مسلط کر دیتی ہے فلسطین کے عربوں پر بھی ایک مزید "قرطاس ابیض" منڈھ دیا گیا اس میں یہ وعدہ کیا گیا کہ دس سال کے بعد فلسطین کو "آزادی" دیدی جائیگی۔ (برطانوی مارکہ کی آزادی) لیکن اس کے بعد بھی فلسطین کے خارجی معاملات پر برطانیہ کے قبضہ، وقدرت میں رہیں گے۔ دس سال کے بعد برطانیہ اور فلسطین کے درمیان جو نئے تعلقات قائم ہوں گے اُن کا تعین ایک معاہدہ کے ذریعہ ہوگا۔

اسی ۱۹۳۹ء کے قرطاس ابیض کی رُو سے یہودیوں کی فلسطین میں آمد عربوں کی خوشی پر چھوڑ دی گئی۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ پہلے پانچ سالوں میں یعنی ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۴ء ۷۵,۰۰۰ مزید یہودی فلسطین میں داخل ہونگے۔

موجودہ صورت حال کے پیدا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ۳۱ مارچ ۱۹۴۴ء کو ۵ سال کے مقررہ عرصے کے ختم ہونے کے بعد بھی اس وقت ۳۱,۰۰۰ یہودی ابھی تک فلسطین میں نہیں داخل

ہو سکے ہیں۔

عربوں کے لیڈروں نے ایک طرح سے گویا ۱۹۳۹ء کے قرطاس ابیض کو تسلیم کر لیا ہے اس لئے کہ وہ دیکھتے ہیں کہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں وہ چاہتے ہیں کہ برطانیہ ۱۹۳۹ء کے قرطاس ابیض کے مطابق اپنے وعدوں کو عملی جامہ پہنائے۔ عرب لیگ کے سکریٹری اعظم سب کا بھی یہی طرز عمل ہے۔ لیکن اس کے برخلاف یہودیوں کا مطالبہ آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔ وہ اعلان بالفور کے عمل میں لائے جانے پر مصر ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ فلسطین کو زبردستی یہودیوں کا وطن بننے دیا جائے اور وہاں جا کر بسنے کی عام اور کھلم کھلا اجازت دے دی جائے اُن کا رویہ اس لئے بھی شدید طور پر جارحانہ اور جارحانہ ہے کہ امریکہ اُن کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ حال ہی میں حبشہ اور امریکہ کے درمیان تیل کے سلسلے میں جو معاہدہ ہوا ہے اس کے تحفظ کے لئے نیز مشرق قریب میں تیل سے متعلق اپنے مفادات کے تحفظ کیلئے امریکہ یہودیوں کو مشرق قریب میں اپنا آلۂ کار بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ اس بنیادی معاشی سبب کی بنا پر صدر ٹرومین نے وزیر اعظم ایٹلی سے اس بات پر اصرار کیا کہ یورپ سے ہٹائے ہوئے ایک لاکھ یہودیوں کو فلسطین میں داخل ہونے کی اجازت دے دی جائے۔ اب تک اس کا پتہ نہ چل سکا کہ صدر ایٹلی نے اپنے اس خط میں کیا جواب دیا جس کا موصول ہونا امریکہ نے تسلیم کر لیا ہے زیادہ قرینہ یہ ہے کہ وزیر اعظم ایٹلی نے شاید انکار کر دیا ہے۔ یہودیوں کے پاس منظم فوج اور آلات و ہتھیار بھی وافر تعداد میں موجود ہیں اُنکے دہشت انگیزوں نے اس وقت وہاں اودھم مچا رکھا ہے اور وہ برطانوی پولیس پر حملہ کر کے زبردستی برطانیہ سے اپنے مطالبات منوانے پر تلے ہوئے ہیں ساتھ ہی فلسطین میں خفیہ طور پر یہودیوں کی غیر قانونی آمد بھی جاری ہے۔ عربوں کے پاس بھی فوج اور آلات و سامان جنگ کی کمی نہیں لیکن اُن کی فوجی تیاریاں ابھی غیر منظم حالت میں ہیں اگرچہ اُن کی تعداد یہودیوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔

جنگ کے ختم ہونے کے بعد برطانیہ کا رویہ فلسطین کے ساتھ یکسانی بدل چکا ہے۔ اگرچہ ایسا خود برطانیہ کے اپنے سامراجی مفاد ہی کے تحت ہوا ہے۔ چرچل کے زمانۂ حکومت میں فرانس کو شام سے نکالا جا چکا ہے، اب برطانیہ مشرق بعید میں اپنا تسلط قائم رکھنے کے لئے امریکہ اور سوویت روس کی روک تھام کرنا چاہتا ہے۔ عرب لیگ کے قیام میں چرچل کی حکومت نے اس لئے مدد کی تاکہ روس کے خلاف مشرق بعید میں ایک عرب محاذ قائم کیا جائے۔ ایٹلی کی حکومت جب برسر اقتدار آئی تو اس نے پہلے تو عرب لیگ سے کوئی دلچسپی نہ دکھائی لیکن وزرائے خارجہ کی کانفرنس میں جب روس نے اٹلی کی گزشتہ افریقی نوآبادیات کو اپنی امانت داری میں لینے کی خواہش ظاہر کی اور ساتھ ہی جب درۂ دانیال اور ڈوڈی کانیز سے متعلق سوویت مطالبات ظاہر ہوئے تو برطانیہ کو یہ محسوس ہوا کہ اس کے سامراجی مفاد خطرے میں ہیں اور اگر روس کا اثر بڑھا تو مشرق قریب کی قومی تحریکیں زور پکڑیں گی چنانچہ ایٹلی کی موجودہ حکومت نے یہ ضروری سمجھا کہ عرب لیگ کو تقویت پہنچائی جائے اور برطانوی حمایت کا وعدہ کر کے اُسے روس کے خلاف ایک دیوار بنانے کی کوشش کی جائے چنانچہ اس وقت برطانیہ کے سامراجی مفادات ہی کا یہ تقاضا ہے کہ یہودیوں کے خلاف عربوں کی حمایت کی جائے۔ لیکن یہ کیا کوئی اطمینان بخش صورت حال ہے؟ ہرگز نہیں، اس لئے کہ برطانیہ کا اصل مقصد (یعنی مشرق بعید میں برطانیہ کے معاشی مفادات کو محفوظ رکھنا) بالکل نہیں بدلا ہے محض اس مقصد کو حاصل کرنے کا طریقۂ کار بدل گیا ہے۔ فلسطین بلکہ پورے مشرق قریب کا مسئلہ صحیح معنوں میں اسی وقت حل ہوگا جب برطانیہ کے قدم مشرق قریب سے بالکل اور ہمیشہ کیلئے اکھڑ جائیں گے۔

ہندوستان کی قومی فوج

ہم اُن لوگوں کو "قومی فوج" کیوں کہتے ہیں جن پر دلّی کے لال قلعے میں حکومت ہند اس وقت غدّاری کے جرم میں مقدمہ چلا رہی ہے؟ اور انھیں کیوں نہیں جو اس وقت رجعت پرست حکومت برطانیہ کے اشارے پر جاوا، انڈوچین اور انڈونیشیا کی قومی تحریکوں کو کچلنے میں معروف ہیں؟ یہ سوال جس قدر اہم ہے اسی قدر آسان اور غالباً اُس قدر آسان کہ ہیں اس وقت لگے جواب دینے میں الفاظ صرف کرنا نہیں چاہتا۔ ہر ہندوستانی محب وطن کے ذہن میں اس کا جواب حاضر و موجود ہے۔

ہندوستانی قومی فوج کے ان نوخیز بہادر سپاہیوں کا پُر شباب دل وطن کے جوش محبت سے معمور ہے اُن کے طاقتور بازوؤں نے برطانوی سامراج کی غلامانہ ڈسپلن میں گُھٹنے سے انکار کر دیا اور وطن کی آزادی کی خاطر ہولناک خطرات کو اپنی طرف کھینچ بلایا وہ غلط راستے پر تھے۔ اچھا صاحب! ٹھیک ہے۔ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اُن کی روحوں میں آزادی کا جذبہ تو مچل رہا تھا۔ انھیں وطن کی غلامی کا تو احساس تھا؟ انھیں سامراج کے خلاف سرفروشانہ جد و جہد کرنے کی بلند ہمتی تو تھی؟ وہ ہندوستانی فوج کے بھیڑ بکریوں سے تو مختلف تھے؟

انھوں نے غلطی کی! لیکن کتنی شاندار غلطی! کتنی حسین غلطی! کتنی قابل تعریف اور لائق ستائش غلطی! آج ہر محب وطن کا دل اُن کے لئے محبت کے آنسوؤں سے لبریز ہے آج وطن کا ہر بچہ، جوان اور بوڑھا ان بھولے، معصوم، نوخیز مجاہدوں کو سینے سے لگا لینے کے لئے بیچین و بیتاب ہے جن کے کمسن بازو طوفانوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں جن کے سینے سامراجی مظالم کے پہاڑ اپنے اوپر کھڑا کر سکتے ہیں۔

زندہ باد مجاہد! پائندہ باد مجاہد!

حکومت ہند ان مجاہدوں پر مقدمہ چلا کر ایک ایسی حماقت کا ثبوت دے رہی ہے جس کا ابھی اُسے واضح احساس نہیں ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ ملک کا ہر طبقہ، ہر گروہ، ہر سیاسی جماعت حکومت کے اس طرز عمل کی مذمت میں یک زبان و یک خیال ہے۔ نام نہاد برطانوی جمہوریت فاشزم سے بھی بدتر ہے جو ملک کے سارے عوام کے متفقہ فیصلے اور متفقہ جذبات کو اس بے رحمی کے ساتھ اپنے آہنی قدموں کے نیچے کچل رہی ہے ایسی جمہوریت کے خلاف "غدّاری" کرنا عین ایمان اور عین حُبّ وطن ہے اسلئے وہ مجاہدین وطن جن پر غدّاری کے جرم میں مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ غدّار نہیں ہیں ہرگز نہیں۔ کون کہتا ہے کہ وہ غدّار ہیں؟

صحت اور طاقت بخش

نصف صدی سے مشہور عالم

مدن منجری گولیاں

قبض بدہضمی دور کر کے قوت حافظہ تیز کرتی ہیں۔ خوراک اچھی طرح ہضم کر کے تازہ خون پیدا کرتی ہے۔ دل دماغ معدہ اور جگر کو تقویت دیتی ہیں قوت حافظہ بڑھاتی ہیں سستی اور نامردی نابود کر کے حیرت انگیز طاقت بخشتی ہیں

قیمت فی ڈبیہ ۴۰ گولیاں صرف عہ

گربھامرت چورن

اس دوا کے استعمال سے حیض کی بے قاعدگی دور ہو کر وقت پر صاف و خلاصہ ہوتا ہے۔ رحم کی جملہ خرابیاں اور بانجھ پن کی شکایت دور ہوتی ہے۔ حمل کی حالت میں استعمال کرنے سے حمل کی پرورش ہوتی ہے۔ بچہ تندرست اور طول عمر پیدا ہوتا ہے۔ عورتوں کیلئے مانند اکسیر ہے قیمت فی پیکٹ ڈھائی روپیہ

مدن منجری فارمیسی۔ جام نگر کاٹھیاوار

الہ آباد ایجنٹ ایل۔ ایم ڈھولکیہ برادرس اور مدن اسٹورس جانسین گنج لکھنؤ۔ نگم میڈیکل ہال امین آباد بنارس۔ راجے لال اینڈ سنز چوک کانپور۔ موہن لال آر۔ پاریکھ مسٹن روڈ

جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے۔ بہر لیں سے زیادہ میرے پاس [illegible] ماننا نہ ماننا آپ کا فعل ہے!!!

معجون عنبری

یہ دوا دنیا بھر میں شہرت حاصل کر چکی ہے ولایت تک اس کے چاہنے والے موجود ہیں [illegible] کمزوری کے لئے اکسیر صفت ہے۔ جوان [illegible] سب کھاتے ہیں اس دوا کے مقابلے میں ہزاروں قیمتی ادویات اور کشتہ جات بیکار ہیں اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ بھی ہضم کر سکتے ہیں۔ اس قدر مقوی ہے کہ بچپنے کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں۔ اکثر شل اکسیرات کے تصور فرمائیے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے۔ ایک شیشی چھ سات سیر خون آپ کے جسم میں [illegible] دیگی اس کے استعمال سے ۶ گھنٹہ کام کرنے سے مطلق تھکن نہ ہوگی یہ رخسار و [illegible] شل گلاب کے پھول کے سرخ اور شل انگوروں کے درخشاں بنادیگی۔ یہ نئی دوا نہیں ہے ہزاروں مایوس العلاج اس کے استعمال سے بامراد ہو کر مثل پندرہ سولہ سال جوان کے بن [illegible] ہیں یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے کہ آپ صبر و تحمل نہیں کر سکتے۔ الغرض اس کی صفت تحریر نہیں ہو سکتی تجربہ کر کے دیکھ لیجئے۔ اس سے بہتر مقوی دوا آپ کو دنیا میں نہیں مل سکتی۔

قیمت فی شیشی چار روپئے۔ (عسہ)

نوٹ۔ فائدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست ادویات مفت منگائیے۔ میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے۔ میرا پیشہ خلق خدا کو نفع پہنچانے کا ہے عام مشتہرین کی طرح لوٹنے کا نہیں ہے اب بھی آپ محروم رہیں تو یہ آپ کی قسمت ہے بس۔

پتہ:۔ حکیم ثابت علی پنج زبان (عالم مثنوی مولانا روم) محمود نگر نمبر ۲ لکھنؤ یوپی



امریکن پستول

گرجتی آواز مانند اصلی

سب سے اچھا نئی ایجاد

زبردست

چھ فیر والا

اس پستول کی خوبیاں بیان کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے مگر پھر بھی آپ کو بتائے دیتے ہیں کہ یہ پستول امریکہ کے مقابلہ میں حال ہی میں تیار ہو کر آئے ہیں۔ جن میں خوبی یہ ہے کہ اصلی پستول کی مانند کارتوس رکھنے کی چرخی خود بخود گھومتی ہے اور کارتوس چلنے کی آواز اس زور سے آتی ہے کہ خود چھوڑنے والا بھی حیران رہ جاتا ہے۔ اپنی جان و مال کی حفاظت کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں اس میں ½" کارتوس چلتے ہیں۔ اس پستول کا وزن تقریباً ۱۵۔ اونس ہے۔ لمبائی تقریباً ۱۰ انچ ڈاکو جنگلی جانور اس کی گرج دار آواز و شکل دیکھ کر ہی بھاگ جاتے ہیں قیمت نمبر ۱۱۱۱ پستول مع ۲۵ کارتوس للعہ نمبر ۱۲۱۲ عمدہ کوالٹی اصلی فولاد کا بنا ہوا مع ۵۰ کارتوس [illegible] قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے نمبر ۱۳۱۳ اسپیشل درجہ خاص نیوماڈل مع ۵۵ کارتوس قیمت ۶ روپے آٹھ آنے۔ ۵۰ کارتوس (شات) ایک سو کی قیمت ایک روپیہ۔ پستول کے لئے تیل فی شیشی بارہ آنے محصولڈاک و پیکنگ الگ

الائیڈ ٹریڈرز لمیٹڈ (N.G.A.) نمبر ۴۵ دہلی

فرقہ وارانہ اتحاد کے لئے تہذیبی بنیاد

از: ——— ڈاکٹر سیّد محمود

"پچھلے کافی عرصے سے "نئی زندگی" کے صفحات ڈاکٹر سید محمود صاحب کے بیش بہا مضامین سے خالی رہے ہیں قید و بند کی مجبوریوں کے بعد ڈاکٹر صاحب کی طویل علالت بھی اس میں حائل رہی۔ اس سلسلۂ سکوت کو توڑنے کے لئے یہ مضمون شائع کیا جارہا ہے اور قوی امید کی جاتی ہے کہ آئندہ ہر ماہ 'نئی زندگی' ڈاکٹر صاحب کی کاوش فکر سے مالا مال نظر آئے گا ——— ایڈیٹر

"ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلہ کو تہذیبی بنیاد پر سلجھایا جائے اور دو بڑے فرقوں کی مشترکہ میراث پر زیادہ زور دیا جائے" اس تصور میں ایک قسم کی کشش بھی ہے اور اس کے لئے زبردست حمایت کرانے کی سخت ضرورت ہے یہ اور بات ہے کہ وہ ہمہ گیر ہو۔ اس کی ضرورت صرف اس لئے بھی ہے کہ اسکا بدل جو سیاسی راستہ تلاش کیا گیا ہے وہ بار بار ناکام ثابت ہو چکا ہے مگر کامیاب نتائج حاصل کرنے کے لئے صرف تصور کا دلکش ہونا کافی نہیں ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ آج ہمارے سامنے جو مختلف مسائل ہیں ان کے حل کرنے اور عملی پروگرام پر کاربند ہونے میں اس کا عملی جائزہ لیا جائے مجھے اس بارے میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اگر اس خیال کو عملی جامہ پہنایا گیا تو پہلے ہی قدم پر ہمیں ان لاتعداد اور بھاری رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑیگا جو ان لوگوں نے پیدا کردی ہیں جن کا مفاد اسی میں ہے کہ کسی طرح دو بڑے فرقوں کے درمیان خلیج کو زیادہ گہرا کردیا جائے۔ ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ ہندوستان کا فرقہ وارانہ مسئلہ بڑی حد تک ملک کے اندر کچھ لوگوں کے پروپیگنڈے کا نتیجہ ہے اور وہ پروپیگنڈہ صرف یہی نہیں کرایا گیا بلکہ موثر طور پر کیا گیا کیونکہ ان کے اکثر مفاد اسی پروپیگنڈے پر منحصر تھے۔ تہذیبی بنیاد پر فرقہ وارانہ مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ہمیں کچھ ہاتھ بٹانے والے ملتے ہیں یا نہیں۔ لیکن پچھلے وقتوں میں کچھ ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جنھوں نے تہذیبی بنیاد (Cultural Plan.) کو لے کر اپنی گنگا بہائی اور وہ فرقہ وارانہ مسئلہ ابھارنے میں کامیاب ہوگئے۔

تاریخ ہند پر نظر ثانی کی ضرورت:۔ مثال کے طور پر اس تمام مواد پر نظر کیجئے جو طالب علم طبقے کو تاریخ ہند کے نام سے دیا جاتا ہے۔ آنکھیں بند کرکے کسی تاریخ ہند کو جو نصاب میں داخل ہو اٹھا لیجئے اور اسکی ورق گردانی کرجایئے۔ پہلا ہی نقش ذہن پر یہ قائم ہوگا کہ قریب قریب پچھلے ایک ہزار سال کی تاریخ میں سلطنت حاصل کرنے کے لئے سیاسی قتل و غارت کے سوا کچھ بھی نہیں ہوا اور جہاں تک درمیانی عہد (مسلمانوں کے عہد حکومت) کا تعلق ہے صرف تخت پر بیٹھنے کا یہ ڈرامہ ہی نہیں کھیلا گیا بلکہ یہ بھی ہوا کہ مسلمان بادشاہوں کے لئے سب سے زیادہ ہمت افزا مشغلہ اپنی ہندو رعایا کو کچلنا اور ان کے مندروں کا برباد کرنا ہی رہ گیا تھا۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں یہ کہنا کچھ ناموزوں ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کو پورے ارادے کیساتھ سوچ سمجھ کر اس مقصد کے ماتحت رنگا گیا ہے جو مورخ کے دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ تاریخ ہند کے یوروپین مصنفوں کو تھوڑا بہت خیال ان فائدوں کو مد نظر رکھنے کا ضرور تھا جو یہاں غیر ملکی حکومت کے لئے کارآمد ہوسکیں۔ اور اس کے لئے انھوں نے تاریخ ہند کے اس خاص پہلو پر زور بھی دیا ہے اور مبالغہ سے بھی کام لیا ہے۔

اس حقیقت سے انکار فضول ہے کہ مذہبی تعصبات کی کچھ مثالیں ہندوستان میں مختلف حالات میں ضرور ملتی ہیں۔ لیکن یہی ایک چیز ہے جسے وہ اپنی تاریخی تحریروں میں مورخانہ حقیقت پسندی دکھلانے کیلئے

پیش کرتے ہیں اور یہ اس سے بالکل مختلف ہے جس کے اظہار میں وہ غیر ضروری جرأت دکھاتے ہیں اور ان واقعات کو اڑا دیتے ہیں جن سے اس کے خلاف نتیجہ نکلتا ہو۔ بلا شبہ یہی مورخ جنھیں ہندو رعایا کے پامال ہونے اور مندر مسمار کرنے کی مثالیں تلاش کرنے کی بڑی کاوش تھی اگر کہیں اپنی تائید میں غیر ارادی طور پر طرفداری نہ برتتے تو دوسری طرف ایسے واقعات پیش کرنے پر بھی مجبور ہو جاتے جن سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا کہ تمام مذہبی اور سیاسی اختلافات کے باوجود مسلم حاکموں اور ان کی ہندو رعایا کے درمیان خوشگوار تعلقات کے حلقے تیار ہوتے چلے جا رہے تھے۔

ایک ہلکی سی روشنی سے یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ دراصل اس سے انکار بہت دشوار ہے کیونکہ یہ بات ناممکن تھی کہ مسلمان حکمران صرف کشت و خون کی طاقت سے اتنے وسیع علاقے اور عظیم الشان ملک پر معمولی انتظامات کی مشینری کا سہارا لے کر نظام حکومت چلا سکتے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ درمیانی عہد کے مسلمان حکمرانوں کو اتنی سہولتیں حاصل نہ تھیں جو آج برطانوی حکومت کو حاصل ہیں مثلاً یہ کہ اُن کے پاس ایسے اعلیٰ ہتھیار نہ تھے جو عام رعایا کے لئے رکھنا اور خریدنا ناممکن ہو۔ اس سے یہ نتیجہ بھی برآمد ہوتا ہے کہ ہندوؤں کو متعصبانہ سزائیں قانون ریاست کے ماتحت بے حد محدود ہوتی ہونگی۔ اوّل تو مسلمان بادشاہ کافی مہذب لوگ تھے اور پھر ہندو مذہب میں اتنی صلاحیت تھی کہ وہ اپنا وقار منوا سکے۔ پھر مسلمانوں کا ہندوؤں سے ناروا سلوک کیونکر جاری رہ سکتا تھا۔

قیمتی تحریریں :۔ ابھی حال میں الہ آباد کے پنڈت سندر لال نے مجھے مطلع کیا کہ انھوں نے خود اُجین کے ایک مشہور مندر کے پجاری لکشمی نرائن کے پاس کچھ شاہی فرمان اور اصل کاغذات دیکھے ہیں میں ان دنوں سیواگرام میں تھا۔ میں نے پنڈت لکشمی نرائن سے درخواست کی کہ وہ ان کاغذات اور تحریروں کو لے کر مجھ سے سیواگرام میں مل لیں۔ چنانچہ پنڈت جی نے بڑی عنایت کی اور وہ مع ایک بنڈل کے سیواگرام میں مجھ سے ملنے آئے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ ان کی اشاعت کے لئے بہت مشتاق ہیں۔ کاغذات دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ان کے پاس اکبر سے لے کر اورنگ زیب تک کے فرمان سلسلہ بسلسلہ موجود ہیں جن میں اُجین کے ان مندروں کے تمام جاگیریں وقف کی گئی ہیں جن کے پجاری پنڈت جی کے بزرگ اس زمانہ میں ہو رہے تھے۔ کچھ ایسے بھی فرمان اور تحریریں تھیں جن میں جاگیروں اور "وردینے" کے جھگڑے قضئے چکائے گئے تھے۔

میں نے پنڈت جی سے کہا کہ وہ انھیں پنڈت سندر لال اور ڈاکٹر تارا چند کے پاس الہ آباد لے جائیں اور آجکل ڈاکٹر تارا چند تفصیل سے ان کا مطالعہ کر رہے ہیں اور عنقریب چھوٹی کتاب کی صورت میں اپنے تبصرہ و تعارف کے ساتھ لے کے شائع کریں گے۔

میں نے ان میں سے دو یا غالباً تین تحریروں کی نقل لے لی۔ ایک تو شاہجہاں کے عہد حکومت کی تحریر ہے اور اس پر اورنگ زیب کے بھائی شہزادہ مراد کے دستخط موجود ہیں۔ یہ شہزادہ گجرات اور مالوہ کا گورنر تھا۔ دیو نرائن کی رپورٹ پر حکیم محمد مہدی نے سرکاری طور پر سفارش کی تھی کہ حکومت کی طرف سے گھی کی کچھ مقدار منظور کی جائے تاکہ "مہاکال دیوال" میں مورتی کے سامنے اس سے روشنی کی جائے۔ اس پر سلطان مراد بخش نے حکم دیا کہ روزانہ ۴ سیر گھی اکبری پیمانے سے مندر کو دیا جائے۔ اصل حکم کی ایک نقل اجین بھیج دی گئی اور غالباً اسی نقل سے ایک نوٹ پجاری کو اطلاعاً روانہ کر دیا گیا۔

دوسرا کاغذ کسی مندر میں ۳۶۰ روپیہ کی چوری کی تحقیقاتی رپورٹ ہے۔ مندر سے یہ روپیہ چرایا گیا تھا۔ تحقیقات مکمل ہو جانے پر چوری کا پتہ چل گیا اور کل روپیہ مندر کو واپس کر دیا گیا۔ مزید آٹھ روپیہ جرمانہ چور سے وصول کر کے مدعی کو دیا گیا اور واقعہ کی رپورٹ حکم لینے کے لئے درج ہو گئی۔

اسی تحریر میں دوسری طرف ایک اور واقع کی رپورٹ درج ہے کہ ۱۸۰۰ من غلہ کسی شخص نے زبردستی مندر سے جھپٹ لیا یہ کل غلہ اس کے قبضے سے برآمد کر کے مندر کو واپس کیا گیا۔ ۱۸۰۰ من غلے کی قیمت ۱۲۲ روپیہ تھی۔ غلہ واپس لینے کے بعد چور عدالت العالیہ کے سپرد کر دئے گئے۔

یہ ان تحریروں کا خلاصہ ہے جن پر کسی تنقید و تبصرہ کی ضرورت ہی نہیں۔ ان میں خود جان ہے اور ثبوت موجود ہے اور بعد کے دونوں فرمان شاہی اورنگزیب کے عہد کے ہیں۔ میرے پاس بھی

کچھ ایسے کاغذات موجود ہیں جن میں بہار، بنگال، متھرا اور دوسرے مقامات کے مندروں کے نام جاگیریں اور پجاریوں کے نام روزینے مقرر کئے گئے ہیں۔ یہ فرمان مختلف بادشاہوں کے جاری کئے ہوئے ہیں۔

ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں بلکہ ایک اصول اور قانون تھا۔ آج بھی ریاست حیدرآباد میں ٹھاکردواروں اور مندروں کے نام بڑی بڑی جاگیریں وقف ہیں اور یہ ریاست مغلوں کی روایات پر قدم بقدم چل رہی ہے۔

حیدرآباد میں کسی مسلمان ولی اللہ کی درگاہ ہے جس کی نگرانی اور انتظام پوری طرح ایک ہندو خاندان کے ہاتھوں میں سینکڑوں سال سے چلا آتا ہے۔ اور اس کی ساری آمدنی اسی خاندان کو پہنچتی ہے۔

گزشتہ عہد وسطیٰ میں ہندو مسلمانوں کے ایسے معاشرتی اور تہذیبی تعلقات قائم تھے لیکن ہمارے کانوں تک یہ چیزیں کم پہنچی ہیں اور ہمارے نونہالوں کے دماغ پر اس من گھڑت بغض و عناد کی داستانیں نقش ڈالتی رہتی ہیں۔

اگر ہمیں فرقہ وارانہ مسئلے کو تہذیبی بنیاد پر سلجھانا ہے تو ہمیں پورے عزم سے کام لے کر ہندوستان کے تاریخی نصاب کو نئے سرے سے لکھنا ہوگا۔ اس مضمون سے میرا منشا یہی ہے کہ ہمیں مسلمان حکمرانوں اور ان کی ہندو رعایا کے تعلقات کے بارے میں جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حقیقت اور صاف بیانی ہمیشہ کامیاب اور مفید رہتی ہے۔

ہندوستان اور اسلام

از: اے۔ ایم۔ حبیب اللہ

آج سے بارہ سو سال قبل عرب کے مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی فوج نے بری اور بحری راستے سے دریائے سندھ کے دہانے پر حملہ کیا۔ حملہ آور حیرت انگیز تیز رفتاری کے ساتھ پوری دریائے سندھ کی وادی پر چھا گئے اور سندھ عربوں کا باجگزار ہو گیا۔ دو سو سال تک سندھ خلفائے اسلام کی وسیع و عریض سلطنت کا ایک حصہ رہا۔ اس کے بعد ہندوستان میں عربوں کے پھیلنے اور بڑھنے کا سلسلہ بند ہو گیا اور عرصے تک بند رہا۔ سندھ کے عرب مسلمان اپنے وطن سے دور ہونے کے سبب علیٰحدہ ہو گئے اور ساتھ ہی انکی نسل میں ہندی خون کی آمیزش شروع ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کی فوجی نوآبادیات کے اس چھوٹے سے جزیرے کا دم گھٹنے لگا۔ اگر ترک نہ ہوتے تو اسلام شاید ہندوستان سے ختم ہو گیا ہوتا لیکن نو مسلم ترکوں نے ہندوستان کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے درۂ خیبر سے داخل ہونا شروع کیا اور اپنی آہنی ضربوں سے ہندو طاقتوں کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن اب بھی اسلام کے قدم ہندوستان میں مضبوطی سے نہیں جمنے پائے۔ دو سو سال کے بعد ترک مسلمانوں نے پھر ہندوستان پر فوجی حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا اور اس بار پوری وادی گنگا میں مشرق تک مسلمان سیاسی اور فوجی اعتبار سے چھا گئے اس وقت سے لیکر اٹھارویں صدی تک اسلام برابر ہندوستان کی زندگی اور افکار و خیالات پر حاوی رہا ہے۔

آج ہندی مسلمانوں کی جو پوزیشن ہے وہ بہت حد تک اسی تاریخی حقیقت کی پیداوار ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں کی موجودہ حیثیت کو متعین کرنے میں اس تاریخی حقیقت کے علاوہ اور کسی چیز کا حصہ نہیں رہا ہے۔ مثال کے طور پر آج ہندوستان میں مسلمانوں کی جو تقریباً ۵ کروڑ آبادی ہے تو مسلمانوں کی یہ تعداد محض اس لئے نہیں کہ یہاں مسلمان آٹھ صدیوں تک حکومت کرتے رہے بلکہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کے اور بھی اسباب ہیں۔ سندھ پر مسلمانوں کے حملے سے پہلے بھی مسلمان تاجر ہندوستان میں موجود تھے اور فتح سندھ یا فتح شمالی ہند سے پہلے بھی مسلمان ہندوستان میں داخل ہوتے رہے اور یہاں کے لوگ اسلام قبول کرتے رہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے قیام اور حکومت نے یہاں کی تہذیب پر جو اثر ڈالا وہ آپ اپنی مثال ہے۔ ایران اور مصر کو مسلمانوں کے فتوحات نے تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے یکسر بدل دیا یہاں تک کہ پرانے اور نئے مصر و ایران میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں رہی۔ اسپین میں بھی تقریباً ایسا ہی ہوا۔ چین میں بھی مسلمانوں کی زبردست آبادی ہے جو نتیجہ ہے اس بات کا کہ وہاں مسلمان تجارت کے سلسلے میں داخل ہوئے۔ لیکن چین میں کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ بدھ مذہب کا پیرو ہے یا اسلام کا۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں مسلمانوں کو دوسری قوموں کے افراد سے الگ کرنا بہت آسان ہے۔ ہندی مسلمان کے متعلق ہمیں سب سے پہلے یہ بات علم میں آتی ہے کہ اس کا نام عربی ہوتا ہے اس کے اطوار و آداب یہاں تک کہ کھانا پکانے کے طریقے بھی عربی اور ایرانی ہوتے ہیں اور مسلمان بچوں کو جو کہانیاں سنائی جاتی ہیں اُن کا پس منظر ہندوستانی زندگی اور فضا سے ماخوذ نہیں ہوتا۔ پھر بھی ہندی مسلمان خود کو ہندوستان میں اجنبی نہیں پاتا اور نہ یہودیوں کی طرح وہ کسی وعدہ کی ہوئی سرزمین (فلسطین) کے خواب دیکھتا ہے۔ ہندوستان کے قومی گیت "ہندوستاں ہمارا" ایک ہندی مسلمان شاعر اقبال کی تخلیق ہے۔ ان تمام باتوں کا دراصل مطلب یہ ہے کہ ہندوستان اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کو تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے مفتوح کرنے میں ناکام رہے۔

یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ہندوستان اور مسلمان تہذیبی اعتبار سے ایک دوسرے کو فتح کرنے میں جو ناکام رہے تو اس کا اصلی یا خاص سبب مذہب نہیں تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اعتقادات، مذہبی اداروں اور رسوم و رواج میں ہندوستانی ماحول کا بہت گہرا اثر موجود ہے۔ ہندوستانی

کے لئے ایک ایسے مذہب کو اپنے وہاں جگہ دینے میں کوئی دقت نہیں پیدا ہو سکتی تھی جس میں نہ تو ذات پات کا جھگڑا تھا اور نہ رسومات کی بھرمار تھی اور جس میں وحدت الوجود اور مساوات کے اصولوں کا خاص دخل تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے طرف سے اس بات کی کوشش ہوئی کہ اسلام اور ہندومت کے مشترکہ اصولوں کی دریافت کی جائے اور ان پر زور دیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی عہد متوسط کے ایک اپنشد کا زمانہ کی دستبرد سے بچا ہوا ایک حصہ اس سلسلے میں مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے جسے "اللہ کا اپنشد" نام دیا گیا تھا۔ اس اپنشد میں اسلام کی دینی شخصیتوں اور ہستیوں اور اسلامی اصولوں کی سنسکرت اور ہندو رنگ اور سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسلام کیوں ہندوستان میں اپنے قدم مضبوطی کے ساتھ نہیں جما سکا اسکی خاص وجہ ہندوستان کے جغرافیائی حالات میں پوشیدہ ہے۔ ایشیا کے تمام ملکوں میں ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں باہر والے سب سے زیادہ آسانی سے داخل ہو سکتے تھے، اسکے علاوہ ہندوستان ایشیا کا سب سے زیادہ دولت مند ملک تھا اور اسکی جائے وقوع بھی بہت حد تک مرکزی واقع ہوئی ہے نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں مسلسل طور پر نئی قومیں اور نئے خیالات داخل ہوتے رہے جو یہاں کی زندگی میں گھل مل گئے۔ عہد قدیم سے لیکر عہد متوسط تک ہندوستان کی مذہبی اور تہذیبی بے تعصبی اور عالمگیر انسان دوستی اپنا کام کرتی رہی، جو نتیجہ تھی بہت حد تک ہندوستان کی جغرافیائی جائے وقوع کا۔ ہندوستان کے باہر کی اسلامی دنیا سے مسلسل طور پر مسلمان ہندوستان میں آتے جاتے رہے، چنانچہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے مذہبی اور بین الاقوامی تعلقات کو بھول جانے کا موقع نہ ملا۔ وقتے وقتے سے یہ بین الاقوامی رشتے انکی آنکھوں کے سامنے اُجاگر ہوتے رہتے تھے۔ عرب اور ایران یہ دو ممالک ایسے ہیں جنھوں نے کلی طور پر اسلامی کلچر کی سرشت اور شکل و صورت کو معین کیا ہے۔ لیکن ہندی مسلمانوں کے ذہن کو سب سے زیادہ ایران نے متاثر کیا ہے بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پورے مرکزی ایشیا کے مسلمانوں پر سب سے زیادہ ایران ہی کے تہذیبی اثرات چھائے رہے ہیں۔ ایران کا یہ اثر اتنا گہرا ثابت ہوا ہے کہ غالباً یورپ پر قدیم یونان کی تہذیب نے بھی اتنا اثر

نہیں جمایا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایرانی تہذیب کے کلی طور پر چھا جانے اور حاوی ہو جانے والے اثرات سے خود کو محفوظ رکھنا غیر ممکن تھا، صرف مشرقی ہند کے مسلمان کچھ حد تک محفوظ رہے ایرانی تہذیب صدیوں تک ہندی مسلمانوں کے سماجی رسوم و رواج، طور طریق زبان اور ادبی اسالیب بیان تک کہ تخیلات کو بھی متعین و متاثر کرتی رہی۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندی مسلمان خود ہندوستان کی زندگی اور ماحول سے متاثر نہیں ہوئے۔ بلکہ اگر دیکھا جائے تو اُن پر ہندوستان کے اثرات بھی اتنے ہی حاوی اور گہرے ہیں جسقدر ایران کے۔ ظاہر ہے کہ کسی قوم کے ساتھ دن رات رہتے ہوئے اس کے ماحول سے خود کو پورے طور پر بچائے رکھنا ناممکن العمل ہے۔ ہندوستان کے مسلمان اُسی نسل کے ہیں جس نسل کے بقیہ ہندوستان کے لوگ، چنانچہ ہندوؤں کی طرح ہندوستان کے مسلمان بھی زبان اور نسل کے اعتبار سے مختلف گروہوں میں منقسم ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے خون میں ہندوستانی نظریہ حیات بسا ہوا ہے اور زندگی کی طرف ان کا رویہ وہی ہے جو ہندوؤں کا۔ مثلاً ہندی مسلمان بھی حیات بعد ممات کو دنیاوی زندگی کے مقابلہ میں زیادہ اہم سمجھتا ہے اور اُسے ترجیح دیتا ہے وہ دنیاوی زندگی کو مصائب و آلام اور ٹریجڈی سے معمور پاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ہندوؤں ہی کی طرح مختلف نسلوں، تہذیبوں اور مذہبوں کے مشترکہ اصولوں کی تلاش میں رہتا ہے اور ان کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرنے کا خواہشمند ہے۔ غرض ہندی مسلمانوں میں جتنا اثر ایران کا ہے اتنا ہی ہندوستان کا بھی ہے۔

ہندوستان کے مسلمان دو چیزوں کے لئے اپنے اندر وفاداری اور محبت کا جذبہ محسوس کرتے ہیں۔ ایک تو ہندوستان کے لئے اور دوسرے اس "ایرانی اسلامی" تہذیب کے لئے جو اُنھیں ورثے میں ملی ہے۔ ہندی مسلمان اس قسم کی قومیت کو اپنے پورے وجود کے ساتھ نہیں تسلیم کرتا جس کا مطلب ہے کہ فرد اپنا تمام تر جذبۂ وفاداری اور محبت اپنے ملک یا علاقے کے لئے مخصوص کردے اور ساری دنیا سے ذہنی اور جذباتی طور پر خود کو علیحدہ محسوس کرنے لگے اور ہندو نظریۂ قومیت کا یہی تقاضا ہے۔ ہندی مسلمان خود کو "بین الاقوامیت پسند" محسوس کرتا ہے، وہ روایتی

طور پر ساری دنیا کے انسان کے مساوی اور یکساں ہونے کے اصول پر اعتقاد رکھتا ہے۔ اسلامی ملکوں سے بھی اس کی دلچسپی اور ذہنی لگاؤ اتنا ہی گہرا ہے جس قدر کہ خود مادرِ وطن ہندوستان سے ۱۹۱۴ء کی عالمگیر جنگ میں فاتح اتحادیوں نے سلطان ترکی کے ساتھ جو ذلیل اور توہین آمیز سلوک کیا تھا اُس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں زبردست بےچینی پیدا ہوئی انھوں نے سلطان ترکی کی دوبارہ بحالی کے لئے تحریک بھی چلائی (یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ دنیا میں صرف ہندوستان ہی کے مسلمان ایسے تھے جنھوں نے اس قسم کی تحریک جاری کی) اس ایجی ٹیشن نے سوائے اسکے کہ خود ترکوں کے لئے تفریح کا موقعہ فراہم کیا اور کوئی نتیجہ نہیں پیدا کیا۔ یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر مذہب اسلام کی جذباتی گرفت جس قدر مضبوط ہے اتنی غالباً عرب یا مصر کے مسلمانوں پر بھی نہیں۔

ہندی مسلمانوں کے اندر جو یہ ملکی اور غیر ملکی دو قسم کے رجحانات کام کر رہے ہیں اُن کے درمیان ایک مناسب سمجھوتہ ہونا ضروری ہے اور یہی سمجھوتہ تاریخ اور مدبرین کے اُن مطالبات کو پورا کر سکتا ہے جو انھوں نے ہندی مسلمانوں سے وابستہ کر رکھا ہے۔ سیاسی محکومی کا اثر مسلمانوں کے شعور کی گہرائیوں پر چھایا ہوا ہے اور آج وہ آزادی کے اتنے شدید طور پر خواہشمند نظر آتے ہیں کہ اپنا سب کچھ تج دینے کے لئے تیار ہیں۔ ایرانی تہذیب کے اثرات اب مٹ رہے ہیں اور ہندوستان کے ماحول اور فضا اور یہاں کے خون کی آمیزش اپنا اثر دکھلا رہی ہے۔ مغرب کی سامراجی محکومی جتنی زیادہ ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے اتنا ہی زیادہ مسلمان بھی اب دنیا سے منہ موڑ کر اُن قدروں اور تہذیبی دولت کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں، جو انھیں یکساں طور پر ہندوستان اور اسلام سے ورثے میں ملی ہے۔

اگر ہندوستان مسلمانوں سے بالکل قطع تعلق کرے تو کیا ہو؟ اگر اسپین کے مسلمانوں کی طرح ہندوستان کے مسلمان بھی یہاں سے ہجرت کر جائیں تو کیا ہندوستان گھاٹے میں رہے گا؟ کیا ہندوستان کے مسلمانوں کا ہندوستان کی تہذیب کے بنانے اور سنوارنے میں کوئی حصّہ رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ آخری دونوں سوالات کا جواب "ہاں" ہے اور بہت پُرزور "ہاں" اگر ہندوستان سے مسلمان چلے جائیں تو ہندوستان تہذیبی اعتبار سے مفلس ہو جائے گا۔ ہندوستانی طرزِ فکر، ہندوستانی فنونِ لطیفہ اور ہندوستانی آداب و اطوار مسلمانوں کے تہذیبی اثرات سے بھرے پڑے ہیں اور وہ کبھی مٹ نہیں سکتے۔

پہلے مذہب ہی کو لیجئے۔ ہندوؤں کے مختلف مذاہب میں بہت سی آزاد خیال اصلاحی تحریکیں جو پیدا ہوئیں وہ براہ راست طور پر اسلام کے نظریۂ وحدت کا نتیجہ تھیں۔ سولہویں صدی کے ہندوؤں میں جب زبردست مذہبی اور روحانی تحقیق و تلاش کا جذبہ پیدا ہوا تو سکھ مذہب جیسا سیدھا سادہ مذہب پیدا ہوا جس میں نہ تو ذات پات کا جھگڑا ہے نہ مذہبی رسومات اور بت پرستی کا دخل۔ یہ مذہب آج ہندوستان کے بہترین سپاہیوں کا مذہب ہے۔ قریب قریب اسی زمانے میں مشرقی ہند میں ذات پات کی تفریقوں اور عبادت کے پرانے بے روح تصنع آمیز طریقوں کے خلاف ردّ عمل پیدا ہوا اور ویشنو فرقے کی بنیاد ڈالی گئی۔ یہ فرقہ اتنی ہی آزاد خیالی کا حامی تھا جس قدر کہ سکھ فرقہ۔ مسلمان گھرانے کے ایک اَن پڑھ جلاہے کبیر نے ایک اور مذہبی جماعت کی بنیاد ڈالی جس کے عقائد میں ایک طرف اگر انسانی مساوات اور وحدت الوجود کے نظریے شامل تھے جو دوسری طرف اسکی بنیاد ہندو مذہب کی جذباتیت پر قائم تھی۔ اسلام کے مذہبی اور سماجی نظریے اب بھی ہندوستانی ذہن میں کام کر رہے ہیں۔ ایک ہی صدی ہوئی کہ بنگال میں برہمو جماعت کی بنیاد ڈالی گئی جس میں ذات پات کی تفریق مٹا ڈالی گئی اور جس کی بنیاد وحدت الوجود کے نظریے پر قائم ہے۔ یہ فرقہ بھی کافی ترقی پسند اصولوں کا حامی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اسلام کا نظریۂ اخوت و وحدت الوجود نہ ہوتا تو ہندو مذہب میں یہ اصلاحیں بہت دیر میں آتیں۔

قدیم ہندوستان میں ایک واحد زبان (سنسکرت زبان) پورے ہندوستان میں بولی جاتی تھی یا نہیں یہ بات ابھی معرضِ شک میں ہے۔ لیکن تاریخی عہد میں ہندوستان کو ایک مشترکہ اور واحد زبان اگر کسی نے عطا کی تو مسلمانوں نے۔ یہ لسانی اتحاد سیاسی اتحاد کا اصلی پیش خیمہ ہے اردو زبان۔ چاہے آپ اسے ہندوستانی کہہ لیجئے۔ انگریزی کی طرح کسی غیر ملک سے نہیں آئی۔ اردو یوں پیدا ہوئی کہ ہندوستان میں پہلے سے رائج بول چال کی ایک زبان کو مسلمان حکمرانوں نے اپنے الفاظ و

اصطلاحات سے گر بہت کی ہندی زبان بنا دیا۔ ہندوستان کی کئی زبانوں اور ادبیات کے ارتقار اور عروج میں مسلمان بادشاہوں کی بے تعصبانہ ہمدردی کام کر رہی تھی۔

فنون لطیفہ میں بھی مسلمانوں کی خدمات ناقابل انکار ہیں ہندوستان کے طول و عرض میں بے شمار ایسی مسجدیں، مقبرے اور مینار یں پھیلی ہوئی ہیں جن کے فنی اور جمالیاتی اصول ہندوستانی فن تعمیر کے جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ ہندوستان کے معماروں کو مسلمانوں ہی نے محراب بنانا اور کنکریٹ اور مسالوں کا استعمال بتایا۔ اس سے پہلے وسیع و عریض چھتیں کھڑی کرنے کے لئے بیشمار کھمبوں کی ضرورت ہوتی تھی لیکن کنکریٹ اور مسالوں کے استعمال کے بعد بڑی بڑی چھتیں کھڑی کرنے کے لئے بے شمار کھمبوں کی ضرورت باقی نہیں رہی سطح پر نقش و نگار بنانے کے فن میں مسلمانوں نے جو اضافہ کیا ہے اس میں جتنا تنوع ہے اتنا ہی حسن و دلکشی بھی ہندو عمارتیں بھاری بھر کم اور مضبوطی کے لئے مشہور تھیں، مسلمانوں نے آکر یہاں کے طرز تعمیر میں حسن اور شان کا اضافہ کیا۔ مسلمانوں نے آکر ہندوستانی طرز تعمیر میں جدت اور تنوع، وقار، شان اور خوشنمائی پیدا کی۔ قطب مینار کا وقار اور شان اور تاج محل کی پُر راز اور خوابناک تعمیر حسین ترین مثالیں ہیں اور یہ دونوں عمارتیں ہندوستانی طرز تعمیر کی اعلیٰ ترین خصوصیات کی حامل ہیں۔

فنون لطیفہ موسیقی میں بھی مسلمانوں کی خدمات اعلیٰ اور قابل تحسین ہیں انھوں نے ہندوستان کی کلاسیکل موسیقی کو نہ صرف یہ کہ قائم رکھا بلکہ اسے پہلے سے بھی زیادہ چمکا دیا۔ خود مسلمانوں کے وہاں پہلے سے فن موسیقی کی کوئی روایت نہ تھی اور مسلمان جو کچھ تھوڑا بہت باہر سے لائے بھی تو وہ ہندوستانی موسیقی سے بنیادی طور پر مختلف تھا بلکہ بعض اعتبار سے تو بالکل مخالف اصولوں پر قائم تھا۔ لیکن مسلمانوں نے بہت جلد ہندوستانی موسیقی سے اپنے ذوق سماعت کو ہم آہنگ کر لیا اور مغربی ایشیا کے کچھ آلات موسیقی سے ہندوستانی موسیقی کو ایک نیا وجود بخشا۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کو معمولی نہیں بلکہ زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ اسکا ثبوت یہ ہے کہ کلاسیکل موسیقی کی تاریخ میں ہندوؤں سے زیادہ مسلمان موسیقاروں کے نام ملتے ہیں۔ اس کے متعدد راگ مسلمانوں ہی سے منسوب ہیں۔ اسکے علاوہ فن موسیقی کی متعدد اصطلاحات اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ یہ فن کس حد تک مسلمانوں کا مرہون منت ہے۔

جہاں تک فن مصوری کا تعلق ہے ہندوؤں کے پاس پہلے سے ایک ترقی یافتہ طرز موجود تھا، اجنتا کی دیواروں کے نقش و نگار کی پوری دنیا کے آرٹ میں اہمیت ہے۔ لیکن پوٹرٹ اور مینیچر DEVELOPMENT OF PORTRAIT AND MINIATURE خالصتاً مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ مغل حکمران اپنے ذوق جمالیات کے لئے مشہور و معروف تھے۔ وہ نہ صرف یہ کہ ایران سے اپنے ساتھ مصوری کے ماہرین کو ہندوستان لائے بلکہ خود ہندوستانی مصوروں کی تعلیم و تربیت کی طرف متوجہ ہوئے اور اس طرح فن مصوری میں ایک ایسی روایت کی بنیاد ڈالی جس کے اثرات اب تک ہندوستانی مصوری سے مٹائے نہیں جا سکے۔ مغل اسکول نے جس طرز کی بنیاد ڈالی اور جسے بعد میں کانگڑہ اور راجپوتانہ میں اختیار کیا گیا وہ ایرانی اور ہندوستانی ذوق اور طرز کے بہترین اتحاد اور ہم آہنگی کا ثبوت دیتا ہے۔ اس میں ہندوستانی مصوری کی رنگارنگی اور چمک دمک اور ایرانی مصوروں کے احساس توازن اور خوشنمائی منظر کا ایک حسین سنگم ہے۔ اگر آپ کسی MINIATURE COLLECTION کو اٹھا کر دیکھیں تو اس میں آپ مختلف رنگوں کی ماہرانہ آمیزش اور تفصیلات

ملاحظہ فرمائیں گے اور یہ چیز انسانی شکل اور مناظر دونوں کی تصویر کشی میں موجود ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندی طرز کی مصوری میں بعض اوقات تفصیلات کی بھرمار فن کار کے مجموعی تاثر کو دھندلا کر دیتی ہے۔ پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستانی فن مصوری میں مسلم مصوروں نے کچھ ایسے عناصر پیدا کئے جن کے بغیر کوئی جدید فنکار بھی اپنا کام نہیں چلا سکتا۔

ہندوستان کی تنظیم حکومت اور قانون سے متعلق شعبوں پر مسلمانوں کا اثر زیادہ عملی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ ہندوستان میں موجودہ برطانوی تنظیم حکومت مغل عہد کی تنظیمی بنیادوں پر قائم ہے برطانوی تنظیم حکومت کی عمارت کا نچلا حصہ بالکل مغل عہد کی یادگار ہے یہاں تک کہ عملے بھی وہی ہیں جو اس زمانے میں تھے ہندوستان میں افسر شاہی (BUREAUCRACY) کوئی نئی چیز نہیں ہے، یا کم سے کم یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے اسلامی عہد میں یہ چیز ضرور موجود تھی۔ اس وقت حکومت کی جو تنظیم اور شعبے ہیں وہ مسلم طرز حکومت سے ماخوذ ہیں اور انھیں ذرا انگریزی طرز پر ڈھال لیا گیا ہے قانونی اصطلاحات اور عدالتوں اور ریونیو کے جو قاعدے اور طریقے اس وقت رائج ہیں اُن پر اسلامی عہد حکومت کا اور بھی براہ راست اثر ہے۔ ان شعبوں میں ہندوستان کے رنگ مسلم عہد کی اصطلاحات اور قاعدوں اور طریقوں کی سختی سے پابندی کرتی ہیں، دو سو سال کی برطانوی حکومت بھی اُن کا استعمال نہ ترک کر سکی۔ آپ ہندوستان کی کسی بھی عدالت میں قدم رکھئے اور مقدمہ بازوں، وکیلوں اور کلرکوں سے گفتگو کیجئے آپ کو فوراً محسوس ہو جائے گا کہ عدالتوں اور قانون پر ہندو عہد کا قطعی کوئی اثر نہیں ہے اور کم سے کم اس شعبے میں مسلم عہد حکومت اب بھی قائم ہے۔

ہندوستان کبھی بھی مسلمانوں کے بغیر اپنی ہندوستانیت نہیں قائم رکھ سکتا۔ اسلئے کہ مسلمانوں نے ہندوستان کی زندگی اور تہذیب سے اپنے کو بالکل گوندھ سا لیا ہے۔ اگر آپ ہندوستان کے اصلی دولت مند اعلیٰ شریف طبقے کی زندگی پر نظر ڈالیں (وہ دولت مند شریف طبقہ نہیں جس نے بھدے انداز میں مغربیت اختیار کرلی ہے) تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت نے کتنا گہرا اثر ڈالا ہے۔ لباس، آداب و اطوار، کھانا یہاں تک کہ کھانے کے برتن اور دیگر سامان، گھریلو طور طریقے، گفتگو کی زبان یہ تمام چیزیں مسلمانوں کی بخشی ہوئی ہیں۔ ہندو راجا اور مسلمان نوابوں میں لباس طور طریقوں اور خانگی طرز حیات کے لحاظ سے قطعی کوئی فرق نہیں، ہندوستان کی زندگی سے اگر مسلمانوں کو علیحدہ کر دیا جائے تو جو کچھ حسن و دلکشی، وقار اور آزاد خیالی اور آزادروی پائی جاتی ہے وہ سب ختم ہو جائے۔

التماس

"نئی زندگی" میں جتنے مضامین چھپتے ہیں اس کا حق کاپی رائٹ بحق نئی زندگی محفوظ ہے اسلئے کوئی صاحب اسکے مضامین بغیر پروپرائٹر (مسٹر سید انیس الرحمن) کی اجازت کے کتابی شکل میں یا کسی اور طرح نہ چھاپیں، ورنہ جوابدہ ہونا پڑے گا، جو اخبار یا رسائل اس کے مضامین نقل کریں وہ "نئی زندگی" الہ آباد کا حوالہ ضرور دیں۔

چندہ کی رقم جمع ہو جانے کے بعد واپس نہیں کی جا سکتی ہے۔

بعض حضرات وی، پی طلب فرما کر واپس کر دیا کرتے ہیں اور دفتر کو محصول ڈاک کی زیر باری اُٹھانی پڑتی ہے لہذا مجبوراً ہم نے وی پی کے ذریعہ پرچہ بھیجنا بند کر دیا ہے، چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجیں وی، پی آرڈر کی تعمیل اس شرط میں البتہ ہو سکتی ہے کہ پہلے محصول ڈاک دفتر کو موصول ہو جایا کرے۔

جواب طلب امور کیلئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ روانہ فرمائیں ورنہ دفتر تعمیل سے معذور سمجھا جائے۔

نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیں۔

"منیجر"

نئے ہندوستان کی خارجی پالیسی کیا ہوگی؟

از :— پرنسپل تھیبیا ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس پرنسپل پٹنہ کالج پٹنہ

لارڈ ویول کی دستوری تجویز میں حکومت برطانیہ کی طرف سے یہ اعلان ہوا ہے کہ ہندوستان کے خارجی معاملات آئندہ خود حکومت ہند کے ہاتھ میں رہیں گے۔ اس اعلان سے برطانیہ کی پالیسی میں ایک نئے عہد کا آغاز ہوتا ہے۔ اب تک ہندوستان کے خارجی معاملات برطانیہ کی وزارت خارجہ کے ہاتھوں میں تھے چنانچہ اُن پر وائسرائے کا مکمل اقتدار تھا۔ لیکن اب اس آئندہ ہونے والی دستوری تبدیلی کی روشنی میں اس بات کی تحقیق و تلاش خالی از دلچسپی نہ ہوگی کہ آزاد یا نیم آزاد ہندوستان کی بیرونی پالیسی کیا ہوگی۔

ہندوستان کی رائے عامہ آزادی کی اندرونی جدوجہد میں اتنی زیادہ مصروف رہی ہے کہ اُسے خارجی معاملات پر غور کرنے یا اُن میں حصہ لینے کا بہت کم موقعہ ملا۔ دراصل خارجی معاملات میں دلچسپی لینا کسی ملک کی آزادی اور خودمختاری کا جزو لاینفک ہے۔ صرف ایک بار جب مولانا محمد علی کے زیر قیادت کانگریس نے خلافت تحریک میں مسلمانوں سے اتحاد قائم کیا تھا تو ہندوستان نے بیرون ملکی مسائل میں عملی طور سے حصہ لیا۔ ہندوستان پر برطانیہ کے دور حکومت میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ ہندوستان کی آواز غیر ملکی معاملات کی دنیا میں سنی گئی اور مؤثر ثابت ہوئی۔ ہندوستان کی صدائے احتجاج نے جنگ ترکی و یونان میں برطانیہ کو اپنی پالیسی بدلنے پر مجبور کردیا۔ اسکا اثر اس حد تک ظاہر ہوا کہ ہندوستان کے سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر مانٹیگو نے استعفیٰ بھی پیش کردیا۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ ہندو و مسلمان اگر ہندوستان میں متحد ہو جاویں تو بڑے بڑے کارنامے سرانجام دے سکتے ہیں ورنہ کچھ نہیں کر سکتے۔

لیکن غیر ملکی سیاست میں اس دلچسپی کی بنیاد کسی سائنٹفک [illegible] پر نہیں قائم کی گئی تھی بلکہ محض جذبات پر۔ پھر یہ ایک وقتی اور ہنگامی چیز بھی تھی۔ چنانچہ جب ترکی کا مسئلہ اپنی اہمیت کھو بیٹھا تو اسکا سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ تحریک خلافت کے زوال کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد بھی ختم ہوگیا۔ بعد میں آنے والے ہندوستانی سیاستدانوں اور لیڈروں میں پنڈت جواہر لال نہرو اور کمیونسٹوں نے مخصوص سیاسی نظریوں کے تحت بین الاقوامی سیاست میں کافی دلچسپی دکھلائی۔ حبشہ، جمہوری اسپین اور چین کے معاملات پر ہندوستان میں زبردست دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔ فلسطین کے مسئلہ پر بھی ہندو اور مسلمان دونوں نے کافی ذہنی اور جذباتی لگاؤ کا ثبوت دیا۔ مسلم لیگ نے مسٹر جناح کے زیر قیادت اپنی توجہ زیادہ تر خانگی معاملات پر مرکوز کی ہے اور بین الاقوامی معاملات کو نظرانداز کیا ہے۔ اگر مسلم لیگ خارجی سیاست میں دلچسپی لیتی تو اسکی آواز مشرق قریب اور ایران کے مسائل میں زیادہ بااثر ثابت ہوتی۔ ہندوستان میں ابھی ایسا خارجی طرز عمل پیدا ہی نہیں ہوا ہے جسکی اساس مذہبی جذبات یا نظریوں پر نہ ہو بلکہ ٹھوس اور حقیقی معاشی اور اقتصادی سمجھ بوجھ پر۔ اس سلسلہ میں برطانیہ کا خارجی طرز عمل مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس معیار تک پہنچنے میں ہندوستان کو شاید ابھی دیر لگے گی۔ تین سو سال سے برطانیہ ایسا

خارجی طرزِ عمل اختیار کر رہی ہے جس کا مقصد ہے یورپ میں طاقتوں کے توازن کو قائم رکھنا، اپنے بحری اقتصادی مفادات کا تحفظ کرنا اور ہندوستان کو جن طاقتوں سے نقصان کا خطرہ ہے اُن کی مخالفت کرنا۔ ان مقاصد کے تحت برطانیہ ان تین سو سالوں کے اندر دنیا کی ہر طاقت سے جنگ آزما ہوئی ہے۔ اسپین، فرانس، روس، امریکہ، اٹلی، جرمنی، جاپان، ترکی اور چین کوئی بھی ملک ایسا نہیں بچا جس سے برطانیہ نے اس خارجی طرزِ عمل کے تحت جنگ نہ کی ہو اور چونکہ ہندوستان برطانیہ کا محکوم رہا ہے اسلئے اُسنے بھی ان جنگوں میں برطانیہ کا ساتھ دیا اور کوئی آزاد اور خود مختار خارجی طرزِ عمل نہ اختیار کر سکا۔

فرض کر لیجئے کہ ہندوستان کے خارجی معاملات خود ہندوستانیوں کے ماتحتی میں آجائے تو ایسی حالت میں یہ سوال خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ہندوستان کے اس نئے اختیار کی نوعیت اور حد کیا ہوگی۔ اور کس طرح ہندوستان اس اختیار کو کام میں لا سکے گا۔ یہ بات بہرحال طے ہے کہ ہندوستان کو جو یہ نیا اختیار دیا جا رہا ہے اسکی حد آسٹریلیا، کناڈا، آئرلینڈ اور جنوبی افریقہ کے خارجی اختیارات سے زیادہ نہ ہوگی اسکی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کو غیر ملکی معاملات میں آزادی ملنے کے بعد بھی اس بات کی ضرورت محسوس ہوگی کہ سلطنت برطانیہ کے خارجی طرزِ عمل اور ہندوستان کے خارجی طرزِ عمل کے درمیان کسی نہ کسی قسم کا ربط اور ہم آہنگی برقرار رکھی جائے۔ مثال کے طور پر سلطنت برطانیہ میں شامل کوئی دو طاقتیں آپس میں جنگ نہیں کر سکتیں یا سلطنت برطانیہ میں شامل کوئی طاقت برطانیہ کے دشمن سے اتحاد نہیں قائم کر سکتی۔ ورنہ خود سلطنت برطانیہ کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اگر سلطنت برطانیہ میں شامل کسی دو طاقتوں کے درمیان اختلاف کی صورت پیدا ہوئی تو باہمی گفت و شنید اور رائے مشورے کے ذریعہ اس کو طے کر دیا جائیگا جس طرح آسٹریلیا اور برطانیہ کے درمیان آجکل ہوتا ہے۔ سلطنت برطانیہ میں شامل طاقتوں کی جو مشاورتی کونسل ہوگی اس میں ہندوستان کا کیا اثر اور اختیار ہوگا۔ اس کا انحصار خود ہندوستان کے اتحاد اور طاقت پر ہے۔ اگر ہندوستان اتنا طاقتور ہوگا کہ سلطنت برطانیہ کے فیصلے کو رد کر سکے یا اُسکو تقویت پہنچا سکے اور سلطنت برطانیہ میں شامل دوسری طاقتوں اور اقتدار کو دبا کر خود

اپنے ارادے اور خواہشات کی تکمیل کر سکے تو پھر کیا کہنا!

آج کی صورتِ حال میں اگر دیکھا جائے تو وہ حالات اور مفادات جو ہندوستان کے خارجی طرزِ عمل کو متعین کریں گے تین حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ یہ حالات اور مفادات کچھ تو سیاسی ہیں، کچھ معاشی اور کچھ نظریاتی۔ سیاسی اعتبار سے دیکھا جائے تو ہندوستان نہ صرف یہ کہ اپنی حفاظت چاہتا ہے بلکہ بحرِ ہند میں امن کا تحفظ چاہتا ہے۔ اقتصادی اعتبار سے ہندوستان کا مفاد یہ ہے کہ نہ صرف ہندوستان کا معیارِ زندگی بلند ہو بلکہ آس پاس کے ملکوں میں بھی مادی اور اقتصادی حالات بہتر صورت اختیار کریں۔ یہ کام مختلف ذریعوں سے ہو سکتا ہے مثلاً صنعت کو ترقی دیکر بیکاری دور کی جائے، تجارت کو ترقی دی جائے اور ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے درمیان آبادی کی نقل و حرکت کو فروغ دیا جائے۔ جہانتک سیاسی و سماجی نظریوں کا تعلق ہے ہندوستان یہ چاہتا ہے کہ ماضی، حال اور مستقبل کے تمام مظالم ختم کردئے جائیں۔ مخصوص طور پر ایشیا اور افریقہ کی پچھڑی ہوئی اور رنگدار قوموں اور نسلوں کے خلاف جو تعصب پایا جاتا ہے اسکا قلع قمع کر دیا جائے۔ ہندوستان یہ بھی چاہتا ہے کہ دنیا کے تمام ملکوں کے مخصوص طور پر اسلامی ممالک کے ساتھ تہذیبی اور تمدنی تعلقات کو فروغ دیا جائے۔ مشرقِ قریب اور افریقہ کے علاوہ ایشیا کے جنوبی مشرقی ممالک جو عہدِ قدیم میں ہندوستان کے نوآبادیات رہ چکے ہیں ہندوستان کے تہذیبی اعتبار سے بہت قریب ہیں اور آزاد ہندوستان اُن سے اُن تعلقات کو فروغ دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ہندوستان اور بحرِ ہند

اوپر کے سطور میں جن سیاسی، معاشی اور نظریاتی حقیقتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اُنکا مطلب یہ ہے کہ بحرِ ہند سے ہندوستان کا مفاد خاص طور پر وابستہ ہے ماضی میں بھی ہمیشہ ایسا ہی رہا ہے۔ خود یہ حکومت ہو یا عہدِ مغلیہ یا عہدِ برطانیہ ہر زمانے میں ایسا ہی رہا ہے دراصل دیکھا جائے تو امریکہ کے منرو اصول[1] کے وجود میں آنے سے پہلے ہی برطانیہ کے قسم کے

[1] منرو اصول: [illegible] امریکہ کے صدر منرو نے یہ اصول پیش کیا کہ براعظم امریکہ [illegible] کوئی بھی یورپی طاقت [illegible] امریکہ کی رضامندی کے بغیر نوآبادیات یا حکومت نہیں قائم [illegible]

"بحر ہند اصول" پر کوئی دو سو سال سے عمل پیرا ہے اگرچہ حکومت برطانیہ نے اس اصول کو صاف اور واضح لفظوں میں اس طرح نہیں پیش کیا ہے جس طرح کہ "منرو اصول" پیش کیا گیا ہے۔ دنیا کی جس طاقت نے بھی بحر ہند کے امن و سکون کو برباد کرنے کی کوشش کی اسے برطانیہ سے جھگڑا مول لینا پڑا۔ برطانیہ نے پرتگال، ہالینڈ، فرانس، روس، جرمنی اور جاپان یہانتک کہ چین کی بھی اسلئے مخالفت کی کہ اُن طاقتوں نے بحر ہند کے ساحلوں پر قدم جمانے کی کوشش کی۔ حکومت برطانیہ کے بعد نئی حکومت ہند بالکل فطری طور پر اس آبائی طرز عمل کو برقرار رکھے گی۔ جس طرح امریکہ اور روس اپنے اپنے ملکوں سے قریب کسی علاقہ میں دوسرے ملکوں کے سیاسی اثر و اقتدار کا بڑھنا گوارا نہیں کرتے اسی طرح ہندوستان بھی یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ برما اور ملایا، لنکا اور افریقہ میں کوئی یورپی یا ایشیائی طاقت آکر ہندوستان کے خلاف فضا پیدا کرے۔ اقتصادی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ممالک ہندوستان ہی کا ایک حصہ ہیں۔ ہندوستان ان ممالک کے لئے ایک زبردست بازار کا کام دیتا ہے اور ہندوستان اس کے بدلے اپنی سادہ اور معمولی صنعتی چیزیں ان ملکوں میں بھیجتا ہے۔ یہ چیزیں ان ملکوں کے عوام کے مذاق اور طرز رہائش کے مطابق ہوتی ہیں تہذیبی اعتبار سے دیکھا جائے تو ہندوستان اور ان ملکوں کے درمیان قدیم تعلقات قائم ہیں اور ان تعلقات کی بنیاد مذہب، فنون لطیفہ اور مشترکہ طرز حیات اور طرز فکر پر قائم ہے۔ اس خیال سے کہ ایسا نہ ہو کہ ہندوستان کے ہاتھوں ان ملکوں کا معاشی استحصال نہ ہو یہ بات اچھی ہوگی کہ ان ملکوں کو خاص خاص تجارتی اور اقتصادی مراعات عطا کئے جائیں اور اگر وہ چاہیں تو اُنھیں محصولات کے اعتبار سے بھی متحد ہونے کا موقع دیا جائے بلکہ اگر وہ چاہیں تو سیاسی اعتبار سے بھی ایک ہی وفاق کے تحت آسکتے ہیں۔ اس سے تمام آس پاس کے ملکوں کا فائدہ ہوگا۔ اس قسم کی سیاسی تنظیم سان فرانسسکو کانفرنس کے فیصلوں اور اسپرٹ کے خلاف بھی نہیں ہوگی اسلئے کہ اس قسم کی علاقائی تنظیم کی تجویزیں وہاں منظور کی گئیں ہیں مخصوص طور پر امریکہ اور روس کی تجویزیں۔ گذشتہ جنگ کے ابتدائی سالوں میں اسی قسم کی ایک ایسٹرن گروپ کانفرنس (EASTERN GROUP CONFERENCE) وجود میں آئی تھی۔ جس کی سر اکبر حیدری صدارت کرتے تھے۔ بعد میں آسٹریلیا اس گروپ سے علیحدہ ہوگیا۔ اسی نمونہ کے مطابق آئندہ کے ہندوستان اور مشرقی ایشیا کے درمیان وفاق قائم کیا جا سکتا ہے اور اسکے لئے زبردست معاشی وجہ جواز بھی موجود ہے۔

اسلامی دنیا

ہندوستان میں تمام اسلامی ممالک کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے یہاں کوئی نو کروڑ کے قریب مسلمان بستے ہیں چنانچہ اسلامی دنیا کے تمام واقعات ہندوستان کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ اس بنا پر ہندوستان کے تعلقات اسلامی دنیا سے خاص طور پر گہرے ہیں۔ موجودہ جنگ کے دوران میں ہندوستان نے اسلامی ممالک کو مخصوص طور پر ان اسلامی ممالک کو جو بحر ہند کے ساحل پر آباد ہیں کپڑا، کھانا اور فوجی اہمیت کی چیزیں مہیا کی ہیں یہانتک کہ اس سلسلہ میں ہندوستان نے خود اپنی ضروریات کو قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا ہے۔ ساتھ ہی ہندوستانی فوجوں نے اسلامی ممالک کی فوجی محافظت بھی کی ہے۔ چنانچہ یہ فرض کرنا غلط نہ ہوگا کہ امن کے زمانے میں اسلامی دنیا سے ہندوستان کے موجودہ تجارتی تعلقات اور ترقی کریں گے اور ہندوستان میں مشرق قریب کے تیل اور دیگر معدنیات کی سب سے زیادہ کھپت ہوگی۔ چنانچہ ہندوستان اس بات کی کوشش کریگا کہ مشرق قریب کے یہ علاقے جو شیعوں اور سنیوں کے مقدس مقامات پر مشتمل ہیں، روس، فرانس اور امریکہ کے قبضہ میں نہ چلے جائیں یہ طاقتیں مشرق قریب کے تیل کے خزانوں پر قبضہ کرنے کے لئے بےچین ہیں مسٹر جناح نے حال ہی میں ملک شام میں فرانسیسیوں کے مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور گاندھی جی نے اسکی پرزور تائید اور حمایت کی۔ یہ صدائے احتجاج بالکل مناسب حال تھی اور اسکے پیچھے تمام ہندوستانیوں کی تائید ہے صرف افسوس کی بات یہ ہے کہ اس صدائے احتجاج کو کافی با اثر نہیں بنایا گیا اسلئے کہ خود ملک میں اندرونی اختلافات موجود ہیں۔ مولانا محمد علی مرحوم نے تحریک خلافت کے ذریعے ترکی کی حمایت میں ہندوستان بھر کی رائے عامہ کو بیدار کر کے زبردست تدبر اور سیاستدانی کا ثبوت دیا تھا آج اسی قسم کی تحریک کو دوبارہ زندہ کرنے کی ضرورت ہے صرف اس فرق کے ساتھ کہ اسکی جذباتی اور مذہبی بنیاد ختم کر دی جائے۔

برطانوی اثر کے تحت جو عرب لیگ قائم ہوئی ہے اُس سے دوستانہ تعلقات بڑھانا ہندوستان کے لئے ضروری ہوگا۔ ہندوستان کے لئے یہ بھی ضروری ہوگا کہ ایران کو مالی اور (TECHNICAL) امداد پہنچائے تاکہ ایران اپنی حالت درست کر سکے۔ اس قسم کی مالی اور TECHNICAL امداد نیپال اور افغانستان کو بھی پہنچانے کی ضرورت ہوگی۔ اسلئے کہ نیپال اور افغانستان کسی زمانے میں ہندوستان ہی کے حصے تھے۔

جنوبی مشرقی ایشیا

جنوبی مشرقی ایشیا کی بودھ اور اسلامی دنیا کے ساتھ کچھ خاص مشکل مسائل وابستہ ہیں۔ سیام کو چھوڑ کر اس علاقے کے تمام ممالک جو کسی زمانے میں ہندوستان کی نوآبادیات رہ چکے ہیں۔ آج برطانیہ فرانس اور ہالینڈ کے محکوم ہیں۔ ان ملکوں سے ہندوستان کے تعلقات اور مفاد رنگ، مذہب، تاریخ اور اقتصادی مفاد پر مبنی ہیں۔ ان ملکوں میں کافی ہندوستانی بھی جاکر آباد ہوگئے ہیں۔ ان اسباب کی بنا پر جنوبی مشرقی ایشیا میں یورپی ممالک کی بنسبت ہندوستان کے مفاد زیادہ ہیں۔ یہ ممالک ہندوستان کو غذا فراہم کرتے ہیں پھر ہندوستان کی زائد آبادی وہیں جاکر بستی ہے چنانچہ سان فرانسسکو کانفرنس کے فیصلے کے مطابق اگر ان علاقوں کو کسی امانت دار کونسل کے کنٹرول میں رکھا گیا تو مناسب ہوگا کہ اس کونسل میں چین کی طرح ہندوستان کو بھی ایک نشست دی جائے یہی نہیں بلکہ ضرورت ہے کہ ہندوستان ان ملکوں سے زیادہ گہرے تعلقات قائم کرنے کے لئے کچھ خاص قسم کی اقتصادی اور سیاسی مراعات کی پیش کش کرے۔ یہاں پر یہ بات نہ بھولنا چاہئے کہ کسی زمانے میں ارل آف منٹو اول کے تحت اسٹریٹس (STRAITS) کا علاقہ ہندوستان کا ایک حصہ تھا۔ سیام، کوچین چین، کمبوڈیا، انام، جاوا، سماٹرا اور بلی ہندوستان کی قدیم نوآبادیات ہیں اور آج بھی ان ملکوں میں ہندوستانی تاجروں کی ایک بہت بڑی تعداد آباد ہے ان علاقوں میں ہندوستان اور چین کے مفادات کے ٹکرانے کا اندیشہ ہے اسلئے کہ یہاں ہندوستان اور چینی باشندے مادی ضروریات کے حصول کے لئے ایک دوسرے سے مقابلہ پر آمادہ ہیں۔ اس کشمکش میں ابتک چینیوں کی فتح ہوئی ہے اسلئے کہ وہ زیادہ ہمت ور منظم اور متحد ہیں اور انہیں اپنے وطن کی سیاسی حمایت اور تائید بھی حاصل ہے لیکن ہندوستانیوں کے ساتھ یہ دقت رہی ہے کہ جو ہندوستان وہاں آباد ہونے گئے وہ زیادہ تر دراصل کے ساہوکار اور قلی تھے چنانچہ اُن کے اندر ایسی خصوصیات تھیں جنکی بنا پر وہ اُن علاقوں میں باعزت مرتبہ اور درجہ نہیں حاصل کر سکتے تھے۔ اب حال ہی میں کچھ معلم، ڈاکٹر اور قانون دان ان ملکوں میں گئے ہیں ضرورت ہے کہ ہندوستان میں ایسے لوگوں کی امداد کی جائے۔ حکومت ہند کی طرف سے انکی بہت کم ہمت افزائی کی گئی ہے اور اسکے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ ہندوستان سے قلی طبقے کے لوگوں کو جانے سے روکا جائے ہاں انھیں اس شرط پر جانے دیا جاسکتا ہے کہ اُنھیں وہاں کاشت کیلئے زمین دی جائے۔ ان طریقوں سے یہ فائدہ ہوگا کہ خود ہندوستان میں تعلیم یافتہ طبقے کی بیکاری دور ہوگی۔

چین اور روس

جہانتک ایشیائی ممالک کا تعلق ہے ہر ہندوستانی کی یہ خواہش ہے کہ چین اور روس کے ساتھ قدیم دوستانہ تعلقات برقرار رکھے جائیں۔ لیکن ان تعلقات میں بیچ بیچ میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ اگر روس نے زار کے زمانہ کی پالیسی برتتے ہوئے افغانستان ایران اور ترکی کے امن اور تحفظ کو برباد کرنے کی کوشش کی اور ہندوستان کے خانگی معاملات میں دخل اندازی کی تو خلل ضرور واقع ہوگا اور اگر چین نے بھی تبت چینی ترکستان اور جنوبی مشرقی ایشیا میں اپنے پرانے سامراج کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی تو ہندوستان سے اُسکے پرانے دوستانہ تعلقات قائم نہیں رہ سکتے۔ چین سے یہ بات ناممکن بھی نہیں۔ اسلئے کہ چین میں دو ہزار سال تک شہنشاہیت قائم رہی یہ شہنشاہیت زمانۂ حال کے جمہوری اور کمیونسٹ اثرات کے تحت دور نہیں ہوسکتی اسلئے کہ یہ جمہوریت اور کمیونزم چین میں جاپان کے وقتی مظالم کے وجہ سے پیدا ہوئی۔ چین کے موجودہ مدبرین منگولیا، منچوریا، ترکستان اور تبت کو اُسی طرح چین کے زیرنگیں لانا چاہتے ہیں۔ جیسے چین خاص کے اٹھارہ صوبوں کو۔ در آنحالیکہ تہذیبی، مذہبی اور تاریخی اعتبار سے ان ممالک کا چین سے کوئی تعلق نہیں۔ آئندہ زمانہ میں چین اور ہندوستان یا روس اور ہندوستان کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کیلئے اس امر کی ضرورت ہے کہ اُن ہمسایہ ملکوں

کی خودمختاری پر زور دیا جائے جن پر چین اور روس دانت لگائے ہیں اور اس بات کی کوشش کی جائے کہ عالمگیر انجمن محافظت اُنکے علاقوں کے تحفظ کا ذمہ خود لے لے ایسی حالت میں ہوسکتا ہے کہ آسٹریلیا کے ساتھ ملکر ہندوستان بھی بین الاقوامی تنظیم میں عظیم طاقتوں کے اثرات کو روکنے کی کوشش کرے۔

امریکہ امریکہ اور ہندوستان میں آگے چل کر اگر اختلاف پیدا ہوسکتا ہے تو مندرجہ ذیل معاملات پر:- ایک تو امریکہ نے رنگ دار قوموں کے خلاف دیوار قائم کر رکھی ہے۔ دوسرے دنیا کے اقتصادی ذرائع پر مکمل قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ پھر امریکہ دوسروں کو تو یہ مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے اپنے ملک کا دروازہ امریکی مال کیلئے کھلا رکھیں لیکن امریکہ خود غیر ملک کے مال اور پیداوار کے لئے اپنا دروازہ بند رکھتا ہے۔ اگر امریکہ یہ چاہتا ہے کہ براعظم امریکہ پر کوئی غیر ملک قدم نہ جمائے تو اُسکا اخلاقی فرض ہے کہ وہ خود بحر ہند میں ہندوستان کے مخصوص مفادات کے پیش نظر قدم جمانے کی کوشش نہ کرے۔ اگر امریکہ ساری دنیا میں جمہوریت کا بول بالا چاہتا ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ خود اپنے یہاں ریڈ انڈین اور نیگرو (NEGRO) قوموں کے ساتھ شریفانہ سلوک روا رکھے۔ اگر امریکہ دنیا کے بازاروں میں اپنے وہاں کے بنے ہوئے مال بھیج کر امریکنوں کی بیکاری دور کرانا چاہتا ہے تو اُسکا فرض ہے کہ وہ ساری دنیا کو اسی طرح زندہ رہنے کی اجازت دے۔ بہرحال ہندوستان اور امریکہ کے درمیان یہ اختلافات باہمی رضامندی اور گفت و شنید سے طے ہوسکتے ہیں۔

امن و امان صرف اقتصادی مفاد کی بنیاد پر قائم ہوسکتا ہے

اوپر جو خاکہ پیش کیا گیا ہے اُس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا کے ہر ملک کے ساتھ ہندوستان پُرامن تعلقات قائم رکھ سکتا ہے اور ہندوستان کو دنیا کے کسی ملک سے بھی اتنا بنیادی اختلاف نہیں ہے کہ اُسے پُرامن طریقے سے نہ طے کیا جاسکے۔ ہندوستان اشوک کے زمانے کی روایات میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہیں دنیا کے بڑے بڑے مذاہب پیدا ہوئے۔ چنانچہ ہندوستان کو جنگ سے فطری نفرت ہے۔ ہندوستان اس دنیا کو نہیں چاہتا کہ

کسی طرح سے اُس کی مادی زندگی کا معیار بلند ہو اور اُس کی ترقی ہوتی آبادی کی مادی ضروریات کے پورے ہونے کا سامان ہوتا رہے۔ ہندوستان کا یہ مقصد اُسی حالت میں پورا ہوسکتا ہے کہ موجودہ برطانوی سامراج کا ڈھانچہ ٹوٹ جائے۔ اور وہ صحیح معنوں میں آزاد اور خودمختار ملکوں کا کامن ویلتھ بن جائے اس کے ساتھ ہی رنگ اور اسکے تعصبات کا بھی خاتمہ ہوجائے۔

ہندوستان کا آئندہ خارجی طرز عمل لازمی طور پر ہندوستان کی اقتصادی ضروریات کا پابند ہوگا اس قسم کے خارجی طرز عمل کی تعمیر دنیا کے ملکوں سے دانشمندانہ گفت و شنید کے ذریعہ ہوسکتی ہے لیکن جب تک ہندوستان خودمختار نہیں ہوتا اس وقت تک ہندوستان کا خارجی طرز عمل یہ ہونا چاہئے کہ وہ ایشیا اور افریقہ کی کمزور اور پچھڑی ہوئی قوموں کی رہنمائی کا سہرا اپنے سر لے لے۔ یہ رہنمائی بہرحال عارضی ہوگی۔ یعنی اس وقت تک جب تک دنیا کی سامراجی طاقتیں ان قوموں کو آزاد نہیں کردیتی ہیں۔

گاندھی جی اور مزاح

از :— ڈاکٹر امیا چکرورتی - ایم - اے ، ڈی فل ، (آکسفورڈ)

"گاندھی جی نے ایک مرتبہ کہا کہ اگر میرے اندر مزاح کا مادّہ موجود نہ ہوتا تو میں مدتوں پہلے خودکشی کر چکا ہوتا۔ یہ ظاہر ہے کہ ہم گاندھی جی کے منہ سے نکلی بات کو جھوٹ نہیں قرار دے سکتے اُن کی زندگی کے کسی ایک دن کو بھی لے لیجئے تو آپ اُسے اتنے سارے واقعات سے معمور پائیںگے کہ اُن سے کتنی الف لیلہ کی کہانیاں تعمیر ہو سکتی ہیں :- طرح طرح کے واقعات ، قسم قسم کے لوگوں سے ملاقاتیں بے شمار مسائل پر بحث و مباحثہ جس میں اختلاف کا اظہار بھی ہوتا ہے اور اتفاق کا بھی ، ہر میدان اور ہر قوم کے لوگوں سے ملاقات ، احمق اور مذہبی تنگ نظروں سے لے کر بے غرض سیاسی کارکنوں تک انتھک خط و کتابت وغیرہ وغیرہ۔ یہ ہے گاندھی جی کی روزمرّہ کی زندگی روزانہ زندگی کی اس مشین کو مسلسل حرکت میں رکھنے کے لئے خوش مزاجی کی سخت ضرورت ہوتی ہے اور خوش مزاجی ہی ہر مزاح کی بنیاد ہے۔

گاندھی جی کی روزمرّہ کی زندگی میں ، مزاحیہ الفاظ ، سکون بخش جملوں مسکراہٹوں اور مخالف کو بے دست و پا کر دینے والے قہقہوں کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ جملے ، الفاظ اور قہقہے بہت برمحل ہوتے ہیں اور دوست اور مخالف دونوں کو بہت جلد مطمئن کر دیتے ہیں گاندھی جی کا روزمرہ کا کام صحیح معنوں میں اسی قسم کے مزاح اور خوش مزاجی کے ماحول میں شروع ہوتا ہے اور بلا کسی رکاوٹ کے جاری بھی رہتا ہے۔

میں نے گاندھی جی کو پہلی مرتبہ سابرمتی میں اُن کے آشرم میں دیکھا اس کے بعد واردھا میں۔ گاندھی جی کی روزمرّہ زندگی میں ہمیشہ ایک ہی قسم کی کہانی ہوتی ہے لیکن اختلاف رنگ کے ساتھ اور یہ اختلاف رنگ اس لئے ہوتا ہے کہ ہر روز غیر متوقع واقعات و حادثات نئے نئے مسائل نئے نئے قسم کے لوگ اُنکی زندگی میں داخل ہوتے رہتے ہیں نئے نئے قسم کے سوالات اور مطالبے اُنکے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ گاندھی جی کے اندر اپنے اوپر قابو کا مادہ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ہر وقت ہر کام کے لئے تیار رہتے ہیں۔ وہ اتنے ہی آزاد معلوم ہوتے ہیں جتنا کہ ایک بچہ لیکن سچ پوچھئے تو اُن کی داخلی زندگی کو قومی اور سیاسی زندگی کی پابندیاں جکڑے رہتی ہیں۔ چونکہ اُنکی داخلی زندگی پابندیوں سے معمور ہے اسلئے گاندھی جی سے ملنے کے بعد بیک وقت آزادی اور پابندیوں دونوں کا احساس ہوتا ہے۔ اُنکی گفتگو اور عمل میں حقیقت کا عنصر بہت کافی موجود رہتا ہے اور ان کو اسکا احساس ہوئے بغیر نہیں رہتا ہے۔ گاندھی جی اپنی ملاقات میں پہلے اسی حقیقت کا احساس کراتے ہیں اسکے بعد اپنی رائے یا مشورہ منہ سے نکالتے ہیں۔ یہ مشورہ ہمیشہ کسی مخصوص حقیقت پر مبنی ہوتا ہے یا تفصیلی مطالعہ پر۔ واقعیت کا یہ عنصر اُنکی زبردست یادداشت کے ساتھ ملکر اُنکے ریمارک میں حاضر دماغی پیدا کرتا ہے۔ اور ان کا جواب کچھ اس انداز سے اُن کے سامنے آتا ہے کہ سننے والا اسکی کشش کو محسوس کئے بغیر نہیں رہتا لیکن عام طور پر اُن کے حاضر دماغی سے بھرے ہوئے جملوں اور مزاح کا لطف دُہرانے میں ختم ہو جاتا ہے۔ اسلئے کہ عام طور پر اس قسم کا مذاق اُسی موقعہ اور فضا کے لئے موزوں ہوتا ہے۔ دوبارہ بیان کرنے سے اُسکا لطف جاتا رہتا ہے۔ اُنکے مزاح کو صحیح صحیح طور پر بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن وہ ہمارے ذہن سے کبھی بھولتا بھی نہیں۔ اُنکے اوپر جو مذاقی اور ذہنی تناؤ کی فضا قائم رہتی ہے وہ اُنکے اچانک قہقہوں اور مزاح کے بعد تر و تازہ اور لطف خیز ہو جاتی ہے مثلاً گاندھی جی جہاں بیٹھے ہیں اس سے کچھ فاصلہ پر ایک صاحب اپنے کسی ساتھی سے سرگوشی کر رہے ہیں گاندھی جی کہتے ہیں "وہ صاحب وہ سازش ہو رہی ہے"

جملہ سننے والے پہلا چونک پڑتا ہے۔ پھر گاندھی جی کا دوسرا جملہ یوں آتا ہے "ڈکیوں صاحب چائے کے لئے یہ سازش ہو رہی ہے" فضا میں مسکراہٹ اور مسرت پھیل جاتی ہے۔ سننے والوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ جن صاحب پر یہ جملہ صرف کئے جا رہے ہیں وہ چائے کے عادی ہیں چار بج چکے ہیں۔ چائے کا وقت آ گیا ہے۔ لیکن اس بیچارے ملاقاتی کے دماغ میں چائے کا خیال بھی نہیں کہ اتنی مشکلوں سے تو گاندھی جی سے ملاقات کا موقعہ ملا ہے اور اتنی جلدی یہاں چائے کا مطالبہ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ لیکن فوراً ہی میزبان (گاندھی جی) یہ احساس کرا دیتا ہے کہ چائے موجود ہے اور اس وقت آ سکتی ہے۔ اور کچھ نہیں تو آشرم کی ایک خاموش ممبر سے اس سلسلہ میں مدد لی جا سکتی ہے۔ یہ خاموش ممبر کون ہے؟ گاندھی جی کی بیوی کستورابا — یہ اُس وقت کی بات ہے جب کستوربا زندہ تھیں۔

غرض گاندھی جی کے مزاح میں اس فضا کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ جو انکے اردگرد قائم رہتی ہے۔ یہی فضا انکے مزاح کو بااثر بناتی ہے۔ گاندھی جی کا مزاح اس وقت اور بھی شدید اور پُر تاثیر ہوتا ہے جب کوئی نازک موقعہ درپیش ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جب وہ جیل جا رہے ہوں یا پہلے ہی سے جیل میں بیٹھے ہوں یا کسی اور شخص کے جرم کی پاداش میں وہ برت کر رہے ہوں اور ایسا برت جسکا اختتام موت پر کرنا چاہتے ہوں۔ اسی قسم کے ایک واقعہ کو فلپ میلریوں بیان کرتا ہے "جب عنقریب گرفتار ہونے کی اطلاع انھیں ملی تو انھوں نے اپنے دوستوں سے ہنس ہنس کر اور مسرت و انبساط سے بھرے ہوئے لب ولہجہ میں باتیں کیں" "اپنے ہر دوست کے لئے گاندھی جی نے اپنی مسرت اور خوش مزاجی کو ہر طرف پھیلا دیا" یہ اُنکی خصوصیت ہے ...... ایک موقعہ پر لالہ لاجپت رائے مہاتما جی کے زخموں کی تکلیف پر اظہار افسوس کر رہے تھے گاندھی جی نے کہا کہ اگر یہ پٹیاں وغیرہ نہیں بندھی رہتیں تو خوب کھل کھل کر ہنستا۔ گاندھی جی کے اس اظہار مسرت اور مزاح کے سامنے لالہ لاجپت رائے کا اظہار افسوس بالکل بچوں کا سا معلوم ہونے لگا۔

گاندھی جی نے زندگی میں جن مصائب و مشکلات کا مقابلہ کیا ہے وہ انکے ذہن اور روح میں محفوظ ہیں پھر بھی انکو اس وقت دیکھئے جب وہ اپنا کام شروع کرنے کی تیاری کر رہے ہوں اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کسی تفریحی مشغلے پر جا رہے ہیں۔ سابرمتی جیل میں وہ اپنے ملاقاتیوں سے اس طرح باتیں کر رہے تھے اور انکے لہجہ میں اتنی مسرت تھی جیسے کوئی اسکول کا لڑکا تعطیل کے ابتدائی دنوں میں خوشی سے پھولا نہ سما رہا ہو

مہاتما جی کی زندگی اتنے زیادہ عرصہ تک جیلوں میں گذری ہے کہ ان کے بہت سے مزاحیہ جملے جیل کی تاریک اور پُر راز دنیا سے وابستہ ہوتے ہیں ہر کوئی اس حقیقت سے واقف ہے کہ گاندھی جی ایک آئیڈیل قیدی ہیں۔ وہ جیل کے قاعدوں کو بہت غور و خوض اور توجہ کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور بڑی پابندی سے اُن قاعدوں پر چلتے ہیں لیکن وہ ایک بے حد دقت آمیز قیدی بھی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ جیل کے معمولی سے معمولی نوکر سے لیکر اعلیٰ سے اعلیٰ افسر تک کو اپنی خوشدلی اور حسن سیرت سے بے دست و پا کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ جیل کے افسروں کو ان کے سامنے احساس پستی ہونے لگتا ہے اور کسی حالت میں بھی گاندھی جی پر پابندیاں عاید نہیں کر سکتے۔ پھر دوسری بات یہ کہ وہ جیل کے قاعدوں میں خرابیاں نکالتے ہیں اور جیل کے تمام قیدیوں کو اس سے فائدہ پہونچتا ہے۔ بے شمار افریقی اور ہندوستانی قیدخانوں میں انھوں نے قیدیوں کے جائز حقوق کے لئے جدوجہد کی ہے۔ گاندھی جی کو خود کئی قسم کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ان میں سے ایک دقت کا وہ حکیم اجمل خاں کے نام ایک خط میں یوں تذکرہ کرتے ہیں یہ خط انھوں نے یربدا جیل سے لکھا تھا :—

"مجھے سات کتابیں اپنے پاس رکھنے کے لئے پوری ذہانت اور عقلمندی صرف کرنی پڑتی تھی ان میں سے ایک مذہبی موضوع پر تھی اور ایک پُرانی ڈکشنری جسکی میں بہت قدر کرتا ہوں اور ایک اُردو زبان کا MANVAL تھا جو مولانا ابوالکلام آزاد نے مجھے دیا تھا۔ ....

مجھے جیل والوں نے یہ کہا تھا کہ یہ ساتوں کتابیں جیل کی لائبریری میں جمع کردو اور دوبارہ اسے اپنے نام پر نکلوا دو۔"

گاندھی جی کے لئے یہ بات دقت طلب تھی انھوں نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا کہ انھیں اس کتاب کی اتنی ضرورت ہوتی ہے جتنی کہ دلچسپی کی چنانچہ انھوں نے اپنے اخلاقی دباؤ سے سپرنٹنڈنٹ کو مجبور کیا کہ وہ کتابیں گاندھی جی خود اپنے پاس رکھیں۔

اس زمانہ میں گاندھی جی کو ایک اور دقت کا سامنا ہوا۔ وہ اپنا ...ٹا سا چاقو اپنے ہی پاس رکھنا چاہتے تھے اسلئے کہ اس سے وہ ...لیموں کاٹتے تھے لیکن جیل کے قاعدہ کے مطابق چاقو رکھنا منع تھا۔ ...ندھی جی نے حکیم اجمل خاں کو اپنے خط میں لکھا: میں نے سپرنٹنڈنٹ ...ے صاف صاف کہہ دیا کہ یا تو مجھے روٹی اور لیموں دو یا چاقو کے ...ستعمال کی اجازت دو۔ حسب معمول گاندھی جی کا مطالبہ صحیح تھا اور ...ر اس مطالبہ کو انھوں نے خوش مزاجی سے پیش کیا تھا۔ چنانچہ وہ منظور ...ے بغیر نہ رہا۔ آخر انھیں چاقو کے استعمال کی اجازت مل گئی لیکن ...س شرط پر کہ چاقو وارڈر صاحب کے پاس رہا کرے گا اور گاندھی جی ...ن میں دو بار لیموں کاٹنے کے اوقات میں وارڈر صاحب سے چاقو ...ے لیا کریں اور پھر واپس کر دیں۔ چنانچہ وہ اپنے خط میں اس کا ...ں مذاق اڑاتے ہیں "اس قسم کی باتیں جیل کے افسروں کے لئے ...بت اونچی تھیں، ، نہیں تو گہرے غور و فکر اور روحانی سوچ بچار ...ں سے فرصت نہیں ملتی"۔

گاندھی جی جب جیل سے باہر آتے ہیں تو وہاں بھی عوام اور سیاسی ...اقعات ایک طرح سے انھیں مقید کر لیتے ہیں۔ لیکن وہ اس دنیا میں ...ں کسی طرح خوش خوش زندہ رہ سکتے ہیں۔ جہاں احموں کی بات آ جاتی ہے وہاں وہ بھی نہیں دبتے لیکن ساتھ ہی وہ اپنی خوش مزاجی بھی ...رقرار رکھتے ہیں۔ گاندھی جی کے اندر خوش مزاجی کوٹ کوٹ کر بھری ...ہوئی ہے ان کے اندر وہی "روحانی انبساط" پایا جاتا ہے جسے ریکاڈیش ...نے ونی فرڈ ہولبی سے منسوب کیا ہے اور جو انسان کو مصائب و آلام ...یں بھی مسکرانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ڈاکٹروں کو گاندھی جی کی اس ...صفت کا خوب علم ہے اس لئے کہ گاندھی جی جب جیل سے باہر یا جیل کے اندر ...برت کے سلسلے میں یا کسی مرض کے شکار ہو کر بستر سے لگ جاتے ہیں تو اس حالت میں بھی ڈاکٹروں سے مذاق کرنے میں نہیں ہچکچاتے یہ ڈاکٹر ہندوستان کے ہر اطراف سے انھیں دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں مہاتما گاندھی کو جدید انگریزی ادویات سے کچھ زیادہ شغف نہیں پھر بھی انھیں اپنے طبیبوں سے سمجھوتہ کر ہی لینا پڑتا ہے لیکن وہ ڈاکٹروں سے نوک جھونک کئے بغیر نہیں رہتے ایسی حالت میں بھی کہ وہ بیمار ...گے پڑے ہیں اور ڈاکٹر ان کی جانچ میں مصروف ہے اور مرض کے

متعلق ان سے سوال پر سوال کئے جا رہا ہے۔ ایک بار جب مشہور ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے کو اسٹیتھو سکوپ لگانے سے روکنے کی کوشش کی اور جب ڈاکٹر صاحب انھیں اس آلے سے جانچنے پر مصر ہوئے تو آخر گاندھی جی نے ایک ہارے ہوئے غازی کی طرح ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "اچھا کیجئے حملہ" جیسے فاتح دشمن کے ساتھ رعایت کر رہے ہوں۔ عجیب منظر تھا۔ جیسے ایک ولی اپنے بستر پر دم توڑ رہا تھا چاروں طرف اس کے دوست خاموش کھڑے تھے۔ دور سے کسی کے منتر پڑھنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس بات کی ناخوشگوار مجبوری کہ ڈاکٹر مریض کو پریشان کئے بغیر اپنا فرض نہیں انجام دے سکتا اور پھر ان تمام چیزوں کے درمیان ہندوستان کے اس زبردست شہید کی خوش مزاجی اور لطف و مزاح سے بھری باتیں۔ گاندھی جی کے الفاظ نے اس وقت میرے دل میں جو خاص لطف و مسرت پیدا کیا اس کا بیان میری قوت سے باہر ہے۔

میں ابھی یہ کہہ رہا تھا کہ گاندھی جی جیل کے باہر بھی ایک طرح سے مقید ہی رہتے ہیں اس قید سے تو نجات ممکن نہیں لیکن یہ قید اس وقت بے حد خطرناک اور جان لیوا ہو جاتا ہے جب گاندھی جی جرنلسٹوں کے درمیان مقید ہو جاتے ہیں۔ خاص کر جب امریکن جرنلسٹ یا امریکن مارکہ جرنلسٹ انھیں گھیر لیتے ہیں اور سوالات کی بوچھار شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر گاندھی جی کے جواب میں مزاح کم اور حاضر دماغی[1] زیادہ ہوتی ہے۔ پھر ایک عجیب معنی خیزی اور اختصار بھی ہوتا ہے جو سیدھے دل کو جا کر لگتا ہے لیکر بغض یا عداوت کبھی نہیں ہوتی اگرچہ ان کے جملوں کی نوک بہت تیز ہوتی ہے اور اسی لئے وہ کہے بھی جاتے ہیں کہ تیر کی طرح دل کو لگیں۔

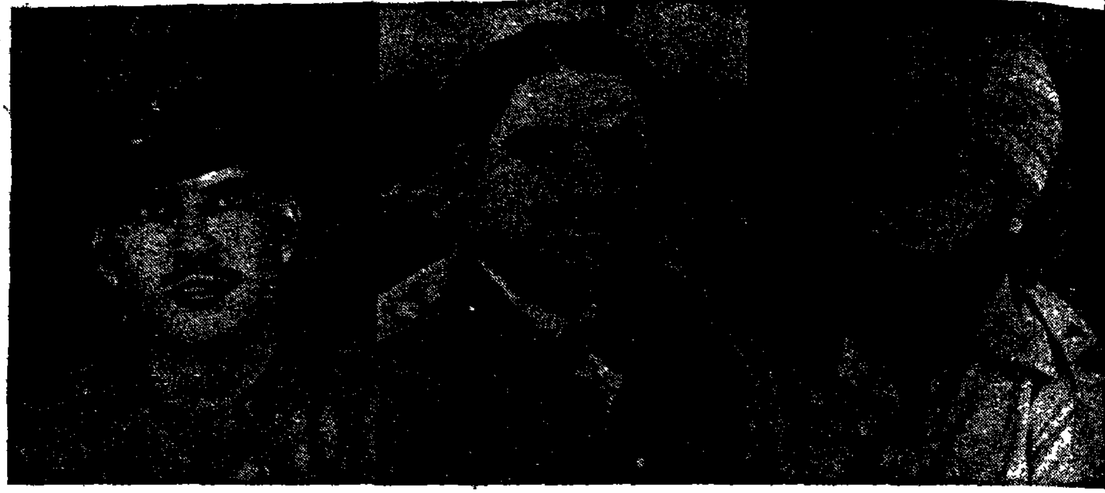
"کیا آپ واقعی مہاتما ہیں؟" ایک چالاک جرنلسٹ نے سوال کیا۔

"مجھے تو کچھ محسوس نہیں ہوتا" گاندھی جی نے جواب دیا۔

"اگر ایسا ہے تو کیا آپ "مہاتما" کے لفظ کی تعریف کر سکتے ہیں؟"

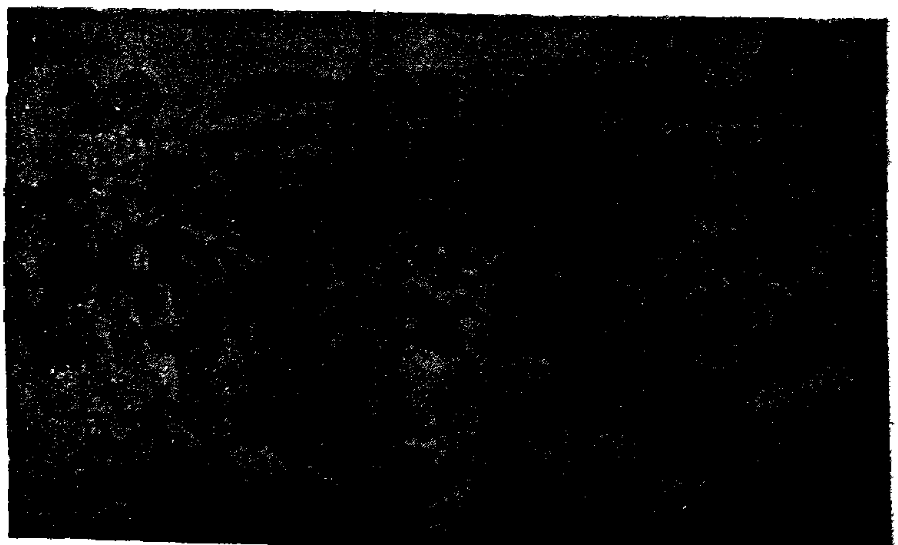
---

[1] مزاح (HUMOUR) اور حاضر دماغی (WIT) میں یہ فرق ہے کہ موخر الذکر ہمارے دماغ کو متاثر کرتا ہے اور اول الذکر ہمارے دل کو۔



کپتان سہگل ۔ کپتان شاہنواز ۔ کپتان ڈھلین

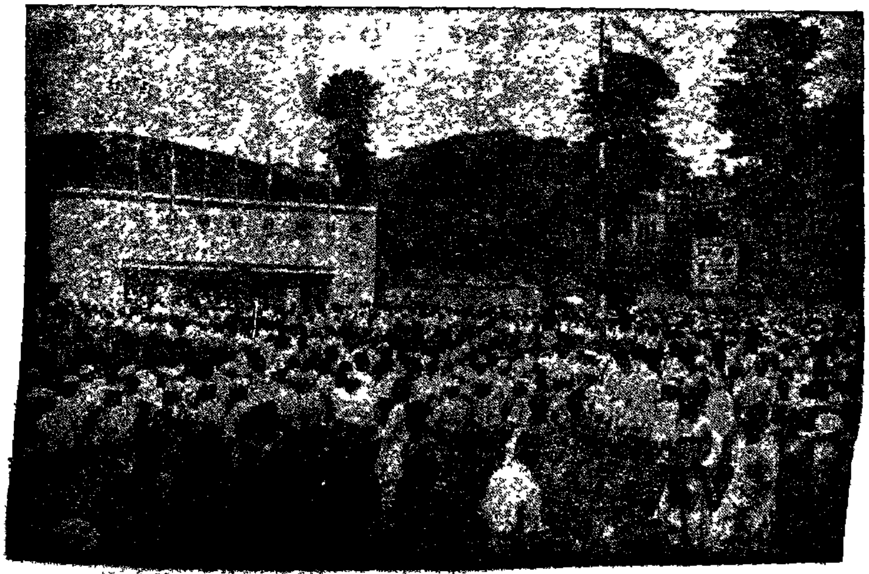
۵ نومبر سنہ ۱۹۴۵ء کو دھلی کے تاریخی لال قلعہ میں حکومت کی عدالت میں ایسے مقدمات کی پیشی ہوئی جو تاریخ ہند میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے اہم ترین ہیں ان مقدمات میں اس بات کا تعین کیا جائیگا کہ بدیشی ظالم سامراج کے خلاف جنگ آزادی کرنا غداری ہے یا حب الوطنی



پونہ اسٹیشن سے لیڈروں کی روانگی



مسٹر اچاریہ کرپلانی جنرل سکریٹری آل انڈیا کانگریس کمیٹی معہ مسز کرپلانی



آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں جھنڈا [illegible] رسم



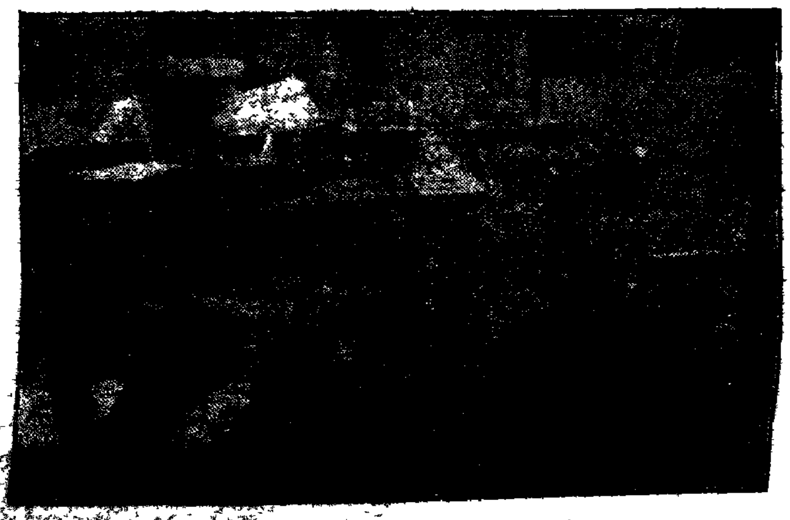
علم بردار آزادی
ماسٹر موتا سنگھ
سکھ لیڈر لاهور میں



مولانا منیرالزمان
معہ‌بوس برادرس
(جو هال میں رها هوے هیں)



بریڈ لا ہال لاہور کی تباہی کانگریس کو واپس دیتے وقت



"چونکہ اب تک میری کسی ملاقات ... ملاقات نہیں ہوئی اس لئے تعریف نہیں کر سکتا۔"

"کیا یہ صحیح ہے کہ پہلے آپ تیسرے درجے میں سفر کرتے تھے اور اب اسپیشل ٹرینوں میں اور فرسٹ کلاس میں سفر کرتے ہیں؟"

"افسوس صد افسوس کہ آپ کو صحیح اطلاع ملی ہے۔ اسپیشل ٹرینوں میں اسلئے سفر کرتا ہوں کہ اب مہاتما ہو گیا ہوں اور تھرڈ کلاس سے تنزل کر کے اسلئے سکنڈ کلاس میں پہنچ گیا ہوں کہ اب دنیا کی آرام اور آسائش کی خواہش ہے" (یعنی جسمانی اعتبار سے کمزور ہو جانے کے باعث)

یہاں پر یہ جان لینا ضروری ہے کہ تھرڈ کلاس سے سکنڈ کلاس کا یہ تنزل کوئی مستقل چیز نہیں ہے گاندھی جی اب بھی کبھی کبھی سکنڈ کلاس سے ترقی کر کے تیسرے درجہ میں پہنچ جاتے ہیں۔

بعض اوقات گاندھی جی سے جب مہمل سوالات کئے جاتے ہیں تو تنگ آکر ایسے جواب ...ے بیٹھتے ہیں جن میں ...انہ دماغی کوٹ کوٹ ...بھری ہوتی ہے۔ ایک ...اُن سے سوال کیا گیا۔ ...ایک لیڈر بن کر شہرت ...ر رفعت کی اونچی منزل پر کیوں رہنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے ...ا جواب دیا۔

"آپ کا خیال ہے کہ میں شہرت اور رفعت کی اونچی منزل پر ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اس کا احساس نہیں۔ ہاں مجھے یہ البتہ محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر بیٹھا ہوں اور اُسے ایک سخت قسم کا غیر آتشی چٹان بنانے میں مصروف ہوں قبل اس کے کہ میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاؤں یہ آتش فشاں کسی وقت بھی پھوٹ پڑ سکتا ہے۔ بدقسمتی سے ہر مصلح کے ساتھ یہ قصہ رہا ہے کہ کامیابی سے پہلے ہی آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑتا ہے۔"

سوال: "کیا آپ سوراج قائم کرنا چاہتے ہیں؟"

جواب: "میں نہایت تیزی کے ساتھ خود اپنے اوپر سوراج قائم کرتا ہوں۔"

سوال: "کیا خیال ہے آپ کا امتداد زمانہ آپ کے اور لارڈ ریڈنگ کے درمیان جو اختلاف ہے اُسے بڑھا دے گا یا گھٹا دے گا؟"
(۱۹۲۱ء میں یہ سوال کیا گیا تھا)

جواب: "اس اختلاف کے جس قدر گھٹنے کا امکان ہے اسی قدر بڑھنے کا بھی۔"

سوال: "جب سوراج حاصل ہو جائے گا تو آپ کی حیثیت کیا ہوگی؟" یہ سوال کس قدر ذاتیات سے بحث کرتا ہے؟

اور آپ شاید یہ امید کر رہے ہوں کہ یہاں پر گاندھی جی اپنے مذہبی خیالات پیش کریں گے یا کسی آئندہ سیاسی اسکیم کی تشریح کریں گے۔ لیکن نہیں جناب، آپ غلط سوچ رہے ہیں۔ گاندھی جی کا جواب یہ ہے "میں سوراج ملنے کے بعد خوب لمبی فرصت لوں گا۔ ایسی فرصت جو میری گذشتہ خدمات کے مطابق ہو۔"

بعض احمق قسم کے لوگوں کے سوال کا جواب گاندھی جی ایسا دیتے ہیں جس میں مزاح کے علاوہ چوٹ بھی ہوتی ہے اور یہ چوٹ "دافع حماقت" ثابت ہوتی ہے۔ گاندھی جی ایسے لوگوں کو اس قسم کا جواب دینے سے نہیں ہچکچاتے جس سے وہ چونک پڑیں اور اپنی صحیح پوزیشن کا احساس کرنے لگیں۔

ضرورت ہے کہ گاندھی جی کے سفر کے حالات سے، دوستوں سے گفتگو سے تحریروں سے تمام مزاحیہ جملوں کو منتخب کر کے ایک جگہ جمع کیا جائے۔

اس قسم کے جملوں اور تحریروں سے گاندھی جی کی زبردست ادبی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آئندہ چل کر گاندھی جی کا انگریزی زبان کے بہترین لکھنے والوں میں شمار ہوگا۔ انکے اسٹائل کی خوبی انکے وضاحت خیال میں پوشیدہ ہے لیکن سب سے زیادہ جو چیز انکے طرز ادا کو حسین بنا دیتی ہے وہ انکے مزاح کی معصومیت ہے جو انکے الفاظ میں ایک عجیب چمک دمک پیدا کر دیتی ہے۔

ایکبار ایک انگریز عورت گاندھی جی سے ملنے گئی اور اُن پھلوں کی تعریف [illegible] کہا [illegible] لینے کے لئے تیار ہوں۔"

ہندوستان میں فضائی نقل و حرکت کا مستقبل

از : ــــــ مسٹر کے۔ کے رائے ام۔ ایس۔ سی۔ آئی۔ آر۔ ایف۔ ای۔ ایس۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پر امن حالات کے پوری طرح قائم ہوجانے کے بعد دنیا بھر میں فضائی نقل و حرکت کے ذرائع بہت ترقی کر جائیں گے ہوائی جہاز جس طرح دوران جنگ میں سب سے زیادہ اہم آلہ رہا ہے اسی طرح امن کے زمانے میں بھی رہے گا۔ جنگ میں انسان حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ ایسی حالت میں اس کی ایجادی قابلیت اور صلاحیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ جنگ کے دوران میں ہوائی جہاز میں ٹیکنیکل لحاظ سے بہت ترقی ہوئی ہے یہ ٹیکنیکل ترقیاں اب تجارتی ہوائی جہازوں کے کام آئیں گی۔ یہ تجارتی ہوائی جہاز ٹیکنیکل لحاظ سے اس قدر ترقی کر جائیں گے کہ اس پر لوگ دور دراز بحری اور بری سفر طے کر سکیں گے اور دور دراز ملکوں میں ان پر مال و اسباب بھیجے جا سکیں گے۔

اب ہر ملک میں ہوائی جہاز کے ذریعے آمد و رفت اور نقل و حرکت کو وسیع کرنے کے لئے اسکیمیں بنائی جا رہی ہیں اس لئے کہ عام طور پر لوگوں کے اندر یہ احساس بڑھتا جا رہا ہے کہ ہوائی جہاز کے ذریعہ نقل و حرکت نہ صرف تجارت بلکہ ملکی تحفظ کے لحاظ سے بھی بہت ضروری ہے۔

ہندوستان میں نقل و حرکت کے تمام ذرائع و اسباب کی کمی ہے یہاں نہ تو ریل ہی کافی ہے نہ سڑکیں اچھی ہیں اور نہ آبی راستے ترقی یافتہ شکل میں ہیں ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک کی ضرورتوں کے لحاظ سے آمد و رفت اور نقل و حرکت کے موجودہ ذرائع قطعی ناکافی اور ناکمل ہیں۔ ملک میں صنعتی ترقی کو معمولی پیمانے پر بھی فروغ دینے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ بیل گاڑی ترک کر دی جائے زیادہ سے زیادہ سڑکیں بنائی جائیں، ریلوے لائنوں کا جال بچھا دیا جائے اور دریائی و بحری راستوں کو وسیع تر کرکے بالکل جدید پیمانے پر نقل و حرکت کے ذرائع مہیا کئے جائیں اور پھر سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ دنیا کے جدید ترین آلہ نقل و حرکت یعنی ہوائی جہاز کو ترقی دی جائے۔

ہندوستان اور چین دنیا کے دو ایسے پھیلے ہوئے ملک ہیں جن کا رقبہ بے حد وسیع و عریض ہے، چنانچہ ان دونوں ملکوں کی آئندہ زندگی میں ہوائی جہاز کے ذریعہ آمد و رفت اور نقل و حرکت کی اہمیت بہت بڑھ جائے گی اور اس سے اُن کی قومی ترقی میں مدد ملے گی۔ آج کل کشمیر سے بنگلور جانے میں کتنی زیادہ کوفت اور سفر کی طوالت برداشت کرنی پڑتی ہے لیکن ہوائی جہاز سے یہ سفر چند گھنٹوں میں آرام کے ساتھ طے کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں طویل سے طویل سفر ہوائی جہاز کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ چار گھنٹوں میں طے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن وہی سفر اگر دیگر ذرائع آمد و رفت سے کیا جائے تو کئی دن لگ جائیں گے۔ اس طرح ہوائی جہاز کے ذریعہ ہندوستان کے صوبے سماجی معاشی اور تہذیبی اعتبار سے ایک دوسرے سے اور بھی قریب لائے جا سکتے ہیں۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں لوگ اتنے دولتمند نہیں ہیں کہ ہوائی سفر کے اخراجات برداشت کر سکیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ چند سالوں کے اندر اندر شاید سات یا آٹھ سالوں میں ہوائی سفر اتنا ارزاں بنایا جا سکتا ہے کہ متوسط طبقے کے لوگ ہوائی سفر اختیار کر سکیں گے۔ اب تک ہوائی نقل و حرکت و آمد و رفت کیوں اس قدر مہنگی رہی ہے اس کے متعدد اسباب تھے۔ جنگ سے پہلے ایک ہوائی جہاز کی تعمیر میں بہت زیادہ لاگت آتی تھی۔ پھر گیسولائن کی قیمت بھی زیادہ تھی اور چونکہ ہوائی جہاز چلانے والے اور اس کی دیکھ بھال کرنے والے غیر ملکی ہوتے تھے اس لئے اُن کی تنخواہیں بھی زیادہ تھیں ان باتوں نے ہوائی سفر کو بہت مہنگا بنا رکھا تھا۔

ہندوستان میں ہوائی سفر اور کارآمد ہوائی سسٹم قائم کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہوگی کہ تمام اہم مقامات اور صنعتی شہروں کے درمیان ہوائی راستے کھول دیئے جائیں۔ اور بڑے بڑے شہروں مثلاً کلکتہ، بمبئی، دہلی، مدراس، رنگون اور شیلانگ کے درمیان ٹرنک ہوائی راستے کھولے جائیں۔ فیڈر راستوں کے لئے ملک میں مخصوص مرکز قائم کر دیئے جائیں گے جہاں سے یہ راستے شاخوں کی طرح پورے ملک میں پھیلے ہوں گے۔ ہوائی جہازوں کی جتنی کمپنیاں ہیں وہ سب متحد ہو کر ہوائی اڈے بنائیں اور بالکل جدید طرز کے ریڈیائی نظام قائم کریں۔ یہ ریڈیائی انتظام ہر اُس مقام پر ہونا چاہیئے جہاں ہوائی اڈہ ہے، اس لئے کہ ریڈیو کے بغیر ہوائی نقل و حرکت میں خطرات اور دقتیں ہیں۔ حکومت کا یا متحدہ طور پر ہوائی کمپنیوں کا یہ بھی فرض ہوگا کہ ملک میں متعدد میٹیورولوجیکل اسٹیشن قائم کر دیں۔

ان ہوائی راستوں پر کس قسم کے جہاز بغیر زیادہ اخراجات برداشت کئے استعمال ہو سکتے ہیں اُن پر بحث کی یہاں گنجائش نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ۲۱ نشستوں والا ڈی۔ سی۔ "۳" ٹرنک راستوں کے لئے اور چھ سے کر دس سیٹوں والا "ڈی۔ سی۔ ۳" فیڈر راستوں کے لئے موزوں ہوگا۔

اہم اسٹیشنوں مثلاً کلکتہ اور بمبئی کے درمیان سفر کرنے والے مسافر زیادہ ہونگے اسلئے اکیس سیٹوں والا ہوائی جہاز بہت موزوں ہوگا۔

جنگ کے ختم ہونے کے دس سال کے بعد چار انجن والے ساڑھے باسٹھ ٹن کے ہوائی جہاز جس میں سو مسافر بیٹھ سکتے ہیں اور جو دو سو پچھتر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑتے ہیں اور جو تین ہزار سے لیکر تین ہزار پانچسو میل تک سفر کر سکتے ہیں استعمال میں آنے لگیں گے اسکے ساتھ چار انجن والے ۳۵ ٹن کے ہوائی جہاز جو دو سو پچھتر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتے ہیں کام میں لائے جائیں گے۔

ہندوستان کا تعلیمی نظام اور ترقی کے امکانات

مسٹر سارجنٹ کی اسکیم

سنہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ میں دکھلایا گیا تھا کہ ہندوستان کی ۳۹ کروڑ آبادی میں سے صرف پونے پانچ کروڑ سادہ اور آسان خط لکھ پڑھ سکتے تھے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں یہ تعداد اس سے بھی کم یعنی صرف سوا دو کروڑ تھی۔ گویا دس سال کے عرصہ میں خواندہ لوگوں میں سو فیصدی سے زیادہ اضافہ ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود خواندہ لوگوں کی موجودہ تعداد کے معنی یہ ہیں کہ پانچ سال سے اونچی عمر کے لوگ میں صرف ساڑھے چودہ فیصدی خواندہ تھے۔

جب ان اعداد کو عورتوں اور مردوں پر تقسیم کر کے دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ پانچ سال سے زیادہ عمر کے مردوں میں تقسیم کا اوسط ۲۲ ۱/۲ فیصدی اور عورتوں میں ۸ء۵ فیصدی تھا۔

عورتوں اور مردوں کی خواندگی میں فرق کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ ابتدائی مدرسوں کے لئے پڑھانے والی عورتیں کافی تعداد میں نہ ملتی تھیں۔ دوسرے معاشرتی اور معاشی اسباب کی بنا پر بھی عورتوں کی تعلیمی ترقی سست تھی۔ لیکن اس سے بڑھ کر رکاوٹیں یہ تھیں کہ ایک تو آبادی کی اکثریت (یعنی ۸۰ فی صدی سے زیادہ) ایسے گاؤں میں رہتی تھی جن کی آبادی پانچسو یا اس سے کم تھی۔ اس کے علاوہ کسانوں کا افلاس اور سرکاری آمدنی کی قلت بھی ترقی کی راہ میں حائل تھی۔ ان تمام رکاوٹوں کے باوجود گذشتہ سالوں میں جو ترقی ہوئی ہے، وہ بہت حوصلہ افزا ہے لیکن اگر آیندہ کے لئے ہندوستان کی تمام بالغ آبادی کو خواندہ بنانا ہے تو لازماً اس رفتار کو بہت زیادہ تیز کرنا پڑے گا۔

ہندوستان کے وسیع نظام تعلیم میں حسب ذیل درسگاہیں شامل ہیں۔ پندرہ (۱۵) یونیورسٹیاں اپنے ۴۲۵ آرٹ اور سائنس کے کالجوں کے ساتھ۔ ۸۵ پیشہ ورانہ کالج، ۲ لاکھ ۳۲ ہزار ۳۶۴ فوقانیہ وسطانیہ اور تحتانیہ اور ہر قسم کے مخصوص مدرسے سنہ ۱۹۴۰ء میں ان ۲ لاکھ ۳۲ ہزار ۸۹۷ مجموعی تعلیمی اداروں میں ایک کروڑ ۲۷ لاکھ ۶۶ ہزار ۹۰۸ طلبہ (لڑکے اور لڑکیاں) تعلیم پا رہے ہیں۔

یہ نظام تعلیم بہت عظیم الشان ہے۔ لیکن ملک کی ضرورتیں اس سے بھی زیادہ بڑی ہیں۔ ہندوستان میں ۶ لاکھ ۵۰ ہزار سے زیادہ گاؤں پائے جاتے ہیں اور آبادی میں اضافہ ۵۰ لاکھ سالانہ کی رفتار سے ہو رہا ہے ان حالات میں لازمی تعلیم کے جاری کرنے کا اختیار مجبوراً مقامی اداروں یعنی میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کو جو سب کی منتخب کی ہوئی جماعتیں ہیں سپرد کرنا پڑا ہے۔ یہی اپنی موجودہ مالی حالت اور سہولتوں کے پیش نظر اس کا فیصلہ کرتی ہیں کہ لازمی تعلیم مناسب رہے گی یا نہیں۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں چھ اور گیارہ سال کی درمیانی عمر کے بچوں کے لئے ۱۹۴ شہروں اور ۱۴ ہزار ۱۰۵ گاؤں پر جبریہ تعلیم ملتوی کی گئی تھی۔ ان علاقوں میں بھی جبریہ تعلیم صرف لڑکوں کے لئے رکھی گئی تھی۔ اگرچہ ملک کے بعض حصوں مثلاً احاطہ مدراس میں یہ اصول لڑکیوں پر بھی عائد کیا گیا تھا۔

سنہ ۱۹۲۱ء سے یعنی جب سے سنہ ۱۹۱۹ء کے دستوری قانون کا نفاذ ہوا تعلیم پورے طور پر صوبائی حکومتوں کی نگرانی میں دے دی گئی ہے۔ برطانوی ہندوستان میں مرکزی اور صوبائی اختیارات کو صراحت کے ساتھ تقسیم کر دیا گیا ہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء سے منتخب شدہ ہندوستانی وزراء جو صوبائی مقننہ کو جوابدہ ہوتے ہیں، تعلیم کی دیہاتی مدرسوں سے لے کر یونیورسٹیوں تک نگرانی کر رہے ہیں۔ مرکزی حکومت کو تعلیم پر کوئی اختیار نہیں رہا۔ وائسرائے کی عاملہ کے وزیر تعلیم کو صرف بعض چھوٹے وفاقی علاقوں (مثلاً دہلی کے دارالسلطنت) کی تعلیم پر جو مرکزی حکومت کی براہ راست نگرانی میں ہے، اختیار حاصل ہے اس کے علاوہ [illegible] ہندوستان

تعلیم کے بارے میں وزیر تعلیم اور اس کے ماہرین تعلیم کا کام صرف مشورہ دینا ہے۔ ایک مرکزی تعلیمی مشاورتی بورڈ کے ذریعے صوبوں نیز ریاستوں کے وزرا کو تعلیم کے کام میں مشورہ دیا جاتا ہے اور اس میں یک جہتی پیدا کی جاتی ہے۔

ہر صوبے میں عوام کی منتخب کردہ کابینہ کا ایک رکن وزیر تعلیم ہوتا ہے اور تعلیمی انتظامات کے صدر مستقل کو جس کا کام وزیر تعلیم کو مشورہ دینا ہوتا ہے۔ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، ہندوستان کی ۹۰ فی صدی تعلیم گاہوں کی صوبائی حکومت نگرانی کرتی ہے جو تعلیم گاہیں حکومت سے اپنی اسناد تسلیم کرانا یا مالی امداد لینا چاہتی ہیں۔ انھیں حکومت کی نگرانی کو قبول کرنا پڑتا ہے اور ان کا سرکاری انسپکٹر وقتاً فوقتاً معائنہ کرتے رہتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے معاملے میں ذمہ داری کچھ تو صوبائی حکومتوں کی ہوتی ہے اور کچھ خود یونیورسٹی کے حوالے کر دی جاتی ہے ادنیٰ تعلیم کے معاملے میں صوبائی حکومتیں میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے ساتھ یا تو ذمہ داری میں شرکت کرتی ہیں یا اپنے اختیارات انھیں منتقل کر دیتی ہیں۔

مدرسے کا نظام

تحتانیہ یا ابتدائی مدرسوں میں چھ سے دس سال تک کی عمر کے بچے تعلیم پاتے ہیں اور ان کا عام مقصد "خواندگی" کے معیار تک پہنچنا، اور کام چلانے کے لائق حساب سیکھنا ہوتا ہے۔ لیکن پچھلے کچھ سالوں سے ابتدائی تعلیم کی بنیاد کو وسیع کرنے اور اسے طلباء کے ماحول سے براہ راست متعلق کرنے کی مختلف کوششیں کی جا رہی ہیں ۱۹۳۷ء سے صوبائی حکومتیں اس مسئلے پر توجہ کر رہی ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں ایک رپورٹ شائع ہوئی جس نے ایک سے زیادہ عملی اور دلچسپ نصاب کو رائج کرنے کی سفارش کی۔ یہ بنیادی تعلیم کی اسکیم تھی جس میں تعلیم کے ایسے اصولوں کو قبول کیا گیا تھا جنھیں گاندھی جی نے پیش کیا تھا۔ بنیادی تعلیم کی اس اسکیم پر جنگ کے باوجود، دیسی ریاستوں کے علاوہ برطانوی ہند کے چار بڑے صوبوں یعنی بمبئی، سی پی، بہار اور یو پی میں تجربہ کیا جا رہا ہے۔

وسطانیہ اسکولوں میں عموماً دس سے ۱۴ سال تک کی عمر کے بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے ہندوستان کے مدرسے دو قسم کے پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ مقامی طور پر ان میں بہت سے اختلافات نظر آتے ہیں اول "ورناکلر" مثل اسکول جن میں انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔ لیکن یہ ذریعہ تعلیم نہیں ہے دوسرے ان کے دو بڑے نمونے پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ مقامی طور پر ان میں بہت سے اختلافات نظر آتے ہیں۔ اول "ورناکلر" مثل اسکول جو طالب علم کو ۱۵ سال ختم کرنے کے بعد یونیورسٹی میں داخلے کے لئے تیار کرتے ہیں، اور جن میں اونچی جماعتوں میں بعض مضامین کی تعلیم کے لئے ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔

مدرسوں کی زیادہ تعداد ایسی ہے جس میں باقاعدہ طور پر مذہبی تعلیم نہیں دی جاتی۔ البتہ جن مدرسوں میں تمام یا اکثر طلباء کا ایک مذہب سے تعلق ہوتا ہے۔ وہاں کچھ گھنٹے اخلاقی تعلیم کے لئے مخصوص کر دئے جاتے ہیں۔ لیکن مذہب کی کوئی جداگانہ تعلیم نہیں دی جاتی۔ دینیات کی تعلیم کے لئے بھی کچھ مدرسے بعض ذاتیں اور فرقے مختلف طریقوں پر چلا رہے ہیں۔ لیکن یہ سرکاری نظام تعلیم سے باہر ہیں۔

تقریباً ۵ لاکھ طلبا ایسی تعلیم گاہوں میں پڑھ رہے ہیں جنھیں حکومت تسلیم نہیں کرتی۔ یہ عام طور پر وہ مدرسے ہیں جنھیں خاص خاص فرقوں یا گروہوں نے کھول رکھا ہے اور یہ عموماً مندروں اور مسجدوں سے متعلق ہوتے ہیں۔

ابتدائی اور یونیورسٹی کی درسگاہوں میں مخلوط تعلیم کو قبول کر لیا گیا ہے لیکن ان میں لڑکیوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ان کے علاوہ ایسے مدرسے اور کالج بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ جن میں صرف لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام ہے، ان کی میزان ۱۹۴۳-۴۴ء میں حسب ذیل تھی۔

۲۶ ہزار ۴۲ ابتدائی مدرسے۔ ایک ہزار ۵۷ ۲ وسطانیہ مدرسے ۲۹۷ فوقانیہ مدرسے ۷۰۵ مخصوص مدرسے ۸ پیشہ ورانہ تعلیم کے اور ۴۵ عام تعلیم کے کالج۔ کل میزان ۲۸ ہزار ۵۵۴ تھی جس میں ۴۴ لاکھ ۲۲ ہزار طالبات زیر تعلیم تھیں۔

یونیورسٹی کی تعلیم

یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے لڑکوں اور لڑکیوں کے کالجوں کی میزان ۴۸ ہوتی تھی، جس میں آرٹ اور سائنس کے پیشہ ورانہ تعلیم سب کالج میں شامل تھے ۱۹۴۲ء میں ان میں ایک لاکھ باون ہزار ۴ ۶ ۸ پڑھتے تھے۔ اس تعداد میں ۱۲ ہزار ۵۵ طالبات بھی شامل تھیں جو یا تو آرٹ یا میڈیسن یا مدرسی یا قانون کی سند کے لئے تیاری کر رہی تھیں۔ ہندوستان کی

یونیورسٹیاں ہیں ان میں سے بعض ممتاز اقامتی یونیورسٹیوں کو مستثنے کردیا جائے تو عام طور پر محض الحاق کرنے والی یونیورسٹیاں ہیں اور انکو قریب قریب انگلستان کی لندن یونیورسٹی کے نمونے پر بنایا گیا ہے۔ ان کی اسناد کو آکسفورڈ کیمبرج لندن اور دوسری برطانوی اور یوروپین یونیورسٹیاں اپنی اسناد کے برابر تسلیم کرتی ہیں۔ ان کے امتحانات عام طور پر سخت ہوتے ہیں اور انکا معیار بھی بلند ہوتا ہے ہندوستان کی ڈاکٹری اور تحقیقات کی سندوں کو بہت زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

استادوں کی حالت

نہایت قدیم زمانے سے ہندوستان میں عالموں کی عزت کا رواج چلا آرہا ہے اور گرو (اُستاد) کا درجہ بہت بلند و محترم سمجھا جاتا رہا ہے۔ لیکن استاد سے یہ توقع کی جاتی رہی ہے کہ وہ ولیوں اور مہاتماؤں جیسی سادہ زندگی بسر کرے۔ اس لئے اسے مادی معاوضہ بہت کم دیا جاتا ہے۔ یہ روایت اب بھی استادوں خصوصاً ابتدائی مدرسوں کے استادوں کی تنخواہ کی کمی کی صورت میں جاری ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت کم گاؤں کے استاد ایسے ہیں جو اپنے کام کو ایک ضمنی کام سے زیادہ اہمیت دے سکتے ہیں ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں استادوں کی مجموعی میزان ۵ لاکھ ۱۰ ہزار ۱۸ ہوتی تھی۔ اس میں سے صرف ۳ لاکھ دس ہزار ۴۹۶ تربیت یافتہ استاد تھے۔ ثانوی مدرسے کے استادوں کو تربیت دینے کے لئے ۶۴ مدرسے تھے جن سے سالانہ صرف ۱۹ ہزار ۳۹۴ استاد تربیت پاکر نکلتے تھے۔ گریجویٹ استادوں کی تربیت کے لئے ۲۰ ٹرینگ کالج تھے۔ جن سے سالانہ ایک ہزار ۳۱۴ استاد تربیت پاکر نکلتے تھے۔

تعلیم پر جنگ کے اثرات

خوش قسمتی سے ہندوستان میں جنگ کی وجہ سے تعلیم کا کچھ زیادہ ہرج نہیں ہوا ہے۔ برما کے فتح ہوجانے کے بعد مشرقی ساحل کی کچھ درس گاہوں نے اپنے امتحانوں کو ملتوی کرنا مناسب سمجھا۔ لیکن اب انھوں نے اپنا کام حسب معمول شروع کردیا ہے کلکتہ یونیورسٹی کے کام میں البتہ کچھ گڑ بڑ ہوئی ہے۔ کیونکہ اس سے ملحقہ کچھ کالج جاپانی بمباری کے بعد زیادہ محفوظ علاقوں میں منتقل ہوگئے تھے

جنگ کے نتیجہ تمام اثرات تعلیم کے لئے موافق ثابت ہوئے ہیں۔ جنگی صنعتوں کی طلب نے فنی تعلیم کی بہت حوصلہ افزائی کی ہے۔ حکومت نے اپنی ٹیکنیکل اسکیم کو ۱۹۴۰ء میں بہت مختصر پیمانے پر شروع کیا تھا لیکن اب اسکیم کے ماتحت چار سو مرکز چل رہے ہیں اور ایک لاکھ فنی ماہر تربیت پاچکے ہیں۔ برطانیہ کے لیبر منسٹر مسٹر ارنسٹ بیون نے جس اسکیم کو شروع کیا تھا اس کے ماتحت ہندوستان کے ماہر مزدوروں اور امیدواروں کی ٹولیاں معینہ وقفہ کے بعد ہتھیار اور گولہ بارود اور جہاز سازی کے کارخانوں میں تربیت پانے کے لئے جاتی رہتی ہیں۔

سائنس کی تحقیقات کو سر ایس ایس بھٹناگر کی سرکردگی میں کاؤنسل آف انڈسٹریل اینڈ سائنٹفک ریسرچ قائم کرکے بہت ترقی دی گئی ہے یہ کاؤنسل نہ صرف اپنے طور پر تحقیقات کا کام جاری رکھتی ہے بلکہ دوسرے بہت سے مرکزوں کے کام میں بھی یک جہتی پیدا کرتی رہتی ہے اور ہندوستان کے وسائل کو جنگ اور صنعت کے کام میں استعمال کرنے میں اسے بعض نمایاں کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔

جنگ کے زمانے میں تعلیمی ترقی کو، خود ہندوستانی فوج نے بھی نہایت اہم اور دیرپا امداد پہنچائی ہے۔ ہندوستانی فوج کی تعداد اب بیس لاکھ سے زائد ہوگئی ہے اس فوج میں جس کی بھرتی رضا کارانہ طریقے پر ہوتی ہے زیادہ تر کسانوں کا طبقہ شامل ہے جو بھرتی کے وقت عموماً ناخواندہ ہوتے ہیں۔ فوج میں انھیں باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے۔ انھیں خواندہ بنایا جاتا ہے اور ایک مشترکہ زبان یعنی لاطینی رسم خط میں لکھی ہوئی اردو سکھائی جاتی ہے۔ (لاطینی خط میں لکھی ہوئی اردو ہندوستانی فوج کا مشترکہ ذریعہ تعلیم ہے) انھیں معقول بنیادی تعلیم دی جاتی ہے جس کا ابتدائی مقصد اگرچہ سپہ گری کی تعلیم ہوتا ہے لیکن جس میں پھر بھی اس دیہی پس منظر کا خیال رکھنا پڑتا ہے جہاں سے سپاہی بھرتی ہوا ہے اور جہاں جنگ کے بعد اسے دوبارہ واپس جانا ہے بہت سے اہل نظر حضرات کا یہ خیال ہے کہ جنگ کے بعد جب وہ سپاہی جس نے فنی مہارت حاصل کی ہے۔ جس نے اپنی نگاہ میں وسعت پیدا کی ہے جس نے ہر قسم کی مشینوں اور حفظان صحت اور صفائی کے اصولوں سے اپنے آپ کو روشناس کیا ہے جس نے جماعتی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی تربیت حاصل کی ہے [illegible] اور ذاتوں

[illegible] سے پہلے لیبر منسٹر تھے۔

کے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی عادت ڈالی ہے جب یہ سپاہی جنگ سے لوٹیں گے تو ترقی کے کام میں بہت معاون ثابت ہوں گے۔

جنگ کے بعد کی تعلیمی ترقی کے لئے جو منصوبہ ہندوستان میں بتلایا گیا ہے وہ اتنا ہمہ گیر اور ایسے بڑے پیمانے پر ہے کہ اس سے پہلے ایسے منصوبہ کبھی نہیں بنایا گیا تھا۔ اس رپورٹ میں جسے حکومت ہند کے مشیر تعلیم مسٹر جان سارجنٹ کے نام پر سارجنٹ اسکیم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے چھ اور چودہ سال کے درمیانی عمر کے تمام لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے لازمی ہمہ گیر تعلیم کا مطالبہ کیا گیا ہے اس تعلیم کا مقصد محض "خواندگی" کا معیار حاصل کرنا نہیں ہوگا۔ بلکہ طلبا کو شہریت کے فرائض انجام دینے کے لئے کم ترین طریقے پر تیار کرنا ہوگا چھ سال سے کم عمر کے بچوں کیلئے گہوارہ کے مدرسوں کو بھی پلان میں جگہ دی گئی ہے اور ان سب بچوں کو جن میں اسکی صلاحیت دیکھی جائیگی ثانوی اور فوقانی تعلیم کا بھی موقعہ دیا جائے گا۔

منصوبہ بندی اور مسئلہ آبادیات

از :— ایل ۔ ایچ ۔ وڑا

ہندوستان میں بعد از جنگ کی تعمیر بڑے پیمانے پر شروع ہو رہی ہے۔ ملک کی نئی صنعتی، اقتصادی اور معاشی زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھالا جائے گا۔ اس جدید تنظیم میں 'بمبئی پلان' کی بڑی اہمیت ہے۔ مگر اس پلان میں اُس مشکل کا کوئی معقول حل نہیں دیا گیا جو ہندوستان کی بڑھتی ہوئی بے پناہ آبادی کی بدولت خود بخود پیدا ہو جائے گی۔ ذیل کا مضمون اس مسئلہ پر کافی حد تک روشنی ڈالتا ہے۔ اس سلسلے میں کئی مضامین 'نئی زندگی' میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن سے مسئلہ آبادیات کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔ (اڈیٹر)

نئے نئے خاکے مرتب کرنے کے بھی اتنے ہی مختلف پہلو ہیں جتنے قوسِ قزح کے رنگ۔ اور اگر اس کا کوئی خاص پہلو نظر انداز ہو جائے تو ملک میں اصل مسئلہ سے متعلق غلط نقطۂ نظر پیدا ہو جاتا ہے۔

جن لوگوں نے بمبئی پلان پیش کیا ہے وہ ایک اہم پہلو یعنی ہندوستان کے مسئلہ آبادیات کو نظر انداز کر گئے ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر گیان چند نے جن خاص باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ بڑی حد تک ہماری رہنمائی کرتی ہیں اور ان سے اس موضوع پر روشنی بھی پڑتی ہے۔ وہ اپنی تصنیف "ہندوستان کی کروڑوں آبادی" (INDIA TEEMING MILLIONS) میں لکھتے ہیں " لاکھوں کی تعداد میں ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی ہمارے اخلاقی، ذہنی اور مادی وسائل کے لئے گویا ایک چیلنج ہے کسی ملک کے لئے 'پلان' تیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ وہاں کی آبادی کی کیا حد اور تعداد ہونی چاہیئے اس کے متعلق پلان بنایا جائے۔ قومی تعمیر کے لئے جو اسکیم بھی بنائی جائے اس کے مطابق موجودہ آبادی کو گھٹا دیا جائے۔ اسکی صورت یہ ہے کہ مرنے والوں کی بہ نسبت پیدا ہونے والوں کی تعداد گھٹا دی جائے" کس قدر حیرت کی بات یہ ہے کہ ہندوستان کے مستقبل کے یہ آٹھ معمار صاحبان ضبطِ تولید (برتھ کنٹرول) کی اہمیت کو محسوس نہ کر سکے درآنحالیکہ یہ ہماری اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

ایک ذمہ دار آدمی جس کے اندر تھوڑی سی بھی دور اندیشی موجود ہے وہ جب اس بات پر غور کرے گا کہ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کیا ہوگی تو اس کا دل خوف اور فکر سے بھر جائے گا ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۱ء تک دس سال کے مختصر عرصے میں ہندوستان کی آبادی ۳۳۸ ملین (پونے چونتیس کروڑ) سے ۳۸۹ ملین (تقریباً اُنتالیس کروڑ) پر جا پہنچی۔ ان اعداد و شمار میں برما شامل نہیں ہے۔ اس مختصر مدت میں ۵۱ اکیاون ملین انسانوں کا اضافہ ہوا جو فرانس کی موجودہ کل آبادی سے بھی زیادہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ۱۹۴۴ء میں سارے ملک میں قحط کا اندیشہ تھا اور پھر بھی ہم ان اعداد و شمار کے نتائج کو نہیں سوچتے جو بظاہر اس قدر غیر نقصان رساں معلوم ہوتے ہیں۔ پندرہ سالہ پلان جن لوگوں نے پیش کیا ہے انھوں نے یہ بھی نہیں بتایا ہے کہ آبادی کو قومی اور بین الاقوامی پیمانے پر قابو میں رکھنا ایک قسم کی سیاسی اور اقتصادی ضرورت ہے۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ چوٹی کے کچھ اقتصادیات اور علمی و صنعتی ماہرین میں سے صرف چند نے یہ محسوس کیا ہے کہ اگر ہماری آبادی میں اسی طرح اضافہ ہوتا رہا تو یہ بار اٹھائے نہ اُٹھے گا جیسا کہ "بمبئی پلان" کے مصنفین نے تجویز کیا ہے اگر اسکے مطابق ہر بالغ شخص کو روزانہ ۲۴۰۰ کیلوری کی تعداد

میں خوراک مہیا کیا جائے گی۔ اگر ہر شخص کے لئے سالانہ ۴۰ گز کپڑا کی کھپت ہوگی اگر ہر ایک آدمی کو سو مربع فیٹ جگہ رہنے کے لئے مل جائے اگر ہر گاؤں میں ایک دواخانہ اور عام طور پر ہر شہر میں ایک زنانہ و مردانہ ہسپتال کھل جائے اور صفائی وغیرہ کے مناسب انتظامات ہوجائیں شہری اور دیہاتی علاقوں میں پانی وغیرہ اور تعلیم کا معقول بندوبست کردیا جائے تو ایسی صورت میں ہماری آبادی کس بے پناہ تیزی سے بڑھتی چلی جائے گی اسکا اندازہ کرنا بھی دشوار ہے۔

آج جبکہ ہم فاقہ مستی اور مایوسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں تب بھی ہماری آبادی ۵۰ لاکھ سالانہ کے اوسط سے بڑھ رہی ہے لیکن اگر ہمارے عوام کا معیار زندگی بمبئی پلان کی تجویز کے مطابق اونچا ہوگیا اور برتھ کنٹرول کے دواخانے اور طبی ادارے پہلو بہ پہلو ہندوستان بھر میں قائم ہوگئے تو ہمارے مرد اور عورتیں اپنی پوری قوت کیساتھ متحدہ بنی نوع انسان کی سب سے پرانی اور زبردست صنعت (انسانی پیدائش) کو ترقی دینے میں صرف کردیں گے پھر ہماری تجویزوں اور منصوبہ بندیوں کے خوشگوار خواب، خواب پریشاں ہوکر رہ جائیں گے اور ہم یونہی خلا میں تکتے رہیں گے۔

کیا 'پلان' بنانے والوں کو معلوم نہیں کہ انیسویں صدی میں پیدائش کی بڑھتی ہوئی تعداد نے مہذب قوموں پر کتنا غیر ضروری بار ڈال دیا۔ اور انسانی تہذیب و ترقی سے جو مسرت و سکون حاصل ہوسکتا تھا اس کے تمام اثرات کو کیسی طرح ضائع کرکے چھوڑا؟

فرض کیجئے طبی سہولتیں بڑھ جانے سے ہم اپنے یہاں کی شرح اموات ۲۲ فی میل سے ۱۲ فی میل کی حد تک کم کرلیتے ہیں جیسا کہ سلطنت متحدہ برطانیہ میں ہے۔ ایسی صورت میں زندہ رہنے والوں کی شرح ۳۴-۱۲ کی نسبت سے ۲۲ فی میل ہوگی۔ بالفرض اگر 'پلان' پر ۱۹۴۶ء سے عملدرآمد شروع ہوتا ہے تو موجودہ اضافہ کی آبادی کی رفتار سے ۱۹۵۱ء میں ملک کی آبادی (۳۸۹ + ۲۵) ۴۱۴ ملین ہوگی پہلے پانچ سال اگر آبادی کی شرح اموات کم کرتے ہیں گھٹ گئے تو ۱۹۵۱ء میں (۴۱۴ + ۴۵) ۴۲۹ ملین آبادی ہوچکی گی۔

'پلان' کے [illegible] مصنفوں کا اندازہ ہے کہ ۱۹۶۱ء میں ہمارے ملک کی آبادی ۴۸۹ ملین (یعنی پچاس کروڑ سے زیادہ) ہوجائے گی

میں سمجھتا ہوں کہ یہ اندازہ کم ہے کیونکہ اگر بمبئی پلان ۱۹۴۶ء سے زیر عمل آیا اور ہماری شرح اموات طبی سہولتوں کے بڑھ جانے سے ۱۹۵۱ء میں ۱۴ فی کی حد تک گھٹ گئی تو ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۱ء تک دس سال کی مدت میں ہماری آبادی بہت بڑھ جائے گی کیونکہ اسے ۴۸۹ ملین کی بجائے ۹۶ ملین تک اور اضافہ ہونا چاہئے۔ منصوبہ بندی کرنے والوں کے پاس شرح اموات کم کرنے کی تدبیر تو ہے مگر شرح پیدائش کم کرنے کی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ اگر ان منصوبوں پر پانچ سالہ عملدرآمد کے بعد شرح پیدائش بڑھی اور شرح اموات کم ہوئی تو اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم پر اتنا غیر ضروری بار پڑجائے جس کے نیچے ہم دب کر اس مسرت اور اعلیٰ معیار زندگی کے اچھے اثرات بھی کھو بیٹھیں جو پلان سے حاصل ہوتے۔

مجھے خوف ہے کہ پلان بنانے والے بے توجہی سے جو قدم اٹھا رہے ہیں وہ ایسی آگ لگادے گا جو بجھائے نہ بنے۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ کثیر آبادی کے فتنے کو چونکنے سے پہلے ختم کردیا جائے۔ اگر کہیں ہماری آبادی ۱۹۵۱ء و ۱۹۶۱ء کے درمیان ۱۰۰ ملین (دس کروڑ) اور بڑھ گئی تو کیا یہ ممکن ہوگا کہ ہم اپنے لاکھوں بھوکے انسانوں کے لئے وہ خوراک مہیا کرسکیں جس میں انٹرنیشنل فوڈ کانفرنس ورجینیا کی رائے کے مطابق تین پاؤ کے قریب روزانہ دودھ، ۴ انڈے فی ہفتہ فی کس بھی شامل ہے۔ ماہرین غذا نے آگے چلکر یہ طے کیا ہے کہ ان چیزوں کے علاوہ ہفتہ بھر کی خوراک میں کم سے کم ۱½ پاؤنڈ گوشت مچھلی، مرغی، پانچ پاؤنڈ چکنائی وغیرہ آلو، ناریل وغیرہ میوہ بھی ہونا چاہئے تاکہ ہم اپنی صحت برقرار رکھ سکیں۔

قومی خدمت

میری رائے میں۔ مادی ضروریات کے پورا کرنے میں آسانی اور سہولت حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ 'برتھ کنٹرول' (ضبط تولید) کے متعلق اطلاعات فراہم اور اسکے طریقے بتانا ان طبی سہولتوں کا ایک لازمی حصہ ہے جو عوام کو مہیا کی جائیں گی۔ جب تک کہ لاکھوں پیدا ہونے والوں کو بھوک کے عذاب سے نہ بچایا جائے گا اس وقت تک ہر قسم کا پلان فضول ثابت ہوگا۔ آبادی کا مسئلہ جہاں تک تعلق ہے ہم حالات کو انکی من مانی رفتار پر نہیں چھوڑ سکتے۔

آبادی کی منصوبہ بندی ایک زبردست اقتصادی، سیاسی اور اخلاقی سوال ہے اور اسے جلد سے جلد حل ہونا چاہیئے اگر ہم پورے ہندوستان میں برتھ کنٹرول دوا خانوں، کا جال بچھا سکیں تو ہم نے گویا پلاننگ کی آدھی دشواریوں پر قابو پا لیا۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں کہ پلاننگ کے ذریعہ ہر شادی شدہ جوڑے کے لئے دو بچوں کا کنبہ کا معاشرتی نمونہ بنا سکیں اس وقت دو بچوں کا کنبہ فیشن ایبل اور معقول کنبہ سمجھا جاتا ہے۔ حقیقتاً صرف اسی شادی کو کامیاب سمجھنا چاہیئے جس کے نتیجے میں تین سے زیادہ بچے نہ ابل پڑیں۔ لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ ہمارے رحمدل خداوندان میونسپل بورڈ اور ممبران اسمبلی ہندوستان بھر میں 'برتھ کنٹرول' کی اشاعت و ترویج سے جان چراتے ہیں صرف اسلئے کہ گاندھی جی ضبط تولید کے کٹر دشمن ہیں۔ یہ لوگ اتنا بھی محسوس نہیں کر سکتے کہ ایسا کر کے وہ ایک بڑی قومی خدمت سے انکار کر رہے ہیں۔ جس شخص نے گہری سوجھ بوجھ ہے اسے یہ بتانا فضول ہے کہ جو 'پلان' بھی بنے اسمیں 'برتھ کنٹرول' کی اشاعت و تبلیغ بے حد ضروری ہے یہی وہ خاص دور ہے جب ہم اپنے عوام کے دماغ میں برتھ کنٹرول کا حامی بنا سکتے ہیں۔

ہمارے 'منصوبہ بندوں' کو یہ بات محسوس کر لینی چاہیئے کہ اگر 'برتھ کنٹرول' کے علم و معلومات کے فراہم کئے بغیر دیگر طبی سہولتیں عوام کے لئے مہیا کر دی گئیں تو وہ پرانی انسانی صنعت (بچے پیدا کرنے) کی طرف پوری توجہ صرف کر کے مصیبت اور بدحالی کے شکار ہو جائیں گے۔ ہندوستان میں شادی ایک عام چیز ہے۔ دنیا کے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ہندوستان کے کنوارے مرد اور عورتیں بہت کم ہیں۔ لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے لیڈر، سماجی اصلاح پسند اور منصوبے بند لوگ اس حقیقت کو پوری طرح محسوس کر لیں کہ اس ملک میں ہر شادی کا مطلب ہے "دو ہستیوں کا مل کر پوری قوت سے انسانی تعداد میں اضافہ کرنا" اسلئے ہندوستان کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ بچوں کی تعداد پیدائش پر مناسب پابندی لگائی جائے اور ہر تجویز دفاع کے ہیں اس چیز کو مقدم سمجھنا چاہیئے۔ دنیا کے بہت سے ملکوں میں برتھ کنٹرول کلینک قائم ہو چکی ہیں مثلاً ہالینڈ، بلجیم، فرانس، جرمنی، اٹلی و اسپین وغیرہ آخر ہندوستان میں ان کا قائم ہونا کیا بڑی بات ہے۔

ہماری ذمہ داری

ایچ - جی - ڈیکر نے اپنی کتاب "ورک، ویلتھ اینڈ ہیپی نس آف مین کائنڈ" (بنی نوع انسان کے لئے مسرت، دولت اور روزگار) میں بنگال کے کسی خطے کی انسانی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "بنگال کے سیکڑوں آدمیوں کو ہر سال شیر چیتے اور دوسرے آدم خور درندے کھا جاتے ہیں۔ یہ درندے گاؤں میں رات کے وقت گھس آتے ہیں اور لوگوں کو گھروں سے اٹھا لے جاتے ہیں۔ کھڑکی، جنگلے، تالے کیلئے روپئے کی ضرورت ہے اور کسانوں کے پاس کچھ بھی نہیں۔ کیسی دردناک حقیقت ہے کہ بنگال کے ان غریبوں کی زندگی اس قدر سستی ہے۔"

ان مزدور عورتوں پر ایک نظر کیجئے جو مہد سے لحد تک بچوں کی کثرت سے عاجز رہتی ہیں اور زندگی کی کوئی مسرت محسوس کرنے سے پہلے ہی جسمانی طور پر ازکار رفتہ ہو جاتی ہیں یہ منظر دیکھ کر ہر شخص کو یہ یقین ہو جائے گا کہ برتھ کنٹرول بے حد ضروری ہے۔ پلان بنانے والے یہ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں قومی پیمانے پر منصوبہ بندی جاری ہونے والی ہے لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ اگر اسی طرح لوگوں کو اندھا دھند آبادی بڑھانے کی اجازت دے دی گئی تو یہ منصوبہ بندی ہی ناممکن ہو جائے گی۔ موجودہ صورت حال میں آبادی سے ہماری دشواریاں بڑھ رہی ہیں اور کمزور کر دیں گی۔ جب ہندوستان بھر میں جگہ جگہ 'برتھ کنٹرول دوا خانے' قائم ہو چکیں اسی وقت یہ ملک سانس لینے کے قابل ہو سکتا ہے۔

دنیا میں ہر سکنڈ پر دو بچے پیدا ہوتے ہیں اور ہندوستان میں ۲۵ بچے فی منٹ پیدائش کا اوسط ہے ان ۲۵ میں سے ... مر جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ بہت ضروری ہے کہ جب ہم سائنس کی مدد سے پیدائش کا اوسط پر بندش لگا سکتے ہیں تو لگا دیں۔ میونسپلٹی کو یہ دیکھنے کے لئے مستحکم ارادہ اور سختی کے ساتھ قدم اٹھانا چاہیئے کہ ایک شادی سے دو (یا زیادہ سے زیادہ تین) بچوں سے اوپر نہ ہوں صرف اسی صورت میں یہ ممکن ہے کہ ہم کسی قدر اونچا معیار قائم و برقرار رکھ سکیں اور اسی سے بیروزگاری کی لعنت اس سرزمین ...

اخبارات کی رائیں

لارڈ ویول کا دوسرا اعلان

۱۸ ستمبر کو لارڈ ویول نے اپنے دوسرے سفر لندن سے واپس آنے کے بعد ہندوستان کے حال و مستقبل کے متعلق جو اعلان کیا ہے اس پر بعض اہم اردو اخبارات کے تبصرے درج ذیل ہیں۔

'ادارہ'

مدینہ جمیعۃ العلمائے ہند کا ترجمان سہ روزہ مدینہ بجنور لکھتا ہے:۔

حکومت برطانیہ کی یہ تازہ پیشکش کرپس پیشکش ہی کا دوسرا نام ہے جس کا اعتراف لارڈ ویول اور مسٹر اٹلی دونوں نے خود بھی کیا ہے۔ البتہ اس مرتبہ اسکیم میں ترمیم کی کھلی گنجائش رکھی گئی ہے مگر اسی کے ساتھ بعض اہم پہلو اسقدر مبہم بنا دیئے گئے ہیں اور بعض مسائل اتنے تشنہ رہ گئے ہیں کہ جب تک ابہام نہ دور کر دیا جائے اور ضروری وضاحت نہ کر دی جائے۔ اس وقت تک زیر نظر پیشکش کو اطمینان بخش نہیں کہا جا سکتا۔ مثال کے طور پر مرکز میں قومی حکومت کے قیام کا مسئلہ ہے یاد ہوگا کہ اسی مسئلہ پر سنہ ۱۹۴۲ء میں گفت و شنید ناکامی پر ختم ہو گئی تھی اور اسی مسئلہ نے شملہ کانفرنس کو ناکام بنایا تھا۔ بایں ہمہ لارڈ ویول نے فرمایا ہے کہ جب صوبائی انتخابات کے نتائج کا اعلان ہو جائے گا تو فوراً ہی مرکز میں ایک ایسی ایگزیکیٹو کونسل بنائی جائے گی جس کو بڑی بڑی پارٹیوں کی حمایت حاصل ہوگی۔ شملہ کانفرنس کی ناکامی کے اسباب پر نظر ڈالنے کے بعد یہ سوال از خود پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی ایک پارٹی حسب سابق شرکت کیلئے تیار نہیں ہوتی تو کیا ہوگا؟ افسوس کہ ابھی تک یہ سوال تشنۂ جواب ہے اور مسئلہ کل کی طرح آج بھی اُلجھا ہوا ہے دوسری اہم بات نمائندہ اسمبلی کی طلبی سے متعلق ہے ہز ایکسیلنسی کے اعلان میں کہا گیا ہے کہ نمائندہ اسمبلی کی تشکیل سے قبل صوبائی نمائندوں کو یہ معلوم کرنے کے لئے طلب کیا جائے گا کہ آیا وہ پیشکش کرپس کو اُس کی اپنی شکل میں پسند کرتے ہیں یا ترمیم شدہ کسی دوسری اسکیم کی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ باہمی اختلافات کی نمائش کے لئے ایک اور میدان تیار کیا جا رہا ہے اور پھر یہ بھی نہیں بتایا جاتا کہ صوبائی نمائندوں کا مشورہ حکومت کے لئے لازمی طور پر قابل قبول ہوگا یا نہیں۔ تیسری اہم بات یہ ہے کہ ہز اکسیلنسی نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ نئی اگزیکٹو کاؤنسل بننے تک موجودہ حکومت ہی ضروری اقتصادی و سوشل مسائل حل کرنے کا کام جاری رکھے گی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ موجودہ حکومت ہندوستانی عوام کی نمائندہ حکومت نہیں ہے۔ کانگریس اپنی ایک قرارداد کے ذریعہ اتحادی اقوام کو متنبہ کر چکی ہے کہ وہ موجودہ حکومت کی عائد کی ہوئی پابندیوں کو لازمی طور پر نہیں اپنائے گی ان حالات میں ضرورت تھی کہ موجودہ غیر نمائندہ حکومت کے حدود کار متعین کر دیئے جاتے تاکہ آئندہ کوئی نزاع پیدا نہ ہو سکتا

ملاپ لاہور کا کانگریسی اخبار ملاپ لکھتا ہے۔

لارڈ ویول کے اعلان کا عنوان ہونا چاہئے تھا "آج نہیں کل" یعنی آج کچھ نہیں ہو سکتا۔ کل دیکھا جائے گا اور کل کیا ہوگا۔ اس کے متعلق اُن کا ارشاد ہے "ایک آئین ساز اسمبلی بلائی جائے گی جو تمام فیصلے کرے گی" قدرتی طور پر یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ یہ فیصلے کیا ہونگے اس لئے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ لارڈ ویول نے ہندوستان کے مستقبل کو پہلے کی طرح ہی تاریک اور غیر یقینی حالت میں کیوں رہنے دیا جائے جو جو تشتی نہیں ہیں۔ آئین ساز اسمبلی کیا کرے گی۔ اسے وہ پیش از وقت بتا نہیں سکتے۔ ہاں آپ یہ پوچھ سکتے ہیں کہ یہ اسمبلی بنے گی کیسے؟ اسکے متعلق لارڈ ویول کا جواب ہے "ہندوستان کی مختلف پارٹیوں اور والیان

ریاست کے فیصلے سے۔ ادھر انتخابات کے نتائج نکلیں گے۔ ادھر معلوم ہو جائے گا کہ ہندوستان نے کس کس پارٹی کو اپنایا ہے۔ ان پارٹیوں کے نمائندوں اور لیڈروں کو والیان ریاست کے نمائندوں کے ساتھ ایک کانفرنس میں بلایا جائے گا اور یہ کانفرنس فیصلہ کرے گی کہ آئین ساز اسمبلی کتنی بڑی ہو۔ کیسے بلائی جائے اور اسے کیا کیا اختیارات ہوں؟ یعنی ایک بار پھر آپ نہیں پوچھ سکتے کہ آئین ساز اسمبلی کیسے بلائی جائے گی اور اسے کیا اختیارات ہوں؟ یعنی ایک بار پھر آپ یہ نہیں پوچھ سکتے کہ آئین ساز اسمبلی کیسے بلائی جائے گی اور اسے کیا اختیار ہوگا۔ ایک بار پھر لارڈ ویول کہہ سکتے ہیں۔ میں جوتشی نہیں ہوں۔ ان تینوں باتوں کو دیکھنے کے بعد جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے اسے غور سے دیکھئے معلوم ہوگا کہ آجا کر سارا جھگڑا پارٹیوں پر چھوڑ دیا جائے گا یہ پارٹیاں ہیں کانگریس ہندو سبھا۔ مسلم لیگ۔ اکالی۔ یونینسٹ، کیمونسٹ، اینگلو انڈین یوروپین اور ریاستیں اگر سوال صرف برطانیہ سے معاہدہ کرنے کا ہو تو یوروپین اور ریاستی نمائندوں کے سوائے سب کے سب مکمل آزادی کی حمایت کرینگے لیکن سوال مکمل آزادی کا نہیں بلکہ ہندوستان کے آئین کا ہے۔ اس لئے سب سے پہلا اور سب سے اہم زیر غور مسئلہ ہوگا فرقہ وارانہ حقوق کی تقسیم یوروپین اور ریاستی نمائندے اس سلسلہ میں کیا کریں گے؟ یہ کوئی کہہ نہیں سکتا لیکن اگر مسلم لیگ کو دشواری ہوا کہ آئین ساز اسمبلی اسے بنا بنایا پاکستان نہیں دے سکتی تو وہ اسمبلی میں شامل ہونے سے انکار کرےگی اس کے بعد کیا ہوگا؟ یہ لارڈ ویول نے نہیں بتایا۔ یعنی اُن کے سارے اعلان کا مطلب یہ ہے کہ آج کچھ نہیں ہو سکتا۔ کل دیکھا جائیگا اور کل کیا ہوگا۔ اس کے متعلق کوئی کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے سب کچھ ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کچھ بھی نہ ہو۔

ہند کلکتہ کا کانگریسی اخبار روزنامہ ہند لاٹ صاحب کیا لائے سرخی کے ماتحت لکھتا ہے۔

انگریز حاکم آئیں بائیں شائیں کر رہے ہیں اور سمجھتے ہیں اس طرح ہندوستان کو مطمئن کر دیں گے اور دنیا کو یقین دلا دیں گے کہ وہ ہندوستان کو آزادی دے دینے والے ہیں۔ صاف بات کو اُلجھایا جا رہا ہے صاف بات یہ ہے کہ تم ہندوستان سے چلے جاؤ اور ہندوستانیوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دو۔ تمہیں کیوں فکر ہے کہ ہندوستانی اپنا دستور بنائیں گے یا نہیں بنائیں گے؟ بنائیں گے تو کیسا بنائیں گے؟ نہیں بنائیں گے تو پھر کیا کریں گے؟ تم نے طاقت کے زور سے ہندوستان کو غلام بنا رکھا ہے اور ہندوستان کو تباہ و برباد کر ڈالا ہے تمہاری حکومت اگر اچھی بھی ہوتی تو بھی ناجائز ہوتی کیونکہ زبردستی بنائی گئی ہے لیکن تمہاری حکومت ایسی رہی ہے کہ ہندوستان کبھی بھی اس کالی حکومت کو بھول نہ سکیگا پھر تم حکومت کرنے کے نااہل ثابت ہو چکے ہو۔ لڑائی کے میدانوں میں تم سے کچھ بھی ہو نہ سکا، اور سنگاپور، ملایا، برما سے دُم دبا کر بھاگ نکلے اور بنگال میں تمہاری نااہلی نے لاکھوں آدمیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

صاف بات یہ ہے کہ تم ہندوستان سے چلے جاؤ اور لندن میں بیٹھ کر دیکھو کہ ہندوستانی تمہارے جانے کے بعد کیا کرتے ہیں آخر ہوگا بھی کیا؟ زیادہ سے زیادہ یہی نہ کہ ہندوستان میں خانہ جنگی ہوگی۔ تو خانہ جنگی تمہاری بلا سے۔ ہم آپس میں لڑ بھڑ کر کچھ نہ کچھ طے ہی کرینگے وہ کون ملک ہے جس میں خانہ جنگی نہیں ہوئی؟ خود تمہارے ملک میں بھیانک خانہ جنگیاں ہو چکی ہیں اگر ہندوستان میں بھی خانہ جنگی ہونا ہے تو ہونے دو خون کے بہنے ہی سے تو قومیں پاک ہوتی ہیں طاقت حاصل کرتی ہیں۔ اونچی ہو جاتی ہیں۔ اگر ہندو مسلمان آپس میں سمجھوتہ نہ کر سکے، تو دونوں کو آپس میں لڑنا ہی ہوگا تو ہونا چاہئے بھی۔ یہ لڑائی ہندوستان کو مٹائے گی نہیں، جلا دے گی، لیکن تمہیں اس خانہ جنگی کی آخر فکر کیوں ہے؟

سرفراز لکھنؤ کا غیر لیگی شیعہ اخبار سرفراز لکھتا ہے:۔

اس اسکیم میں میاؤں کا مقصود جو کچھ ہے وہ یہی کہ ہندو مسلم اختلاف کیونکر دور ہوگا۔ اس کے لئے کرپس تجاویز میں یہ گوشہ رکھا گیا ہے کہ اگر کوئی صوبہ متحدہ آئین کے ماتحت قائم ہونے والی متحدہ حکومت ہند میں شریک ہونا نہ چاہے گا تو وہ صوبہ اس سے علیحدہ رہ سکے گا۔ وہ علیحدہ رہتے ہوئے حکومت برطانیہ سے جداگانہ صلحنامہ کریگا جس طرح کہ وہ دیسی ریاستیں بھی جداگانہ صلحنامہ برطانیہ سے کرینگی جو مشترک حکومت ہند میں شریک ہونا منظور نہ کرینگی۔

لیکن کرپس تجویز میں سارے صوبے کی رائے پر علیحدگی منحصر کیگئی ہے جبکہ مسٹر جناح کا مطالبہ ہے کہ صرف صوبے کی مسلم پبلک کی رائے کافی سمجھی جائے اور سکھوں اور ہندوؤں وغیرہ کو کہ اقلیت میں ہونگے [illegible] کی جائے

یہ ایسی گتھی ہے جو شروع سے اب تک حل نہ ہوئی اور نہ آئندہ آسانی سے حل ہوتی نظر آتی ہے۔ شاید الکشن کے نتائج سامنے آجانے کے بعد کانگریس، لیگ وغیرہ کے لیڈروں کو اپنی رایوں پر نظرثانی کا موقع ملے اور اتحاد کی کوئی شکل غیب سے سامنے آجائے۔ اگر حکومت ہند صدق دل سے اپنی اسکیم پیش کر رہی ہے اور آخر تک اس میں پُر خلوص طور پر غیر جانب دار رہے گی تو اس قضئے کے حل ہوجانے کے قرائن پیدا ہوں گے ورنہ دوسری شکل میں بہت دشواری ہوگی۔

پیام حیدرآباد جو ایک قوم پرست اخبار ہے ویول کی تازہ پیش کش کے متعلق لکھتا ہے۔

مستقبل بعید کے یہ منصوبے جتنے مبہم ہیں اتنا ہی مبہم مستقبل قریب کا وہ منصوبہ ہے جو وائسرائے نے اپنی کونسل کے متعلق پیش کیا ہے۔ الکشن کے بعد وہ ایک ایسی ایگزیکیوٹو کونسل قائم کریں گے جسے ہندوستان کی خاص خاص جماعتوں کی تائید حاصل ہو۔ یہ بات کسی قدر اطمینان بخش ہے کہ اس میں فرقوں کی جگہ جماعتوں کا ذکر آیا ہے اور شملہ کانفرنس میں کانگریس لیگ مساوات کی جگہ ہندو مسلم مساوات کو بنیاد قرار دیکر حکومت نے جو غلطی کی تھی اس سے بچاؤ کر لیا گیا ہے تاہم کوئی واضح بات نہیں کہی گئی ہے حالانکہ لارڈ ویول نے اپنی تقریر میں کہا ہے کہ "ہم دشواریوں سے واقف ہیں اور ان پر قابو پالینے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں" لیکن جب ایک سرکاری ترجمان سے اس تہیہ کی تفصیل پوچھی گئی تو اس نے کہا کہ اس کا دارومدار دشواری پیدا کرنے والے اور اسکی قوت پر ہے گویا ایک ہاتھ سے تھوڑا بہت جو کچھ دیا جا رہا ہے دوسرے ہاتھ سے اسے واپس لینے کا امکان بھی باقی رکھا جا رہا ہے۔ لیکن اہل ہند اگر آزادی کے نام پر متحد ہوجائیں تو اس امکان کو ختم کر سکتے ہیں۔ اگرچہ حکومت پھوٹ ڈالکر حکومت کرنے کی پالیسی پر کاربند ہے لیکن پھوٹ کو مٹانے کے لئے ہندوستانی لیڈروں پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ اسے ٹال نہیں سکتے۔ خاصکر ایسے وقت کہ جب حکومت نے با دل ناخواستہ ہندوستانیوں کو اپنا دستور آپ بنانے کا حق مان لیا ہے۔

پیام چونکہ ایک ریاستی اخبار ہے اس لئے اس سلسلہ میں اس نے والیان ریاست سے کہا ہے۔

ہندوستانی ریاستوں کے متعلق لارڈ ویول کے اعلان میں صرف ایک جملہ ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ "ہندوستانی ریاستوں کے نمائندوں سے بھی یہ معلوم کرنے کے لئے گفتگو کی جائے گی کہ دستور ساز مجلس میں ان کے حصہ لینے کی بہترین صورت کیا ہوگی"۔ اس ضمنی تذکرہ کے باوجود ریاستوں پر جو ذمہ داری عاید ہوتی ہے وہ بہت بڑی ہے برطانی ہند کی سیاسی جماعتیں اکثر یہ شکایت کرتی ہیں کہ ریاستیں آزادی کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوتی ہیں اور جب کرپس والی تجویزوں میں یہ کہا گیا کہ جو ریاست اتحاد ہند میں شامل نہیں ہوگی اس کے ساتھ برطانی حکومت ایک الگ معاہدہ کرے گی تو یہ شکایت بہت بڑھ گئی تھی ممکن ہے اس مرتبہ بھی حکومت کی طرف سے ریاستوں کو اسی طرح استعمال کرنے کی کوشش کی گئی اور یہ کوشش کامیاب ہوگئی تو ریاستوں کا مستقبل چند روز کے لئے چاہے جتنا بہتر معلوم ہونے لگے لیکن مستقل طور سے تاریک ہوجائے گا۔ اس لئے کہ ہندوستان اب سدا محکوم نہیں رہے گا۔ ضرورت ہے کہ وائسرائے کے ساتھ دستوری مسائل پر گفتگو کرنے کیلئے ریاستوں کی جانب سے اچھے سے اچھے نمائندے وہی ہو سکتے ہیں جنکو عوام کی زیادہ سے زیادہ تائید حاصل ہو۔

منشور مرکزی مسلم لیگ کا ترجمان لکھتا ہے:—

بیشک اس سے مسلم لیگ کے دو اعتراضات رفع ہو جاتے ہیں:۔ ایک یہ کہ مجلس واضع آئین ہندوستان میں ایک یونین قائم کرنے کے لئے منعقد کی جا رہی تھی اور دوسرا یہ کہ گذشتہ ۱۹۴۲ء کے مسودۂ اعلان میں ترمیم یا متبادل اسکیم پیش کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ موجودہ اعلان میں جب متبادل یا ترمیم شدہ اسکیم پیش کرنے کی گنجائش ہے تو اس مجلس وضع آئین کا مقصد یہ ہے ہندوستانی یونین قائم کرنا ہرگز نہیں۔ جبکہ حکومت برطانیہ کی طرف سے اس میں تجاویز کرپس پیش ہونگی۔ مسلمانوں کو یہ حق ہونا چاہئے اور یقیناً ہوگا کہ وہ پاکستان اسکیم پیش کردیں اور اس مجلس واضع آئین کو اس پر غور کرنا پڑے گا۔

یہ دو اعتراضات بیشک رفع ہوگئے اور اس کا امکان پیدا ہوگیا کہ مسلمان اس مجلس واضع آئین میں شریک ہوجائیں۔ مگر دو شرطیں بہر حال لازمی ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ نمائندے جو مسودے کیلئے منتخب ہوں بطریق انتخاب جداگانہ ہوں اور دوسرے یہ کہ مجلس واضع آئین میں مسلمانوں کی تعداد یا اتنی ہو کہ وہ اکثریت کی توقع کر سکیں یا پھر اکثریت کے ذریعہ فیصلہ

نہ ہو۔ یقیناً لارڈ ویول اس کا یہ جواب دیں گے کہ یہ مسئلہ ابتدائی مشورے میں طے ہوگا۔

حق لکھنؤ کا مسلم لیگی اخبار ویول کے اعلان کا خلاصہ پیش کرنے کے بعد لکھتا ہے :۔

یہ خلاصہ ہے اس اعلان کا جس کے انتظار میں کانگریسی لیڈران لیل و نہار کی طرح کروٹیں بدل رہے تھے وہ بجائے خود متوقع اسکے تھے کہ چونکہ لیبر گورنمنٹ کے ہاتھ میں سلطنت برطانیہ کی زمام حکومت آگئی ہے لہذا اب ہندوستان کو کانگریس کے حسب منشا اس بام بلند پر لیجا کر کھڑا کر دیا جائے گا کہ جسے وہ سوراج کے نام سے مدتہائے دراز سے یاد کرکرکے جی رہی ہے لیکن واقعہ یہ ہوا کہ لیبر وزارت کی تائید اور ہم آہنگی سے بھی ہندوستان کو آگے بڑھانے کے بجائے اُسے ۱۹۴۲ء پر واپس لیجانے کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے اس کے بعد غالباً کانگریس والوں کو یہ محسوس ہوا ہوگا کہ اگر انھوں نے ۱۹۴۲ء میں اس پیشکش کو ٹھکرانے کی غلطی نہ کی ہوتی تو جو چیز انھیں ۱۹۴۵ء میں مل رہی تھی وہ اس سے تین سال پہلے مل چکی ہوتی اور وہ درجۂ نو آبادیات کہ جسے سامنے آنے کے بعد ۱۹۴۲ء میں انھوں نے ٹھکرا دیا تھا اس پر وہ اسوقت قائم ہو چکے ہوتے انتخابات کے اختتام اور اس کے نتائج کے اعلان تک تو وائسرائے کے اس اعلان کا نفاذ ہونا نہیں اور اس کے بعد کانگریس اور مسلم لیگ کی طرف سے گورنمنٹ کی اس پیشکش کی صورت میں خیر مقدم کیا جائیگا، اسکے بارے میں ابھی کوئی بات کہنا قبل از وقت ہے۔ غیر سرکاری اور سیاسی حلقوں کا یہ اطلاع ہے کہ وہاں وائسرائے کے اس اعلان پر کسی خوشی اور مسرت کا اظہار نہیں کیا جا رہا ہے۔

انقلاب لاہور لکھتا ہے :۔

حکومت برطانیہ کے متعلق کسی کا گمان اچھا ہو یا بُرا ہو اس کی نیت کو نیک سمجھا جائے یا نہ سمجھا جائے لیکن اس حقیقت میں شبہ نہیں کہ مختلف ہندوستانی جماعتوں کے اتفاق سے آزادی جلد از جلد حاصل کیجا سکتی ہے۔ لیکن اگر خدا نخواستہ اتفاق نہ ہوسکا تو موجودہ حالت میں کسی بہتر اور قابل ذکر تغیر کا بظاہر کوئی امکان نہیں ہے۔ کانگریسی کہتے ہیں کہ ترک ہند کی قرارداد بدستور باقی ہے۔ لیکن اس کی عملی حیثیت کیا ہے؟ اس کے وجود بقا سے ہندوستان کو کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے؟ ایسا ڈھول پیٹنے سے کیا حاصل جس کی آواز ڈھول کے خلا سے باہر نہ نکلے؟ ہندوستان کی نجات صرف اتفاق پر موقوف ہے اور اتفاق ہی پر موقوف رہے گی اس کے سوا جو کچھ ہے وہ محکومی کے امتداد کے سوا کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا جن لوگوں میں اپنے معاملات کو سنبھالنے اور درست کرنے کی ہمت وصلاحیت نہیں تھی وہ گھبرا کر یہ کہتے رہے کہ تیسری پارٹی ہم میں پھوٹ ڈال رہی ہے۔ تیسری پارٹی یقیناً اپنے بقا کی کسی تدبیر کو حتی الامکان نظر انداز نہیں کریگی۔ اور اس کے فرشتہ سیرت بن جانے کی آرزو قیامت تک پوری نہیں ہوسکتی۔ لیکن آج ہر شخص پر واضح ہوجانا چاہئے کہ پھوٹ کے ذمہ دار ہم خود ہیں اور یہ پھوٹ اس پیمانے پر پہونچ چکی ہے کہ حکومت ہمارے ہر متفقہ فیصلے کو بے توقف مان لینے کا اعلان کر رہی ہے اور ہم آپس میں سمجھوتہ نہیں کرسکتے اور قوت آزمائی کے انتہائی ساز و سامان کے ساتھ انتخابات کے میدان میں اُتر رہے ہیں یعنی پھوٹ میں اگر کوئی کسر رہ گئی ہے تو اُسے آئندہ تین چار مہینے میں پورا کردیا جائے گا۔ پھر پھوٹ محض مختلف قوموں تک محدود نہیں بلکہ ان قوموں کی مختلف پارٹیاں ہیں جو آپس میں اس طرح کشمکش پر تلی بیٹھی ہیں کہ گویا ایک نئی جنگ عظیم کا منظر پیدا کرکے دم لیں گی۔ ان افکار اور اس طرز عمل کیساتھ تیسرے فریق کو طعنے دینے سے بیشتر ہمیں سو مرتبہ تامل ہونا چاہئے

زمیندار کانگریس کو مشورہ دیتا ہے۔

کانگریس سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ ہندوستان میں وہی دستوری سکیم عملی صورت اختیار کرسکے گی جسے مسلمانوں کی تائید و حمایت حاصل ہوگی ہندو اپنی سرمایہ دارانہ قوت سے چاہے برطانیہ کو بھی خرید لیں اور اپنی شورش آرائی سے خواہ ہندوستان کو انقلاب کے کوئلوں میں دے پٹکیں اور اس دہشت انگیزی سے برطانیہ و ہندوستان کی حکومتوں کو بھی لرزہ براندام کردیں لیکن ہندوستان میں کوئی دستوری تجویز قابل عمل نہیں بنائی جا سکتی جب تک اس پر مسلمانوں کی مہر تصدیق ثبت نہ ہو۔ کیونکہ دس کروڑ انسانوں کو نظر انداز کرنا ملک پر زلزلہ افگن حوادث کے دروازے کھولنے کے مرادف ہے۔ اس حقیقت سے نہ ہندو کو انکار ہے نہ انگریز ہی کو پس و پیش ہوسکتا ہے پھر پاکستان کے مطالبے سے کانوں پر ہاتھ کیوں دھرے جاتے ہیں، جب مسلمان پاکستان کے سوا مطمئن نہیں ہوسکتے تو پھر حریت خواہی کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ ہندو اور مجنون غلام سازی کے جوش میں

تبصرہ

اُردو ادب میں تاریخ نویسی کا ایک نیا دور

کمپنی کی حکومت مُصنّفہ باری۔ قیمت چار روپے

ملنے کا پتہ مکتبہ اُردو، لاہور۔ حجم چار سو صفحات۔

جہاں تک لکھائی چھپائی اور کتاب کی صوری حیثیت کا تعلق ہے محض مکتبہ اردو کا نام ضمانت کے لئے کافی ہے جس نے طباعت و اشاعت کی ٹیکنیکل خوبیوں کے لحاظ سے اردو میں یوروپین معیار قائم کر دیا ہے۔ کپڑے کی مضبوط اور خوشنما جلد پر رنگین گردپوش ہے جس نے کتاب کو اس قابل بنا دیا ہے کہ ڈرائنگ روم کے کونے میں رکھی ہوئی شیشے کی خوبصورت الماری میں لے فرانس اور امریکہ کی مطبوعہ تصانیف کے پہلو بہ پہلو آراستہ کیا جا سکے۔

جہاں تک کتاب کی معنوی حیثیت کا تعلق ہے باری کا نام اُردو کے ایک صفِ اوّل کے معاشرتی ادیب (WRITER.SOCIOLOGICAL) کی حیثیت سے محتاجِ تعارف نہیں۔ باری کا اسٹائل صاف، سادہ سلیس رواں دواں اور سائنٹفک ہوتے ہوئے بھی پر جوش ہوتا ہے۔ اسی قسم کا طرز معاشرتی موضوعات کیلئے موزوں بھی ہے۔

"شکست خوردہ تاجدار کی کوئی منزلِ مقصود نہ تھی وہ لکڑی کے اس ٹکڑے کے مانند تھا جو سمندر کی موجوں کے رحم کرم پر ہو۔ ابو عبداللہ ایک پہاڑی پر رک جاتا ہے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ابو لحمرہ! دنیا کی یہ حسین ترین عمارت ابو عبداللہ کو واپس نہ بلا سکی۔ حسین و جمیل عمارتیں بنانا اور پھر ان کے تحفظ کی قوت کھو دینا کیا کم عبرتناک ہے؟ ابو عبداللہ کی تلوار کند ہو چکی تھی۔ ایک ہارا ہوا بادشاہ! الحمرا پر اس کی آخری نگاہ تھی۔ اس کی آنکھیں پر نم تھیں۔ وہ رو رہا تھا۔ بچوں کی طرح انسانی تقدیر آنسوؤں سے نہیں بدل سکتی۔"

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ تصنیف ہندوستان کی تاریخ کے ایک ایسے دور سے بحث کرتی ہے جسے کئی باتوں کے لحاظ سے سب سے انقلابی سب سے مصیبت انگیز اور سب سے ذلت آمیز، پر امیدوار اور مایوس کن سب سے زیادہ (ANARCHIE) اور سب سے تعمیری دور قرار دیا جا سکتا ہے یہ وہ عہد ہے جب ہندوستان کا صدیوں پرانا ساختی اور جاگیردارانہ نظام مغرب کی ترقی یافتہ صنعتی سرمایہ داری سے دوچار ہوتا ہے اور دوچار ہونے کے بعد اس کے دست و بازو بھڑنے لگتے ہیں ایک مہیب اور عظیم الشان عمارت جس کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں تیزی کے ساتھ زمین بوس ہونے لگتی ہے۔ لیکن کاش یہ تاریخی عمل آزادانہ طور پر وقوع پذیر ہوتا اور اس کو آگے بڑھانے میں کسی بدیسی سامراج کا ہاتھ نہ ہوتا۔ یورپ میں سرمایہ داری کے شہنشاہیت اور ملوکیت کا روپ اختیار کرتے ہی برطانوی سامراج کے آہنی دست و بازو ہندوستان کے سامنتی نظام کے گرتے ہوئے در و دیوار کو تھام لیتے ہیں اور جاگیرداری کے مکمل استیصال اور سرمایہ داری کے مکمل قیام کا فطری تاریخی عمل بالکل غیر فطری طور پر اپنے منطقی نہج تک پہنچنے سے روک دیا جاتا ہے ہندوستان دونوں نظاموں کے بیچ میں لٹک کر رہ جاتا ہے ؎

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ برطانوی سرمایہ داری کے بنیادی مفاد اسی میں پوشیدہ تھے۔ ہندوستان میں سرمایہ دارانہ نظام کے مکمل قیام کے معنی تھے برطانوی سامراج کی شکست اور زوال ٹھیک جس طرح امریکہ میں ہوا۔

پھر اس کے بعد ایک نئے عہد کا آغاز ہوتا ہے۔ خود ہندوستان اس تاریخی عمل کو جس کا تذکرہ اوپر آ چکا ہے اس کے منطقی نہج تک پہنچانے

کے لئے جدوجہد شروع کرتا ہے۔ یہ ہندوستان میں قومی تحریک کے آغاز کا دور ہے، جو ۱۸۵۷ء کے بعد تھوڑا دم لینے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ زیر نظر تصنیف بہرحال اس دور کو زیر بحث نہیں لاتی اس لئے کہ یہ اس کے موضوع سے باہر ہے۔ ۱۸۵۷ء میں ایک کرم خوردہ جاگیرداری فیوڈل نظام کے نام لیوا۔ ترقی یافتہ مغربی سرمایہ داری سے ٹکر لیتے ہیں اور لابدی طور پر شکست کھاتے ہیں یہ شکست ان کی موت کا پیغام لے کر آتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وقت کے خونیں افق پر ہندوستان کے لئے ایک نئی زندگی کے پَو پھٹنے لگتے ہیں۔

اوپر کے بیان سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ زیر نظر تصنیف ہندوستان میں رونما ہونے والے مغرب اور مشرق کے تصادم کے صرف اس عہد سے بحث کرتی ہے۔ جس میں مغرب کی تجارتی اور صنعتی سرمایہ داری ہندوستان کے جاگیردارانہ نظام کی جڑیں کھوکھلی کرنے لگتی ہے اور آخر ۱۸۵۷ء میں اس کو اس حد تک تباہ و برباد کر کے دم لیتی ہے جس حد تک وہ غیر ملکی سرمایہ داری اور سامراج کے لئے خطرے کا باعث ہو سکتا تھا۔ اس عمل میں جو بدقسمتی سے غیر ملکیوں کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوا ہندوستان کی داستان ایک عبرتناک اور الم انگیز داستان ہے۔ ایک بوڑھے دم توڑتے ہوئے نظام کی جاں کنی کا عالم یوں ہی آہوں، کراہوں، سسکیوں اور ہچکیوں سے معمور ہوتا ہے اس پر ایک خود غرض، بے رحم، لالچی، بیہودی قسم کے اجنبی کی آہنی ضربیں! جنھوں نے مرنے والے کے احساس تکلیف کو شدید سے شدید تر کر دیا۔ یہ ہے کمپنی کی حکومت کی وہ پرالم داستان جس کو باری نے اپنی شاندار تصنیف میں اتنا دلچسپ بنا کر پیش کیا ہے

باری کا تجزیہ بنیادی اور سائنٹفک ہے اور تاریخ نگاری کے اُس عہد کی نمائندگی کرتا ہے جو گبن اور کارلائل کے عہد کو ایک صدی پیچھے چھوڑ چکا ہے۔ اس نئے عہد میں تاریخ نگاری محض واقعات و حادثات اور ہنگاموں کو یکجا جمع کرنے کا نام نہیں رہ جاتی ہے اور نہ اس دور کی تاریخ نگاری میں شخصیتوں کو اور جرنیلوں اور بادشاہوں کی نجی زندگی کو سماجی انقلابات کا مرکز بنا کر دکھایا جاتا ہے۔ یہ دور وہ دور بھی نہیں جب کہ فلسفۂ تاریخ (PHILOSOPHY of HISTORY) پیش کرنے کے یہ معنی تھے کہ سماجی رفتار اور تاریخی عمل کو مابعد الطبیعاتی محرکات کا نتیجہ قرار دیا جائے۔ جیسا کہ گبن اور کارلائل نے کیا۔ تاریخ نگاری کے اس سائنٹفک دور میں سماجی انقلابات کے اسباب و علل ان مادی اور معاشی طاقتوں میں تلاش کئے جاتے ہیں جو انسان کی معاشرتی زندگی کی تہ میں کارفرما ہوتی ہیں زیر نظر تصنیف اُردو زبان میں جدید سائنٹفک تاریخ نگاری کے عملی اطلاق کا ایک اعلیٰ اور مکمل نمونہ ہے۔ اس حیثیت سے یہ تصنیف اردو کے معاشرتی ادب میں ایک نادر اضافہ ہے۔

اس کتاب میں جو فلسفہ تاریخ مضمر ہے اور اس میں تاریخ نگاری کے جس طریقۂ کار (METHOD) سے کام لیا گیا ہے اس سے قطع نظر اسے زیر بحث دور سے متعلقہ تاریخی واقعات و حقائق اور تفصیلات کا ایک جامع اور مکمل (COMPREHENSIVE) مجموعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

تاریخ کے ہر قسم کے طالب علم کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

اُجالے سے پہلے دس افسانوں کا مجموعہ۔ مصنفہ مدھوسودن بی۔ اے حجم ۲۱۶ صفحات۔ مطبوعہ اردو محل حیدرآباد دکن۔ مجلّد۔ دیدہ زیب گردپوش۔ قیمت درج نہیں ہے اور نہ خدانخواستہ کوئی دیباچہ ہے۔

اردو ادب کے تمام اصناف میں افسانہ ہی کیوں ترقی کے اتنے حیرت انگیز منازل طے کر رہا ہے؟ یہ حالیہ تنقید کا ایک اہم سوال ہے بلاخوف دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ گزشتہ سات آٹھ سال کے عرصے میں اردو افسانہ نگاری ترقی کے اس بلند درجے پر پہنچ گئی ہے جہاں چینی زبان کو چھوڑ کر ایشیا کی کوئی بھی زبان، اور یورپ کی متعدد زبانیں اس کا مقابلہ میں نہیں پیش کی جا سکتیں۔ اس کی متعدد تشریحات پیش کی جا سکتی ہیں۔ مغرب کے صنعتی اور اشتراکی دور سے روشناس ہونے کے بعد ملک میں جو تہذیبی نشاۃ ثانیہ رونما ہوا اس کا ابتدائی اظہار خود ملک کے حالیہ سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل کا ادیب کے شعور میں ردّعمل۔ ان دو طاقتوں نے جدید افسانہ نگاری کے نہ صرف مواد بلکہ تکنیک کا بھی تعین [illegible] وہ غیر شاعری اور عمومی بات ہوئی اُن کو زیادہ خلوص [illegible] کیا جا سکتا ہے کہ اردو افسانہ نگاری کے [illegible] اور تکنیک پر انگریزی کا کم

فرانسیسی کا اس سے زیادہ اور روسی زبان کا سب سے زیادہ اثر پڑا ہے اور اردو افسانے کے بنیادی موضوعات (THE MES) ملک کے حالیہ سماجی اور معاشی مسائل سے براہ راست طور پر ماخوذ ہیں جن میں ادیب کی ذاتی داخلیت کی شمولیت واجب ہی واجب ہوتی ہے۔ جدید اردو افسانہ نگاری ایک طرف تو سماج کے خارجی مسائل کا جائزہ لے رہی ہے اس قسم کے افسانوں میں روسی افسانہ نگاری کی تکنیک واضح ہے۔ اور دوسری طرف انھیں خارجی مسائل نے افراد کے شعور اور کردار میں جو ردّ عمل پیدا کیا ہے اس کا مطالعہ کر رہی ہے۔ یہاں پر اردو افسانوں کی تکنیک نفسیاتی تجزیہ (PSYCHOANALYSIS) ہو کر رہ جاتی ہے۔ بلکہ حالیہ اردو افسانہ نگاری کے جو دو قریب قریب مخالف گروہ پیدا ہو گئے ہیں۔ ان کی اساس انھیں دو فرقوں پر قائم ہے۔ لیکن زیادہ باہوش ادیب ان دو چیزوں کے درمیان۔ یعنی نفسیاتی داخلیت اور سماجی خارجیت کے درمیان — کوئی فرق نہیں محسوس کرتے اور یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی نقیض نہیں ہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو لازمی پہلو ہیں۔ مکمل اور اعلیٰ قسم کے افسانوی تکنیک میں یہ دونوں چیزیں پہلو بہ پہلو اور ایک دوسرے کی معاون و مددگار کی حیثیت سے نظر آتی ہیں۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور کچھ اور ادیبوں کی نئی عظمت کا بھی راز ہے اور اسی کو صحیح، صحت مند اور پر تکمیل نظریہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے یعنی نفسیاتی تحلیل اور سماج کی خارجی تجزیہ ایک دوسرے کے مخالف کی حیثیت سے نہیں بلکہ معاون نظر آتے ہیں۔

مدھو سودن کے افسانوں میں بھی میں نے یہی بات پائی اُن کے افسانے نفسیاتی تجزیے سے مملو ہوتے ہیں لیکن وہ اس کے ابہام میں نہیں گرفتار ہوتے بلکہ خارجی دنیا کے دریچے اور دروازے کھلے رکھتے ہیں جن میں سے باہر کی صحت مند ہوا کے جھونکے داخل ہو ہو کر ماحول کو تر و تازہ رکھتے ہیں۔ ان کا داخلی سماجی تجزیہ خارجی سماجی ماحول پر ایک تنقید بلکہ چوٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا سب سے مکمل نمونہ اُن کا افسانہ ناجائز تعلقات دوسری زندگی میں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُنکا موضوع زیادہ تر جنسیات ہے لیکن اس حسین اور کریہہ دنیا میں داخل ہو کر وہ کیچڑ نہیں اچھالتے اور نہ پبلشرز سے زائد رائلٹی حاصل کرنے کے لئے پڑھنے والوں کی جنسی حس کو خواہ مخواہ اور بلا وجہ بھڑکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا جنسی تجزیہ پاکیزگی، بلندی اور حسین جذبات سے معمور ہوتا ہے۔ اُس کے افسانہ نگاروں کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ (اردو کے کئی عدد چوٹی کے افسانہ نگاروں کے برخلاف) جنس کوئی گھناؤنی چیز نہیں ہے بلکہ قدرت کا دلکش ترین اور مقدس ترین دین ہے۔

موجودہ سماجی نظام نے افراد کی جنسی زندگی پر جو ہولناک اور خطرناک مظالم ڈھائے ہیں اور ڈھا رہا ہے اس کا اتنا موثر اور اذیت ناک بیان مدھو سودن کے علاوہ اور بہت کم افسانہ نگاروں میں ملتا ہے اس کے بعض فقرے تو پڑھنے والے کو تلملا دیتے ہیں اور وہ اپنے اندر سماجی انقلاب کا شدید ترین جذبہ محسوس کرنے لگتا ہے۔

اس کا نفسیاتی تجزیہ بہت عمیق، تفصیلی ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ جذباتی دلکشی کا حامل بھی۔

اس کے افسانوں کا خارجی پلاٹ، بے حد سادہ اور تقریباً کچھ بھی نہیں ہوتا لیکن اس میں وہ نفسیاتی اور جمالیاتی پلاٹ شامل کر کے ایک حسین تخلیق بنا دیتا ہے۔

دس افسانوں کا یہ مجموعہ اردو کے افسانوی ادب میں [illegible] طور پر ایک ملبند اضافہ ہے اور اردو [illegible] افسانہ نگاری کی تاریخ مدھو سودن کو کسی لحاظ سے بھی نظر انداز [illegible] نہیں کر سکتی۔

ط۔ا۔خ

معذرت
ناظرین کرام! چند در چند مجبوریوں کی وجہ سے گزشتہ ماہ کا افسانہ "سہارے" کا بقیہ حصہ شائع نہیں کیا جا رہا ہے، آئندہ ماہ دسمبر میں ملاحظہ فرمائیں۔



بارگاہ الٰہی میں

کرم کر رحم کر پروردگارا ٭ بس اک رحمت کا ہے تیری سہارا
چھپا تجھ سے نہیں احوال میرا ٭ تجھے معلوم ہے سب حال میرا
حیا دیتی ہے حکم بے زبانی ٭ چھپاؤں کیسے اشکوں کی روانی
مجھے برباد کرتا ہے زمانہ ٭ خود اپنا کہہ نہیں سکتی فسانہ

مظہر آرٹ کا مسلّم شاہکار

"پہلی نظر"

اداکاران: دینا۔ موتی لال۔ منور سلطانہ۔ بابوراؤ پندھارکر۔ نیمو۔ بیو۔ بالک رام۔ بدھواڈوانی۔ نفیس بیگم۔ پروین
بمکلا۔ لیلا پوار۔ کوکو۔ سوبھاشنی۔ مغل۔ للتا۔

کہانی۔ مکالمے۔ گانے
ڈاکٹر صفدر آہ

موسیقی
انل بسواس

عکاسی
دلیپ گپتا
کیکی۔ این۔ مستری

پروڈیوسر و ڈائرکٹر
مظہر خاں

مظہر آرٹ پروڈکشنز۔ نیگام کراس روڈ۔ دادر بمبئی

اقبال اکیڈمی کی تازہ ترین اور مقبول ترین تصانیف

تعلیم کا مسئلہ: عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے مایۂ ناز ریڈر پروفیسر ڈاکٹر محمد رضی الدین صاحب صدیقی ایم۔ اے، پی، ایچ ڈی نے پوری وضاحت کے ساتھ ہماری تعلیمی ضروریات پر بحث کی ہے اور مستقبل کے لئے ایک نظام تعلیم کا مشورہ دیا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف اساتذہ اور طلبہ کو مفید ثابت ہوگا بلکہ ہر لکھے پڑھے کے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کرے گا۔ قیمت عہ

ہندوستانی مسلمان: انگریزوں نے جب مسلمانوں سے حکومت لی تو یہاں کیا کیا نئے قوانین جاری کئے اور کس طرح مسلمانوں کی تعلیمی، سیاسی اور اخلاقی حالت کو کمزور کیا۔ اگر آپ اسکی تفصیل دیکھنا چاہیں تو ولیم ہنٹر آئی سی ایس کی کتاب کا مطالعہ کیجئے اور جو پہلی مرتبہ اردو میں ترجمہ ہو کر چھپی ہے قیمت عگ

کالا پانی: سید احمد بریلویؒ کی جماعت مجاہدین کے ایک سرگرم رکن مولوی محمد جعفری تھانیسری کی آپ بیتی۔ وہ کس طرح گرفتار ہوئے۔ کالے پانی میں ان کی عمر کس طرح گزری اور انگریزوں نے وہابیت کا ہوا کس طرح بھیانک شکل میں ہندوستانیوں کو دکھایا اور مسلمانوں کو کچلنے کے لئے کیا طور طریقے استعمال کئے اس کی پوری تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ کیجئے۔ قیمت ایک روپیہ

تقویۃ الایمان: حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی مشہور کتاب تقویۃ الایمان کا ایک نہایت خوبصورت، بہترین اور صحیح ترین ایڈیشن پہلی بار پورے اہتمام کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ جن لوگوں کے پاس اس کتاب کا کوئی ایڈیشن موجود ہے اُن کو بھی یہ نادر نسخہ حاصل کرنا چاہیئے۔ اس کتاب کے شروع میں مولانا کے ذاتی حالات اور آخر میں ان کا ایک غیر مطبوعہ مقالہ "یک روزہ" بھی شامل ہے۔ ان تمام خصوصیات نے اس کتاب کو لاثانی بنا دیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

سیرت سیدہ فاطمہ: جناب سیدہ فاطمۃ الزہرا بنت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک سیرت اور پاک زندگی کے حالات، مردوں، عورتوں، بہنوں اور بچوں سب کے لئے سبق آموز ہیں۔ یہ کتاب اتنی مفید اور بلند پایہ ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ قیمت دو روپے بارہ آنہ

کتب سماوی پر ایک نظر: تورات وانجیل کی تاریخ حیات اور اُن کی تعلیمات کا قرآن پاک کی تاریخ اور ان کی تعلیمات سے موازنہ۔ اردو زبان میں یہ پہلی تحقیقی تصنیف ہے جو یورپ کے اصول تحقیق پر لکھی گئی ہے۔ قرآن پاک کے ہر ماننے والے کو اس کتاب کا مطالعہ لازمی ہے۔ قیمت دو روپے بارہ آنے۔

مندرجہ بالا کتب کے علاوہ ہمارے پاس علامہ اقبال کی جملہ تصانیف موجود ہیں اور علامہ کے متعلق جو کتب ادھر اُدھر شائع ہوئی ہیں وہ اکثر و بیشتر موجود ہیں
اگر آپ اسلامی اور سیاسی لٹریچر کا مطالعہ کرنا چاہیں تو ہماری خدمات سے فائدہ اُٹھائیں

منیجر اقبال اکیڈمی 54 (الف) سرکلر روڈ بیرون موچی گیٹ لاہور



آئینۂ سکندری

عرف

ترکال درشی شیشہ

کہتے ہیں کہ سکندر بادشاہ کے پاس ایک آلہ تھا جس سے وہ دنیا کے سب آنے والے واقعات کو دیکھ لیا کرتا تھا، لیکن اب نہ وہ سکندر رہے۔ نہ وہ آلہ۔ اب اس دورِ جدید میں حکیم ستتاف ایک ایسی چیز کو دیکھ رہی ہے جس کا نام ترکال درشی شیشہ ہے جس کی بدولت ساحر لوگ بے جان بُدوں کے پنجر میں روح پھونک کر اس سے بات چیت کر لیتے تھے۔ ہم نے اس عجیب و غریب نئے اصول جدت پر حیرت انگیز کل کا آلہ ایجاد کیا ہے جس کی مدد سے آپ ہر قسم کے طلسمی سوالات جواب بڑی آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں۔ مثلاً گم شدہ کا پتہ چلانا اس دنیا اور دوسری دنیا کے عجائبات دیکھنا۔ تقدیر روزگار اور حیات و ممات کے متعلق سوالات پوچھنا۔ کیا بیمار اچھا ہو جائے گا۔ اور میری آئندہ زندگی کیسے بسر ہوگی۔ مجھے کس قسم کی عورت ملے گی۔ دفینہ معلوم کرنا۔ پردیس گئے ہوئے کا پتہ لگانا۔ کیا تلاش روزگار کے لئے مجھے پردیس جانا پڑے گا۔ فلاں آدمی کیسا ہے۔ مجھے اس پر اعتبار کرنا چاہئے۔ میری تقدیر میں کیا لکھا ہے۔ مجھے مقدمہ میں کامیابی ہوگی۔ میرے خواب کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ میرا آج دن کیسے گذرے گا۔ وغیرہ وغیرہ اس قسم کے سینکڑوں سوالوں کے جواب اس طلسمی شیشے سے دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ نیز ماضی، حال و مستقبل کے حالات۔ کسی مشکل کے حل ہونے یا نہ ہونے کا انکشاف۔ ارزانی و قحط کے آثار قبل از شروع سال معلوم ہو سکتے ہیں۔ دروسول شہیدوں بلکہ تمام عزیزوں اور دوستوں کی روحوں سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ جو کہ مر چکے ہیں۔ بھوت پریت آسیب و جن بھی اگر گھر میں موجود ہوں تو وہ دفع کئے جا سکتے ہیں۔ افلاس و پریشانی دفع ہو کر مدبریں بھی ملیں گی۔ حُب و بغض و مشکل کاموں میں کامیابی ہو سکتی ہے۔

جس عورت یا مرد کو کبھی نہ دیکھا ہو وہ اس آئینہ میں جلوہ گر ہوگا۔ ہر شخص کے سربستہ راز و خفیہ اسرار پوچھو۔ بزرگان سلف سے باتیں کرلو۔

ہر قسم کے مرض کی تشخیص و نسخہ کشفائی ممکن ہوگا وغیرہ وغیرہ جو چاہو دریافت کرلو۔ اصلی ترکال درشی شیشہ سوائے ہمارے کارخانہ کے انڈیا بھر میں کسی اور جگہ سے آپ کو [illegible] ہوا عمر بھر کام دے گا۔

ترکال درشی آئینہ واقعی بڑے کام کی [illegible] اس شیشہ سے عورت مرد دونوں یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ باوجود ان تمام خوبیوں کے قیمت ترکال درشی آئینہ فی عدد [illegible] تین روپئے (تے ہے)

منیجر موہنی بھنڈار رجسٹرڈ۔ (N.G.A.) دہلی

میری دکھ بھری داستان

کسی ایک بیماری کا علاج جب ڈاکٹر لوگ نہیں کر سکتے تو اسکو لاعلاج قرار دیتے ہیں۔ مگر پرانے زمانے میں سنیاسی ننگ دھڑنگ جنگلوں میں رہنے والے مُردوں کو از سرِ نو زندہ کر دینے کی طاقت رکھتے تھے ٹوٹکے ٹھیک ایسے ہیں کہ ایک دفعہ تو مردہ بھی اُٹھایا جا سکتا ہے۔ گو زمانہ بدل چکا ہے لیکن پھر بھی ہندوستان کا نام روشن کرنے والے سنیاسی موجود ہیں۔ آپ میری کہانی سنئے۔ کم فہمی کی بدولت میری صحت کا نا ہوکر طرح طرح کی بیماریوں میں پھنسکر بےحد کمزور ہوگیا۔ جسم کھوکھلا۔ چہرہ زرد پڑ گیا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئیں۔ دل دھڑکتا۔ سر چکراتا وغیرہ سے تنگ آ کر مایوس ہوگیا۔ مشہور مشہور ڈاکٹروں اور تمام دوائیوں پر صحت کے لئے دھن برباد کر کے زندگی سے مایوس ہو بیٹھا۔ میری خوش قسمتی کہ مجھے سرینگر جانا پڑا۔ انہی دنوں میں وہاں ایک عرس تھا میں بھی وہاں چلا گیا۔ وہاں ہر سال ہزاروں فقیر زیارت کو آتے ہیں۔ ایک دن شام کو سیر کرتا ہوا ایک پہاڑی کے کنارے جا نکلا۔ سردی بڑھ گئی۔ میں نے وہاں اچانک جو دیکھا تو ایک درویش فقیر پہاڑی سے میری طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے چہرہ پر پورا جلال تھا۔ جب میرے نزدیک آ گئے تو مجھے سردی سے کانپتا دیکھ کر پوچھا "بیٹا کیا سردی زیادہ لگتی ہے" پہلے تو میں ڈرا۔ پھر حوصلہ کرکے دھیمی آواز میں کہا "جی ہاں" مجھ پر ترس کھا کر انھوں نے سبز رنگ کی ایک بوٹی کھانے کو دی۔ پیارے ناظرین! اس خدائے وحدہٗ لاشریک کو حاضر و ناظر جان کر سچ کہتا ہوں کہ ایک منٹ نہ گزرا تھا کہ میرا جسم آگ کی طرح گرم ہوگیا اس معجزہ کو دیکھ کر میں نے فقیر کے پاؤں پکڑ لیے اور میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ انھوں نے ہمدردی سے پوچھا۔ بیٹا! شام کے وقت جنگل میں اکیلا اور رونے کا سبب میں نے تمام دکھ بھری کہانی سچ سچ کہدی۔ اس فقیر نے مجھے حوصلہ دیا اور مجھ کو اپنے مقام رہائش پر جہاں وہ اُترے ہوئے تھے لیگئے اور کہا کہ اگر تم سچے دل سے عہد کرو کہ اسکے بعد لوگوں کی بھلائی کرو گے تب تمہارا بھلا ہو سکتا ہے میں نے ہاتھ جوڑ کے سچے دل سے اقرار کیا۔ اس پر سچے فقیر نے دو نسخے لکھ دیئے اور کہا کہ اب جاؤ بیٹا اور بے فکر رہنے۔ جیسے دکھیوں کا بھلا کرو۔ ناظرین! یقین کریں کہ مجھ کو اس فقیر کی اچانک ملاقات سے اس قدر حوصلہ ہوا کہ خود بخود میرے اندر جوش پیدا ہوگیا۔ میں نے واپس آ کر فقیر کے کہنے کے مطابق دونوں دوائیاں تیار کر کے استعمال کرنی شروع کر دیں جسطرح میرا یقین تھا۔ اسکی پہلی خوراک نے اپنا کرشمہ دکھانا شروع کر دیا۔ آپ یقین کریں کہ پانچ چھ دن کے بعد ہی میری کایا پلٹ ہوگئی۔ سب تکلیفیں دور ہو کر بجلی کی طرح طاقت اور جوش پیدا ہوگیا اور میں اپنے آپ کو قابل فخر محسوس کرنے لگا۔ بحکم مرشد پندرہ دن تک دوائی جاری رکھی۔ دودھ مکھن گھی خوب ہضم ہونے لگا۔ زیادہ لکھنا فضول ہے۔ گیارہ سال ہو چکے ہیں آج تک کسی دوا کی ضرورت نہیں پڑی۔ خدا کی مہربانی سے تین تندرست اور خوبصورت نور نظر میرے گھر میں ہیں۔ سینکڑوں کی مرادیں پوری ہو چکیں۔ سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکل سکتا ہے لیکن اس دوا کا اثر خالی جاتا نہیں دیکھا۔ اسی دن سے مرشد کے ہاتھ کے کئے ہوئے وعدے اور دنیا کی بھلائی کے لئے اس دوائی کا شہرہ گھر گھر کر رہا ہوں۔ اس لئے ہر قسم کی کمزوری۔ بیماری میں شکر آنا۔ کمزوری سے پیدا ہونے والے تمام امراض بجلی کی طرح دور ہو کر پکی اور سچی طاقت اور جوش پیدا ہوتا ہے۔ دوائی میں کسی قسم کی مضر صحت یا ضرر والی چیز نہیں ہے۔ ہر موسم میں کھانے کے لائق ہے۔ کیا جوان، کیا بوڑھے سب فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ تندرست بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ اس دوائی کے بعد عمر بھر کسی دوائی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ قیمت ہر دو ادویات برائے پندرہ یوم جو کہ صحت کے لئے کافی ہے صرف چار روپے آٹھ آنے (للعہ) چونکہ مجھ کو اس کایا پلٹ دوائی نے موت کے منہ سے بچایا ہے اس لئے اپنا ایمان سمجھ کر اسکی اشاعت کر رہا ہوں اور قیمت صرف خرچہ اور لاگت کے برابر رکھی گئی ہے۔

ضروری گذارش } تنگ مزاج اصحاب میری دوا نہ طلب کریں۔ جو شخص ہر چیز کو بے یقینی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ موقع پر ہیرے کو پتھر سمجھ کر کھو بیٹھتا ہے۔ جسکو اس دوا سے فائدہ نہ ہو وہ ایمان کو جان کر قیمت واپس منگوالے اور ساتھ ہی آپ کا ایمان بھی ہے اگر دوا تحریر سے بڑھ کر نکلے تو اس فقیر کے پیغام کی خبر گھر گھر پہنچا دیں۔

شرطیہ علاج اور وعدہ } ہندو کو دھرم کی اور مسلمان کو ایمان کی قسم ہے کہ اگر میری دوائی کے استعمال سے حسب وعدہ فائدہ نہ ہو تو حلفی تحریر بھیج کر قیمت واپس منگالیں۔ عدم صحت میں کسی کا پیسہ رکھنا گناہ سمجھتا ہوں۔

پتہ :- صوفی ایم۔ اے خان۔ پوسٹ بکس نمبر 261 N.G.A. لاہور



تمہارے طرزِ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تم نے یہ اعزاز محض اپنے بل پر حاصل کیا ہے۔ یاد نہیں کہ یہ میری ہی بچائی ہوئی رقم تھی جس کی بدولت تم نے یہ ہنر سیکھا۔ اِس میں شک نہیں کہ تم بہت ہونہار ثابت ہوئے، مگر . . . میں روپیہ جمع نہ کرتا تو آج تم کو اِتنا عُمدہ روزگار حاصل نہ ہوتا"

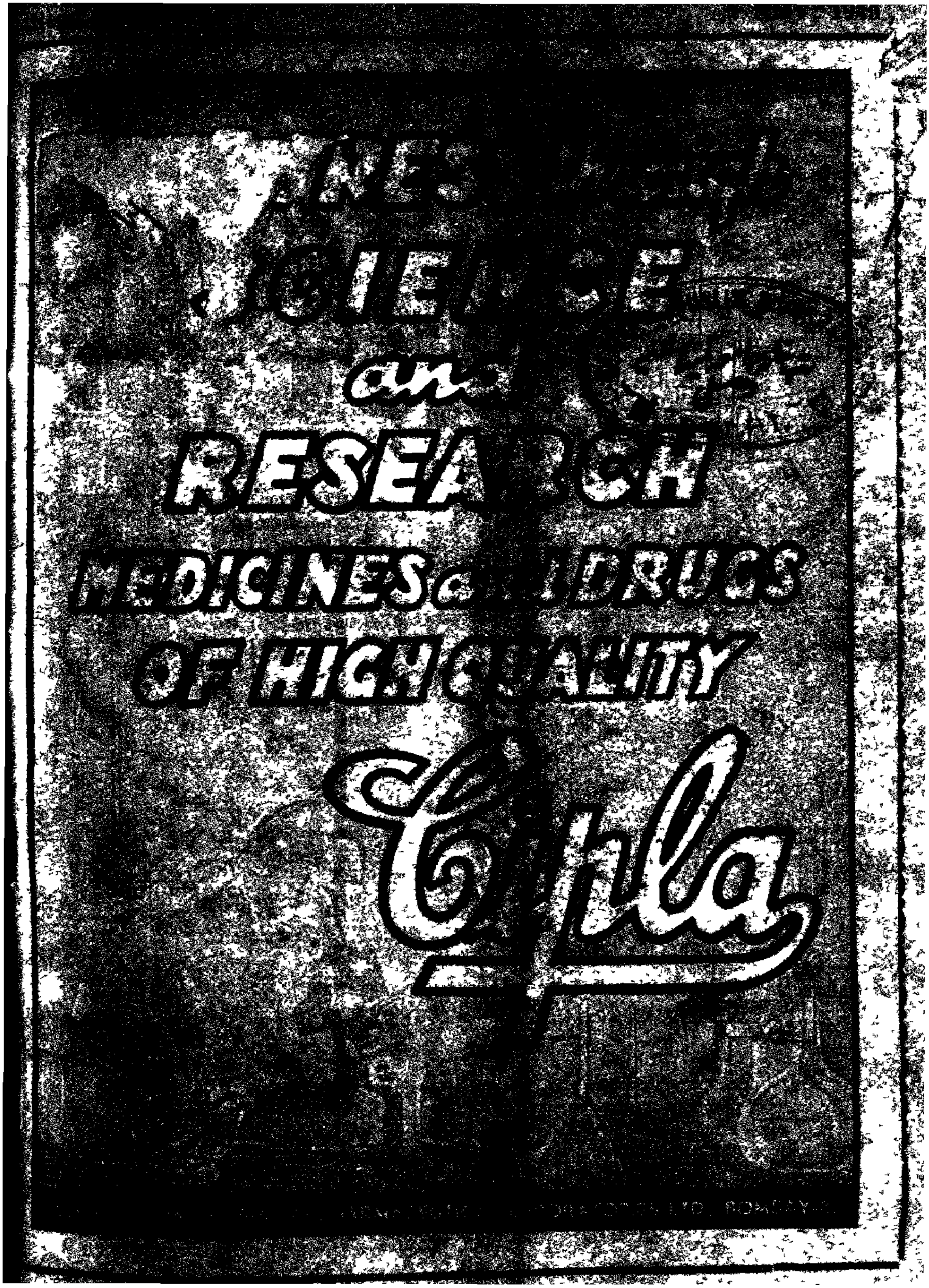
یہ اب سے بارہ برس بعد، ایک نازاں باپ اور شاداں لڑکے کے درمیان خیالی گفتگو سہی، مگر حقیقت سے دُور نہیں۔ ہمارا مُلک آئندہ بڑی تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرے گا اور نوجوانوں کے لئے نہایت عُمدہ مواقع پیدا ہوں گے۔ جس طرح ہندوستان کو ترقی کے لئے سرمایے کی ضرورت ہوگی، اِسی طرح نوجوانوں کو بھی تعلیم و تربیت کیلئے روپیہ درکار ہوگا۔ اِسے فراہم کرنے کے لئے آپ کو اس وقت کفایت اور جُزرسی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

کل کا فکر آج کیجئے
جتنا بچا سکیں بچا لیجئے

مگر اپنی رقم کسی ایسی مد میں لگائیے جہاں یہ محفوظ رہے اور وقتِ ضرورت آپ کو مل سکے۔
نیشنل سیونگز سرٹیفیکیٹس، سرکاری قرضے، ڈاکخانے کا سیونگز بینک کھاتہ، بیمہ پالیسی، انجمن امداد باہمی اور بینک کا بچت کھاتہ یہ سب میں محفوظ بھی ہیں اور فائدہ مند بھی۔ زمین۔ عمارات، خام یا صنعتی اشیا اور جواہرات خرید کر اپنی رقم کو خطرے میں نہ ڈالئے۔ یہ آجکل بڑے خسارے کا سودا ہے۔
مستقبل کے لئے بچائیے اور احتیاط سے لگائیے۔

گورنمنٹ آف انڈیا کے محکمۂ فائینس نے شائع کیا

AAA153


SCIENCE
RESEARCH
MEDICINES
DRUGS
OF HIGH QUALITY
Cipla

NAI ZINDAGI

ALLAHABAD

اردو زبان کا واحد مکمل سیاسی رسالہ

نئی زندگی

بانی ۔ ڈاکٹر سید محمود
سرپرست ۔ ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید
ایڈیٹر ۔ سید انیس الرحمٰن

جلد ۵	ماہ دسمبر ۱۹۴۵ء	نمبر ۹

فہرست مضامین

۱	نواسے برس (نظم)	جمیل مظہری	۳
۲	فکر و نظر	ایڈیٹر	۵
۳	کیا ہندوستان کی غربت کا سبب کثرت آبادی ہے؟	پروفیسر سوکمار رنجن داس	۹
۴	برطانوی ہند اور ریاستی ہند	راؤ بہادر سردار ام ۔ ڈی ۔ کیبے ۔ ام ۔ اے	۱۴
۵	امن عالم اور علاقائی جمعیتیں	برنس سکریٹری آف اسٹیٹ (امریکہ)	۱۷
۶	ہندوستان اور ہندیپی اتحاد	سیرل موڈک	۲۱
۷	برطانیہ پر ہندوستان کا قرضہ	ادارہ	۲۶
۸	سوویت روس کی عورتیں	حمیدہ نقوی	۲۹
۹	جنگی مجرمین اقوام عالم کے روبرو	گورشانن	۳۲
۱۰	آزاد ہند فوج کے نام (نظم)	مجیب خیرآبادی	۴۴
۱۱	کیا جمہوریت دھوکے کی ٹٹی ہے؟	روسی صحافت نگار	۴۵
۱۲	انتخابات کی [illegible]	ادارہ	۴۷
۱۳	ادبی تنقید	ہمایوں کبیر	۵۱
۱۴	[illegible] (افسانہ)	صدیقہ بیگم	۵۳

سالانہ چندہ پانچ روپے   ششماہی : تین روپے   فی پرچہ ۔ آٹھ آنے

پاکستان کیا ہے؟

آج ہر کس وناکس اس غور وفکر میں مبتلا ہے کہ پاکستان کیا ہے لیکن ہندوستان میں اس مسئلے پر جو کچھ بھی لٹریچر اب تک شائع ہوا ہے وہ اس معاملہ میں کسی قسم کی رہنمائی نہیں کرتا، اور اس معاملہ کے سمجھنے میں مدد نہیں دیتا۔ بلکہ اسکے برعکس اس معاملہ کو اور بھی زیادہ الجھا دیا ہے اور عوام الناس کے دماغ میں انتشار پیدا کر دیا ہے بہر حال اب جبکہ عام انتخابات کئے جا رہے ہیں، اور پبلک کو اسی مسئلہ پر ووٹ دینا ہے، اس امر کی ضرورت تھی کہ پاکستان سے متعلق تمام وکمال معلومات فراہم کی جائیں اور اس کے ہر پہلو پر۔ جذبات اور جانبداری سے قطع نظر ہو کر سنجیدہ اور عالمانہ طور پر بحث کی جائے۔ چنانچہ

مشہور سیاسی رسالہ نئی زندگی

کے ادارے نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کا جنوری (سنہ ۱۹۴۶ء) حسب معمول

سالانہ نمبر ہوگا

جو صرف مسئلہ پاکستان پر مشتمل ہوگا

چنانچہ اس معرکتہ الآرا نمبر میں ہندوستان کے چوٹی کے مصنفین، مفکرین، سیاسی رہنما اور جید علما حصہ لے رہے ہیں جو اس کے الگ الگ پہلوؤں پر نہایت سنجیدگی سے روشنی ڈالیں گے علاوہ ازیں ادارے کی طرف سے یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ اس نمبر میں وہ سب کچھ اکٹھا کر دیا جائے جو پاکستان کی لاہور والی تجویز (مارچ سنہ ۱۹۴۰ء) کے بعد گذشتہ سال کے اندر اس ملک میں ہوا یا کہا گیا غرضیکہ اس سلسلے کے

تمام بیانات، اعداد و شمار، نقشے، چارٹ اور تصاویر کا ایک بیش بہا خزانہ ہوگا

جو آپ کو یکجائی طور پر اردو یا انگریزی کسی زبان میں نہیں مل سکتا۔ مختصر یہ کہ یہ نمبر مسئلہ پاکستان پر آخری حرف، آخری لفظ اور آخری فقرہ ہوگا۔ جس کی مدد سے آپ سمجھ سکیں گے کہ پاکستان کیا ہے۔

خریداروں سے عرض ہے کہ کاغذ کی راشننگ کے سبب ہم اسی قدر کاپیاں چھاپیں گے جتنی کاپیوں کی مانگ ہوگی اور جب تک آپ عہ بھیجکر اپنی کاپی ریزرو نہ کرا لیں ہم سپلائی کی ذمہ داری نہیں لے سکتے۔ وی۔ پی نہیں بھیجا جائیگا۔

سالانہ خریداروں کو یہ نمبر مفت نذر کیا جائے گا۔ چھ ماہ کے خریداروں کو اس نمبر کی پوری قیمت ادا کرنی ہوگی۔

مشتہرین سے التماس ہے کہ اشتہارات کے صفحے نہایت محدود اور مقررہ ہونگے اسلئے اپنی جگہ فوراً ریزرو کرا لیں۔ چونکہ انتخابات کے سبب ہم یہ نمبر عظیم الشان تعداد میں چھاپ رہے ہیں اس لئے مشتہرین کو فائدہ بھی بے حد ہوگا۔ اس لحاظ سے نرخ فی صفحہ سو روپئے قلیل ہے۔ نرخ میں کمی کی گنجائش نہیں۔ اس لئے خط وکتابت میں وقت ضائع نہ فرمائیں۔

منیجر رسالہ نئی زندگی الہ آباد یو۔پی

حجم ۲۵۰ صفحات۔ قیمت سالنامہ عہ

سالانہ چندہ: پانچ روپئے

کہ جنوری سنہ ۱۹۴۶ء تک یہ عظیم الشان نمبر مارکیٹ میں آجائے گا

نوائے جرس

حضرت جمیل مظہری کی ایک نظم "نالۂ جرس" کے نام سے عرصہ ہوا مختلف رسائل میں چھپ چکی ہے، اور "آزادی کی نظمیں" میں بھی وہ نظم شائع ہوئی ہے، موجودہ نظم شاعر نے تقریباً اسی قافیۂ ردیف میں کہی ہے۔ لیکن معنوی حیثیت سے ان دونوں نظموں میں آسمان زمین کا فرق ہے ــــ وہ کاروانِ حریت کی صدائے جرس تھی اور یہ قافلۂ ارتقاء کی "نوائے جرس" ہے۔ ان دونوں نظموں کے مقابلے سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ شاعر گذشتہ پانچ سال میں خود بھی "ارتقاء" کی کافی منزلیں طے کر چکا ہے ~~~~~~ ایڈیٹر

جہاں کے سرد و گرم کے مزاجداں بڑھے چلو ہیں ابر و باد و برق تم سے سرگراں بڑھے چلو
بدل رہا ہے کائنات تیوریاں بڑھے چلو

کھلی ہے آنکھ عقل کی نہ نیند ہے نہ خواب ہے یہ دیکھو آفتاب ہے وہ دیکھو ماہتاب ہے
بلا رہی ہیں دور سے بلندیاں بڑھے چلو

بڑھائے جاؤ زندگی کی وسعتیں بڑھے چلو گرائے جاؤ ممکنات کی حدیں بڑھے چلو
بنائے جاؤ آسماں پہ آسماں بڑھے چلو

جلاؤ چاند کا دیا عمل کی بارگاہ میں بچھاؤ بادلوں کا فرش زندگی کی راہ میں
اڑاؤ دامنِ ہوا کی دھجیاں بڑھے چلو

یہ بحر کیا یہ لہر کیا یہ اوج کیا یہ فوج کیا تمھارے من کی موج میں سمندروں کی موج کیا
سمندروں سے چھین لو روانیاں بڑھے چلو

اٹھان ہو دباؤ میں وقار ہو جھکاؤ میں گھماؤ میں، چڑھاؤ میں، ندی کے اس بہاؤ میں
اٹھائے اپنی کشتیوں کا بادباں بڑھے چلو

حقیقتیں زمین کی ہیں گردِ آستین کی ابھر رہی ہیں نقشِ پا سے منزلیں یقین کی
اتر رہی ہیں طور سے تجلیاں بڑھے چلو

بہاریں راستے کی دیکھتے چلو، چلے چلو حقیر سا تبسم ان پہ پھینکتے ہوئے چلے چلو
یہ فطرتِ شریر کی ہیں شوخیاں بڑھے چلو

ہو ناز اپنے رنگ میں نیاز اپنی وضع پر   سبو چکور چاند سے [illegible]
تم ان لطیف مشغلوں میں نغمہ خواں بڑھے چلو

رواج اپنی قید میں دلوں کو گھیرتا سہی   خرد سمیٹتی سہی، جنوں بکھیرتا رہے
مگر تم اپنی دھن میں سب سے سرگراں بڑھے چلو

جلو میں عہد رفتہ کی جوانیاں لئے ہوئے   عروج کی زوال کی کہانیاں لئے ہوئے
حکایتوں روایتوں کے درمیاں بڑھے چلو

جھکے نہ سر بڑھے چلو، رکے نہ دل بڑھے چلو   کہ منزلیں ہیں منزلوں سے متصل بڑھے چلو
قدم قدم پہ ہو رہا ہے امتحاں بڑھے چلو

نشیب کیا فراز کیا، خلیج کیا، خیال کیا   اصولِ دین و دہر کیا قیودِ ماہ و سال کیا
یہ بیڑیاں ہیں بیڑیاں ہیں بیڑیاں، بڑھے چلو

ممانعت کی قید کیا، مخالفت کا زور کیا   یہ آندھیوں کی چیخ کیا یہ زلزلوں کا شور کیا
یہ دھمکیاں ہیں دھمکیاں ہیں دھمکیاں، بڑھے چلو

یہ حکمتیں یہ قدرتیں، نظر کی میہماں ہیں   تجلیاں فریب ہیں ترقیاں گماں ہیں
ابھی دیارِ وہم میں ہے کارواں بڑھے چلو

بھرا ہوا ہے آنکھ میں ابھی غبار راہ کا   ابھی حدودِ رنگ میں ہے، قافلہ نگاہ کا
ابھی حجاب حسن کا ہے درمیاں بڑھے چلو

ابھی تو لذتوں میں گم ہیں قوتیں شعور کی   ابھی تو عقل ہے کنیز شوقِ ناصبور کی
ابھی تو عشق ہے خودی پہ حکمراں بڑھے چلو

ابھی حیات مانگتی ہے، بھیک آفتاب سے   ابھی تو خاک لے رہی ہے زندگی سحاب سے
ابھی تو یہ زمیں ہے زیرِ آسماں بڑھے چلو

نہ اقتدار ابر پر نہ اختیار باد پر   نہ رحم ہے نبات پر، نہ لطف ہے جماد پر
ابھی الوہیت کی منزلیں کہاں بڑھے چلو

بلند تر ہو قدسیت کے پایۂ جلیل سے   نگاہِ جبرئیل سے، تصورِ جمیل سے
پرے ہے عرش سے تمہارا آشیاں بڑھے چلو

جمیل مظہری

فکر و نظر

پروفیسر لاسکی، اور ہندوستان

پروفیسر ہیرالڈ لاسکی، برطانیہ کے اُن سوشلسٹ لیڈروں میں ہیں، جو ہمیشہ سوشلزم کے اصول کے لئے لڑے، اور اپنی لیبر پارٹی سے نہ صرف زبانی، بلکہ عملاً بھی سوشلزم کے اصول منوائے۔ علاوہ ازیں پروفیسر لاسکی، اُن مدبرین برطانیہ میں ہیں جنھوں نے ہمیشہ ہندوستان سے ہمدردی کی ہے، اور اس ملک کی آزادی کی حمایت کی ہے چنانچہ آپ نہ صرف برطانیہ کی لیبر پارٹی کے صدر ہیں، بلکہ لیبر پارٹی کے اس گروہ کے بھی رکن اعلیٰ ہیں، جو ہندوستان کی آزادی کا حامی ہے اور اسکے لئے برابر جدو جہد کرتا رہتا ہے۔

حال میں پنڈت جواہرلال نہرو کی ۵۶ ویں سالگرہ منانے کے لئے لندن میں ایک جلسہ ہوا جسکی صدارت پروفیسر لاسکی نے کی۔ آپ نے پنڈت نہرو کو ہندوستان کی جدو جہد آزادی کا نشان بتلایا، اور یہ کہا کہ میں ان کی دوستی پر فخر کرتا ہوں۔ پروفیسر لاسکی نے کہا کہ پنڈت جواہرلال ہندوستان کے تمام لیڈروں سے اس معاملے میں آگے ہیں کہ وہ سیاست اور معاشیات دونوں کو سمجھتے ہیں، اور ہندوستان کی آزادی کو وہ دراصل عوام الناس کی بھوک اور غربت کا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ غرضیکہ پروفیسر لاسکی نے، جو لیبر پارٹی کے صدر ہونے کی حیثیت سے، سب سے بڑے انگریز ہیں، پنڈت جواہرلال کی بے حد تعریف کی، اور یہ بھی کہا کہ پنڈت نہرو ہندوستان کے آنے والے لمحوں میں بہت بڑا رول ادا کرینگے اور انکی گرفتاری کی جو خبر گشت کر رہی ہے، وہ محض بے بنیاد ہے، اور حکومت ہند ایسی حماقت نہیں کر سکتی۔

لیکن پروفیسر لاسکی کی تقریر کا وہ حصہ سب سے اہم تھا جس میں آپ نے ہندوستان کو آزادی دینے کے متعلق برطانوی پالیسی کی مذمت کی۔ مگر تقریر کے اس حصے میں آنے سے پہلے پروفیسر لاسکی نے چند الفاظ میں اپنی صفائی پیش کی اور حفظ ماتقدم کے طور پر بہت سی باتیں کہیں جسکا مطلب یہ تھا کہ وہ صرف ایک برطانوی شہری کی حیثیت سے بول رہے ہیں، اور ان کے اس بیان کی نہ لیبر گورنمنٹ ذمہ دار ہے نہ لیبر پارٹی۔ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ اپنی شخصی حیثیت سے کہہ رہے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال ان کے الفاظ سنئے:-

> آخر کب ہم اس اہم ذمہ داری کا احساس کریں گے، جو ہندوستان کے معاملے میں ہم پر عائد ہوتی ہے؟ ہم نے ہم نے ہندوستان کو نہایت نیم دلی سے آزادی کی پیشکش کی ہے، اور بزدلی اور ہچکچاہٹ کے ساتھ اس کے سامنے چھوٹی آزادی پیش کی ہے۔ کرپس کی پیشکش جیسی چیزیں مسئلے کو حل نہیں کر سکتیں، تاوقتیکہ ہم سچے جذبے کے ساتھ ہندوستان کو وہ آزادی دیں جسکا وہ مستحق ہے۔ خواہ مسٹر چرچل کی مشترکہ وزارت ہو، خواہ لیبر پارٹی کی حکومت ہو، میں ہندوستان کے معاملے میں سچے جذبے کی کمی پاتا ہوں، اور یہ محسوس کرتا ہوں کہ حکومت ہندوستانیوں کو آزادی کے دروازے تک پہونچانے میں خلوص و دیانت کے ساتھ مدد دینا نہیں چاہتی!!

پروفیسر لاسکی نے بہت صحیح فرمایا، اور یہی ہندوستان کے لیڈر زمانے سے چیخ رہے ہیں کہ حکومت برطانیہ میں صحیح جذبے کی کمی ہے، اور وہ خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ کوئی پیشکش نہیں کرتی۔ چنانچہ انکی تمام پیشکشوں کا حشر یہی ہوتا ہے کہ وہ ٹھکرا دی جاتی ہیں۔ لیکن برطانیہ کے پروپگنڈا کی مشینری ساری دنیا میں اس بات کا ڈھنڈورا پیٹتی ہے کہ ہندوستان کو ہم سب کچھ دے رہے تھے۔ لیکن ہندوستان نے ٹھکرا دیا

اگر پروفیسر لاسکی کے بیان کے مطابق، برطانیہ کی تمام پیشکشوں کے پیچھے خلوص اور صحیح جذبے کی کمی تھی، تو پھر اگر ہندوستان نے ان پیشکشوں کو ٹھکرا دیا تو کیا برا کیا۔

پروفیسر لاسکی، اپنی تقریر کے خاتمے پر پورے خطیبانہ رنگ میں چمکنے لگے اور انھوں نے کہا۔

ہندوستان کی آزادی ناگزیر ہے، اور وہ آتی ہے اور اس سے ہم کترا نہیں سکتے۔ ہمیں جو کچھ سوچنا ہے وہ اتنا ہی ہے کہ یہ آزادی شایان شان طریقے سے برطانیہ کے ذریعہ ملیگی یا برطانیہ کی دشمنی کی بنا پر ہندوستان کو حاصل ہوگی۔ ہمیں اس بات کا جائزہ لینا ہوگا کہ کیا برطانیہ کی لیبر پارٹی یا لیبر گورنمنٹ اس قابل ہے اور اتنی اہلیت رکھتی ہے کہ وہ دنیائے انسانیت کی اس عظیم الشان آبادی کو ہلاکت سے نجات دلانے میں معاون ثابت ہو، اور ایک بیش قیمت کلچر کو اسکی جائز بلندیوں تک پہنچنے میں مدد دے؟ وہ لیبر پارٹی جو انسانیت کے اتنے بڑے جم غفیر کو آزادی حاصل کرنے میں کوئی مدد نہیں پہنچا سکتی، وہ یقینی برطانی عوام کی بھی کوئی خدمت نہیں کر سکتی۔

لیکن عنان حکومت سنبھالنے کے بعد لیبر حکومت ابتک جو کچھ بھی کرتی رہی ہے، اور ہندوستان کی طرف سے اسکی غفلت کی جو پالیسی رہی ہے اسے سامنے رکھتے ہوئے کیا یہ تبلانے کی ضرورت ہے کہ انگلستان کی مزدور حکومت بھی سرمایہ دار حکومت کی طرح، ہندوستان کا مسئلہ حل کرنے میں نا اہل ہے؟

فلسطین کے یہودیوں کا مسئلہ

ہندوستان کے ایک موقر انگریزی روزنامہ "ٹریبون" لاہور کا لندن کا نامئدہ لکھتا ہے:—

"برطانیہ کے وزیر خارجہ کے حال کے بیان پر، جو اس سلسلے میں دیا گیا ہے، لندن میں مسئلہ فلسطین سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے اور یہ سوال زوروں پر لوگوں کے سامنے آگیا ہے کہ کیا واقعی یہودیوں کو فلسطین میں بسانا مناسب ہوگا یا نہیں۔

ساری عرب دنیا، جسکی آبادی ساڑھے چار کروڑ سے کچھ زیادہ ہے۔ یعنی سعودی عرب، شام، لبنان، مصر، فلسطین، عراق، اُردن اور مراکش، ۲۵ لاکھ یہودی مہاجرین کے خلاف صف آرا ہو گئے ہیں۔ علاوہ اسکے پریس کی رپورٹوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان عربوں کے اس مطالبے کی پشت پر ہیں۔ اسی طرح انڈونیشیا والوں کی جو انجمن لندن میں ہے، وہ بھی یہ کہتی ہے کہ انڈونیشیا کے دو کروڑ مسلمان عربوں کے مطالبے کو حق بجانب قرار دیتے ہیں اور انکے حامی ہیں۔ یہودیوں کی لندن کی انجمن کے سکریٹری نے اپنے بیان میں کہا۔ "یہودی بہت زیادہ اس امر کے متوقع ہیں اور انھیں کامل اعتماد ہے کہ صدر ٹرومین انکی مدد کریں گے۔ صدر ٹرومین نے اس بات پر اصرار کیا ہے کہ یورپ کے ایک لاکھ یہودی مہاجرین کو بہر طور فلسطین میں جگہ دینی ہی چاہیئے۔"

آگے چلکر یہودیوں کی سب سے بڑی انجمن کے سکریٹری نے جس کی شاخیں ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں کہا کہ ہماری انجمن کا واحد مقصد یہ ہے کہ ہم فلسطین کو ایک یہودی اسٹیٹ بنا دیں۔

لیکن اسکے برخلاف عرب ممالک کے نمائندوں کے دعاوی بھی کچھ کم نہیں۔ لبنان کا ایک وزیر، جو آجکل لندن میں ہے عالمگیر تعلیمی کانفرنس میں شرکت کر رہا ہے کہتا تھا کہ یہ چیز سرے سے غور کرنے کے قابل ہی نہیں کہ فلسطین کسی وقت بھی ایک یہودی اسٹیٹ بن سکتا ہے۔ فلسطین گذشتہ پندرہ صدیوں سے عرب اسٹیٹ ہے، اور عرب اسٹیٹ رہیگا، نہ وہ یہودی اسٹیٹ بن سکتا ہے اور نہ اسکا بٹوارہ ہو سکتا ہے، ہم کسی طرح فلسطین کی تقسیم کو گوارا نہ کریں گے۔ اسی طرح ابن سعود کے ایک وزیر نے کہا کہ فلسطین ہمیشہ سے ایک عرب ملک ہے، اور یہ عرب ممالک کا بالکل اسی طرح ایک جزو ہے جس طرح ملک ... انگلستان کا جزو ہے ہم کسی طرح اسے ... نہ ہونے دیں گے

چلا بڑا دلچسپ ہے، اور عربوں کے بیچ جذبۂ وطنیت کی ترجمانی کرتا ہے۔ عربوں کے لئے مذہب کا کوئی سوال نہیں، عرب خواہ مسلمان ہو، عیسائی ہو۔ وہ بہرحال عرب ہے اور اسکی تمام ہمدردیاں عربوں کیساتھ ہیں، چنانچہ لبنان کا وزیر مسٹر چامون (MR. CHAMOUN) نصرانی عرب ہے، جسکے خیالات ہم نے اوپر نقل کئے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ فلسطین کے مطالبۂ تقسیم کے متعلق مسلم لیگ کا کیا خیال ہے، لیکن اگر کسی وقت مسلم لیگ فلسطین کی تقسیم کے خلاف آواز اٹھائے گی تو ہم اس سے پوچھیں گے۔

آنیوالی اقتصادی مصیبت

جیوں ہی حکومت ہند کا جنگی بجٹ ختم ہوگا اور باہر سے مال آجانے کے بعد ہندوستان کی دیسی اشیاء کی مانگ کم ہوگی، اس ملک میں ایک بے پناہ اقتصادی کساد بازاری کا دار دورہ ہو جائیگا۔ جس کے جلو میں بیروزگاری آئے گی اور عوام الناس کی قوت خرید اور معیار زندگی بہت نیچے جائیگا۔

۱۹۳۹ء سے لیکر ۱۹۴۵ء تک یعنی چھ سال کے عرصے میں حکومت ہند نے ایک کثیر رقم ہندوستان کے خزانے کی خرچ کردی ہے۔ ۳۹۱۰ کرور روپئے یعنی تقریباً چار کھرب روپئے، جس میں سے صرف جنگی مصارف پر ۲۶۴۳ کرور روپئے صرف کئے گئے ہیں، (جسے ہندوستان کی مدافعت کا نام دیا جاتا ہے) اور دوسرے مصارف پر ۱۲۹۳ کرور۔ ظاہر ہے کہ اب آگے حکومت ہند اتنی کثیر رقم نہ صرف کرسکے گی، جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک سے آہستہ آہستہ پیسہ غائب ہونا شروع ہوگا۔ غلے پر سے دام گرنگا اور پھر کی دوسری اشیاء کی قیمتیں گریں گی، اور ہندوستان کی تمام اشیاء کی قیمت کوڑیوں کے مول ہوجائے گی۔ غرضیکہ اس طرح صناعوں کی کمائیاں کم ہونگی، اور مزدوروں کی مزدوریاں گریں گی۔ ملٹری کے لئے جو چیزوں کی بیحد مانگ ہے وہ جاتی رہے گی اور شاذ ہی ہندوستان کی پبلک کی اتنی مانگ ہو، جو ملٹری کی مانگوں کی جگہ لے سکے۔

۱۹۴۴ء میں جبکہ جنگ پورے شباب پر تھی، فیکٹریوں میں تقریباً چوبیس لاکھ مزدور کام کرتے تھے۔ اسی طرح ہندوستانی فوج کی تعداد پچیس لاکھ کے قریب تھی۔ علاوہ اس کے چھوٹے موٹے پیشہ ور جنگی تعداد ڈیڑھ کروڑ سے کم نہیں ہوسکتی، جنگ کے سبب اپنے پیشوں میں پوری قوت سے کام کر رہے تھے۔ اب حکومت کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اکتوبر سے لیکر مئی ۱۹۴۶ء تک ساڑھے آٹھ لاکھ فوجی اپنی ملازمتوں سے سبکدوش کئے جائیں گے۔ فیکٹریوں سے آدمی نکالے جارہے ہیں، اور فوجی ٹھیکے بند ہونے کے سبب چھوٹے پیشہ وروں کا کام بھی ختم ہو رہا ہے۔

غرضیکہ رفتہ رفتہ ملک ایک نہایت خطرناک حالت کی طرف قدم بڑھاتا جا رہا ہے، جس کی فکر نہ مرکزی حکومت کو ہے نہ صوبائی حکومتوں کو۔

ادبستان لاہور کی تازہ ترین کتابیں

خطبات ابوالکلام آزاد

علم و ادب کی دنیا میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام صف اول میں شمار کیا جاتا ہے آپ کا [illegible] انگیز اور انقلابی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کے خطبات میں اردو ادب، سیاست اور مذہب [illegible] آپ کے تمام خطبے آج تک متفرق پڑے تھے اور علمی دنیا ان خطبات کے حصول کے لئے پریشان تھی۔ چنانچہ اس کتاب میں مولانا کے تمام خطبے جمع کر دئے گئے ہیں۔ مشرق بھر میں ایسا خطیب پیدا نہیں ہوا۔ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کیجئے۔ قیمت مجلد مع گرد پوش تین روپے آٹھ آنے۔

مقالات الہلال

سنہ ۱۹۱۱ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ہفتہ وار الہلال جاری کیا تھا۔ الہلال جاری ہوتے ہی ہندوستان کی نظریں اس کی انقلاب انگیز دعوت کی جانب اٹھ کھڑی ہوئیں۔ الہلال کی دعوت نے ہر ہندوستانی کو انقلابی بنا دیا۔ مذہبی نقطۂ نظر سے بھی الہلال کا کوئی ثانی نہ تھا۔ الہلال نے سیاسیات میں بھی نئی راہیں پیدا کیں۔ اردو ادب کو الہلال کی بدولت چار چاند لگے۔ یہ کتاب اسی الہلال کے منتخب مضامین کا مجموعہ ہے۔ قیمت مجلد دو روپے۔ اعلیٰ جلد والی تین روپئے بارہ آنے

مضامین الہلال

یہ کتاب بھی سلسلۂ الہلال کی دوسری جلد ہے قیمت دو روپئے۔ اعلیٰ ایڈیشن تین روپئے ۱۲ آنے

مضامین ابوالکلام آزاد

اس کتاب میں مولانا کے متفرق مضامین جمع کر دئے گئے ہیں قیمت دو روپئے چار آنے

مولانا کی دیگر کتابیں

قول فیصل ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ تصریحات آزاد دو روپے۔ انسانیت موت کے دروازے پر دو روپے
مسلمان عورت دو روپئے چار آنے۔ مضامین البلاغ تین روپئے۔

ایک ادبی ڈائری

اس کا مصنف اختر انصاری ہے اردو کی دنیائے ادب اختر انصاری کو ایک شاعر، افسانہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے خوب جانتی ہے۔ اختر انصاری کے اس ادبی تصویر خانے میں ہماری نظر لاتعداد مصنفوں، بے شمار فنی کارناموں اور ان گنت ادبی مسائل و تحریکات سے دوچار ہوتی ہے۔ [illegible] اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہے۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے

روحِ عصر اختر انصاری کی تازہ ترین و غیر مطبوعہ نظموں، غزلوں، گیتوں اور قطعات کا نایاب مجموعہ ہے۔ قیمت [illegible]

دیگر قابل مطالعہ کتابیں

مضامین جمال الدین افغانی دو روپیہ آٹھ آنے۔ [illegible] علامہ اقبال بزبان انگریزی [illegible]
بزبان انگریزی دس روپئے۔

منگوانے کا پتہ :- ادبستان بیرون [illegible]

کیا ہندوستان کی غربت کا سبب کثرت آبادی ہے؟

از: ——— پروفیسر سوکمار رنجن داس۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

دارالعوام میں مسٹر ایمری سابق وزیر ہند نے ایک بار تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں غذا کی کمی اور بنگال کے ہولناک قحط کا ایک اہم اور مخصوص سبب یہ تھا کہ ہندوستان کی آبادی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ یہی آواز مختلف حلقوں سے اور کئی برطانوی مدبرین نے بلند کی ہے، یہاں تک کہ پروفیسر ہل جیسے عالم اور سائنسداں بھی خود کو اس غلط خیالی سے محفوظ نہ رکھ سکے۔ مسٹر ایمری کے بیان پر غور کیا جائے تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ہندوستان میں گویا اب مستقل طور پر غذائی قلت کی شکایت رہے گی اور اگر غیر ممالک سے برابر غلہ کی درآمد کا انتظام نہ کیا گیا تو ہندوستان کے لوگ بھوکوں مرتے رہیں گے دراصل ہندوستان میں برطانوی انتظام حکومت کے ناکارہ ہونے کا اعتراف اس سے زیادہ صاف لفظوں میں نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوستان میں غذا کی سپلائی اور آبادی کو پورے مسئلے پر اگر غور کیا جا سکتا ہے تو صرف دو نکتۂ نظر سے ایک تو یہ کہ ملک کے موجودہ معاشی اور سیاسی حالات کیا ہیں؟ دوسرے ایک بہتر اور زیادہ ہمدرد اور کارآمد انتظام حکومت کے قیام کے بعد ملک کے معاشی وسائل و ذرائع کو کس طرح کام میں لایا جا سکتا ہے؟ انھیں دو طریقوں پر عمل درآمد کرکے ہم آبادی اور غذائی قلت کے مسائل کو حل کر سکتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ جب کبھی بھی ہندوستان کی موجودہ غربت اور مفلسی کا سوال اٹھایا گیا ہے تو برطانیہ کے سرکاری حلقوں نے زیادتی آبادی کو اصل سبب قرار دے کر اپنی ذمہ داریوں سے بچنے کی کوشش کی ہے اس کے برخلاف ہندوستان کے مدبرین ردّعمل کے طور پر ایک بالکل [illegible] نظریہ اختیار کر لیتے ہیں اور غم و غصے میں برطانیہ کے سرکاری حلقوں کی دلیل کو غلط ثابت کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتے۔

(صفحہ ۶۸-۶۹) میں زائد آبادی کی جو تعریف پیش کی ہے اس کی روشنی میں دیکھا جائے تو "زائد آبادی" کی اصطلاح دراصل ایک مختصر (RELATIVE) اصطلاح ہے اس کا کوئی جامد مفہوم نہیں ہے۔ زائد آبادی کا احساس مختلف اسباب و علل کی بنا پر ہوتا ہے جو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ آبادی سے متعلق مختلف ملکوں کے اعداد و شمار پر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ آبادی کی زیادتی یا کمی کسی ملک کے مفلس یا دولت مند ہونے کا اصلی سبب نہیں ہے۔ ہندوستان میں ۱۹۵ فی مربع میل آبادی ہے جو انگلستان یا جرمنی کے مقابلہ میں بہت کم ہے جہاں ۶۸۵ فی مربع میل آبادی ہے۔ چنانچہ آبادی کے اعداد و شمار سے کسی ملک کی دولت یا مفلسی کا اندازہ لگانا غلط ہے۔

اگر گذشتہ پچاس سال کے اعداد و شمار پر غور کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ہندوستان میں آبادی کے بڑھنے کی دس سالہ رفتار بہت کم رہی ہے۔ اس کے اسباب و علل پر اعداد و شمار کی روشنی میں غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ اگرچہ ہندوستان میں پیدائش کی رفتار تیز رہی ہے لیکن اس کے ساتھ اموات کی رفتار بھی کم تیز نہیں رہی ہے ہندوستان میں پیدائش کے بعد زندہ رہ جانے کی رفتار یورپ کے مقابلے میں بہت کم رہی ہے۔ سنہ ۱۸۷۱ء اور سنہ ۱۹۳۱ء کے درمیانی عرصے میں ہندوستان کی آبادی میں دو سو ترپن ہزار نواسی ملین سے لیکر تین ہزار پانچسو اٹھائیس ملین تک ہوئی ہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء سے سنہ ۱۹۳۱ء تک آبادی میں فی صد اضافہ کی رفتار ۱۰۶ رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آبادی کے فاضل اور زائد ہونے کی ایک شناخت یہ ہے کہ پیدائش زیادہ ہو اور اس کے ساتھ اموات بھی زیادہ ہوں، خاص کر بچوں کی موت۔ اموات کے زیادہ ہونے کا

(۱) [illegible] کی تصنیف "دولت" (WEALTH)

جب اس میں کوئی شک نہیں کہ مفلسی اور امراض کی کثرت ہے لیکن اس کے علاوہ اور بھی اسباب ہیں۔ بہت حد تک ہندوستان کے رسوم و رواج پر بھی اسکی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور ان کا دفعیہ گاؤں سدھار ہی کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔ گاؤں سدھار کا مطلب ہے کہ دیہاتوں میں تعلیم کو فروغ دیا جائے اور صفائی کا انتظام کیا جائے۔

مغربی ممالک میں آبادی میں اضافہ کی جو صورت ہے اس کا موازنہ بعض باتوں کی بنا پر ہندوستان کے اضافہ آبادی سے نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں سے ایک خاص بات یہ ہے کہ ہندوستان میں شادیاں بہت کثرت سے ہوتی ہیں، مغربی ملکوں میں شادیاں اتنی کثرت سے نہیں ہوتیں ہندوستان میں شادی کرنا تو ایک مذہبی فرض سمجھا جاتا ہے۔ ایک طرف تو یہ حال ہے دوسری طرف یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں بچوں کی پیدائش کثرت سے نہیں ہوتی اسکی وجہ یہ ہے کہ اوپر کے دولت مند طبقوں میں قوت پیدائش عام طور سے کم پائی جاتی ہے اور مزدور طبقے میں یہ حال ہے کہ شوہر تلاش روزگار اور ملازمت کے سلسلے میں بیوی سے عرصہ دراز تک علیحدہ رہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ چنانچہ یورپ میں پیدائش کو روکنے کے لئے جو سائنٹفک طریقے رائج ہیں اور جنھیں شوہر و بیوی انفرادی طور پر زیر استعمال رکھتے ہیں اُن کی ہندوستان کے لوگوں کو کوئی ضرورت نہیں ہندوستان میں کچھ اس قسم کے رسوم و رواج ہی نافذ ہیں کہ اُن سے پیدائش میں زیادتی نہیں ہوتی۔ اس لئے ہندوستان میں آبادی کے بہت زیادہ بڑھ جانے کا کوئی خدشہ نہیں۔

آج کل زراعت اور صنعت دونوں میں مزدوروں اور کام کرنے والوں کی کمی کی عام شکایت پائی جاتی ہے۔ یہاں پر اُن لوگوں کا استدلال غلط ثابت ہوتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں کثرت آبادی کے سبب مفلسی کا دار دورہ ہے۔ یہ حضرات یہ نہیں جانتے کہ کثرت آبادی کا مطلب یہ ہے کہ ملک کی صنعتی اور زراعتی قوت پیداوار زیادہ ہوتی ہے اور اس سے ملک کی مجموعی دولت میں اضافہ ہوتا ہے اس لئے کہ جتنے ہی زیادہ کام کرنے والے ہوں گے اتنا ہی دولت میں بھی اضافہ ہوگا ہندوستان کے صنعتی ذرائع اور وسائل کو ابھی بہت کم کام میں لایا گیا ہے۔ بعد از جنگ کی تعمیری اسکیموں میں چھوٹے اور بڑے پیمانے کی صنعتوں کو ترقی دینے کا جو پروگرام ہے اُسے خاص اہمیت حاصل ہے اور وہ جب زیر عمل آجائے گا تو ملک بھر میں کام کرنے والوں اور مزدوروں کی مانگ بہت بڑھ جائے گی۔

اوپر جو خیالات پیش کئے گئے ہیں اُن کی بنا پر ممکن ہے یہ خیال پیدا ہو کہ ہندوستان کی تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی آبادی کوئی خطرے کی بات نہیں ہے اور اس سے ہندوستان کو نقصان کے بجائے فائدہ ہوگا۔ قدرت کے پاس خود آبادی کے بڑھنے یا گھٹنے کا ایک قانون موجود ہے جو انسانی تحفظ کے لئے کافی ہے کسی مزید قانون کی پابندی ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ سب سے اہم کام یہ ہے کہ ملک کے تعلیمی اور معاشی حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے۔ یہ نظریہ اُس سرکاری نظریے کا بالکل مخالف ہے جو اس وقت رائج ہے۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس کا اچھی طرح تجزیہ اور غور و فکر کرنے کے بعد فیصلہ اور رائے قائم کریں۔ اس پورے مسئلے کو اس وقت ہندوستان کے موجودہ اور آئندہ وسائل اور ذرائع کی روشنی میں سلجھانے کی ضرورت ہے۔

جب کسی ملک کی آبادی اس طرح بڑھنے لگتی ہے کہ اس سے فی کس آمدنی میں کمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ملک میں کثرت آبادی یا زائد آبادی کا رجحان موجود ہے اور اگر کسی ملک میں لوگوں کو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اگر موجودہ آبادی میں کمی واقع ہوجائے تو اس سے فی کس آمدنی میں اضافہ ہوجائے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ملک میں کثرت آبادی یا زائد آبادی پہلے سے موجود ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ دونوں باتیں کسی طرح ہندوستان پر صحیح اور پوری اترتی ہیں؟ قومی آمدنی سے متعلق جو اعداد و شمار موجود ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ آج کل ہندوستان میں فی کس آمدنی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہاں پر یہ سرکاری نظریہ بالکل غلط ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان میں کثرت آبادی کی وجہ سے مفلسی ہے۔ اسلئے کہ خود اعداد و شمار اس نظریے کو غلط ثابت کر رہے ہیں اور اگر سرکاری نظریہ کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس سے موجودہ حکومت کی بدنامی میں قطعی کوئی کمی نہیں ہوتی جس نے ڈیڑھ سو سال سے ہندوستان کا انتظام سنبھال رکھا ہے۔ حکومت نے ہندوستان کی [illegible] کے لئے صحیح وقت پر کوشش نہیں کی گویا حکومت نے اس مفلسی اور [illegible]

خوشحال کرنے کی طرف قدم نہیں بڑھایا جس کا نتیجہ رونا رو رہی ہے ظاہر ہے کہ ان الزام سے حکومت سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ اسلئے کہ اب ہر شخص کے سامنے یہ حقیقت واضح ہو کر آ گئی ہے کہ صنعتی ترقی کے ذریعہ مفلسی اور افلاس کا قلع قمع کیا جا سکتا ہے اور حکومت نے صنعتی ترقی ہی کی طرف قدم اٹھانے سے انکار کیا۔

کثرت آبادی کے مسئلے سے متعلق سب سے اہم سوال غذا کی فراہمی کا ہے۔ حکومت نے ہمیشہ یہ شکایت کی ہے کہ آبادی کے لحاظ سے غذائی پیداوار ہندوستان میں بہت کم ہے۔ بنگال کے قحط اور ہندوستان میں غذائی کمی کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ہندوستان میں آبادی بہت بڑھ گئی ہے۔ لیکن اعداد و شمار ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ قحط بنگال کے بہت سے دوسرے اسباب تھے۔ سنہ ۲۱-۱۹۲۰ء سے سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء تک ہندوستان کی مجموعی آبادی میں لگ بھگ دس فیصدی کا اضافہ ہوا ہے اس کے مقابلے میں زراعتی پیداوار میں ۱۶ فی صدی کا اضافہ ہے اور صنعتی پیداوار میں ۱۰ فی صدی کا۔ سنہ ۱۹۰۰ء سے لے کر سنہ ۱۹۳۱ء تک کے درمیانی عرصے میں ہندوستان کی آبادی میں انیس فیصدی کا اضافہ ہوا ہے۔ زراعتی پیداوار میں انتیس فی صدی کا اضافہ ہوا ہے صنعتی پیداوار میں ۱۸۹ فی صدی کا۔ ان اعداد و شمار سے ڈاکٹر پی جے۔ ٹامس نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہندوستان میں آبادی کا اتنا اضافہ نہیں ہوا ہے کہ زرعی اور صنعتی پیداوار سے بھی آگے بڑھ جائے اور ہندوستان کی غربت اور مفلسی آبادی میں اضافہ کے سبب نہیں ہے اب ہر شخص کو اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ ہندوستان میں غذا کی جو اتنی شدید قلت تھی تو اس کا سبب انفرادی ذخیرہ اندوزی تھی یا حکومت کی ذخیرہ اندوزی، اس کی سب سے بڑی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے جس نے غلہ جمع کر کے اسے برباد ہو جانے دیا لیکن عوام تک اسے پہنچنے نہیں دیا۔

ڈاکٹر رادھا کمل مکرجی نے اپنی لاجواب تصنیف "چالیس کروڑ کے لئے غذا کی فراہمی" میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ہندوستان میں اگر غذائی کمی ہے تو صرف بارہ فی صدی۔ ڈاکٹر رادھا کمل مکرجی نے یہ رائے بہت صحیح سمجھ کر اور غیر جانب دار ذرائع سے حاصل کئے ہوئے اعداد و شمار پر قائم کی ہے لیکن اس میں تبدیلی کی کافی گنجائش ہے اس لئے کہ اول تو ملک میں ایسے لوگوں کی بھی ایک بڑی تعداد ہے جو بنی بنائی اشیا بھی کھاتے ہیں جو غیر ملکوں سے آتی ہیں، [illegible] تمام افراد یکساں تعداد میں نہیں کھاتے بلکہ کم و بیش مقدار میں۔ ڈاکٹر ای۔ سی۔ سنو نے اس سلسلے میں ایک پیمانہ تجویز کیا ہے اور وہ یوں کہ اس نے ایک تیس سال کا آدمی زیادہ سے زیادہ جتنا کھا سکتا ہے اسے ہر فرد کے لئے (بچہ اور جوان ملا کر) پیمانہ تسلیم کر لیا ہے۔ اس نے پندرہ سال سے کم عمر کے بچوں ایوریج غذا کو ۱۹ تسلیم کیا ہے۔ پندرہ سے انتیس سال کی عمر کے لوگوں کے لئے ۸۱، تیس سے چالیس سال کے لئے ۹۵، پینتیس سے انسٹھ سال کے لئے ۶۸، ساٹھ سے چوہتر سال کے لئے ۳۲ اور پچھتر سال سے زیادہ کے لئے ۰۶۔

اگر مندرجہ بالا اعداد و شمار پر غور کیا جائے تو غذا کی قلت ہندوستان میں برائے نام رہ جاتی ہے اور اس سے اس قسم کے قحط کی حالت نہیں پیدا ہونی چاہئے جیسی کہ اس وقت ملک کے بہت سے حصوں میں پائی جاتی ہے۔

اور اگر ذرا سی غذائی قلت ملک میں ہے بھی تو اس سے کوئی بہت زیادہ خطرہ نہیں ہونا چاہئے۔ ہندوستان میں پیداوار کی زبردست گنجائش ہے۔ اگر ملک میں جہازرانی، ذرائع نقل و حرکت، آبپاشی اور تقسیم دولت کا بہتر انتظام قائم ہو گیا تو اس سے غذا بہت آسانی کے ساتھ وافر مقدار میں فراہم ہو سکے گی۔

اگر زراعت میں بہتر کھاد کا استعمال شروع ہوا اور کوآپریٹو اور سائنٹفک طریقے کام میں لائے گئے تو ہندوستان میں عظیم الشان زراعتی ترقی ہو سکتی ہے ملک میں غلہ جتنا پیدا ہونا چاہئے اتنا اس لئے نہیں پیدا ہوتا کہ بے حد دقیانوسی اور غیر سائنٹفک اصولوں پر کاشت کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں ایوریج طور پر ۱۰۰۰ پونڈ چاول فی ایکڑ پیدا ہوتا ہے اور گیہوں ۶۶۲ پونڈ۔ اس کے برخلاف جاپان میں فی ایکڑ اس سے تین گنا چاول اور دو گنا گیہوں پیدا ہوتا ہے۔ ہندوستان میں زراعتی ترقی کی طرف پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ زمین کو ٹکڑے ٹکڑے تقسیم کرنے کا جو رواج قائم ہے اسے قطعی منسوخ کر دیا جائے اور اکنامک ہولڈنگ (ECONOMIC HOLDING) کا طریقہ رائج کیا جائے۔ دوسرا قدم یہ ہونا چاہئے کہ ملک کے ایک سرے سے دوسرے

سے تک آب پاشی کا طریقہ بالکل بدل دیا جائے تیسرا قدم یہ ہونا چاہئے کہ سائنٹفک طریقے اختیار کئے جاویں۔

۱۹۳۶-۳۷ء میں برطانوی ہند کے جو زراعتی اعداد و شمار فراہم کئے گئے تھے اُن کی رو سے دیکھا جائے تو قابل کاشت زمین کا صرف ایک تہائی حصہ زیر کاشت ہے۔ اس کے علاوہ قریب ایک چوتھائی حصہ زمین کاشت ہو سکتی ہے لیکن کاشت نہیں کی جاتی۔ ظاہر ہے کہ ذرائع اور وسائل کے ہوتے ہوئے یہ حالت بے حد افسوسناک ہے اور ذرائع و وسائل کی گویا بربادی ہے۔ اگر زراعت میں تقسیم کے اصول کو رواج دیا جائے اور آب پاشی کا بہتر انتظام کیا جائے تو ملک میں پچاس فیصدی سے زیادہ غلّہ کی پیداوار بڑھ سکتی ہے۔ تجربے سے یہ بات معلوم کی گئی ہے کہ اگر ایسی زمین زیر کاشت لائی جائے جو اب تک خالی پڑی تھی تو پیداوار بہت وافر ہو سکتی ہے۔

ماہرین اقتصادیت قومی دولت میں اضافہ کرنے کے اور بھی طریقے بتاتے ہیں، ان طریقوں کو زیر عمل لانے سے ملک میں غربت اور امراض کا قلع قمع کیا جا سکتا ہے۔ وہ طریقے کیا ہیں؟ معاشی ترقی کو فروغ دینا صنعت کو آگے بڑھانا، آبادی کی تقسیم اور ملک کے جس حصے میں آبادی زیادہ ہے وہاں سے لوگوں کو کم آبادی والے علاقوں میں بسانا۔ اگر ملک کے کسی خاص حصے میں غذائی قلت کا سامنا ہے تو وہاں سے لوگوں کا ہجرت اختیار کر کے کسی دوسرے حصے میں چلا جانا حالات کو بہت حد تک سنبھال دیتا ہے۔ اس طریقے کو ہندوستان میں ضرور اختیار کیا جائے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ملک کی دولت کو ہموار کرنے میں آبادی کی نقل و حرکت نے بڑی مدد کی ہے نہ صرف عوام کو بلکہ طبقہ امرا کے لوگوں کو بھی نقل مکان میں دلچسپی لینی چاہئے ورنہ صحیح اور مناسب تقسیم کی بجائے ملک کی دولت ناہموار طریقے سے تقسیم ہوگی۔

ہندوستان اگرچہ زراعتی ملک رہا ہے لیکن یہاں چھوٹے پیمانے کی صنعتیں اور کاٹیج انڈسٹری قومی دولت میں اضافہ کرنے کے لئے موجود تھی۔ لیکن جب برطانوی راج قائم ہوا تو اس نے انگلستان کے تاجروں کو فائدہ پہنچانے کے لئے ہندوستان کی صنعتوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ کوآپریٹو انجمنوں کے ذریعہ ان صنعتوں کو دوبارہ بحال کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

ان تمام ترقیوں کو عالم وجود میں لانے کے لئے صحت عامہ اور صفائی کی طرف خاص طور پر دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ دیہات میں صفائی کا انتظام کرنا زراعتی ترقی کی طرف گویا پہلا قدم ہے۔ دیہات سدھار کا یہ ایک لازمی حصہ ہے اور اس کو کامیاب بنانے کے لئے دیہی تعلیم کی ایک مکمل اسکیم کو عمل میں لانے کی ضرورت ہے۔ اس تعلیم کی بنیاد کتابی علم پر کم اور بچے کی فطری دلچسپیوں پر زیادہ ہونی چاہئے۔ بچوں کو ایسے عملی کاموں کے ذریعے [illegible] سے خاص خاص مقصد حل ہوتے ہوں جن سے خاص خاص امور انجام پاتے ہوں اور جن سے تخلیق اور پیداوار ہوتی ہو دیہی حالات اور ضروریات کے لئے خاص طور پر موزوں ہے۔ پودوں اور جانوروں سے متعلق سائنٹفک معلومات مہیا کرنا، ایسی تعلیم و تربیت دینا جن کا تعلق مقامی صنعتوں سے ہو، جسمانی ورزش، بوائے اسکوٹ اور فرسٹ ایڈ کی ٹریننگ دینا۔ ان باتوں سے کاشتکار طبقے کی جسمانی قوت میں زبردست اضافہ ہوگا، امراض میں کمی واقع ہوگی اور پیداوار بڑھانے میں آسانی ہوگی۔ دیہاتوں میں زراعتی تعلیم و تربیت کے طریقوں کو بہتر بنانے کے لئے "ہندوستان کے معاشی پلان" کے مصنف نے مستقل زراعتی میوزیم کی تجویز پیش کی ہے جو کوآپریٹو طریقوں پر قائم کی جائے۔ زندگی کو بہتر اور برتر بنانے کے لئے کاشتکاری کو بہتر اور اعلیٰ پیمانے پر ترقی دینے کی اشد ضرورت ہے۔ ان دونوں چیزوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے دیہی تعلیم کے علاوہ نئی صنعتیں قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ مخصوص طور پر چھوٹی کاٹیج ٹائپ کی صنعتوں کو ترقی دینا اور بھی ضروری ہے اور جو صنعتیں اس وقت موجود ہیں انھیں اور وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔ زراعت اور صنعت کی روز افزوں ترقی سے پیداوار میں اضافہ ہوتا جائے گا اور اس طرح دونوں کے درمیان پھر سے ایک توازن قائم ہو جائے گا۔ جو صنعتیں قائم کی جائیں اُن میں آلات زراعت بنانا، پھلوں کی کاشت، انڈے، مرغیاں، بطخ پالنا، گھی دودھ اور دہی، کپڑے بُننا، چمڑے کی اشیاء تیار کرنا، ترکاریوں کی کاشت وغیرہ غرض ان تمام چیزوں کا انتظام کیا جائے جو دیہات میں ممکن ہیں۔

برطانوی ہند اور ریاستی ہند

از :۔ راؤ بہادر سردار ایم۔ وی۔ کیبے۔ ام۔ اے

چند مہینے بیشتر حکومت ہند کی طرف سے ایک رپورٹ شائع ہوئی تھی جس کا تعلق بعد از جنگ کے تعمیری اور صنعتی پروگرام سے تھا۔ اس رپورٹ میں یہ بتلایا گیا تھا کہ برطانوی ہند کے مقابلے میں ریاستوں میں بھاری صنعتوں کے ترقی کرنے کا امکان بڑھتا جا رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ریاستوں میں اولاً تو ٹیکس بہت کم لگتا ہے، دوسرے وہاں کے مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کے لئے قوانین موجود نہیں ہیں اور یہ دونوں باتیں سرمایہ داروں کے حق میں ہیں۔ حکومت ہند کے اس رپورٹ کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان بھر میں اب یکساں اور ہموار قسم کے قوانین اور ٹیکس جاری کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی زمانے میں یہ خبر بھی موصول ہوئی تھی کہ حکومت ہند کے پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ سے والیان ریاست کے نام خط بھیجا گیا ہے جس میں انھیں یہ اطلاع کی گئی ہے کہ ریاستوں کی سرحدوں اور اقتدار کو متعین [illegible] کرنے کا جو سلسلہ جاری تھا اُسے دوبارہ عمل میں نہیں لایا جا سکتا۔ اس اعلان کا تعلق مخصوص طور پر گجرات کی ریاستوں سے تھا خط میں غالباً یہ بھی درج تھا کہ ریاستوں اور برطانیہ کے درمیان جو معاہدے ہیں اور جن سے دونوں کے باہمی تعلقات کا تعین ہوتا ہے اُنکے معنی و مفہوم کو اب نئے اور موجودہ حالات کی روشنی میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔ کچھ والیان ریاست چیمبر آف پرنسز سے اس بات پر مستعفی بھی ہو گئے اور ایسے وقت میں مستعفی ہوئے کہ چیمبر کی کارروائی بالکل رک سی گئی۔ ان والیان ریاست نے استعفیٰ داخل کرنے کے بعد خود اپنی ایک مجلس عمل COMMITTEE OF ACTION کی تشکیل کی۔

نہ صرف حکومت ہند بلکہ دوسری جماعتیں بھی اب ریاستوں کے وجود کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتیں۔ مثلاً ام۔ این۔ رائے نے حال میں ایک اسکیم بنائی ہے جس میں انھوں نے ریاستوں کے بہت جلد ہندوستان کی سطح سے معدوم ہو جانے کی پیشین گوئی کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ریاستیں ایک کل ہند ریاست میں مدغم ہو کر رہ جائیں گی۔

ہندوستان میں دیسی ریاستوں کا وجود دراصل ایک ایسی چیز ہے جس کی اور کہیں مثال نہیں۔ جب سے مسٹر جناح نے پاکستان کی آواز بلند کی ہے تب سے "برطانوی ہند" اور "دیسی ہند" کے اختلاف کا احساس لوگوں کے ذہن میں دھندلا پڑ گیا ہے۔ دراصل پاکستان اور دیسی ریاستوں کے درمیان سیاسی اعتبار سے کوئی بھی چیز مشترک نہیں۔ دیسی ریاستوں کو ایک حد تک ملایا کی فیڈرل ریاستوں سے البتہ مثال دی جا سکتی ہے اگرچہ ملایا کی ریاستوں کی طرح ہندوستان کی ریاستیں کسی وفاق کے ماتحت نہیں ہیں۔ اگر وسعت دیکھا جائے تو مملکت نظام بڑی حد تک اگر ابیسینیا نہیں تو مصر کی حیثیت ضرور اختیار کر سکتا تھا۔

دیسی ریاستوں کے موجودہ حیثیت اختیار کرنے کی کہانی بڑی طویل ہے مسلسل فتوحات کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی نے حکومت برطانیہ کی حمایت سے پہلے تو دوسری یوروپین طاقتوں کے اثر کو مٹایا، ڈچ، پرتگالی اور فرانسیسی رعب و اثر کو ہندوستان سے ختم کرنے میں کمپنی کا گویا پہلا کام تھا۔ کمپنی نے دیسی ریاستوں سے معاہدے کر کے حریف یوروپین طاقتوں کو علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ کمپنی نے دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ معاہدوں کے ذریعہ والیان ریاست کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ دوسرے والیان ریاست سے تمام خط و کتابت اور گفت و شنید کمپنی کے پولیٹیکل ایجنٹ کے ذریعے کریں۔ والیان ریاست خود آپس میں آزادانہ تعلقات نہیں قائم کر سکتے تھے پھر یہ پولیٹیکل ایجنٹ بجائے خود اُن کے قوانین اور ہدایتوں سے مجبور تھے جو پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کی طرف سے اُن پر عائد کر دی گئیں تھیں۔ کمپنی کے عہد حکومت میں جنرل سر جان میلکم نے جو ہدایتیں پولیٹیکل ایجنٹوں کیلئے جاری کی تھیں تقریباً انھیں پر اب تک عمل درآمد ہو رہا ہے۔

حکومت ہند نے دیسی ریاستوں کے ساتھ اب تک جو طرز عمل [illegible]

اس میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ بعض اوقات حکومت نے اپنے کنٹرول کو ڈھیلا کر دیا ہے اور بعض اوقات اس میں اضافہ کر دیا ہے لیکن بحیثیت مجموعی برطانیہ کا کنٹرول ترقی ہی کرتا رہا ہے۔ کچھ ہی سال ہوئے کہ کچھ ایسے مشہور و معروف ماہرین قوانین نے جن پر خود والیان ریاست کو بھروسہ تھا والیان ریاست کے قانونی حقوق کی اچھی طرح تفصیلی جانچ پڑتال کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ ریاستوں پر برطانیہ کی جو سرپرستی حاصل ہے اسکی صحیح صحیح قانونی تعریف غیر ممکن ہے۔

والیان ریاست کا تذبذب، حکومت ہند کی عائد کردہ رکاوٹوں کے سبب ایک دوسرے سے علیحدگی کی حالت میں رہنا، ان کی میٹنگ اور باہمی مراسلات پر حکومت کی عائد کردہ پابندیاں۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ حکومت برطانیہ ان کے معاہدوں سے متعلق حقوق پر جو حملہ کرتی تھی اس کا وہ متحد ہو کر مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ جب حکومت نے پابندیوں اور سختیوں کی باگ کچھ ڈھیلی کر دی تو والیان ریاست کی طرف سے بیشمار اخراجات، محنت اور تحقیق و تلاش کے بعد چار بڑے موٹے موٹے مسودے تیار ہوئے جن میں یہ دکھلایا گیا کہ حکومت برطانیہ نے کتنی بار والیان ریاست سے کئے ہوئے معاہدوں کی خلاف ورزی کی ہے۔ ملک کے بہترین ماہرین قانون کو فیس کی بھاری بھاری رقمیں دے کر اس بات کے لئے تیار کیا گیا کہ وہ والیان ریاست کی جانب سے کیس تیار کریں۔ لیکن ان تمام سخت کوشش و محنت کا ذرہ برابر بھی نتیجہ نہ نکلا۔

زیادہ تر والیان ریاست مغل بادشاہوں کے زیر حکومت بالکل ماتحت بلکہ غلام بنے رہنے کے عادی ہو گئے تھے۔ یہ گرفت ان پر اتنی مضبوط تھی کہ بہت سے والیان ریاست نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر سایہ اور زیر حفاظت آ جانا مناسب سمجھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی انیسویں صدی کے ابتدائی [illegible] میں ہندوستان کی سب سے حاوی اور مضبوط طاقت بن چکی تھی [illegible] والیان ریاست [illegible] ہندوستان کی سیاسی طاقت میں [illegible]

[illegible]

اگرچہ اب وہ بات نہیں رہی لیکن اتنا تو ہے کہ برطانیہ [illegible] اور بعد بھی جب چاہتی تھی والیان ریاست کو گدی سے اتار کر اپنی پسند کے لوگوں کو بٹھا دیتی تھی۔ بعض ریاستوں میں تو برطانیہ نے نئے خاندان کی بنیاد ڈالی اور انھیں تخت و تاج کا مالک بنا دیا۔

کہا جاتا ہے کہ ۱۸۷۷ء میں جب لارڈ لٹن نے اعلان کیا کہ ملکہ وکٹوریہ نے قیصر ہند کا لقب اختیار کیا ہے تو والیان ریاست کے درباروں میں ہلچل مچ گئی۔ سب سے پہلے مہاراجہ سندھیا نے حکومت برطانیہ کے اس اعلان کا خیر مقدم کیا اور اسکے بعد دوسری ریاستوں نے کچھ نے بالکل اسی قسم کی شرطوں پر معاہدہ کیا جن پر سندھیا نے کیا تھا اور کچھ نے ذرا دامن بچا کر اور ایسی شرطوں پر جن کے ذریعہ کچھ پابندیاں اور رکاوٹیں عاید کی گئی تھیں مثلاً مہاراجہ ہولکر نے ایسا ہی کیا۔ کچھ ہوشمند والیان ریاست نے یہ محسوس کیا کہ نائٹ کے خطاب کا تاج کے معزز خادموں اور والیان ریاست کو عطا کیا جانا ایک ایسی چیز ہے جو دونوں کو ایک ہی سطح پر لے آتی ہے۔

ہز ہائنس مہاراجہ سیاجی راؤ گائیکواڑ نے جن کی عمر اس زمانے میں بہت کم تھی، آگے چل کر یہ محسوس کیا کہ برطانیہ کے اس اعلان سے دیسی ریاستوں کی بنیاد بالکل اکھڑ گئی ہے چنانچہ انھوں نے کھلم کھلا طور پر وفاق (FEDERATION) کی حمایت میں آواز بلند کی اور اسے اپنا مقصد قرار دیا۔ اسی صدائے احتجاج کے بعد جیمبر آف پرنسز وجود میں آیا۔ مہاراجہ سیاجی راؤ گائیکواڑ، مہاراجہ شاہو چھترپتی کولہاپور کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:—

ریاستوں کے اندرونی معاملات میں کلی خودمختاری [illegible]
[illegible]

کے درمیان اختلافات رائے کی صورت پیدا ہو تو اُن کے تصفیہ کی ایک عدالت مقرر کی جائے جس کے اصول میں جسٹس کے اختیارات موتب دئے جائیں۔

بہتر ہوتا کہ والیان ریاست انھیں مقاصد کے حصول کی کوشش کرتے لیکن آج وہ ایسا نہیں کر رہے ہیں اور قانونی امداد و اعانت کے پیچھے حیران و سرگرداں ہیں۔ اگر والیان ریاست اس طرف رجوع کریں اور جدا جدا بہ سیاسی تاڈ کا پیکار کے تشکیل کردہ مقاصد کے حصول کی کوشش کریں تو اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔

گذشتہ جنگ کے دوران میں یہ بات ظاہر ہو گئی کہ ریاستیں اور برطانوی ہند کے صوبے ایک دوسرے کی امداد و اعانت کے بغیر اپنا کام نہیں چلا سکتے۔ اس سے ہندوستان کا ناقابل تقسیم ہونا بھی پورے طور پر ثابت ہو گیا ہے۔

وفاقی ریاستوں میں یہ رواج ہے کہ بعض قوانین جنھیں مرکزی اسمبلی پاس کرتی ہے اُن کے کچھ حصوں کو صوبے بھی اپنے اپنے وہاں پاس کرتے ہیں یا اُن پر عمل درآمد کرتے ہیں۔ کینیڈا میں ایسا ہی ہوتا ہے جب کسی وفاق میں ایک بار یہ سسٹم قائم ہو جاتا ہے تو پھر اس کو ختم کرنا غیر ممکن ہو جاتا ہے۔ ہندوستان میں بھی ایسا ہی ہوا ہے اور اس سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ کون کون سے معاملات ایسے ہیں جنھیں کل ہند معاملات کہا جا سکتا ہے اور کس طرح انھیں طے کیا جا سکتا ہے نہ صرف صوبے بلکہ بڑی بڑی ریاستیں بھی جو اب تک صوبوں کے حقوق پر معترض تھیں اب ایسے قاعدوں کی پابندی پر مجبور ہیں جن کی تشکیل میں خود اُن کی آواز بھی شامل ہے ... کچھ ایسے قوانین اور قاعدے موجود ہیں جن کی ... [illegible] ... ریاستوں اور برطانوی ہند کے ... [illegible] ... کے پاس ... [illegible] ...

[illegible]

والیان ریاست بارہا یہ اعلان کر چکے ہیں کہ وہ ہندوستان کے ... خود اختیارات چاہتے ہیں اور اس کے حصول میں وہ کوئی رکاوٹ پیدا کرنا نہیں چاہتے — وہ پاکستان کے قسم کی سیاسی علیحدگی بھی نہیں چاہتے۔ حالات انھیں مجبور کر رہے ہیں کہ وہ بقیہ ہندوستان کے ساتھ تعاون اور اشتراک عمل کا راستہ اختیار کریں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ وہ مکمل طور پر برطانوی ہند میں مدغم ہو جانا نہیں چاہتے۔

ان کے لئے جو سب سے مشکل مسئلہ درپیش ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے آبائی اور خاندانی مفاد اور مراعات کو کس طرح قائم رکھیں۔ وہ یہ تو نہیں چاہتے کہ اُن کے مفادات اور مراعات کی خاطر تنظیم حکومت میں کسی قسم کی خرابی پیدا ہو، ساتھ ہی وہ ریاست کی آمدنی کی غیر مساوی تقسیم بھی نہیں چاہتے۔ بلکہ اس کے برخلاف عہد قدیم ہی سے ہندوستان کے حکمراں اپنی رعایا کے مفاد کو آگے بڑھانے میں کوشاں رہے ہیں۔

زمانۂ حال کا رجحان یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں ایک دوسرے میں مدغم ہو کر بڑی بڑی ریاستوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کی ریاستیں بھی گھل مل کر ایک بڑے "متحدہ ہندوستان" کی شکل اختیار کر سکتی ہیں۔ ہندوستان تاج برطانیہ کا روشن ترین ہیرا مانا جاتا ہے۔ ہندوستان کی ریاستیں تاج برطانیہ سے عہد ناموں اور معاہدوں کے ذریعہ منسلک ہیں، جب ہندوستان درجۂ خود اختیاری حاصل کر لیگا تو وہ اختیارات جو معاہدوں کے ذریعہ دیسی ریاستوں پر برطانیہ کو حاصل ہیں وہ ہندوستان کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائیں گے اور "متحدہ ہندوستان" کا صوبوں اور ریاستوں دونوں پر اختیار و اقتدار ہوگا۔

۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں جس وفاق کا ... پیش کیا گیا ہے اس کی وجہ سے بہت سے دستوری قانونی ... مسائل پیدا ہو گئے ہیں ... [illegible]

[illegible]

صوبوں کے اختیارات بہت بڑھ جائیں گے۔ ریاستوں کو اب یہ خوف دامنگیر ہے کہ اُن کے حقوق اور مراعات محفوظ نہیں رہیں گے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے آبائی اور خاندانی مفادات کو بھی قائم و دائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ وفاق میں شامل ہونا قبول کر لیتے۔ تو اس کا مطلب ہوگا کہ وہ اپنی موجودہ حیثیت سے گر کر قانون اور دستوری حکمراں کی حیثیت سے اختیار کر لیتے ہیں یعنی وہ ایسے حکمران بن جاتے ہیں جن پر دستور حکومت اور قانون کی طرف سے پابندیاں عائد ہوں گی۔ اس عمل کا آگے چل کر منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ ریاستیں آہستہ آہستہ بالکل اپنا وجود کھو بیٹھیں گی اس لئے کہ رقبہ، آمدنی اور آبادی کے لحاظ سے اپنی اپنی انفرادیت کا برقرار رکھنا اُن کے لئے غیر ممکن ہو جائے گا۔ ریاستوں کے وفاق میں شامل ہونے کے فوراً ہی بعد یہ مسائل بہت اہمیت اختیار کر لیں گے اور اُن کا فوری حل "تلاش کرنا ضروری ہو جائے گا۔" ڈاکٹر بیسنٹ کے "کامن ویلتھ آف انڈیا بل" اور نہرو رپورٹ میں -- ان دقتوں اور پیچیدگیوں کا پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا۔ چنانچہ ان لوگوں نے ریاستوں کے مسئلے کو نظر انداز کر دیا تھا کانگریس کا بھی آج یہی رویہ معلوم ہوتا ہے مسلم لیگ کے لیڈران بھی اسی طرز عمل کی حمایت کر رہے ہیں۔ گذشتہ جنگ کے دوران میں ریاستوں کے تعاون کو حاصل کرنے کا مرکزی حکومت نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ بڑی حد تک ہمارے سامنے ریاستوں کے مسئلے کا ایک موزوں حل پیش کرتا ہے۔ ہندوستان کے مفاد کے لئے یہ ضروری ہے کہ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں اس طور پر رد و بدل کیا جائے کہ ریاستوں کو معدود اور مناسب طور پر نظر انداز

کرنے کا رویہ برقرار رہے۔ اس لئے کہ ریاستیں اب مرکزی حکومت کے بیشتر معاملات پر تعاون اور اشتراک عمل کرنے کی عادی ہو گئی ہیں۔ بڑی بڑی ریاستوں کو البتہ مرکزی حکومت کی پالیسی کی تشکیل میں اپنی رائے کے اظہار کا حق دیا جاتا ہے اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں ان کے پیچھے پیچھے چلنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اسی سسٹم پر ذرا زیادہ سخت قسم کی نگرانی رکھی جائے۔ یہ بات اکثر معرض شک میں ہے کہ ریاستیں مرکزی حکومت کے جن فیصلوں کو اپنے وہاں عمل میں لانے کے لئے ضروری احکام جاری کرتی ہیں وہ عمل میں لائے بھی جاتے ہیں یا نہیں۔ اس قسم کے شکوک کے پیدا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ریاستوں کی تنظیمی مشینری درست نہیں ہے۔ خیر یہ خرابی تو آگے چل کر دور ہوگی فی الحال ضرورت اس بات کی ہے کہ مرکزی حکومت اپنے ایجنٹوں اور نمائندوں کے ذریعہ ریاستوں پر دباؤ قائم رکھے اور معمولی معمولی خلاف ورزی کو بھی واقع ہونے سے روکنے کی کوشش کرے اس سے یہ ہوگا کہ پورے ہندوستان میں ہموار اور یکساں قسم کی پالیسی زیر عمل رہے گی اور ریاستیں مرکزی حکومت کے ساتھ باہمی رشتے میں منسلک رہیں گی۔

اس قسم کے سوالات بعد میں طے ہوں گے کہ ہندوستان میں جو وفاق قائم ہوگا تو اس میں شامل مختلف صوبوں اور ریاستوں کے اختیارات کیا ہوں گے اور اُن کے اقتدار کی حد کیا ہوگی۔ یہ وفاق دو بڑی ریاستوں پر مشتمل ہوگا (پاکستان اور ہندوستان) یا ایک ہی ریاست پر (یعنی صرف ہندوستان پر) لیکن ان مسائل کو ہندوستان کی آزادی کی راہ میں حائل کرنے کی کوشش نہ کی جائے تو بہتر ہے۔

امن عالم اور علاقائی جمعیتیں

از:- برنس سکریٹری آف اسٹیٹ ریاستہائے متحدہ امریکہ

"جب سے "مجلس اقوام متحدہ" کی بنیاد ڈالی گئی ہے تب سے یہ سوال بہت اہم ہو گیا ہے کہ دنیا کے امن و امان کو قائم رکھنے کے لیے ریاستوں کی علاقائی جمعیتیں کس حد تک مفید یا خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں۔ حال ہی میں صدر ٹرومین نے امریکہ کی خارجی پالیسی سے متعلق اپنے بارہ نکات کا اعلان کرتے ہوئے اور سوویت یونین کے طرز عمل پر اعتراض کرتے ہوئے یہ بتایا کہ سوویت یونین بلقان اور مرکزی حکومت میں اپنی رہنمائی میں ریاستوں کی جس علاقائی جمعیت کو فروغ دے رہا ہے وہ امن عالم کے لیے خطرناک ہے۔ لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ خود صدر ٹرومین نے اُسی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ ریاست ہائے متحدہ اپنے تحفظ کے لیے یہ ضروری سمجھتا ہے کہ پورے براعظم امریکہ کے فوجی دفاع کی ذمہ داری اپنے سر لے اور وہاں کسی مغربی یا مشرقی طاقت کے پاؤں نہ جمنے دے۔ کیا یہ علاقائی جمعیت بازی نہیں ہے؟ اسی علاقائی جمعیت کے مسئلے پر برنس، سکریٹری آف اسٹیٹ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا ایک مقالہ ناظرین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ مقالہ اب تک ہندوستان کے کسی اردو یا انگریزی اخبار میں شائع نہیں ہوا ہے۔ ہم اس سلسلے میں امریکی دفتر اطلاعات کے مشکور و ممنون ہیں۔"

امن عالم کو دائم و قائم رکھنے کے لیے دنیا کی قوموں میں تعاون اور اشتراک عمل کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ تعاون اُس وقت تک وجود میں نہیں آسکتا جب تک دنیا ایسے مختلف حصوں میں بٹی رہے گی جہاں کچھ طاقتوں کو خاص مراعات حاصل ہیں اور دوسری طاقتیں اُن مراعات سے محروم ہیں، جہاں کچھ طاقتوں کا مکمل اقتدار اور دبدبہ قائم ہے اور دوسری طاقتوں کی کچھ بھی نہیں چلتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمسایہ ریاستیں ہمیشہ ایک دوسرے سے قریب آنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن ہمسایہ ممالک کے تعلقات کو عالمگیر تعلقات سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ عالمگیر بین الاقوامی تنظیم کے مقاصد کو تقویت [illegible] ہے۔ اس کے بغیر امن عالم کا قائم رہنا دشوار ہو جائے گا۔

یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ صدر روزویلٹ نے ایک طرف اگر براعظم امریکہ کی [illegible] ختم کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف انھوں نے ساری دنیا کی قوموں کی برادری کو وجود میں لانے کے لیے اور بھی زیادہ جدوجہد کی۔ صدر روزویلٹ جس اصول پر عمل پیرا تھے وہ یہ تھا کہ اس عہد میں دنیا کی تمام قومیں ہمسایہ قومیں ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ اگرچہ ریاستہائے متحدہ کے براعظم امریکہ کی دوسری قوموں سے خاص طور پر بھائی کے تعلقات قائم ہیں لیکن خود براعظم اور اس میں بسنے والی تمام قومیں دنیا کی پوری انسانی آبادی کا ایک حصہ ہیں، جن قوموں پر یہ انسانی آبادی مشتمل ہے وہ بحیثیت مجموعی ایک ہی ہیں اور وہ ایک دوسرے کے تعاون اور مدد کے بغیر اپنا کام نہیں چلا سکتیں۔

انھی بنیادی اصولوں پر براعظم امریکہ میں بین الاقوامی تعلقات قائم رہے ہیں۔ وہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیشہ اچھے نہیں رہے ہیں۔ کچھ [illegible] کی بات ہے کہ ریاستہائے متحدہ پر یہ الزام عائد کیا گیا [illegible] براعظم امریکہ کی ریاستوں کے اندرونی معاملات میں دخل [illegible]

پالیسی سامراجی ہے اور اپنی ڈالر ڈپلومیسی کے ذریعے براعظم امریکہ کی کمزور اور چھوٹی چھوٹی قوموں پر اپنا سامراجی نظام مسلط کر رہا ہے۔ لیکن ہم نے خود اپنے تجربے سے یہ جان لیا کہ ہمسایوں کی مدد اور ہمدردی حاصل کرنے کے لئے خود اچھا ہمسایہ بننا ضروری ہے۔

ہم نے اپنے تجربے سے یہ بات دریافت کی کہ دوسری قوموں کو مجبور کر کے اُن سے ہمدردی نہیں حاصل کی جا سکتی اور نہ یہ چیز ایسی ہے کہ اُسے خریدا جا سکے۔ دوسری قوموں کی ہمدردی خود پیدا ہوتی ہے۔ پیدا نہیں کرائی جاتی ہم نے یہ بھی سیکھا ہے کہ حکومتوں کے درمیان اس وقت تک پائدار دوستی اور محبت نہیں قائم ہو سکتی جب تک قوموں کے درمیان دوستی اور محبت نہ قائم ہو۔

براعظم امریکہ میں جو ریاستوں کا نظام قائم ہے اُس میں اس اصول کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ کوئی ریاست دوسری ریاست کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی نہ کرے اور نہ دوسری ریاست کو ملک کے اندرونی معاملات میں دخل انداز ہونے دے۔

لیکن ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ دوسری قومیں اگر ہمارے خیالات اور عمل سے واقفیت حاصل کرنا چاہتی ہیں تو وہ ضرور ایسا کریں، ساتھ ہی نہیں بھی دوسری قوموں کے خیالات اور عمل سے واقفیت حاصل کرنے کا حق ہے۔ اسی قسم کی واقفیت حاصل کر کے ہر قوم خود اپنا طرز حیات متعین کر سکتی ہے۔

دوسری قوموں کو یہ جاننے کا پورا پورا حق حاصل ہے کہ ہم امریکی، جمہوریت اور انسانی حقوق کی قدر کرتے ہیں۔ ہمارا یہ پکا عقیدہ ہے کہ حکومت کی بنیاد عوام کی رضامندی پر قائم ہونی چاہیئے اور قوموں کے درمیان مفاہمت اور امن کو آگے بڑھانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ خیالات کا آزاد تبادلہ ہو۔

اس بات پر اعتقاد رکھتے ہوئے بھی کہ ایک قوم دوسری قوم کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کی کوشش نہ کرے ہمارا خیال ہے کہ قوموں کے درمیان مفاہمت کو وجود میں لانے کے لئے ایک دوسرے کے خیالات اور عمل سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے اسی قسم کی مفاہمت سے قوموں کے درمیان رواداری اور اختلافات کے دور کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

لیکن جب کوئی حکومت اپنے خیالات اور اپنے وہاں کی خبروں کو دوسرے ملکوں میں پہنچنے سے روکتی ہے تو اس سے شکوک اور بے اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ شکوک اور بے اعتمادی صحیح بھی ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ شک اور بے اعتمادی ظلم و جور کی تکمیل ہے۔

لیکن ایک قوم اگر دوسری قوم کے خانگی معاملات میں دخل انداز ہونا نہیں چاہتی تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اُس ظلم و جور کی حمایت اور تائید کر رہی ہے جو دوسری قوم کی حکومت خود اپنے ہم قوموں پر ڈھا رہی ہوتی ہے۔ ہماری پالیسی یہ ہے کہ ہم اپنی ہمسایہ قوموں کو اس بات کا موقع دیں کہ وہ اپنی آزادی کا تحفظ خود اپنے طور پر اور خود اپنی خواہش کے مطابق کریں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم انھیں دوسروں کی آزادی پر حملہ کرنے کا موقع دیں۔

ہم نے گذشتہ دس سال کے تلخ تجربوں سے یہ معلوم کیا ہے کہ نازیوں اور فاشسٹوں نے سب سے پہلے خود اپنے ہم وطنوں ہی پر ظلم ڈھایا اور دیگر قوموں کی صدائے احتجاج کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا، کہ یہ ہمارا خانگی معاملہ ہے اس میں آپ کو دخل انداز ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب ہمارا یہ خیال ہے کہ دنیا میں کہیں بھی ظلم و جور ہو رہا ہو اُس کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے اس لئے کہ یہ قطعی ممکن ہے کہ وہ خانگی ظلم و جور آگے چل کر بین الاقوامی صورت اختیار کرے اور دنیا کی قومیں مصیبت میں مبتلا ہو جائیں۔

چنانچہ ہم اگر یہ دیکھیں گے کہ براعظم امریکہ کے کسی ملک میں کچھ ایسے واقعات رونما ہو رہے ہیں جن سے خود ہمارے تحفظ کے خطرے میں پڑ جانے کا اندیشہ ہے تو ہم براعظم امریکہ کی دوسری ریاستوں کے ساتھ گفت و شنید کر کے ایسی پالیسی اختیار کرنے کی کوشش کریں گے جس سے ہمارا تحفظ ہو سکے۔

ہم امریکیوں کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ ہم نے ہمسائگی کے اچھے تعلقات کو ترقی دینے کی کوشش کی ہے اس پالیسی کی ابتدا منرو اصول (MUNRO DOCTRINE) سے ہوتی ہے ظاہر ہے کہ ہم دوسری قوموں کو بھی اس قسم کی پالیسی اختیار کرنے سے نہیں روک سکتے۔

آج سوویت یونین مشرقی اور مرکزی یورپ کی ہمسایہ قوموں کی

طرف دوستی اور قربت کا جو ہاتھ بڑھا رہا ہے اس کی ہم نے مخالفت کرنے کی بجائے حمایت کی ہے۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ سوویت یونین کا ملکی تحفظ ان ملکوں سے گہرے طور پر وابستہ ہے۔ شکست خوردہ دشمن کے ملکوں اور مقبوضات کا جو ہم نے انتظام کیا ہے اس میں سوویت یونین کے ان حقوق کا اچھی طرح خیال رکھا گیا ہے۔

سوویت یونین کی اس خواہش اور ارادے کی ہم قدر کرتے ہیں جس کے تحت وہ اپنے ہمسایہ ملکوں میں اب ایسی پالیسی کو پنپنے دینا نہیں چاہتا جس سے سوویت یونین کا تحفظ اور وہاں کا طرز حیات دوبارہ خطرات میں مبتلا ہو جائے امریکہ اس بات کا عہد کرتا ہے کہ وہ ان ملکوں میں ایسی جماعتوں کا ہرگز ہرگز ساتھ نہیں دے گا جو سوویت یونین کے خلاف عمل پیرا ہوں گی۔ ساتھ ہی ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ سوویت یونین بھی براعظم امریکہ میں کسی ایسی جماعت کا ساتھ نہیں دے گا جو ریاستہائے متحدہ کے خلاف سازش کرنا چاہے گی۔

ہم دنیا کے ہر علاقے میں ہمسایہ ملکوں کے درمیان جنگ نہیں بلکہ دوستی کے تعلقات کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ پچیس سال کے اندر اندر دو بار اسی ہمسایہ ملکوں کے جھگڑے نے عالمگیر جنگ کی صورت اختیار کی اور ساری دنیا مصیبت میں مبتلا ہو گئی۔ ہمسایوں کے درمیان دائمی امن قائم رکھنے کے لئے دوستی اور خلوص کا وجود ضروری ہے ایسی دوستی جسے قومیں خود اپنی خواہش سے فروغ دیں۔ اس قسم کی دوستی کیلئے ضروری ہے کہ قومیں ایک دوسرے کی عزت کرنا اور ایک دوسرے کا پاس و لحاظ کرنا سیکھیں۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ تمام قوموں کو اس بات کی آزادی دی جائے کہ وہ خود اپنی رضامندی سے اپنے طرز حکومت کا انتخاب کریں۔ ہر ملک کی حکومت کا وہاں کے باشندوں کی رضامندی پر قائم ہونا ضروری ہے اور ساتھ ہی اس کا اس ملک کے طرز حیات سے ہم آہنگ ہونا بھی لازمی ہے۔

ہم نے اپنی ہمسایہ قوموں سے جو تعلقات قائم کئے ہیں ان میں اس بات کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ سوویت یونین نے اس بات کا اعلان کیا ہے کہ وہ سوویت طرز کے نظام کو اپنی ہمسایہ قوموں پر زبردستی مسلط کرنا نہیں چاہتا۔ اگر مجلس اقوام متحدہ میں شامل تمام قومیں اس اصول کو مان لیں تو دنیا کی تمام قوموں کے درمیان محبت اور دوستی کے رشتے

مضبوط ہو جائیں۔ میں یہاں پر اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ ہمسائیگی ایک ایسی چیز ہے جس کا تعلق محض دو قوموں یا دو حکومتوں سے نہیں ہوتا بلکہ دو ملکوں کے درمیان ہمسائیگی اور دوستی کے تعلقات کا قائم ہونا دیگر ملکوں کو بھی متاثر کرتا ہے۔ یہاں پر اس بات کا جان لینا ضروری ہے کہ اچھے ہمسائے اپنے ہمسایوں کو دوسروں سے بھی دوستی کرنے سے نہیں روکتے۔

ہم نے اپنے تجربے سے یہ معلوم کیا ہے کہ براعظم امریکہ کے تحفظ کے لئے یہ ضروری ہے کہ بقیہ دنیا سے معاشی اور تہذیبی تعلقات قائم کئے جائیں۔ اسی لئے ہم نے "مجلس اقوام متحدہ" کے دستور اساسی کو تسلیم کر لیا ہے ساتھ ہی ہم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ عالمگیر انسانی برادری کو دنیا کے ہر ملک پر اعلیٰ ترین اقتدار و اختیار حاصل ہے۔ مجلس اقوام متحدہ کے دستور اساسی کی رو سے ہر قوم کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ جب اس پر حملہ ہو تو وہ انفرادی طور پر اور دوسری قوموں کے ساتھ مل کر بھی اس حملے کا مقابلہ کرے۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہ علاقائی جمعیتیں جب اس حملے کے خلاف کوئی کارروائی شروع کریں تو اس کے لئے مجلس تحفظ کی رضامندی حاصل کر لینا ضروری ہے۔

ہم اس پالیسی پر بھی سختی سے عمل پیرا ہیں کہ براعظم امریکہ کی جمہوریتوں کے ساتھ تعاون اور اشتراک عمل کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسرے براعظموں کی حکومتوں کے ساتھ اشتراک عمل نہ کیا جائے۔ براعظم امریکہ کی جمہوریتوں نے ہمیشہ ان تمام حکومتوں کے ساتھ مساویانہ سلوک روا رکھا ہے جو دوسری ریاستوں کو متحد اور آزاد و خود مختار دیکھنا چاہتی ہیں۔

براعظم امریکہ کی تمام ریاستوں کا باہم یکجا ہونا عالمگیر تعاون کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاتا۔ اس قسم کی علاقائی جمعیت جو دیگر ریاستوں کے حقوق اور مفاد کا پورا پورا لحاظ رکھتی ہے اور عالمگیر تنظیم سے ہم آہنگ ہے امن عالم کو نقصان پہنچانے کی بجائے آگے اور مضبوط کرتی ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عالمگیر تنظیم کو غیر ضروری قرار دے کر ختم کر دیا جائے اور ہر جگہ ریاستوں کی علاقائی جمعیتیں قائم کی جائیں ایسا کرنے سے دنیا کی تمام چھوٹی اور بڑی قوموں کے مشترکہ مفاد کو آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔

ہم سب کے سب ایک ہی دنیا میں بستے ہیں، دو دنیاؤں میں نہیں۔ علم کے اس دور میں علاقائی جمعیتوں کے ذریعہ دنیا کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ہی علیحدگی سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اگر دنیا مختلف ایسے بڑے بڑے علاقوں میں تقسیم ہو گئی جہاں خاص خاص قوموں کو خاص خاص مراعات حاصل رہیں گے اور وہاں اُن کا کمل اثر و اقتدار قائم ہوگا تو دنیا کی تمام قوموں میں اشتراک عمل اور تعاون نہیں قائم ہو سکے گا اور اس تعاون کے بغیر امن نہیں قائم رہ سکتا۔

سنہ ۱۹۴۳ء کے "اعلان ماسکو" کا یہی مطلب تھا۔ اس اعلان کے ذریعے دنیا کی عظیم ترین قوموں نے اس بات کا عہد کیا تھا کہ وہ جنگ میں کامیابی حاصل کرنے اور اس کے بعد امن قائم رکھنے کے لئے ایک دوسرے سے تعاون کریں گی۔ قوموں کی عالمگیر برادری قائم کرنے کی کوشش کی تاریخ میں یہ اعلان زبردست اہمیت رکھتا ہے۔ اعلان ماسکو ہی کے بطن سے ڈمبرٹن اوکس کانفرنس، طہران کانفرنس، کریمیا کانفرنس، سان فرانسسکو کانفرنس اور پوٹسڈیم کانفرنس پیدا ہوئیں۔ اسی اعلان کی اسپرٹ کے تحت مجلس اقوام متحدہ اور مجلس وزرائے خارجہ قائم کی گئی۔

بین الملی تعاون کی اساس سمجھوتے پر قائم ہونی چاہیئے۔ اس تعاون کو وجود میں لانے کے لئے ضروری نہیں کہ ہم یا کوئی بھی قوم ہمسایہ ملکوں سے اپنے مخصوص تعلقات کو نظرانداز کردے۔ یہ البتہ ضروری ہے کہ ہمسائیگی کے تعلقات عالمگیر بین الاقوامی تعلقات میں اچھی طرح فٹ ہو جائیں۔

جو عالمگیر تنظیم ہم قائم کرنا چاہتے ہیں اس کی اساس دنیا کی تمام قوموں کی مکمل برابری اور خود مختاری پر قائم ہونی چاہیئے۔ اس اصول کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دنیا کی تمام قومیں اثر و اقتدار میں بھی بالکل برابر ہیں، ٹھیک جس طرح تمام انسانی افراد جسمانی طاقت اور اثر و اقتدار میں ایک دوسرے کے برابر نہیں ہو سکتے۔ اس اصول کا دراصل مطلب یہ ہے کہ تمام چھوٹی اور بڑی قوموں کی انفرادیت اور خود مختاری کی برابر قدر کی جائے، ٹھیک جس طرح تمام انسانی افراد چاہے وہ طاقتور ہوں یا کمزور قانون کی نگاہ میں برابر ہوتے ہیں۔ یہ اصول پائدار امن کے بین الاقوامی نظام کی اصل بنیاد ہے۔ اس اصول پر مجلس اقوام متحدہ کا نظام قائم ہے۔ پائدار امن قائم کرنے کے لئے اس اصول پر عمل کرنا ضروری ہے۔ پائدار امن ناقابل تقسیم ہے۔ اس کا تعلق محض چند بڑی بڑی ریاستوں یا ریاستوں کی بڑی بڑی جمعیتوں سے نہیں ہے اس کا تعلق دنیا کی تمام قوموں سے ہے ریاستہائے متحدہ یہ چاہتا ہے کہ وہ تمام قومیں چاہے وہ چھوٹی ہوں یا بڑی جنھوں نے جنگ میں دشمن کے خلاف حصّہ لیا وہ امن کی تعمیر میں بھی حصّہ لیں۔

صدیوں تک بڑی بڑی طاقتیں دنیا کو کیمپوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔ انھیں ناکامی ہوئی اور ان کی ناکامی نے سالوں اور قرنوں کو خون آلودہ کردیا۔ اب اس قسم کی کوشش موجودہ دنیا میں اور بھی ناکامیاب ہوگی اس لئے کہ دنیا کی تمام قومیں اب ایک دوسرے سے قریب آگئی ہیں۔

دنیا کے سامنے صرف دو راستے ہیں۔ یا تو دنیا ایک رہے جس میں ہم سب کو فائدہ پہنچیگا یا دنیا مختلف کیمپوں میں تقسیم ہو جائے اور جس میں کسی کو بھی فائدہ نہ پہنچیگا۔

ہندوستان اور تہذیبی اتحاد

از ـــــــــ سیرل موڈک

پانینی نے اس ملک کو "سرزمین اندس" کہہ کر غالباً شاعرانہ ذوق سے کام لیا ہے۔ "اندوستان" کا لفظ نکلا اور بگڑ کر "ہندوستان" ہو گیا۔ اگر یونانی اس ملک کو "دلپستان" کا لقب عطا کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا اس لیے کہ ہندوستان بے شمار نسلوں اور دنیا کی تمام تہذیبوں کا مرکز و گہوارہ ہے۔ ہندوستان کو بجا طور پر دنیا کی قوموں اور نسلوں کا مقام اتصال کہا جا سکتا ہے۔ پانچ معاون دریا کوہستانی علاقوں سے نکلتی ہیں اور دریائے سندھ کی آغوش میں سمٹ جاتی ہیں جیسے پہلے ہی سے اس بات کی آپس میں سازش کر رکھی ہو۔ یہی پانچ دریا سرزمین پنجاب کو سیراب کرتی ہیں اور اسے زرخیز بناتی ہیں۔ شمال میں کوہ ہمالیہ ایک عجیب وقار اور شان کے ساتھ اپنا سر اٹھائے کھڑا ہے اور جنت کی ہواؤں کے مزے لے رہا ہے۔ کبھی کبھی اس کا سر امنڈتے ہوئے بادلوں کی رومانی تاریکیوں میں بھی کھو جاتا ہے۔

ہندوستان ملاپ کی سرزمین ہے یہاں ملاپ کے بعد کبھی جدائی نہیں ہوتی غالباً اسی وجہ سے یونانی [illegible] کے صدمات ہندوستان چھوڑ کے پر بھی نہیں چھوٹے۔

دریائے سندھ اور اس کی معاون ندیوں کی طرح کوئی دس ہزار برس پیشتر [illegible] شمال اور مشرق و مغرب کی طرف سے ہندوستان میں [illegible] ہندوستان کے اپنی تہذیبی اور [illegible] معاشرتی [illegible]

پہلے پارسی اپنا زرتشت مذہب لے کر ہندوستان میں آئے۔ ہندوستان ہی ان تمام مذاہب کا مقام اتصال تھا۔ یہ سلسلہ ماضی ہی میں نہیں جاری رہا بلکہ آج بھی جاری ہے۔ چینی اور برمی، [illegible] برطانوی، امریکی اور دیگر قومیں اور مشرق الہند اور یورپ کے بگڑے اور جنگی مصیبت زدہ اس وقت ہندوستان میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ اس طرح ہندوستان آج کہیں زیادہ گہرے معنوں میں دلپستان کہلانے کا مستحق ہے۔ لیکن یہ کتنی احمقانہ بات ہے کہ ہم اس قابلِ فخر بات پر نالاں و شاکی ہیں!

اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی ملک میں متعدد نسلوں اور تہذیبوں کے یکجا ہو جانے سے بڑے پیچیدہ حالات پیدا ہو جاتے ہیں لیکن اس سے ملک کی نئی اور پنپتی ہوئی نسل کی تہذیبی زندگی بھی بھرپور اور مالامال ہو جاتی ہے۔ تہذیبی اتصال قوموں کے اندر ایک نئی طاقت اور ایک نیا جوشِ حیات پیدا کرتا ہے اور اس سے قومی زندگی میں تنوع پیدا ہوتا ہے۔ اہلِ ہند کی ذہنی صلاحیت ہی کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ نسلی اور تہذیبی ملاپ اور اتحاد سے اُسے نقصان کی بجائے فائدہ پہنچتا ہے۔ ہندوستانیوں میں نئے حالات سے خود کو مطابق اور ہم آہنگ کر لینے کی بہت صلاحیت پائی جاتی ہے۔ ہندوستانی قوم کبھی بھی اُن کی قومی اور نسلی روایات سے بالکل نہیں خوف کھاتا۔ اگر ہندوستانی ذہن کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ دنیا کے ہر اصول کا درس [illegible] کبیر، گرو نانک، شہزادہ دارا شکوہ اور کیشب چندر سین کی تعلیمات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستانی ذہن مذہب کے معاملے میں بھی غیر ملکی اثرات کو قبول کر سکتا ہے [illegible]

ں گرونانک کی زندگی میں ملتا ہے جہاں ان دونوں مذاہب کو پگھلا کر یک ہی دھات میں بدل دیا گیا ہے جس طرح ہندی ایرانی طرز مصوری ور طرز تعمیر میں ہمیں ہندو اور اسلامی تہذیبوں کے اتصال کا جمالیاتی اظہار ملتا ہے اسی طرح سکھ مذہب کو ان دونوں تہذیبوں کے اتصال کا مذہبی اظہار کہا جا سکتا ہے۔ گرونانک کی موت سے متعلق جو کہانی ہے اس میں بھی ہندو مسلم تہذیبی اتحاد کا ایک گہرا مفہوم پوشیدہ ہے گرونانک نے موت کے وقت اپنے جسم پر ایک چادر ڈال لی اور ہونے والے گرو اس کے بعد خدا کے سامنے بندگی کا اظہار کیا اور آخری ہچکی لی۔ گرونانک کے ہندو اور مسلمان پیروکاروں میں جھگڑا شروع ہوا کہ اسے دفن کیا جائے یا جلایا جائے۔ لیکن جب انہوں نے گرو کے جسم پر سے چادر ہٹائی تو جسم تو غائب تھا اور اس کی بجائے پھولوں کے دو گچھے پڑے تھے۔ انہیں پھولوں کو لے کر راوی ندی کے کنارے ہندوؤں نے ایک مندر بنایا اور مسلمانوں نے دفن کر کے مقبرہ تعمیر کیا۔ لیکن قدرت کو یہ بات ناگوار گزری گرونانک کا جس محبت کے دیوتا پر اعتقاد تھا اس کی یہ توہین تھی اور ساتھ ہی اس سرزمین کی بھی جس میں انہوں نے مذہبی اتحاد پیدا کیا تھا۔ یہ دو الگ الگ چیزیں۔ مقبرہ اور مندر۔ اس اتحاد کی توہین کر رہی تھیں "آخر یہ دوئی کیوں؟" راوی کے غصہ آلود ذہن سے نکلا اور وہ ایک ہی ریلے میں مقبرہ اور مندر دونوں کو بہا لے گیا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہذیبی میل جول کے اثرات کا بہترین مذہبی اظہار ہمیں گرونانک کی زندگی اور تعلیمات میں ملتا ہے۔ ہندوستان کی زبانوں، فنون، صنعت و حرفت، طور و طریقہ، رسم و رواج میں بھی اسی قدر ملتے ہیں جس قدر طرز فکر اور خیالات کی دنیا میں۔ مرہٹی اور

خاص نمبر

(۱) اس نمبر میں پاکستان کے مسئلے پر مختلف سیاسی نکتۂ خیال اور ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کے زاویۂ نگاہ سے مفصل اور سیر حاصل بحث و تمحیص کی جائے گی۔

(۲) پاکستان ممکن ہے یا ناممکن، عملی ہے یا غیر عملی؟

اس کا فیصلہ کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں کی روشنی میں پاکستان کی ممکنات پر غور کیا جائے۔ یعنی جغرافیائی، معاشی، صنعتی، زراعتی اور سیاسی حقائق کی روشنی میں۔

زیر نظر نمبر انہیں ابواب اور موضوعات کے تحت پاکستان کے مسئلے سے بحث کرے گا۔

(۳) یہ نمبر موجودہ ہندوستانی سیاست سے متعلق جامع مکمل اور مفصل معلومات سے پُر ہوگا۔

گجراتی، سندھی اور پنجابی اور سب سے زیادہ ہندی فارسی زبان کے حیات بخش اثرات کے تحت آ گئی۔ ایک زبان کا اثر دوسری زبان پر کس طرح پڑتا ہے اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے محض یہ جان لینا کافی نہیں ہے کہ اس زبان کے کتنے الفاظ اس زبان میں ہیں بلکہ تخیل اور فکر کی پیچیدہ دنیا میں اس کے اثرات کو سمجھنے کی ضرورت ہے جب فارسی الفاظ اور محاورے ہندوستان کی زبان میں داخل ہوئے تو اپنے ساتھ ایرانی فکری ڈھانچہ، ایرانی میلان اور ذہنی طرز عمل اور ایرانی تہذیبی قدروں کو بھی ساتھ لیتے آئے اور یہ چیزیں مہاراشٹر، گجرات، سندھ، پنجاب، یو۔ پی، بنگال، مرکزی اور جنوبی ہند میں بسنے والوں کی بول چال، خیال اور زندگی میں بس گئیں۔

نسلی اور فرقہ وارانہ اتحاد قائم کرنے میں زبان کی بڑی اہمیت ہے اس لئے کہ زبان نہ صرف خیالات اور بول چال کو متاثر کرتی ہے۔ بلکہ اپنے جذبات کو حرکت میں لے آنے کی قوت سے انسان کے عمل پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ ہندی ایرانی ادب کو فروغ دینے میں کشمیری پنڈتوں اور صوبجات متحدہ کے کائستھوں نے بڑا حصہ لیا ہے چنانچہ اب ایرانی ادب میں بہت سے الفاظ ہندی نژاد کے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایرانی نژاد کے ہزاروں الفاظ ہندوستان کی ہر زبان میں داخل ہو گئے ہیں۔ اسی لسانی اتحاد سے اردو زبان پیدا ہوئی جسے اتحاد باہم کی حسین تخلیق قرار دیا جا سکتا ہے۔ اردو زبان دراصل ہندو مسلم تہذیب کے ملاپ سے پیدا ہوئی ہے۔ لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ یہی آج مسلم لیگ کے ہاتھوں میں دو جداگانہ قومیت کے نظریے کی اشاعت کا آلۂ کار بنی ہوئی ہے۔

ظاہر ہے کہ اردو ادب فارسی داں مسلمانوں کا اجارہ نہیں ہو

دیا شنکر نسیم جیسے مثنوی نگار، منشی جوالا پرشاد برق جیسے مرثیہ گو اور پنڈت برج نرائن چکبست جیسے ترقی پسند انقلابی شاعر اور منشی درگا سہائے سرور جیسے ماہر فن کے ہوتے ہوئے یقیناً یہ نہیں دعویٰ کیا جا سکتا کہ اردو ادب محض مسلمانوں تک محدود ہے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار مصنف فسانۂ آزاد، الہ شری رام مصنف خمخانۂ جاوید، مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد مصنف جمکدۂ رحمت یہاں بے شمار ہندوؤں میں سے چند کے نام ہیں جنھوں نے اردو ادب کی آرائش و زیبائش میں حصہ لیا ہے۔

اسی طرح ہندی ادب میں بھی رنگینی اور تازگی پیدا کرنے میں مسلمان ادیبوں نے زبردست حصہ لیا ہے۔ امیر خسرو عام فہم ہندی کے پہلے شاعر مانے جاتے ہیں، کتبان، منجھن، عثمان، شیخ نبی، قاسم شاہ اور نور محمد ہندی کے ان معروف شاعروں میں ہیں جنکے ہاتھوں ہندی کی صوفیانہ شاعری پروان چڑھی۔ ہندی شاعری میں کبیر کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے کبیر نے بھگتی تحریک بھی چلائی جس کی بنیاد وحدت الوجود کے نظریے پر قائم ہے۔ رحیم خاں خاناں نے اپنی شاعری میں اپنے مالک اکبر کے دشمن مہارانا پرتاپ کی دلیرانہ تعریف کرکے تمام ہندوؤں کی تعریف و توصیف حاصل کی۔ رس کھان کی وشنو عقیدت سے لبریز شاعری ہندی ادب کی جان ہے۔ ملک محمد جائسی مصنف پدماوتی کا نام چوٹی کے ہندی شاعروں میں گنا جاتا ہے۔ فرقہ وارانہ عصبیت کے اس دور میں بھی جوش ملیح آبادی جیسے عظیم المرتبت قومی شاعر اور ظہور بخش جیسے ہندی تنقید نگار کے نام ہندی اور اسانی اتحاد کے وجود کو ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں۔

ہندی اور اردو ہی ہندوستان کی ایسی زبانیں ہیں جنھیں بآسانی سمجھا بولا جا سکتا ہے۔ ہندی کا طالب علم اردو کے اثرات سے بچ نہیں سکتا

اور نہ اردو کا طالبعلم ہندی نثر و نظم کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ فرقہ وارانہ رنجش کے اس زمانے میں بھی یہ بات عام ہے کہ ہندو طلباء گفتگو اور تقریروں میں اردو اشعار پڑھتے ہیں اور مسلمان طلباء فرقہ وارانہ جذبات کو بالائے طاق رکھکر چکبست اور نسیم کے اشعار کا حوالہ دیتے ہیں۔ نسلی اور فرقہ وارانہ اتحاد اور ہم آہنگی قائم کرنے میں ادب سے زیادہ معاون و مددگار اور کوئی چیز نہیں اس لئے کہ ادب براہ راست طور پر ذہن اور جذبات کو متاثر کرتا ہے۔ نسل، اور ذات اور عقیدہ ادب کے میدانوں میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ غالباً اسی سبب سے اقبال کو جب اپنے زمانے کے سیاسی جھگڑوں کو شاعری میں پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو انھیں اردو چھوڑ کر فارسی کی طرف جانا پڑا۔

التماس

"نئی زندگی" میں جتنے مضامین چھپتے ہیں ان کا حق کاپی رائٹ بحق نئی زندگی محفوظ ہے اسلئے کوئی صاحب انکے مضامین بغیر پروپرائٹر (سید انیس الرحمٰن) کی اجازت کے کتابی شکل میں یا کسی اور طرح نہ چھاپیں، ورنہ جوابدہ ہونا پڑے گا، جو اخبار یا رسائل انکے مضامین نقل کریں وہ "نئی زندگی" الہ آباد کا حوالہ ضرور دیں۔

چندہ کی رقم جمع ہو جانے کے بعد واپس نہیں کی جا سکتی ہے۔

بعض حضرات وی۔ پی طلب فرما کر واپس کر دیا کرتے ہیں اور دفتر کو محصولڈاک کی زیرباری اٹھانی پڑتی ہے لہذا مجبوراً ہم نے وی۔ پی کے ذریعے پرچہ بھیجنا بند کر دیا ہے، چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجیں وی۔ پی آرڈر کی تعمیل اس شرط پر البتہ ہو سکتی ہے کہ ہر محصولڈاک دفتر کو وصول ہو جایا کرے۔

جواب طلب امور کیلئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ روانہ فرمائیں ورنہ دفتر تعمیل سے معذور سمجھا جائے۔

نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیں

"منیجر"

مسلم حکمرانوں نے ہندوستان کی زبان کی ترقی اور فروغ میں جو حصہ لیا اُسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اکبر اس کی سب سے روشن مثال ہے، ودیاپتی کی شاعری میں نصیر شاہ اور سلطان غیاث الدین کی تعریف و توصیف ملتی ہے جنھوں نے دیسی زبانوں کی ہر طرح ہمت افزائی کی۔ نصیر شاہ نے اپنے دربار میں پہلی بار مہابھارت کا بنگالی ترجمہ کرانا شروع کیا۔ مسلمان حکمرانوں نے ہندوستان کا رسم الخط اور زبانوں کی ترقی میں جو حصہ لیا اس کے مقابلے میں دیکھا جائے تو ہندو حکمرانوں نے فارسی اور اردو رسم الخط کی بالکل نہیں ہمت افزائی کی۔

شہاب الدین، نظام شاہ، شیر شاہ، شاہجہاں، مظفر شاہ، ملا شاہ اُن مسلمان حکمرانوں میں سے ہیں جنھوں نے سنسکرت ادب کی سرپرستی کی۔ اکبر کے نام ایسے حکمرانوں میں روشن ترین مانا جاتا ہے۔ اگر واقعی اس جیسے کچھ اور بادشاہ پیدا ہوتے تو ہندوستانی قوم اور ہندوستانی تہذیب زندگی زوال پذیر ہونے سے بچ جاتی۔ جگن ناتھ، ہری [illegible]

دھن، امرت وت اور دیگر ہندو شعرا نے دربار مغلیہ سے انعام و اکرام پائے اور ہر طرح اُن کی ہمت افزائی کی گئی۔ تانسین خاں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ہندی میں شاید کہتے ہی تھے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے کے بعد سمرقند اور ہرات کی مصوری نے ابتدا کی مصوری سے مل کر ایک نیا طرز پیدا کیا۔ ہندو مصوروں نے بہت جلد ایرانی اثرات قبول کیے اور مسلم مصوروں نے ہندو آرٹ کی خصوصیات کو اپنانے کی کوشش کی۔ آئینہ اکبری میں متعدد ایسے ہندو فن کاروں کے نام موجود ہیں جنھیں شہرت اور مہارت کی بنا پر دربار اکبری میں بلایا گیا تھا۔ دسونت، بساون، مکند، جگن ناتھ، کیشولال، ہری بنس اور مادھو کا شمار بہترین فن کاروں میں ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان مصوروں کے فن میں مسلم اور ہندو اثرات کا ملاپ رہا ہوگا تبھی اکبر جیسے بہادر بادشاہ کے دربار میں بلائے گئے۔ خدا بخش خاں کی لائبریری (پٹنہ) میں جو مسودہ محفوظ ہے اس میں گوالیار، گجرات اور کشمیر کے ہندو مصوروں کے نام موجود ہیں، مثلاً تلسی، سرجن، [illegible]، سورج، شنکر اور ہزاروں ان مصوروں نے تشریحی مصوری (ILLUSTRATION) میں مہارت حاصل کی تھی جو ایران کی پیداوار تھی اور ہندوستان کے لئے بالکل نئی۔ شاہجہاں کے عہد حکومت میں مسلم فن کار۔ نادر سمرقندی، میر ہاشم، فقیر اللہ خاں اپنے ہم عصر ہندو مصوروں کلیان داس، منوہر، رائے انوپ اور دیگر مصوروں سے کم نہ تھے۔ مغل آرٹ نے ہندو آرٹ کو مندر کے دھیمے دھیمے روشن دینی ماحول سے نکال کر مغل دربار کی شان و شوکت سے لبریز کھلی فضا میں لا کھڑا کیا۔ راجپوت اسکول کی مصوری سے لے کر اس وقت تک کی مصوری کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ محسوس ہوگا کہ اس پورے عرصے میں مغل آرٹ کے حیات بخش اور آزاد کن اثرات مسلسل اپنا کام کرتے رہے ہیں۔ ہندو آرٹ کے اثرات کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلم مصوری جس میں پہلے محض آرائش و زیبائش ہوتی تھی ہندو آرٹ کی جذباتی اور حیاتی روح [illegible] سے معمور ہو گئی اور اس میں زندگی کے جیتے جاگتے مناظر نظر آنے لگے۔ مغل اسکول کی مصوری سے لے کر موجودہ مسلم مصوروں تک کے کارناموں کو دیکھا جائے تو اُن میں مستقل طور پر ہندو مصوری کا اثر نظر آتا ہے۔

موسیقی کے میدان میں بھی اسی طرح ہمیں ہندو مسلم تہذیبی اتحاد کا نقشہ نظر آتا ہے۔ مسلمان پہلی بار جب ہندوستان میں مستقل طور پر بسنے آئے تو اپنے ساتھ موسیقی کا ذوق بھی ساتھ لائے۔ یہ ذوق اس تشنگی کی وجہ سے اور بھی تیز ہو گیا ہے جو فنِ لطیف کی ممانعت میں اسلامی قوانین کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی، انھوں نے ہندوستان کی فضا کو موسیقی کی جھنکاروں سے لبریز پایا چنانچہ انھوں نے جی بھر کر اپنی پیاس بجھائی۔ صوفیوں نے قوالی کو جنم دیا۔ پھر غزل گائی جانے لگی۔ مغل بادشاہوں نے ہندوستانی موسیقی کو پروان چڑھایا اور اُسے طبقہ امرا میں فیشن کے طور پر رائج کر دیا۔ ہر ہندو یا مسلم جشن یا تہوار کے موقعے پہ ہندی آلات موسیقی بجائے جانے لگے۔ کچھ ہندی آلات موسیقی میں تبدیلی کر کے اُن کے ایرانی نام رکھے گئے۔ دلربا، طاؤس، سرود، رباب۔

مسلمان بادشاہوں کی نگرانی اور سرپرستی میں ہندی موسیقی کی ترقی چمک اٹھی، اس سے پہلے وہ اسباب کی بنا پہ یہ فن زوال کی حالت میں پڑا تھا۔ ایک تو نا قدری کے سبب موسیقاروں کی مالی حالت ناگفتہ بہ تھی دوسرے ہندی موسیقی پر مذہبیت سوار تھی۔ مسلمان موسیقاروں نے بہت جلد ہندی موسیقی میں مہارت حاصل کر کے ہندوؤں میں مقبولیت حاصل کر لی۔ چاہے ہندو مہا سبھا والے اسکو نہ تسلیم کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ مسلمان موسیقاروں نے سب سے زیادہ "[illegible]" "بھجن" اور [illegible] میں مہارت حاصل کی [illegible] قوالی

کی ہیں کی نہیں تھی

پنڈت بھاتکھنڈے جو ہندوستانی موسیقی کے مجدد مانے جاتے ہیں، انھوں نے ساری تربیت رام پور کے وزیر خاں سے اور محمد علی جے پور مقصود (خیال) کے ماہر سے حاصل کی۔ 'خیال' کے جو چار طرز رائج ہیں ان میں سے تین مسلمان موسیقاروں کے نام سے منسوب ہیں عبدالکریم خاں بمبئی۔ فیاض خاں آگرہ، غلام علی پنجاب اور چوتھا طرز راجہ بھایا اور شنکر پنڈت گوالیاری کے نام سے منسوب ہیں اس وقت جو ہندوستانی موسیقی فلموں کے ذریعے ملک بھر میں مقبول ہو رہی ہے وہ بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔

ہندوستان کے فن تعمیر میں بھی اسی قسم کی تہذیبی ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ مسلمانوں کے فن تعمیر میں انتہائی سادگی تھی جو دراصل نتیجہ تھی اسلامی ملکوں کے جغرافیائی حالات کا، سادگی بھی اسلام کے سیدھے سادے اور سخت اصولوں کی تخلیق قرار دی جا سکتی ہے۔

اس کے برخلاف ہندو فن تعمیر میں باہر سے بھڑکیلا پن اور اندر سے تخیلی ابہام پایا جاتا تھا۔ اول الذکر خصوصیت ہندوستان کے گوناگوں اور رنگ برنگ کے قدرتی مناظر کی پیداوار تھی اور موخرالذکر ہندو مذہب کے اثر سے وجود میں آئی تھی۔ لیکن ہندو اور مسلم طرز تعمیر نے مل کر ایک تیسرے طرز کی تخلیق کی جس میں ہوشیاری اور کاریگری، پیچیدگی اور آرائش و تفصیل تو ہندو فن تعمیر نے پیدا کی اور حسین ساخت، شاندار محرابیں اور مینار یں، سادی دیواریں اور اندرونی کشادگی مسلم فن تعمیر نے بخشی۔

> اگر آپ "مخلص نمبر" مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی پانچ روپیہ سالانہ چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما کر مستقل خریدار بن جائیے

غرض ہندو اور مسلم تہذیبوں نے مل کر ہر میدان میں اتصال اور ہم آہنگی کے ایسے نمونے پیدا کر دیئے جو ہماری قومی تہذیب کا قابل قدر سرمایہ ہیں اور جن کی بنیادوں پر مستقبل میں ایک شاندار اور عظیم الشان تہذیب کی تعمیر کی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ غیر ملکی حکمراں ہیں اس کا موقع بھی دیں اور ملک فرقہ وارانہ تصادم کی موجودہ ناخوشگوار فضا سے پاک ہو جائے۔

برطانیہ پر ہندوستان کا قرضہ

متذکرہ بالا موضوع موجودہ سیاسیات اور معاشیات کا ایک اہم مسئلہ ہے اور اس سے بڑی حد تک ہندوستان کی آئندہ صنعتی ترقی کا راز وابستہ ہے۔ لیکن عام طور پر اردو داں حلقوں میں اس مسئلے پر واضح سوجھ بوجھ کی کمی پائی جاتی ہے۔ زیر نظر مضمون میں آسان اور سادہ انداز میں برطانیہ پر ہندوستان کے قرضے کی ابتدا، تاریخ اور نوعیت سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے امید ہے کہ وہ حضرات اس مضمون سے فائدہ اٹھائیں گے جو انگریزی میں اس مسئلے پر مشکل تصانیف اور مقالوں کا مطالعہ نہیں کر سکتے۔ اس مضمون کی تیاری میں مشہور ماہر معاشیات۔ بی۔ ٹی رندیوے کی معرکتہ الآرا تصنیف "انڈیاز اسٹرلنگ بیلینسز" سے کافی مدد لی گئی ہے۔

ـــــــــــــ ادارہ

سب سے پہلے تو ہمارے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ برطانیہ پر ہندوستان کا اتنا قرضہ کیوں کر ہو گیا۔ سادہ اور آسان طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ جنگ چھڑنے کے بعد ہندوستان نے برطانیہ کو جتنے مال و اسباب اور سامان جنگ دئے اور ہندوستانیوں نے جنگی کاموں میں جس قدر جسمانی و دماغی محنت صرف کی اس کی ابھی تک برطانیہ نے اپنے وعدوں کے باوجود قیمت نہیں ادا کی ہے۔ اسی کو "برطانیہ پر ہندوستان کا قرضہ" کہا جاتا ہے۔ اس قرضے کی مجموعی رقم کوئی چودہ ارب روپئے ہیں۔ یہ رقم ہندوستان کی سالانہ آمدنی کا پینتالیس فی صدی حصہ ہے۔ اس رقم کے بے حد عظیم ہونے کا اندازہ لگانے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ ہندوستان میں جنگ سے پہلے صنعتوں کی ترقی میں (ریلوے اور دیگر ذرائع نقل و حرکت کو چھوڑ کر) جس قدر سرمایہ لگایا گیا تھا اُس کی یہ دوگنی ہوتی ہے۔ یعنی جنگ سے پہلے ہندوستانی صنعتوں میں سات ارب روپے لگائے گئے تھے اور اس وقت برطانیہ پر ہندوستان کا قرضہ چودہ ارب روپئے ہیں۔ اگر برطانیہ ہندوستان کے ساتھ ایمانداری برتتے ہوئے یہ قرضہ ادا کر دے تو اس سے ہندوستانی صنعت کتنی عظیم الشان ترقی کر سکتی ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

اس رقم کے عظیم ہونے کا اندازہ لگانے کے لئے یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ یہ رقم ہماری پوری قومی آمدنی کے نصف اور پوری قوم کی چھ ماہ کی محنت کے برابر ہے۔ لوہے، اسٹیل، سیمنٹ، شکر اور دیگر صنعتوں میں اس وقت ملک ہند میں جتنا سرمایہ لگا ہوا ہے اس کی یہ رقم دوگنی ہے۔ اگر یہ رقم برطانیہ ہندوستان کو ادا کر دے تو اس سے ہندوستان میں فیکٹریوں کی تعداد دو سو فی صدی بڑھ جائے۔ اور جنگ سے پہلے جتنے لوگ باکار تھے اُن سے دوگنے لوگ مزید طور پر باکار ہو جائیں۔

جب چوتھی ستمبر ۱۹۳۹ء میں برطانیہ نے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تو اس کے سامنے یہ مسئلہ پیش آیا کہ وہ ہندوستان کو کس طرح جنگ میں شامل کر دے۔ ہندوستان کی طرف سے جنگ میں شمولیت کا اعلان کر دینا تو حکومت ہند کے لئے آسان تھا لیکن اصل مسئلہ یہ تھا کہ ہندوستان کی خاص خاص سیاسی جماعتوں سے سمجھوتہ کئے بغیر ہندوستان کے سر پر جنگ کے اخراجات کس طرح مسلط کئے جائیں۔ اسی مسئلے کو حل کرنے کے لئے نومبر ۱۹۳۹ء میں برطانیہ نے حکومت ہند سے ایک مالی سمجھوتہ کیا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ ہندوستان کے تحفظ کے لئے جتنی بری فوج تیار ہوگی وہ سب ہندوستان ہی کے ذرائع اور وسائل سے اور اُن کے تمام تر اخراجات بھی ہندوستان

ہی برداشت کرے گا۔ لیکن جب اُس فوج کو برطانیہ ہندوستان سے باہر لے جانا چاہے گی تو اس کی تیاری میں ہندوستان نے جتنے اخراجات برداشت کئے ہیں وہ سب اُسے برطانیہ سے واپس مل جائینگے۔ اسی معاہدے کی رُو سے یہ بھی طے ہوا کہ ہندوستان میں برّی افواج کی تیاری کے سلسلے میں جو کچھ سامان باہر سے منگوانے کی ضرورت ہوگی وہ سب برطانیہ مفت سپلائی کرے گی۔

اس معاہدہ کا سیاسی مفہوم اور مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کو کسی طرح خاموش رکھا جائے اور اُن سے کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کی ضرورت نہ پیش آئے۔ اگر حکومت برطانیہ یہ آسان اور پُرفریب طریقہ نہ اختیار کرکے ملک میں ٹیکس عائد کرتی۔ اُس سے بے چینی پیدا ہوتی۔ چنانچہ ان تمام مصیبتوں سے بچنے کے لئے یہ معاہدہ کیا اس سے یہ ہوا کہ برطانیہ کو سامان جنگ کے عوض میں ہندوستان سے فوجیں ملتی رہیں اور ملک میں اس کا سیاسی اقتدار بھی برقرار رہا۔

لیکن جن بین الاقوامی حالات کے تحت یہ معاہدہ عمل میں آیا تھا وہ بہت تیزی کے ساتھ بدلنے لگے۔ یورپ کی جنگ نے بہت جلد عالمگیر جنگ کی شکل اختیار کرلی۔ اور برطانیہ نے فوراً یہ محسوس کیا کہ فتح حاصل کرنے کے لئے دس گنی رقم، دس گنے سامان اور آدمیوں کو لگانے کی ضرورت ہے۔ یہ معاہدہ برطانیہ نے اس خیال کے تحت کیا تھا کہ ہندوستانی فوج کی مدد سے اور برطانوی خزانے کی تھوڑی سی رقم خرچ کرکے آسانی سے سلطنت کا تحفظ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اب برطانوی مدبرین کو یہ محسوس ہونے لگا کہ سلطنت کا تحفظ اور نوآبادیات و محکوم ممالک پر قبضہ و اقتدار برقرار رکھنے کی قیمت اتنی کم نہیں ہے دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء میں جاپان کے اعلان جنگ کے بعد ہندوستان خاص طور پر جنگی مرکز بن گیا اور برطانوی اور ہندوستانی فوجیں ہندوستان میں داخل ہونے لگیں تاکہ ہندوستان کی سرحدوں کی حفاظت کی جاسکے۔ ان تمام باتوں کا مطلب یہ تھا کہ جنگ کے اخراجات اربوں بڑھ گئے۔ نومبر سنہ ۱۹۳۹ء کے معاہدے کی رُو سے ہندوستان میں مقیم برطانوی افواج کے تمام اخراجات ہندوستان ہی کو برداشت کرنے تھے اور برطانیہ کو صرف ان کی قیمت ادا کرنی تھی مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے اُس زمانے کے تیزی سے بڑھتے ہوئے جنگی اخراجات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سال	روپے (لگ بھگ)
سنہ ۱۹۴۱-۴۲ء	۱۹۴۰۰۰۰۰۰۰
سنہ ۱۹۴۳-۴۴ء	۳۹۲۷۰۰۰۰۰۰
سنہ ۱۹۴۵-۴۶ء	۴۴۰۰۰۰۰۰۰۰

سنہ ۱۹۳۹ء کے بعد سے اس وقت تک کے مجموعی اخراجات اٹھارہ ارب روپئے ہوتے ہیں۔

ہندوستان نے برطانیہ کو جتنے آدمی اور جتنے سامان دئے اُن کے عوض میں اُسے کچھ بھی نہیں ملا۔ اسی طرح برطانیہ نے صرف یہ کہ سنہ ۱۹۳۹ء کے معاہدے کی پابندی نہ کی بلکہ اور اوپر سے برطانوی فوجوں کے اخراجات بھی اُس کے سر پر لاد دیئے۔

حکومت ہند نے حکومت برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کو دھوکہ دینے کے لئے ایک نیا طریقہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ حکومت ہند نے اس بات کا ذمہ لیا کہ برطانیہ پر ہندوستان کی طرف سے جو اخراجات عائد ہوتے ہیں انھیں وہ روپیہ کی شکل میں ادا کرے گی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان کے تیار کردہ سامان ہندوستان ہی کے روپئے سے خریدے جائیں اور برطانیہ کو دیئے جائیں۔ برطانیہ نے وعدہ کیا کہ وہ ہندوستان سے حاصل کئے ہوئے تمام سامان جنگ کی قیمت خود اپنے وہاں کے سکے یعنی اسٹرلنگ کی شکل میں ادا کرے گی۔ یہ اسٹرلنگ لندن میں جمع کردی گئی اور اسے ریزرو بینک کے سپرد کردیا گیا۔ حکومت ہند کو یہ اختیار ملا کہ وہ اس جمع شدہ اسٹرلنگ کے مطابق روپیہ بنائے اور اُس سے ہندوستان سے جنگی خدمات اور سامان خریدے۔ اس جمع شدہ اسٹرلنگ کے خرچ کرنے کا کسی حکومت یا فرد کو اختیار نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اس رقم سے جو سراسر ہندوستان ہی کی ہوتی ہے ہندوستان بھی دوسرے ملکوں یا برطانیہ سے مال و اسباب نہیں خرید سکتا اور نہ ملکی صنعت کو ترقی دینے کے لئے مشین خرید سکتا ہے۔ غرض یہ رقم جو ریزرو بینک میں ہندوستان کے نام سے جمع ہے اس کی اصل حقیقت اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں کہ وہ محض وعدہ ہی وعدہ ہے اور اُسے ہندوستان ذرہ برابر بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

لیکن ہندوستان کے لوٹنے کے سلسلے میں برطانیہ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ امریکہ پر ہندوستان کے جو پینتالیس کروڑ روپئے قرض تھے وہ بھی ہضم کرلئے اور ہندوستان کو اس روپیہ سے امریکہ سے صنعتی مشین

خریدنے سے روک دیا۔

غرض ہندوستان نے برطانیہ کو جتنے جنگی سامان، فوج اور جنگی خدمات دیں اُن کے عوض میں ہندوستان کو کاغذی نوٹوں کے علاوہ اور کچھ نہ ملا۔

اس بے ایمانی اور لوٹ کے جو خطرناک نتائج پیدا ہوئے اس کا سارا خسارہ ہندوستان کے غریب، مفلس اور بھوکے ہوئے عوام کو برداشت کرنا پڑا وہ یوں کہ جب حکومت ہند نے ہندوستان کی جنگی خدمات اور سامان کی قیمت ادا کرنے کے لئے بہت بڑی تعداد میں نوٹ چھاپنے شروع کئے تو اُس سے اشیاء کی قیمت کا دفعتاً بڑھ جانا یقینی ہوگیا۔ اگست ۱۹۳۹ء کے بعد سے نوٹوں کی تعداد نوارب بڑھ گئی۔ نوٹوں کی یہ تعداد جنگ سے پہلے کے مقابلے میں چھ گنی زیادہ ہے۔ جاپان کے اعلان جنگ کے بعد حکومت ہند نے اور بھی زیادہ تعداد میں نوٹ چھاپنے شروع کئے مندرجہ اعداد و شمار سے نوٹوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سال	ایک روپئے والے نوٹوں کی تعداد
اگست ۱۹۳۹ء	۱۷۸۸۹۰۰۰۰۰
۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۰ء	۲۰۸۸۶۰۰۰۰۰
۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۱ء	۲۲۱۶۲۰۰۰۰۰۰
۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۲ء	۳۰۸۴۶۰۰۰۰۰۰
۱۹۴۲ء	۴۷۶۹۱۰۰۰۰۰۰
۱۹۴۳ء	۷۴۹۷۶۰۰۰۰۰۰
۱۹۴۴ء	۹۲۷۸۶۰۰۰۰۰۰
دسمبر ۱۹۴۴ء	۹۸۹۸۲۰۰۰۰۰۰
۱۶ مارچ ۱۹۴۵ء	۱۰۷۹۲۱۰۰۰۰۰۰

اتنے کاغذی نوٹوں کے بدلے ہندوستان نے اپنی تمام جنگی خدمات، جنگی سامان اور فوجیں برطانیہ کو دے دیں۔ اس سے زیادہ بے ایمانی اور کیا ہوسکتی ہے۔

اتنے زیادہ نوٹوں کے چھپنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ روپئے کی قیمت گر گئی اور ہر چیز کی قیمت کئی گنی بڑھ گئی۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں روپئے کی قیمت پہلے کے مقابلہ میں ۷۵ فی صدی رہ گئی اور سنہ [illegible] میں صرف چالیس فی صدی۔

اشیاء کی گرانی اور روپئے کی قیمت کے گھٹنے سے سب سے زیادہ مصیبت نچلے متوسط طبقے، کلرکوں، مزدوروں، چھوٹے چھوٹے کسانوں کھیت مزدوروں، استادوں اور ہنرمندوں پر نازل ہوئی اور برطانیہ کی دھوکہ بازی اور بے ایمانی کے پیدا کردہ نتائج کا سب سے بڑا بوجھ انھیں کو برداشت کرنا پڑا۔ ملک میں غربت، قحط اور موت چھا گئی دوسری طرف نفع خوربیوں کو موقع ملا۔ انھیں اشیاء کی قیمت کے گھٹنے کا ڈر تو تھا نہیں چنانچہ انھوں نے جی کھول کر مہنگے داموں پر اشیاء فروخت کرنے شروع کئے۔ بنگال میں ۳۵ لاکھ آدمی بھوک سے مرگئے سارے ملک میں معاشی بدحالی پھیل گئی۔ ہندوستان کی تاریخ میں اتنے زبردست پیمانے پر غربت اور مفلسی کبھی نہیں نظر آئی تھی۔

لیکن برطانیہ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایسی بدحالی اور قحط کے زمانے میں جب کہ ہندوستان میں لوگ بھوکوں مر رہے تھے اُس نے زبردستی ہندوستان سے اپنے پچھلے قرضے وصول کئے۔ جنگ سے پہلے ہندوستان برطانیہ کے ۳۰ کروڑ اسٹرلنگ (برطانوی سکہ) کا مقروض تھا۔ برطانیہ نے ہندوستان کی حالت کی ذرہ برابر بھی پرواہ کئے بغیر ایک ظالم اور بے رحم یہودی کی طرح یہ قرضہ وصول کرلیا اور وہ یوں کہ اُتنی قیمت کے سامان زبردستی ہندوستان سے لے لئے۔ اس کی مثال ویسی ہی ہے جیسے کوئی بھوک سے مر رہا ہو اور بے رحم مہاجن اُس سے اپنے قرض کی وصولی میں اُس کے گھر کے بچے کھچے سامان اُٹھائے جائے۔

سوویت روس کی عورتیں

از قلم :———— حمیدہ نقوی

سوویت روس کی عورتوں میں سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ وہ آزاد ہیں اور انھیں زندگی کی مختلف سہولتیں اور آسانیاں فراہم ہیں اس قسم کی آزادی عورتوں کو ابتدائی اشتراکی دور کے علاوہ کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی جرمن فاشسٹ حملہ آوروں کو شکست فاش دینے میں روس کی عورتوں کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے جس بہادری عزم اور استقلال سے روسی جوانمرد میدان جنگ میں لڑے اسی جوش اور مستعدی سے انکی عورتوں نے نہ صرف یہ کہ عقب کو پوری طرح سنبھالے رکھا بلکہ محاذ پر بھی گئیں چھاپہ مار دستوں میں پیش پیش رہیں اور ہر قسم کی جنگی خدمت سر انجام دی۔

ایسی خونریز جنگ میں اتنا بڑا اور اہم حصہ انھوں نے کس طرح ادا کیا اس کا اصل راز انکی آزادی میں پوشیدہ ہے اور اس خاص قسم کی نئی پوزیشن میں جو انھیں اب حاصل ہے۔ لینن گراڈ کی بہادر عورتوں نے اپنے بیان میں کہا کہ ہم اس آزاد زندگی کے علاوہ کسی قسم کی زندگی قبول نہیں کر سکتے اور اس زندگی و آزادی کے لئے ہم اپنے ملک اور اپنے وطن کے ممنون ہیں اسکی خاطر ہم ہر قسم کی تکلیف اور صعوبت برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں" ان الفاظ میں لاکھوں محب وطن سوویت عورتوں کی صدا گونجتی ہے جو اپنے ملک و نظام کے لئے کسی قسم کی قربانی کرنے سے بھی ذرا دریغ نہیں کرتیں۔

یہ آزادی جسکی سوویت عورت اتنی قدر کرتی ہے اور جو سوویت نظام کا ایک جزو ہے ایکدن میں نہیں آئی۔ سوویت آئین کے تحت جتنی خوشگوار آزادی عورت کو حاصل ہے زار کے زمانے میں اسیقدر وہ سماجی بندشوں کے اندر جکڑی ہوئی تھی اور اس کی حالت شرمناک حد تک خراب تھی تعلیم تو تقریباً ختم تھی شادی کے بعد مالی آزادی کی کوئی گنجائش نہ تھی مرد عورتوں کی تعداد دن بدن زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ ہفتہ میں وہ ساٹھ گھنٹہ کام کرتیں مگر معاوضہ اسقدر کم ہوتا تھا کہ دو وقت کے کھانے کیلئے بھی بمشکل تمام گنجائش نکلتی تھی۔ انکے کپڑے، جھونپڑے اور بچے گندے اور بدبودار ہوتے چھوٹے چھوٹے کمروں میں پورا پورا خاندان رہتا تھا بچوں کی باقاعدہ پرورش تو بہت بڑی چیز تھی۔ مشرقی روس کی حالت اس سے بھی بدتر تھی اسلامی صوبجات کی عورتوں کی حالت تو بالکل ہی ناقابل بیان تھی۔ اسٹالین نے کہا ہے کہ عورتوں کی گھریلو زندگی میں انکو شادی سے قبل باپ کی اور شادی کے بعد شوہر کی لونڈی بننا پڑتا۔ ان کی حالت سنگین کی تھی وہ مردوں کی خاطر محنت اور مشقت کرتے کرتے مر جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ محض جبر کا تختۂ مشق بنے رہنے کے لئے پیدا کی گئیں ہیں۔ آٹھ نو سے لے کر دس گیارہ سال کی عمر کے اندر ہی اندر ان کو کسی ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا جو معاوضے میں سب سے زیادہ مال اسباب والدین کو دے سکتا تھا یہاں کا گھر اسکا دائمی قیدخانہ ہوتا جہاں اُسے سخت محنت کے علاوہ شوہر اور تمام دیگر لوگوں کی مار پیٹ اور گالی کوسنے برداشت کرنے پڑتے غلامی اسکی عمر بھر کی ساتھی تھی۔ غلاظت میں انکی پرورش ہوتی رسم و رواج شکوک و اوہام ان کا مذہب تھا۔ جانوروں کی زندگی اور ان کی زندگی میں مشکل ہی سے کوئی فرق تھا۔

یہ تھی ۱۹۱۷ء میں اور اس سے پہلے زار کے عہد کی روس کی حالت اس کے بعد سرخ انقلاب آیا۔ عورتوں نے نہ صرف اس کا گرمجوشی سے استقبال کیا بلکہ خود بھی جدوجہد میں پیش پیش رہیں انھوں نے محاذ پر پہونچ کر جنگ انقلاب میں حصہ لیا۔

اس جانبازی کا لازمی نتیجہ تھا کہ سوویت روس میں جب نئے قوانین بنے تو عورتوں کی بہبودی کو بھی اتنی ہی اہمیت دی گئی جسقدر دیگر باشندگان ملک کی خیر و فلاح کو مدنظر رکھا گیا تھا۔

ہر عورت کو مردوں کے برابر حقوق ملے سوویت حکومت نے نہ

صرف سیاسی مساوات عطا کی بلکہ مکمل اقتصادی مساوات بھی عورتوں کی تنخواہیں مردوں کے برابر ہونے لگیں۔ لینن نے کہا تھا کہ ہر باورچن کو حکومت کا نظم و نسق سیکھنا چاہیئے۔ چنانچہ سویت جمہوریتوں نے اس چیز کی انتہائی کوشش کی اور پست ترین عورتیں بھی سیاسی زندگی میں کھنچ آئیں۔ حکومت کے مختلف شعبوں میں فیکٹریوں، پنچایتی کھیتوں وغیرہ میں عورتوں کو داخل کرکے انھیں ہر قسم کے کام کی مشق کرائی جانے لگی۔ عورتوں کو زندگی میں پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ وہ بھی سوسائٹی کی ہر اعتبار سے ایک ذمہ دار رکن ہیں۔ چنانچہ مقامی سویتوں سے لیکر مرکزی سویت اعلیٰ تک میں عورتیں نمائندہ بن کر جانے لگیں مقامی سویتیں بھی عورتوں کی ترقی میں ہر طرح سے ہاتھ بٹاتی رہیں۔

دیہاتوں میں بھی انقلاب نے ایک نئے طرز زندگی کی داغ بیل ڈالی اور سینکڑوں سال سے خوابیدہ عوامی قوتوں کو بیدار کیا نیک طینت راستباز اور محنتی لڑکیوں نے ملکی جد و جہد اور سویت کی تعمیر میں پرجوش حصہ لے کر پہلی مرتبہ معاشی کاموں میں قدم اٹھایا۔ پبلک کے انتظامات میں بھی عورتوں نے کافی اہم حصہ لیا۔ پنچایتی کاشتوں میں برابر کام کرنا شروع کیا دیا انھیں مردوں کے برابر تنخواہیں ملتی تھیں گنے کی کاشت میں ایک خاتون نے ایسی چیز ایجاد کی جسے امریکن کاشتکار یا روس کے مرد بھی نہیں ایجاد کر سکے۔ اس کے علاوہ بھی عورتوں نے بہت سے نئے نئے ریکارڈ قائم کئے ان خدمات کے عوض میں انھیں خطابات اور تحائف عطا کئے گئے۔

اشتراکی نظام کی اقتصادی تعمیر میں عورتیں مساوی طور پر حصہ لیتی ہیں لینن نے کہا تھا کہ سویت حکومت نے جس کام کی ابتدا کی ہے اسے پایۂ تکمیل تک پہونچانے میں ضروری ہے کہ روس کے ہر حصے سے سیکڑوں کی بجائے ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں عورتیں بھی حصہ لیں چنانچہ کل محنت کش آبادی میں سے چالیس فیصدی اور صنعتی کام کرنے والوں میں ... فیصدی عورتیں تھیں طبی اور تعلیمی شعبوں میں عورتوں کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے محنت مزدوری کی حالت سویت یونین میں عام طور سے بہت اچھی ہے ہر سال مزدوروں کو ۱۵ دن کی چھٹی اور خاص

حالتوں میں ایک مہینہ کی فرصت مع تنخواہ کے ملتی ہے بیماری یا کسی اور حادثے کی وجہ سے جو غیر حاضری ہوتی ہے اسمیں سماجی فنڈ سے روپیہ ملتا ہے مزدور عورتوں کو بھی مفت ہسپتال، صحت گاہوں اور تفریح گاہوں سے مستفید ہونے کا حق ہے علاوہ ازیں سویت یونین میں بچوں کی پرورش و پرداخت اور تربیت کا خاص طور پر خیال کیا جاتا ہے اسلئے کہ بچوں ہی پر آنے والی نسلوں کا دار و مدار ہے۔ تمام مزدور عورتوں کو زمانۂ زچگی اور اسکے بعد دو ماہ کی چھٹی معہ تنخواہ کے دیجاتی ہے۔ شیر خوار بچوں کی ماؤں کو ہر تیسرے گھنٹے کے بعد آدھ گھنٹے کی چھٹی دودھ پلانے کی غرض سے ملتی ہے حاملہ عورتوں کو وہاں برطرف نہیں کیا جاتا بلکہ ان کا کام ہلکا کر دیا جاتا ہے۔

عورتوں کے لئے ہر قسم کے پیشے کے دروازے کھلے ہیں صلاحیت رکھنے والی عورتیں اسٹیشن ماسٹر، انجینیر، فیکٹری ڈائرکٹر ہو سکتی ہیں تحریک استحاف جو ۱۹۳۵ میں شروع ہوئی اشتراکی نظام کے تحت کا نظریہ عملی طور سے واضح کر دیا عورتیں اس میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہیں دینودی گرلیا کو مثال کے طور پر لیجئے جس نے ۱۲۷ کرگھے ایک ساتھ چلا کر امریکہ کا ۵۰ فیصدی سے زیادہ سے ریکارڈ توڑ دیا پھر کچھ عرصے کے بعد ۲۸۴ کرگھے ساتھ چلا کر سویت یونین کا ریکارڈ قائم کیا۔

اشتراکی نظام نے عورتوں کو نہ صرف سیاسی اور شہری حقوق دیئے بلکہ انھیں تعلیمی اور تہذیبی اداروں میں ترقی کرنے کا موقع دیا سویت حکومت نے سب سے پہلے عورتوں کی جہالت کے خلاف قدم اٹھایا اور ہر بچے کے لئے تعلیم لازمی اور مفت کر دی سن رسیدہ عورتوں کے لئے بھی تعلیمی ادارے کھولے گئے اور تمام عورتوں نے بہت اشتیاق کے ساتھ تعلیم حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم بھی عام کر دی گئی اور لڑکیوں میں اسکا شوق پیدا کیا گیا یہاں تک کہ آج سویت یونین میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیوں کی تعداد تمام یورپ کے مقابلے میں دو گنی ہے سائنس اور آرٹ میں اعلیٰ دستگاہ رکھنے والی ہزاروں عورتیں ... یہاں تک کہ بعض

چھ ماہ کے

خریدار صاحبان ۱۲ آنے بھیجکر اپنی کاپی "خاص نمبر" کی محفوظ کرالیں کیونکہ ششماہی خریدار کو خاص نمبر کا مستحق نہ سمجھا جائے گا

محکموں میں تو ناظر عورتوں کی تعداد اکثریت میں ہے۔ مثال کے طور پر سویت استانیوں کو لے لیجئے اور یہ حقیقت بھی قابل غور ہے کہ یہ استانیاں بچوں کو صرف سبق ہی نہیں پڑھاتیں بلکہ انھیں روشن خیال، جری اور محب وطن بناتی ہیں۔ اسی طرح ہسپتالوں، پرورش گاہوں اور صحت گاہوں میں بھی زیادہ تر عورتیں ہی کام کرتی ہیں۔ سویت یونین کے سب سے بڑے میڈیکل کالج ماسکو کی افسر اعلیٰ ایک خاتون ہے جو سویت کے تمام سرجنوں میں سب سے زیادہ ممتاز ہے۔

سائنس کے شعبے میں بھی عورتوں کی ترقی کا یہی حال ہے انجینیرنگ میں پہلے عورتیں بالکل نہیں تھیں مگر انھوں نے اب اس رُخ میں بھی بہت تیزی سے ترقی کر لی ہے۔ صحافت نگاری میں بھی عورتوں کا کافی اہم حصہ ہے نہ صرف یہ کہ سویت عورتیں اخبار بے حد دلچسپی سے پڑھتی ہیں بلکہ وہ اپنی رائے کے اظہار کے لئے بھی اخبارات و رسائل سے مدد لیتی ہیں۔

عورتوں کے لئے کھیل کود کے سامان بھی ہیں جس میں وہ بہت مستعدی سے حصہ لیتی ہیں اس وقت ورزشی کھیلوں میں حصہ لینے والوں میں ان کی تعداد تہائی ہے۔

فنون لطیفہ کے میدان میں سویت عورتوں کے کارناموں سے دنیا کو حیرت ہوتی ہے سویت حکومت نے اس سلسلے میں ان کے لئے بہت سی آسانیاں پیدا کر دی ہیں چنانچہ تھیٹر، موسیقی، مصوری اور دیگر قسم کے فنون لطیفہ میں عورتیں بکثرت حصہ لیتی ہیں فیکٹریوں اور پنچایتی کھیتوں میں کام کرنے والی سب عورتیں ہر مہینہ میں چار پانچ مرتبہ کسی نہ کسی فنی ادارے یا تہذیبی مرکز میں جاتی ہیں اور خود بھی انکے پروگرام میں شریک ہوتی ہیں۔

سویت نظام نے گھر کے اندر مردوں کے جابرانہ سلوک کو یکسر قلم موقوف کر دیا دھوکہ بازی سے اور روپیہ کے زور پر شادی کی رسم بھی بند ہو گئی اسکی جگہ اب شوہر اور بیوی کی مفاہمت اور محبت کو شادی کا جزو اعظم ٹھیرایا گیا اور دونوں کو برابر کے حقوق دے کر ایک دوسرے کے دلوں میں باہمی احترام کا جذبہ پیدا کیا گیا طرفین کو اپنی ملکیت کے مالک ہونے اور پیشے کے انتخاب کا حق حاصل ہے علاوہ ازیں انھیں اپنے اپنے مذہبی دستور کے مطابق یا سول میرج کرنے کی اجازت ہے سویت لڑکی اپنی شادی کی خود ذمہ دار ہے والدین کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ملتا چاہے تاہم کہ طلاق آسانی مل جاتی ہے

نجی زندگی کے متعلق سوالات قانوناً ممنوع ہیں اور نہ طلاق کی عام اشاعت کی ضرورت ہے۔ برابر کے حقوق اور اقتصادی تفریق کی عدم موجودگی آپس میں اتفاق، احترام اور محبت کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے اور عورت کی ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ گھریلو زندگی بھی خوشگوار رہتی ہے۔ شادی کے معاملات میں اتنی آزادی دیتے ہوئے بھی سویت نظام میں شادی اور اسکی ذمہ داری سے لاپرواہی کرنے کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور گھریلو زندگی میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی سے بچے پیدا کرنے اُن کی مناسب نگہداشت اور تعلیم و صحت کا خیال رکھنا ایک خوشگوار فرض سمجھا جاتا ہے۔

سویت یونین میں ماں باپ دونوں بچے کی پرورش کے ذمہ دار ہوتے ہیں تنازعہ کی صورت میں دونوں برابر کا خرچ برداشت کرتے ہیں پہلے بچہ کے لئے چوتھائی دو کے لئے تہائی اور زیادہ کے لئے تنخواہ کا آدھا حصہ ماں باپ دونوں کو دینا پڑتا ہے عدم ادائگی کی صورت میں قید کی سزا ملتی ہے اگرچہ سویت یونین میں طلاق کی آزادی حاصل ہے مگر اُسے بُری نظر سے دیکھا جاتا ہے رفتہ رفتہ اس کی تعداد بھی گھٹتی جا رہی ہے اسکے علاوہ سویت یونین میں بچے والیوں کو جتنی آسانیاں بہم پہونچائی گئیں ہیں ان کا کوئی شمار نہیں جگہ جگہ تربیت گاہیں طفل گاہیں کنڈرگارٹن مفت اسکول ہسپتال نرسنگ ہوم اور پبلک طعام خانے بھی قائم ہیں اکثر یہ طفل گاہیں فیکٹریوں اور پنچایتی کھیتوں کے قریب ہوتی ہیں تاکہ ماؤں کو آسانی رہے طفل گاہوں اور کنڈرگارٹن کے اخراجات کا ½ حصہ والدین کو اور ½ حصہ حکومت کو برداشت کرنا پڑتا ہے ہر وقت طعام خانوں کی موجودگی سے عورتیں ہانڈی چولھا اور دیگر تھکا دینے والے خانہ داری کے امور سے بچی رہتی ہیں وہ کام کرنے کے بعد اپنے مکان میں رہ سکتی ہیں۔ جو سویت حکومت نے سستے داموں انکے لئے تعمیر کرائے ہیں۔ سویت یونین میں کثیر تعداد بچوں کی ماؤں کو علیحدہ طور سے بھتہ ملتا ہے۔

ان حالات کو سن کر ہم ہندوستانی عورتوں کی بے ساختہ یہی طبیعت چاہتی ہے کہ کس طرح ہماری یہ روز روز کی مصیبتیں ختم ہوں اور ہم بھی اسی قسم کی فضا میں سانس لیں۔

جنگی مجرمین اقوام عالم کے رُو برُو

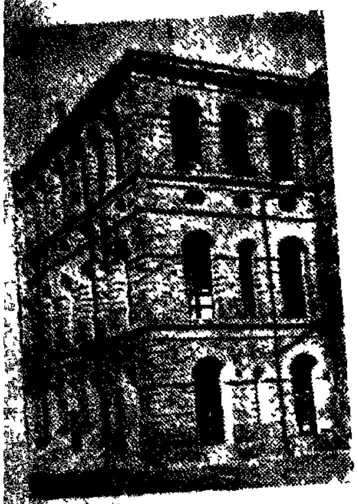
از ـــــــ گوہر شانی

بین الاقوامی فوجی عدالت نے دنیا کے خاص خاص جنگی مجرمین پر جو الزامات عائد کئے ہیں وہ سویت یونین، برطانیہ، امریکہ، اور فرانس میں بیک وقت شائع ہو چکے ہیں اور اب ہر شخص اُن سے واقف ہو چکا ہوگا۔ آج وہ جنگ پسند لوگ جنھوں نے دنیا کی قوموں کو نیست و نابود کرنے کا تہیہ کر لیا تھا، جنھوں نے دوران جنگ میں عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو قتل کیا اور ترقی و تہذیب کا گلا گھونٹ دیا۔ وہی لوگ آج دنیا کی قوموں کے سامنے مجرم کی حیثیت سے کھڑے ہیں اور اپنے کرتوت کی سزا پانے والے ہیں۔ انسانیت کے یہ دشمن جو خود کو تمام انسانوں سے اعلیٰ اور برتر سمجھتے تھے اور حکمراں نسل قرار دیتے تھے، جنھیں ساری دنیا کو اپنے زیر نگیں کرنے کا خبط اور نشہ چڑھا ہوا تھا وہ اب تھک کر بیٹھ گئے ہیں اور اب اُن کی پرسش کا وقت آ گیا ہے۔ جرمن فاشسٹوں نے جو بیڑہ اٹھایا تھا اس کا انجام مکمل تباہی اور بربادی پر ہوا اور سرخ افواج اور اتحادی فوجوں کے پے در پے حملوں نے اُن کے ارادوں کو تہس نہس کر دیا۔

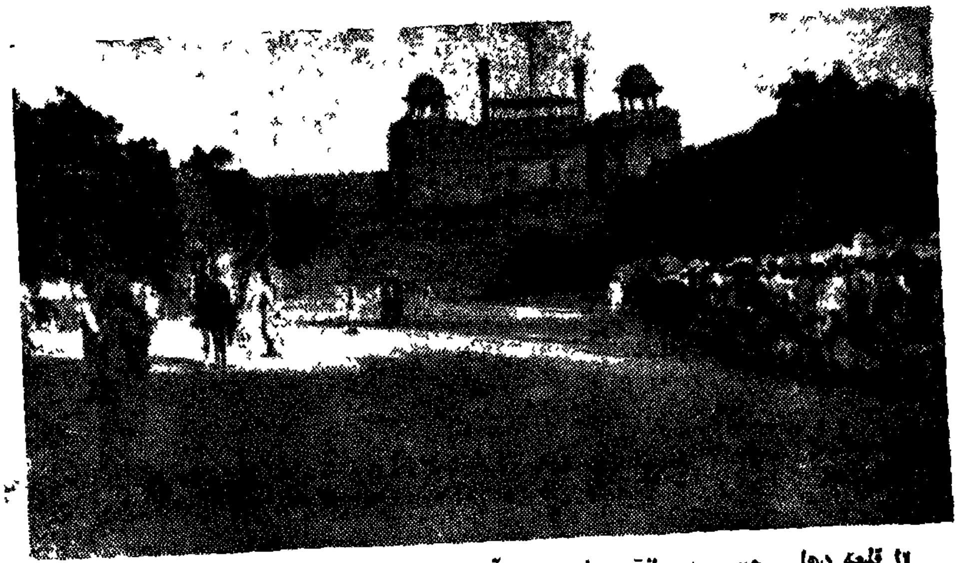
الزامات کا جو مسودہ سویت یونین، برطانیہ، امریکہ اور فرانس میں شائع ہوا ہے اس کی نوعیت قطعی طور پر قانونی ہے۔ اُس میں اُن الزامات کا تذکرہ ہے جو تحقیق تفتیش کے بعد دریافت کئے گئے ہیں۔ اُس میں واقعات و حقائق اور اعداد و شمار کا ایک وافر ذخیرہ موجود ہے۔ اُس میں قانونی موشگافیوں کے ساتھ جرائم کی نوعیت بیان کی گئی ہے۔ اس مسودے پر ایک نظر ڈالنے کے بعد انسان خوف اور دہشت سے کانپ اٹھتا ہے۔ اُس میں ان تمام جرائم کا تذکرہ ہے جو افراد یا انجمنوں اور اداروں کی طرف سے سرزد ہوئے۔ یہ مجرمین نازی جرمنی کے مشہور و معروف لیڈران تھے۔ ان لیڈروں نے آدم خور ہٹلر کے ساتھ ساز باز کر کے ہولناک مظالم کئے ہیں۔ یہ لوگ اپنا ضمیر کھو چکے تھے

جب یہ لوگ جرمنی میں دھوکہ اور قتل سے برسر اقتدار ہوئے تو انھوں نے جرمنی میں ظلم و جور اور دہشت و خوف کا راج قائم کیا۔ انھوں نے حریت پسند قوموں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے ہر قسم کے ظلم سے کام لیا۔ جب سے جرمن نازی پارٹی کی بنیاد پڑی تبھی سے اُس میں جرمنی کے سب سے سامراج پسند قسم کے لوگ داخل ہونا شروع ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں ہٹلر اور اُس کے گرگے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے بعد دنیا، اقوام عالم اور جمہوریت کے خلاف کمربستہ ہو گئے۔ انھوں نے دوسری نسل کے لوگوں کو قتل کیا۔ امن پسند قوموں کو دھمکیاں دیں، بے ایمانی، جعل سازی اور فریب کاری کا طوفان برپا کر دیا۔ دوسرے ملکوں میں اپنے خفیہ ایجنٹ بھیجے اور آزادی پسند قوموں کے پیٹھ پیچھے چھرا بھونکنے کے لئے اُنکے ملکوں میں غدار دوست پیدا کئے۔

جب نازیوں نے خود اپنے ملک میں نہایت بے رحمی کے ساتھ تمام جمہوری عناصر کو کچل دیا تو وہ آسٹریا اور زیکو سلاواکیہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ۱۲ مارچ ۱۹۳۸ء کو ہٹلر نے آسٹریا پر حملہ کیا۔ اُسی کے دوسرے روز اُس نے خود کو حکومت آسٹریا کا حکمراں قرار دیا اور اُسے جرمنی میں شامل کر لیا۔ پہلی اکتوبر ۱۹۳۸ء کو جرمن افواج نے زیکو سلاواکیہ کے سوڈٹین علاقے پر قبضہ کر لیا اور مارچ ۱۹۳۹ء میں پورا زیکو سلاواکیہ فاشسٹ مظالم کی نذر ہو گیا۔ آسٹریلیا اور زیکو سلاواکیہ پر فاشسٹوں نے اس لئے قبضہ کیا تاکہ وہاں سے بحیرۂ یورپ کے دوسرے ملکوں اور قوموں پر حملہ کرنا آسان ہو جائے اس کے بعد پولینڈ کی باری آئی۔ اُس کے بعد ہٹلر جرمنی نے تیز رفتاری کے ساتھ اُن تمام رکاوٹوں کو ختم کرنا شروع کیا جو یورپ پر مکمل اقتدار حاصل کرنے کے راستے میں حائل تھیں۔ اپریل ۱۹۴۰ء میں ڈنمارک اور ناروے پر [illegible] مئی ۱۹۴۰ء میں بلجیم، ہالینڈ اور لکزمبرگ کو [illegible] اس کے بعد فرانس



''کورٹ'' روم جس میں سماعت منعقد ہوئی



لال قلعہ دہلی جس میں انڈین نیشنل آرمی کے مجاہدوں پر مقدمہ چل رہا ہے



ممبران کورٹ مارشل (بیچ میں صدر مسٹر میجر جنرل بلیکز لینڈ)



وکلاء مجاہدین - کی کورٹ سے واپسی سرتیج بہادر سپرو ڈاکٹر کاٹجو پی کے سین



انڈین نیشنل فوج کے حملہ کا ایک منظر مشین گن اور فوجی بگل کے ساتھ





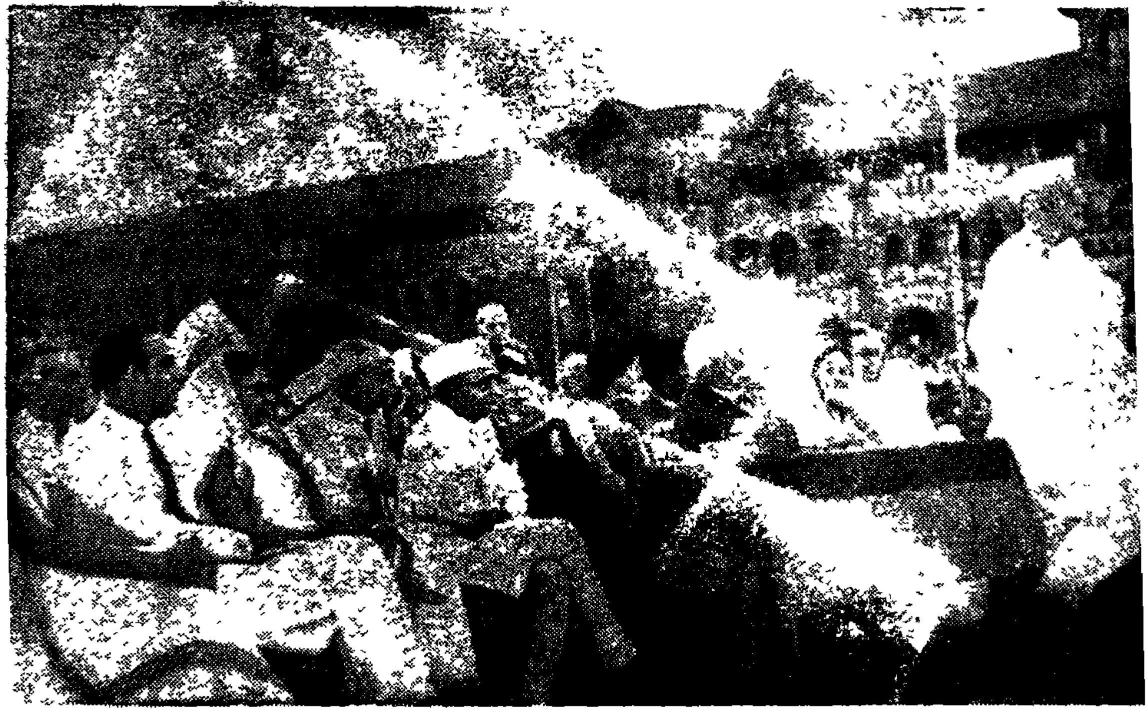
Sj. Subhas Chandra Bose snapped with Sj. Rash Behari Bose in Singapore.

سوباس چندر بوس معہ راس بہاری
بوس سنگاپور میں

نیتاجی (سوباش بابو) کا فوتو احتراماً سرپر رکھکر مادر وطن کے آزا
افتتاح کیا جارہا ہے



وکلا مجاہد بائیں سے
بھولابھائی ڈیسائی- پنڈت ج
لال نہرو- مسٹر اصف علی- ا
کاٹجو - مسٹر رگھو نندن

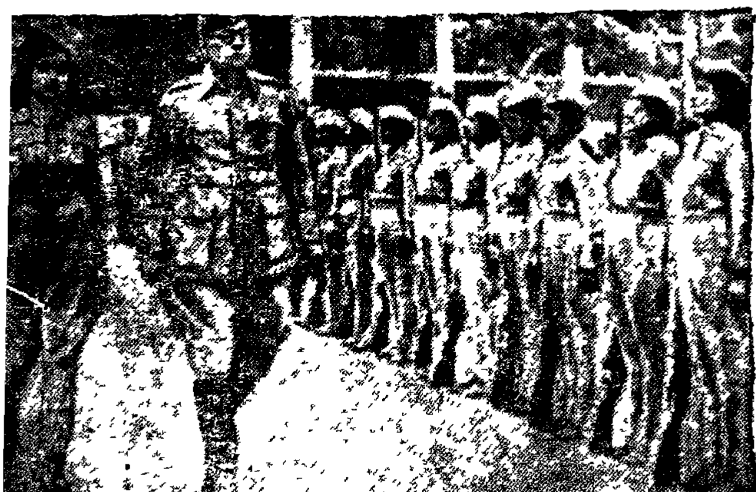


چوپاٹی، بمبئی میں نیشنل آرمی ڈے پر سرت چندر بوس جلسہ میں تقریر کر رہے ہیں





سبھاس بابو ترنگہ جھنڈا لہراتے وقت جاپانی افسروں کے ساتھ سلامی لے رہے ہیں دوسری طرف
انڈین نیشنل آرمی کا ایک مجاہد سرگرم عمل ہے



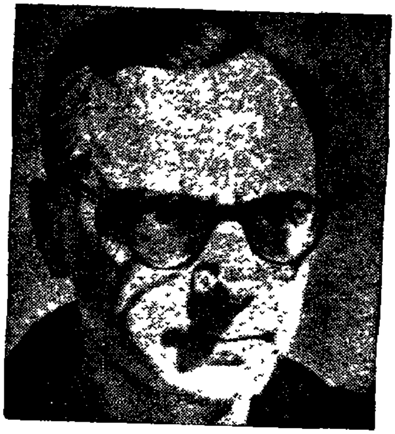
Bose & Capt. Lakshmi Inspecting the 'Rani of Jhansi' Regiment

لکشمی رانی جھانسی رجمنٹ کا معائنہ کررہے ہیں



SJ Bose at Singapore at a ... of women.

وہ فاشصت جلھون نے ظلم کیا آج وہ اقوام متحدہ کے سامنے مجرم کی حیثیت سے کھڑے ھین - لیکن برطانیہ کے حدود مملکت مین اُن لوگون کو مجرم قرار دیا جارھا ھے جلھون نے ظلم کو ختم کرنے کی کوشش کی - کون اصلی مجوم ھے- ھندوستان کی قومی فوج یا برطانوی سامراج ؟



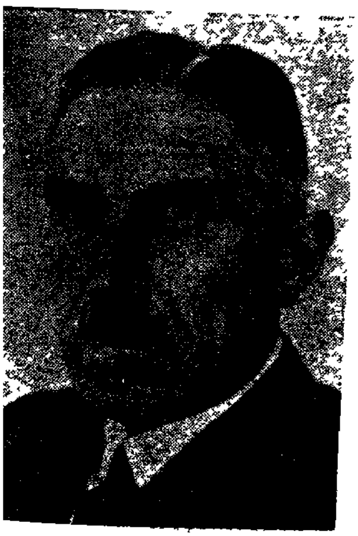
الفرڈروزنبرگ - ناري پارتي کا فلسفي جس نے نازیت کے فلسفے کو جرمنی مین عام کیا



جولیس استریچر یہودیون کا دشمن اور ناری پارتی کا اخبار نویس



گستاوک رپ جرمنی کے کرپ اسلحہجات کا صدر



فرانزفان پپین- نازی سفیر اور مدبر



جنرل ھی دےکی توجو جاپان کا جنگ پرست مدبر



مولانا ابوالکلام صاحب آزاد اپنی بیگم مرحومہ کے مزار پر فاتحہ پڑھ رہے ہیں



مولانا ابوالکلام آزاد کا لاہور میں خواتین استقبال کر رہی ہیں



مولانا آزاد قومی کارکنوں کے ساتھ لاہور میں مشورہ کررہے ہیں



علامہ عنایت اللہ خان مشرقی [illegible] میں تقریر کررہے ہیں

کی بازی ہاری تھی اور اپریل ۱۹۴۱ء میں یوگو سلاویہ اور یونان کی۔
— مغربی یورپ میں چونکہ انھیں نہایت آسانی کے ساتھ فتح پر فتح حاصل ہوئی تھی اس لئے انھوں نے یہ سمجھا کہ سوویت یونین کی قوموں کو محکوم کرنے کا جو مدتوں سے خواب تھا اس کے پورا ہونے کا اب وقت آگیا ہے چنانچہ سوویت یونین کو جرمنی کی نوآبادیات بنانے کے لئے انھوں نے خفیہ طور پر پہلے تیار اور مسلح فوجوں کو سوویت یونین کی سرحد پر جمع کر رکھا تھا۔ ۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو انھوں نے جنگ کا اعلان کئے بغیر بالکل ڈاکوؤں کی طرح سوویت یونین پر اچانک حملہ کر دیا۔

جرمنی، اٹلی اور جاپان نے سامراجی ارادوں اور مقاصد کے تحت پوری دنیا کے خلاف متحد ہو کر ایک محاذ قائم کیا۔ جاپان نے یورپ کی جنگ کے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دسمبر ۱۹۴۱ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے علاقوں — پرل ہاربر اور فلپائن پر — حملہ کر دیا۔ اس کے بعد وہ برطانوی علاقوں اور فرانسیسی اور ڈچ علاقوں پر حملہ آور ہوئے۔ اُسی مہینے میں جرمنی نے امریکہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

ہٹلر جرمنی کے مدبرین اور لیڈران کو اب بین الاقوامی فوجی عدالت کے روبرو یہ بتانا ہے کہ انھوں نے کیوں دنیا کے خلاف ظالمانہ جنگ چھیڑی، کیوں معاہدوں کے خلاف ورزی کی اور آزادی خواہ قوموں اور ملتوں کے خلاف کیوں سامراج مظالم کا میدان کھول دیا۔

انھوں نے قوموں کو غلام بنانے اور اپنا ظالمانہ "نیا نظام" قائم کرنے کے لئے ایسے ایسے جبر و تشدد کے نمونے پیش کئے کہ عہد متوسط کے مظالم اور تشدد معمولی نظر آنے لگے۔

[illegible] ۱۹۴۱ء کو استالن نے ماسکو کے سوویت میں تقریر کرتے ہوئے ہٹلری [illegible] تحریک کا بھید چاک کیا اور اس کی اصل حقیقت کھول کر رکھ دی۔ اس نے یہ بتایا کہ نازی پارٹی دراصل دنیا کے سب سے [illegible] سامراجیوں کی پارٹی ہے [illegible]

عہد متوسط کے رجعت پرست اور سیاہ کار مجرم ایسا۔

نازیوں نے اپنے "فتح عالم" کے پروگرام کو عمل میں لانے کے لئے پوری پوری قوم کو نیست و نابود کرنے سے بھی منہ نہیں موڑا۔ ہٹلر نے یہ اعلان کیا تھا کہ "ساری دنیا کو فتح کرنے کے لئے ہم تمام ممکن ذرائع کام میں لائیں گے۔ اگر ہم ایک عظیم الشان جرمن سلطنت قائم کرنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ سلاو نسل کی قوموں کو فنا کر ڈالیں۔ یعنی روسی، پولی، زیکو سلاوی، سلاویکی، بلغاری، یوکرین اور بائیلو روسی قوموں کو فنا کر ڈالنا ضروری ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم یہ کام نہ کریں"

ہٹلر کے گرگوں نے یعنی نازی پارٹی کے لیڈروں نے جرمن قوم کے افراد کو قتل اور غارت گری کے لئے اُکسایا اور اپنے جرائم آلود ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انھیں منظم کیا۔ انھوں نے مفتوح ممالک میں آگ اور تلوار کی مدد سے ایک خونین نظام کی بنیاد ڈالی جس کا نام انھوں نے "نیا نظام" رکھا۔

نازیوں نے جنگی قیدیوں پر کتنا بہیمانہ سلوک کیا اس کا بالتفصیل تذکرہ الزامات کے مسودے میں موجود ہے اگرچہ جرمنی نے اس معاہدے پر اپنا دستخط ثبت کیا تھا جس کی رو سے جنگی قیدیوں کے ساتھ انسانیت کا سلوک روا رکھا گیا ہے جرمنی کے سپاہیوں اور افسروں نے اپنے لیڈروں کے حکم پر جنگی قیدیوں پر منظم انداز میں شدید ظلم ڈھائے اور ان کو قتل کیا۔ جنگی قیدیوں کے کیمپ کو انھوں نے مذبح میں تبدیل کر دیا جس کے نتیجے کے طور پر اتحادیوں کے لاکھوں سپاہی اور افسران ختم ہو گئے۔

اب سوویت یونین کی قومیں اس بات کا مطالبہ کر رہی ہیں کہ لاکھوں سوویت جنگی قیدیوں کو جو قتل اور غارت کیا گیا ہے اُن کا بدلہ لیا جائے۔ سرخ فوج کے لاکھوں سپاہیوں، افسروں کو قتل کرنے، زہر دینے، گولی مارنے اور بھوکا مارنے کے جرم کی سزا دی جائے۔ سلاف قوم اور دوسری قوموں کو فنا اور نیست و نابود کرنے کے لئے نازی [illegible]

ایجنٹ صاحبان

"خاص نمبر" کے کاپیوں کی تعداد سے ۱۵؍ دسمبر تک مطلع فرمائیں۔ ورنہ تعمیل سے دفتر معذور ہوگا

ڈبوں میں بند کرکے دم گھونٹ دیا، کتنوں کو زندہ جلا دیا، آدمیوں سے بھرے جھونپڑوں اور مکانوں میں آگ لگا دی۔ ان کے والدین کی آنکھوں کے سامنے بچوں کو سنگینوں پر کھڑا کر دیا۔ عورتوں کی عصمت دری کی اور انھیں ہولناک مظالم کا شکار بنایا۔

بے شمار امن پسند شہریوں کو جنھیں فوج سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ انھیں پکڑ کر کیمپوں میں بند کر دیا گیا، ان پر مظالم ڈھائے گئے، انھیں بھوکا مارا گیا، انھیں جاڑوں میں ننگا رکھا گیا، اُن کے جسم میں ہولناک امراض کے جراثیم داخل کئے گئے۔ کتوں سے انھیں نچوایا گیا، ان کے جسم پر اذیت ناک سائنٹفک تجربے کئے گئے اور بلا کسی عیب یا قصور کے محض مزاح اور لطف پیدا کرنے کے لئے انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

نازی مجرموں نے خاص خاص "موت کے کیمپ" تیار کئے جہاں مردہ قیدیوں کے جسم خاص طور پر تیار کئے ہوئے بڑے بڑے دہکتے ہوئے چولھوں میں پھونک دئے جاتے تھے۔ سوویت یونین، پولینڈ، امریکہ، برطانیہ زیکوسلاوکیہ کے فرانس اور دوسرے ممالک کے کُل ملا کر کوئی پچپن لاکھ۔ شہریوں کو نازی موت کے کیمپوں میں مار ڈالا گیا۔ سب سے زیادہ ہولناک اذیتیں اور مظالم نازیوں نے سوویت روس کے مفتوحہ علاقوں میں ڈھائے۔ لوو کے علاقے میں انھوں نے کوئی سات لاکھ سوویت شہریوں کو مار ڈالا۔ گھیٹو کے مقام پر کوئی ایک لاکھ ۳۳ ہزار یہودیوں کو ۷ ستمبر ۱۹۴۱ء اور ۶ جولائی ۱۹۴۳ء کے درمیان قتل کیا۔ پانو کے مقام پر نازیوں کا جو "موت کا کیمپ" قائم تھا اُس میں انھوں نے لاکھوں غیر فوجی شہریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

سوائے نازی جانوروں کے اور کوئی بھی ایسی بے رحمی نہیں کر سکتا تھا۔ مثلاً زندہ آدمیوں کو شدید جاڑے کے موسم میں سرد اور برفیلے پانی کے بائرن میں ڈال دیا اور وہ وہاں برف میں جم گئے۔ ایک طرف آرکسٹرا کی دھن بج رہی ہے اور دوسری طرف لاتعداد قیدیوں کو کھڑا کرکے اُن کو گولیوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اور مزید قیدی گولیوں کا نشانہ بننے کے لئے منتظر کھڑے ہیں۔

اسمولنسک کے علاقے میں ایک لاکھ پینتیس ہزار شہریوں کو گولی مار دی گئی۔ کیف کے قریب ایک لاکھ سے زیادہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو مار ڈالا گیا۔ جرمن حملہ آور جہاں جہاں گئے انھوں نے خون کے دھارے بہا دئے، لاکھوں سوویت شہریوں کو جرمنی لے جا کر غلام بنایا گیا۔

نازی غلام گردوں نے لاکھوں آدمیوں کو عہد متوسط کے غلاموں کی طرح غلام بنا دیا۔ ان کی کھالوں پر جانوروں کی طرح غلامی کا نشان لگایا گیا۔ اُن کو نمبر پہنائے اور اُن کے ساتھ قیدیوں کا سا سلوک کیا۔ ملوں اور کارخانوں کے مالکوں، زمینداروں اور امیر کسانوں کے مظالم تحط اور بہیمانہ قسم کا استحصال برداشت کرتے کرتے ان غلاموں کی صحت تباہ ہو گئی اور ان میں سے لاکھوں مر بھی گئے۔

> **جن ایجنٹ صاحبان کے**
>
> ذمہ گزشتہ مہینوں کا حساب باقی ہے ۱۵ دسمبر سے قبل دفتر میں اپنا حساب بھیج دیں ورنہ
>
> "خاص نمبر" انکو نہیں بھیجا جائے گا

نازیوں نے مفتوح قوموں کے قومی نشانات کو مٹی میں ملا دیا۔ انھوں نے تہذیبی ذخیروں میں آگ لگا دی قومی عبادت گاہوں کی توہین کی گرجوں کو تباہ و برباد کر دیا خانقاہوں اور متبرک مقامات کو زمین کے برابر کر دیا۔

انھوں نے ہزاروں اور لاکھوں شہروں اور دیہاتوں کو پردۂ زمین سے نیست و نابود کر دیا۔ انھوں نے بے شمار مادی دولت کو خاک میں ملا دیا، اور بہت بڑے پیمانے پر پبلک اور پرائیوٹ دولت کو سمیٹ کر اپنے گھر لے گئے۔ نازیوں نے سوویت شہروں اور دیہاتوں کے باشندوں کا اور سوویت حکومت کا کتنا مالی نقصان کیا ہے اُس کا اندازہ سوویت حکومت کے مقرر کردہ کمیشن نے ۶۷۹ بلین روبل لگایا ہے۔ یہ رقم ۱۹۴۱ء میں اشیاء کی جو قیمت تھی اُس کے حساب سے ہے۔

یہی مجرم اس وقت بین الاقوامی فوجی عدالت میں پیش ہیں، عوام نے ان کی بہیمیت کو ابھی بھلایا نہیں ہے۔ ان مجرمین میں ایک ہرمن گورنگ بھی ہے جس نے کہا تھا کہ "مارو مارو جتنا ہو سکے قتل کرو، ہر مخالف کو قتل کر دو، اس کی ذمہ داری تمھارے سر نہیں ہوگی بلکہ میرے سر اس لئے بلا خوف و خطر قتل کرو"

اسی گورنگ نے اس حکنامے پر دستخط کیا تھا جس کی رُو سے جرمنی میں کھلاڑے کو قتل کا آلہ بنایا گیا۔ اُسی نے یہ بھی کہا تھا اور بڑے فخر کے ساتھ "میرا کام ہے نیست و نابود کرنا، فنا کرنا اور قتل کرنا۔ اور کچھ نہیں"

ہٹلر کا معاشی مشورہ کار فنک، جرمنی کی بڑی بڑی صنعتوں کے نمائندے کرپ اور تھائسن، جنھوں نے ہٹلر کو برسر اقتدار ہونے میں مدد دی اور جنھوں نے نازی سپاہیوں کو ہتھیار دئیے۔ یہ لوگ بھی عدالت کے سامنے پیش ہیں۔

مجرموں میں خاص خاص کے نام یہ ہیں۔ فیلڈ مارشل کیٹل، کرنل جنرل جودل، امیر البحر رائڈر اور جرمنی نازی حکومت کا سردار ڈونٹز۔

اسٹالین نے ۱۹۴۲ء میں کہا تھا "ان فسطائیوں کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اپنے جرموں کی ذمہ داری سے بچ نہیں سکتے اور ستائی ہوئی قوموں کو دست انتقام سے محفوظ نہیں رکھ سکتے"

عوام کے غم و غصہ کی تلوار اب ان مجرمین کے سروں پر اٹھ چکی ہے اور اب انصاف ہو کر رہے گا۔

(آزاد ہند فوج کے نام)

بڑھے چلو

از:۔۔۔۔۔۔ حضرت مجیب خیرآبادی

دیوانہ وار موجۂ طوفاں سے کھیل کر ۔۔۔ ہر گام پر شدائدِ دوراں سے کھیل کر
اک کھیل اور گردشِ دوراں سے کھیل کر
دیوانہ وار جانبِ منزل بڑھے چلو

دشواریٔ حیات سے ہنس کر گزر چلو ۔۔۔ ہنگام کارزار سدا تیز تر چلو
تم جانِ روزگار ہو، جانِ سفر چلو
پایندہ باد جذبۂ کامل بڑھے چلو

شوقِ تمام و جذبۂ محکم سے کام لو ۔۔۔ منزل وہ دے رہی ہے صدا تیز گام لو
دستِ عمل میں پرچمِ آزاد تھام لو
آزاد ہند فوج ہے! ساحل بڑھے چلو

محکومیت کے شانے پہ یہ بار رہ نہ جائے ۔۔۔ شاخوں سے پھول نوچ ہی لو خار رہ نہ جائے
دو چار گام منزلِ دشوار رہ نہ جائے
پیشِ حریف مدِ مقابل بڑھے چلو

صبحِ بہار گائے! غزلخواں ہو زندگی! ۔۔۔ آزاد ۔۔۔ گلستاں میں خراماں ہو زندگی
تا حشر مضمحل، نہ ہراساں ۔۔۔ ہو زندگی
آزاد فوجیوں کے مماثل بڑھے چلو! ۔۔۔ دیوانہ وار جانبِ منزل بڑھے چلو!!

کیا جمہوریت دو قسم کی ہوتی ہے

یورپ کے وہ ملک جو جرمنی کی محکومی سے آزاد کئے گئے ہیں اس وقت متعدد چھوٹے اور بڑے سیاسی، معاشی، اسماجی اور تہذیبی مسائل کا سامنا کر رہے ہیں۔ یہ مسائل اُسی وقت حل ہو سکتے ہیں اگر ان ملکوں کے عوام کی صحیح معنوں میں جمہوری طاقتیں آپس میں متحد ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان ملکوں میں صحیح معنوں میں جو جمہوری سیاسی پارٹیاں موجود ہیں اور جو صرف زبانی نہیں بلکہ واقعی طور پر عوام کے مفاد کو پیش نظر رکھتی ہیں متحد اور ہم آہنگ ہو کر کام کرنے کو زیادہ ترجیح دیتی ہیں۔ جنگ سے پہلے کئی یورپین ملکوں کی جمہوری طاقتیں آپس میں اتحاد قائم نہیں رکھ سکی تھیں جسکی انھیں بہت گراں قیمت ادا کرنی پڑی۔ جمہوری جماعتوں کی نا اتفاقی سے فائدہ اُٹھا کر رجعت پرستوں کی چھوٹی چھوٹی لیکن سیاسی اعتبار سے تجربہ کار جماعتوں نے جمہوریت کو نیچا دکھایا۔ فرانس میں بالکل ایسا ہی ہوا، جہاں رجعت پرستوں٭ نے "عوامی محاذ" کو آخر توڑ دیا اور جمہوریت پسندوں میں نا اتفاقی پیدا کر دی۔ اس کے بعد فرانس نے ایسی خطرناک اور تباہ کن خانگی اور خارجی پالیسی اختیار کی جس کا نتیجہ بے عزتی اور چار سال کی نازی غلامی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ گذشتہ عالمگیر جنگ کی ابتدا سے کچھ سال پہلے زیکوسلاویکیہ کی جمہوری طاقتیں درجنوں مختلف جماعتوں میں منقسم تھیں۔ ٹریڈ یونین تحریک اسی طرح جماعت بندی کی شکار تھی۔ زیکوسلاویکیہ کے رجعت پرستوں نے ان نا اتفاقی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اُن کے ہتھکنڈوں کے سبب زیکوسلاویکیہ پر ہٹلری مظالم کی مصیبت نازل ہوئی۔ چنانچہ جنگ کے بعد اگر آج زیکوسلاویکیہ کی چار جمہوری جماعتیں — قومی اشتراکی پارٹی، سوشل ڈیموکریٹک پارٹی، کمیونسٹ پارٹی اور قومی پارٹی آپس میں متحد ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس متحدہ محاذ کا نام "قومی محاذ" ہے۔ بلغاریہ، رومانیہ اور ہنگری میں بھی

٭ رجعت پرست [illegible] دولت مند اور امیر خاندانوں کے زیر اثر تھے۔

ایک روسی صحافت نگار، ... کے قلم سے

اسی قسم کے متحدہ محاذ قائم ہیں اول الذکر کے نام علی الترتیب ہیں: "محاذ محبان وطن"، "قومی جمہوری محاذ"۔ ہنگری میں تمام فاشسٹ دشمن جماعتوں کا ایک متحدہ محاذ قائم ہوا ہے اور اُسی نے ایک مخلوط وزارت بھی بنائی ہے جسکے ہاتھ میں اسوقت ملک کی باگ ڈور ہے۔ یوگوسلافیہ میں بھی ایک "قومی محاذ" ہے اور پولینڈ میں چار پارٹیوں کی ایک مخلوط وزارت قائم ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان ملکوں میں مخالف جماعتوں اور پارٹیوں کا وجود ہی نہیں۔ متحدہ محاذ کی مخالفت کرنے والوں کی جماعتیں موجود ہیں اور انھیں، تحریر و تقریر اور انتخابات میں حصہ لینے کی آزادی بھی حاصل ہے لیکن اب اس میں آخر کس کا قصور ہے کہ عوام جواب کافی تجربے اُٹھا چکے ہیں ان مخالف جماعتوں اور ان کے لیڈروں کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

آج کل برطانیہ میں جو یہ کہا جا رہا ہے کہ ان ملکوں میں ایک ہی پارٹی کی حکومت ہے سراسر بے محل اور بے معنی ہے۔ اس لئے کہ آخر برطانیہ اور امریکہ میں بھی تو ایسا ہی ہے، یعنی وہاں بھی بہ یک وقت بے شمار جماعتوں کے ہاتھوں میں حکومت نہیں ہے۔ برطانیہ اور امریکہ میں دراصل دو جماعتوں کا رواج چلا آرہا ہے، جن میں سے بہ یک وقت کوئی ایک ہی جماعت برسر اقتدار رہتی ہے۔ جنگ کے دوران میں برطانیہ میں مخلوط وزارت قائم تھی اور اس وزارت کو تمام جماعتوں کی تائید اور حمایت حاصل تھی۔ لیکن اس وزارت کے متعلق کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ یہ ایک ہی پارٹی کی حکومت ہے۔ جنگ کے ختم ہونے سے کچھ ہی پہلے یہ مخلوط وزارت ختم ہو گئی اور حکومت کی از سر نو تنظیم عمل میں آئی جس کے بعد حکومت خالصتاً کنزرویٹو جماعت کے لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی۔ جولائی میں انتخاب کے بعد کنزرویٹو وزارت کا دور ختم ہوا اور لیبر پارٹی کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور چلی آئی۔ لیکن یہ بہرحال سب کو معلوم ہے کہ برطانیہ میں اسوقت برسر اقتدار جماعت اور مخالف

کرنے والی جماعت متعدد اہم قومی سوالات پر ہم خیال و ہم نوا ہیں خاص طور پر خارجی معاملات اور اُن معاملات پر جن کا تعلق سلطنت برطانیہ سے ہے دارالعوام میں وزیر خارجہ مسٹر بیون نے جو پروگرام پیش کیا ہے اُسکا کنزرویٹو پارٹی کے لوگوں نے بڑے پُرزور الفاظ میں خیر مقدم کیا ہے۔ یہاں تک کہ لیبر پارٹی والوں نے بھی اُس کا اتنا خیر مقدم نہیں کیا ہے۔ کنزرویٹو جماعت کے اخبارات نے اس بات کی بڑی تعریف کی کہ لیبر وزارت برطانیہ کی خارجی پالیسی کے تسلسل کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کنزرویٹو پارٹی کے لیڈر صاحبان برطانیہ کی موجودہ خارجی پالیسی کے سلسلے میں اُن لاکھوں اور کروڑوں ووٹروں کی بہ نسبت بہت زیادہ خوش اور مطمئن ہیں جنھوں نے اس امید میں لیبر پارٹی کے لوگوں کو ووٹ دیا تھا کہ وہ ملکی معاملات کے علاوہ خارجی معاملات میں بھی زیادہ ترقی پسند اور جمہوری رویہ اختیار کریں گے۔ اس تجزیئے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آج برطانیہ میں جو دو خاص سیاسی جماعتیں ہیں وہ دراصل ایک دوسرے کی مخالف نہیں ہیں بلکہ دوستی کے بہت مضبوط رشتے میں بندھی ہوئی ہیں۔ اگرچہ سطحی نظر سے دیکھا جائے ایسا نہیں معلوم ہوتا جب برطانیہ میں یہ حال ہے تو آخر یورپ کے ان آزاد شدہ ملکوں نے کون سا قصور کیا ہے کہ وہاں کی جمہوری جماعتیں ملک کے مسائل کو حل کرنے کے لئے آپس میں متحد نہ ہوں۔

"مغربی جمہوریت" کے ہمنوا یہ کہتے ہیں کہ مشرقی یورپ کے ممالک میں دراصل کمیونسٹ پارٹی کی آمریت قائم ہے۔ اور تمام دوسری جماعتیں محض جمہوریت کی نمائش کے لئے رکھی گئی ہیں۔ اس لئے کہ ان جماعتوں کے لیڈر دراصل کمیونسٹ ہیں جنھیں بہت خاص طور پر چُن کر بھیجا جاتا ہے اور یہ نہیں ظاہر کیا جاتا کہ وہ کمیونسٹ ہیں۔ حالانکہ جس واقعہ واقعہ کی بنیاد پر جھوٹ کا یہ طومار کھڑا کیا گیا ہے اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ جنگ کے بعد ان ملکوں کی بہت سی جمہوری جماعتوں کے اب وہ پرانے لیڈر نہیں رہے بلکہ اب ان جماعتوں کی رہنمائی نئے لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی ہے۔ ہنگری کی سوشل ڈیموکراٹک پارٹی کا حال ہی میں جو جلسہ ہوا ہے اس میں اس پارٹی کے پرانے لیڈر پیر کو بے حد قلیل ووٹ آئے وہ شخص کمیونسٹ پارٹی اور دوسری پارٹیوں کے ساتھ مل کر متحدہ محاذ [illegible] تھا۔ اس جلسے میں نئے لوگوں کو رہنمائی دی گئی [illegible]

اور آزاد شدہ ملکوں میں بھی یہی بات ہو رہی ہے۔ رومانیہ میں نیشنل زارانسٹ پارٹی اور قومی لبرل پارٹی کے پرانے رہنما اب بے قوم کے پیغمبر بنائے گئے ہیں۔ اُن کے پُرانے ساتھیوں کی زبردست اکثریت اب ان کا ساتھ چھوڑ چکی ہے۔ اور دوسرے سیاسی لیڈروں کا ساتھ دے رہی ہے۔ یوگوسلاویہ میں کروشیا کی کسان جماعت کے پُرانے لیڈر کو اب کروشیا کے کسان نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اس لئے کہ اُس نے جرمن حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا اور ان کے ایجنٹوں کے ساتھ تعاون برتا تھا۔ اس جماعت کی رہنمائی اب دوسرے لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے اور اب اس جماعت کا نام کروشین کسان جمہوری پارٹی ہے۔ پولینڈ اور دیگر ممالک کی جمہوری جماعتوں کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے کہ اُن کے پُرانے رہنما اپنا اثر و اقتدار کھو چکے ہیں اور لیڈرشپ نئے لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے۔

اسی رہنماؤں کے بدل جانے کی وجہ سے مغربی طرز کی جمہوریت کے نام لیوا تنگ نظر ملاؤں کی طرح یورپ کے لوگوں سے کہتے ہیں کہ اپنے پُرانے لیڈروں کے قدم بہ قدم چلو ورنہ ہم اپنی جمہوریت کے مندر سے تمھیں اچھوت قرار دیکر نکال باہر کریں گے۔

ظاہر ہے کہ امریکہ اور برطانیہ کے یہ جمہوریت کے پجاری یہ نہیں جانتے کہ اُنکے اس مطالبے اور حقیقی جمہوریت کے درمیان کوئی چیز بھی مشترک نہیں جمہوریت کا بالکل ابتدائی اصول یہ ہے کہ ہر پارٹی کو اپنے رہنماؤں کے انتخاب کی مکمل آزادی حاصل ہونی چاہئے۔ ساتھ ہی اُس پارٹی کو اس بات کا بھی حق حاصل ہے کہ وہ ضرورت کے تحت اپنے لیڈر بدل بھی سکتی ہے۔ یورپ کی جمہوری جماعتوں کے پرانے لیڈر اقوام کی نگاہوں میں ذلیل و خوار ہو چکے ہیں اسلئے کہ انھوں نے فاشزم کا ساتھ دیا۔ خود اپنے ملکوں کی عوامی مدافعت کی تحریکوں کیساتھ دغا کیا اور برطانیہ امریکہ اور روس کے باہمی اختلافات سے فائدہ اُٹھا کر اپنا اُلّو سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ اس قسم کے لیڈروں کو دوبارہ یورپ کی جمہوری جماعتوں کے سر پر مسلط کرنیکا مطلب یہ ہے کہ جمہوریت کے پردے میں جمہوریت کے دشمنوں کا ساتھ دیا جائے اور چونکہ امریکہ اور یورپ کے ترقی دشمن رجعت پرست اس بات کا بھی پروپگنڈا کر رہے ہیں کہ مشرقی یورپ کے آزاد شدہ ملکوں میں جمہوریت کے نام پر دراصل [illegible] حکومت قائم کی جا رہی ہے حالانکہ ساری دنیا کو معلوم ہے کہ ان ملکوں [illegible] کو برقرار رکھا گیا ہے جسکی اساس [illegible]

اخبارات کی رائیں

مسٹر جناح کی تشریح پاکستان

نومبر کے آغاز میں مسٹر جناح نے نیوز کرانیکل کے نمائندے کے سامنے پاکستان کی جو تشریح کی تھی اس پر بعض موقر اردو اخبارات کے تبصرے حسب ذیل ہیں ——— ادارہ

مدینہ بجنور

جمعیۃ العلمائے ہند کا حامی اخبار سہ روزہ مدینہ بجنور لکھتا ہے۔

پاکستان کے متعلق مسٹر جناح کا ایک بنیادی مطمح نظر ہے وہ صحیح بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی ہوسکتا ہے۔ پاکستان کے بارے میں آزادی کے محاذ پر کام کرنے والے مسلمانوں کا ایک دوسرا خیال ہے۔ ہوسکتا ہے وہ اپنے اصول اور اصل کے لحاظ سے صحیح ہو اور ہوسکتا ہے کہ غلط ہو اس بارے میں ہمارا مطالبہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اس اختلاف کو مخالفت کا رنگ نہ دینا چاہئے اس کا فیصلہ مرضی عامہ اور استصواب رائے عامہ سے ہونا چاہئے ہر وہ فیصلہ جو اس بارے میں کیا جائے مسلمانوں کے دماغوں میں ڈکٹیٹروں کی طرح ٹھونسا نہ جائے بلکہ ہر بات مسلمانوں کے کانوں تک پہنچا دیجائے اور ان کے دل اور دماغ کو کسی نتیجہ پر پہنچنے کا حق دیا جائے۔

مسٹر جناح کے تشریحی نکات نقل کرنے کے بعد مدینہ لکھتا ہے

ان نکات میں سے پہلا نکتہ ہندوستان اور پاکستان کی سیاسی تقسیم سے متعلق ہے ہم چاہتے ہیں کہ مسٹر جناح نے اسکو جس سنجیدگی سے پیش کیا ہے اسی سنجیدگی سے دوسری جماعتیں اس کا تجزیہ کریں اس بارے تما ہماری یہ رائے ہے کہ مسلمانوں کا نصب العین متعین کرنا کسی ایک اسلامی جماعت اور گروہ کا کام نہیں ملک کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کا دارومدار سب سے پہلے مسلمانوں کی رائے عامہ پر ہے۔ اس ملک ماوہ خاص جو اسلامی ہند کے محاذ پر پچاس سال سے سرگرم رہے ہیں ان کا خیال ہے کہ اس مسئلہ کا فیصلہ پوری طرح غور اور بحث کے بعد

کیا جائے کسی فیصلہ کے حق میں ہونے کی یہ دلیل نہیں ہوسکتی کہ وہ اُسے بلندی سے پتھر کی طرح رائے عامہ کے سر پر پھینک دیا جائے اور لوگوں کے دماغوں پر زبردستی دے مارا جائے۔ کیونکہ اس قسم کے فیصلے مقاصد کو تباہ اور قوموں کو برباد کردیتے ہیں۔

آگے چل کر مدینہ پاکستان کے رد و قبول کے لئے حسب ذیل طریقہ بتاتا ہے۔

مسٹر جناح نے ۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنؤ میں طے کیا تھا اور مسلم اقلیت کے صوبوں کے نامراد فائدوں کے لئے پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریت کو برباد کردیا تھا۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ مسٹر جناح اس غلطی کا کفارہ ۱۹۴۵ء میں ادا کرنا چاہتے ہیں اور اس مرتبہ وہ کہتے ہیں کہ میں پنجاب اور بنگال سرحد اور سندھ میں مسلم اکثریت کا پاکستان قائم کرنے کے لئے یو، پی، سی، پی، بہار اور بمبئی کے ۳ کروڑ مسلمانوں کے کفن دفن میں شریک ہونے کے لئے تیار ہوں۔ ہم کہتے ہیں قبل اس کے کہ ہم کو خود اپنی خودکشی، اپنے صوبوں سے جلاوطنی اور اپنے گھربار کی بربادی کے محضرنامے پر دستخط کیلئے مجبور کیا جائے ہمیں اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقع دیا جائے مگر ہم سے کہا جاتا ہے اگر تم اپنی موت پر دستخط نہیں کروگے تو تمھارا سر کچلنا چور کردیا جائیگا اور تمہیں ایک لفظ کہنے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ ۱۹۳۶ء میں مولانا ابوالمحاسن سجاد مرحوم کی رائے تھی کہ مسلمانوں کے نصب العین کا فیصلہ مسلمانوں کی ایک عام قومی موتمر (مسلم نیشنل کنونشن) میں غور و بحث اور تحقیق و تنقیح کے بعد ہونا چاہئے ...

عاجلانہ احمقانہ اور لغو ہے۔ ہم آج بھی یہ خیال رکھتے ہیں کہ انتخاب کے بعد مسلمانوں کی مجلس اعلیٰ شوریٰ (نمائندہ پارلیمنٹ) کا جلسہ طلب کیا جائے اور اُس اجتماع کی بنیاد اس حقیقت پر رکھی جائے کہ دونوں خیال کے مسلمان دیانتداری کے ساتھ اپنی اپنی رائے پیش کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ جب دونوں طرف سے آراء سامنے آجائیں اور دلیلیں سُن لی جائیں اور پارلیمنٹری طریقہ پر اسکو قلمبند کر لیا جائے تو اس کے بعد آخری فیصلہ حاصل کرنے اور متحدہ طور پر ایک نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ کامیابی کا صرف یہی ایک ذریعہ ہے اور اگر مسلمانوں کے لئے رائے کی آزادی کا اصول تسلیم نہ کیا گیا اور ہندوؤں کی خوشامد کرکے ان کو اطمینان دلانے کی کوشش کی گئی تو یہ امر سراسر بے نتیجہ ہوگا۔

ہند

کلکتہ کا قوم پرست اخبار ہند اس بات پر اعتراض کرتا ہے کہ پاکستان میں اسلامی حکومت نہیں ہوگی بلکہ جمہوری حکومت ہوگی وہ لکھتا ہے۔

مسٹر جناح نے فرمایا ہے کہ پاکستان جمہوری ملک ہوگا اور اُسکی حکومت اسلامی ہوگی، اگر اس ارشاد کا مطلب کیا ہے؟ "جمہوری ملک" کا مطلب تو دنیا یہی سمجھتی ہے کہ اُس ملک میں وہاں کے جمہور یعنی وہاں کے باشندوں کی حکومت ہوگی۔ اگر مسٹر جناح "جمہوری" کا یہ مطلب نہیں سمجھتے تو انھیں بتا دینا چاہئے کہ اس لفظ کے معنی اُنکی لغت میں کیا ہیں، لیکن اگر مسٹر جناح کا مطلب بھی اس لفظ سے وہی ہے جیسے دنیا بھر سمجھتی ہے، تو اُن کے اس کہنے کا معنیٰ یہ ہوئے کہ پاکستان میں پاکستان کے باشندوں کی حکومت ہوگی' اور معلوم ہے پاکستان میں ہندوؤں وغیرہ کی تعداد، مسلمانوں سے کچھ ہی کم ہوگی تو اب نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان میں جو حکومت ہوگی، وہ مسلموں اور غیر مسلموں دونوں کی حکومت ہوگی' اور جب غیر مسلموں کی بھی حکومت ہوگی، تو مسٹر جناح کا یہ کہنا بے معنی ہو جاتا ہے کہ پاکستان میں اسلامی حکومت ہوگی۔ مسٹر جناح کا یہ کہنا اس لئے بے معنی ہو جاتا ہے کہ اسلامی حکومت وہی ہو سکتی ہے، جس میں غیر مسلموں کو حاکمانہ اقتدار و اختیار حاصل نہ ہو اگر کسی حکومت میں غیر مسلموں کو بھی حاکمانہ اقتدار و اختیار حاصل رہے تو وہ حکومت "اسلامی نہیں ہو سکتی۔

دیکھ لیا آپ نے، مسلم لیگ کا یہ قائداعظم کس طرح بے معنی نقلوں سے مسلمانوں کو بیوقوف بنانے کی کوشش کرتا ہے [illegible] سانس میں وہ اَن مل، بے جوڑ باتیں کہتا ہے پاکستان میں جمہوریت ہوگی، یعنی پاکستان میں اُس کے سب باشندوں "مسلمانوں اور غیر مسلموں کی حکومت ہوگی' اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں اسلامی حکومت ہوگی! اب بتلائیے "قائد اعظم" کی کون سی بات سچ سمجھی جائے؟

پھر "اسلامی حکومت" سے "قائد اعظم" کا مطلب کیا ہے؟ اسلامی حکومت کے لفظ سے ہر آدمی یہی سمجھتا ہے اور یہی سمجھ سکتا ہے کہ اسلامی شریعت کی حکومت ہوگی، یعنی پاکستان میں شریعت اسلام کا سکہ چلے گا اور غیر اسلامی قانون نہیں چلیں گے۔

ویر بھارت

لاہور کا اخبار ویر بھارت اس تشریح کے بعد بھی کہتا ہے کہ غیر مسلم پاکستان کی مخالفت کرتے رہیں گے اور ان کی مخالفت کی وجہ سے پاکستان نہ بن سکے گا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

آخرکار مسٹر جناح نے مان لیا کہ پاکستان ایک جمہوری حکومت ہوگی۔ نہ کہ اسلامی اور شرعی۔ جیسا کہ مسلم لیگ کے لیڈر آج تک مسلمانوں کو بتاتے آئے ہیں۔ علیحدگی کی صورت میں اسلامی حکومت قائم ہو سکتی تھی اگر مسٹر جناح مشرقی بنگال اور لاہور کے جنوبی و مغربی علاقوں پر قناعت کرتے۔ لیکن وہ تو سندھ اور سرحد کے علاوہ سارا پنجاب سارا بنگال اور آسام کا وہ صوبہ بھی مانگ رہے ہیں۔ جس میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ ڈاکٹر لطیف نے بالکل ٹھیک کہا کہ پاکستان کی جمہوری حکومت میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا تناسب پانچ اور چار سے کم نہیں ہو سکتا اور اگر مسٹر جناح ہندو مسلم مساوات کا اصول بھی مان لیں۔ جیسا کہ انھوں نے شملہ کانفرنس میں کہا تھا تو ہندو پاکستان میں برابر کے حصہ دار ہوں گے۔ مسلمان قائداعظم سے پوچھ سکتے ہیں کہ کیا ان سے قربانیوں کا مطالبہ اسی قسم کی حکومت قائم کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے اور انتخاب میں ان کی [illegible] چاندی کی گولیاں [illegible] کے لئے استعمال کی جا رہی ہیں؟ آج تک مسلمانوں کو خالص اسلامی حکومت قائم کرنے کا [illegible] دیا گیا ہے اور اب ان کے لئے پاکستان نام والی جمہوری حکومت کے تصور میں دلکشی کیسے ہو سکتی ہے۔

... خیال ہے کہ پاکستانی ریاست اقتصادی لحاظ سے ایک بہت بڑی طاقت ہوگی۔ کیونکہ کلکتہ اور کراچی جیسی بندرگاہیں۔ جو گنگا کی سب سے بڑا ہائیڈرو الیکٹرک اسٹیشن اور لوہا۔ پٹرول۔ کوئلہ وغیرہ کے ذخیرے اُسے دولتمند بنادیں گے۔ لیکن مسٹر جناح اس بات کو نظر انداز کردیتے ہیں کہ ان کے مجوزہ پاکستان کی دس کروڑ آبادی میں اگر ۵ کروڑ مسلم ہیں تو ۴ کروڑ غیر مسلم ضرور شامل ہونگے اور پاکستان کے متعلق غیر مسلموں کا نقطۂ نگاہ سب کو معلوم ہے۔ وہ اس حق ہی یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ایک اتنی بڑی ناراضامند اقلیت کو زبردستی اپنے ساتھ لاکر پاکستان اسٹیٹ پھل پھول سکے گی۔

قومی جنگ (نیا زمانہ)

جو کمیونسٹوں کا اخبار ہے پاکستان کے مجوزہ نقشے اور حدود کو زیادہ قرار دیتا ہے اس کی رائے ہے۔

"مسلم لیگ کا یہ مطالبہ حق بجانب ہے کہ آزاد ہندوستان کی ریاست مرکزی اور واحد ریاست نہ ہو اس قسم کی ریاست کا ڈھانچہ تو برطانوی حکومت نے ہم پر عائد کیا تھا۔ اس دلیل کے بعد مسٹر جناح یا مسلم لیگی رہنما صوبوں کی موجودہ مصنوعی حد بندیوں کو کیسے جائز کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ حد بندیاں بھی تو برطانوی حکمرانوں نے اپنی سہولت اور سیاسی مصلحت کے تحت قائم کی تھیں۔

پورے پنجاب، پورے بنگال یا آسام کا مطالبہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مسٹر جناح دوسری قوموں کے علاقوں کو بھی پاکستان میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ انصاف پسندی نہیں، حق تلفی ہوگی۔

مسلمان ان تمام علاقوں کا جائز مطالبہ کرسکتے ہیں جہاں وہ اکثریت میں ہیں لیکن انھیں اس کا حق نہیں کہ وہ دوسروں کی ایک انچ زمین پر بھی للچائی نظریں ڈالیں۔

مثلاً بنگال کے مسلمان زیادہ تر مشرقی اضلاع میں آباد ہیں وہاں کے ضلعوں میں ان کی غالب اکثریت ہے سلہٹ کا ضلع (جو آسام میں ہے) مشرقی بنگال میں ... جہاں بھی بنگالی مسلمانوں کی اکثریت ہے لہذا یہ مشرقی بنگال ہی کا حصہ ہوا نہ کہ آسام کا۔ اس تمام علاقے میں انھیں کو اپنی قسمت کا ... اور خود مختار ریاست یعنی مشرقی پاکستان ... کا پورا ...

رہ گیا مغربی بنگال، سو اس میں مسلمانوں کی اقلیت ہے گو کلکتہ اس کی بندرگاہ مغربی بنگال میں واقع ہے۔ یہاں بھی مسلمانوں کی آبادی ۲۶ فی صدی سے زیادہ نہیں۔ مسلمان مغربی بنگال کو مشرقی پاکستان میں شامل کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ جس حق سے وہ مشرقی پاکستان بنانے کا دعویٰ کرتے ہیں اسی حق کے مطابق انھیں مغربی یعنی ہندو بنگال سے بھی دستبردار ہونا پڑے گا۔

اسی طرح آسام میں سلہٹ کے سوا ہر ضلع میں مسلمان اقلیت میں ہیں اکثر حصوں میں ان کی آبادی ... فیصدی ... سلہٹ تو بلا شک مشرقی پاکستان میں جذب ہو سکتا ہے لیکن آسام کے بقیہ ضلعوں کو پاکستان میں شامل کرنا ایک اجنبی قوم کے علاقہ پر زبردستی قبضہ کرنا ہے جسے انصاف کا تقاضا نہیں ہو سکتا۔

پورا بنگال اور پورا پنجاب بھی پاکستان میں صرف اسی صورت میں شامل ہو سکتا ہے جب مسلمان ان علاقے کے ہندوؤں اور سکھوں کو پوری طرح مطمئن کریں اور ان کی باقاعدہ رضامندی حاصل کرلیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ کانگریس لیگ میں سمجھوتہ ہو اور لیگ یہ بتائے کہ پاکستان اور ہندوستان کے مشترکہ مسائل کا حل جس کو نظم و نسق کی کیا صورت ہوگی۔ لیکن افسوس ہے کہ مسٹر جناح نے اس مسئلہ پر روشنی نہیں ڈالی۔"

صدائے عام

پٹنہ کا اخبار روزنامہ صدائے عام مسٹر جناح کی تشریح پر اظہار خیالات کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

ایک خبر رساں ادارے کے نمائندے سے ملاقات کے دوران میں ۲ نومبر کو قائداعظم مسٹر محمد علی جناح نے پاکستان کے متعلق جو تشریحات پیش کی ہیں وہ نہایت بصیرت افروز ہیں۔ معترضین پاکستان کا یہ کہنا کہ پاکستان کی تعریف نہیں کی گئی ہے اور یہ مسئلہ ابہام میں پڑا ہوا ہے کبھی بھی حق بجانب نہ تھا۔ جہاں تک پاکستان کے بنیادی اصول کا تعلق ہے کل ہند مسلم لیگ کی لاہور والی قرارداد میں اسکی کافی وضاحت موجود ہے اور کوئی دیانت دار شخص اسکو تشنۂ تشریح نہیں قرار دے سکتا۔ جغرافیائی لحاظ سے غیر مبہم الفاظ میں بتا دیا گیا ہے کہ حامیان پاکستان کا منشا ان علاقوں کو پاکستان میں شامل کرنا ہے۔ پاکستان کی تشریح کا اہم ترین حصہ وہ ہے جس میں اسکے سیاسی اور اقتصادی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے "پاکستان جمہوریہ ہوگا" کو مختصر لیکن جامع

اور معنی خیز جملہ ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستان میں آمرانہ یا خود سرانہ حکومت نہیں ہوگی۔ بلکہ ایسی جمہوری حکومت ہوگی جسکی اصل طاقت عوام کے ہاتھ میں رہے گی اور انھیں کی مرضی اور ارادے کارفرما رہیں گے۔

اقتصادی لحاظ سے بھی مسٹر محمد علی جناح نے یہ بات اچھی طرح واضح کر دی ہے کہ پاکستان کی حکومت وقت کے مناسب اور جائز تقاضوں کا ساتھ دے گی اور ایسا نظام قائم کرے گی جس میں سرمایہ داری کو کوئی دخل نہیں ہوگا اور ملک کے جملہ باشندوں کو ملک کی تجارت صنعت وحرفت اور ذرائع سے مساوی طور پر منتفع ہونے کا موقع ملے گا۔

قائد اعظم نے اس اعتراض کی بھی دھجی اڑادی ہے کہ پاکستان کی حکومت کمزور ہوگی اور یہاں کے ذرائع خود کفالت کے لائق نہیں ہونگے اس سلسلے میں انھوں نے پاکستانی علاقے کے گرانبہا معدنی نمونوں کا ذکر کیا جن سے بطریقۂ احسن فائدہ اٹھانے کے بعد کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ پاکستانی علاقہ کافی دولتمند اور اپنا کفیل نہ بن سکے۔ کیسی حیرت کی بات ہے کہ برطانیہ کے ساڑھے تین کروڑ باشندے اپنے محدود علاقے کے ساتھ دنیا کی اول درجہ کی طاقت بن جائیں اور پاکستان جیسے کثیر علاقہ کے دس کروڑ مسلمانوں کی نسبت کہا جائے کہ وہ ایک ایسی طاقتور حکومت نہیں بنا سکتے جو انکی حفاظت کی ضامن ہو۔

کٹ حجتی تو پاکستان کے خلاف اب بھی یقیناً کی جا سکتی ہے مگر ہم بلا خوف تردید یہ کہنے کی جرأت رکھتے ہیں کہ مسٹر محمد علی جناح کی جدید ترین وضاحت کے بعد پاکستان کے خلاف دیانتداری سے کوئی قابل تسلیم اعتراض پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔

خلافت

روزنامۂ خلافت بمبئی جو مسلم لیگ کا موید ہے تحریر کرتا ہے۔

مسٹر جناح کے بیان کردہ خاکہ کا لب لباب یہ ہے کہ ہندوستان میں دو فیڈریشن ہوں گے۔ ایک ہندو وفاق، دوسرا مسلم وفاق مسلم وفاق میں پنجاب، صوبۂ سرحد، سندھ، بنگال اور آسام شامل ہوں گے، ان صوبوں کو وقوع کے لحاظ سے دو زون میں تقسیم کیا جائے گا۔ ان دونوں زون کے نمائندوں پر مشتمل ایک مسلم وفاق بنایا جائے گا۔ اور ہر زون میں جتنے صوبے ہوں گے وہ سب آٹانومس اسٹیٹس یعنی اندرونی آزادی رکھنے والی ریاستیں بنادی جائیں گی مسلم وفاق کوشش کرے گا کہ ہندو وفاق سے مساویانہ اور باعزت طور پر دوستانہ معاہدہ کرے۔ اس طرح ملک کے دو حصے ہو جائیں گے جس کا ہر حصہ ایک مستقل سلطنت ہوگا اور ہر سلطنت کا ایک وفاق ہوگا۔

مسٹر جناح نے جو تشریح کی ہے، ہمیں یقین ہے اس سے پاکستان کے ہندو باشندوں کو اطمینان ہو جائے گا اور وہ یہ سمجھ لیں گے کہ انکے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے ہندو صوبوں میں اس سے کہیں بہتر پاکستان میں ہوگا، پاکستان کے غیر مسلموں کو نظام حکومت میں شریک کیا جائیگا۔ ان کا مذہب، ان کا تمدن، ان کی زبان، ان کا کلچر، اور ان کے تمام حقوق جو ایک شہری کی حیثیت سے اُن کو حاصل ہونے چاہئیں وہ سب حاصل رہیں گے اور وہ اسی طرح آزاد ہوں گے جس طرح پاکستان کا ہر مسلم باشندہ آزاد ہوگا۔ مسٹر جناح کی اس تشریح میں بالفاظ دیگر غیر مسلموں کے لئے "بنیادی حقوق کی آزادی" کا چارٹر پیش کر دیا گیا ہے۔ یہی وہ چیز تو ہے جس پر کراچی کے اجلاس کے بعد سے کانگریس ابتک بڑا فخر کر رہی تھی اور مسلمانوں کو اسی قسم کے اعلان سے تو مطمئن کرنے کی کوشاں تھی؟ اب وہ چیز پاکستان کا محرک غیر مسلموں کے لئے پیش کر رہا ہے۔ تو کیوں نہ اس پر اظہار اطمینان و خوشنودی کریں۔

مسلم لیگ کو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی جماعت کہہ کر یہ اندیشہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ جب پاکستان بن جائے گا تو وہاں بھی سرمایہ دارانہ ذہنیت کارفرما ہوگی اور نظام حکومت جاگیرداروں ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔ مسٹر جناح نے پاکستان کا خاکہ پیش کرتے ہوئے وہی بات فرمائی ہے۔ جو انگلستان کے مزدور لیڈروں نے انتخابات سے پہلے کہی تھی۔ یعنی یہ کہ اہم مصنوعات، معدنیات اور ذرائع رسل و رسائل حکومت کی ملکیت ہونگے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی حکومت کا بنیادی اصول "اشتراکیت" کے اصول پر مبنی ہوگا۔ اب بھی اگر غیر مسلم طبقہ پاکستان کو مشکوک اور مشتبہ نگاہوں سے دیکھے تو سوائے اس کے کہ اُسے عقل سلیم عطا ہونے کی خدا سے دعا کی جائے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

ادبی تنقید

بنگالی شاعری

از ——————— پروفیسر ہمایوں کبیر

مدھو سودن دت کی شاعری بنگال کے نئے ہندو متوسط طبقے کی جذبات و احساسات کو منعکس کرتی ہے اور ٹیگور کی شاعری اس دور کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیتی ہے جسکے بعد سے اس دور کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ٹیگور کے بعد والی شاعری میں زوال اور پستی کے رجحانات کا پایا جانا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ بنگال میں مغربی سرمایہ دارانہ نظام کا سب سے پہلا اثر انفرادیت اور تہذیب کے فروغ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ لیکن مختلف اسباب کی بنا پر اس عروج کا سلسلہ نارمل طور پر جاری نہ رہ سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تو سرمایہ داری اور نہ اسکی تخلیق جمہوریت صحیح معنوں میں بنگال کے قومی کردار کا جزو بن سکی۔ یہ ظاہر ہے کہ اس مسئلے پر اگر سیر حاصل اور تفصیلی بحث ہو سکتی ہے تو صرف ایک ایسے مقالے میں جو بنگال کی سماجی تاریخ سے بحث کرتا ہو۔ لیکن شاعری کو سماج سے علیٰحدہ کرنا غیر ممکن ہے اسلئے بنگالی شاعری پر بحث کرتے ہوئے ان سماجی حقائق و واقعات کی طرف اشارہ لازمی ہے۔

مشرقی بنگال کے قدرتی کچھ حالات ایسے ہیں کہ اُنکے اندر رہ کر فرد میں خود مختاری اور خود اعتمادی کی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں۔ انفرادیت کا یہی وہ گہرا احساس تھا جسکی وجہ سے مشرقی بنگال میں اسلام کے اثرات حاوی ہوگئے اور اسلامی نصب العین سے متاثر ہو کر بنگال کے قومی کردار میں جو انفرادیت پسندی پائی جاتی ہے وہ اور آگے بڑھ گئی چنانچہ یورپ کی جمہوریت جسکی اساس انفرادیت پر قائم ہے اُس کا بھی اثر سب سے زیادہ بنگال ہی میں ہوا۔ اسکا ثبوت یہ ہے کہ اگرچہ برطانیہ کے سیاسی اور معاشی تعلقات سب سے پہلے جنوبی ہند سے قائم ہوئے لیکن بہت بڑے پیمانہ پر برطانیہ کا اقتدار اور دور دورہ اگر قائم ہوا تو سب سے پہلے بنگال میں۔ بنگال ہی میں ہندوستان کی تہذیبی زندگی سب سے زیادہ اور سب سے پہلے برطانوی اثرات کے تحت آئی۔ بنگال کے قومی کردار میں ایسے عناصر موجود تھے جو یورپ کے تہذیبی اثرات سے ہم آہنگ ہو سکتے تھے اسی سبب سے بنگال نے یورپ کے تمدن سے دوچار ہوتے ہی شاعری اور فنون لطیفہ کے بڑے بڑے ماہرین پیدا کرنے چنانچہ انیسویں صدی کے بنگال میں بیشمار ایسی شخصیتیں پیدا ہوئیں جو ملک و قوم کیلئے مایہ ناز تھیں اُن میں ٹیگور کی آواز سب سے بلند تھی۔

چونکہ بنگال کے قومی کردار میں برطانوی اثرات کو قبول کرنیکی صلاحیت موجود تھی اسلئے برطانیہ کے دور حکومت میں بنگال نے اسقدر جلد ترقی کے منازل طے کرلئے لیکن یہ سلسلہ کچھ مختصر اور ناپائدار رہا۔ اور اسکی وجہ بھی یہی تھی کہ یورپ کی عقلیت (RATIONALISM) نے بنگالی کردار کی انفرادیت کو بہت جلد انتہائی منزل عروج پر پہنچا دیا۔ یورپ کے تہذیبی اثرات کے تحت بنگال کی انفرادیت اور جذبہ خود پسندی (EGO-CENTRICITY) کو اچھی طرح چمکا دیا۔ یہ نفسیاتی میلان اتنی بلندیوں پر پہنچ گیا کہ اس سے آگے چل کر خود انفرادی شخصیت کا زوال شروع ہو گیا۔ بنگالیوں میں خود غرضی اور خود رائی کا رجحان ہمیشہ موجود رہا ہے لیکن قدیم طریقۂ زندگی نے انھیں اتنے مواقع نہیں دئے تھے کہ وہ اپنے ان رجحانات کو خطرناک حد تک پہنچا سکیں۔ لیکن جب بنگال میں یورپ کا تسلط قائم ہوا تو پرانا معاشی نظام بکھر کر رہ گیا اور انفرادیت کے بڑھتے ہوئے احساس سے کچھ قدیم روایات اور طریقۂ حیات ختم ہونے لگے۔ جب خود غرضی کسی مخصوص حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو شخصیت بگڑ جاتی ہے اور اس کا اتحاد ختم ہو جاتا ہے۔ فرد کی داخلی زندگی کا ربط اور ہم آہنگی ٹوٹ جاتی ہے اور وہ محض علیٰحدہ علیٰحدہ احساسات اور غیر منظم قسم کے جذبات کا مجموعہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

شخصیت کے اسطرح ٹوٹ کر بکھرنے اور منتشر ہونے کا یہ رجحان موجودہ بنگالی شاعری میں پورے طور پر پایا جاتا ہے۔ یہ رجحان اتنا قوی ہو گیا ہے کہ ہم اسے ایک زبردست انقلاب قرار دے سکتے ہیں۔ گذشتہ جنگ عظیم کے بعد یورپ کی سرمایہ داری نے شدید بحران پیدا کیا اسکا اثر ہندوستان کے معاشی نظام پر بھی پڑا۔ بنگالی شاعری کا نیا میلان ایک حد تک انھیں اثرات کا نتیجہ ہے لیکن اس حقیقت کو واضح طور سے سمجھنے کے لئے بنگال کے متوسط طبقوں میں عروج و زوال کی داستان کا علم لینا ضروری ہے۔ انیسویں صدی میں بنگال کے متوسط طبقوں نے توہمات اور رسوم و رواج کے خلاف علم بغاوت بلند کیا بیسویں صدی میں یہی رجحان آگے چل کر شخصیت پسندی اور انفرادیت پرستی کا سبب بنا

کر دیتی ہے جسکے آگے سماجی قدروں کی کچھ بھی حیثیت نہیں باقی رہ جاتی۔ انیسویں صدی میں انفرادیت ہی کے رجحان کے تحت بنگال کی حسین ترین اور اعلیٰ ترین شاعری نے جنم لیا۔ لیکن بیسویں صدی میں اسی رجحان کے تحت شاعر کی منتشر شخصیت نے ایسی شاعری پیدا کی جو غیر مسلسل احساسات اور ایسے شعور کی حامل تھی جو اپنے مرکز سے اکھڑ چکی ہو۔ یہ غیر فطری میلان جو پیدا ہو گیا ہے دراصل ملک کے معاشی اور سیاسی حالات کے پیدا کردہ احساس شکست اور احساس غم کی تخلیق ہے ملک کی موجودہ معاشی اور سیاسی تباہ و بربادی اور عام احساس پستی کے پس منظر میں ہم بنگال کی حالیہ شاعری کے رجحانات کو سمجھ سکتے ہیں۔

انیسویں صدی کی پوری بنگالی شاعری نے ہندو متوسط طبقوں کی تخلیق تھی یہ زمانہ ان کے عروج اور توسیع کا زمانہ تھا۔ وہ قوت حیات جو اس عروج اور توسیع کا سبب بنی زندگی کے ہر میدان میں ظاہر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ معاشی اور سیاسی میدانوں میں اس کا اظہار یوں ہوا کہ سرمایہ دارانہ نظام اور قومی ریاست اور حکومت کے قیام کی خواہش پیدا ہوئی یہ ظاہر ہے کہ شاعری کسی قوم کی قوت حیات اور قوت نمو کی پیداوار ہوتی ہے یہی سبب ہے کہ جدید بنگالی ادب کی بنیاد انگریزی تعلیم یافتہ ہندو متوسط طبقوں کے ہاتھوں پڑی

لیکن متوسط طبقوں کی ترقی اور عروج کا سلسلہ اپنی متوقع منزل پر نہیں پہنچ سکا اور دفعتاً اسکا خاتمہ ہو گیا۔ بجائے اسکے کہ جاگیردارانہ نظام سرمایہ دارانہ نظام میں بدل جاتے بنگال میں ایک نئے قسم کا سماج پیدا ہوا جو نہ تو جاگیردارانہ تھا اور نہ سرمایہ دارانہ۔ پرانا جاگیردارانہ نظام ختم ضرور کر دیا گیا ہے لیکن اسکے مردہ اثرات ابھی تک بنگال کی زندگی پر چھائے ہوئے ہیں۔ "بندوبست دائمی" ابھی تک ماضی کا بھوت بنا ہوا ہماری گردن پر سوار ہے چنانچہ متوسط طبقے منطقی نتیجے کے طور پر بورژوا اور سرمایہ دار طبقے نہ بن سکے صرف یہ ہوا کہ متوسط طبقے کے لوگ سماج میں پھیلتے اور بڑھتے چلے گئے اور کوئی توازن قائم نہ رہ سکا۔ آج بنگال میں ایسے لوگوں کی تعداد میں بے تحاشا اضافہ ہو رہا ہے جو اپنی روزی زمین کی محض ملکیت سے حاصل کرتے ہیں اسکے استعمال سے نہیں۔ ایسے لوگوں کی غیر متوازن تعداد کا سبب یہ ہے کہ بنگال میں سرمایہ داری کا عروج رکا رکا سا رہا ہے۔

متوسط طبقے کی ترقی اور عروج کا رک جانا پوری قوم کی ذہنیت پر اثر انداز ہوا۔ بنگال کی حالیہ شاعری میں فرار و شکست کی ایک غم آمیز لے پائی جاتی ہے یہ دراصل متوسط طبقے کی شکست اور تباہی کے احساس ہی کا نتیجہ ہے۔ اُس زمانے میں بھی جبکہ ہندو متوسط طبقہ سرعت کے ساتھ ترقی کے منازل طے کر رہا تھا ایک گہری بے چینی اور بے اطمینانی کا احساس اُن پر چھایا ہوا تھا۔ ٹیگور کی شاعری میں یہ احساس اور یہ سماجی شعور اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔ چنانچہ اسکی شاعری میں غم اور افسردگی کی ایک گہری جھلک پائی جاتی ہے۔ ٹیگور کا عظیم الشان ذہن سماج کی طبقاتی رکاوٹوں سے بلند تھا۔ اسکی شاعری نے ترقی زندگی کے اُن عمیق گوشوں سے جواب حاصل کی جہاں طبقاتی رکاوٹ اور تقسیم باقی نہیں رہتی۔ اس بے اطمینانی کے جھلک نے اسکی شاعری کو اور بھی چمکا دیا لیکن اس بے اطمینانی نے اسکی شاعری کی جمالیاتی خصوصیتوں کو تباہ نہ کیا۔ لیکن وہ ادیب اور شاعر جو ٹیگور کی سی فطانت نہ رکھتے تھے انکے ساتھ یہ ہوا کہ سماجی بے اطمینانی اور بے چینی کی جھلک نے اُن کی شاعری پر غلط اثر ڈالا اور اس میں تضاد، بے اعتمادی اور داخلی تصادم پیدا کیا ظاہر ہے کہ ایک شکست خوردہ اور غیر مطمئن شاعر یا فن کار عدم شخصیت (IMPER[illegible] -SONALITY) کی اس منزل پر نہیں پہنچ سکتا ہے جو جمالیاتی اور فنی تخلیق کا اصلی راز ہے۔

متوسط طبقے کی توسیع اور ترقی بہت جلد شکست اور بے اطمینانی پیدا کر کے ختم ہو گئی۔ اسی کے متوازی یہ ہوا کہ ٹیگور کی اعلیٰ ترین فطانت اور اسکے مختلف النوع اظہار کے باوجود بنگالی شاعری اچانک ایک ایسی منزل پر پہنچ گئی جس کے آگے کوئی راستہ نہ جاتا تھا۔ برطانیہ کی پالیسی کا ہمیشہ سے یہ مقصد رہا ہے کہ متوسط طبقے کی ترقی کے امکانات اور ذرائع کو تباہ کیا جائے۔ "دائمی بندوبست" کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ لاخراج کی دوبارہ بحالی اور عدالتوں کی زبان کا دفعتاً بدل دینا یہ سب اُسی پالیسی کے نتائج تھے۔ ان چیزوں کا با تفصیل تذکرہ یہاں ضروری نہیں ہے۔ لیکن یہ جان لینا ضروری ہے کہ دراصل یہ پالیسی جو برطانیہ نے اختیار کی اسکا اصلی مقصد یہ تھا کہ بنگال کے مسلمانوں کے سیاسی اثر اور معاشی حیثیت کو تباہ کر دیا جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انیسویں صدی میں بنگال میں متوسط طبقوں کا جو عروج ہوا اُس میں بنگال کے مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں رہا۔ اس چیز کے تفصیلی بیان اور اسکے اسباب کی تشریح کا یہ موقع نہیں ہے لیکن بہرحال اتنا علم ضروری ہے کہ اس چیز کے دو پہلو تھے جو حالیہ بنگالی شاعری کی تاریخ کے سمجھنے میں مدد کرے گا۔ برطانیہ کی اس پالیسی کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ فرقہ وارانہ اختلافات کو اور مضبوط کیا جائے۔ دوسرے تعلیم یافتہ طبقوں اور جاہل عوام کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ اور انگریزی تہذیب سے متاثر ہندو متوسط طبقہ ان پڑھ مسلم عوام کی اکثریت سے جدا ہو گیا بلکہ بعض لحاظ سے تو وہ خود اپنے ہم مذہبوں سے بھی بے تعلق ہو گیا۔

ہمسائے (افسانہ)

از ——————— صدیقہ بیگم

(سلسلہ کیلئے اکتوبر کا رسالہ ملاحظہ فرمائیے)

"ہاں — ہندوستان آزاد ———" ترلوک نے حیرت سے دیکھا اسکا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ ایسے ہی تیتی ہوگی یہ کیا جانیں۔ لیکن پھر اسکی نظر کھدر کی ساری پر پڑی اس نے سوچا نہیں — باتیں ضرور ہونگی۔ اگر نہ جانتی تو ان جھنڈے والی مورتی میں کیسے ہوتیں — لیکن پھر بھی اس کو حیرت تھی کہ گاندھی جناح صاحب کی صلح سے ہندوستان کیسے آزاد ہوجائیگا۔

"دیکھو بھائی — یہ مصیبتیں جب ہی تک ہیں جب تک ہم آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں اور جب بھی ہم چالیس کروڑ ایک ہوجائیں گے تو سمجھ لو — ہندوستان آزاد ہوجائے گا اور پھر ہر چیز سستی ہوجائے گی۔

"ہر چیز سستی ہوجائے گی — سچ مچ" اُس نے خوش ہوکر پوچھا۔ "کیا دیوی جی آٹا، دال، کپڑا سب سستا ہوجائیگا"

"ہاں اور کیا — آٹا دال کیا پھر تو ہر چیز سستی ہوجائیگی"

"سچ مچ دیوی جی پھر تو ———" یہ کہکر وہ رک گیا۔ وہ شیرا کو سترہ خریدے گا۔ جب سب چیزیں سستی ہوجائیں گی پھر تو ٹھاٹ ہونگے۔ دو چار روز کی پریشانی اور ہے ——— وہ آنے والے بھلے دنوں کے تصور میں کھو گیا۔ اسکی آنکھوں کے سامنے ربّو کی شکل پھر گئی۔ سفید سفید براق سے کپڑے پہنے ہوئے نیلے رنگ کا خوبصورت سا دوپٹہ گلے میں ٹھیک کیے ہوئے۔ ہاں پھر تو وہ ربّو کو چاندی کے بٹن لا دیگا اُسکی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہوگی کہ گھوڑا اس کا اپنا ہوگا — ہر مہینے — اسکے سامنے شیرا تھان پر جھومتا دکھائی دیا — بھیس کے کھڑا تھا۔ اسکے سامنے آگئے وہ مستقبل کے سہانے سپنے میں کھو گیا ———

[illegible] — پیارے لال جی جناح صاحب کی بات [illegible]

کرتے ہیں — صلح کی۔ تو کتنے دن میں معاملہ طے ہوجائیگا؟"

"اب دیکھو جب بھی ہوجائے گا اخبار میں آجائے گا"

وہ پھر سوچنے لگا تو پھر ان لوگوں نے پہلے ہی سے کیوں نہ صلح کرلی۔ اگر پہلے ہی کرلیتے تو کاہے کو شیرا کے بکنے کی نوبت آتی خیر اب بھی کچھ نہیں گیا — اگر اب بھی مان جائیں، مانینگے کیوں نہیں آخر اسی لئے تو بات چیت کر رہے ہیں — کاش وہ اپنے احساسات کو ... کے ... منتقل کرسکتا۔ کیا اچھا ہو اگر یہ لوگ صلح کرلیں۔ اُس نے پھر پوچھا —

"ایسے ہی دو چار روز لگیں گے دیوی جی؟"

"ہاں — اُمید تو یہی ہے"

پھر وہ دیر تک اُن سے باتیں کرتا رہا۔ بہت سی باتیں لڑائی کے بارے میں پوچھیں اور ہر طرح سے اطمینان کرلیا ——— ذرا سی دیر میں تالکٹورہ باغ آگیا اور وہ اتر گئیں۔

"کتنے پیسے ہوئے" انھوں نے دریافت کیا۔

"آپ سے کیا پیسے لیتے دیوی جی ———"

"نہیں نہیں — تمہیں تو دینے ہی پڑتے۔ تمہیں تو دینا ہی ہیں لو" بہت اصرار کرنے پر ترلوک نے چار آنے لئے اور چل دیا۔ وہ بیحد خوش تھا ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے اسکا دماغ کسی بڑے بھاری بوجھ سے ہلکا ہوگیا وہ چاہتا تھا کہ جلد گھر والوں کو بتائے کہ اب شیرا آنے والا ہے۔ ربّو کو بتائے کہ اب اسکے لئے چاندی کے بٹن بھی آجائینگے۔ روز طعنہ دیتی ہے لیکن جس وقت بٹن لاکر دیگا کیسے ہی اچھا لگتا ہے ابھی [illegible] کپڑے [illegible] زیادہ سے زیادہ دیر کرے گی۔ [illegible]

[illegible]

وہ خیالات کے سمندر میں احساسات کی موجوں کے سہارے بہتا چلا جا رہا تھا جس میں اس کا ماضی اور حال ڈوب چکا تھا — آنے والے دن کتنے اچھے ہوں گے۔

شام کے وقت شریف گھر پہونچا۔ اسکی پریشانیاں قریب قریب ختم ہو چکی تھیں۔ آج تو کل سے بھی زیادہ آمدنی ہوئی تھی پر آج اسکو اس کا افسوس نہ تھا کہ اسکی تنخواہ کیوں نہ بڑھائی گئی وہ راستے بھر یہی سوچتا چلا جا رہا تھا کہ کس طرح گھر والوں کو بتلائے کہ آج ہندوستان میں ایک بہت بڑا انقلاب ہو رہا ہے۔ یہ مصیبتیں ختم ہو جائینگی، خوشی کے دن آ گئے ہیں۔ اسکو ٹھیک سے الفاظ نہیں مل رہے تھے کہ وہ کس طرح سمجھائے کہ گاندھی جی اور جناح صاحب کی ملاقات کی اہمیت کیا ہے بس یہ مہنگی ختم ہو پھر چاہے کچھ ہو۔ اسکا جی کسی طرح آ جائے۔ مزا آ جاوے جو کہیں یہ لوگ صلح کر لیں کرینگے کیوں نہیں۔ وہ بھی کیسی عجیب عجیب باتیں سوچتا ہے "بیوقوف کہیں کا" کیا وہ نہیں جانتے کہ لوگوں کا کتنا برا حال ہے۔ ٹھیک سے کھانے کو نہیں ملتا۔ گیہوں نکھٹو بھر ہی نہیں۔ آٹا بھی ہو ملتا ہے۔ بس اللہ رحم کرے۔ ایسا بھی کیا کہ انھیں نہ معلوم ہو۔ اتنے بڑے لیڈر اتنا تو جانتے ہی ہونگے۔ پھر جب انکی صلح سے راج مل گیا ہر چیز سستی ہو جائے گی، سب لوگ چین سے رہنے لگیں گے — یہ سب باتیں ہیں تو پھر انکا کیا جاتا ہے۔ وہ ہمارا فائدہ ہی تو چاہتے ہیں۔ سچے یہ خبر سن کر کتنا خوش ہوں گے۔ سب کے سب وہ انھیں خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ سامنے کچہری نظر آئی۔ وہ سوچنے لگا کتنے نوابوں کی تصویریں ہیں یہاں — نہ جانے انہیں اس کے پردادا کون تھے۔ آخر وہ بھی تو نوابوں سے تعلق رکھتا ہے ہوگا کوئی ایسا ہی — گھوڑے اڑاتے ہوں گے وہ تو مصیبت میں پھنسا ہے۔ جبھی تو ساری نوابی ختم ہو گئی۔ وہ تو اتنا جانتا ہے کہ اس کا باپ جب مرا تھا تو اتنا بھی نہ تھا کہ ٹھیک سے دفنا بھی سکتے۔ بس کسی طرح نماز پڑھوا کر گاڑ دیا اور بڑے دادا بھی تو بری حالت میں مرے۔ ابا بتاتے تھے کہ علاج کرانے کو بھی پیسے نہ تھے — ہم غریبوں کی تو مر کر بھی مصیبت ہے۔ جیتے جی تو خیر ہے ہی — کہیں ... میں گور ہوتی ہے۔ اتنے آدمی ہیں۔ سینے کا قرضہ الگ سے بڑھتا جاتا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے۔ اسکا دماغ بالکل ماؤف ہو گیا۔ حال کی پریشانیوں نے اگر اس کو پھر دبوچ لیا — وہ پاگل ہو جائیگا۔

پھر اسکو یاد آیا۔ پریشانی کی کونسی بات ہے دو چار روز کی تو بس اور ہے — سچ مچ اب تو مزے آ جائیں گے۔ بس صلح کی دیر ہے۔ اسکے دل و دماغ پر یہ شگفتگی آ گئی کہ اس کا ذہن سب بھول گیا سارا جا رہا تھا۔ اتنے میں گھر سامنے آ گیا اس نے دروازہ پر پہونچ کر یکہ رکا یکہ رکنے کی آواز سنتے ہی بچے اندر سے دوڑ پڑے — "بھیا آ گئے — بھیا آ گئے — بھیا ہمیں گھما لاؤ" سب ایک وقت چیخ پڑے۔ شریف کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن انکے شور میں خیالات اسکے دماغ میں گڈمڈ ہو گئے اسکو غصہ آنے لگا۔ وہ تو کتنی اچھی خبر لے کر آیا ہے اور یہاں آتے ہی بچے پریشان کرنے لگے۔ پھر تو وہ بغیر پوچھے ہی یکہ پر چڑھنے لگے۔ "آرو اس پرے" اس نے زور سے ڈانٹا۔ اتنے میں ابو بھی دوپٹہ سنبھالتی ہوئی آ گئی — "کیوں ڈانٹتے ہو بچاروں کو انکا شیرا ہوتا تو کیا —" شریف نے فوراً ربو کی بات کاٹ دی۔

"اری تو نے کچھ اور بھی سنا۔ آج بڑی اچھی خبر لایا ہوں۔"

"کیا خبر لائے ہو۔ تم تو روز ہی اچھی خبر لاتے ہو۔" اس نے دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"تجھے یقین نہیں آتا۔ اری میں کہتا ہوں۔ گاندھی جی اور جناح صاحب صلح کر رہے ہیں۔"

ربو کو ہنسی آئی "یہ لو صلح کر رہے ہیں تو تمھیں کیا — تمھیں بھی شمل نہ آئیگی۔ سچ مچ منی کے بھیا جب —" کاش اسوقت بچے نہ ہوتے۔ وہ زبان سے کچھ بول بھی تو نہیں سکتی۔ لیکن آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے اپنا مطلب ادا کر دیا۔ شریف جھنجھلا گیا "تجھے تو ہر وقت یہی پڑی رہتی ہے جیسے بڑا نیا کام ہی تو کر رہی ہیں —"

"اور نہیں تو کیا — میرے لئے تو نیا ہی ہے"

"خیر۔ سنتی نہیں میری بات میں کہہ رہا ہوں اب یہ مہنگی کے دن ختم ہو رہے ہیں"

"کیوں — کیا لڑائی ختم ہو گئی —؟"

"نہیں جی — لڑائی نہیں" وہ سوچنے لگا کہ کس طرح اسے سمجھائے کہ گاندھی جناح صلح سے ہندوستان آزاد ہو جائے گا — پھر سب چیزیں سستی ہو جائیں گی تو کیا جانے ان باتوں کو۔ بس تھوڑے دن کی بات ہے گاندھی جی اور جناح صاحب یہ سب طے کر رہے ہیں۔ بس

...جان کی مصیبت ہے پھر تو ہم تیرا کو سے آئینگے۔" "تیرا آجائیگا بچے ... بھیے — "اماں تیرا آرہا ہے بھیا کہہ رہے ہیں تیرا آرہا ہے۔"

... بچے ... تے ہوئے اندر چلے گئے — رؔبو کے سینہ سے دوپٹہ ڈھلک گیا ... اس نے جان کر ہی گرایا ہو۔ شریف کی نظر اسکے گلے پر پڑی۔ ساری ... گھر میں ٹانکے کیوں دئے اور اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر دونوں ... توڑ دئے۔ "ہائے اللہ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔ میں نہیں جانتی" ... نے رونی صورت بنا کر کہا۔ "نہیں ایسا ہی کھلا رہے گا۔"

"پھر وہی — تمھیں بھی عقل نہ آئے گی — تھوڑے دن میں ایک ... کے باپ —" وہ اتنا کہہ کر جھینپ گئی۔ "ہاں — ہاں — کیا کہہ رہی تھی"۔ اسکی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

"میں کہتی ہوں گھر میں تم ہی اکیلے تو ہو نہیں جو ایسے ہی کھولے پھروں — اماں دیکھیں گی تو کیا کہیں گی — ویسے بھی وہ دن بھر چلاتی رہتی ہیں کہ بہو بیٹوں کے یہ ڈھنگ نہ ہوتے۔ ذرا دوپٹہ سرکا اور انھوں نے للکارا۔ "لونڈی ماروں کے دن آگئے۔ پر تیرا الٹرپن نہیں گیا۔" اسی مارے تو میں آپ ہر وقت اوڑھے بیٹھے پڑی رہتی ہوں۔" شریف نے ٹالتے ہوئے کہا۔ "رؔبو میں تیرے لئے سلک کا کرتہ لاؤنگا۔ گرگرتہ ٹھیک نہیں جمپر —"

"تو کیا سچ مچ سب چیزیں سستی ہو جائیں گی۔"

"تو کیا میں مذاق کر رہا ہوں۔ ارے دیکھتی رہنا۔ ہر چیز سستی ہو جائے گی۔ کپڑا دیکھنا کتنا سستا بکے گا۔ اچھی سے اچھی سلک ایک روپیہ گز لے لو۔ تیرے لئے تو پھر بہت سی چیزیں لاؤنگا — سچ مچ اپنی رؔبو کے لئے تو جان تک حاضر ہے۔"

"پھر وہی بات" رؔبو کو اسی بات پر غصہ آتا تھا۔ "جان حاضر ہے" یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ نہ جانے کس کی شگت میں رہ رہ کر ایسی بُری بُری باتیں سیکھتے ہو۔"

اتنے میں ماں آگئی — "بیٹا کیا بات ہے۔ یہ بچے کیا کہہ رہے ہیں کہ بھیا تیرا کو لانے والے ہیں۔" انکے پیچھے پیچھے بچے چلے آرہے تھے۔ "ہاں چھوٹا بھیا سے" کسی نے کہا۔

"ہاں اماں — گاندھی جی اور جناح صاحب میں صلح ہو گئی ہے۔ ہندو مسلمان ایک ہو جائینگے۔ پھر ہندوستان آزاد ہو جائے گا اور بس سب چیزیں سستی ہو جائیں گی۔"

"بیٹا کیسی باتیں کر رہے ہو۔ ہندو مسلمان ایک کیسے ہو جائینگے اتنے دن سے تو ہوئے نہیں اور اب ہو جائینگے۔"

"نہیں اماں — صلح ضرور ہو جائیگی۔ تم دیکھتی تو رہو۔"

"ہاں بیٹا — ہم تو بہت دیکھ چکے۔ دیکھتے دیکھتے تو چونڈا سفید ہو گیا۔ اب تم ہی دیکھو۔"

"اماں! تم کیا جانو ان باتوں کو۔ میرے گھر پر ایک لڑکی جھنڈا تھی وہ بتا رہی تھی۔ کھدر کی ساری پہنے تھی" "کھدر پر اس نے خاص طور پر زور دیا" وہ ان جھنڈے والی پارٹی کی تھی۔

اماں کچھ قائل ہوتی ہوئی نظر آئیں۔ "کسی طرح بیٹا یہ تنگی ختم ہو جائے پھر کچھ ہو اب تو جان مصیبت میں ہے۔"

دن گزرتے گئے لیکن شریف کو کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ ہندوستان کب آزاد ہو رہا ہے۔ وہ اکثر یہ سوچ کر گھبرا جایا کرتا تھا کہ جب ان لوگوں کو معلوم ہے کہ ان کی صلح سے ملک آزاد ہو جائے گا۔ تنگی ختم ہو جائے گی، لوگ بھوکے نہ مرینگے تو پھر یہ دیر کیوں۔ بھلا اس میں اتنی لمبی چوڑی بات چیت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس نے اکثر لوگوں کو بات چیت کرتے سنا۔ قریب قریب ہر ایک یہی تو کہتا تھا کہ صلح ہو جائے گی۔ گاندھی جی نے پاکستان مان لیا۔ پھر کیا جھگڑا ہے کتنے دن ہو گئے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کیا ہوگا۔ جس سے بھی پوچھو یہی بتا ملے کہ بات چیت ہو رہی ہے۔ ہر ایک کہہ رہا ہے کہ جناح صاحب نے ۱۱ اکتوبر کو کہا تھا کہ اگر ہم صلح نہ کر سکے تو یہ سمجھو کہ ہماری عقل کا دیوالہ نکل چکا ہے اور گاندھی جی نے بھی کہا ہے کہ چاہے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں — دنیا کی آنکھیں ہماری طرف لگی ہوئی ہیں۔ ہم ہر طرح کوشش کرینگے کہ کسی طرح صلح ہو جائے۔ شریف یہ باتیں سنکر مطمئن سا ہو جاتا۔

گھر پر یہ حالت تھی کہ جیسے ہی وہ گھر پہونچتا بچہ بچہ اس سے پوچھتا "بھیا صلح ہوئی یا نہیں —" اسکا ناک میں دم آگیا تھا اور جب وہ کہتا کہ بھائی جب ہو گی میں آپ بتا دونگا ابھی کچھ پتہ نہیں تو لٹکے ہوئے چہرے کملا جاتے۔ پھر بھی وہ سب کو تسلی دلاتا رہتا کہ صلح ضرور ہو جائے گی۔

— کوٹھی کی شام کو شریف جب لوٹا تو چاچا بوڑھا تھا۔ ایک بابو صاحب بیٹھے ہوئے تھے یکایک ایک آواز سے اچھو نکا دیا۔ گاندھی جناح بات چیت ختم ہو گئی۔ روشن خیال لوگ ہو گئے انجام اخبار ہو — آج کی تازہ خبر —۔

شریف گھبرا گیا وہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ کئی دن سے وہ برابر اسی قسم کے خواب دیکھ رہا تھا کبھی دیکھتا کہ صلح ہو گئی — اور کبھی یہ کہ نہیں ہوئی اسوقت اسی پریشانی کی مدد تھی۔ اسکا بنایا ہوا محل جکنا چور ہو گیا تھا اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا — یہ تنگی سدا رہے گی، فقیر اب اسکے پاس نہیں اسکا اب وہ گھر جا کر کیا کرے گا۔ بچے روز شام کو اسکا انتظار کرتے ہیں۔ تو پہلا سوال یہی کرتے ہیں — اسکی آنکھوں کے سامنے ان کا کھلا چہرہ آگیا وہ کسی کے پاس نہیں آئینگے۔ پہلے اُس کے تصور سے اسکو ایک خاص قسم کا لطف آتا تھا لیکن اس وقت اسکو تکلیف ہو رہی تھی۔ "اب کیا ہوگا" اسکی زبان سے بے ساختہ نکل گیا شبد وقت کہیں سکے" اسکو خیال بھی نہیں آیا کہ کیسے پر کوئی بیٹھا ہے کیا ہوگا۔ اسکو جب خیال آیا تو وہ چونک پڑا جیسے سوتے سوتے جاگ گیا ہو —

"بابو جی! صلح کیوں نہیں ہوئی"

"میں ابھی اخبار میں دیکھا۔ گاندھی جی کہتے ہیں کہ ہندو مسلمان ایک قوم ہیں اور جناح صاحب کہتے ہیں نہیں دو قومیں ہیں۔ بس اسی بات پر بات چیت ٹوٹ گئی"

"سمجھدار بھی تنگی تو سب کے لئے ہے۔ ایک قوم ہو چاہے دو یہ بھی کوئی بات ہوئی"

"لیکن انھوں نے کہا ہے کہ بات چیت ہمیشہ کے لئے ختم نہیں ہوئی — پھر ملیں گے"

شریف کا خون کھول رہا تھا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ ایک قوم ہیں دو قوم ہیں — پڑھے لکھے آدمی ہیں، دنیا دیکھی ہے پر ہم غریبوں کا انکا بھی خیال نہیں۔ سکو غصہ آنے لگا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اسکا دماغ پھٹ جائیگا۔ پھر اسکو یاد آیا، بابو جی کہتے تھے کہ پھر ملیں گے — ممکن ہے سمجھ میں آجائے پڑھے آدمی ہیں کوئی بیوقوف تھوڑا ہی ہیں غلطی ایک بار ہوتی ہے۔ ہمیشہ تھوڑی ہوتی ہے — وہ بھی آخر آدمی ہیں — پھر نئی امنگ روشنی آگئی۔ سراتی بل کھاتی ہوئی گزرتی — ڈوبتے ہوئے سورج کا جھلملاتا ہوا عکس — شفق کی سرخی کے درمیان سورج کھویا ہوا تھا۔ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی — سورج کی مدھم روشنی۔ شفق کی سرخی۔ تمام گلے —

اپنی کوٹھی میں ان کا آنا جانا بھی جاری تھی پہلے دنیا الٹ جانے کا تھا۔ شریف نے پھر اپنی نظر اٹھائی — پھر وہی ہلکی ہلکی، دبی دبی ہنسی کی پریشان کن خوفناک یادیں — حال کی بے اطمینانی — مستقبل کا خوف — دیکھئے اب وہ دوبارہ کب ملتے ہیں کب ہندوستان آزاد ہوتا ہے کب سستی کا زمانہ آتا ہے۔ وہ انھیں خیالات میں کھویا ہوا گھر پہنچا۔ اسکا دماغ ماضی، حال، اور مستقبل کے جالوں میں الجھا ہوا تھا — نظر سامنے کھیلتے ہوئے بچوں پر پڑی جو اسکے دیکھتے ہی دوڑ پڑے۔

"کیوں بھیا کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں — پھر ملیں گے۔ ابھی صلح نہیں ہوئی —"

رقیہ نے اندر سے سن لیا وہ دوڑتی ہوئی آئی۔ بچے افسردہ ہو گئے — منی چیختی ہوئی اندر چلی گئی — "اماں اب کیا ہوگا صلح نہیں ہوئی — تمھارا نہیں آئے گا —" ذرا سی دیر میں گھر میں کہرام مچ گیا۔

رقیہ جلدی میں بغیر دوپٹہ اوڑھے ہی چلی آئی — اس نے اسکے قریب پہونچکر آہستہ سے کہا۔

"کیا ہوگا منی کے بھیا — آج گھر میں کھانے کو نہیں میرے دل الگ ہو رہا ہے۔ میں کیا کروں، یہ لوگ کیوں ایک دوسرے سے لڑتے ہیں — "وہ پاگلوں کی طرح مبہوت کھڑی تھی۔ شریف محسوس کر رہا تھا جیسے اسکا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ گھر میں سب لوگ پریشان ہو گئے۔ کتنے دن کی آرزوئیں خاک میں مل گئیں اس نے غلطی کی آج گھر میں کھانے کو نہیں پریشانی الگ سے کر دیا۔ بابو جی سے وہ روپیہ پیشگی لے چکا ہے اور بنئے نے ادھار دینا الگ بند کر دیا۔

بابو آج یونہی سو رہو۔ آٹھ نو گھنٹے کی تو بات ہے کل کچھ نہ کچھ ہو ہی جائیگا۔ اب ایسا بھی کیا۔ کوئی جھگڑا تھوڑا ہی ہے — وہ لوگ پھر ملیں گے۔ رقیہ جاؤ دوپٹہ تو اوڑھ لو۔ ہائے اللہ تم کیسے کھڑی ہو دیکھو سینہ کھلا ہے کیا اچھا ہو اگر دو چار دن بعد پھر گاندھی جی اور جناح صاحب میں صلح ہو جائے ہمارے گھر میں خوبصورت سا بچہ ہو — شیرا تمھاں پر بھے۔

ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ دونوں کی آوازیں اندھیرے میں ڈوب گئی تھیں۔ ہر طرف خاموشی — یہی خاموشی — اتنے میں سڑک پر بجلی کی روشنی ہوئی۔

ختم ————

اقبال اکیڈمی کی تازہ ترین اور مقبول ترین تصانیف

تعلیم کا مسئلہ: عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے مایۂ ناز پروفیسر ڈاکٹر محمد رضی الدین صاحب صدیقی ایم۔ اے' پی' ایچ' ڈی نے پوری وضاحت کے ساتھ ہماری تعلیمی ضروریات پر بحث کی ہے اور مستقبل کے لئے ایک نظام تعلیم کا مشورہ دیا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف اساتذہ اور طلبہ کو مفید ثابت ہوگا بلکہ ہر لکھے پڑھے کے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کرے گا۔ قیمت عہ

ھندوستانی مسلمان: انگریزوں نے جب مسلمانوں سے حکومت لی تو یہاں کیا کیا نئے قوانین جاری کئے اور کس طرح مسلمانوں کی تعلیمی' سیاسی اور اخلاقی حالت کو کمزور کیا اگر آپ اسکی تفصیل دیکھنا چاہیں تو ولیم ہنٹر آئی سی ایس کی کتاب کا مطالعہ کیجئے اور جو پہلی مرتبہ اردو میں ترجمہ ہو کر چھپی ہے قیمت عہ

کالا پانی: سید احمد بریلوی ؒ کی جماعت مجاہدین کے ایک سرگرم رکن مولوی محمد جعفری تھانیسری کی آپ بیتی۔ وہ کس طرح گرفتار ہوئے۔ کالے پانی میں ان کی عمر کس طرح گزری اور انگریزوں نے وہابیت کا ہوا کس طرح بھیانک شکل میں ہندوستانیوں کو دکھایا اور مسلمانوں کو کچلنے کے لئے کیا طور طریقے استعمال کئے اس کی پوری تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ کیجئے۔ قیمت ایک روپیہ

تقویۃ الایمان: حضرت شاہ اسمٰعیل شہید ؒ کی مشہور کتاب تقویۃ الایمان کا ایک نہایت خوبصورت' بہترین اور صحیح ترین ایڈیشن پہلی بار پورے اہتمام کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ جن لوگوں کے پاس اس کتاب کا کوئی ایڈیشن موجود ہے اُن کو بھی یہ نادر نسخہ حاصل کرنا چاہیئے۔ اس کتاب کے شروع میں مولانا کے ذاتی حالات اور آخر میں ان کا ایک غیر مطبوعہ مقالہ "یک روزہ" بھی شامل ہے۔ ان تمام خصوصیات نے اس کتاب کو لاثانی بنایا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

سیرت سیدہ فاطمہ: جناب سیدہ فاطمۃ الزہرا بنت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک سیرت اور پاک زندگی کے حالات' مردوں' عورتوں' بہنوں اور بچوں سب کے لئے سبق آموز ہیں۔ یہ کتاب اتنی مفید اور بلند پایہ ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ قیمت دو روپے بارہ آنہ

کتب سماوی پر ایک نظر: تورات و انجیل کی تاریخ حیات اور اُن کی تعلیمات کا قرآن پاک کی تاریخ اور ان کی تعلیمات سے موازنہ۔ اردو زبان میں یہ پہلی تحقیقی تصنیف ہے جو یورپ کے اصول تحقیق پر لکھی گئی ہے۔ قرآن پاک کے ہر ماننے والے کو اس کتاب کا مطالعہ لازمی ہے۔ قیمت دو روپے بارہ آنے۔

مندرجہ بالا کتب کے علاوہ ہمارے پاس علامہ اقبال کی جملہ تصانیف موجود ہیں اور علامہ کے متعلق جو کتب ادھر اُدھر شائع ہوئی ہیں وہ اکثر و بیشتر موجود ہیں
اگر آپ اسلامی اور سیاسی لٹریچر کا مطالعہ کرنا چاہیں تو ہماری خدمات سے فائدہ اٹھائیں

منیجر اقبال اکیڈمی 54 (الف) سرکلر روڈ بیرون موچی گیٹ لاہور

چند جدید الطبع معرکتہ الآرا کتابیں

نام مصنف	نام کتاب		قیمت
ابراہیم جلیس	زرد چہرے	سبق آموز افسانے سوسائٹی کی کمزوریوں کا خاکہ	عگ ۴ر
اقبال	فلسفہ عجم	ڈاکٹر اقبال نے اپنے ابتدائی دور میں عجمیوں کے فلسفہ پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی اس کا ترجمہ	سے ۱ر
بجلی جاپوری	فلمی تتلیاں	نامور فلم ایکٹرسوں کے باتصویر حالات	سے ر
سعید صدیقی	داستان کربلا	حادثہ کربلا پر مشاہیر علما، اور ممتاز اہل قلم کے بصیرت افروز مقالات کا مجموعہ	عگ ۱۴ر
سید سلیمان ندوی	سیر افغانستان	تین ہم سفر۔ سید سلیمان ندوی۔ ڈاکٹر اقبال۔ اور سر راس مسعود کا سفرنامہ افغانستان	عگ ۸ر
شاہد حسین رزاقی	نازیت	بالشویزم کے مخالف تحریک کا نام جسے دوسرے لفظوں میں ہٹلرازم کہتے ہیں	عہ ۱۲ر
عبدالرحمٰن سعید	قائدین کے خطوط	سیاست حاضرہ پر قائدین کے خطوط مسٹر جناح کے نام	عار
غلام دستگیر رشید	اسلام کے سیاسی تصورات	اسلام کے سیاسی تصورات مشاہیر زعماء کے قلم سے	عگ ۴ر
	حکمت اقبال	حکمت اقبال کے مختلف پہلوؤں پر حکیمانہ تجربے اور تبصرے	للعہ ر
	فکر اقبال	اقبال کے نظریات فکر و عمل ان کی تصنیفات کی روشنی میں	للعہ ر
فضل حق قریشی	آجکل کے رومان	عورتوں کے قلم سے لکھے ہوئے شاہکار افسانوں کا مجموعہ	عہ ۱۲ر
عیسی رامپوری	خطا	ایک معاشرتی ناول	سے ر
	سزا	سزا کے مختلف پہلوؤں پر ناول کے پیرایہ میں روشنی ڈالی ہے	عگ ۴ر
	ضربیں	معاشرتی افسانوں کا قابل قدر مجموعہ	سے ر
ماہر القادری	ذکر جمیل	کیف و سرور سے معمور ایک نعتیہ مجموعہ کلام	عہ ۱۲ر
مجنوں گورکھپوری	سرنوشت	فلسفیانہ خیالات اور تاثرات ایک مسلسل افسانہ کی صورت میں	عار
مسلم ضیائی	روسی ظرافت	ملک روس کی لطیف ظرافت۔ ہندوستانی نقطۂ نظر سے کہیں بمشکل کوئی ظرافت کا پہلو نکلتا ہے	عگ ۴ر
نعیم صدیقی	ذہنی زلزلے	موجودہ نظام کے خلاف ذہنی ہیجانات کی عکاسی افسانوی رنگ ہیں	عگ ۴ر
صدیقہ بیگم صاحبہ	ہچکیاں	دلچسپ اور سبق آموز افسانے۔ سسکتی ہوئی تہذیب کا خاکہ	سے ۴ر

ملنے کا پتہ :۔ صدیق بک ڈپو۔ لکھنؤ

دی مغل لائن لمیٹڈ

جنگ کے زمانے میں

عدن، جدہ، پورٹ سوڈان مصر اور ماریشس

جانے والے ہمارے مسافر اور مال کے جہازوں کی آمد و رفت ناگزیر حالات کی وجہ سے بیقاعدہ رہی

قیام امن کے بعد

ہمیں امید ہے کہ حالات عنقریب پہلے کی طرح ہو جائیں گے اور ان بندرگاہوں پر سفر کرنے والوں اور مال بھیجنے والوں کے لئے انشاء اللہ بہت جلد ہمارے جہازات پھر اسی مستعدی اور باقاعدگی سے آنے جانے لگیں گے۔

دریافت طلب امور کے لئے:—

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶۔ بنک اسٹریٹ

بمبئی

آئی ہے انقلاب لئے بیسویں صدی

ماضی اور مستقبل کا تصادم

ہندو مسلم اتحاد کی شاندار تصویر

بھونانی پروڈکشنز کا انقلاب انگیز شاہکار

بیسویں صدی

ایم۔ بھونانی

نرگس، موتی لال، مظہر خان، آشالتا، گوپ، اینڈ وانی

بکنگ ۱۰-۰۰ سے ۱۲ اور ۳ سے ۶ بجے

سواستک ٹاکیز

شو روزانہ: ۳-۰۰ اور دس بجے
سنیچر اتوار کو ایک بجے

STANDARD PICTURES

بمبئی کے شہرۂ آفاق فلمساز ادارے اسٹنڈرڈ پکچرز کارپوریشن

کے بسائے ہوئے چمنستان فلم کے

وہ پھول جن کی خوشبو

بیرم خاں

کے پردۂ سیمیں پر ضوفشاں ہوتے ہی مشام عالم کو معطر کردیگی

پروڈیوسر: مشہور فلمساز مسٹر ھومی والا

ہدایت کار: آفتاب صنعت مسٹر گجانن جاگیردار   افسانہ: خان بہادر حکیم احمد شجاع

مکالمے: مسٹر کمال امروہوی   موسیقی: مسٹر غلام حیدر

فلم بیرم خاں کے جگمگاتے ستارے

گجانن جاگیردار۔ آہو چشم مہتاب (بعنایت منروا مووی ٹون) غلام محمد۔ سرشیس۔ رمیش۔ ڈیوڈ۔ بنجامن۔ زیب النساء۔ ہنسا۔ بورج موہن (عباس)

یوسف آفندی۔ سسن۔ سنالنی دیوی۔ للیتا پوار۔ شاہنواز

اسٹنڈرڈ پکچرز کارپوریشن جوتی۔ اسٹوڈیو کینڈی بریج بمبئی نمبر ۷

ڈائریکٹر: مسٹر بھگوان

پروڈیوسر: مسٹر آنند ایس مونیم

دلکش نغمات

رقص سحر کن

جاگ رتی پکچر کا بصیرت افروز کارنامہ



نغمۂ صحرا



دیکھئے محبت اپنے مقصد میں ہمیشہ بغیر قہر و غضب کے صرف خاموش قربانیوں سے کامیاب ہوئی ہے

فلم نغمۂ صحرا دیکھنے کے بعد آپ محسوس کرینگے کہ محبت کا یہی افتخار ہے

اداکار

شہنشاہ فلم ماسٹر وٹھل
کیرکٹر ایکٹر بھگوان
مسٹر بسنت۔ امرناتھ۔ مسٹر نواز
بھگوان داس کئی کہنہ مشق
ستارے

وہ آرٹ جو عربی تمدن کا صحیح عکس پیش کرتا ہے

وہ موسیقیت جسے پوسے دو ارب سنتے ہیں

وہ۔ ادب جن نے سینۂ قرطاس پر آج تک عربی
افیت کو زندہ رکھا

تمثیلی شخصیتیں

مس خورشید (نو)
کونتا دیوی
شانتا پٹیل
و کئی غارت گرایاں
کے ساتھ

سال رواں کی کیف آور رومانوی تصویر و محبت بھرے دلوں کا عکس رنگیں ہے۔
جسے ہر دل عزیز جاگ رتی پکچر انتہائی کاوش و زر کثیر کے بعد آپ کو زندگی کے
حقیقی موضوع پر متوجہ ہونے کے لئے پیش کر رہی ہے۔

ڈائیلاگ و گانے

حضرت احسن رضوی داناپوری

موسیقی

مسٹر مسی رامچندر صاحب

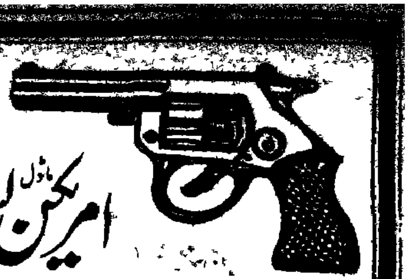
برائے تفصیلات | جاگ رتی پکچر بمبئی ۱۴ | پبلسٹی بیکو

آئینہ سکندری

ترکال درشی شیشہ

کہتے ہیں سکندر بادشاہ کے پاس ایک آلہ تھا جس سے وہ دنیا کے سب آ
والے واقعات کو پہلے سے ہی دیکھ لیا کرتا تھا لیکن اب نہ وہ سکندر ہے نہ وہ آلہ اب
دورِ جدید میں چشمِ مشتاق ایک ہی چیز کو دیکھ رہی ہے جس کا نام ترکال درشی شیشہ ہے جس
بدولت ساحر لوگ بیجان ہڈیوں کے پنجر میں روح پھونک کر اس سے بات چیت کر
ہم نے اس عجیب غریب نئے اصول اور جدت پر حیرت انگیز شکل کا آلہ ایجاد کیا ہے
کی مدد سے آپ ہر قسم کے طلسمی سوالات کا جواب بڑی آسانی سے معلوم کر سکتے
مثلاً گمشدہ کا پتہ چلانا اس دنیا اور دوسری دنیا کے عجائبات دیکھنا تقدیر رو
اور حیات و ممات کے متعلق سوالات پوچھنا کیا ہمارا بیمار اچھا ہو جائیگا اور میری
زندگی کیسے بسر ہو گی۔ مجھے کس قسم کی عورت ملے گی دفینہ معلوم کرو۔ پردیس
ہوئے کا پتہ لگانا۔ کیا تلاش روزگار کے لئے مجھے پردیس جانا پڑے گا فلاں
کیسا ہے۔ مجھے اس پر اعتبار کرنا چاہیئے میری تقدیر میں کیا لکھا ہے۔ کیا
مقدمہ میں کامیابی ہو گی۔ میرے خواب کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ میرا آج کا دن کیسا گذریگا
اس قسم کے سینکڑوں سوالوں کے جوابات اس طلسمی شیشہ سے کئے جا سکتے ہیں نیز ما
و مستقبل کے حالات کسی مشکل کے حل ہونے یا نہ ہونے کا انکشاف ارزانی و قحط کے
قبل از شروع سال معلوم ہو سکتے ہیں اور دلیتوں شہیدوں بلکہ تمام عزیزوں اور دوستو
روحوں سے ملاقات ہو سکتی ہے جو کہ مر چکے ہیں بھوت پریت آسیب جن بھی اگر گھر میں ہو
دفع کئے جا سکتے ہیں افلاس و پریشانی دفع ہونے کی تدبیریں بھی ملیں گی حب و بغض مشکل
میں کامیابی ہو سکتی ہے جس عورت یا مرد کو کبھی دیکھا ہو وہ اس آئینہ میں جلوہ گر ہو گا
سربستہ راز و خفیہ اسرار پوچھ لو بزرگان سلف سے باتیں کر لو ہر قسم کے مریض کی تشخیص
بھی ممکن ہو گا وغیرہ وغیرہ جو چاہو دریافت کر لو اصلی ترکال درشی شیشہ سوائے ہمارے
کے انڈیا بھر میں بھی کسی اور جگہ سے آپ کو مل سکے گا ایک بار کا خریدا ہوا عمر بھر
ترکال درشی آئینہ واقعی بڑے کام کی چیز ہے۔ **نوٹ**۔ اس شیشہ سے عورت مرد
یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں باوجود ان تمام خوبیوں کے قیمت ترکال درشی آئینہ فی عدد صرف تین
ہے کاپی ترکیب استعمال چھپی ہوئی ہمراہ ارسال ہو گی پسند نہ آنے یا غلط نکلنے پر واپسی کی شرط
اصلی کلیدِ سٹہ سٹہ و لاٹری کا نمبر معلوم کرنے والی آسان کتاب قیمت صرف ایک

ملنے کا پتہ: **مینیجر موہنی بھنڈار رجسٹرڈ لاہور**



زبردست چھ فیر والا

امریکن پستول ماڈل

اس پستول کی خوبیاں بیان کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے۔ مگر پھر بھی آپ کو بتائے دیتے ہیں کہ اس میں خوبی یہ ہے کہ اصلی پستول امریکہ کے مقابلہ میں حال ہی میں تیار ہو کر آئے ہیں جن میں خوبی یہ ہے کہ اصلی پستول کی مانند کارتوس رکھنے کی چرخی خود بخود گھومتی ہے اور کارتوس چلنے کی آواز اس زور سے آتی ہے کہ چھوڑنے والا بھی حیران رہ جاتا ہے اپنی جان و مال کی حفاظت کیلئے اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ اس میں ½ انچ کے کارتوس چلتے ہیں اس پستول کا وزن تقریباً ۱۰ اونس ہے لمبائی تقریباً ۵ چور ڈاکو اسکی آواز سن کر اور شکل دیکھ کر ہی بھاگ جاتے ہیں قیمت ۱۱/ پستول بجہ و شاٹ البیر ۱۲/ عمدہ کوالٹی اصلی فولاد کا بنا ہوا مع و شاٹ ۱۳/ سپیشل درجہ خاص ہو ماڈل مع شاٹ چھ ر پیلے آنے فالتو کارتوس اشاث، قیمت ع پستول کیلئے تیل فی شیشی ۱۲ر محصول وغیرہ معاف۔

الائیڈ ٹریڈرز لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۲۶۱ لاہور

پہلی رات کس طرح گذاری

ایک دلہن کی سنسنی خیز آپ بیتی

گورنمنٹ آف انڈیا سے باضابطہ رجسٹری شدہ

دلچسپ و دھڑکا دینے والی سچی کہانی جس کو پڑھ کر ساٹھ سالہ بوڑھے بھی جذبات کو قابو میں نہیں رکھ سکتے جن مریضوں کو طاقت کی ہزاروں دوائیاں جوان نہیں بنا سکیں وہ اس کتاب کو ایک دفعہ پڑھ کر ہی جوان مرد بن جاتے ہیں اور پھر بار بار پڑھتے ہیں موقعوں کی وہ پرائیوٹ باتیں جن کی آپ کو بالکل خبر نہیں اور جنسیات کے وہ راز آج تک آپ سے پوشیدہ ہیں آپ پر پوری طرح روشن ہو جائیں گے۔ قیمت فی جلد دو روپے علاوہ محصولڈاک

اصلی کوک شاستر یہ وہ کتاب ہے جو اپنی خوبیوں کی وجہ سے کئی ہزار فروخت ہو چکی ہے مرد عورت کی سنسنی خیز تصویریں قیمت صرف دو روپے علاوہ محصولڈاک

حسن کی دنیا ۱۷ سے ۲۵ سال تک خوبصورت لڑکیوں کی کارڈ سائز کی ۲۶ تصاویر کیمرہ کے پرائیوٹ حالت میں قیمت فی البم چار روپے رعایتی قیمت تین روپے۔

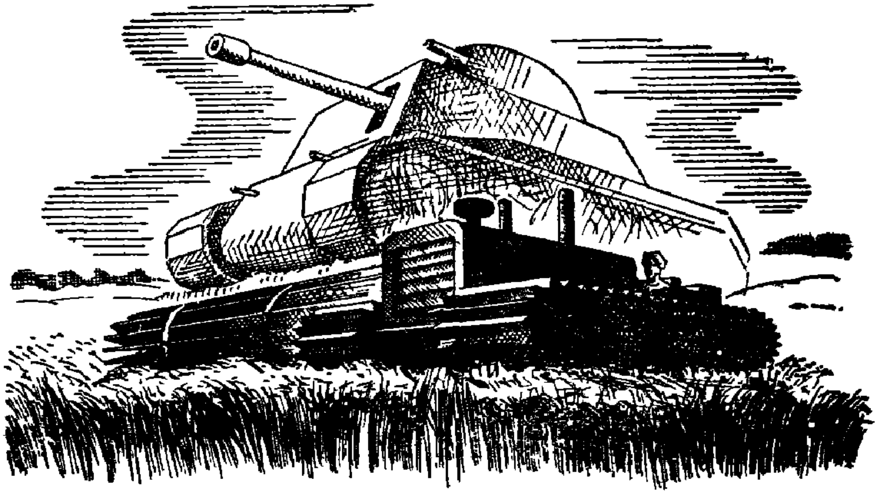
ایسٹرن آرٹس اکاڈمی لمیٹڈ ۲۲۳ لاہور

تین صد روپیہ مفت انعام

عملِ محبت کے شائقین ہمارا اصلی جادو تعویذ منگا لیں اس کو اپنے پاس رکھ کر اپنے دل میں جس کسی کا نام لیں گے۔ خواہ وہ کیسا ہی پتھر دل مغرور اور سخت کلام کیوں نہ ہو جہاں کہیں بھی ہو گا آپ سے ملنے کیلئے تڑپنے لگ جائیگا اور جب بھی آپ اس کے سامنے جائیں گے وہ آپ سے اظہار محبت کریگا۔ ہر وقت آپ کے ساتھ رہنے کی خواہش کریگا نیز گمشدگی کی تلاش کرنا کسی کے دل کا بھید معلوم کرنا مردہ روحوں سے بات چیت کرنا معشوق کو بس میں کرنا حسب مرضی روزگار حاصل کرنا غرضیکہ آپ کے ہر ایک سوال کا جواب آپ کو مل جائیگا اور آپکے دل میں کوئی ایسی خواہش ہے جو باوجود کئی ہزار کوششوں کے بھی پوری نہیں ہوتی تو وہ بھی ہمارے اصلی جادو تعویذ کے پاس رکھنے سے گنتی کے دنوں میں پوری ہو جائیگی معاوضہ فی تعویذ دو روپے محصولڈاک علاوہ۔ غلط نکلنے پر قیمت واپسی کی شرط۔

موہنی بھنڈار رجسٹرڈ لاہور

جب تلواریں ہلوں میں اور ٹینک ٹریکٹروں میں تبدیل ہونگے



بھاری بھرکم گاڑیاں مُلک بھر میں دوڑتی اور گرجتی پھریں گی۔ مگر اُن کی آ [illegible] کی بھیانک گونج نہ ہوگی۔۔۔ ہندوستان کے وسیع دیہات میں ایک نہایت اُمید افزا بیداری کے آثار پائے جاتے ہیں۔ کاٹھ کے ہلوں، پھاوڑوں اور درانتیوں کا زمانہ ختم ہوا، جبکہ ہمارے کاشتکار اپنی سخت مشقت کا بہت قلیل صلہ حاصل کرتے تھے۔ اِن کی جگہ بڑے بڑے ہل، فصل کاٹنے کی مشینیں اور دُوسرے زراعتی آلات اور انجن کام میں لائے جائیں گے۔ جن کی بدولت کاشتکار کی مشقت کم اور زمین کی پیداوار کہیں زیادہ ہوجائے گی۔

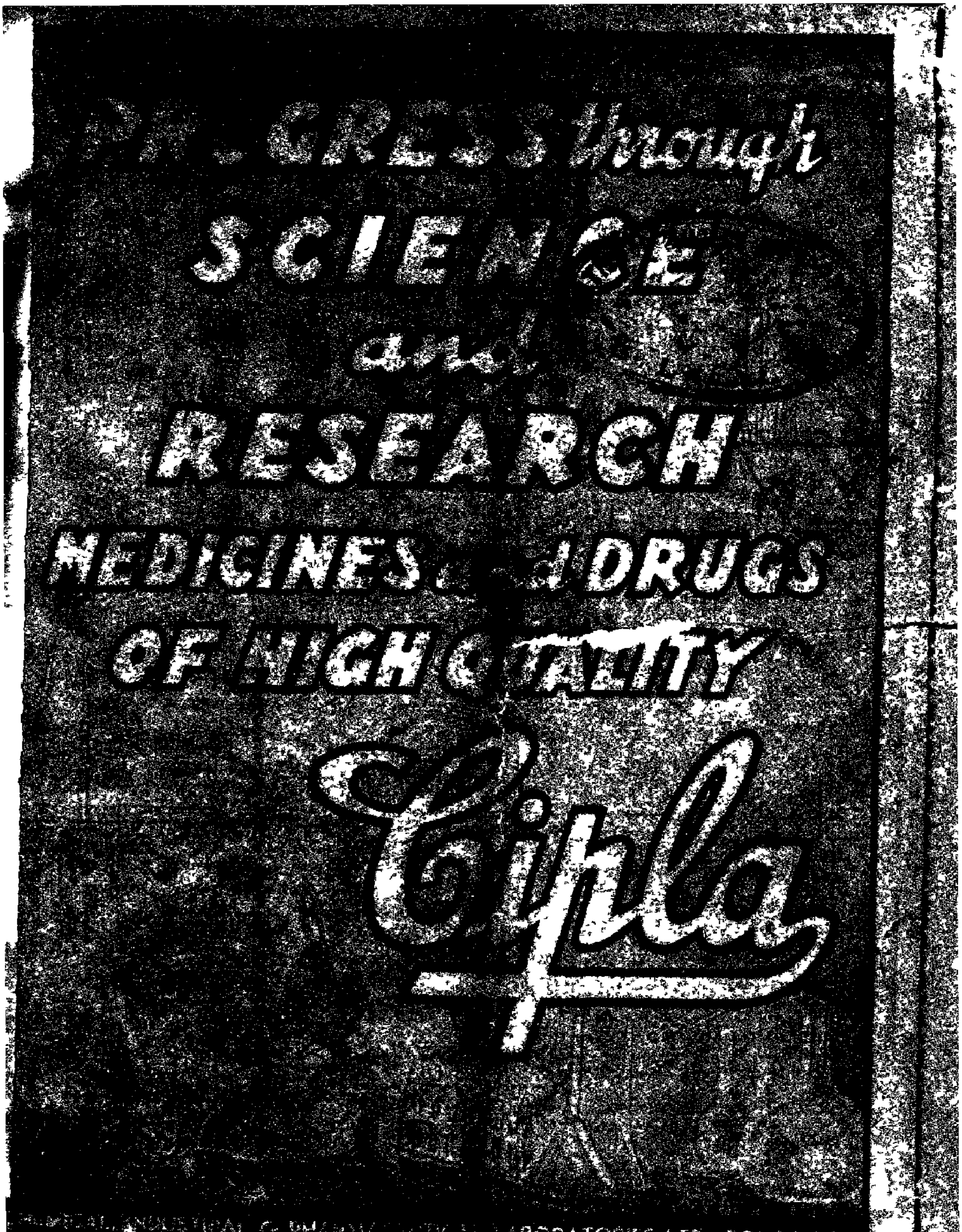
یہ مستقبل قریب کا ایک دل افزا تصور ہے۔ اِس خیال کو سچ کر دکھانے کے لئے اُمرا کے لاکھوں روپے ہی نہیں بلکہ معمولی حیثیت کے لوگوں کا کروڑوں روپیہ بھی درکار ہوگا۔ خوب سمجھ لیجئے کہ جب تک کافی سرمایہ حاصل نہ ہو، ہندوستان ایک خوشحال اور ترقی یافتہ مُلک نہیں بن سکتا۔ ہندوستانی صنعت اور زراعت کو جنگ کے بعد آپ کے روپے کی ضرورت ہوگی۔ آنے والی خوشحالی میں حصہ بٹانے کے لئے آج ہی تیاری کیجئے۔

کل کا فکر آج کیجئے
جتنا بچا سکیں بچا لیجئے

مگر اپنی رقم کسی ایسی مد میں لگایئے جہاں یہ محفوظ رہے اور وقتِ ضرورت آپ کو مل سکے۔

نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹس، سرکاری قرضے، ڈاک خانے کا سیونگز بینک کھاتہ، بیمہ پالسی، انجمن امداد باہمی اور بینک کا بچت کھاتہ، یہ سب مدیں محفوظ بھی ہیں اور فائدہ مند بھی۔ زمین، عمارات، خام یا صنعتی اشیا اور جواہرات خرید کر اپنی رقم کو خطرے میں نہ ڈالئے۔ یہ آجکل بڑے خسارے کا سودا ہے۔ مستقبل کے لئے بچایئے اور احتیاط سے لگایئے۔

گورنمنٹ آف انڈیا کے محکمۂ فنانس نے شائع کیا



GRESS through
SCIENCE
and
RESEARCH
MEDICINES DRUGS
OF HIGH
Cipla
LABORATORIES LTD., BOMBAY-8